نوائے سروش
مکمل دیوانِ غالب مع شرح
از
غلام رسول مہر
آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

نوائے سروش

مکمل دیوانِ غالب مع شرح

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

نوائے سروش

مکمل دیوانِ غالبؔ مع شرح

از

غلام رسول مہرؔ

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز،
لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : غلام علی پرنٹرز
جامعہ اشرفیہ ، اچھرہ ، لاہور

مقامِ اشاعت :
شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پبلشرز،
۱۹۹۔ سرکلر روڈ، چوک انارکلی، لاہور ۲ — ۵۴۰۰۰

ISBN - 969 - 31 - 0016 - 6

فہرست

نمبر شمار	غزلیات	صفحہ

صفحہ	غزلیات	نمبر شمار
۱۹۴	ہم مریضِ عشق کے تیمار دار ہیں	۵۵
	چ	
۱۹۴	نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ	۵۶
	د	
۱۹۷	حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد	۵۷
	ر	
۲۰۲	بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار	۵۸
۲۰۶	گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر	۵۹
۲۱۰	کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر	۶۰
۲۱۶	لرزتا ہے میرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر	۶۱
۲۲۲	ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشان اور	۶۲
۲۲۸	صفائے حیرت آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر	۶۳
۲۲۹	جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی	۶۴
۲۳۴	ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں	۶۵
۲۳۴	لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور	۶۶
	ز	
۲۳۹	فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبحِ مہر	۶۷
۲۴۱	حریفِ مطلب مشکل نہیں فسونِ نیاز	۶۸

نمبر شمار	ضمیمہ دوم	صفحہ
	۱۰۸۹

مقدّمہ

از

غلام رسول مہرؔ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

اصل و نسب ۔ اسد اللہ بیگ خاں نام، اسدؔ اور غالبؔ تخلص، قوم ترک، ۸ رجب ۱۲۱۲ھ (۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء) کی شب میں طلوعِ سحر سے چار گھڑی پیشتر بہ مقام آگرہ پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنے آپ کو سلجوقی و افراسیابی و پشنگی کہا ہے۔ ممکن ہے، ان دعاوی کی تصدیق و توثیق کے لیے مستند تاریخی دستاویزیں پیش نہ کی جا سکیں، اس لیے کہ تاریخ کے نزدیک تو سلجوقیوں اور افراسیاب و پشنگ کا باہمی تعلق بھی محلِ نظر ہے، لیکن اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ غالب کے دادا، میرزا قوقان بیگ خاں سمرقند سے ہندوستان آئے تھے اور وہ نسلاً ایک ترک تھے۔ نیز میرزا غالب کی خاندانی روایات وہی تھیں، جو انھوں نے وقتاً فوقتاً نظم و نثر میں جا بجا بیان کیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ان روایات کے ایک ایک حرف کی توثیق غالب کی عظمت میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتی اور عدمِ توثیق سے اس عظمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ غالب نے جس دائرے میں درجۂ کمال حاصل کیا، وہ افراسیاب و پشنگ کی داستان آرائیوں اور سلجوقیوں کی کشور کشائیوں سے بالکل الگ ہے۔

جدِّ امجد میرزا قوقان بیگ خاں کے ترکِ وطن کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ کسی بات پر اپنے والد ماجد سے ناراض ہو گئے تھے۔ نظر بہ ظاہر وہ تنہا نہ آئے ہوں گے بلکہ تھوڑی چھوٹی یا بڑی جمعیت ساتھ لائے ہوں گے۔ اگرچہ مغلوں کی عظمت و شوکت کا درخشاں دور گزر چکا تھا اور سلطنت شکست و نزع کی آخری منزل میں پہنچی ہوئی تھی، تاہم بہادروں اور جانبازوں کی طلب اس زمانے میں بھی باقی تھی۔ چنانچہ میرزا قوقان بیگ خاں لاہور پہنچے تو معین الملک عرف

میر منّو ناظم پنجاب نے اُنھیں اپنے پاس رکھ لیا۔ یہ اٹھارھویں صدی کے وسط کا واقعہ ہونا چاہیے۔ معین الملک کی وفات کے بعد میرزا قوقان بیگ خاں سے کم و بیش بیس برس کے حالات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہُوا ہے۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہ کہاں کہاں رہے؟ کیا کیا خدمات انجام دیں؟ بہ ظاہر سپہ گری کے سوا انھیں کسی مشغلے سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ جب شاہ عالم ثانی الٰہ آباد سے دہلی پہنچ گئے، اور ذوالفقار الدولہ نجف خاں کی مختاری کا دور شروع ہوا تو پھر میرزا قوقان بیگ خاں کا ذکر آگیا، وہ یوں کہ نجف خاں نے اُن کے لیے ضلع بلند شہر میں پہاسو کا تعلقہ ذات اور رسالے کی تنخواہ کے لیے مقرر کرا دیا۔ غالباً اسی زمانے میں میرزا قوقان بیگ خاں نے شادی کی اور میرزا غالب کے والد عبداللہ بیگ خاں دہلی ہی میں پیدا ہوئے۔

نجف خاں نے اپنی ہمت و شجاعت اور تدبیر و تدبر سے سلطنت کے بگڑے ہوئے نظام کی درستی کا بندوبست شروع کر دیا تھا۔ ۱۷۸۲ء میں اس کی وفات پر پھر انتشار و بدنظمی کا پہلا دور عود کر آیا اور میرے اندازے کے مطابق ۱۷۸۴ء میں میرزا قوقان بیگ خاں بہت سے دوسرے ترکوں کے ساتھ سلطنت دہلی سے قطع تعلق کر کے ریاست جے پور میں ملازم ہو گئے۔ غالباً اسی لیے دہلی کی سکونت چھوڑ کر آگرہ میں مقیم ہوئے اور وہیں وفات پائی۔ اُن کے بیٹے بھی تھے اور بیٹیاں بھی۔ ہمیں صرف دو بیٹوں کا کسی قدر حال معلوم ہے، ایک غالب کے والد میرزا عبداللہ بیگ خاں، دوسرے ان کے چھوٹے بھائی نصراللہ بیگ خاں۔

والد اور چچا: عبداللہ بیگ خاں کی شادی آگرہ کے رئیس غلام حسین خاں کمیدان کی صاحبزادی عزت النسا بیگم سے ہوئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود میرزا قوقان بیگ خاں بھی آگرہ کے رؤسا میں شمار ہوتے تھے۔ عبداللہ بیگ خاں پہلے لکھنؤ میں آصف الدولہ کے پاس، پھر حیدرآباد دکن میں نظام علی خاں کے پاس ملازم رہے۔ آخری ملازمت جاتی رہی تو آگرہ چلے آئے۔ پھر تلاش معاش کے لیے الور کا قصد کیا۔ ایک سرکش زمیندار کی تادیب کا حکم ہوا۔ اس قضیے میں گولی کھا کر جاں بحق ہوئے اور راج گڑھ میں انھیں دفن کیا گیا۔ یہ ۱۸۰۲ء کا واقعہ ہے۔ تین بچے چھوڑے، ایک بیٹی اور دو بیٹے۔ بیٹی سب بچوں سے بڑی تھی۔ بیٹوں میں اسداللہ بیگ خاں غالب کی عمر پانچ برس کی تھی اور اُن سے چھوٹے یوسف خاں صرف تین برس کے تھے۔ قیاس کہتا ہے کہ وفات کے وقت عبداللہ خاں بیگ خاں کی عمر

تیس سے اوپر نہیں پہنچی ہو گی ۔

نصراللہ بیگ خاں نے مرحوم بھائی کے یتیم بچوں کی پرورش اپنے ذمے لے لی ۔ مرہٹوں کی طرف سے انھیں آگرہ میں صوبیداری کا منصب حاصل تھا ۔ جب آگرہ ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے فتح کر لیا تو نصراللہ بیگ خاں کو چار سو سوار کا رسالدار بنا دیا اور ایک ہزار سات سو روپے ماہانہ مشاہرہ مقرر کیا ۔ پھر نصراللہ خاں بیگ نے ضلع متھرا کے دو پرگنے سونک اور سونسا مرہٹوں سے بہ زور چھین لیے ۔ لارڈ لیک نے یہ پرگنے بھی تاحیات انھیں کے حوالے کر دیئے ان کی آمدنی لاکھ ڈیڑھ لاکھ بتائی جاتی تھی ۔ اس طرح چند سال بہ اطمینان گزر گئے ۔

قیام دہلی اور وفات : یہ حالات تھے ، جن میں غالب نے ہوش کی آنکھ کھولی ۔ نانا بہت بڑے رئیس اور جاگیردار تھے ۔ چچا بھی بہت بڑے تنخواہ دار اور رئیس تھے ۔ باپ اور دادا کا پایہ بھی بہت بلند تھا اور یہ امر محتاج تصریح نہیں کہ انیسویں صدی کے اوائل میں اس قسم کے خوشگوار خاندانی حالات بہت کم لوگوں کو میسر تھے ۔ اچانک ۱۸۰۶ء میں نصراللہ بیگ خاں بھی غالباً میدان جنگ ہی میں نذر اجل ہوئے ۔ ساتھ ہی رسالہ ٹوٹ گیا ، تنخواہ ختم ہو گئی ، جاگیر واپس لے لی گئی اور متوفی کے متعلقین کے لیے پہلے دس ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر ہوا ۔ ایک ماہ بعد اس وظیفے کو گھٹا کر پانچ ہزار کر دیا گیا ۔ پھر اس رقم میں سے دو ہزار ایک ایسے شخص کے لیے تجویز ہوئے جسے نصراللہ بیگ خاں کے خاندان سے کوئی ایسا تعلق نہ تھا کہ وظیفے میں از روئے استحقاق حصہ دار بن سکتا ۔ گویا مرحوم کے اصل متعلقین کے لیے صرف تین ہزار روپے سالانہ رہ گئے ۔ ان میں سے ڈیڑھ ہزار بہ حصہ مساوی عبداللہ بیگ خاں کے دو بیٹوں کے لیے تھے ، ساڑھے سات سو میرزا غالب کے اور اتنے ہی میرزا یوسف کے لیے ۔

نصراللہ بیگ خاں کی شادی نواب احمد بخش خاں والی فیروزپور جھرکا و لوہارو کی ہمشیرہ سے ہوئی تھی اور بعض ارباب علم و نظر کا خیال ہے کہ دونوں خاندانوں میں پہلے بھی اس قسم کے روابط موجود تھے ۔ اس بنا پر میرزا غالب کی شادی ۷ ، رجب ۱۲۲۵ھ (۹ ، اگست ۱۸۱۰ء) کو نواب احمد بخش کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے

ہوئی۔ سولہ سترہ برس کی عمر میں غالب آگرہ کی سکونت چھوڑ کر مستقل طور پر دہلی میں مقیم ہوگئے۔ وہیں قریباً ساٹھ سال گزار کر ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو وفات پائی۔ تہتّر سال اور کچھ دن کم چار ماہ عمر ہوئی۔ نظام الدین میں چونسٹھ کھمبے (مقبرۂ عزیز کوکلتاش) کے پاس نواب الٰہی بخش خاں معروف کے احاطے میں انھیں دفن کیا گیا۔ اب وہاں سنگِ مرمر کا نہایت خوبصورت مقبرہ بنا دیا گیا ہے۔

غالب نے اردو اور فارسی نظم و نثر میں جو کچھ لکھا، اُسے الگ الگ کتابوں کی شکل میں گنا جائے تو تعداد بیس کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ فارسی نظم و نثر میں وہ ان تمام اساتذہ کے ہمسر نظر آتے ہیں، جن پر اس زبان کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ لیکن پاک و ہند میں ان کی عظمت کا حقیقی مدار اُردو کا مختصر سا دیوان اور اس کے بعد اُردو مکاتیب ہیں۔

تعلیم: میرزا غالب نے آگرہ کے مشہور معلّم خلیفہ محمد معظّم سے تعلیم پائی، عربی جیسا کہ وہ کہتے ہیں، شرحِ مأۃ عامل تک پڑھی۔ فارسی سے طبیعت کو خاص مناسبت بھی تھی اور اس پر توجہ میں بھی کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا۔ ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء) میں ایک نومسلم ایرانی فاضل ملّا عبدالصّمد بہ طریقِ سیاحت ہندوستان آئے اور دو برس آگرہ اور دہلی میں غالب کے پاس مقیم رہے، ان کی صحبت سے میرزا نے بہت فائدہ اٹھایا۔ تعجب ہے کہ اس اُستاد کا وجود بھی اب تک بعض اربابِ علم و فضل میں موضوعِ بحث بنا ہوا ہے اور اس بارے میں شک و شبہ کی بنا غالباً خواجہ حالی مرحوم کے اس بیان سے ہوئی۔

> "کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ مجھ کو مبدءِ فیاض کے سوا کسی سے تلمّذ نہیں ہے اور عبدالصّمد محض ایک فرضی نام ہے۔ چونکہ مجھ کو لوگ بے استاد کہتے تھے، ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی اُستاد گھڑ لیا ہے۔" ("یادگارِ غالب" ص ۱۱)

خواجہ حالی نے یقیناً وہی لکھا، جو کچھ سنا۔ ممکن ہے میرزا غالب نے عالمِ سرخوشی میں ایک سے زیادہ مرتبہ اس قسم کی بات کہہ دی ہو، لیکن اس میں جس اُستادی کی نفی کی گئی ہے صاف ظاہر ہے کہ اس کا تعلق تعلیم و تعلّم سے نہیں، بلکہ صرف شاعری سے ہے یعنی میرزا

نے اس عہد کے عام دستور کے خلاف شاعری میں کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہ کیا اور عبدالصمد
کو بھی مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا۔ میرزا کا اسلوب فکر و نظر نہ کسی استاد کا متحمل ہو سکتا تھا اور نہ کسی
کے تلمذ سے انھیں کوئی فائدہ پہنچ سکتا تھا، بلکہ نقصان ہی پہنچتا، اس لیے کہ خداداد صلاحیتوں کے
طبعی نشوو ارتقا میں کم یا زیادہ رکاوٹ پیدا ہوتی اور مختلف منزلیں طے کرتے ہوئے انھیں جس
مقام پر پہنچنا تھا، یا تو بالکل نہ پہنچتیں یا اتنی دیر میں پہنچتیں کہ زندگی کی مہلت ہی تمام ہو جاتی۔

بہرحال خواجہ صاحب کی پیش کردہ روایت سے، جس کا موقع اور محل ہم سے مخفی ہے، تعلیم و
تعلم کی نفی نہیں ہوتی۔ بلاشبہ میرزا نے شاعری میں جو کچھ حاصل کیا، مبدءِ فیاض سے حاصل کیا،
لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انھیں عام طریق تعلیم پر کاربندی کے بغیر ہی سب کچھ آ گیا۔ یعنی
پڑھنے لکھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی اور جب خلیفہ محمد معظم سے تعلیم پانا مسلّم ہے تو پھر ملّا
عبدالصمد سے فارسی زبان کے حقائق سیکھنے کو محلِ نظر قرار دینا باعثِ تعجب ہے۔ اس بارے
میں دقیقہ سنجیاں بلکہ موشگافیاں اس درجہ دور از کار ہیں کہ اہل علم کی طرف سے ان میں صرفِ
وقت و نظر سراسر حیرت افزا ہے۔

عجیب بات ہے کہ خواجہ حالی کی اس روایت کو بنیاد بنا کر بحث و استدلال کی بڑی
بڑی عمارتیں اٹھانے والے بزرگ یہ خیال نہیں فرماتے کہ دو قدم آگے چل کر "یادگار" ہی میں یہ
روایت بھی درج ہے:

"نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کہتے تھے کہ ملّا عبدالصمد کے ایک خط میں جو اس
نے میرزا کو کسی دوسرے ملک سے بھیجا تھا، یہ فقرہ بھی لکھا تھا: اے عزیز چہ کسی کہ
با ایں ہمہ آزادگی گاہ گاہ بہ خاطر می گذری۔" (یادگار، ص ۱۲)

میرزا غالب کی راستبازی اور صداقت شعاری کا فیصلہ تھوڑی دیر کے لیے ملتوی
فرمایئے، کیا نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا شیوہ بھی معاذ اللہ یہی تھا جو میرزا غالب کا مانا جاتا ہے؟

معاملہ صرف اتنا ہے کہ میرزا غالب نے فارسی زبان کے متعلق جو بنیادی حقائق پیش
کیے (اور جن کی کوئی مثال اس عہد یا پیشتر کے عہد میں نہیں ملتی) وہ یا تو کسی سے سیکھے یا خود
وسعتِ مطالعہ سے پیدا کیے۔ قرینِ قیاس یہی ہے کہ کہیں نہ کہیں سے رہنمائی کی روشنی حاصل

کی۔ پھر وسعتِ مطالعہ، وقتِ نظر اور حسنِ ذوق کی بنا پر ان کے متعلق قلب میں اذعان پیدا ہو گیا۔ اب اگر یہ روشنی ملا عبدالصمد سے ملی، جیسا کہ میرزا غالب نے کہا اور شیفتہ کے بیان سے اس کی تائید مزید ہوئی، تو اس باب میں رد و کد کی صفیں بچھانے اور لپیٹنے سے دنیائے علم کے کون سے آباد گوشے میں آبادکاری کا بندوبست ہو سکتا ہے؛

شعر گوئی:

میرزا ابتدائے سنِ تمیز ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ اس بارے میں ان کے مختلف بیانات موجود ہیں جن میں آغازِ شاعری دس پندرہ کے درمیان سا نظر آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ سلسلہ دس گیارہ برس ہی کی عمر میں شروع ہو گیا تھا، مگر جن اشعار کو کلام کی حیثیت میں محفوظ رکھنے لگے۔ وہ پندرہ برس یا اس کے آس پاس ہی کی عمر کے ہوں گے۔

شعر گوئی کی ابتدا اردو زبان میں ہوئی، جو میرزا کی مادری زبان تھی، مگر یقین ہے کہ کبھی کبھی وہ فارسی بھی کہتے ہوں گے۔ ان کے ابتدائی دور کے اردو اشعار دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ وہ فارسی زبان میں ترقی کی خاصی منزلیں طے کر چکے تھے۔ لیکن مطالعہ کے آغاز میں، انھوں نے ان فارسی شعرا کا کلام بڑے ذوق و شوق سے دیکھا تھا جنھیں خیال بند مانا جاتا ہے۔ مثلاً جلال اسیر، شوکت بخاری، بیدل عظیم آبادی۔ خصوصاً بیدل سے وہ اس درجہ متاثر ہوئے کہ اردو میں بھی انہی کا انداز اختیار کر لیا، حالانکہ اردو اپنی سادگی میں خیال بندی کے دقائق کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا غالب کو مجبوراً فارسی کا سہارا لینا پڑا۔ یوں ان کے ابتدائی اشعار عام اردو شعروں کے مقابلے میں بہت مغلق اور پیچیدہ ہو گئے۔ جب ذہن و فکر نے درجۂ بلوغ حاصل کیا اور نیک و بد کی تمیز پیدا ہوئی تو بیشتر اشعار قلم زد کر دیئے اور انہیں مستند کلام کے درجے سے خارج ہی کر دینا مناسب تھا۔ ۱۹۲۱ء میں نسخۂ حمیدیہ کے نام سے جو مجموعہ شائع ہوا، اس سے غالب کے شاعرانہ کمالات میں ہرگز کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا تھا، البتہ فکرِ غالب کے ارتقائی مدارج معلوم کرنے کے لیے اسے حد درجہ قیمتی ذریعہ ضرور مانا جا سکتا ہے۔

اندازہ یہ ہے کہ پچیس برس کی عمر تک (۱۸۲۱ء) وہ زیادہ تر اردو میں شعر کہتے رہے۔ پھر فارسی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس وقت سے زیادہ تر فارسی نظم و نثر ہی لکھتے رہے، اگرچہ اس دور میں بھی وقتاً فوقتاً ریختہ کہتے رہے۔ مثلاً لکھنؤ یا رامپور کے مشاعروں کے لیے غزلیں لیکن وہ اصلاً فارسی ہی کے شاعر تھے۔ اسی دور کے متعلق دعویٰ کیا تھا :

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ   بگزر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

سنہ ۱۸۵۰ء میں قلعے سے ملازمت کا تعلق پیدا ہوا تو پھر ریختہ گوئی کی طرف زیادہ توجہ ہو گئی۔ ان کا بہترین اردو کلام اسی دور کا ہے۔ بعض غزلیں ایسی ہیں کہ فارسی زبان کے بیش بہا خزینے میں بھی ویسے جواہر پارے شاید ہی مل سکیں۔

ایک افسانہ اُردو شاعری کے سلسلے میں بھی ایک افسانہ مشہور ہے، یعنی یہ کہ نواب حسام الدین حیدر خاں نے غالب کا ابتدائی کلام لکھنؤ میں میر تقی کو دکھایا تو میر صاحب نے کہا کہ اگر اس لڑکے کو استاد کامل نے سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا، ورنہ مہمل لکھنے لگے گا لیکن یہ بیان قطعاً قابل قبول نہیں، اس لیے کہ :

۱۔ میر تقی کی وفات ۲۰ شعبان ۱۲۲۵ھ / ۲۰ ستمبر ۱۸۱۰ء کو ہوئی گویا اس وقت میرزا غالب صرف تیرہ برس، ایک مہینے اور چند دن کے تھے اور اس عمر کے بچے کا کلام آگرہ سے لے جا کر لکھنؤ میں میر تقی جیسے کہنہ مشق، استاد کو دکھانے کا خیال بھی کسی کو نہیں ہو سکتا تھا۔

۲۔ حسام الدین حیدر خاں دہلی میں رہتے تھے۔ خاندان لوہارو سے عموماً اور میرزا غالب کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف سے خصوصاً ان کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ اسی وجہ سے غالب کے ساتھ خاص مراسم پیدا ہو گئے، لیکن انہیں یہ کیوں کر معلوم ہو سکتا تھا کہ غالب کم سنی میں حیرت انگیز شعر کہتے ہیں اور انہیں لکھنؤ لے جا کر میر تقی کو دکھانا چاہیے، جبکہ غالب کی مستقل سکونت آگرہ میں تھی اور عمر بارہ تیرہ برس سے زیادہ نہ تھی۔

۳۔ ماہ رجب ۱۲۲۵ھ / ۹ر اگست ۱۸۱۰ء کو میرزا غالب کی شادی ہوئی۔ اگر سمجھا جائے کہ اس وقت دہلی میں آمد و رفت شروع ہوئی اور حسام الدین حیدر خاں کو بھی غالب

کے شعر سننے کا موقع ملا تو یہ تعارف چھپنے ڈیڑھ مہینے کی قلیل سی مدت میں اس پیمانے پر کیوں کر پہنچ سکتا تھا کہ حسام الدین حیدر خاں میرزا کے اشعار لکھنؤ لے جا کر میر تقی کو دکھاتے اور ان کے متعلق میر صاحب کی رائے لے آتے؟

۴۔ اس قول میں ایک سے زیادہ پہلو ایسے ہیں کہ میر تقی جیسے رمز شناسِ شعر کی زبان پر وہ آ ہی نہ سکتے تھے۔

بہ ہر حال میر کی بیان کردہ پیش گوئی کو بھی انہیں داستانوں میں شمار کرنا چاہیے جو عجائب پسند لوگ غیر معمولی دل و دماغ کے آدمیوں کے متعلق وضع کر لیا کرتے ہیں اور شاید ہی کوئی بڑا آدمی گذرا ہو، جس کے گرد و پیش ایسی داستانوں کے ہالے تیار نہ کر دیے گئے ہوں۔ میرزا غالب یقیناً "لاجواب شاعر" بن گئے مگر سیدھے رستے پر ہو لینے کے لیے کسی استاد کی رہنمائی کے ممنون نہ ہوتے:

شعر غالب نبود وحی و نہ گوییم ولے تو و یزداں نتواں گفت کہ الہامے ہست!

اردو دیوان کی کہانی غالب کے اردو دیوان کی ترتیب و انتخاب کے متعلق بھی ایک افسانہ وضع کر لیا گیا، جسے مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے "آب حیات" میں شامل کر کے حقیقت کے درجے پر پہنچا دیا، یعنی مولانا فضل حق خیر آبادی اور میرزا خاں کوتوال سنے دوست ہونے کی حیثیت میں غالب کو سمجھایا کہ تمہارے اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ غالب نے کہا:

"اب اتنا کچھ کہہ چکا، تدارک کیا ہو سکتا ہے؟ انھوں (مولانا اور مرزا خاں) نے کہا خیر ہُوا، سو ہُوا، انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ میرزا نے دیوان حوالے کر دیا دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا" (آب حیات ص ۵۱۰)

اس اقتباس کا بے سر و پا ہونا کسی تفصیل کا محتاج نہیں۔ غور فرمائیے کہ:

۱۔ اگر شعر کے حسن و خوبی کا انتہائی معیار ہو تا کہ وہ عام لوگوں کی سمجھ میں آ جائے تو عرفی، نظیری وغیرہ کے مقابلے میں بلاقی کا مرتبہ بدرجہا بلند تر ہوتا۔

۲۔ پھر یہ کیا قول ہے کہ "اتنا کچھ کہہ چکا، تدارک کیا ہو سکتا ہے؟" کیا میرزا غالب اتنے

کی کم حیثیتی کے قائل ہو چکے تھے تو وہ فرماتے کہ ایسے اشعار قلم انداز کر دیے جائیں گے۔ شاعر جو کچھ کہتا ہے، کیا اسے چھپنا اور شائع کرنا قدرت کی طرف سے لازم ہو جاتا ہے؟

۳۔ مرزا خاں کوتوال کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ مولانا فضل حق یقیناً بہت بڑے عالم تھے، لیکن کیا یہ بزرگ اشعار کی اچھائی یا برائی کو میرزا غالبؔ سے بہتر سمجھتے تھے جنہیں قدرت نے شعر گوئی ہی کے لیے پیدا کیا تھا اور جن کے متعلق نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ نے "گلشن بے خار" میں لکھا تھا کہ:

"مضامین شعری را کما ہو حقہٗ فہمد و بہ جمیع نکات و لطائف پے مے برد و این فضیلتے است کہ مخصوص بعض اہل سخن است۔ اگر طبع سخن شناس داری، بہ این نکتہ مے رسی۔ چہ خوش گو اگر کمیاب است، اما خوش فہم کمیاب تر۔ خوشا حال شخصے کہ از ہر دو شربے یافتہ و حظے ربودہ۔ بالجملہ چنیں نکتہ سنج نغز گفتار کم تر مرئی شد۔" (گلشن بے خار ۱۴۹)

غرض یہ بیان بھی سراسر افسانہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرزا غالبؔ نے تمیز نیک و بد ہونے کے بعد خود ہی شعروں کا انتخاب کیا۔ پھر وہ کلکتہ گئے تو وہاں "گلِ رعنا" کے نام سے اپنے کلام کا ایک انتخاب تیار کیا۔ اس میں عرشی صاحب کے بیان کے مطابق اردو کے کل ۴۵۴ شعر رکھے تھے۔ پھر ان میں مزید غزلیں شامل ہوتیں اور دیوان کی بقیہ تہر گذشت خلاصہ یہ ہے:

۱۔ اردو دیوان پہلی مرتبہ شعبان ۱۲۵۷ھ / اکتوبر ۱۸۴۱ء میں سید محمد خاں برادر سید مرحوم کے مطبع "سید المطابع" میں چھپا۔ یہ ایک سو آٹھ صفحات پر مشتمل تھا اور اس میں کل ایک ہزار پچانوے شعر تھے۔

۲۔ پھر جمادی الاولیٰ ۱۲۶۳ھ / مئی ۱۸۴۷ء میں مطبع دارالسلام واقع حوض قاضی نے نور الدین احمد لکھنوی کے زیرِ اہتمام دیوان دوسری مرتبہ چھاپا۔ اس میں کل ایک ہزار ایک سو گیارہ شعر تھے، یعنی طبع اوّل سے صرف سولہ شعر زیادہ۔ چودہ شعر اس غزل کے تھے جو مروجہ اردو دیوان کی آخری غزل ہے، یعنی "جاں کے لیے" "آسماں کے لیے" دو شعر جیسی وقتی

والے قطعے کے تھے۔ گویا ۱۸۲۱ء سے ۱۸۴۷ء تک اردو زبان میں ان کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر ۱۸۶۱ء تک طبع دیوان کی نوبت نہ آئی۔

۲۔ ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۷ء تک جو کچھ کہا تھا زیادہ تر مشہور غزلیں اسی دور میں کہی گئی تھیں، وہ سب قلمی نسخوں میں مرقوم ہوا، جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں تلف ہو گئے اور آغازِ ہنگامہ سے کچھ مدت پیشتر غالب نے اپنے اردو دیوان کا ایک نسخہ خوش نویس سے لکھوا کر نواب یوسف علی خاں والی رام پور کے پاس بھیج دیا تھا۔ ۱۸۶۰ء میں رام پور گئے تو اس نسخے کی نقل لے آئے اسے پہلے میرٹھ میں چھپنے کے لیے دیا، پھر منشی شیو نرائن آرام کے پاس آگرہ بھیج دیا۔ وہاں طباعت میں تاخیر ہوئی تو مرزا غالب نے دیوان کا ایک اور نسخہ دہلی میں مولوی محمد حسین خاں تحسین کے حوالے کر دیا۔ چنانچہ دیوان تیسری مرتبہ مطبع احمدی واقع شاہدرہ (دہلی) میں باہتمام امو جان طبع ہو کر ۲۰ محرم الحرام ۱۲۷۸ھ = ۲۸ جولائی ۱۸۶۱ء کو شائع ہوا۔ اس میں کل ایک ہزار سات سو چھیانوے اشعار تھے۔

۴۔ اس دیوان کا خط بھی اچھا نہ تھا نیز غالب کی روش کے خلاف بہت سے الف ڈ ملا کر لکھے گئے تھے۔ اور غلطیاں بہت رہ گئی تھیں، اس لیے کہ کاتب نے تصحیح کا پورا خیال نہیں کیا تھا۔ مرزا غالب نے مطبوعہ دیوان کی خود تصحیح کی اور اس میں چند شعر بڑھا دیے، جو غالباً مطبع احمدی والے نسخے کی طباعت کے بعد کہے گئے تھے۔ یہ نسخہ مولوی محمد حسین خاں تحسین کے ذریعے سے چھپنے کے لیے مطبع نظامی واقع کان پور میں بھیج دیا، جس کے مالک محمد عبدالرحمٰن خان بن حاجی محمد روشن خاں تھے۔ یہ دیوان ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ میں یعنی مطبع احمدی والے نسخے سے قریباً ۱۰ ماہ بعد چھپا۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ اس کے کل اشعار ایک ہزار آٹھ سو دو تھے۔ (۱۷۹۶ + ۶)

۵۔ اس دوران میں منشی شیو نرائن آرام نے بھی طباعت شروع کر دی تھی اور ان کے مطبع میں دیوان ۱۸۶۳ء میں مکمل ہوا۔ یہ دیوان نسخۂ رام پور کے مطابق تھا۔

۶۔ اور جے نرائن تاجر کتب دہلی نے سید ظہیر دہلوی سے کہہ کر غالب، ذوق اور مومن کے دیوانوں کا انتخاب مرتب کرایا تھا، جس کا نام "گلدستۂ سخن" رکھا تھا۔ یہ کتاب مینٹ

مستفرز؛ کالج دہلی کے مطبع العلوم میں چھپنی شروع ہوئی تھی مگر تکمیلِ طباعت مطبع احمدی میں ہوئی۔ اس میں غالبؔ کی غزلیات کے صرف پینتیس اشعار چھوڑ دیے گئے تھے۔ باقی سب انتخاب میں لے لیے گئے تھے۔ "نگارستانِ سخن" ۲۷۔ صفر ۱۲۸۰ھ (۱۳؍اگست ۱۸۶۳ء) کو شائع ہوئی۔ "سہرا"، پہلی مرتبہ اسی مجموعے میں شامل کیا گیا تھا، بعد ازاں دیوان میں شامل ہوا۔[1]

بس، غالبؔ کی زندگی میں اردو دیوان اتنی ہی مرتبہ چھپا، البتہ ان کی وفات کے بعد جو ایڈیشن نکلے، ان کا شمار ممکن نہیں۔ ان میں عام ایڈیشن بھی شامل ہیں اور نہایت پُرتکلف، دیدہ زیب مصوّر ایڈیشن بھی۔ اردو نظم کے کسی مجموعے کو شاید ہی وہ ہر دلعزیزی حاصل ہوئی ہو جو دیوانِ غالب کے حصّے میں آئی اور اس پر جو شرحیں لکھی گئیں، ان کا شمار بھی آسان نہیں۔

موجودہ دیوان میں مدت سے غالب کے دیوان کا ایک ایسا ایڈیشن مرتب کر دینے کا آرزومند تھا، جو مختلف خصوصیات کا جامع ہو۔ مثلاً:

۱۔ صحت کا پورا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ بیشتر اشعار صرف اس وجہ سے پیچیدہ اور مشکل بن گئے تھے کہ ان میں علاماتِ اوقاف صحیح مقامات پر لگانے کا خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ میرا خیال تھا، اگر اوقاف ٹھیک لگا دیے جائیں تو اغلب ہے اکثر اشعار کا مطلب بالکل واضح ہو جائے جنھیں عام طور پر مشکل سمجھا جاتا ہے اور بعض شارحین دماغ سوزیوں کے باوجود ان کی صحیح شرح نہیں کر سکے، بلکہ مقصودِ شاعر سے دُور دُور ہٹتے ہٹتے، انھوں نے شعروں کو چیستاں بنا دیا۔

۳۔ اشعار میں، ایسے الفاظ بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں، جن کے معنی تو اکثر اصحاب سمجھتے ہیں، لیکن ان کے تلفظ میں غلطی کر جاتے ہیں۔ ایسے تمام الفاظ پر اعراب لگا دیے جائیں تاکہ تلفظ میں غلطی سرزد نہ ہو اور یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ الفاظ غلط پڑھے جائیں تو شعر کی حقیقی حیثیت ہی نازک ہو جاتی ہے۔

۴۔ جتنے اشعار دیوان سے باہر رہے تھے اور وہ مختلف مقامات پر چھپ چکے تھے، انھیں اکٹھا کر کے بطورِ ضمیمہ شاملِ دیوان کر دیا جائے تاکہ اربابِ ذوق کو ان کی

---

[1] یہ تفصیلات محبِ عزیز جناب مالک رام صاحب ایم اے کی تحقیقات پر مبنی ہیں۔

تلاش میں دوسرے مآخذ کی طرف رجوع کی ضرورت نہ رہے۔

۵۔ آخر میں "نسخۂ حمیدیہ" سے ایسے اشعار منتخب کر لیے جائیں جو کسی قدر سہل ہوں اور ان میں فکر و بیان کی کوئی خوبی پائی جائے۔

۶۔ اس میں مختلف غزلیات و قصائد کی تاریخیں مستند ماخذ کی بنا پر متعین کر دی جائیں۔

میں اپنے مجوزہ دیوان کی ترتیب مکمل نہیں کر سکا تھا کہ مالک رام صاحب نے ایک دیوان شائع کر دیا جس میں تاریخوں کے تفصیلی اہتمام کے سوا، وہ خصوصیات کم و بیش موجود تھیں، جو میرے پیشِ نظر تھیں۔ خوب غور و فکر کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ نئے دیوان کی ترتیب بہرحال ضروری ہے۔ چنانچہ میں نے دیوان مرتب کر کے مطبع کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد فاضل جلیل و محبِّ محترم مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی کا مرتبہ دیوان شائع ہو گیا، جس کا دائرہ میرے مجوزہ دیوان کے دائرے سے زیادہ وسیع ہے اور اسے دیوان غالب کے بجائے کلیاتِ غالب قرار دینا چاہیے، اس لیے کہ اس میں "نسخۂ حمیدیہ" سے آخر تک وہ سب کچھ جمع کر دیا گیا جس نے اردو میں غالب کے نام سے انتساب پایا۔ پھر تاریخوں کا بھی اہتمام ہے اور اوقاف و صحت کا بھی۔ میں نے اپنے مرتبہ دیوان کی کتابت روک کر اس نسخۂ بہتیہ سے بھی بقدرِ صلاحیت استفادہ کیا۔

میرے پیشِ نظر جامعیت کے بجائے یہ امر تھا کہ ان اشعار کو باہتمام خاص مرتب کر دیا جائے، جن سے اردو خواں صحاب زیادہ سے زیادہ تعداد میں استفادہ کر سکیں۔

یہ بھی عرض کر دوں کہ میں نے بعض الفاظ اسی طرح رکھے ہیں جس طرح میرزا غالب کے زمانے میں استعمال ہوتے تھے مثلاً "آوے" کو "آئے" اور "فرماویں گے" کو "فرمائیں گے" نہیں بنایا۔ الفاظ کو ملا کر لکھنے سے احتراز کیا ہے، لیکن بعض مقامات پر رفعِ اشتباہ کی غرض سے اس کے خلاف بھی کرنا پڑا مثلاً "سخت جانی ہائے" کو "سخت جانیہائے" ہی لکھا۔ پہلی صورت میں میرے اندازے کے مطابق غلطی کا امکان بڑھ جاتا تھا۔ البتہ "نالہائے زار" کو "نالہ ہائے زار" لکھا۔ اس بارے میں کوئی ایک قاعدہ بنایا جا سکتا ہے تو یہی بنایا جا سکتا ہے کہ خوانندگانِ کرام کو غلط فہمی یا اشتباہ سے حتی الامکان محفوظ رکھا جائے۔

کلام کی تاریخوں کا مسئلہ کلام کی تاریخوں کا مسئلہ بے حد اہم تھا۔ اس سلسلے میں دور مرتب کرنے کے واضح قرینے موجود تھے مثلاً:

۱۔ نسخۂ حمیدیہ میں جو کلام ہے، وہ فی الجملہ پچیس برس کی عمر تک کا ہے، یعنی اس کی آخری تاریخ ۱۸۲۲ء سمجھنی چاہیے

۲۔ تذکرہ "گلشن بے خار"، ۱۸۳۴ء میں مرتب ہوا تھا۔ اس میں جو منتخب اشعار آ گئے ہیں، ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ان اشعار کی غزلیں ۱۸۳۴ء سے پیشتر کی ہیں۔

۳۔ ۱۸۴۱ء میں اردو دیوان پہلی مرتبہ چھپا۔ اس میں جو غزلیں ہیں، وہ بہر حال ۱۸۴۱ء تک کی ہیں۔

۴۔ ۱۸۴۷ء کے دیوان میں صرف سولہ شعر زائد تھے اور ان کی تصریح پہلے کی جا چکی ہے۔

۵۔ ۱۸۶۱ء میں تیسری مرتبہ دیوان چھپا۔ اس سے ۱۸۴۷ء اور ۱۸۶۱ء کی درمیانی مدت کے کلام کا پتا چل سکتا ہے۔

۶۔ باقی جو کچھ ہے، بعد کا ہے۔

ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے پہلے دو بڑی تقسیمیں کیں، یعنی ۱۸۴۱ء تک کا کلام اور ۱۸۶۱ء تک کا کلام۔ پہلی تقسیم میں جا بجا "گلشن بے خار" کے حوالے بھی دے دیے تاکہ معلوم ہو جائے، وہ کلام تذکرہ مذکورہ کی تکمیل سے پیشتر کا ہے۔ ان بڑی تقسیموں کے بعد جن غزلوں کی معین تاریخیں معلوم ہو گئیں، ان کے متعلق حواشی میں مع ماخذ تصریحات کیں اور ان کی تعداد خاصی ہے، جیسا کہ دیوان ملاحظہ فرمانے سے واضح ہو گا۔ کاش تحقیق کا قدم آگے بڑھانے کے لیے کوئی نیا سامان مل جائے تاکہ باقی کلام یا اس میں سے بیشتر حصے کی تاریخیں معین طور پر معلوم ہو جائیں۔ میں چاہتا تھا کہ ہر ردیف کی غزلیات تاریخی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کر دوں، لیکن کلام کا خاصا بڑا حصہ چونکہ ایسا ہے جس کی معین تاریخ تاحال معلوم نہیں ہو سکی، لہٰذا ایک حصے کے متعلق معلومات کو پیش نظر رکھتے ہوئے متداول ترتیب میں رد و بدل مناسب نظر نہ آیا۔

بعض غزلیات یا قطعات و قصائد وغیرہ کے اوقات داخلی یا خارجی شہادتوں کی بنا پر معین کر لینے کے قرینے موجود تھے۔ میں نے ان قرینوں سے فائدہ اٹھانے میں بھی کوتاہی نہیں کی۔ غرض اس دیوان کو ہر لحاظ سے مفید اور نفع بخش بنانے میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہیں رکھا۔ امید ہے، یہ ناچیز سعی کلام غالب کے مطالعے اور اس سے استفادے کے دائرے کو وسیع تر کرنے میں معاون ثابت ہو گی۔

آخر میں چند الفاظ دیوان کی شرح کے متعلق بھی عرض کر دینے چاہئیں۔ اردو دیوان کی اتنی شرحیں ہو چکی تھیں کہ مجھے خیال بھی نہیں تھا، کوئی نئی شرح ضروری ہو گی اور یہ کام بھی مجھے انجام دینا پڑے گا۔ ہر انداز اور ہر پیمانے کی شرحیں مروج چلی آتی تھیں۔ ایسی بھی تھیں، جن میں صرف مشکل اشعار کی سرسری تشریح کی گئی تھی اور ایسی بھی، جن میں شعر بہ شعر مفصل شرح کی گئی تھی۔ لیکن میرے عزیز دوست شیخ نیاز احمد صاحب (مالک شیخ غلام علی اینڈ سنز) کی رائے ابتدا سے یہ تھی کہ نئی شرح ہونی چاہیے۔ وہی اس پورے سلسلے کی اشاعت کے ذمہ دار ہیں، وہی میری تمام تحریرات شائع فرماتے رہتے ہیں، سالہا سال کے خاص تعلق سے ان کی رائے میرے نزدیک زیادہ توجہ کی مستحق رہی۔ میرے عزیز دوست دلاوری صاحب نے بھی شیخ صاحب ہی کی تائید کی، اس لیے میں نے شرح کا بیڑا اٹھایا۔ کام شروع ہوا تو یقین ہو گیا کہ بیسیوں شرحیں چھپ جانے کے باوجود غالب کے مختصر سے اردو دیوان کی توضیح و تشریح کا حق ادا نہیں ہوا اور، غالب ہے، اس کے بعد بھی اہل فکر و نظر کا احساس یہی رہے۔

میں نے ذہن میں شرح کا جو پیمانہ تجویز کیا تھا، وہ نہ زیادہ مختصر تھا اور نہ زیادہ مفصل۔ آرزو یہ تھی کہ میرزا کے شعر ایسے انداز میں پیش کیے جائیں، جس سے ان کی معنوی اہمیت و عظمت بخوبی واضح ہو جائے اور خوانندگان کرام اندازہ فرمائیں کہ میرزا کو اردو شعر و ادب میں یگانگی کا جو مرتبہ ملا، اس کی بنیاد و اساس کیا ہے۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ ہر شعر کی شرح خواہش و اطمینان کے مطابق کر سکا ہوں، لیکن اسے ملاحظہ فرما لینے کے بعد یہ یقین ضرور ہو جائے گا کہ میں نے شارحین کی قابل قدر نکتہ نوازیوں سے استفادے کے ساتھ جا بجا

فکر و نظر کے نئے پہلو بھی پیش کیے ہیں اور کوشش برابر یہی رہی کہ میرزا کی شعر گوئی میں بیان و تخییل کے جن کمالات کی جلوہ آرائیاں بکثرت نمایاں ہیں، ان تک رسائی زیادہ سے زیادہ سہل ہو جائے۔ میں ان شرحوں پر نقد و تبصرہ کا رشتہ سنبھال نہیں سکتا، اتنا عرض کر دیتا ہوں کہ پوری صحت میں خواجہ حالی مرحوم و مولانا طباطبائی مرحوم ہی کے ارشادات زیادہ تر محکم و استوار نظر آئے، جیسا کہ خود کتاب کے ملاحظے سے یہ حقیقت آشکار ہو جائے گی۔

علاوہ بریں اس شرح کی چند ور خصوصیات بھی ہیں، جن کی طرف اجمالاً اشارہ کر دینا غالباً غیر مناسب نہ سمجھا جائے۔

۱- امید ہے کہ اسے دیکھ لینے کے بعد میرزا کے اشعار کی بلند حیثیت کا بہتر اندازہ ہو سکے گا۔

۲- میں نے محض الفاظ و تراکیب ہی کی تشریح پر معاملہ نہیں چھوڑا، بلکہ افکار کے مختلف پہلو بھی واضح کیے اور حتی الامکان کوئی ضروری نکتہ نظر انداز نہ کیا۔

۳- اس امر کا خاص خیال رکھا کہ میرزا کے اشعار کو نری تخییل طرازی نہ سمجھا جائے، بلکہ حقائق حیات سے ان کا ربط و تعلق واضح کیا جائے۔

۴- چند اصحاب نے میرزا کے بعض اشعار کو کسی نہ کسی فارسی شعر سے ماخوذ قرار دیا۔ میرے علم میں ایسے جتنے اشعار آئے، ان کا موازنہ میرزا کے اشعار سے کر کے معنویت کا فرق دکھا دیا، بتایا کہ بعض شعروں میں اک گونہ اشتراک کے باوصف سابق میں مضمون جس طرح پیش کیا گیا تھا، وہ یا تو ناقص تھا یا غیر طبعی۔ میرزا نے اسے صحیح انداز میں پیش کیا۔ اس وجہ سے اگر وہ مضمون جزواً کسی سابق شعر میں آ بھی چکا تھا تو میرزا نے اس کی حقیقی حیثیت کا اندازہ کرتے ہوئے اسے مکمل کر دیا اور طبعی بنا دیا۔

۵- میں نے اس امر کا بھی خیال رکھا کہ میرزا نے اردو میں بعض ایسے اشعار بھی کہے، جن کا مضمون وہ بیشتر فارسی میں باندھ چکے تھے۔ میں نے وہ اشعار جا بجا نقل کر دیے۔ تاکہ خوانندگان کرام اندازہ فرما سکیں، آیا اصل مضمون اردو میں بہتر طریق پر ہوا یا فارسی میں۔

۶- اس شرح میں افکار غالب کے مطالعے کا ذوق پیدا کرنا بہ طور خاص مدنظر رہا۔

۷۔ اصل دیوان کے علاوہ ضمیمہ کے اشعار کی شرح بھی کر دی گئی تاکہ خواندگانِ کرام ان اشعار سے بھی بہتر طریق پر بصیرت اندوز ہو سکیں۔

ان چند خصوصیات کا سرسری ذکر کر دینے کے بعد یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں، دیوانِ غالب کی شرح کا اصل مدعا یہی نہیں کہ ایک جلیل القدر شاعر کا کلام بخوبی سمجھ لیا جائے۔ غالب در اصل اردو شاعری کو جدید اسلوب پہ لانے کا ذمہ دار تھا۔ اسے قدیم و جدید کے درمیان ایک برزخ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس نے ندرت افروزِ فکر و بیان سے اردو زبان کو ایسا پیرایہ دے دیا جس سے اس میں حسنِ اسالیب کے علاوہ دقیق حکیمانہ، فلسفیانہ اور دوسرے نکات و مطالب بے تکلف پیش کرنے کی صلاحیت نمایاں ہو گئی۔ اس کا مطالعہ ہماری قومی زبان کے ممکنات ارتقا سے استفادے کا ایک اہم جزو ہے، جسے میں بہترین ذریعہ سمجھتا ہوں۔ خواندگانِ کرام یہ نکتہ ملحوظ رکھیں گے تو توقع ہے کہ اس کی گزارشات رائیگاں نہ جائیں گی اور جن خوشگوار امیدوں کی بنا پر ناچیز علم و فہم کے مطابق یہ کام انجام دیا گیا ہے، وہ گلدستۂ طاقِ نسیاں نہ بنیں گی۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کاوِ کاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیئے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

۱۔ **لغات۔ نقش** : لکھنا، نقش و نگار کرنا، بیل بوٹے بنانا، نشان، تعویذ، تصویر یہاں آخری معنی میں استعمال ہُوا ہے۔

کاغذی پیرہن : کاغذی لباس، جو زمانۂ قدیم کے ایران میں دادخواہ پہن لیتے تھے۔ مرزا غالب نے لکھا ہے: "ایران میں رسم ہے کہ دادخواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے، جیسے مشعل دن کو جلانا یا خون آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا کر لے جانا" شعرائے ایران کے کلام سے اس رسم کی تصدیق ہوتی ہے۔

شرح : خود مرزا اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "شاعر خیال کرتا ہے، نقش کس کی شوخیِ تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورتِ تصویر ہے اس کا پیرہن کاغذی ہے۔ یعنی ہستی اگرچہ مثلِ تصاویر اعتبارِ محض ہو موجبِ رنج و ملال و آزار ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی وجودِ حقیقی یعنی خدا سے علیحدگی اور جدائی کا باعث ہوئی۔ جدائی سے پیشتر معرفت کی جو دولت و لذت حاصل تھی، وہ باقی نہ رہی۔ روحیں پیدا کی گئی تھیں اور ان سے پوچھا گیا تھا: الستُ بربکم کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ تو سب کی فطرت سے ایک صدا بلند ہوئی یعنی بلیٰ بیشک تو ہی ہمارا پروردگار ہے۔ دنیا کے بکھیڑوں سے سابقہ پڑا تو وجودِ حقیقی سے قرب کی یہ کیفیت بھی جاتی رہی اور بندگی کے اقرار کا حق بھی ادا نہ ہو سکا۔ اسی حالت درد و غم نے ہستی کو فریاد پر مجبور کر دیا۔ درد و غم کے دو سبب ہوئے: اوّل وجودِ حقیقی سے جدائی، دوم اس کے حکموں کی تعمیل میں کوتاہی۔ شاعر کہتا ہے کہ ہر

نقش کسی کی شوخیِ تحریر کا فریادی ہے جس کے باعث ہر تصویر نے کاغذی لباس پہن لیا ہے؛ ہستی کو تصویر اس لیے کہا کہ اس کا وجود حقیقی نہیں، غیر حقیقی اور اعتباری ہے، مگر اعتباری اور عارضی ہونے کے باوجود وہ اتنے رنج و ملال کا باعث ہوئی کہ ہر ہستی سراپا فریاد بن گئی۔

۲۔ **لغات۔ کاوِ کاو** : فارسی مصدر کاویدن سے ہے، جس کے معنی ہیں کھودنا، کاوش، خلش، سخت محنت، رنج۔

سخت جانی : مدد رپہ جفاکشی، ہر قسم کی سختیاں برداشت کرنا۔

جُوئے شیر : عام روایت کے مطابق وہ نہر؛ جو فرہاد نے بے ستون پہاڑ کاٹ کر بنائی تھی تاکہ شیریں کے باغ تک پانی پہنچ جائے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ حقیقۃً دودھ کی نہر تھی۔ پہاڑوں پر سے جتنی ندیاں نیچے اُترتی ہیں، ان کے پانی کا رنگ دُور سے عموماً سفید نظر آتا ہے، کیونکہ پانی پتھروں سے ٹکراتا ہوا آتا ہے اور اس میں جھاگ اٹھتے ہیں۔ لہٰذا وہ بہ لحاظ منظر جوئے شیر مشہور ہو گئی۔

شرح : جدائی کی حالت میں جن جن کاوشوں، کاہشوں اور مشقتوں کا میں تختۂ مشق بنا ہوا ہوں، ان کا حال کچھ نہ پوچھو۔ نہ میں بیان کر سکتا ہوں، نہ سخت جانی کے باعث دم نکلتا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ رات گزارنا اور شام کا صبح کرنا اتنا ہی دُشوار ہے، جتنا فرہاد کے لیے بے ستون کو کاٹ کر جوئے شیر لانا دشوار تھا۔

اس شعر میں شاعر نے بہ حالتِ جدائی اپنی سخت جانی کو پہاڑ سے اور شام کے صُبح کرنے کو جُوئے شیر سے تشبیہ دی ہے۔

۳۔ **لغات۔ شوق** : یہاں اس سے مراد ہے شوقِ قتل۔

دَم : سانس، دمِ شمشیر سے مراد تلوار کی دھار ہے۔

شرح : میرے شوقِ قتل کا جذبہ، جو اختیار سے باہر ہے، دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی کا یہ کرشمہ ہے کہ تلوار کا دم یعنی اس کی دھار کھچ کر سینے سے باہر نکل آئی ہے۔ چونکہ تلوار میں ایک گونہ جھکاؤ ہوتا ہے، اس لیے شاعر نے کہا کہ اس کی دھار (دم)

کھچ کر سینے سے باہر نکل آئی ہے۔ اِس میں لطف یہ ہے کہ لفظ دَم کے دونوں معنی شاعر کے پیشِ نظر رہے۔ عام سانس سینے کے اندر ہوتے ہیں، لیکن شوقِ قتل کا جذبہ تلوار کی دھار (دم) کھینچ کر سینے سے باہر لے آیا۔

۴۔ **لغات** ۔ آگہی یعنی آگاہی : شعور، عقل، علم، واقفیت، باخبری۔
عنقا : ایک فرضی اور خیالی پرندہ۔ کہتے ہیں، اس کی گردن لمبی ہونے کے باعث یہ نام رکھا گیا ہے۔ نام موجود ہے، پرندہ ناپید ہے اس سے مراد ہے ناپید اور گم۔

شرح : آگہی یعنی عقل و علم ہمارا مقصد بھانپنے کے لیے سماعت کے کتنے ہی جال پھیلا دیں، مگر وہ ہمارے مفہوم و مطالب کو بھانپ نہیں سکتے۔ یعنی ہم جو کچھ کہتے ہیں اس کا مفہوم و مطلب بلند ہے۔ اُسے عنقا کی طرح ناپید کہنا بھی نامناسب نہ ہوگا۔
شاعر کا یہ مطلب نہیں کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں، اس کا مطلب کچھ نہیں۔ مقصود یہ ہے کہ ہمارا مطلب اتنا دقیق اور نازک ہوتا ہے کہ اس تک عام علم و عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی۔

مرزا نے فارسی میں بھی اس مضمون کا ایک شعر کہا ہے۔

ما ہمائے گرم پروازیم، فیض از ما مجو
سایہ ہمچوں دود بالا می رود از بالِ ما

یعنی ہم تیز اُڑنے والے ہما ہیں اور ہماری پرواز میں اس قدر گرمی ہے کہ سایہ بھی زمین پر نہیں پڑتا، بلکہ دھواں بن کر اُوپر نکل جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص ہم سے فیض حاصل کرنا چاہے، اُسے بلندی پر آنا چاہیئے۔ اپنی جگہ بیٹھ کر ہمارے نیچے اُترنے کا انتظار نہ کرنا چاہیے۔

۵۔ **لغات** ۔ بسکہ : چونکہ۔
آتش زیرِ پا : لفظی معنی، جس کے پاؤں کے نیچے آگ ہو، محاورہ، مضطرب و بے قرار۔
مُوئے آتش دیدہ : بال، جسے آگ نے چھوا ہو۔ ایسا بال بَل کھا کر

حلقے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

شرح: اے غالب! میں قید میں بھی بے قرار ہوں اور جو زنجیر میرے پاؤں میں ڈالی گئی ہے، اس کی ہر کڑی میرے آتش زیرِ پا ہونے کے باعث اُس بال کی سی ہو گئی ہے، جسے آگ چھو گئی ہو، یعنی بالکل کمزور ہے اور میری بے قراری کو روک نہیں سکتی۔

شاعر کی مراد یہ ہے کہ اگرچہ دنیا سے تعلق کی زنجیر میرے پاؤں میں پڑی ہوئی ہے، لیکن میرا عشقِ ربانی اِس قدر پُختہ ہے کہ وہ زنجیر مجھے حقیقی راستے سے روک نہیں سکتی۔

○

جُز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار — صحرا، مگر بہ تنگیِ چشمِ حسُود تھا

آشفتگی نے نقشِ سُوَیدا کیا درست — ظاہر ہُوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ — جب آنکھ کھُل گئی نہ زیاں تھا نہ سُود تھا

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز — لیکن یہی کہ "رفت" گیا اور "بود" تھا

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی — میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجُود تھا

تیشے بغیر مر نہ سکا، کوہکن اَسَدؔ! — سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

ا۔ **لغات۔ قیس:** مشہور عاشق مجنوں کا اصل نام، جو نجد کے قبیلۂ عامر سے تھا اور لیلیٰ کے ساتھ محبت کے باعث عالمگیر شہرت پائی۔ عام روایات کے مطابق اس کی ساری عمر بیابان کی خاک چھاننے میں بسر ہوئی۔

بروئے کار آنا: نمایاں ہونا۔ بر سرِ کار آنا۔

حَسُود : (ح پر زبر، سین پر پیش) بہت حسد کرنے والا۔ زیر غور شعر میں یہی لفظ استعمال ہُوا ہے۔

حُسُود : (ح پر پیش، سین پر پیش) اوّل مصدر بہ معنی حسد کرنا، دوم حاسد کی جمع

شرح : عمریں گزر گئیں، قیس کے سوا کسی دوسرے آدمی نے جنونِ عشق میں نمایاں حیثیت حاصل نہ کی اور اس کی طرح صحرا گردی میں عمر نہ گزاری۔ اس سے معلوم ہُوا کہ صحرا بھی وسعت کے باوجود بہت حسد کرنے والے شخص کی آنکھ کی طرح تنگ تھا۔

چشمِ حاسد کی تنگی اس لیے مشہور ہوئی کہ وہ اپنے سوا ہر شخص کی نعمت کا زوال چاہتا ہے، کسی کو پھولتا پھلتا دیکھنا اسے گوارا نہیں ہوتا۔ شاعر کہتا ہے کہ صحرا دیکھنے میں کتنا ہی وسیع اور کشادہ کیوں نہ ہو، لیکن جب ہم یہ حقیقت پیشِ نظر رکھتے ہیں کہ قیس کے سوا کوئی اور فرد جنونِ عشق کی سرگشتگی میں صحرا کے اندر نہ پہنچ سکا تو معلوم ہُوا کہ صحرا چشمِ حاسد کی طرح تنگ ہے۔ یعنی وہاں کسی دوسرے کو قدم رکھنے کے لیے جگہ نہ مل سکی۔

۲۔ لغات۔ آشفتگی : پریشانی۔

سُوَیدا : دل کا سیاہ نقطہ۔ اَسوَد کی تانیث ہے۔ شاعر نے پریشانی اور آشفتگی کو دھوئیں سے، دل کے سیاہ نقطے کو داغ سے تشبیہ دی ہے۔

شرح : عشق کی پریشانی کے باعث دل سے آہ و فغاں کا دھواں اٹھتا رہتا تھا۔ اسی دھوئیں سے دل کے سیاہ نقطے کی صورت قائم ہو گئی۔ معلوم ہے جس مقام پر دھوآں مسلسل لگتا رہے، وہاں سیاہی پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعر کے نزدیک دل کے نقطے یعنی سویدا کی سیاہی آہ و فغاں کے اسی دھوئیں کا کرشمہ تھی، جو عشق کی پریشانی و آشفتگی میں مسلسل اٹھتا رہتا ہے۔ اسی صورتِ حال پر شاعر نے اپنا عام مشاہدہ چسپاں کر دیا یعنی یہ کہ داغ کا اصل سرمایہ اور راس المال صرف دھوآں ہوتا ہے کیونکہ جس جگہ دھوآں مسلسل لگتا رہے وہ سیاہ ہو جاتی ہے۔

۲۔ شرح : اے محبوب! عالمِ بیداری میں تو تیرے ساتھ عشق و محبت کے معاملے کی کوئی صورت نہیں۔ البتہ تو خواب میں آ جاتا ہے تو خیال تجھ سے معاملے کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ مثلاً کبھی اپنے شوق کی فراوانی پیش کر دی۔ کبھی عرض کر دیا کہ سچے جانبازوں سے بے تعلق نہ رہنا چاہیئے۔ کبھی شوقِ وصل کا اظہار کر دیا۔ محبوب عالمِ خواب میں ایسی کسی گزارش پر متوجہ نہیں ہوتا۔ پھر آنکھ کھل جاتی ہے اور خواب کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے تو شاعر پر واضح ہوتا ہے کہ نفع اور نقصان یا سود و زیاں کی جو بات چیت ہو رہی تھی، وہ تو خواب و خیال کی حیثیت رکھتی تھی۔ عالمِ بیداری میں تو کوئی معاملہ ہی پیش نہ آیا، لہٰذا سود و زیاں کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محبوب کے ساتھ جو معاملے پیش آئے اور عیش و راحت یا رنج و ملال کے جن واقعات سے سابقہ پڑا، ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ عالمِ خواب میں خیال کے کرشمے تھے۔ جب آنکھ کھل گئی تو عیش و راحت اور رنج و ملال یعنی سود و زیاں میں سے کچھ بھی نہ رہا۔ کیونکہ خواب کی تمام باتوں کا اثر آنکھ کھلتے ہی زائل ہو جاتا ہے۔

۳۔ شرح : میں غمِ دل یعنی عشق کے مکتب میں ابھی پڑھنے لگا ہوں اور میرا سبق بالکل ابتدائی حالت میں ہے، یعنی ابھی تک رفت (گیا)، اور بود (تھا) یاد کر رہا ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ عشق کی درس گاہ میں ابھی مبتدی اور نوآموز ہوں۔ قدم آگے بڑھے گا اور تعلیم کے ابتدائی درجوں سے ترقی کرتا ہوا اوپر کے درجوں میں پہنچوں گا تو خدا جانے کیا کیفیت رونما ہو گی۔

عشق کی ابتدائی حالت کے متعلق عرفیؔ نے بھی ایک نہایت عمدہ شعر کہا ہے:

عشق می خوانم و می گریم زار
طفلِ نادانم و اوّل سبق است

یعنی میں عشق کا درس لے رہا ہوں اور زار زار رو رہا ہوں۔ گویا میں نا سمجھ بچہ

ہوں اور یہ میرا پہلا سبق ہے۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ چھوٹے بچوں کو آزاد پھرتے پھرتے مکتب میں بٹھا دیا جائے اور وہ پابند ہو جائیں تو پڑھتے پڑھتے رونا شروع کر دیتے ہیں۔

غالب اور عرفی دونوں نے عشق کی ابتدائی کیفیت پیش کرنے کے لیئے درسگاہ سے مثالیں لیں، لیکن اس کے سوا دونوں شعروں میں کوئی یکسانی نہیں۔ عرفی کے شعر سے واضح ہوتا ہے کہ اس نے جو پہلا سبق پڑھا، وہ عشق کا تھا۔ غالب اپنے عشق کی صرف ابتدائی کیفیت پیش کر رہا ہے۔

۵۔ لغات۔ ننگ وجود: ہستی کے لیے ننگ و عار کا باعث۔

شرح: مجھ سے برہنہ ہونے کے جتنے عیب تھے، ان سب کا داغ کفن نے ڈھانپ لیا، ورنہ میری حالت یہ تھی کہ کوئی بھی لباس پہن لیتا، ہستی اور انسانیت کے لیے شرم اور ننگ و عار کا باعث تھا۔

برہنگی کا مطلب ہے اخلاقی محاسن اور انسانی شرف کے اوصاف سے خالی ہونا۔ لباس اس لیے پہنا جاتا ہے کہ انسان برہنہ نظر نہ آئے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں اعلیٰ اوصاف سے عاری ہونے کے باعث اپنے وجود یعنی ہستی اور انسانیت کے لیے باعثِ شرم ہو گیا۔ کوئی بھی لباس اختیار کرتا، برہنہ ہونے کے عیب چھپ نہ سکتے۔ زندگی اسی حالت میں گزر گئی۔ آخر موت آئی اور مجھے کفن پہنایا گیا تو اس سے وہ عیب قطعاً نہیں چھپ سکتے تھے۔ جو زندگی میں شرفِ انسانیت سے محرومی کے باعث مجھ پر لگے، البتہ صرف برہنہ ہونے کا داغ کفن نے ڈھانپ لیا۔

اس شعر سے خیال قرآن مجید کی اس آیت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، جس میں فرمایا گیا ہے: "اے اولادِ آدم! ہم نے تمہارے لیے ایسا لباس مہیا کر دیا، جو جسم کی ستر پوشی کرتا ہے اور ایسی چیزیں بھی دے دیں، جو زیب و زینت کا ذریعہ ہیں۔ نیز پرہیزگاری کی راہ دکھا دی کہ تمام لباسوں سے بہتر لباس ہے (سورۂ اعراف)

گویا خدا نے انسان کے لیے جسمانی لباس کے علاوہ ایک باطنی پوشاک بھی دے دی، جو اخلاق و سیرت کے عیبوں کو ڈھانک سکتی ہے۔ یہ تقویٰ اور پرہیزگاری کی

پوشاک ہے جس کے بغیر انسان ہر دائرے میں زندگی اور انسانیت کے لیے باعثِ ننگ ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جب میں پرہیزگاری کا لباس اختیار نہ کر سکا تو میری ہستی باعثِ ننگ رہی اور میں انسانی شرف کا اہل نہ رہا۔ یہ حالت میری موت پر ختم ہوئی۔

۶۔ **لغات۔ کوہکن** : لغوی معنی، پہاڑ کاٹنے والا۔ فرہاد کا لقب جس نے پہاڑ کاٹ کر نہر شیریں کے باغ تک پہنچائی تھی۔ قصہ مشہور ہے کہ فرہاد کو شیریں سے دُور رکھنے کے لیے کہا گیا تھا کہ پہاڑ کاٹ کر نہر لے آؤ گے تو شیریں تمہیں مل جائے گی۔ خیال یہ تھا کہ نہ پہاڑ کٹے گا اور نہ شرط پوری کرنے کی نوبت آئے گی۔ فرہاد نے نہر نکال لی تو اس کے پاس ایک بڑھیا کو یہ پیغام دے کر بھیجا گیا کہ شیریں مر گئی۔ فرہاد نے یہ سنا تو تیشہ ہاتھ میں تھا، وہی سر پر مارا اور مر گیا۔ مرزا غالب نے دوسری جگہ کہا ہے :

دی سادگی سے جان، پڑوں کوہکن کے پاؤں
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں

سرگشتہ : لغوی معنی، جس کا سر پھر گیا ہو، یعنی حیران و پریشان

خمار : نشے کے اُتار کی کیفیت۔ اس میں نشہ پینے والے پر بے لطفی اور اعضا شکنی سی طاری ہو جاتی ہے۔

رسم و قیود : رسم اور قید کی جمع، یعنی رسمیں اور پابندیاں۔

شرح : اے اسدؔ! فرہاد تیشے کے بغیر جان نہ دے سکا۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ دنیوی رسم و رواج کی پابندیوں کے خمار میں حیران و پریشان تھا۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ عشق صادق و کامل ہو تو عاشق کے لیے مرنے کے اسباب تلاش کرنے کی ضرورت نہیں جیسے فرہاد نے خودکشی کے لیے تیشہ استعمال کیا۔ یہ رسم کی پابندی تھی حالانکہ ایسی پابندی عشق کامل کی آزادگی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی تیشہ مار کر ہر شخص مر سکتا ہے، اس میں فرہاد کے عشق نے کیا کمال دکھایا؟

کمال یہ تھا کہ وہ ایسی کسی چیز کا روادار نہ ہوتا، مثلاً ایک آہ سرد کھینچتا اور جان دے دیتا۔ افسوس کہ اس نے انتظار کیا، ایک بڑھیا شیریں کی موت کی جھوٹی خبر لائے۔ وہ سُنے، پھر تیشہ مار کر اپنے آپ کو ہلاک کرے۔

○

کہتے ہو نہ دینگے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجیے ہم نے مدّعا پایا

۱۔ شرح: اے محبوب! تم کہتے ہو کہ تیرا دل کہیں پڑا پائیں گے تو واپس نہ دیں گے، لیکن ہمارے پاس دل ہے ہی کہاں کہ گم ہو۔ وہ تو ہم پہلے ہی دے چکے ہیں، البتہ آپ کی اس بات کا مطلب ہم سمجھ گئے، یعنی یہ کہ ہمارا دل تمھارے پاس ہے اور ہمارا مدّعا بھی یہی ہے کہ تمھارے ہی پاس رہے۔

دو بے تکلّف دوستوں میں سے کسی کی چیز گم ہو جائے اور دوسرے کے ہاتھ آ جائے تو وہ اسے چھپائے رکھتا ہے اور مالک سے کہتا ہے کہ اگر وہ چیز ہمیں مل گئی تو ہرگز واپس نہ دیں گے۔ اسی عام معمول سے غالب نے ایک پُرلطف مضمون پیدا کر لیا۔

"ہم نے مدّعا پایا" کے دو مطلب ہیں اوّل یہ کہ ہم نے تمھارا مطلب سمجھ لیا یعنی دل تمھارے پاس ہے دوم یہ کہ دل کا تمھارے پاس رہنا ہمارا اصل مقصد تھا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی دردِ بے دوا پایا

دوست دارِ دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

سادگی و پُرکاری بیخودی و ہشیاری
حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

غُنچہ پھر لگا کِھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہُوا دیکھا گم کیا ہوُا پایا

حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈھا تم نے بارہا پایا

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

وہ مقصد ہم نے پا لیا۔

۲۔ **شرح** : زندگی بے کیف اور بے لطف ہی نہیں ، طرح طرح کی تکلیفوں اور دکھوں سے بھری ہوئی تھی۔ عشق آیا اور اس نے زندگی میں خاص لذت و کیفیت پیدا کر دی جس سے تمام درد اور دکھ مٹ گئے، کیونکہ عشق ان کے لیے دوا بن گیا ، لیکن خود عشق ایسا درد ہے ، جس کی کوئی دوا نہیں۔

زندگی کے بے کیف اور بے مزہ ہونے کا سبب بظاہر یہ ہے کہ کسی شے سے کوئی دلبستگی نہ تھی۔ بشتم پشتم دن گزر رہے تھے۔ عشق نے خاص دلبستگی پیدا کر کے زندگی کو پر مزہ بنا دیا۔

یہ حقیقت محتاج تشریح نہیں کہ زندگی گوناگوں آرزوؤں سے لبریز ہوتی ہے کوئی آرزو ایسی نہیں ، جسے پورا کرنے کے لیے محنت و مشقت سے کام نہ لینا پڑے محنت و مشقت کے بعد بھی بعض آرزوئیں پوری ہوتی ہیں ، بعض نہیں ہوتیں گویا ان آرزوؤں کے باعث زندگی دکھ درد کا مرقع بن جاتی ہے۔ عشق آیا تو تمام دکھ مٹا دیئے۔ بہر حال عشق ہی زندگی میں لطف اور کیفیت پیدا کرتا ہے اور تمام دکھوں کا وہی علاج ہے لیکن خود اس کی دوا نہیں۔

بعض اصحاب نے یہ شعر ظہوری کے اس مطلع سے وابستہ کر دیا ہے :

شد طبیب ما محبت منتش بر جانِ ما
محنتِ ما راحتِ ما دردِ ما درمانِ ما

یعنی محبت نے ہمارے لیے طبیب کا کام دیا۔ ہماری جان پر اس کا احسان ہے۔ ہمارا غم خوشی میں بدل گیا اور ہمارے دکھ کا علاج ہاتھ آ گیا۔ سرسری نظر سے بھی واضح ہو سکتا ہے کہ غالب اور ظہوری کے شعروں کا مفہوم ایک نہیں۔ اسلوب بیان اور معنویت کے اعتبار سے مرزا غالب کا شعر زیادہ بلند ہے۔

۳۔ **شرح** : جس سے ہم محبت کرتے ہیں ، وہ ہماری جان کا دشمن بنا ہوا ہے

اور دل بھی ہمارا ساتھ چھوڑ کر اسی کا دوست بن گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اب اس پر کیا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ دشمن سے دل کی دوستی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے جتنی آہیں کیں، وہ کوئی اثر پیدا نہ کر سکیں اور جتنے نالے کھینچے، وہ مقصد پر نہ پہنچ سکے۔

اِس شعر میں مرزا نے نہایت پرلطف طریق پر اپنے عشق کی کیفیت بیان کر دی۔ عشق کا مرکز دل ہوتا ہے۔ وہ محبوب کے ساتھ ہے۔ مرزا اپنے آپ کو ایک الگ شخص فرض کر کے آہ و فغاں کی بے اثری کا یہ سبب بتاتے ہیں کہ جب دل ہی ساتھ نہیں تو میرے رونے دھونے سے کیا حاصل ہو سکتا ہے

۴۔ **لغات**۔ پرکاری : ہوشیاری۔

بیخودی : اپنے آپ میں نہ رہنا، یعنی ہوش میں نہ رہنا۔ بے خبری۔ زیرِ نظر شعر میں اس سے مراد تجاہل یعنی جان بوجھ کر انجان بننا ہے۔

جرأت آزما : حوصلے اور ہمت کا امتحان لینے والا۔

شرح : حسین بظاہر بڑے سادہ اور بھولے بھالے نظر آتے ہیں، لیکن اصل میں بہت ہوشیار اور چالاک ہیں۔ وہ کبھی کبھی جان بوجھ کر انجان بن جاتے ہیں اور بے پروائی سی اختیار کر لیتے ہیں، مگر اس حالت میں بھی ہوشیاری اور خبرداری ترک نہیں کرتے۔ بھولے بن جانے سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دیکھیں، جو لوگ عشق کے مدعی ہیں، ان کے حوصلے اور ہمت کا کیا حال ہے۔ صبر و استقلال کی کیا کیفیت ہے۔ آیا وہ ہماری سادگی سے فائدہ اٹھا کر کسی گستاخی پر تو نہیں اُتر آتے؛ گویا ان کی سادگی اور تجاہل سے مقصود عشاق کی آزمائش ہوتی ہے۔

۵۔ **شرح**۔ بہار آگئی اور کلیاں کھلنے لگیں۔ یہ کیفیت دیکھتے ہی ہمیں اپنا دل یاد آگیا، جو اسی طرح خون ہوا تھا جس طرح گل کھل کر سرخی کے باعث سراپا خون نظر آتی ہے۔ نیز ہم نے اپنا دل پا لیا، جو کھو گیا تھا۔

۶۔ **شرح** : ہمیں دل کا حال کچھ معلوم نہیں، صرف اِتنا جانتے ہیں کہ ہم اسے برابر ڈھونڈتے رہے اور کبھی نہ پایا۔ تم نے اے محبوب! ڈھونڈے بغیر

اسے ہمیشہ پا لیا۔

مطلب یہ کہ ہمارا دل جب سے آپ کے قبضے میں آیا، ہمیں کبھی نہ ملا اور آپ اس پر برابر قابض رہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ دل کو محبوب کے پاس رہنے کا انتہائی شوق ہے۔ جب اسے ڈھونڈا جائے، وہ معشوق ہی کو ملتا ہے۔ عاشق کو نہیں ملتا۔

۷۔ **شرح** : ناصح نے ترکِ عشق کی نصیحت کر کے ہمارے زخم پر نمک چھڑک دیا۔ یعنی ہمیں حد درجہ دُکھ پہنچایا، کیونکہ ہم سے ترکِ عشق ہو ہی نہیں سکتا۔ اس سے پوچھنا چاہیئے کہ ایسی نصیحت کر کے تمہیں کیا مزہ ملا؟

شور اور نمک کی مناسبت کسی تشریح کی محتاج نہیں، اگرچہ شعر میں شور سے مراد یہ ہے کہ ناصح نے نصیحت بڑے زور شور سے اور ہنگامہ آرائی کے انداز میں کی۔

○

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

عرض کیجیے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

۱۔ **لغات** ۔ بے محابا : بے تکلف بے خوف، بے دھڑک۔

آتشِ خاموش : دبی ہوئی آگ جو بظاہر بجھی ہوئی معلوم ہو، لیکن اندر اندر جل رہی ہو۔

شرح : میرا دل اُس سوز سے جل گیا، جو اندر ہی اندر اپنا کام کر رہا ہے۔ سمجھنا چاہیئے کہ وہ اُس آگ کی طرح جل گیا، جو بظاہر راکھ معلوم ہوتی ہے، لیکن اندر اندر برابر جلتی رہتی ہے۔ "خاموش" اور "گویا" کی مناسبت ظاہر ہے۔

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کار فرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

عشق کی آگ کا یہی طریقہ ہے کہ عاشق صبر و ضبط سے کام لیتا ہے اور آگ خفیہ خفیہ اس کا دل جلاتی رہتی ہے۔

۲۔ شرح : دل میں وصل کا شوق اور محبوب کی یاد تک باقی نہ رہی۔ یہی اس کی سب سے بڑھ کر قیمتی اور عزیز متاع تھی۔ گویا اس گھر میں ایسی آگ لگی کہ جو کچھ بھی اس میں تھا، سارے کا سارا جل کر بھسم ہو گیا۔

کہا جا سکتا ہے کہ وہ عشق کیا ہوا، جس میں محبوب کی یاد اور وصل کا شوق بھی سلامت نہ بچا۔ معلوم ہے کہ یہ دونوں چیزیں عشق کا مرکز اور نصب العین ہیں۔ اس سلسلے میں شعر کی دو تاویلیں ہو سکتی ہیں : اوّل نفسِ عشق کی فراوانی نے دل میں اتنا غلبہ حاصل کر لیا کہ محبوب کی یاد اور وصل کے شوق کے لیے گنجائش ہی باقی نہ رہی گویا دل سراپا عشق بن گیا۔ دوسرا پہلو یہ ہو سکتا ہے کہ محبوب کی مسلسل بے اعتنائی اور سنگ دلی سے عاشق کی مایوسی و ناامیدی آخری حد تک پہنچ گئی، جس کے بیان کے لیے عاشق کو زیادہ مؤثر صورت یہی نظر آئی کہ جو چیزیں عشق کی جان تھیں انھیں بھی موہوم قرار دے لے۔ وہ کہنا یہ چاہتا ہے کہ مایوسی ایسی صورت اختیار کر چکی ہے، جس کے پیشِ نظر ذوقِ وصل اور یادِ یار کا وجود ہی محلِ نظر رہ گیا ہے۔

۳۔ شرح : میں عدم سے بھی آگے نکل گیا، یعنی اس درجہ معدوم ہو گیا کہ عدم بھی میرے مقام کے تعلق میں وجود کی حیثیت رکھتا ہے، ورنہ جب تک عدم یعنی عالمِ فنا میں تھا تو بارہا ایسا ہوا کہ میرے دل میں آگ برسانے والی جو آہ اٹھتی تھی، اس سے عنقا کے پر جل جاتے تھے۔

کہا گیا ہے کہ غالبؔ کے اس شعر کا مضمون بیدلؔ کے مندرجہ ذیل شعر سے ملتا جلتا ہے :

ہمچو عنقا بے نیازِ عرضِ ایجادیم ما
یعنی آں سُوئے عدم یک عالم آبادیم ما

اس کا ترجمہ یہ ہے : ہم عنقا کی طرح اپنی ایجاد یعنی وجود پذیری کو پیش کرنے سے بے پروا ہیں۔ ہم عدم سے آگے رہتے ہیں اور بجائے خود ایک آباد دنیا ہیں۔ ظاہر ہے کہ دونوں شعروں میں اس کے سوا اشتراک کا کوئی پہلو نہیں کہ غالب کی طرح بیدل کے شعر میں بھی عنقا اور عدم کے لفظ آئے ہیں۔

۴۔ **لغات۔ جوہرِ اندیشہ** : سوچ بچار اور غور و فکر کا جوہر۔ جوہر اس چیز کو کہتے ہیں، جو قائم بالذات ہو۔ اس سے مراد مادّے کا وہ ذرّہ لیتے ہیں، جس کا تجزیہ نہ ہو سکے، اسی لیے اسے جزو لایتجزیٰ کہتے تھے، لیکن معلوم ہے کہ یہ نظریہ مدت ہوئی غلط ثابت ہو چکا ہے اور اب جوہر یعنی اٹم کا تجزیہ کر کے ایسی قوت دریافت کر لی گئی ہے جسے بے پناہ مانا جاتا ہے۔ عجیب امر یہ ہے کہ غالب نے اس شعر میں جوہر کا یہی پہلو پیشِ نظر رکھا ہے۔

شرح : میں سوچ بچار اور غور و فکر کے جوہر کی گرمی کہاں ظاہر کروں؟ کس مقام پر دکھاؤں؟ کیونکر معرضِ بیان میں لاؤں؟ صورتِ حال یہ ہے کہ وحشت کا خیال آتے ہی صحرا جل کر خاک ہو گیا۔ وحشت میں صحرا گردی ہی پیشِ نظر تھی، مگر صحرا جوہرِ اندیشہ کی گرمی کا تصور بھی برداشت نہ کر سکا۔

آج جوہر یعنی ایٹم کی قوت مرزا کے اس بیان کی تصدیق کر رہی ہے یعنی وہ اتنی ہولناک ہے کہ کوئی شے اس کا تصور بھی دماغ میں لے آئے تو جل کر خاکستر ہو جائے۔

۵۔ **لغات۔ چراغاں** : بہت سے چراغ، لیکن اس لفظ کو چراغ کی جمع نہ سمجھنا چاہیے۔

کارفرما : حاکم، دوسروں سے کام لینے والا۔

شرح : میرے پاس دل ہی نہیں رہا، ورنہ تمھیں دکھاتا کہ سینے کے داغوں کی بہار کا کیا رنگ ہے۔ میں کیا کروں، داغوں کے ان بے شمار چراغوں کا انتظام

کرنے والا اور ان سے کام لینے والا ہی باقی نہیں رہا۔

شعر میں سینے کے داغوں کو چراغاں سے تشبیہ دی ہے اور دل کو اس چراغاں کا منتظم و کار فرما بتایا ہے۔

۲۔ **لغات**۔ افسردگی: پژمردگی، دل بجھ جانا۔

تپاک۔ محبت کی گرم جوشی۔ اضطراب۔ بے قراری۔ یہاں "طرزِ تپاک" سے مراد اہل دنیا کی منافقت اور ریاکاری ہے، جس کی وجہ سے دل بجھ گیا۔

شرح: اہل دنیا کا ریاکارانہ برتاؤ دیکھ کر دل اس طرح جل بجھا ہے کہ اے غالبؔ! تمام آرزوئیں اور تمنائیں ختم ہو گئی ہیں۔ صرف افسردگی و پژمردگی کی آرزو باقی رہ گئی ہے۔

افسردگی اور تپاک کی مناسبت محتاجِ بیان نہیں۔

○

شوق، ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی، یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پَر افشاں نکلا

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

۱۔ **لغات**۔ شوق: عشق۔

ہر رنگ: ہر حال اور ہر صورت میں۔ بہر طور۔

رقیب: دشمن۔ مخالف۔

شرح:۔ اس شعر کی شرح خود مرزا غالب نے اپنے شاگرد عبدالرزاق شاکر وکیل گورکھپور کو یوں لکھی تھی:

"رقیب یعنی مخالف یعنی شوق سر و سامان کا دشمن ہے۔ دلیل یہ ہے کہ قیس جو زندگی میں ننگا

دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد
کام یاروں کا، بقدرِ لب و دنداں نکلا

ہی تھا تصویر کے پردے میں بھی ننگا ہی رہا۔ لطف
یہ ہے کہ مجنوں کی تصویر بناتے ہیں

اب اس کی تصویر بناتے ہیں تو اس میں بھی اس دیوانے کو برہنہ ہی پیش کرتے ہیں۔
رنگ، تصویر، پردے اور عریاں کی مناسبت واضح ہے۔

۲۔ **لغات** ۔ داد نہ دینا : زائل نہ کرنا۔
پَر افشاں : پَر جھاڑتا ہُوا۔ تیر کی نوک یعنی پیکان کے دونوں جانب پر سے
لگے ہوتے تھے تاکہ تیر کمان سے نکلتے ہی سیدھا نشانے پر جا بیٹھے۔

شرح : اس شعر کی شرح کرتے ہوئے غالبؔ شاکرؔ کو لکھتے ہیں :
"یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت سے نکالی ہے، جیسا کہ اس شعر میں :

نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے

یعنی زخمِ تیر کی توہین بہ سبب ایک رخنہ ہونے کے اور تلوار کے زخم کی
تحسین بہ سبب ایک طاق سا کھل جانے کے۔" زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل
کی" یعنی زائل نہ کیا تنگی کو۔ پرافشاں، بہ معنی بیتاب اور یہ لفظ تیر کے
مناسبِ حال ہے۔ معنی یہ کہ تیر تنگیٔ دل کی داد کیا دیتا، وہ تو خود
ضیقِ مقام سے گھبرا کر پرافشاں اور سراسیمہ نکل گیا۔

تیر کا زخم اتنا معمولی تھا کہ اس سے دل کی تنگی زائل نہ ہو سکی اور اس میں کوئی
فراخی دکشادگی پیدا نہ ہوئی۔ اس کے برعکس مشاہدہ بتاتا ہے کہ تیر دل کی تنگی کے
باعث سینۂ بسمل سے پھڑکتا ہوا باہر نکل گیا اور جاتے جاتے اس کے پَر بھی جھڑ گئے۔

۳۔ **شرح** :۔ پھول کی خوشبو، دل کی آہ و فغاں اور چراغ کا دھواں۔ ان
میں سے جو بھی چیز تری بزم سے نکلی، آشفتہ و پریشاں ہی نکلی

شاعر نے عشاق کی پریشانی ظاہر کرنے کے لیے تین چیزیں لیں، جو اصلاً مختلف تھیں، لیکن ان میں ایک خاصیت یعنی پریشانی مشترک پائی گئی اور تینوں کو محبوب کی بزم سے خاص تعلق تھا۔ اوّل پھولوں کی خوشبو جس کا خاصہ ہی پریشان ہونا ہے، دوم عشاق کے دل کا نالہ، سوم چراغ کا دھواں۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب کی بزم سے جو بھی چیز نکلتی ہے، یعنی محبوب سے جدا ہوتی ہے، وہ پریشان ہی پائی جاتی ہے۔

بیشک ان تین چیزوں کی خاصیت ہی پریشانی ہے۔ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ مرزا نے شعر میں بزمِ محبوب سے نکلنے کو ان کی پریشانی کا موجب قرار دیا۔

۴۔ **لغات** ۔ **مائدہ** : دسترخوان

شرح : میرا دل حسرت کا مارا ہُوا تھا اس کے دسترخوان پر لذتِ درد کے کھانے چُنے ہوئے تھے۔ دوستوں نے اپنے دانتوں اور لبوں کی حیثیت یعنی اپنی استعداد اور استطاعت کے مطابق ان کھانوں سے فائدہ اٹھایا۔ میرے پاس لذتِ درد کے سامان کی کمی نہ تھی۔ اس میں سے دوستوں نے اپنی اپنی قابلیت کے مطابق استفادہ کیا۔

شاعر یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ میرے اشعار میں غم و درد کے سرمائے کی کوئی کمی نہیں، لیکن ہر فرد پورا سرمایہ نہیں سمیٹ سکتا۔ جس شخص میں جتنی ہمت، قابلیت اور ذوق ہوتا ہے، اسی کے مطابق میرے دسترخوانِ درد سے وہ حصہ پاتا ہے۔ فیض کا دروازہ کسی کے لیے بند نہیں، مگر فیض ہر شخص کو اس کے ظرف کے مطابق ملتا ہے :

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

۵۔ **لغات** ۔ **نوآموز** : جس نے پڑھنا شروع کیا ہو، مبتدی۔
دشوار پسند : جسے مشکل کام پسند ہو۔ یہ کام سے اشارہ کار رفتا کی

طرف ہے۔

شرح :۔ میری ہمت مشکل کاموں کو بہت پسند کرتی تھی۔ اگرچہ اس نے فنا کا سبق نیا نیا پڑھنا شروع کیا تھا، لیکن مصیبت یہ پیش آئی کہ مبتدی اور نوآموز ہونے کے باوجود اسے یہ کام بھی بہت آسان معلوم ہُوا۔

مطلب یہ ہے کہ شاعر نے اپنے لیے فنا کا کام اختیار کیا تھا، جو اس کے نزدیک اس لیے پسندیدہ تھا کہ اس کی ہمت مشکل کاموں ہی کو دلی رغبت سے اختیار کرتی تھی، لیکن یہ حد درجہ کٹھن کام بھی اس کی ہمت کو آسان نظر آیا اور نوآموزی کے باوجود وہ فنا کی منزل طے کر گئی۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ میری ہمت کے لیے، جو فنا کو معمولی سا کام سمجھتی ہے، کوئی ایسا مشغلہ چاہیے، جو فنا سے بھی بدرجہا زیادہ کٹھن ہو۔

اس شعر کے بعض نسخوں میں "تھی" کی جگہ "اسے" اور "ہے" "ہے" جس سے مضمون پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ "تھی" رکھا جائے یا "اسے" یا "ہے" شاعر جس اولوالعزمی کا داعی ہے، وہ تینوں صورتوں میں بدستور واضح رہتی ہے۔

۶۔ **شرح** :۔ اے غالبؔ! میں نے گریہ ضبط کر رکھا تھا اور سمجھتا تھا کہ اس کی حیثیت قطرے جتنی بھی نہیں، لیکن اب از سرِ نو گریے میں جوش و خروش رونما ہُوا تو واضح ہو گیا کہ جسے میں قطرے سے بھی کم سمجھتا تھا، وہ تو یکسر طوفان ہے۔

○

دھمکی میں مر گیا، جو نہ بابِ نبرد تھا	عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا
تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہُوا	اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں	مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

دل تا جگر، کہ ساحلِ دریائے خُوں ہے اب — اس رہ گزر میں جلوۂ گُل، آگے گرد تھا

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی — دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا

احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے — زنداں میں بھی خیال، بیاباں نورد تھا

یہ لاشِ بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے — حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

۱. **لغات** ۔ باب نبرد : جنگ کے لائق، مقابلے کی صلاحیت رکھنے والا، بہادر ۔ جوانمرد ۔

نبرد پیشہ : جنگجو، جس کا پیشہ جنگ ہو۔

شرح : جو شخص بہادر اور مردِ میدان نہ تھا، وہ عشق کی سختیوں اور مصیبتوں کے سیل کا صرف خطرہ دیکھ کر دم توڑ بیٹھا ۔ عشق کا پیشہ ہی جنگ و پیکار ہے ۔ اس کی مصیبتیں اور آفتیں وہی سہہ سکتا ہے، جو مردِ کار ہو، یعنی جس میں زیادہ سے زیادہ ہمت، مردانگی اور مصیبتوں کے مقابلے میں استقلال سے قدم جمانے رکھنے کا جوہر موجود ہو۔ تھُڑ دلے آدمیوں کے لیے سزاوار نہیں کہ وہ میدانِ عشق میں قدم رکھیں ۔

عرفیؔ کا ایک مطلع ہے جس میں بھی یہی حقیقت پیش کی گئی ہے، اگرچہ انداز مختلف ہے :

عشق اگر مرد است، مردے تابِ دیدر آورد
ورنہ چوں موسیٰ بسے آورد و بسیار آورد

۲. **شرح** :- مجھ پر زندگی بھر موت کا خوف طاری رہا اور خوف کے باعث انسان کا رنگ اصل حالت پر نہیں رہتا، اس میں زردی آ جاتی ہے ۔ شاعر کہتا ہے کہ مرنے کے ساتھ چہرے پر جو زردی اور مُردنی چھا جاتی ہے، اس سے پہلے ہی میرا

رنگ زرد ہی تھا، جو موت کے خوف سے پیدا ہوا تھا۔ خوف یہ کہ زندگی جیسی گزارنی چاہیئے تھی، نہ گزری۔ خدا جانے مرنے کے بعد کیا حالت پیش آئے اور کیسی گزرے۔

شعر میں جو لفظی مناسبتیں ہیں، وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں۔

۳۔ لغات۔ تالیف : جمع کرنا۔ ترتیب دینا۔

شرح :۔ جب میرے خیالات کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا اور افکار کے اوراق منتشر تھے۔ یعنی میں طفلی کے عالم میں تھا۔ معلوم ہے کہ طفلی کی حالت میں انسان کے خیالات و افکار اکٹھے نہیں ہوتے، جیسے پختگی کی منزل پر پہنچ جانے کے ساتھ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ میں اس زمانے میں بھی وفا کی کتابیں مرتب کر رہا تھا۔ گویا دورِ طفلی میں بھی مجھے عشق ہی سے دلبستگی تھی اور اس زمانے میں بھی پختہ کار عاشقوں کی سی حیثیت حاصل تھی۔

۴۔ لغات۔ گرد تھا : بے حقیقت تھا۔ ہیچ تھا۔

شرح :۔ اب دل سے جگر تک خون کے دریا کا کنارہ بنا ہوا ہے۔ اس راستے میں پہلے پھولوں کا جلوہ بھی بے حقیقت اور بے حیثیت معلوم ہوتا تھا یا یہ کہ ہر راستے میں گرد و غبار ہوتا ہے۔ اس راستے میں پہلے پھولوں کے جلوے کو گرد و غبار کی حیثیت حاصل تھی۔

دریائے خون کے بجائے ساحلِ دریائے خوں لانے سے بظاہر یہ مقصود ہے کہ دل اور جگر دونوں خون ہوئے اور اس خون نے ایک دریا کی حیثیت حاصل کر لی۔ خون بہہ چکا، اب صرف ساحل باقی رہ گیا ہے۔ اس سے اس مقام کی بے رونقی اور ویرانی نمایاں ہوتی ہے۔

شعر کا مضمون یہ ہے کہ جہاں اب جانکاہی اور جگر گدازی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، وہاں پیشتر عیش و نشاط کی بہترین بہار چھائی ہوئی تھی۔

۵۔ شرح ۔ عاشق کو غمِ عشق کی کشمکش سے کبھی نجات نہیں ملتی۔ اگر دل پہلو سے نکل بھی گیا ہو تو اس کا نکل جانا ہی دل کا درد بن جاتا ہے۔ یعنی جب تک

دل پہلو میں تھا، وہی غم واندوہ کا مرکز تھا۔ دل چلا گیا تو اس کے جانے کا غم شروع ہو گیا ہے غرض کسی بھی صورت میں غم کی کھینچا تانی سے خلاصی نہیں ملتی۔

۶۔ **لغات**۔ چارہ سازی : علاج۔ مداوا۔

بیابان نورد : صحرا میں آوارہ پھرنے والا۔

شرح :۔ دوست اور ہمدرد میری وحشت کی حالت میں علاج کی کوئی تدبیر نہ کر سکے۔ ان کے بس میں صرف یہ تھا کہ مجھے قید کر دیتے تاکہ بہ حالت دیوانگی باہر نکل کر بیابان میں نہ پہنچ جاتا، اس طرح انھوں نے میرا جسم تو قید میں ڈال دیا، لیکن میرا خیال برابر بیابان نوردی میں مصروف رہا۔

ظاہر ہے کہ وحشت و دیوانگی کا علاج محض جسم کو قید خانے میں ڈالنے سے نہیں ہو سکتا۔ ضروری ہے کہ خیالات سے بھی وحشت دور کی جائے۔ مرزا یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایک تدبیر تو دوستوں نے کر لی، مگر دوسری کا کوئی انتظام نہ کر سکے۔

۷۔ **شرح** :۔ یہ نعش، جسے کفن نصیب نہیں ہوا، اسدؔ کی ہے، پریشان حال تھا اور جس کی جان زخموں سے چُور تھی۔ اللہ تعالیٰ اسے بخشے، وہ بڑا آزاد انسان تھا۔

○

شمارِ سبحہ، مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا

بہ فیضِ بے دلی، نومیدیِ جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عُقدۂ مشکل پسند آیا

۱۔ **لغات**۔ سُبحہ : تسبیح۔ مالا

مرغوب : جس کی طرف رغبت ہو، پسندیدہ

شرح :۔ ہمارے محبوب کو، جسے مشکل کام پسند ہیں، تسبیح پھیرنے سے بڑی رغبت ہے۔ اس طرح اسے سَو دل ایک

ہی مرتبہ مُٹھی میں لے لینے کا تماشا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ گویا اس کی تسبیح خوانی وردو وظیفہ کے لیے نہیں، بلکہ وہ سُو سَو دل ایک ہی مرتبہ قبضے میں لے لینے کی مشق کرتا ہے۔
تسبیح کے سَو دانے ہوتے ہیں۔

ہوائے سیرِ گل، آئینۂ بے مہریِ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا
جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ
مبارک باد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا

محبوب کے ہاتھ میں تسبیح دیکھ کر دل باختہ شاعر کو یہ خیال ہُوا کہ محبوب بجز سَو دِل مُٹھی میں لے رہا ہے۔

بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ مرزا کا یہ شعر غنیؔ کاشمیری کے شعر ذیل سے ماخوذ ہے۔

به گوشم این صدا از مُقریِ تسبیح می آید
که صد دل مضطرب گردد چو یک دل یابد آرامی

یعنی امامِ تسبیح سے یہ آواز میرے کان میں آ رہی ہے کہ سَو دل پریشانی کا تختۂ مشق بنتے ہیں تو ایک دل کو آرام نصیب ہوتا ہے۔

غنیؔ کے پیشِ نظر یہ حقیقت ہے کہ تسبیح خوانی میں امام شامل نہیں ہوتا۔ سَو دانوں پر ہاتھ پھرتا جاتا ہے اور امام الگ رہتا ہے۔ اس سے یہ مضمون پیدا کر لیا کہ سَو دلوں کے پریشان ہونے کے بعد ایک دل آرام پاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ دونوں شعروں میں "صد دل" اور "تسبیح" کے لفظوں کے سوا کوئی وجہِ اشتراک نہیں۔

۲۔ **لغات**۔ بیدلی: عاشقی، افسردگی، مایوسی

شرح۔ بیدلی کی برکت سے ہم اتنے بے نیاز ہو چکے ہیں کہ ہمارے لیے ہمیشہ کی مایوسی و ناامیدی بھی سہل ہو گئی ہے اور اس کا برداشت کر لینا ہرگز مشکل نہیں۔ کشائش یعنی عقدے سلجھانے کی صلاحیت کو ہمارا مشکل عقدہ پسند آگیا ہے۔

اور وہ نہیں چاہتی کہ یہ عُقدہ کھُلے۔ وہ جس حالت میں ہے، ہمیشہ اسی حالت میں رہے گا، کشودِ کار کی نوبت نہ آئے گی۔

۳۔ **لغات**۔ ہَوا : آرزو۔ خواہش

بہ خوں غلطیدن : خون میں لوٹنا، تڑپنا، لت پت ہونا۔

شرح :۔ ہمارے قاتل (محبوب) نے پھولوں کی سیر کے لیے خواہش کی ہے تو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس کا مقصد تفریح ہے، بلکہ اسے خون میں بسملوں کے لوٹنے اور تڑپنے کا سماں پسند ہے۔ یہ خواہش اس کی بیدردی اور سنگدلی کا نقشہ پیش کر رہی ہے۔

پھولوں کے تختے میں نسیم پھرتی ہے تو سرخ سرخ پھول ہلنے لگتے ہیں۔ شاعر نے یہ منظر دیکھا تو اُسے یاد آگیا کہ بسمل بھی خون میں اسی طرح لوٹا اور تڑپا کرتے ہیں چنانچہ اس نے سمجھ لیا کہ محبوب کے پیشِ نظر پھولوں کی سیر نہیں، بلکہ بسملوں کے تڑپنے اور لوٹنے کا نظارہ ہے، جو اُسے بہت پسند ہے اور یہی اس کی بے مہری کا ثبوت ہے۔

۴۔ **لغات**۔ جراحت : زخم

ارمغاں : تحفہ

شرح : اے اسدؔ! مبارک ہو کہ تیری دکھی جان کے لیے عشق ایسے تحفے لایا ہے، جو اس کی غم خواری کریں گے۔ مثلاً زخم، الماس، جس سے زخم بڑھتے ہیں، جگر کے داغ۔

یہ تمام چیزیں تکلیف و اذیت کا باعث ہیں اور دردمند جان کے لیے یہی موزوں تحفے ہو سکتے تھے، اس لیے شاعر نے اپنے آپ کو مبارک باد دی۔ یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ شعر بہ طورِ طنز کہا گیا ہے۔

○

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہُوا　　ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہُوا

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا　　یہ زمرّد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہُوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں　　وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہُوا

دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی　　گر نفس جادۂ سرمنزلِ تقویٰ نہ ہُوا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی　　گوش منت کشِ گلبانگِ تسلّی نہ ہُوا

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے؟　　ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں، سو وہ بھی نہ ہُوا

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ　　ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہُوا

۱- **لغات** ۔ **نقش** : تحریر۔ نام و نشان ۔ تعویذ۔ تصویر۔ یہاں بظاہر مراد نام و نشان ہے۔

شرمندۂ معنی ہونا : معنی کی شرمندگی اٹھانا یعنی بامعنی ہونا۔

شرح : زمانے میں وفا کا نقش دل کے لیے تسلّی اور اطمینان کا باعث نہ ہُوا۔ یہ تو ایسا لفظ معلوم ہوتا ہے، جس کے کوئی معنی نہیں، بلکہ سراسر مہمل ہے۔ لفظ "وفا" کا تذکرہ زبانوں پر تو بہت ہے، مگر تین حرفوں کے اس مجموعے سے کسی کو اس وقت تک کیا تسکین ہو سکتی ہے، جب تک اس کی حقیقت اور معنویت پر عمل نہ ہو، یعنی لوگ وفا کا عملی مظاہرہ نہ کریں۔ اگر یہ ممکن نہیں تو یہ لفظ کوئی معنی نہیں رکھتا اور بے وجہ زبانوں پہ جاری رہتا ہے۔

شاعر کا مقصود یہ ہے کہ آج زمانے میں وفا کی عملی تصویر کہیں نظر نہیں آتی، لوگ صرف ریاکاری سے یہ لفظ استعمال کرتے رہتے ہیں۔ غالبؔ نے حُسنِ بیان سے اس مضمون میں ایک خاص شان پیدا کر دی۔ سعدیؒ نے یہی مضمون دوسرے انداز میں پیش کیا ہے۔

یا وفا خود نبود در عالم
یا کسے اندریں زمانہ نکرد

یعنی یا تو یہ سمجھنا چاہیے کہ دنیا میں وفا کا وجود ہی نہ تھا یا ہمارے زمانے میں کسی نے اس پر عمل نہیں کیا۔ سعدیؒ نے دو صورتیں پیشِ نظر رکھیں، یعنی یا تو وفا تھی ہی نہیں یا ہمارے زمانے میں غائب ہو گئی۔ غالب کا بیان یہ ہے کہ وفا کا لفظ تو موجود ہے، مگر اس کی حقیقت گم ہے اور یہی حقیقت ہے۔

۲۔ **لغات۔ کاکل** : سر کے وہ بال جو دونوں جانب آگے کی طرف لٹکے ہوتے ہیں۔ اس کی صفت سرکش قابلِ توجہ ہے۔

زُمُرُّد : (ز، م اور ر تینوں پر پیش اور ر پر تشدید) بیش قیمت پتھروں میں سے ایک، جس کا رنگ سبز ہوتا ہے۔ اسی لیے شعر میں اسے سبزۂ خط سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بعض اساتذہ نے ر کو مفتوح بھی باندھا ہے۔

حریف : مدِمقابل۔ دشمن۔

افعی : کالا سانپ، جو بہت زہریلا اور موذی ہوتا ہے۔ اسے کاکل سے تشبیہ دی گئی ہے۔

شرح : اے محبوب! تیرا سبزۂ خط کاکل کو دبا نہ سکا، یعنی اس پر کچھ اثر نہ ڈال سکا اور اسے پیچھے نہ ہٹا سکا۔ اگرچہ اس کی حیثیت زمرد کی تھی، مگر یہ زمرد کالے اور موذی سانپ کی پھنکار کا مدِمقابل نہ ہوا۔

شعر کا مضمون فارسی اور اردو ادب کی اس مشہورِ عام روایت پر مبنی ہے کہ زمرد کو دیکھ کر افعی سانپ اندھا ہو جاتا ہے۔ خود مرزا غالب صاحب عالم مارہروی کو کفِ الخضیب کے سلسلے میں قبولِ دعا کے مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ:

> "منجملہ مضامینِ شعری ہے، جیسے کتان کا پرتوِ ماہ میں پھٹ جاتا اور زمرد سے افعی کا اندھا ہو جانا۔ آصف الدولہ نے افعی تلاش کر کے منگوایا اور قطعاتِ زمرد اس کے محاذی چشم رکھے۔ اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔"

ایران در روم و فرنگ سے الواع الواع کے کپڑے منگوائے، چاندنی میں پھیلائے، کوئی مسکا بھی نہیں۔"

شاعر کا مطلب یہ ہے کہ محبوب کے چہرے پر خط نکل آنے سے کاکل کی دلکشی و دلآویزی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

۳۔ **شرح** :۔ میں نے چاہا تھا کہ مرجاؤں اور اس طرح وفا کے غم و درد اور مصیبتوں سے نجات حاصل کر لوں اور وفاداری کے تقاضوں کو پورا کرنا نہایت پریشانی اور کوفت کا باعث ہے۔ خصوصاً اس حالت میں کہ محبوب کا پیشہ ہی ظلم وستم اور جور و جفا ہو، لیکن ظالم محبوب میرے مرنے پر بھی راضی نہ ہوا اور مجھے دنیا کے رنج و غم سے مخلصی نہ مل سکی۔

شعر کا یہ پہلو خاص توجہ کا محتاج ہے کہ عاشق اپنے محبوب کے جور و جفا کے باوجود وفا کے تقاضے پورے کر رہا ہے۔ جب وہ سمجھتا ہے کہ تقاضے پورے کرنا ناقابلِ برداشت مصیبتوں کا سامان ہے اور ان سے رہائی پانا چاہتا ہے تو اس حالت میں بھی اپنی خواہش پر محبوب کی رضا کو ترجیح دیتا ہے۔ یہی سچے عاشق کا خاصہ ہے۔ محبوب عاشق کے مرنے پر غالباً اس لیے راضی نہ ہوا کہ یہ امر اس کی بدنامی کا باعث تھا۔

۴۔ **لغات** ۔ **جادہ** : راستہ۔ پگڈنڈی۔

تقویٰ : جسے شاعر نے ایرانیوں کے طریقے کے مطابق تَقوِی باندھا ہے (مثلاً عیسیٰ، عیسی، لیلیٰ، لَیلِی) پرہیزگاری۔

شرح :۔ میرا دل شراب اور پیالے کے خیالات کی گزرگاہ ہی نہیں اگر میرا سانس پرہیزگاری کی منزل کے لیے پگڈنڈی نہ بن سکا تو کچھ مضائقہ نہیں۔

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ اگر مجھے پرہیزگاری نصیب نہیں تو رندی اور مےنوشی ہی ہو، دونوں میں سے ایک حالت کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ یہ مناسب نہیں کہ نہ رندی ہو، نہ نکوکاری۔

۵۔ لغات۔ منت کش : احسان اٹھانے والا۔ ممنون

گلبانگ : قلندروں اور شاطروں کی آواز۔ بلبل کی آواز۔ اچھی آواز اور خوشخبری۔ وہ شور اجو خوشی کے موقع پر لوگوں میں اٹھتا ہے۔ مطلق آواز کے معنی میں مستعمل ہے۔

شرح : اے محبوب! تُو نے مجھ سے ملنے کا وعدہ نہ کیا۔ میں اس پر بھی راضی ہوں، کیونکہ میرے کان نے تسلی کی اس اچھی آواز کا احسان نہ اُٹھایا۔

مطلب یہ ہے کہ تُو وعدہ کر ہی لیتا تو اس کے پورا ہونے کی کوئی امید نہ تھی کیونکہ تیرا شیوہ یہی ہے کہ وعدے پورے نہ کیے جائیں۔ وعدہ نہ کرنے سے اتنا تو فائدہ ہوا کہ کان منت کے احسان سے محفوظ رہے۔ محبوب کا وعدہ کر لینا عملاً ویسا ہی تھا، جیسا وعدہ نہ کرنا۔

۶۔ شرح :۔ میں خوش نصیبی سے اس درجہ محروم ہوں کہ اس دنیا میں جس خواہش کے لیے شاید ہی کوئی تیار ہو، یعنی مرجانا، میں اس کے لیے بھی تیار تھا، لیکن یہ خواہش بھی پوری نہ ہوئی، یعنی مرنا بھی میسر نہ آسکا۔ یہ محرومی و ناکامی کی انتہا ہے، مگر شکایت کس سے کی جائے؟ فریاد لے کر کس کے پاس جائیں؟

۷۔ لغات۔ جنبشِ لب : لب ہلانا۔

دمِ عیسیٰ : حضرت عیسیٰ کا دم یعنی قُم باذن اللہ (اللہ کے حکم سے اُٹھ) کہنا، جس سے مُردے زندہ ہو جاتے تھے۔

شرح :۔ غالب اس قدر ناتوان، ضعیف اور کمزور تھا کہ حضرت عیسیٰؑ نے معجزہ قُم باذن اللہ سے کام لینا چاہا۔ آپ کے لب ہلے تو اسی صدمے سے غریب غالب کی جان نکل گئی۔

ناتوانی اور ضعف کی انتہا ہے کہ زندگی بخشنے والا اعجاز ہی موت کا باعث بن گیا۔

○

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا، ہوا ریشہ نیستاں کا

دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے، خونِ گرم دہقاں کا

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ، ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

۱۔ لغات۔ ستائش گر: تعریف کرنے والا۔ مداح۔
باغِ رضواں: داروغۂ بہشت کا باغ یعنی بہشت۔
طاقِ نسیاں: وہ طاق، جس میں انسان کچھ رکھ کر بھول جائے۔

شرح:۔ زاہد جس بہشت کی اس قدر تعریف کر رہا ہے، ہم بیخودوں کے نزدیک اس کی حیثیت صرف اتنی ہے، جیسے ایک گلدستہ ہو اور اسے طاق پر رکھ کر بھول جائیں۔

مولانا حالیؔ فرماتے ہیں کہ "بہشت کو بیخودوں کے گلدستۂ طاقِ نسیاں سے تشبیہ دینا بالکل ایک نرالی تشبیہ ہے۔ جو کہیں نہیں دیکھی گئی"۔ فارسی میں بھی مرزا غالب نے جنّت کو نقش و نگار طاقِ نسیاں کہا ہے:

رنگ ہا چوں شد فراہم مصرفِ دیگر نداشت
خلد را نقش و نگارِ طاقِ نسیاں کردہ ایم

غالب نے بہشت کو گلدستہ

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے !
دلِ افسردہ گویا حُجرہ ہے یوسف کے زنداں کا
بغل میں غیر کی آپ آج سوئے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا ؟ خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا
نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہُوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا
نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

طاقِ نسیاں کہہ کر محض تشبیہ اور حسنِ بیان ہی کے کمالات نہیں دکھائے، بلکہ اجزائے اعمال کے متعلق اپنا فلسفہ بھی پیش کر دیا ہے۔ وہ یہ حقیقت واضح کرنا چاہتا ہے کہ ہم بخود اور خدامست اپنے اعمال کی جزا کے لیے بہشت کے خواہاں نہیں، ہم تو بہشت کی یاد ہی دل سے نکال چکے ہیں، اور اسے گلدستۂ طاقِ نسیاں بنا چکے ہیں ہمارے پیشِ نظر صرف خدا کی رضا اور اس کے حکموں کی تعمیل ہے چنانچہ وہ دوسری جگہ کہتے ہیں۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

۲- لغات۔ مرجان : مونگا۔ سمندر میں خاص قسم کے کیڑے لعابِ دہن سے اپنے لیے گھر بناتے ہیں، جو سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ گھر وسیع چٹانوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، جو شاخ در شاخ دور دور تک پھیل جاتی ہیں۔ پرانے زمانے کے لوگ مونگے کو جمادات و نباتات میں ایک اتصالی کڑی سمجھتے تھے یعنی مونگے میں جمادات نے پہلے پہل نباتات کی شکل اختیار کی، چنانچہ وہ جمادات سے بھی ملتا ہے، کیونکہ پتھر ہوتا ہے اور اس میں نباتات کی بھی خاصیت ہے، کیونکہ بڑھتا اور پھیلتا ہے۔

شرح :۔ محبوب کی پلکوں نے سوئی بن کر دل میں کاوشوں کا ایک ایسا ہنگامہ بپا کر دیا کہ ہر قطرۂ خون کو چھید ڈالا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ میرے جسم کا ایک ایک قطرۂ خون

مونگے کی تسبیح کا دانہ بن گیا۔ چھیدنے کے لیے جامد جسم درکار ہے۔ لیکن مژگانِ یار کی کاوش کا کمال یہ ہے کہ اس نے سیال قطروں میں سوراخ کر دیے۔ کاوش کا ایسا نقشہ اور کہیں نظر نہیں آ سکتا۔

۳۔ **لغات**۔ سطوت : رعب۔ دبدبہ

دانتوں میں تنکا لینا : زمانۂ ماضی میں عجز کا اظہار کرنے کے لیے دانتوں میں تنکا لیا جاتا تھا، فارسی میں اسے "خس بہ دنداں گرفتن" کہتے ہیں۔

نیستاں : سرکنڈے، بانس اور نرکل کا جنگل۔ بانس اور نرکل سے بانسری اور نَے بنتی ہیں، جن سے نغمے اور نالے نکلتے ہیں۔

شرح :- قاتل کا رعب اور دبدبہ مجھے آہ و فغاں سے روک نہ سکا۔ میں نے اظہارِ عجز کے لیے جو تنکا اٹھا کر دانتوں میں دبایا، وہ بانس اور نرکل کے جنگل کا ریشہ بن گیا۔ یعنی اس سے نیستاں پیدا ہوا، نیستاں سے لَے بنی۔ گویا اظہارِ عجز ہی کی تدبیر میرے لیے نالہ و فغاں کا سامان بن گئی۔

قاتل یعنی محبوب چاہتا تھا کہ مجھے نالوں سے روکے۔ میں نے خود بھی عاجزی اختیار کرنی چاہی۔ وہی عاجزی نالوں کی کثرت کا ذریعہ بن گئی۔

۴۔ **لغات**۔ سروِ چراغاں : چل چراغ۔ وہ جھاڑ جس میں بہت سے چراغ جلتے ہوں۔ پاک و ہند میں لکڑی یا دھات سے سرو جیسی ایک چیز بنا لیتے تھے جس میں بے شمار چراغ جلانے کا انتظام کر لیتے تھے۔

شرح :- اگر مجھے زمانے نے مہلت دے دی تو میں ایسا تماشا دکھاؤں گا جو ہمیشہ یادگار رہے، کیونکہ میرے دل کا ہر داغ سروِ چراغاں کا ایک بیج ہے۔

بے شمار داغوں سے بے شمار سروِ چراغاں پیدا ہو جائیں گے اور ان سب پر بہ کثرت چراغ جلنے لگیں گے تو واقعی ایک نادر منظر سامنے آ جائے گا۔

شعر کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں جنونِ عشق کی افزائش کا اظہار کیا ہے، کیونکہ ہر داغِ دل میں سروِ چراغاں کی نمو ثابت کی ہے۔

۵۔ لغات۔ آئینہ خانہ : شیش محل۔ وہ گھر جس میں ہر طرف رنگا رنگ آئینے لگے ہوئے ہوں۔

شبنمستان : وہ مقام، جہاں سبزے اور پودوں پر بہ کثرت شبنم پڑی ہوئی ہو۔

شرح :۔ اے محبوب! تیرے جلوۂ حسن نے آئینہ خانے میں وہی شان اور وہی کیفیت پیدا کردی ہے، جو سورج کی شعاعوں کے نور سے شبنمستان پر طاری ہوجاتی ہے۔

اِس شعر کی حقیقی حیثیت کا اندازہ مشاہدے سے تعلق رکھتا ہے۔ صبح کو اُٹھیے اور کسی ایسے مقام پر پہنچ جائیے، جہاں سبزے کا فرش ہو۔ جا بجا پھولوں کی کیاریاں ہوں اور ان پر خوب شبنم پڑی ہوئی ہو۔ جیسا کہ سرما میں پڑتی ہے۔ پھر سورج نکلے اس کی شعاعیں شبنم کے قطروں پر پڑیں تو ہر قطرہ ایک چھوٹا سا قمقمہ نظر آئے گا۔ جس میں چراغ کی سی روشنی ہوگی۔ آپ مختلف زاویوں سے دیکھیں گے تو ہر قطرے میں نور کے مختلف رنگوں کا جلوہ دکھائی دے گا۔ آپ دیکھتے جائیں ایسی بہار آپ کے سامنے ہوگی، جس کا نقشہ لفظوں میں نہیں کھینچا جا سکتا۔

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب! یہی کیفیت آئینہ خانے میں تیرے جلوے نے پیدا کردی۔

واضح رہے کہ شعر میں غالب نے یہی مشاہدہ پیش کیا ہے۔ اسے سورج کے نکلنے پر شبنم کے اُڑ جانے یا آئینے کا پانی خشک ہوجانے سے کوئی تعلق نہیں۔

۶۔ لغات۔ مُضمر : چھپا ہُوا۔ پوشیدہ۔

ہیولیٰ : ہر مادی چیز کی اصل مادی جسموں کی صورتِ حال ہے اور ہیولیٰ اس کا محل ہے۔

شرح :۔ میری آبادی اور بناوٹ ہی میں خرابی اور بربادی کی ایک صورت موجود ہے۔ کسان کا خون محنت و مشقت میں گرم ہوتا ہے۔ وہی گرمی ایک مادہ ہے،

جس سے میرے حاصل کے لیے بجلی بنتی ہے۔

مرزا غالب نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ دہقان کو فصل کے لیے جوتنے بونے اور پانی دینے میں مشقت اٹھانی پڑتی ہے اور ریاضت میں اس کا لہو گرم ہو جاتا ہے۔ یہی گرمی حاصل کو جلانے کے لیے بجلی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

گویا میں آبادی کے لیے جو کوشش کرتا ہوں، وہی میری بربادی کا باعث بن جاتی ہے۔

مولانا طباطبائی نے فرمایا ہے: "یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ حرارت غریزی جو باعثِ حیات ہے، خود وہی ہر وقت تحلیل و فنا بھی کر رہی ہے... اس شعر میں جو مسئلہ طب مصنف نے نظم کیا ہے، اسے آگے بھی کئی جگہ باندھا ہے"

مثلاً : برقِ خرمنِ راحت خونِ گرم دہقاں ہے۔

۷۔ **لغات۔ مدار** : لغوی معنی دورہ کرنے اور گھومنے کی جگہ۔ مجازاً جس پر کسی بات کا ٹھہراؤ اور انحصار ہو۔

شرح : گھر میں ہر طرف گھاس اُگ آئی ہے، جو بجائے خود اس امر کی دلیل ہے کہ گھر ویران و بے آباد ہے، کیونکہ وہاں ہر طرف گھاس اسی وقت اگتی ہے، جب کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہ ہو اور نہ کوئی آئے جائے۔ دربان اس لیے مقرر کیے جاتے ہیں کہ گھر کے دروازے پر پہرا دیں اور اندر آنے والے ان کی اجازت کے بغیر نہ آ سکیں، لیکن میرے گھر میں تو ویرانی کے باعث کسی کی آمد و رفت کا امکان ہی نہیں اور دربان کا کام دروازے پہ پہرا دینے کے بجائے گھاس کھودنا رہ گیا ہے۔

۸۔ **لغات۔ خوں گشتہ** : جو خون ہو چکی ہیں، یعنی ان کے پورا ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

چراغِ مُردہ : بجھا ہوا چراغ، جسے چراغِ خاموش بھی کہتے ہیں۔

گورِ غریباں : اجنبیوں، بے وطنوں اور مسافروں کی قبریں۔

شرح :- میری خاموشی میں لاکھوں ایسی آرزوئیں اور تمنائیں چھپی ہوئی ہیں، جن کا خون ہو چکا ہے اور ان کے پورا ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ میری مثال اس بجھے ہوئے دیئے کی ہے، جو کسی غریب، بے وطن اور مسافر کی قبر پر جلایا گیا تھا۔ اور اس کی لَو ختم ہو چکی۔

عام دستور ہے کہ لوگ عزیزوں کی قبروں پر چراغ روشن کر دیتے ہیں، اس طرح قبرستان کی خاموشی اور اداسی میں بھی آبادی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہیں، لیکن جو لوگ باہر سے آئے اور مر کر سرزمین غیر میں دفن ہو گئے، ان کا کوئی عزیز اور رشتہ دار موجود نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان کی قبروں پر یا تو دیے جلائے ہی نہیں جاتے یا کسی نے ایک آدھ مرتبہ جلا بھی دیا اور وہ بُجھ گیا تو کوئی اس کی پروا نہیں کرتا۔

مرزا کہتے ہیں کہ میرے دل میں بے شمار تمنائیں تھیں، جو خون ہو چکیں اور میں چُپ بیٹھا ہوں۔ گویا وہ دیا ہوں، جو کسی مسافر کی قبر پر جلایا گیا تھا، بجھا تو پھر کسی نے خبر نہ لی۔

شعر کی لفظی مناسبتیں، کمالِ تشبیہ اور تاثیر بیان ایک روشن کرامت ہے۔

۹۔ شرح :- میرا دل بُجھ چکا ہے اور اس میں کوئی اُمید باقی نہیں، لیکن خیالِ محبوب کے نقش کی روشنی تا حال قائم ہے۔ گویا دل افسردگی کے باعث ایک حجرہ ہے، جس کے متعلق عام تصور تنگی و تاریکی کا ہوتا ہے، لیکن خیالِ یار کے پرتو کی برکت سے یہ حجرہ حضرت یوسفؑ کے قید خانے کا حجرہ بن گیا یعنی وہ کوٹھڑی جس میں یوسفؑ بند تھے۔

دلِ افسردہ کو نقشِ یار کے پرتو سے زندانِ یوسف کا حجرہ قرار دینا ایک نادر تشبیہ ہے، جس کی مثالیں شعر و ادب میں بہت کم مل سکتی ہیں۔

۱۰۔ لغات :- تبسم ہائے پنہاں : زیرِ لب مسکراہٹیں۔

شرح :- معلوم ہوتا ہے کہ آج آپ رقیب کی بغل میں جا سوئے ہیں، ورنہ خواب میں اگر زیرِ لب مسکراہٹ کا اور کیا موقع ہو سکتا تھا۔

مطلب یہ ہوتا ہے کہ محبوب عاشق کے خواب میں آیا اور ایسی حالت میں کہ زیرِلب مسکرا رہا تھا۔ عاشق کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ ہر معمولی سے معمولی بات پر اس کے دل میں بدگمانی پیدا ہو۔ محبوب کی زیرِلب مسکراہٹ دیکھ کر عاشق کو فوراً خیال پیدا ہوا کہ ہو نہ ہو محبوب غیر کی آغوش میں پہنچ گیا ہے۔

۱۱۔ لغات ۔ لہو پانی ہونا : رنج و تکلیف میں مبتلا ہونا۔ جان ہلکان ہونا

شرح :۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ تیری پلکوں پر آنسو آجانے سے کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا۔ کون کون انتہائی رنج و غم کا تختۂ مشق بنا ہوگا۔

سچ ہے، محبوب کا ہلکا سا ملال بھی عاشقوں کے لیے قیامت سے کم نہیں ہوتا۔

۱۲۔ لغات ۔ شیرازہ : وہ بندش جس سے کتاب کے اوراق ترتیب کے ساتھ یکجا کیے جاتے ہیں۔

شرح :۔ اے غالبؔ! ہم راہِ فنا کی پگڈنڈی سے غافل نہیں اور اس کی حقیقت خوب پہچانتے ہیں۔ یہی وہ بندش ہے، جس کے ذریعے سے کائنات کے بکھرے ہوئے اجزا، کتاب کے ورقوں کی طرح اکٹھے کیے جاتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ زندگی نے اس دنیا میں بے شمار شکلیں اختیار کیں۔ وہ ایک دوسری سے اتنی مختلف ہیں کہ ان میں جوڑ میل پیدا کرنا ممکن نہیں، لیکن ان تمام بکھری ہوئی شکلوں اور صورتوں کے لیے لازم ہے کہ فنا کی پگڈنڈی اختیار کریں۔ وہی پگڈنڈی دھاگے کی طرح ان تمام بکھرے ہوئے اجزا کو باہم سی دے گی۔ گویا موت کے بعد یہ سب چیزیں یکجا ہو جائیں گی، جو آج بکھری ہوئی نظر آتی ہیں، اسی لیے ہم بھی راہِ فنا کی پگڈنڈی کو بھولے نہیں، ہر وقت اسی پر نظر ہے۔

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا
محبت تھی چمن سے، لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گُل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

لغات :۔ یک بیاباں ماندگی: محدود جز تکان۔ اتنی تکان جو پورے بیابان کی خاک چھاننے سے پیدا ہو۔
ذوق : اس سے مراد ہے۔ بیاباں گردی کا ذوق۔

شرح :۔ میں کتنا ہی تھک جاؤں، لیکن صحرا گردی کا ذوق و شوق ہرگز کم نہ ہوگا۔ میرے پاؤں کے نقشِ رفتار کی لہروں پر بلبلے بنے ہوتے ہیں۔

شاعر نے اپنے چلنے کو موج سے اور نقشِ قدم کو حباب سے تشبیہ دی۔ کمال یہ کیا کہ نقشِ قدم کو، جس کا خاکا ہی افتادگی اور واماندگی ہے، یعنی جو زمین پر جم کر بالکل بے حرکت ہو جاتا ہے۔ شاعر نے اسے اپنے ذوقِ رفتار کی برکت سے متحرک کرکے موجِ رفتار کا بلبلا بنا دیا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کا نقشِ قدم رفتار کی لہر کا بُلبُلا ہوگا، اس کی صحرانوردی کے شوق میں کمی کا کیا امکان ہو سکتا ہے اور تھکاوٹ اس پر کیا اثر ڈال سکتی ہے؟

۲۔ **لغات**۔ بے دماغی : پریشانی، ناخوشی، زود رنجی، چڑچڑاپن، بدمزاجی۔ بیزاری۔

ناک میں دم آنا : نہایت تنگ اور بیزار ہونا۔

شرح :۔ ایک زمانے میں مجھے باغ اور اس کے اندر سیر و تفریح سے محبت تھی، لیکن اب بیزاری و نازک مزاجی سے یہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے کہ پھول کی خوشبو سے بھی میں سخت تنگ اور رنجیدہ ہو جاتا ہوں۔

آخری مصرع میں خوبی یہ ہے کہ پھول ناک کے سامنے رکھ کر دم اندر کھینچا جائے تو خوشبو دماغ تک پہنچتی ہے۔ یہاں پھول کی خوشبو سے ناک میں دم آنے کی مناسبت بھی ہے، اگرچہ یہاں ناک میں دم آنا بطورِ محاورہ استعمال کیا گیا ہے۔ شاعر کا

مفہوم یہ ہے کہ میں بھی ایک زمانے میں شادمانی کے اسباب سے اسی طرح فائدہ اٹھاتا اور لذت اندوز ہوتا تھا، جس طرح عام لوگوں کا شیوہ ہے، مگر اب یاس وافسردگی نے یہ حالت پیدا کردی ہے کہ پھول کی خوشبو سے بھی جو نہایت لطیف وفرحت بخش ہوتی ہے، میں بیزار ہوں اور اس درجہ بیزار ہوں، گویا اس سے ناک میں دم آتا ہے۔

دلکش مناظر سے رغبت ومحبت کے بجائے انتہائی نفرت وبیزاری یہ بتاتی ہے کہ حالات میں کس درجہ عبرت انگیز انقلاب آگیا۔

○

سراپا رہنِ عشق وناگزیرِ اُلفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا!

بقدرِ ظرف ہے، ساقی، خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے، تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

لغات۔ رہن : گرد
ناگزیر : مجبور۔ ناچار۔ جس سے گریز ممکن نہ ہو۔

شرح :۔ میں سر سے پاؤں تک عشق کے پاس گرد ہوں یعنی عشق میں مبتلا ہوں۔ ساتھ ہی زندگی کی الفت سے بھی دامن بچانا میرے لیے ممکن نہیں، یعنی جان کو بھی عزیز رکھتا ہوں۔ گویا میری حالت اُس شخص کی سی ہے، جو بجلی کو معبود بنائے بیٹھے ہو، رات دن اس کی بندگی کرتا ہو، بایں ہمہ اسے یہ افسوس ہو کہ حاصل برباد ہو گیا، سرمایہ جل بجھا، حالانکہ بجلی کا خاصہ ہی یہ ہے کہ حاصل کو جلا ڈالے۔

مرزا یہ حقیقت واضح کرنا چاہتے ہیں کہ جب انسان عشق کی نذر ہو جائے تو زندگی سے کوئی دلبستگی باقی نہ رہنی چاہیئے۔ اگر عشق کے ساتھ جان سلامت رکھنا منظور ہو تو یہ خواہش سراسر غیر طبعی ہو گی، کیونکہ بجلی کو پوج کر اپنے آپ کو بچائے رکھنے کی آرزو بالکل عبث ہے۔ عشق کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے لیے زندگی کی ہر

شے سے الفت کا رشتہ کٹ جائے۔

۲۔ **لغات** ۔ ظرف : حوصلہ۔ گنجائش۔ سمائی۔
تشنہ کامی : پیاس۔ اشتیاق، خصوصاً اشتیاقِ مے۔
خمیازہ : انگڑائی۔

شرح :۔ اے ساقی! شراب کی پیاس اور طلب کی بے کیفی حوصلے کے مطابق ہوتی ہے۔ اگر تو لطف و کرم سے شراب کا دریا ہے تو میں اس دریا کے ساحل کی انگڑائی ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ ساقی میں لطف و کرم کا جتنا حوصلہ ہو، پینے والے کی پیاس بھی اتنی ہی بڑھ جاتی ہے۔ فرض کیجیے کہ ساقی شراب کا دریا بن گیا تو پینے والے نے اس کے ساحل کی شکل اختیار کر لی۔ معلوم ہے کہ دریا کا جوش و خروش کتنا ہی بڑھ جائے، ساحل اس جوش و خروش کو اپنے اندر سمائے رکھتا ہے۔ بالکل یہی کیفیت شراب نوش کی ہے، اس کی طلب ساقی کے لطف و کرم کے ساتھ ساتھ زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

○

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا ۔۔۔ یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے ۔۔۔ یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

تُو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز ۔۔۔ مَیں، اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا، وگرنہ میں ۔۔۔ طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

ہیں بس کہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے ۔۔۔ ہر گوشۂ بساط ہے، سر شیشہ باز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز ۔۔۔ ناخن پہ قرض، اس گرہِ نیم باز کا

تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ ۔۔۔ سینہ، کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

۱۔ لغات ۔ نواہائے راز : راز کے نغمے۔ راز سے مراد حقیقت کے بھید ہیں۔

شرح :۔ خواجہ حالی نے اِس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے : "راز کے نغموں سے تو خود ہی نا آشنا ہے، ورنہ دنیا میں بظاہر جو حجاب نظر آتے ہیں، وہ بھی پردۂ ساز کی طرح بول رہے، بج رہے اور اسرارِ الٰہی ظاہر کر رہے ہیں۔"

شاعر کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی ہر شے میں حقیقت جلوہ گر ہے۔ ہر چیز قادرِ مطلق کے بھید ظاہر کر رہی ہے اور معرفت کے نغمے سنا رہی ہے، مگر مصیبت یہ ہے کہ انسان ان نغموں کا محرم نہیں، وہ ہر شے کو حقیقت کا حجاب یعنی چھپا لینے والے پردے سمجھتا ہے۔ وہ تو ساز کے پردے ہیں، جن سے نغمے نکلتے ہیں، لیکن ان نغموں کو سننے کے لیے ایسے کان چاہئیں، جو ٹھیک ٹھیک سننے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

عرفی کا مشہور شعر ہے :

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ
اینہا ہمہ راز است کہ معلومِ عوام است

یعنی ہر شخص کو راز پہچان لینے کا ملکہ حاصل نہیں، ورنہ جو کچھ عام لوگ جانتے ہیں، وہ بھی دراصل سارے کا سارا راز ہے۔

عرفی نے عوام کی معلومات کو راز بتایا، لیکن غالب اُن چیزوں کو حقیقت کے ترانوں کا مصدر قرار دیتا ہے، جنھیں سب لوگ حجاب یعنی حقیقت چھپا لینے والے پردے قرار دیتے ہیں۔

۲۔ لغات ۔ رنگِ شکستہ : اُڑا ہوا رنگ، مراد ہے عاشق کا اڑا ہوا رنگ۔

شرح :۔ محبوب کو دیکھتے ہی عاشق کا رنگ اُڑ گیا۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ اُڑا ہوا رنگ بہارِ نظارہ کی صبح ہے۔ صبح کے وقت پھول کھلتے ہیں اور جو صبح عاشق کے رنگِ شکستہ سے پیدا ہوئی، اس میں محبوب کے ناز نخرے کے پھول کھلنے چاہییں۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ محبوب کو دیکھ کر عاشق کا رنگ اُڑ جاتا ہے اور محبوب اس اڑے ہوئے رنگ کو صبح قرار دے کر اپنے ناز نخرے کے پھول کھلانے میں اور سرگرم ہو جاتا ہے۔

۳۔ **شرح** :۔ تو غیر کو غصّے کی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ مجھے تیری لمبی پلکوں کی اس تکلیف سے دُکھ پہنچ رہا ہے۔

غیر کا دل پتھر کا ہے۔ اُسے چھیدنے میں تری پلکوں کو جو زحمت ہو رہی ہے، وہ میرے لیے باعثِ اذیت ہے۔ تیری نگاہیں اس کے پتھر جیسے دل کے لیے نہیں بلکہ میرے نرم، ملائم اور نیازمند دل کے لیے وقف رہنی چاہئیں۔

ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محبوب غیر کو تیز نظروں سے دیکھ رہا ہے اور عاشق کو رشک کے مارے دکھ پہنچ رہا ہے۔ وہ برداشت نہیں کر سکتا کہ محبوب کے عتاب یا توجہ کا رخ اس کے سوا کسی دوسری طرف پھرے۔

۴۔ **لغات۔ صرفہ** : فائدہ، کفایت شعاری۔ خرچ۔

طعمہ : لقمہ۔ نوالہ

شرح :۔ آہ کے ضبط کرنے میں میرا ہی فائدہ ہے، ورنہ میں ناتوانی اور نقاہت کے باعث جان کو گھلا دینے والے ایک ہی سانس کا رزق بن جاؤں گا، یعنی معمولی سی آہ بھی مجھے گھلا دینے کے لیے بالکل کافی ہو گی۔

۵۔ **لغات۔ گوشۂ لباط** : فرش کا کونا یا حصّہ۔

شیشہ باز : عام معنی شعبدہ باز کے ہیں، یہاں اشارہ فنِ رقص کے ان ماہروں کی طرف ہے۔ جو شیشہ و صراحی گلاب سے بھر کر سر پر رکھتے ہیں۔ حرکات کے باوجود کوئی چیز سر سے نہیں گرتی۔ اگر شیشہ یا صراحی ہل جائے تو اسے اصول کے مطابق حرکت کرتے ہوئے بازو پر سنبھال لیتے ہیں، پھر پہلی جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ پرانے زمانے میں ایک دستور یہ بھی تھا کہ میخانے میں خوبصورت لڑکے ساغرِ شراب سے بھر کر رقص کرتے ہوئے میخوار کے پاس پہنچتے ہی اچھال دیتے تھے، پھر خود ہی سنبھال کر میخوار

کے سامنے رکھ دیتے تھے۔ اس رسم کی بعض چیزیں اب تک بھی شراب نوشوں کی محفل میں رائج ہیں۔ یورپ کے اندر طعام گاہوں یا شراب خانوں میں ایسی رسمیں کسی نہ کسی شکل میں پائی جاتی ہیں۔ انھیں بھی شیشہ باز ہی کہتے تھے۔

شرح:۔ موسم بہار آگیا اور شراب کے جوش سے بوتلیں اور صراحیاں اس طرح اچھل رہی ہیں کہ شراب نوشی کی بزم میں فرش کا ہر گوشہ شیشہ باز کے سر کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔

۶۔ **لغات۔ گرہ نیم باز:** اَدھ کھُلی گرہ، یعنی جو پوری نہ کھلی ہو، بلکہ اس کے پیچ کا کچھ حصّہ باقی ہو۔

شرح:۔ دل ابھی تک کاوش کا تقاضا کر رہا ہے، کیونکہ ناخن پر اس اَدھ کھُلی گرہ کا قرض واجب الادا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ میرا دل ابھی تک افسردہ و گرفتہ ہے۔ اس گرہ کو کھولنے کی کوشش کی گئی، مگر پوری نہ کھُلی اور ناخن پر یہ قرض باقی رہ گیا، لہذا کاوش کا تقاضا جاری ہے اور وہ ختم نہیں ہو سکتا، جب تک دل کی گرہ پوری طرح کھُل نہ جائے۔

۷۔ **شرح:**۔ اے اسدؔ! میرا سینہ ایسا تھا کہ اس میں راز کے گوہر دفن کیے ہوئے تھے، یعنی اس میں گوناگوں راز چھُپے ہوئے تھے۔ لیکن محبوب کی جدائی کے غم نے اس خزانے کو بُری طرح تاراج و برباد کر ڈالا۔

○

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھُلا
رکھیو یارب! یہ درِ گنجینۂ گوہر کھُلا

شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھُلا
اس تکلّف سے کہ گویا بتکدے کا در کھُلا

۱۔ **شرح:**۔ شہنشاہ کی محفل میں شعروں کا دفتر کھُل گیا، یعنی مشاعرہ شروع ہو گیا۔ الٰہی! گوہروں کے اس خزانے کا دروازہ ہمیشہ کھُلا رکھیو۔ شعر کا دوسرا مصرعہ دعائیہ ہے۔ مطلب

گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھُلا

گو نہ سمجھوں اس کی باتیں، گو نہ پاؤں اُس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھُلا

ہے خیالِ حُسن میں، حُسنِ عمل کا سا خیال
خُلد کا اِک در ہے، میری گور کے اندر کھُلا

مُنہ نہ کھُلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے مُنہ پر کھُلا

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہُوا بستر کھُلا

کیوں اندھیری ہے شبِ غم؟ ہے بلاؤں کا نزول
آج ادھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھُلا

کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھُلا

اس کی اُمت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھُلا

یہ ہے کہ فیض کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔

۲۔ **لغات۔** انجم : نجم کی جمع۔ ستارے۔
رخشندہ : چمکنے والے روشن۔ تاباں۔
شرح : رات ہو گئی، پھر روشن و تاباں ستاروں کا ایک سماں آنکھوں کے سامنے آشکارا ہو گیا اور اس منظر کے کھلنے میں اہتمام اور آرائش و زیبائش کا یہ عالم ہے۔ گویا بتخانے کا دروازہ کھُل گیا۔

اہتمام اور آرائش میں بتخانے کے دروازے کا خیال شاعر کو یا تو اس وجہ سے آیا کہ بتخانے خاص اوقات میں عبادت کے لیے کھُلتے ہیں، ہر وقت کھلے نہیں رہتے، نیز ان میں بتوں کو سجا کر رکھا جاتا ہے یا اس وجہ سے کہ خود ستاروں کی

پرستش کو بتخانے سے خاص نسبت و تعلق ہے۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ چمکتے ہوئے ستاروں کا منظر سامنے آتے ہی یہ خیال آجاتا ہے کہ بت خانوں میں ان کی پرستش ہوتی تھی۔ ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شام کے وقت بتخانوں میں پرستش شروع ہوتے ہی بہت سے چراغ روشن کر دیئے جاتے تھے، جنھیں ستاروں کے منظر سے اک گونہ مناسبت ہے۔

۳۔ **لغات**۔ دشنہ : ایک قسم کا خنجر، کٹاری۔

شرح :۔ اگرچہ میں دیوانہ ہوں، لیکن دوست کا فریب نہیں کھا سکتا۔ اس نے ہاتھ میں تو کھُلا ہُوا نشتر تھام رکھا ہے، جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ میرا غم خوار ہے اور فصد لینے کا ارادہ رکھتا ہے تاکہ زائد خون نکل جائے اور میری دیوانگی جاتی رہے، لیکن اس نے آستین میں کٹاری چھپا رکھی ہے۔ تاکہ موقع پاتے ہی میرا کام تمام کر دے۔

مطلب یہ کہ آج کل کے دوست بظاہر غمخواری کا دم بھرتے ہیں، مگر ارادہ دشمنی کا ہوتا ہے۔ دوستوں کا ظاہر باطن ایک نہیں۔ میں ان کے نفاق سے خوب واقف ہوں۔ شعر میں دوست سے مراد بظاہر محبوب نہیں، بلکہ وہ شخص ہے۔ جو دکھاوے کی غرض سے دوستی کا دم بھرتا ہے۔

۴۔ **لغات**۔ **کھُلا** : یہاں اس سے مراد بے حجاب ہُوا، بے تکلف ہو گیا۔

شرح :۔ بیشک میں محبوب کی باتوں کا مطلب نہیں سمجھتا یہ بھی نہیں جانتا کہ مجھ سے بے تکلف ہو جانے کا راز کیا ہے۔ میرے لیے تو یہی سب سے بڑی نعمت ہے کہ اس پری پیکر کا حجاب دُور ہو گیا اور اس نے مجھ سے بے تکلفی اختیار کر لی۔

اس میں ایک پہلو تو یہ ہے کہ عاشق کے لیے محبوب کا خفیف سا التفات بھی بجائے خود انتہائی مسرت کا باعث ہوتا ہے، اگرچہ وہ کتنے ہی رنج و غم کا پیش خیمہ ہو۔ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ محبوب کے التفات میں عاشق کے لیے

کرید کی کوئی ضرورت نہیں اور کرید مناسب بھی نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ انتہائی رنج و غم اٹھا چکنے کے بعد محبوب نے بے تکلفی اختیار کر لی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اور کھل جائیگا اور عاشق کی تمام مرادیں پوری ہو جائیں گی۔

۵۔ شرح :۔ میں حُسن یعنی چہرۂ محبوب کے تصوّر کو نیک عمل اور نکوکاری سمجھتا ہوں۔ اسی تصوّر کی بدولت میری قبر کے اندر بہشت کا دریچہ کھل گیا۔

بہشت اُن لوگوں کو ملتی ہے، جن کے پاس نیک عملوں کا سرمایہ ہو۔ میں نے محبوب کے حسین چہرے کے خیال میں عمر گزار دی اور وہی تصوّر میرا سرمایۂ عمل تھا جو میرا یا نیکی شمار ہُوا اور اس کی برکت سے میری قبر کی تنگی ہی میں بہشت کی فضا میرے لیے مہیا ہو گئی۔

۶۔ لغات ۔ **منہ پر کھُلنا** : مراد ہے کسی چیز کا چہرے پر زیبا و خوش نما معلوم ہونا۔

شرح :۔ محبوب کا چہرہ نہ کھُلنے پر بھی حسن و دلفریبی کا وہ عالم ہے کہ آج تک کبھی دیکھنے ہی میں نہیں آیا۔ پہلے زلفیں اس کے چہرے پر پڑی رہتی تھیں اور نہایت دلآویز معلوم ہوتی تھیں۔ اب اس نے نقاب اوڑھ لی ہے اور نقاب نے زلفوں سے بھی بڑھ کر اس کے چہرے پر زیبائی اور خوش نمائی پیدا کر دی ہے۔ گویا نقاب کا حسن زلف سے بازی لے گیا ہے۔

۷۔ شرح :۔ میں نے درخواست کی کہ حضور! دروازے پر پڑا رہنے کی اجازت دے دیجیے۔ اجازت مل گئی اور میں نے اپنا لپٹا ہُوا بستر کھولنا شروع کیا۔ اس اثنا میں محبوب قول سے پھر گیا اور مجھے بصد حسرت و یاس اپنا کھُلا ہُوا بستر پھر لپیٹنا پڑا۔

اس شعر میں محبوب کی شوخی، تلوّن اور عاشق آزاری کا نقشہ نہایت دلکش انداز میں کھینچا گیا ہے۔

۸۔ شرح :۔ میری غم بھری رات اتنی اندھیری کیوں ہے کہ اس میں ستاروں

کے ٹمٹماتے دیے بھی نظر نہیں آتے؟ پھر شاعر خود ہی اس سوال کا جواب دیتا ہُوا سبب یہ بیان کرتا ہے۔ کہ عالم بالا سے روئے زمین پر بلائیں نازل ہو رہی ہیں اور ستارے دنیا کے آسمان کی طرف سے آنکھیں پھیر کر عالم بالا کو تک رہے ہیں۔ جدھر سے بلائیں اترتی ہیں۔ ستاروں کی آنکھیں اس منظر کی طرف سے ہٹ نہیں سکتیں۔ اور ان سے جو بھی روشنی حاصل ہو سکتی ہے۔ زمین کی طرف نہیں آسکتی لہٰذا میری غم بھری رات سراسر اندھیری ہوگئی۔

شبِ غم کی کامل تاریکی کا یہ سبب بالکل نیا اور اچھوتا مضمون ہے۔ لطف یہ کہ یہ سبب بلاؤں کے نزول سے پیدا ہُوا اور شب غم کی تاریکی میں درد انگیزی کا اضافہ ہوگیا۔

۹۔ **لغات** : غربت : مسافری۔ بے وطنی۔ پردیس۔

حوادث : حادثہ کی جمع یعنی آفتیں اور مصیبتیں۔

شرح : میرے لیے پردیس میں خوش رہنے کی کون سی صورت ہے جب آفتوں اور مصیبتوں کا یہ عالم ہے کہ قاصد وطن سے جو خط لاتا ہے، وُہ اکثر کھُلا ہُوا ہوتا ہے؛

دوسرے مصرع کا مضمون اس رسم پر مبنی ہے کہ جن خطوں میں کسی کی موت کی خبر ہوتی تھی، وہ اکثر کھُلے بھیجے جاتے تھے یا ان کا کوئی گوشہ چاک کر دیتے تھے تاکہ مکتوب الیہ دیکھتے ہی سمجھ جائے، خط میں کوئی بُری خبر درج ہے۔ آج بھی یہی دستور ہے جس شخص کے پاس وطن سے اکثر خط کھُلے ہوئے آئیں، اس کا مسلسل رنج و غم میں مبتلا رہنا کسی تصریح کا محتاج نہیں۔ پردیس میں وطن سے خطوں کا آنا ہر مسافر کے لیے خوشی کا باعث ہوتا ہے، لیکن جس شخص کو زیادہ تر خبرِ مرگ دینے والے خطوط ملیں، وہ کیونکر خوش رہ سکتا ہے۔ پردیس کے غم پر عزیزوں اور دوستوں کے مرنے کا غم اس کے لیے مزید قلق کا باعث بنا رہے گا۔

۱۰۔ **لغات**۔ گنبدِ بے در : ایسا گنبد، جس میں کوئی دروازہ نہ ہو،

مراد ہے آسمان۔

شرح :۔ اے غالب! میں تو کونین کے بادشاہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمّت میں ہوں، جس کے لیے معراج کی رات آسمان کے بند دروازے کھُل گئے پھر میرے کام کیونکر بند رہ سکتے ہیں؟ میرے لیے کار برآری میں کیونکر رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے؟ جس مقدّس ذات کے لیے یہ بے دروازہ گنبد رکاوٹ نہ بن سکا، اس کے لطف و نوازش سے میری تو کوئی بھی غرض رُکی نہیں رہ سکتی۔

○

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوّالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام
گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جُو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

یاں سرِ پُرشور بے خوابی سے تھا دیوار جُو
واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا

۱۔ لغات۔ زہرہ: پتّا۔
شعلۂ جوّالہ: جولان کرتا یا چکر کھاتا ہوا شعلہ۔ طریقہ یہ ہے کہ ایک لکڑی (جسے بنیٹی کہتے ہیں) کے دونوں سروں پر یا تو مشعلیں باندھ لیتے ہیں یا گیند سی باندھ کر اور آگ لگا کر گھماتے ہیں۔ اس طرح آگ کا ایک گول چکّر پیدا ہو جاتا ہے۔ آتشبازی میں ایک چرخی سے یہی کام لیا جاتا ہے۔

شرح : رات غمِ ہجر میں میرے دل کی جلن سے جو بجلیاں نکل رہی تھیں، انھوں نے بادل کا پتّا پانی پانی کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سیلاب آگیا جس میں جا بجا بھنور پیدا ہو گئے۔ پانی کی بہ کثرت

یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بے خودی
جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

فرش سے تا عرش، واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

ناگہاں اس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

میرے سوزِ دروں پر کوئی اثر نہ ڈال سکی، بلکہ میرے سوز نے پانی پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ بھنور کا ہر حلقہ شعلہ جوالہ بن گیا۔

گرداب اور شعلۂ جوالہ میں تشبیہ گولائی پر موقوف ہے۔ جس سوزِ دل نے پانی کو آگ کی شکل میں تبدیل کر دیا، حالانکہ پانی آگ بجھاتا ہے اس کی تیزی اور تندی کسی تشریح کی محتاج نہیں۔

ایسے اندازِ بیان کو عموماً مبالغہ آمیز قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ شاعر کے گہرے تاثرات کا ایسا اظہار ہوتا ہے، جس کے بغیر وہ اپنے حقیقی محسوسات سننے والے تک پہنچا نہیں سکتا۔

۲۔ **لغات**۔ **عناں گیر** : باگ تھامنے یعنی روکنے والا۔
پنبۂ بالش : تکیے کی روئی۔
کفِ سیلاب : سیلاب کا جھاگ

شرح :- محبوب مجھ پر مہربانی کا ارادہ کیے بیٹھا تھا، مگر یکایک بارش شروع ہو گئی اور اسے روانگی سے رک جانے کا بہانہ مل گیا۔ یہاں یعنی عاشق کے ہاں روتے روتے ایک تیز و تند سیلاب آگیا اور اس کے تکیے کی روئی اس سیلاب کا جھاگ بن گئی۔

روئی اور جھاگ کی مناسبت واضح ہے۔

۳۔ **لغات** ۔ **خود آرائی** : بناؤ سنگار کرنا۔ بننا۔ ٹھننا۔

شرح :- محبوب کو بناؤ سنگار کرنے اور بننے ٹھننے کے سلسلے میں یہ خیال

تھا کہ بال بال میں موتی پروئے جائیں۔ غریب عاشق کی آنکھوں سے آنسوؤں کا طوفان اس انداز میں بہ رہا تھا کہ نگاہ کا تار بھی گم ہو گیا تھا۔

پیشتر اور بعد کے اشعار کی طرح اس شعر میں بھی شاعر نے محبوب اور عاشق کے ہاں کی متضاد کیفیتیں پیش کی ہیں اور کمال یہ ہے کہ ہر شعر میں دونوں کیفیتیں بحیثیت مجموعی ملتی جلتی ہیں، اگرچہ دونوں مختلف حالتیں پیش کر رہی ہیں۔

۴۔ شرح :- محبوب نے نہر کے کنارے بزمِ عیش و نشاط آراستہ کر رکھی ہے ہر طرف تختہ ہائے گل نظر آ رہے ہیں۔ پھولوں کا عکس نہر کے پانی میں پڑتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پانی کے اندر چراغ جگمگا رہے ہیں۔ اس کے برعکس عاشق کے ہاں یہ نقشہ تھا کہ اس کی روتی ہوئی آنکھ کی پلکوں سے خالص خون بہ رہا تھا۔

چراغوں اور خونِ ناب کی مناسبت محتاجِ تشریح نہیں۔

۵۔ لغات :- فرقِ ناز : محبوب کا سر، جس نے ناز و نعمت اور لاڈ پیار کے سوا کچھ نہ دیکھا۔

زیبِ بالش : تکیے کے لیے باعثِ زینت۔

کمخاب : لغت نگار اسے کمخاب بھی لکھتے ہیں اور کمخواب بھی۔ ایک قیمتی ریشمی کپڑا جو زری کے تار شامل کر کے بُنا جاتا ہے۔

شرح : عاشق کی کیفیت یہ تھی کہ اسے نیند نہیں آتی تھی اور اس کا وحشت بھرا سر دیوار کی تلاش میں تھا تاکہ اس سے ٹکرا کر مر جائے۔ محبوب کے ہاں اس کے برعکس دوسرا ہی نقشہ تھا، یعنی وہ اپنا سر۔۔۔۔ جس نے ناز و نعمت اور عیش و نشاط کے سوا کبھی کچھ نہ دیکھا تھا۔۔۔۔ کمخاب کے تکیے پر رکھتے ہوئے مزے مزے سے سو رہا تھا۔

اس شعر کا ایک نسخہ "محوِ بالش" کی جگہ "زیبِ بالش" بھی ہے۔ اس میں بھی عاشق و محبوب کی متضاد کیفیتیں قائم رہیں۔ فرق صرف یہ ہوا کہ پہلے شعروں میں محبوب کا ذکر مقدم تھا اور عاشق کا مؤخر۔ اس میں یہ ترتیب بدل گئی۔

۶۔ شرح :- عاشق کی بزم بجھ رہی تھی، اس کے سامنے شمع جلا کرتی تھی

محبوب کی بزم کا فرش پھولوں سے بھرا ہوا تھا اور وہ دوستوں سے عیش و نشاط میں مشغول تھا۔

عاشق کے دل سے جو سوز اٹھتا تھا، اس نے سانس کو بھی سراپا آگ بنا دیا تھا، اس لیے سانس عاشق کی مجلسِ بیخودی میں شمع بن گیا۔ محبوب کی بزم میں پھولوں کی کثرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا فرش جلوۂ گل کا نقشہ پیش کرنے لگا۔

۷۔ **شرح** ۔ محبوب کے ہاں فرش سے عرش تک رنگ کی لہروں کا طوفان تھا یعنی عیش و نشاط اور رنگینی و شادمانی کی بہتات تھی۔ اس کے برعکس عاشق کے ہاں زمین سے آسمان تک ہر چیز جل جانے اور جلا دینے کے قابل تھی، یعنی محرومی اور انتہائی غمگینی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس شعر میں پھر محبوب اور عاشق کی کیفیت بیان کرنے کی ترتیب بدل گئی۔

۸۔ **لغات** ۔ خوں نابہ : خالص خون، یہاں مراد ہے خون کے آنسو۔

شرح :۔ میرا دل ناخنِ غم کی کاوش سے لذت پلئے ہوئے تھا۔ یہ متضاد حالت دیکھ کر یکایک جوش میں آیا اور آنکھوں سے خون کے آنسو ٹپکانے لگا۔

نالۂ دل میں شب، اندازِ اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بے تاب تھا
مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا
نازشِ ایامِ خاکستر نشینی، کیا کہوں
پہلوئے اندیشہ، وقفِ بسترِ سنجاب تھا

۱۔ **لغات** ۔ سپند : حرمل کا کالا دانہ، جو نظرِ بد سے بچاؤ کے لیے آگ پر ڈالتے ہیں اور وہ چٹختا ہے۔

شرح : رات دل سے جو نالہ اٹھتا رہا، اس میں تاثیر بالکل غائب تھی۔ جب میرا محبوب غیر کی بزمِ وصل کو آراستہ کیے ہوئے تھا تو نالہ اس گرچہ شانہ میل جول

کچھ نہ کی، اپنے جنونِ نارسا نے، ورنہ یاں
ذرہ ذرہ، روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن، کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

مَیں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے
اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

کو نظر بد سے بچانے کے لیے سپند کا کام دیتا رہا۔ یعنی میرے حق میں اثر پیدا کرنے کے بجائے میرے خلاف مصروفِ عمل رہا۔ اگرچہ سانحۃً بیتاب و بیقرار بھی تھا۔

شاعر نے نالے سے تین فعل منسوب کیے، اوّل اس کا بے اثر رہنا، دوم غیر کی بزم وصل کے لیے سپند بننا، سوم بے قرار ہونا۔ شاعر کہتا ہے کہ اوّل تو نالے میں کوئی اثر ہی نہیں تھا۔ اس نے کچھ کیا تو میرے خلاف کیا۔ اگر اس میں حقیقی تاثیر ہوتی تو غیر کو محبوب سے بزم وصل آراستہ کرنے ہی کی نوبت نہ آتی۔

۲۔ **لغات** ۔ مَقدم : آنا۔

آہنگ : آواز، نغمہ، طرز، روش، قاعدہ، قانون۔

سازِ صدائے آب : جلترنگ ۔ ایک ساز ہے جو سات پیالیوں میں پانی کی مختلف مقدار بھر کر سات سروں کے موافق بنا لیتے ہیں۔ پیالیوں کو کسی چیز سے بجاتے ہیں تو ان میں سے مختلف سُر نکلتے ہیں۔ ان کی ترتیب سے مختلف نغمے پیدا کیے جاتے ہیں۔

شرح ۔ سیلاب کی آمد سے دل نے شادمانی کے گوناگوں نغمے گانے شروع کر دیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عاشق کا گھر جلترنگ تھا۔ یعنی جس طرح پیالیوں میں پانی بھر کر مختلف سُر پیدا کیے جاتے ہیں، اسی طرح عاشق کا گھر سیلاب کی آمد

پر جلترنگ کی طرح بجنے لگا۔

۳۔ **لغات : نازش** : فخر۔ ناز۔

خاکستر نشینی : خاک نشینی، فقر، درویشی، قناعت۔

سنجاب : برفستان کا ایک جانور، جس کا رنگ خاکی اٹل یہ سیاہ ہوتا ہے اس کی کھال بیش قیمت ہوتی ہے، جس سے پوستین اور بعض دوسری چیزیں بناتے ہیں۔کھال کو بھی سنجاب ہی کہتے ہیں۔

شرح :۔ میں خاک نشینی اور درویشی کے زمانے کا حال کیا سناؤں۔ قناعت نے میرے لیے فخر و ناز کے سامان فراہم کر رکھے ہیں۔ کسی کا احسان لینا گورہ نہ تھا اور میرا خیال سنجاب کے بستر پر لیٹا ہوا مزے اڑا رہا تھا، یعنی جسم ہی نہیں، دل و دماغ پر بھی انتہائی راحت و شادمانی طاری تھی اور تشویش کوئی نہ تھی۔

۴۔ **لغات** ۔ **جنونِ نارسا** : ناتمام اور بے تاثیر عشق۔

رُوکش : مقابل۔ حریف۔ مُنہ پھیر دینے والا۔ شرمندہ کرنے والا۔ بڑھ کر۔

شرح :۔ ہمارے ہی ناتمام عشق سے کُچھ بن نہ آیا اور وہ خُدا کی دی ہوئی صلاحیتوں سے فائدہ نہ اٹھا سکا، ورنہ عشق کی یہ برکت ہے کہ وہ جہاں پہنچا، اس نے ذرّے ذرّے کو اس درجہ درخشاں بنا دیا کہ پوری کائنات کو روشن کرنے والا سورج بھی شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ اس کی آب و تاب ان ذرّوں کے آگے ماند پڑ گئی جنھیں عشق نے روشنی بخشی تھی۔

۵۔ **شرح** :۔ کچھ معلوم نہیں کہ آج تو ان لوگوں سے کیوں بے پروا ہو گیا ہے، جو تیرے عشق کے جال میں ہیں۔ کل تک تو یہ صورت نہ تھی اور تجھے بھی محبت و وفاداری کا سزاوار مانا جاتا تھا۔ یعنی تو محبت و وفاداری پر قائم تھا، ورعاشقوں سے بے نیازی تیرا شیوہ نہ تھا۔

۶۔ **شرح** :۔ وہ دن یاد کر، جب تیرے جال کا ایک ایک حلقہ شکار کے انتظار میں اُس آنکھ کی طرح کھلا تھا، جو نیند سے محروم ہو۔

پہلے شعر کی طرح اس میں بھی سابقہ و موجودہ حالت کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

۷۔ شرح :۔ رات میں نے غالب کو سمجھا بجھا کر اشکباری سے روک دیا، ورنہ وہ اتنا روتا، اتنا روتا اور رو کر ایسا سیلاب برپا کر دیتا کہ یہ آسمان بھی اُس پر حباب بن کر رہ جاتا۔

○

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب — خُونِ جگر، ودیعتِ مژگانِ یار تھا

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو — توڑا جو تو نے آئنہ تمثال دار تھا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں — جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پُوچھ حال — ہر ذرّہ مثلِ جوہرِ تیغ آب دار تھا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب — دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

۱۔ لغات۔ ودیعت : امانت

شرح : خواجہ حالی اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :" آنکھوں سے اس قدر خون جاری رہتا ہے، گویا جسم میں جتنا خون تھا، وہ مژگانِ یار کی امانت تھا، اس لیے اس کے ایک ایک قطرے کا حساب اُسی طرح دینا پڑے گا جس طرح امانت کا حساب دینا پڑتا ہے۔

بظاہر شعر کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عاشق رونا ضبط نہ کر سکا اور اتنے آنسو بہائے کہ جگر کا سارا خون ختم ہو گیا۔ اب وہ اس غم و رنج میں مبتلا ہے کہ جگر کا خون تو محبوب کی پلکوں کی امانت تھا اور امانت میں خیانت ہونی ہی نہ چاہیئے تھی۔ اب ایک ایک قطرے کا مجھ سے حساب لیا جا رہا ہے اور مجبور ہوں کہ حساب دوں۔

گویا عاشق ضبط میں ناکام رہا و رمصیبت یہ پیش آئی کہ اس بے ضبطی میں محبوب

سے بھری ہوئی تھی۔

۹۔ **شرح** : یعنی نواب کے غسلِ صحت کی محفل۔ وہ نواب، جو عزو وقار کی گدی کے لیے رونق بڑھانے کا موجب ہے۔

۱۰۔ **شرح** : وہ نواب، جو بزم میں تشریف فرما ہو تو ایسا امیر ہے، جس کے پاس بادشاہ کا کشان ہو، یعنی جو بادشاہ جیسا ہو۔ وہ نواب، جو میدان جنگ کے اندر شیر کی طرح گھات میں بیٹھنے والا حریف یعنی شیر دل حریف ہے۔

۱۱۔ **شرح** : وہ نواب، جس کی مسند آسمان کا ایک گوشہ ہے، یعنی آسمان کی طرح بلند ہے۔ وہ نواب، جس کی انگشتری میں سورج کا نگینہ جڑا ہوا ہے

۱۲۔ **شرح** : وہ نواب، جس کے محل کی دیوار کے نیچے آسمان ایسا فقیر ہے، جو سایے میں آ بیٹھا ہو۔

۱۳۔ **شرح** : زمانے میں خوشی اور شادمانی کی ایسی محفل کبھی روے زمین پر سجائی نہیں گئی۔

۱۴۔ **شرح** : تاروں بھرا آسمان موتیوں کا جڑاؤ فرش ہے۔ چاندنی شراب ہے اور چاند نقرئی پیالہ ہے۔

۱۵، ۱۶۔ **لغات** : اندر کا اکھاڑا : ہندوؤں کی دیو مالا کا ایک راجا، جس کی محفل میں پریاں ناچتی تھیں۔

شرح : بیشک راجا اندر کا اکھاڑا مشہور ہے۔ لیکن وہ زمین پر نہیں، آسمان کی بالائی سطح پر ہے۔ اس پر اُن لوگوں کی نظریں پڑ سکتی ہیں، جو وہم و خیال میں مبتلا ہوں۔ اس کے برعکس نواب یوسف علی خاں بہادر کے غسلِ صحت پر جو بزمِ نشاط آراستہ ہوئی، وہ اہلِ یقین کی آنکھوں کے لیے روشنی کا سرمایہ ہے۔

۱۷، ۱۸۔ **لغات** : گدیہ گر : بھکاری، مانگنے والا۔

دُرِّ ثمین : بیش قیمت موتی۔

شرح : بھلا اندر کے اکھاڑے میں عطا، بخشش اور کرم کا کیا موقع،

جہاں بدکاری نام کو بھی موجود نہیں۔ یہاں یہ کیفیت ہے کہ جہاں تک نظر جاتی ہے، نہایت بیش بہا موتی اولوں کی مانند زمین پر پھیلے ہوئے ہیں۔

۱۹-۲۰- لغات : لُولیاں : لُولی کی جمع۔ ناچنے گانے والیاں

مظنون : گمان کیا گیا، خیالی۔

شرح : ہر طرف ایسے گویّوں کے نغموں سے فضا بریز ہے جو زہرہ کی طرح گاتے ہیں۔ ہر سمت اُن ناچنے گانے والیوں کے جلوے ہیں، جن کی پیشانیاں چاند جیسی ہیں۔ اندر کے اکھاڑے سے متعلق جو کچھ وہم وگمان میں آتا ہے، وہ ہم نے نواب کی محفل میں آنکھوں سے دیکھا، جو ہر شے کو صرف ظاہری شکل وصورت میں دیکھ سکتی ہیں۔

۲۱-۲۲- لغات : مہر فر : آفتاب جیسی شان وشکوہ والا۔

شرح : وہ آقا، جسے آفتاب جیسی شان شکوہ حاصل ہے، تجمل کے ساتھ خوب بن سنور کر سوار ہُوا۔ سب نے سمجھ لیا کہ گھوڑا پری ہے اور زین کا دامن پری کا بازو ہے۔

۲۳- لغات : سمند : بادامی رنگ کا گھوڑا، عام گھوڑے کے لیے بھی مستعمل ہے۔

شرح : گھوڑے کے سُموں کے جو نشان بنتے گئے، ان سے پورا میدان پھول چُننے والے کا دامن بن گیا۔

اِس شعر میں گھوڑے کے سُموں کے نقش کو پھولوں سے تشبیہ دی ہے۔ جہاں جہاں نقش پڑے، پھول بنتے گئے اور اس کثرت سے بنے، جیسے پھول چُننے والے کی جھولی میں کثرت سے جمع ہو جاتے ہیں۔

۲۴- لغات : مشام : قوتِ شامہ کی جگہ۔ دماغ۔

شرح : فوج کے چلنے سے جو گرد اُڑتی ہے، وہ مشک بکھیرتی ہے، یعنی اُس سے مشک کی خوشبو آتی ہے اور راستہ چلنے والوں کے دماغ عطر میں بستے

چلے جاتے ہیں۔

۲۵۔ لغات : فرزین : وزیر۔ پیادہ، در فرزین شطرنج کے مہرے بھی ہیں۔
شرح : فوج کو اتنا اونچا درجہ دے دیا گیا ہے، گویا اسے وزیر کا منصب حاصل ہے۔

۲۶۔ لغات : موکب : وہ سوار، جو کسی بڑے آدمی کی جلو میں چلتے ہیں۔
شرح : نواب کی خاص سواری نکلی تو زمین پر وہی منظر پیش کر دیا، جو آسمان پر پروین ستارے پیدا کر دیتے ہیں۔

۲۷-۲۸۔ لغات : گور : گورخر، ایک جانور، جس کا شکار کرتے ہیں۔
بہرام : مشہور ساسانی بادشاہ، جسے گورخر کے شکار کا اتنا شوق تھا کہ اس کا لقب ہی بہرام گور پڑ گیا تھا۔ اس کا دستور یہ تھا کہ گورخر پکڑتا اور اس کی ران پر داغ لگا کر چھوڑ دیتا۔

سُرین : پُشت۔ پیٹھ۔
شرح : بہرام گور کا دستور تھا کہ گورخر کی ران پر تازہ داغ لگا کر چھوڑ دیتا تاکہ پتا چل جائے، یہ بہرام کا شکار ہو چکا ہے، لیکن اسے نواب عالی جناب! آپ کی غلامی کا داغ بہرام نے اپنی پیٹھ کے لیے زینت کا باعث سمجھ لیا ہے۔

۲۹۔ شرح : اے فرمانبرداروں کے پرورش کرنے والے! میں نے جو مدح و ثنا کی آرائش کی، اس کا مقصد یہ نہیں کہ فنِ شعر کا کمال پیش کروں۔

۳۰۔ شرح : آپ کی تعریف اور میرا منہ! اگر دعویٰ بھی کروں تو کسے یقین آئے گا؟ یعنی میرا منہ اس قابل نہیں کہ آپ کی تعریف کر سکے۔

۳۱۔ شرح : اور تعریف کا قصد بھی کرتا تو اب بڑھاپے کے ضعف میں کون سا امکان تھا، جب میں بالکل دبلا پتلا، پریشان حال اور غمگین ہوں۔

۳۲۔ شرح : بڑھاپا اور کمالِ ضعف کہ مرنے کے قریب پہنچا ہوا ہوں، خدا کی پناہ! ہاتھ خالی ہے اور دل غم سے بھرا ہوا ہے

۲۳۔ شرح : قلم جو زمین پر سجدہ ریز ہے، یہ صرف آپ سے عقیدت و ارادت کا اظہار کر رہا ہے۔

۲۴۔ شرح : غالب، جو عاجز اور نیاز مند ہے، مدح نہیں کہتا، صرف دعا کر رہا ہے۔

۲۵۔ شرح : دعا بھی یہی ہے کہ آپ دنیا میں ہمیشہ زندہ رہیں، خدا کرے ایسا ہی ہو!

○

ایلن براؤن

تمہید :۔ یہ قصیدہ غالب نے اپنے شاگرد شیونرائن آرام کی فرمائش پر ۱۸۵۸ء میں کہا تھا۔ آرام آگرہ کے ایک ممتاز کائستھ گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور ان کے دادا منشی بنسی دھر غالب کے [illegible] جب غالب بچے [illegible] ۔ [illegible] دوست دستوں میں سے

ملاذِ کشور و لشکر، پناہِ شہر و سپاہ
جناب عالی ایلن برون والا جاہ

بلند رتبہ وُہ حاکم، وہ سرفراز امیر
کہ باج تاج سے لیتا ہے جس کا طرفِ کلاہ

وُہ محض رحمت و رافت کہ بہرِ اہلِ جہاں
نیابتِ دمِ عیسیٰ کرے ہے جس کی نگاہ

وُہ عینِ عدل کہ دہشت سے جس کی پرسش کی
بنے ہے شعلۂ آتش، انیس پرّۂ کاہ

زمیں سے سودۂ گوہر اٹھے، بجائے غبار
جہاں ہو توسنِ حشمت کا اس کے جولاں گاہ
وہ مہرباں ہو تو انجم کہیں: "الٰہی شکر"
وہ خشمگیں ہو تو گردوں کہے "خدا کی پناہ"
یہ اس کے عدل سے، اضداد کو ہے آمیزش
کہ دشت و کوہ کے اطراف میں، بہ ہر سرِ راہ
ہزبر، پنجے سے، لیتا ہے کام شانے کا
کبھی جو ہوتی ہے الجھی ہوئی دُمِ روباہ
نہ آفتاب، ولے آفتاب کا ہم چشم
نہ بادشاہ، ولے مرتبے میں ہمسرِ شاہ
خدا نے اس کو دیا ایک خوبرو فرزند
ستارہ جیسے چمکتا ہوا بہ پہلوئے ماہ
زہے ستارۂ روشن کہ جو اُسے دیکھے
شعاعِ مہرِ درخشاں ہو اس کا تارِ نگاہ
خدا سے ہے یہ توقع کہ عہدِ طفلی میں
بنے گا شرق سے تا غرب اس کا بازی گاہ

تھے۔ آرام تھے آگرہ میں مفید خلائق کے نام سے ایک مطبع قائم کر لیا تھا اور اخبار بھی نکالتے تھے۔ آگرہ میونسپل کمیٹی کے سکرٹری بن گئے تھے۔ غالب کی کتاب "دستنبو" پہلی مرتبہ مطبع مفید خلائق ہی میں چھپی تھی۔ یہ قصیدہ ایلن براؤن نام ایک انگریز افسر کے بچہ ہونے پر کہا گیا تھا۔ میرزا کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اکیس شعر رات بھر میں کہہ کر بھیج دیے گئے تھے۔

۱۔ لغات:

ملاذ: جائے پناہ۔

شرح:

ملک اور لشکر کا امن اور شہر و سپاہ کی پناہ کون؟ جناب عالی

جواں ہو کے کرے گا یہ، وُہ جہانبانی
کہ تابع اس کے ہوں روز و شب سپید و سیاہ

کہے گی خلق اسے "داورِ سپہر شکوہ"
لکھیں گے لوگ اسے "خسروِ ستارہ سپاہ"

عطا کرے گا خداوندِ کار ساز اسے
روانِ روشن و خوئے خوش و دلِ آگاہ

ملے گی اس کو وُہ عقلِ نہفتہ داں کہ اسے
پڑے نہ قطعِ خصومت میں احتیاجِ گواہ

یہ ترکتاز سے برہم کرے گا کشورِ روس
یہ لے گا، بادشہِ چیں سے چھین تخت و کلاہ

سنینِ عیسوی، اٹھارہ سو اور اٹھاون
یہ چاہتے ہیں جہاں آفریں سے شام و پگاہ

یہ جتنے بیگڑے ہیں سب ہزار ہو جاویں
دراز اس کی ہو عمر اس قدر، سخن کوتاہ

امیدوارِ عنایات، "شیو نارائن"
کہ آپ کا ہے نمک خوار اور دولت خواہ

ایبن براؤن، جن کا
درجہ بہت اونچا ہے۔

۲۔ لغات :
باج : خراج۔

شرح :
وہ بلند رتبہ حاکم، وہ
ممتاز امیر، جس کا گوشۂ
کلاہ تاج سے خراج
وصول کرتا ہے۔

۳۔ لغات :
رافت : مہربانی۔
نیابت : قائم مقامی۔

شرح :
وہ امیر، جو سراپا رحمت
اور مہربانی ہے اور جس
کی نگاہ اہلِ دنیا کے
لیے دمِ عیسیٰ کی قائم مقام
ہے۔

۴۔ لغات :
پرِ کاہ : گھاس
کا تنکا۔

شرح :
وہ سراپا عدل امیر

یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں عزّ و جاہ کے ساتھ
جس کی پوچھ گچھ سے

تعیںِ اور اس کو سلامت رکھے سدا اللہ
ڈر کر آگ کا شعلہ گھاس کے تنکے کا رفیق بن

گیا ہے اور اس سے محبت کرنے لگا ہے۔ وہ دیکھتا رہتا ہے کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرنے پائے۔ ہر ایک کو خوف ہے کہ کہیں پوچھ گچھ کی نوبت نہ آجائے۔ شعلہ گھاس کے تنکے کو ایک لمحے میں جلا ڈالتا ہے، مگر ایلن براؤن کی پرسش کے خوف سے شعلے نے یہ کام چھوڑ دیا اور تنکے سے محبت شروع کر دی۔

۵۔ لغات : سُودۂ گوہر : موتیوں کا سفوف۔

توسنِ حشمت : جاہ و حشم کا گھوڑا۔

شرح : جہاں اُس کے جاہ و حشم کا گھوڑا دوڑتا ہو، وہاں زمین سے گرد و غبار کی جگہ موتیوں کا سفوف اُڑتا ہے۔

۶۔ شرح : وہ مہربان ہو جائے تو ستارے کہیں! اللہ تیرا شکر ہے۔ وہ غصّے میں آجائے تو آسمان پکار اٹھے: خدا کی پناہ، یعنی آسمان کو خدا کے سوا کہیں پناہ نہ ملے۔

۷، ۸۔ لغات : اضداد : وہ چیزیں، جو ایک دوسری کی ضد ہوں، ایک دوسرے کے دشمن۔

ہزبر : شیرِ ببر۔

شرح : ایلن براؤن کے عدل کے باعث ایک دوسرے کے دشمن بھی اس طرح مل گئے ہیں کہ جنگلوں اور پہاڑوں کے اطراف میں اور ہر راستے پر لومڑی کی دُم میں الجھاؤ پیدا ہو جائے تو ببر شیر اس الجھاؤ کو دُور کرنے کے لیے اپنے پنجے سے کنگھی کا کام لیتا ہے۔

۹۔ شرح : وہ سورج نہیں، لیکن اس کا ہم رتبہ ضرور ہے۔ وہ بادشاہ نہیں، مگر درجے میں بادشاہ کے برابر ہے۔

۱۰- شرح : خدا نے اسے ایک خوب صورت بیٹا عطا کیا ہے۔ کیسا بیٹا ؟ جیسے چاند کے پہلو میں ستارہ چمک رہا ہو۔

۱۱- شرح : وہ ایسا روشن ستارہ ہے کہ جس کی بھی آنکھ اُس پر پڑ جائے، اُس کی نگاہ کا تار روشن سورج کی شعاع بن جائے۔

۱۲- شرح : خدا سے اُمید ہے کہ لڑکپن ہی میں مشرق سے مغرب تک کی سرزمینیں اس کے لیے کھیل کا میدان بن جائیں گی۔

۱۳- شرح : جب وہ جوان ہو جائے گا تو دنیا کا انتظام اس طرح کرے گا کہ سفید اور سیاہ کے دن اور رات اس کے فرمانبردار ہوں گے۔

روز و شب سپید و سیاہ کو لف و نشر مرتب سمجھا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ سفید کے دن اور سیاہ کی راتیں اس کے تابع ہوں گی۔ اگر سپید و سیاہ کو جامعیت کے لیے ایک شے مان لیا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ اس کے دن اور رات اس کے فرمانبردار ہوں گے۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شب اور سپید کے درمیان اضافت کے بجائے واو عاطفہ رکھی جائے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ دن اور رات بھی اس کے تابع ہوں گے اور سفید و سیاہ بھی۔

۱۴- شرح : خلقِ خدا کہے گی کہ یہ ہمارا ایسا حاکم ہے جسے آسمان کی سی شوکت حاصل ہے۔ ساتھ ہی لکھیں گے، یہ ایسا بادشاہ ہے، جس کے پاس ستاروں جیسی سپاہ ہے۔

۱۵- شرح : کارسازِ باری تعالےٰ اس بچّے کو روشن روح، اچھی طبیعت اور حقیقتوں کو سمجھنے والا دل عطا کرے گا۔

۱۶- لغات : نہفتہ داں : پوشیدہ چیزوں کو جاننے والا۔
خصومت : جھگڑا۔

شرح : اسے وہ پوشیدہ باتیں جاننے والی عقل نصیب ہو گی، جسے جھگڑے کا فیصلہ کرنے کے لیے گواہیاں لینے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ چونکہ وہ

ہر پوشیدہ بات عقل سے جان لے گا ، اس لیے گواہوں کے بغیر ہی صحیح فیصلے کرتا جائے گا۔

۱۷۔ **شرح** : یہ بچہ جوان ہو کر ایسی یورش کرے گا کہ سلطنت روس کا نظام درہم برہم ہو جائے گا، نیز یہ چین کے بادشاہ سے تخت و تاج چھین لے گا۔

۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱۔ یہ سب دعائیہ اشعار ہیں۔

لغات : **پگاہ** : صبح۔

شرح : ۱۸۵۶ء کے عیسوی سال صبح و شام اللہ تعالےٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ اس بچے کی عمر لمبی ہو ، اتنی لمبی کہ ہمارے سیکڑے سب کے سب ہزار ہو جائیں ۔ اے ایلن براؤن صاحب ! شونارائن آپ کی عنایت کا امیدوار ہے آپ کا نمک کھاتا ہے اور دولت خواہ ہے ۔ اللہ تعالےٰ سے اس کی آرزو یہ ہے کہ خدا ہمیشہ آپ کو اُس بچے کو عزّت سے رکھے اور بلند رتبہ عطا کرے !

قطعات

(۱)

نوّاب کلب علی خاں

ہند میں اہلِ تسنن کی ہیں دو سلطنتیں
حیدرآباد دکن، رشکِ گلستانِ ارم

رام پور، اہلِ نظر کی ہے نظر میں وہ شہر
کہ جہاں ہشت بہشت آ کے ہوئے ہیں باہم

حیدرآباد بہت دور ہے اس ملک کے لوگ
اس طرف کو نہیں جاتے ہیں، جو جاتے ہیں تو کم

رام پور آج ہے وہ بقعۂ محمود کہ ہے
مرجع و مجمع اشرافِ نژادِ آدم

رام پور ایک بڑا باغ ہے از روئے مثال
دلکش و تازہ و شاداب و وسیع و خرم

۱۔ شرح: ہندوستان میں اہلِ سنت کی دو سلطنتیں ہیں، ایک حیدرآباد دکن، جو باغِ بہشت کے لیے باعثِ رشک ہے۔

۲۔ شرح: دوسری سلطنت رام پور کی ہے اور رام پور اہلِ نظر کی نگاہوں میں وہ شہر ہے، جہاں آٹھوں بہشت آ کر اکٹھے ہو گئے ہیں۔

کی پلکوں کی امانت بھی آنکھوں کے راستے نکل گئی۔

۲۔**لغات۔ یک شہرِ آرزو** : آرزوؤں کا ایک شہر، مراد ہے آرزوؤں کی کثرت۔

تمثال دار : جس میں تصویر ہو۔

شرح : عاشق کا دل ایک ایسا آئینہ تھا، جس میں محبوب کی تصویر محفوظ تھی۔ محبوب نے وہ آئینہ توڑ دیا اور اس کے بے شمار ٹکڑے ہو گئے۔ ثابت آئینے میں صرف ایک عکس نظر آتا ہے، آئینہ ٹوٹا تو اس کے ہر ٹکڑے میں وہی عکس نظر آنے لگا۔ گویا سیکڑوں تصویریں عاشق کے سامنے آگئیں اور ہر تصویر ایک آرزو کے خون کا باعث ہوئی۔ گویا محبوب نے عاشق کا آئینۂ دل توڑ کر اسے سیکڑوں ہزاروں آرزوؤں کے ماتم میں مبتلا کر دیا۔

۳۔ **لغات۔ جاندادہ** : جان دے دینے والا۔ جان قربان کر دینے والا۔

ہوا : آرزو۔ خواہش۔ محبت۔

شرح :۔ میں محبوب کی آمد و رفت کے راستے کی محبت و آرزو پر جان قربان کیے ہوئے تھا۔ اسی حالت میں اور اسی سبب سے میری موت واقع ہوئی۔ اب مناسب یہ ہے کہ میری نعش کو گلیوں میں کھینچے پھرو تا کہ مرنے کے بعد بھی ان راستوں پر پھرنے کی سعادت حاصل ہو جائے، جن پر محبوب کی آمد و رفت تھی۔ اسی طرح محبوب اتفاقیہ مجھے دیکھ لے اور اس پر آشکارا ہو جائے کہ میں نے کس سبب سے اور کس شوق میں جان دی۔

۴۔ **لغات۔ سراب** : گرما میں صحرا کی ریت پر سورج کی تیز کرنیں پڑتی ہیں تو دیکھنے والے کو دور سے پانی لہریں لیتا نظر آتا ہے۔ اصل میں یہ نگاہ کا دھوکا ہوتا ہے۔ بعض اوقات چاند کی روشنی میں بھی صحرا کے اندر یہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ پانی کے اس بے بنیاد جلوے کو سراب کہتے ہیں۔

شرح :۔ وفا کے صحرا میں سراب کی جو لہریں نظر آتی ہیں، ان کی کیفیت

جس طرح باغ میں ساون کی گھٹائیں برسیں

ہے اسی طور پہ یاں دجلہ فشاں دستِ کرم

ابرِ دستِ کرم کلب علی خاں سے مدام

دُرِّ شہوار ہیں، جو گرتے ہیں قطرے پیہم

صبح دم باغ میں آجائے، جسے ہو نہ یقیں

سبزہ و برگِ گل و لالہ پہ دیکھے شبنم

حبذا باغِ ہمایونِ تقدس آثار

کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالانِ حرم

مسلک شرع کے ہیں راہرو و راہ شناس

خضر بھی یاں اگر آجائے تو لے ان کے قدم

مدح کے بعد دعا چاہیے اور اہل سخن

اس کو کرتے ہیں بہت بڑھ کے بہ اغراق رقم

حق سے کیا مانگیے ان کے لیے جب ہو موجود

ملک و گنجینہ و خیل و سپہ و کوس و علم

ہم نہ تبلیغ کے مائل، نہ غلو کے قائل

دو دعائیں ہیں کر دیتے ہیں وہ نواب کو ہم

۳۔ شرح :

حیدر آباد بہت دُور ہے۔ شمالی ہند کے لوگ اُس طرف نہیں جاتے اور جو جاتے ہیں، اُن کی تعداد کم ہے۔

۴۔ لغات :

بُقعۂ معمور : آباد ٹکڑا۔

مرجع : رجوع کی جگہ۔

مجمع : جمع ہونے کی جگہ۔

نژاد : نسل، اولاد۔

شرح :

آج رام پور وہ آباد خطہ ہے، جہاں اولادِ آدمؑ میں سے بڑے بڑے لوگ پہنچتے اور جمع ہوتے رہتے ہیں۔

۵۔ شرح: رام پور کو ایک بڑا باغ سمجھ لیا، جائے تو وہ دلکش، تروتازہ، شاداب، بہت وسیع ہے۔ اور اس پر ہر طرف شادمانی برس رہی ہے۔

یا خدا! غالب عاصی کے خداوند کو دے
دو وہ چیزیں کہ طلب گار ہے جن کا عالم
اوّلاً عمرِ طبیعی، بہ دوامِ اقبال
ثانیاً دولتِ دیدارِ شہنشاہِ امم

۶۔ شرح : باغ میں جس طرح ساون کی گھٹائیں برستی ہیں، اسی طرح رام پور میں سخاوت کا ابر دریا بہائے جا رہا ہے۔

۷۔ شرح : نوّاب کلب علی خاں کے دستِ کرم کے بادل سے جو قطرے پے در پے گر رہے ہیں، وہ ایسے موتی ہیں، جو بادشاہوں کے لائق ہیں۔

۸۔ شرح : جسے اس بات کا یقین نہ ہو، وہ صبح کے قریب باغ میں آجائے اور سبزے، نیز لالہ و گل کی پنکھڑیوں پر اوس کے قطرے دیکھ لے۔

۹۔ لغات : حبّذا : واہ وا، مرحبا۔
تقدّس آثار : پاکیزگی کے نشانوں والا، پاکیزہ۔
غزالانِ حرم : حرم پاک کے ہرن۔
شرح : واہ وا! وہ باغِ ہمایوں، جو پاکیزگی کے نشانوں سے بھرا ہوا ہے اور جہاں حرم پاک کے ہرن چرنے کی غرض سے آتے ہوں۔

۱۰۔ لغات : قدم لینا : پاؤں چومنا، استقبال کرنا۔
شرح : نواب کلب علی خاں شریعت کے راستے پر چلتے ہیں اور راستہ پہچانتے ہیں۔ خضر بھی یہاں آجائیں تو نوّاب کے استقبال

کے لیے اُٹھیں۔

۱۱۔ **لغات** : اِغراق : بہت زیادہ مبالغہ۔

شرح : مدح میں جو کچھ کہنا تھا۔ کر چکے، اب دعا کرنی چاہیے اور شاعر لوگ دعائیہ اشعار لکھتے وقت بہت مبالغے سے کام لیتے ہیں۔

۱۲۔ **شرح** : خدا سے نواب صاحب کے لیے کیا مانگیں؟ ان کے لیے تو ہر چیز پہلے ہی سے موجود ہے۔ مُلک ہے، خزانہ ہے، مصاحبوں کی جماعت ہے، لشکر ہے، نقارہ ہے جھنڈا ہے۔

۱۳۔ **لغات** : **تبلیغ** : مبالغہ کرنا

غُلُوّ : مبالغے کی ایک قسم، بہت زیادہ مبالغہ۔

شرح : ہمارا میلان مبالغے کی طرف نہیں اور ہم غُلُو کے بھی قائل نہیں۔ دو دعائیں، جو ہم نواب کو دیتے ہیں۔

۱۴۔ **شرح** : لہٰذا کہتے ہیں کہ اے خدا! غالبؔ گنا ہگار کے آقا کو دو ایسی چیزیں عطا کر، جن کی طلب ساری دنیا کرتی ہے۔

۱۵۔ **لغات** : شہنشاہِ اُمَم : اُمتوں کا شہنشاہ مراد رسول اکرم (صلعم)۔

شرح : اوّل انھیں طبعی عمر نصیب ہو اور اقبال ہمیشہ قائم رہے، دوم خدا انھیں رسول اکرم (صلعم) کے دیدار کی دولت عطا کرے۔

(۲)

ایضاً

مقامِ شکر ہے اے ساکنانِ خطۂ خاک
رہا ہے زور سے ابرِ ستارہ بار برس

تمہید :-
یہ قطعہ ۱۱ر اگست ۱۸۶۶ء کے مکتوب

یں نواب کلب علی خاں کے پاس بھیجا گیا تھا۔ مکتوب میں میرزا لکھتے ہیں۔ "اگرچہ یہاں (دہلی میں) مینہ اس قدر برسا ہے کہ جس کے پانی سے زمیندار حاصل زمین سے ہاتھ دھولیں، مگر چونکہ یہ فرمانِ ازلی میرے رزق کی برات آپ پر ہے اور آپ کے ملک میں بارش خوب ہوئی ہے، ابرِ رحمت کے شکریے میں ایک قطعہ ملفوف اس عرضی کے بھیجتا ہوں۔"

کہاں ہے ساقیِ مہوش، کہاں ہے ابرِ مطیر
بیار، لامے گلنار گوں، بیار ، برس
خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی
درِ حضور پہ اے ابر! بار بار برس
ہر ایک قطرے کے ساتھ آئے جو ملک وہ کہے
امیر کلب علی خاں جییں ہزار برس
فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں
کئی ہزار برس، بلکہ صد ہزار برس
جنابِ قبلۂ حاجات! اس بلاکش نے
بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس
شفا ہو آپ کو، غالب کو بندِ غم سے نجات
خدا کرے کہ یہ ایسا ہو سازگار برس

۱۔ **شرح** : اے خطۂ خاک کے رہنے والو! یعنی زمین پر بسنے والو! شکر ادا کرنے کا موقع ہے کہ ستارے برسانے والا بادل خوب زور سے برس رہا ہے۔

۲۔ **لغات** : مطیر : برسنے والا۔

شرح : چاند جیسا ساقی کہاں ہے، جسے کہا جائے، "بیار" (لا) گلناری شراب لا۔ برسنے والا بادل کدھر ہے، جسے کہا جائے، "بیار" یعنی خوب برس،

۳۔ **شرح** : اے بادل! خدا نے تجھے موتی برسانے کی خصلت عطا کر دی ہے، لہٰذا حضور نواب کے دروازے پر بار بار برستا رہ اور موتی برساتا رہ۔

۴۔ **شرح** : بارش کی ہر بوند کے ساتھ جو فرشتہ آئے، اس کی زبان پہ بے اختیار یہ دعا جاری ہو جائے کہ نواب کلب علی خاں ہزار برس جییں!

اس شعر میں ہر قطرے کے ساتھ ایک فرشتہ آنے کا ذکر کیا گیا ہے، وہ عوام کے اس تصور پر مبنی ہے چونکہ بارش کا ہر قطرہ رحمت لاتا ہے، اس لیے خدا کی طرف سے ایک فرشتہ اس کے ساتھ زمین پر آتا ہے اور رحمت فرشتوں کے ذریعے سے زمین پر آتی ہے۔

۵۔ **شرح** : یہ جینے کی جو تجویز کی گئی ہے، وہ ہزار برس تک محدود نہیں، مطلب ہے، کئی ہزار برس بلکہ سو ہزار برس یعنی لاکھ برس جییں۔

۶۔ **لغات** : **قبلۂ حاجات** : دوسروں کی ضرورتیں پوری کرنے والا۔
بلاکش : بلائیں جھیلنے اور مصیبتیں برداشت کرنے والا۔

شرح : اے دوسروں کی ضرورتیں پوری کرنے والی بارگاہ کے مالک! اس بلائیں جھیلنے اور مصیبتیں برداشت کرنے والے یعنی غالب نے پانچ چار برس بڑے عذاب سے کاٹے ہیں اور بہت دکھ اٹھائے ہیں۔

اس شعر میں میرزا غالب نے فسادِ خون اور احتراق کے اس مرض کا ذکر کیا ہے، جو ۱۸۶۲ء میں شروع ہوا اور تقریباً ۱۸۶۵ء تک جاری رہا۔ اس دور کے تمام مکاتیب میں اس مرض کا ذکر تفصیل سے موجود ہے اور ہر مکتوب الیہ کو نہایت دردناک انداز میں مصیبت کی داستان سناتے ہیں۔ وہ پوری تفصیل اس شعر کے ایجاز اور تاثیر پر قربان ہے۔ حق یہ ہے کہ جس شخص کو الفاظ کی معنویت اور پیش نظر مطلب کے عین مطابق ترتیب پر غالب کے برابر عبور حاصل نہ ہو، وہ ایسا شعر نہیں کہ سکتا۔ ایسے اشعار، اشعار نہیں، ادبی معجزے ہوتے ہیں اور غالب کے سوا ایسے ادبی معجزے شاید ہی کہیں مل سکیں۔

۷۔ شرح : معلوم ہوتا ہے، نواب صاحب کی طبیعت بھی ناساز تھی، اسی لیے انھیں دعا دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ شافیِ مطلق آپ کو شفا عطا کرے اور غالب کو بندِ غم یعنی زندگی سے نجات مل جائے۔

غالب کے نزدیک بندِ غم اور زندگی ایک شے ہیں، جیسا کہ وہ کہتے ہیں:

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں،
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

(۳)

۱۸۵۷ء

تمہید :۔ ۱۸۵۷ء میں دہلی کے اندر انگریزی فوج کے ظلم و جور کا جو منظر میرزا غالب نے دیکھا، یہ اس کے تاثرات کا ایک سرسری خاکہ ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان اشعار کا لفظ لفظ خونِ جگر میں ڈوب کر نکلا ہے۔ یہ علاء الدین احمد خان علائی کے پاس ایک خط میں بھیجا گیا تھا۔

بسکہ فعّالِ ما یرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آبِ انساں کا

چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

شہرِ دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک
تشنۂ خوں ہے، ہر مسلماں کا

کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک
آدمی واں نہ جا سکے یاں کا

میں نے مانا کہ مِل گئے، پھر کیا
وہی رونا تن و دل و جاں کا

گاہ جل کر کیا کیے شکوہ
سوزشِ داغہائے پنہاں کا

گاہ رو کر کہا کیے باہم
ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے یارب
کیا مٹے داغ دل سے ہجراں کا

۱۔ لغات :
فعّالِ مایُرید : یہ سورۂ بروج کی ایک آیت ہے، جس کا ترجمہ ہے : کر گزرنے والا، جو وہ چاہتا ہے۔
سلحشور : اسلحہ استعمال کرنے والا، سپاہی۔
شرح : آج انگلستان کے ہر سپاہی نے وہ حیثیت حاصل کر لی ہے کہ جو کچھ چاہتا ہے، کر گزرتا ہے۔

۲۔ شرح : گھر سے بازار میں نکلنا اس درجہ مشکل ہو گیا ہے کہ باہر نکلیں تو گرد و پیش کے مناظر دیکھ کر پِتّا پانی پانی ہوتا ہے۔

۳۔ لغات : چوک : اس سے مراد ہے چاندنی چوک جو شاہجہاں کی دہلی کا بہترین بازار تھا اور تین صدی تک دنیا کے کسی شہر کا کوئی بازار اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ دونوں طرف آنے جانے کی سڑکیں تھیں، درمیان نہر بہتی تھی، جس پر خوب صورت درخت لگے ہوئے تھے اور جابجا چمن زار تھے۔

شرح : جسے چوک کہتے ہیں، وہ آج قتل گاہ بنا ہوا ہے اور گھر نے قید خانے کی صورت اختیار کر لی ہے۔

مطلب یہ کہ باہر نکلو تو پھانسی ملتی ہے، گھر میں بیٹھو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ قید خانے کی کسی تاریک کوٹھڑی میں بند ہیں۔

۴۔ **شرح** : دہلی کی خاک کا ذرہ ذرہ ہر مسلمان کے خون کا پیاسا ہے۔

فتح دہلی کے بعد انگریزوں نے وہاں جو کیفیت پیدا کر دی تھی، اس کا زیادہ سے زیادہ صحیح نقشہ یہی ہے۔

۵۔ **شرح** : کوئی فرد وہاں سے یہاں نہیں آسکتا اور کوئی فرد یہاں سے وہاں نہیں جا سکتا۔

مطلب یہ کہ دوستوں اور عزیزوں کے درمیان آمد و رفت بالکل بند ہے، بلکہ نوکر چاکر کو بھی باہر بھیجنے کا کوئی امکان نہیں۔

۶۔ **شرح** : مانا کہ دوست احباب کے لیے باہم ملاقات کا موقع پیدا ہو گیا، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ ملیں گے تو جسم، دل اور جان کو رونے کے سوا کیا کریں گے؟

۷۔ **شرح** : کبھی جل کر سینے کے چھپے ہوئے داغوں کی جلن کا شکوہ ایک دوسرے سے کریں گے۔

۸۔ **شرح** : کبھی باہم رو رو کر اشک بار آنکھوں کا ماجرا ایک دوسرے سے کہیں گے۔

۹۔ **شرح** : یا اللہ! اس طرح کے میل ملاپ کی کوئی صورت پیدا بھی ہو تو دل سے جدائی کا داغ کیونکر مٹے گا؟

مطلب یہ کہ وصال تو وہی مطلوب ہے، جب ملنے والے مسرور و شادماں ہوں، باہم خوشی کی باتیں کریں۔ جب رونے اور دل کی جلن کے شکوے کرنے کے سوا کوئی کام نہیں تو اس وصال کو فراق سے کس بنا پر بہتر قرار دے سکتے ہیں۔؟

(۴۲)

خوشی ہے یہ آنے کی برسات کے
پییں بادۂ ناب اور آم کھائیں
سرِ آغازِ موسم میں، اندھے ہیں ہم
کہ دلّی کو چھوڑیں، لوہارو کو جائیں
سوا ناج کے جو ہے مقلوبِ جاں
نہ واں آم پائیں، نہ انگور پائیں
ہُوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں
ابھی جا کے پوچھو کہ کل کیا پکائیں
وُہ کھٹّے کہاں پائیں اِملی کے پھُول
وُہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں
فقط گوشت سو بھیڑ کا، ریشہ دار
کہو اس کو کیا کھا کے ہم حظ اُٹھائیں

تمہید:- یہ قطعہ غالباً لوہارو جانے سے معذرت کے طور پر لکھا گیا تھا۔

۱- **شرح:** برسات کے آنے کی خوشی اس لیے ہے کہ شراب پییں گے اور آم کھائیں گے۔

۲- **شرح:** کیا ہم اندھے ہیں کہ اس موسم کے عین آغاز پر دہلی سے نکلیں اور لوہارو چلے جائیں؟

۳- **شرح:** ناج (اناج) کے سوا، جو جان کا الٹا ہے، واں ہے کیا؟ نہ آم ملتے ہیں، نہ انگور۔

۴- **شرح:** باورچیوں کو حکم ہوا کہ ابھی پوچھو، کل کیا پکائیں؟

۵- **شرح:** اِملی کے کھٹّے پھول کہاں ملیں؟ کڑوے کریلے کس جگہ سے منگائیں؟

۶- **شرح:** بھیڑ کا گوشت موجود ہے، جو ریشے دار ہوتا ہے۔ بتاؤ اسے کھا کر کیا لطف اٹھائیں؟

(۵)

اس کتابِ طرب نصاب نے جب
آب و تاب انطباع کی پائی
فکر تاریخ سال میں مجھ کو
ایک صورت نئی نظر آئی
ہندسے پہلے سات سات کے دو
دیے ناگاہ مجھ کو دکھلائی
اور پھر ہندسہ تھا بارہ کا
با ہزاراں ہزار زیبائی
سال ہجری تو ہو گیا معلوم
بے شمولِ عبارت آرائی
مگر اب ذوق بذلہ سنجی کو
ہے جداگانہ کار فرمائی
سات اور سات ہوتے ہیں چودہ
بہ امیدِ سعادت افزائی

۱۔ لغات :
طرب نصاب : جس کا سرمایہ خوشی ہو۔

شرح : جب اس کتاب نے، جو خوشی اور نشاط کی سرمایہ دار ہے، چھپائی کی آب و تاب پائی۔

۲۔ شرح : تو مجھے چھپائی کے سال کی تاریخ سوجھنی پڑی اور اس کے لیے ایک نئی صورت ذہن میں آئی۔

۳۔ شرح : پہلے مجھے اچانک سات سات کے دو ہندسے دکھائی دیے۔

۴۔ شرح : ان کے بعد بارہ کا ہندسہ تھا، جو حد درجہ زیبا معلوم ہوتا تھا۔

کچھ نہ پوچھو۔ بس یہ سمجھ لو کہ جس ریت پر سورج کی روشنی پڑنے سے سراب پیدا ہو رہا تھا، اس کا ذرّہ ذرّہ تیز دھار والی تلوار کے جوہر کی مانند تھا۔

مراد یہ ہے کہ عشق میں وفا کے تقاضے پورے کرنا بہت مشکل ہے۔ جس نے اس صحرا میں قدم رکھا، اس کے لیے بچنا ممکن ہی نہیں، کیونکہ سراب پیدا ہونے والی ریت کا ایک ایک ذرّہ اس کے لیے تیز دھار والی تلوار سے کم نہیں ہوتا۔

۵ ۔ اس شعر کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

۱ ۔ جب تک ہم ناتجربہ کار تھے، یہی سمجھتے تھے کہ عشق کا غم معمولی چیز ہے۔ ایسا نہیں کہ برداشت نہ ہو سکے۔ اب تجربے کے بعد معلوم ہوا کہ اسے کم بھی مان لیا جائے تو یہ دنیا بھر کے غموں کے برابر ہے۔

۲ ۔ ہم بھی ایک زمانے میں غمِ عشق کو زیادہ بڑی چیز نہیں سمجھتے تھے۔ اب تجربہ کیا تو معلوم ہوا کہ غمِ عشق کم ہو جائے تو دنیا کے دوسرے غم اس کی جگہ لے لیتے ہیں۔

اس آخری شرح کی تائید مرزا غالب کے ایک اور شعر سے ہوتی ہے:

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

مرزا نے اس میں ایک بہت بڑی حقیقت بیان کی ہے۔ عشق ایک لگن اور ایک دُھن ہے۔ جب تک انسان اس دھن میں مگن رہے، اسے کسی دوسری چیز کا خیال نہیں آتا، گویا وہ تمام تشویشوں سے بالکل محفوظ رہتا ہے۔ اگر اسے کسی خاص کام کی دھن اور لگن نہ ہو تو دنیا کی چھوٹی چھوٹی حقیر باتیں اس کے لیے پریشانی کا باعث بنتی رہیں گی۔

(۰)

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

۱۔ شرح: خواجہ حالیؔ مرحوم اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "بادی النظر

غرض اس سے ہیں چار معصوم
جس سے ہے چشمِ جاں کو زیبائی

اور بارہ امام ہیں بارہ
جس سے ایماں کو ہے توانائی

ان کو غالب یہ سال اچھا ہے
جو آئمہ کے ہیں تَوَلّائی

۵- شرح : یوں عبارت آرائی سے کام لیے بغیر تاریخ کا ہجری سال تو معلوم ہو گیا یعنی ۱۲۷۸ھ۔

۶- شرح : لیکن لطیفہ گوئی کا ذوق اب الگ کار فرمائی چاہتا ہے۔

۷- شرح : وہ کہتا ہے کہ سات جمع سات چودہ ہوتے ہیں۔ اس جمع سے سعادت میں اضافہ ہونے کی امید ہے۔

۸- شرح : چودہ کے ہندسے سے چودہ معصوم مراد ہیں۔ جن سے جان کی آنکھ کو آرائش ملتی ہے۔

۹- شرح : اور بارہ کا ہندسہ بارہ اماموں کی طرف اشارہ ہے جن سے ایمان قوی ہوتا ہے۔

۱۰- لغات : تَوَلّائی : محبت کرنے والا۔
شرح : اے غالب! یہ سال اُن لوگوں کے لیے بہت اچھا ہے جنھیں اماموں سے محبت کا دعویٰ ہے۔

(۶)

قطعہ تاریخ تکشیف الحکمہ

سلیم خاں کہ وہ ہے نورِ چشمِ واصل خاں
حکیم حاذق و دانا ہے وہ لطیف کلام

تمہید :- طب کے متعلق یہ کتاب حکیم سلیم خان ابن

تمام دہر میں اس کے مطب کا چرچا ہے
کسی کو یاد بھی لقمان کا نہیں ہے نام
اُسے فضائلِ علم و ہنر کی افزائش
ہوئی ہے مبدءِ عالم سے، اِس قدر انعام
کہ بحثِ علم میں، اطفالِ ابجدی اس کے
ہزار بار فلاطوں کو دے چکے الزام
عجیب نسخۂ نادر لکھا ہے ایک اس نے
کہ جس میں حکمتِ طب ہی کے مسئلے ہیں تمام
نہیں کتاب، ہے اک منبعِ نکاتِ بدیع
نہیں کتاب، ہے اک معدنِ جواہر کام
کل اس کتاب کے سالِ تمام میں جو مجھے
کمالِ فکر میں دیکھا خرد نے بے آرام
کہا یہ جلد کہ تو اس میں سوچتا کیا ہے؟
"لکھا ہے نسخۂ تحفہ"، یہی ہے سالِ تمام

حکیم واصل خاں کی تصنیف تھی، جیسا کہ میرزا نے قطعے میں واضح کردیا ہے۔

۱۔ شرح: سلیم خاں واصل خاں کا نورِ چشم ہے۔ وہ بڑا ماہر اور دانشمند طبیب ہے اور اس کی باتیں بھی نہایت پُر لطف ہوتی ہیں۔

۲۔ شرح: زمانہ بھر میں اس کا مطب مشہور ہے۔ لوگ علاج کے لیے اسی کے ہاں جاتے ہیں اور لقمان حکیم کا نام بھی کسی کو یاد نہیں رہا۔

۳،۴۔ لغات:
مبدءِ عالم: دُنیا کا آغاز۔
اطفالِ ابجدی: ابجد پڑھنے والے لڑکے۔

شرح: جب سے دنیا کا آغاز ہوا ہے، اُسے اللہ تعالیٰ نے علم و ہنر

بڑھانے کی ایسی توفیق عطا فرمائی ہے کہ اس کے ہاں جو لڑکے ابھی ابتدائی درس لیتے ہیں، وہ افلاطون کو بحث میں ہزار مرتبہ ہرا چکے ہیں۔

۵۔ **شرح** : اس نے ایک عجیب نادر نسخہ لکھا ہے جس میں اوّل سے آخر تک طب کے تمام مسئلے بیان کر دیئے گئے ہیں۔

۶۔ **لغات** : منبع : سرچشمہ۔
نکاتِ بدیع : نئے نئے نکتے۔
معدنِ جواہر کام : گوہر بھری کان۔

شرح : یہ کتاب نہیں، بلکہ نئے نئے نادر نکتوں کا سرچشمہ ہے۔ یہ کتاب نہیں بلکہ ایک کان ہے، جو گوہروں سے بھرپور ہے۔

۷-۸۔ **شرح** : کل عقل نے مجھے اس کتاب کے پورا ہو جانے کی تاریخ سوچتے سوچتے مضطرب و بیتاب پایا تو فوراً کہا : اس بارے میں کیا سوچتا ہے "لکھا ہے نسخۂ تحفہ"، بس اسی سے اس کے پورا ہونے کا سال نکلتا ہے۔

(۷)

اٹھا اک دن بگولا سا جو کچھ میں جوشِ وحشت میں
پھرا آسیمہ سر گھبرا گیا تھا جی بیاباں سے
نظر آیا مجھے اک طائرِ مجروح پر بستہ
ٹپکتا تھا سرِ شوریدہ دیوارِ گلستاں سے
کہا میں نے کہ او گمنام، آخر ماجرا کیا ہے
پڑا ہے کام تجھ کو کس ستمگر آفتِ جاں سے
ہنسا کچھ کھلکھلا کر پہلے، پھر مجھ کو جو پہچانا
تو یہ رویا کہ جوئے خوں بہی پلکوں کے داماں سے

۱۔ **لغات** :
آسیمہ سر : پریشان حال۔

شرح : یک دن بیابان میں بگولا سا تھا اور میں وحشت کے جوش میں پریشان حال بنا۔ حقیقت یہ ہے کہ بیابان میں پھرتے پھرتے دل گھبرا گیا تھا۔

۲- شرح : واپس آیا تو مجھے ایک پرندہ دکھائی دیا، جو زخمی تھا اور اس کے پَر بندھے ہوئے تھے۔ وہ باغ کی دیوار سے، دیوانہ وار سر پٹک رہا تھا۔

کہا میں صید ہوں اس کا کہ جس کے دام گیسو میں
پھنسا کرتے ہیں طائر روز آکر باغِ رضواں سے

اسی کے زلف و رخ کا دھیان ہے شام و سحر مجھ کو
نہ مطلب کفر سے ہے اور نہ ہے کچھ کام ایماں سے

بہ چشم غور جو دیکھا مرا ہی طائرِ دل تھا
کہ جل کر ہو گیا یوں خاک مری آہ سوزاں سے

۳- شرح : میں نے اس سے پوچھا کہ او گمنام پرندے! تجھ پر کیا گزری؟ تجھے کس جان لیوا ستمگر سے کام پڑ گیا!

۴- شرح : میری بات سنتے ہی وہ پہلے تو کھلکھلا کر ہنسا۔ پھر مجھے پہچان لیا تو اتنا رویا کہ پلکوں کے دامن سے خون کی ندی بہ نکلی۔

۵- شرح : پھر کہا: میں اُس ظلم کا شکار ہوں، جس کی زلفوں کے جال میں باغِ رضواں (بہشت) کے پرندے آ آ کر پھنسا کرتے ہیں۔

۶- شرح : مجھے صبح و شام اُسی کی زلف اور چہرے کا تصور بندھا رہتا ہے، نہ مجھے کفر سے کوئی غرض اور نہ ایمان سے کچھ کام۔

۷- شرح : جب میں نے ذرا توجہ سے دیکھا تو وہ میرا ہی طائرِ دل تھا، جو میری شعلوں بھری آہ سے جل کر راکھ ہو گیا تھا۔

(۸)

۱- شرح : آج کل ہمارے لیے فراغت، آرام اور

کیا ان دنوں بسر ہو ہماری فراغ میں
کچھ تفرقہ رہا نہ دل و درد و داغ میں

چاہا بہ چشمِ شوق، جو موسیٰ نے طور پر
یاں دیکھتے ہیں روز وہی ہر چراغ میں

یہ مکنت و وقار علائی یہ وحشتیں
شورش ہے کچھ ضرور تمہارے دماغ میں

آسودگی سے زندگی بسر کرنے کی کون سی صورت ہو سکتی ہے جبکہ دل، درد اور داغ میں جدائی باقی ہی نہیں رہی۔ انسان کا اطمینان خاطر اس وقت زائل ہو جاتا ہے۔ جب درد شروع ہو جائے یا دل پر کوئی داغ لگ جائے۔ جس حالت میں درد و داغ دل کے مستقل رفیق بن جائیں تو اطمینان سے دن گزارنا ممکن ہی نہیں رہتا۔

۲۔ **شرح :** حضرت موسیٰ جو جلوہ شوق کی آنکھوں سے کوہ طور پر دیکھنے کے آرزو مند تھے۔ وہ ہمیں روزانہ ہر چراغ میں نظر آتا ہے۔

۳۔ **لغات : مکنت :** قدرت، طاقت، توانائی

وقار : اصل لفظ، بافتح ہے یعنی وَقار۔ لیکن فارسی والے خدا جانے کیوں بالکسر بولنے لگے (وِقار) بہ معنی حلم، تسکین، بعض اوقات جاہ و جلال کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

وحشت : کئی معنی ہیں۔ مثلاً نفرت۔ گھبراہٹ، جہالت، اداسی، آوارگی۔ اُلٹے سیدھے طور اختیار کرنا۔ غیر مانوس حرکتوں کا صادر ہونا۔ علائی سے مراد نواب علاء الدین احمد خاں، بن نواب امین الدین احمد خاں والی لوہارو ہیں، جو میرزا کے عزیز بھی تھے۔ یعنی غالب کی بیگم علائی کے والد کی پھوپھی بھی تھی علائی کے دادا احمد بخش خاں اور بیگم غالب کے والد الٰہی بخش خاں حقیقی بھائی تھے۔ علائی زیادہ تر لوہارو میں رہتے تھے ان میں اور میرزا غالب میں چھیڑ چھاڑ اور لطیفہ بازی کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ علائی نے خط لکھنے میں دیر کی۔ چپ چاپ اپنے کام میں مصروف رہے۔ لہٰذا میرزا نے یہ قطعہ انہیں لکھا جس کے آخری شعر کا مطلب یہ ہے کہ بڑے آرام اور آسودگی سے بیٹھے ہو۔ الٹی سیدھی حرکتیں کر رہے ہو۔ یقیناً تمہارے دماغ میں شورش ہے۔

(۹)

مجلسِ شمعِ عذاراں میں جو آ جاتا ہوں
شمع ساں میں تہِ دامانِ صبا جاتا ہوں

سرگراں مجھ سے سبک رو کے نہ رہنے سے ہو
کہ بہ یک جنبشِ لب مثلِ صدا جاتا ہوں

ہووے ہے جادۂ رہ، رشتۂ گوہر ہر گام
جس گزرگاہ میں، میں آبلہ پا جاتا ہوں

۱- لغات : شمع عذار : شمع جیسے رخساروں والا کیونکہ فارسی میں عذار بہ معنی رخسار ہے۔ مطلب ہے روشن چہرے والے یعنی محبوب۔ حسین۔

شرح : میں جب حسینوں اور معشوقوں کی مجلس میں آ جاتا ہوں تو شمع کی طرح دامنِ صبا کی اوٹ جا پہنچتا ہے۔ قاعدہ ہے کہ شمع کو ہوا کے جھونکے سے بچائے رکھنے کے لیے۔ لے کر نکلتے ہیں تو اسے دامن سے ڈھانک لیتے ہیں۔

۲- لغات : سرگراں : ملول، رنجیدہ۔
سبک رَو : تیز چلنے والا۔

شرح : مجھ سے تیز رو کے نہ رہنے سے ملول و رنجیدہ نہ رہو۔ میں تو اتنی تیزی سے جاتا ہوں جیسے لبوں کے ہلنے صدا نکل جاتی ہے

۳- شرح : میرے پاؤں میں چھالے ہیں۔ میں جس گزرگاہ میں قدم رکھتا ہوں ہر قدم پر راستہ وہی شکل اختیار کر لیتا ہے جو موتیوں میں دھاگے کی ہوتی ہے۔ راستے کو رشتے اور چھالوں کو موتیوں سے تشبیہ دی ہے۔

(۱۰)

پیری میں بھی کمی نہ ہوئی تاک جھانک کی
روزن کی طرح دید کا آزار رہ گیا

۱- لغات : تاک جھانک : دزدیدہ نظروں سے دیکھنا۔

وہ مرغ ہے خزاں کی صعوبت سے بے خبر
آیندہ سال تک جو گرفتار رہ گیا

کن انکھیوں سے تماشا کرنا گوشہ چشم سے نظر ڈالنا۔ اسے جھانک تاک بھی کہتے ہیں۔ مطلب ہے حسینوں کو دیکھنا۔

روزن : روشن دان۔ جو مکانوں میں بلندی پر روشنی کی غرض سے رکھ لیتے ہیں

شرح : بڑھاپے میں بھی تاک جھانک کی عادت رہ گئی۔ گویا نظارہ بازی یک روگ ہے۔ ایک لپکا ہے جو ساتھ ساتھ چلا جا رہا ہے اور بڑھاپے میں بھی اس کے اندر کمی نہیں آئی۔ جس طرح مکانوں کی دیواروں میں بلندی پر روشن دان ہوتے ہیں وہی حالت نظارہ بازی کے اس آزار کی ہے، یہ ختم نہیں ہوتا۔

۲۔ لغات : صعوبت : دشواری، دقت، مصیبت۔

شرح : جو پرندہ موسم بہار میں پکڑا گیا اور آیندہ سال تک قفس میں پڑا رہا۔ اسے کیا خبر ہو سکتی ہے کہ موسم خزاں میں کیا کیا مصیبتیں اور مشکلیں آتی ہیں؟ ان مصیبتوں کا اندازہ تو اسی کو ہو سکتا ہے جو پت جھڑ کے موسم باغ کے اندر رہا ہو اور اس نے پریشانیاں دیکھی ہوں دکھ سہے ہوں۔ قفس کے گوشے میں بیٹھے ہوئے پرندے کے لیے بہار و خزاں کی حیثیت یکساں ہے۔

(۱۱)

دیکھ وہ برقِ تبسم، بسکہ دل بیتاب ہے
دیدۂ گریاں مرا فوارۂ سیماب ہے
کھول کر دروازہ میخانے کا بولا میفروش
اب شکستِ توبہ میخواروں کو فتح الباب ہے

۱۔ شرح : مسکراہٹ کی بجلی چمکی یعنی محبوب مسکرایا یہ کیفیت دیکھتے ہی دل بے قرار ہو گیا۔ آنکھیں غم عشق میں پہلے ہی رو رہی تھیں اب وہ پارے کا فوارہ بن گئیں۔ یعنی ایسا فوارہ جس سے پانی کے بجائے پارہ اچھل اچھل

کر باہر آ رہا ہو۔ یہ دل کی بے تابی کا کرشمہ ہے جس کی وجہ سے آنکھوں سے بہنے والا پانی سیماب بن گیا۔

۲۔ لغات : فتح الباب : دروازے کا کھلنا۔

شرح : شراب بیچنے والے نے شراب خانے کا دروازہ کھولا اور پکار کر کہا کہ اب شراب نوشوں کے لیے موقع ہے کہ توبہ توڑ ڈالیں چلے آئیں اور اپنا شوق پورا کریں۔ شراب خانے کا دروازہ کھلنا ان کے لیے باب مراد کا کھلنا ہے۔

(۱۲)

اک آہِ گرم کی تو ہزاروں کے گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے
پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لیے اسدؔ
ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

۱۔ شرح : ہمارا جگر عشق کی آگ میں جل چکا ہے حالت یہ ہے کہ ہم ایک گرم آہ کر دیں تو ہزاروں گھروں میں آگ بھڑک اٹھے اور سب کچھ جل جائے۔

۲۔ شرح : اسدؔ، میرزا غالبؔ کا ابتدائی تخلص، جسے بعد میں کبھی کبھی استعمال کرتے رہے۔

اے اسدؔ شمع شام سے صبح تک ہر وقت جلتی ہے۔ تمہیں معلوم ہے اس کا سبب کیا ہے؟ یہ پروانے کے غم کا اثر ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس بیچاری کو کیا پڑی تھی کہ ہر رات شام سے صبح تک جل جل کر پگھلتی رہتی۔

(۱۳)

گوڑگانویں کی ہے جتنی رعیت وہ یک قلم
عاشق ہے اپنے حاکمِ عادل کے نام کی

۱۔ شرح : پیارے لال آشوب، میرزا غالب کے عزیز

سو یہ نظر فروز قلم دان نذر ہے
مسٹر کووان صاحب عالی مقام کی

شاگرد تھے۔ انھوں نے پرانے دہلی کالج میں تعلیم پائی تھی۔ پھر محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کر لی۔ بلند عہدے پر پہنچے اور رائے بہادر کا خطاب پایا ۱۸۹۶ء میں پنشن لی۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ مثلاً رسوم ہند۔ قصص ہند حصہ اول و سوم۔ وغیرہ۔ لالہ سری رام مصنف "خمخانۂ جاوید" رائے بہادر موصوف کے بھتیجے تھے۔

پیارے لال کچھ مدت گوڑگاؤں کے سکول میں ہیڈ ماسٹر رہے۔ وہاں مسٹر کوآن اسسٹنٹ کمشنر تھے ان کا تبادلہ ہوا تو اہل گوڑگاؤں نے چاندی کا ایک قلمدان بطور یادگار ان کی خدمت میں پیش کرنے کا انتظام کیا۔ اس پر ایک موزوں شعر کندہ کرانا منظور تھا۔ اس غرض سے پیارے لال اپنے ایک دوست کے ہمراہ میرزا غالب کی خدمت میں پہنچے۔ مدعا بیان کیا میرزا نے مندرجہ ذیل قطعہ ان کے حوالے کر دیا۔ اسی وقت سے میرزا کے ساتھ آشوب کے تعلق کی ابتدا ہوئی پھر روابط بہت بڑھ گئے۔

۱۔ شرح : گوڑگاؤں کی جتنی رعایا ہے وہ پوری کی پوری اپنے عادل دوست اور منصف مزاج حاکم کے نام کی عاشق ہے۔ حاکم سے مراد مسٹر کوآن ہیں۔

۲۔ شرح : اس محبت کی یادگار کے طور پر رعایا یہ نظروں کو روشن کرنے والا قلمدان مسٹر کوآن کی نذر کر رہی ہے۔ جن کا مقام بلند ہے۔

(۱۴)

ہم نشیں تارے ہیں اور چاند شہاب الدین خان
بزم شادی ہے فلک، کاہکشاں ہے سہرا
ان کو لڑیاں نہ کہو، بحر کی موجیں سمجھو
ہے تو کشتی میں، و لے بحرِ رواں ہے سہرا

۱۔ شرح : شہاب الدین خان چاند ہے اور اس کے دوست احباب تارے ہیں۔ آسمان کو شادی کی محفل سمجھیں تو کہکشاں کو

سہرا قرار دے لینا زیبا ہے

ظاہر ہے کہ یہ سہرا شہاب الدین احمد خاں ثاقب بن نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر کی شادی پر کہا گیا تھا اور اس کے صرف دو شعر رہ گئے، لیکن باقی شعر مل نہ سکے۔

۲۔ شرح : سہرے کی لڑیوں کو لڑیاں نہ کہو، یہ سمندر کی لہریں ہیں۔ اگرچہ سب کشتی میں لگا کر لائے ہیں۔ لیکن خود سہرا لہریں لیتا ہوا سمندر رہے۔

۱۔ لغات :

دائرہ : ڈفلی کی قسم کا ایک ساز، جس کی ایک طرف منڈھی ہوئی اور دوسری کھلی ہوتی ہے۔

چرخ تک دُھوم ہے، کس دھوم سے آیا سہرا
چاند کا دائرہ لے، زہرہ نے گایا سہرا
رشک سے لڑتی ہیں آپس میں اُلجھ کر لڑیاں
باندھنے کے لیے جب سر پہ اُٹھایا سہرا

شرح : سہرا اس دھوم سے آیا کہ آسمان تک دھوم مچ گئی۔ زہرہ نے چاند کی ڈفلی ہاتھ میں لے کر سہرا گانا شروع کر دیا۔

۲۔ شرح : جب سہرا سر پر باندھنے کے لیے اٹھایا تو اس کی لڑیاں رشک کے باعث باہم الجھ کر لڑنے لگیں۔

(۱۵)

ایک اہلِ درد نے سنسان جو دیکھا قفس
یوں کہا: آتی نہیں کیوں اب صدائے عندلیب
بال و پر دو چار دکھلا کر کہا صیاد نے
یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب

۱-۲۔ شرح : ایک دردمند نے پنجرے کو سنسان دیکھا تو کہا کہ بلبل کی آواز کیوں نہیں آتی؟ جواب میں صیاد نے دو چار پَر اٹھا کر دکھا دیے اور کہا: بس بلبل کی جگہ اس کی یہ نشانی باقی رہ گئی ہے۔

میں یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے، مگر غور سے دیکھا جائے تو بالکل اچھوتا خیال ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ دنیا میں آسان سے آسان کام بھی دشوار ہے، اور دلیل یہ ہے کہ آدمی جو عین انسان ہے، اس کا بھی انسان بننا مشکل ہے۔ یہ منطقی استدلال نہیں، بلکہ شاعرانہ استدلال ہے، جس سے بہتر ایک شاعر استدلال نہیں کر سکتا۔" (یادگار غالب صفحہ ۹)

معلوم نہیں خواجہ مرحوم نے اس کے شاعرانہ استدلال ہونے پر کیوں زور دیا، کیونکہ استدلالی ہر لحاظ سے معقول و محکم ہے یعنی ہر آدمی نوع کے اعتبار سے یقیناً انسان ہے اور حضرت آدمؑ کی اولاد میں سے ہے، لیکن انسانیت کی حقیقی صفات ہر آدمی میں نظر نہیں آتیں۔ ہر آدمی کمال انسانیت کے درجے پر نہیں پہنچتا اور اخلاق و فضائل کے اعتبار سے اشرف المخلوقات نہیں بنتا، لہذا یہ کہنا کہ ہر آدمی کو انسان ہونا میسر نہیں، اتنا بدیہی

گریہ چاہے ہے خرابی میرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر، اور آپ ہی حیراں ہونا

جلوہ از بس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہر آئنہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

عشرت قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط
تُو ہو، اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا

عشرت پارۂ دل، زخمِ تمنا کھانا
لذّتِ ریشِ جگر، غرقِ نمک داں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زُود پشیمان کا پشیماں ہونا

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

تمہید :- مندرجۂ ذیل دو قطعے ۲۱-جولائی ۱۸۶۶ء کے مکتوب میں سیف الحق میاں داد خاں سیاح کو لکھے گئے تھے۔ سیاح نے غالباً میر غلام بابا رئیس سورت کی شادی کی تقریب پر تاریخ کی فرمائش کی تھی۔ میرزا فرماتے ہیں: "میں فنِ تاریخ گوئی و معمّا سے بیگانۂ محض ہوں۔ حساب سے میرا جی گھبراتا ہے اور مجھ کو جوڑ لگانا نہیں آتا۔" سیاح نے لکھا تھا کہ سید غلام بابا کسی بحر میں نہیں آتا۔ فرماتے ہیں کیوں نہیں آتا۔ اور یہ دو قطعے لکھ بھیجے۔

(۱۶)

جب کہ سید غلام بابا نے
مسندِ عیش پر جگہ پائی
ایسی رونق ہوئی برات کی رات
کہ کواکب ہوئے تماشائی

(۱۷)

ہزار شکر کہ سید غلام بابا نے
فرازِ مسندِ عیش و طرب جگہ پائی
زمیں پر ایسا تماشا ہوا برات کی رات
کہ آسمان پہ کواکب بنے تماشائی

۱-۲ **لغات :** کواکب : کوکب کی جمع، ستارے۔

شرح : جب سید غلام بابا عیش کی مسند پر تشریف فرما ہوئے تو برات کی رات اتنی رونق ہوئی کہ آسمان پر ستارے بھی اس رونق کو نگاہِ شوق سے دیکھنے لگے۔

۱-۲ **شرح :** ہزار شکر کا مقام ہے کہ سید غلام بابا عیش و طرب کی مسند پر تشریف فرما ہوئے۔ برات کی رات زمین پر ایسی محفلِ نشاط آراستہ ہوئی کہ آسمان پر ستارے بھی شوق کی نگاہوں سے نظارے میں مصروف ہو گئے۔

خمسہ بر غزل ابوظفر بہادر شاہ

گھستے گھستے پاؤں میں زنجیر آدھی رہ گئی
مر گئے پر قبر میں تعمیر آدھی رہ گئی
سب ہی پڑھتا، کاش! کیوں تکبیر آدھی رہ گئی
کھینچ کے قاتل! جب تری شمشیر آدھی رہ گئی
غم سے جانِ عاشقِ دلگیر آدھی رہ گئی

بیٹھے رہتا لے کے چشمِ پُرنم اُس کے رُو برُو
کیوں کہا تو نے کہ کہہ دل کا غم اُس کے رو برو
بات کرنے میں نکلتا ہے دم اس کے رو برو
کہہ سکے ساری حقیقت کب ہم اس کے رو برو
ہم نشیں! آدھی ہوئی تقریر، آدھی رہ گئی

تو نے دیکھا، مجھ پہ کیسی بن گئی اے راز دار
خواب و بیداری پہ کب ہے آدمی کو اختیار

تمہید: مخمس بہادر شاہ ظفر کی غزل پر کہا گیا۔ اور یقیناً بادشاہ کی فرمائش کا نتیجہ ہی ہوگا۔

۱۔ **شرح:** میرے پھرتے پھرتے پاؤں کی زنجیر گھس گھس کر آدھی رہ گئی۔ ہم مر گئے۔ لیکن قبر کی تعمیر پوری نہ ہو سکی، آدھی ہی رہ گئی۔ کاش میں تکبیر پوری کی پوری پڑھتا، مگر بیچ میں ہی چھوڑنی پڑی۔ اے قاتل! جب تیری تلوار کھینچ کر آدھی رہ گئی۔ تو نتیجہ یہ ہوا کہ غمگین عاشق کی جان بھی غم کے باعث آدھی رہ گئی۔

مثلِ زخم آنکھوں کو سی دیتا، جو ہوتا ہوشیار

"کھینچتا تھا رات کو میں خواب میں، تصویرِ یار

جاگ اُٹھا، جو کھینچی تصویر آدھی رہ گئی"

غم نے جب گھیرا تو چاہا ہم نے، یوں اے دلنواز

مستیِ چشمِ سیہ سے چل کے ہوویں چارہ ساز

تو صدائے پا سے جاگا تھا جو محوِ خوابِ ناز

"دیکھتے ہی اے ستمگر! تیری چشمِ نیم باز

کی تھی پوری ہم نے جو تدبیر، آدھی رہ گئی"

اس بُتِ مغرور کو کیا ہو کسی پر التفات

جس کے حسنِ روز افزوں کی یہ اک ادنیٰ ہے بات

ماہِ نو نکلے پہ گزری ہوں گی راتیں پانچ سات

"اس رخِ روشن کے آگے ماہِ یک ہفتہ کی رات

تابشِ خورشیدِ پُرتنویر، آدھی رہ گئی"

تا مجھے پہنچائے کاہش، بخت بد ہے گھات میں

ہاں فراوانی اگر کچھ ہے تو ہے آفات میں

۲۔ شرح :

کاش میں اپنی پُرنم آنکھیں سے کر محبوب کے سامنے بیٹھ رہتا اور مُنہ سے کچھ نہ کہتا اے ہمنشیں! تو نے کیوں یہ مشورہ دیا کہ دل کا غم اس کے روبرو بیان کر دے؟ حالت یہ ہے کہ اس کے سامنے بات کرنے میں جان نکلتی ہے۔ بھلا ہم کب پوری حقیقت اس سے کہہ سکے؟ ہماری کیفیت نصف بیان ہوئی تھی۔ نصف باقی رہ گئی۔

۳۔ شرح :

اے رازدار! تو نے دیکھا کہ مجھ پر کیا بن گئی؟ بھلا سونے اور جاگنے پر آدمی کو اختیار کب ہے؟ اگر میں

جز غم داغ و الم گھٹتا ہے ہر اک بات میں
"کم نصیبی اس کو کہتے ہیں کہ میرے ہات میں
آتے ہی خاصیتِ اکسیر، آدھی رہ گئی"

سب ہے یہ گوشہ، کنارے ہے، گلے لگ جا مرے
آدمی کو کیوں پکارے ہے، گلے لگ جا مرے
سر سے گر چادر اتارے ہے، گلے لگ جا مرے
"مانگ کیا بیٹھا سنوارے ہے، گلے لگ جا مرے
وصل کی شب لے بتِ بے پیر آدھی رہ گئی"

میں یہ کیا جانوں کہ وُہ کس واسطے ہوں پھر گئے
پر نصیب اپنا انھیں جاتے سنا، جوں پھر گئے
دیکھنا قسمت، وُہ آئے اور پھر یوں پھر گئے
"آ کے آدھی دُور میرے گھر سے وُہ کیوں پھر گئے
کیا کشش میں دل کی اب تاثیر آدھی رہ گئی"

ناگہاں یاد آ گئی ہے مجھ کو یارب کب کی بات
کچھ نہیں کہتا کسی سے، سُن رہا ہوں سب کی بات

اپنے آپ میں ہوتا تو آنکھوں کو زخم قرار دے کر ہی ڈالتا تاکہ وہ کبھی نہ کھلتیں۔ اب مصیبت یہ پیش آئی کہ میں رات سوتے میں محبوب کی تصویر کھینچ رہا تھا۔ آدھی کھینچی تھی کہ یکایک آنکھ کھل گئی اور آدھی باقی رہ گئی۔

۴ - شرح :
اے دلنواز محبوب! جب غم نے ہمیں، چاروں طرف سے گھیر لیا تو دل میں خیال پیدا ہوا تیری چشم سیاہ کی مستی سے غم کا علاج کریں۔ ہم تیرے قریب پہنچے تو پاؤں کی آہٹ پاکر تو خواب ناز سے جاگ اٹھا۔ اے ظالم! تیری آدھی کھلی آنکھیں دیکھتے ہی ہماری سوچی سمجھی جڑی

کس لیے تجھ سے چھپاؤں؟ ہاں وُہ پرسوں شب کی بات
" نامہ بر جلدی میں تیری، وُہ جو تھی مطلب کی بات
خط میں آدھی ہو سکی تحریر، آدھی رہ گئی "

ہو تجلی برق کی صورت میں، یہ بھی ہے غضب
پانچ چھ گھنٹے تو ہوتی فرصتِ عیش و طرب
شام سے آتے تو کیا اچھی گزرتی رات سب
" پاس میرے وُہ جو آئے بھی تو بعد از نصف شب
نکلی آدھی حسرت، اے تقدیر! آدھی رہ گئی "

تم جو فرماتے ہو دیکھ اے غالبِ آشفتہ سر
ہم نہ تجھ کو منع کرتے تھے، گیا کیوں اس کے گھر
جان کی پاؤں اماں، باتیں یہ سب سچ ہیں، مگر
" دل نے کی ساری خرابی، لے گیا مجھ کو، ظفرؔ!
واں کے جانے میں مری توقیر، آدھی رہ گئی "

تحریر درہم برہم ہو گئی، پوری نہ ہو سکی۔ آدھی ہی رہ گئی۔ گویا بالکل بے نتیجہ رہی۔ کیونکہ اس کا نتیجہ خیز ہونا۔ پورا ہونے پر موقوف تھا۔

۵۔ شرح : ہمارا مغرور محبوب کسی پر کب التفات کر سکتا ہے، جس کے حسن کا ہر روز بڑھے جانا معمولی بات ہے۔ نئے چاند کو نکلے پانچ سات راتیں گزری ہوں گی۔ ایک ہفتے کے چاند کی رات ہمارے محبوب کا رخ روشن نمایاں ہو تو اس کے سامنے پُرنور سورج کی چمک دمک بھی ماند پڑ کر آدھی رہ گئی۔

۶۔ لغات : کاہش : گھٹاؤ، لاغری، کمزوری۔

شرح : بدنصیبی گھات میں بیٹھی ہے۔ چاہتی ہے کہ مجھے کمزور کرے اور نقصان پہنچائے۔ میرے لیے کثرت و فراوانی ہے تو آفتوں میں ہے۔ یعنی آفتیں مجھ

پر بہت زیادہ نازل ہوتی ہیں۔ رنج، غم اور الم ہی کی زیادتی ہے۔ ان کے سوا ہر بات میں کمی ہے۔ کم نصیبی اسی کو کہتے ہیں کہ اکسیر، جو مسِ خام کو بھی کندن بنا دیتی ہے، میرے ہاتھ میں پہنچی تو اس کا اثر آدھا رہ گیا، شاعر کا کمال دیکھیے کہ بے نصیبی نہ کہا حالانکہ یہ اعتبارِ نتیجہ بے نصیبی ہی تھی۔ کم نصیبی اس لیے کہا کہ اکسیر ہاتھ تو آ گئی، مگر اس کی خاصیت آدھی رہ گئی۔

۷۔ شرح : یہ گوشہ سب سے الگ تھلگ ہے۔ یہاں آس پاس کوئی نہیں۔ اے محبوب! آ اور میرے گلے لگ جا۔ تُو مانگ کو کیوں سنوار رہا ہے؟ میرے گلے لگ جا۔ اگر سر سے چادر اتار رہا ہے تو میرے گلے لگ جا۔ اے بے پیر بُت! بیٹھا ہوا مانگ کیا سنوار رہا ہے؟ میرے گلے لگ جا۔ تو نہیں دیکھتا کہ وصل کی رات آدھی گزر چکی ہے۔ اور آدھی باقی رہ گئی ہے؟ دیکھیے جزئیات پر شاعر کی نظر کتنی گہری ہے۔ مانگ سنواری ہی نہیں جا سکتی جب تک چادر یا دوپٹا سر سے اتار نہ جائے۔

۸۔ شرح : بھلا مجھے کیا معلوم کہ وہ (محبوب) آتے آتے کیوں لوٹ گئے؟ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ جب اُن کے لوٹنے کا سنا تو میں نے جانا کہ جس طرح میرا نصیبا پھرا ہوا ہے، اسی طرح وہ بھی پھر گئے۔ قسمت تو دیکھو کہ وہ آئے اور یوں لوٹ گئے۔ اپنے گھر سے نکلے میرے گھر کا رُخ کر لیا۔ لیکن جب میرا گھر آدھی دور رہ گیا تو سمجھ میں نہ آیا کہ انھیں لوٹ جانے کا خیال کیوں ہوا؟ کیا میں یہ سمجھوں کہ میرے دل کی کشش میں تاثیر آدھی رہ گئی تھی کہ اپنے مکان تک انھیں نہ کھینچ سکا۔

۹۔ شرح : دیکھو، اچانک مجھے کب کی بات یاد آ گئی۔ سب کی باتیں سن رہا ہوں، کسی سے کچھ کہتا نہیں، لیکن اے نامہ بر! تجھ سے پرسوں رات کی بات کیوں چھپاؤں؟ تو خط لے کر جاتے میں جلدی کر رہا تھا اور جو مطلب کی بات تھی، آدھی لکھی گئی۔ اور آدھی باقی رہ گئی۔

۱۰۔ شرح : اگر محبوب بجلی کی طرح چمک کر جلوہ دکھائے تو یہ بھی غضب کی بات ہے۔ یعنی اس سے دل کی تسلی کیونکر ہو سکتی ہے کہ جلوہ دکھائے اور غائب ہو جائے۔ آٹھ پانچ پہر گھنٹے کی فرصت تو ہونی چاہیے تھی تاکہ خوب خوشیاں منا لیتے۔ اگر شام ہی سے آ جاتے تو

ساری رات کتنی اچھی گذرتی! لیکن وہ میرے پاس آئے بھی تو آدھی رات گزر جانے کے بعد آئے۔ گویا دل کی حسرت آدھی نکلی اور اسے تقدیر، آدھی باقی رہ گئی۔

۱۱- شرح : دوستو! تم اب یہ فرماتے ہو کہ لے دیوانے غالب! کیا ہم تجھے منع نہیں کرتے تھے کہ اس کے گھر نہ جاؤ؟ جان کی امان پاؤں - جو کچھ کہتے ہیں ـ سب، سچ ہے، مگر میں، کیا کروں اے ظفر! یہ ساری خرابی دل کی ہے۔ وہی مجھے لے گیا اور یہ صحیح ہے کہ وہاں جانے میں میری عزت آدھی رہ گئی۔

سلام

سلام اسے کہ اگر بادشا کہیں اس کو
تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اس کو

نہ بادشاہ، نہ سلطاں، یہ کیا ستائش ہے
کہو کہ خامسِ آلِ عبا کہیں اس کو

خدا کی راہ میں شاہی و خسروی کیسی
کہو کہ رہبرِ راہِ خدا کہیں اس کو

خدا کا بندہ، خداوند گار بندوں کا
اگر کہیں نہ خداوند، کیا کہیں اس کو

فروغِ جوہرِ ایماں، حسینؑ ابنِ علیؑ
کہ شمعِ انجمنِ کبریا کہیں اس کو

۱- شرح : اُس مقدس وجود کو سلام جسے بادشاہ کہیں تو خود ہی خیال آتا ہے کہ کچھ اس سے سوا کہنا چاہیے

۲- لغات : آلِ عبا : وہ بزرگ ہستیاں، جنھیں عام روایت کے مطابق رسول اللہ صلعم، نے اپنی عبائے مبارک میں لے کر آیت تطہیر پڑھی یعنی انھیں گناہوں سے بالکل پاک قرار دیا۔ مراد ہے حضرت

کفیلِ بخششِ امت ہے، بن نہیں پڑتی
اگر نہ شافعِ روزِ جزا کہیں اس کو

مسیح جس سے کرے اخذِ فیضِ جاں بخشی
ستم ہے کشتۂ تیغِ جفا کہیں اس کو

وہ جس کے ماتمیوں پر ہے سلسبیل سبیل
شہیدِ تشنہ لبِ کربلا کہیں اس کو

عدو کے سمعِ رضا میں جگہ نہ پاتے وہ بات
کہ جنّ و انس و ملک سب بجا کہیں اس کو

بہت ہے پایۂ گردِ رہِ حسینؑ بلند
بہ قدرِ فہم ہے گر کیمیا کہیں اس کو

نظارہ سوز ہے یاں تک ہر ایک ذرّۂ خاک
کہ ایک جوہرِ تیغِ قضا کہیں اس کو

ہمارے درد کی یارب کہیں دوا نہ ملے
اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اس کو

ہمارا منہ ہے کہ دیں اس کے حسنِ صبر کی داد
مگر نبیؐ و علیؑ مرحبا کہیں اس کو

فاطمہؓ، حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ چونکہ اس مقدس جماعت کی گنتی میں رسول اللہ (صلعم) سب سے پہلے گنتے ہیں، اس لیے حضرت امام حسینؓ کو خامسِ آلِ عبا کہتے ہیں، یعنی آلِ عبا میں سے پانچویں۔

شرح: نہ وہ بادشاہ ہیں، نہ وہ سلطان ہیں۔ انھیں ایسے القاب سے یاد کرنا ستائش کا کون سا طریقہ ہے؟ یہ کہنا چاہیے کہ وہ آلِ عبا میں سے پانچویں بزرگ ہیں۔

۳۔ شرح: بھلا اللہ تعالیٰ کے راستے میں بادشاہی اور خسروی کی کیا حیثیت ہے کہ حضرت امام حسینؓ کے لیے یہ لقب جائز،

زمامِ خاتمِ کف اس کے ہیں ہے کہ اہلِ یقیں
پس از حسینؑ علیؑ پیشوا کہیں اس کو
وُہ ریگِ تفتۂ وادی پہ گام فرسا ہے
کہ طالبانِ خدا رہنما کہیں اس کو
امامِ وقت کی یہ قدر ہے کہ اہلِ عناد
پیادہ لے چلیں اور نا سزا کہیں اُس کو
یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمنِ دیں
علیؑ سے آ کے لڑے اور خطا کہیں اُس کو
یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ
بُرا نہ مانیے گر ہم بُرا کہیں اس کو
علیؑ کے بعد حسنؑ اور حسنؑ کے بعد حسینؑ
کرے جو ان سے برائی بھلا کہیں اس کو؟
نبی کا ہو نہ جسے اعتقاد کافر ہے
رکھے امام سے جو بغض کیا کہیں اس کو؟
بھرا ہے غالبؔ دل خستہ کے کلام میں درد
غلط نہیں ہے کہ خونیں نوا کہیں اُس کو

سمجھے جائیں، یوں کہنا چاہیے کہ آپ راہِ خدا کے رہبر ہیں جن کی پیروی میں لوگ یہ راستہ طے کرتے ہیں

۴۔ شرح:
وہ خدا کے بندے ہیں اور بندگانِ خدا کے آقا ہیں پھر اگر انھیں خداوند نہ کہیں تو کیا کہیں۔ یعنی انھیں خداوند و آقا ہی کہنا مناسب ہے۔

۵۔ شرح:
حسینؑ ابن علیؑ جو سرِ جان کی جلا ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ انھیں انجمن کربلا کی شمع قرار دیں، یعنی خاصانِ خدا کی جو انجمن ہے اس میں حضرت امام حسینؑ کو شمع کی حیثیت حاصل ہے۔

۶۔ لغات : کفیل : کفالت کرنے والا، ضامن، ذمہ دار۔

شرح : انھوں نے بخشش امت کی ذمہ داری اٹھائی ہے۔ لہٰذا ہمیں کہنا چاہیے کہ انھیں قیامت کے دن شفاعت کرنے والا قرار دیا۔

۷۔ شرح : جس سے مسیح بھی جان بخشی کا فیض حاصل کرے، غضب ہے کہ سے ظلم کی تلوار کا کشتہ کہا جائے۔ مطلب یہ کہ ایسے بلند منزلت وجود نے ظلم کی تلوار سے خلعت شہادت پایا۔ شہید ہونے کے اعتبار سے وہ زندہ جاوید ہیں انہیں "کشتہ" نہیں کہا جا سکتا۔

۸۔ لغات : سلسبیل : بہشت کی ایک نہر۔

شرح : وہ پاک ذات، جس کے ایتوں کے لیے سبیل، سلسبیل کی حیثیت رکھتی ہے یا سلسبیل سبیل بنی ہوئی ہے۔ اسے کربلا میں تشنہ لب شہید قرار دینا پڑتا ہے، یعنی ایسا شہید جسے پینے کو پانی نہ ملا ہو۔

۹۔ شرح : دیکھو کتنا غضب ہے کہ جس بات کو جن، انسان اور فرشتے سب بجا اور درست کہتے ہیں، وہ دشمن کی رضامندی کے کان میں جگہ نہ پا سکی۔ دشمن کے کان اسے سن نہ سکے۔

۱۰۔ شرح : حضرت امام حسینؑ کے راستے کی گرد کا پایہ بہت بلند ہے۔ اگر ہم اسے کیمیا کہیں تو یہ تو ہمارے فہم کا ایک اندازہ ہے۔ اصل حقیقت اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔

۱۱۔ شرح : کربلا کی خاک کا ذرہ ذرہ اس درجہ بینائی کو جلا دینے والا ہے کہ اسے تیغ قضا کا جوہر کہنا چاہیے۔ جس طرح تلوار کے جوہروں کی درخشانی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر دیتی ہے۔ وہی کیفیت کربلا کی خاک کے ایک ایک ذرے کی ہے پھر کیوں نہ ہر ذرے کو تیغ قضا کا جوہر کہیں۔

۱۲۔ شرح : اگر ہم اس خاک کو اپنے درد کی دوا نہ کہیں تو خدا کرے ہمارے درد کی دوا کہیں نہ ملے۔

۱۳۔ شرح : حضرت امام حسینؑ نے صبر کی جو شان دکھائی ہمارا کیا منہ ہے کہ اس کی داد دے سکیں۔ یعنی ہم کیوں کر اس کی حقیقت کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ البتہ رسول کرم

ہے کہ اس کے لیے کوئی دلیل لانے کی ضرورت نہیں۔ دعویٰ یہ نہیں کہ دنیا میں آسان سے آسان کام بھی دشوار ہے، دعویٰ یہ ہے کہ ہر آدمی انسان نہیں بنتا، لہذا نتیجہ یہ نکلا کہ جن کاموں کو بظاہر بہت آسان سمجھا جاتا ہے، وہ بھی سخت مشکل اور دشوار ہیں۔

اس سلسلے میں ایک شعر کا ذکر کیا گیا ہے، جسے عالمگیر اعظم نے اپنے رقعات میں ایک یا دو جگہ نقل کیا۔ بظاہر یہ خود عالمگیر کا شعر ہے۔

آنچہ ما جستیم کم دیدیم و درکار است و نیست
نیست جز آدم دریں عالم کہ بسیار است و نیست

یہ محض ایک حقیقت کا اظہار ہے۔ دنیا میں انسان بہت ڈھونڈے، مگر کم ملے۔ یہ جنس ہے تو بہت زیادہ، لیکن حقیقۃً ناپید ہی ہے۔ مرزا غالب نے یہ حقیقت نہایت بدیہہ انداز میں پیش کی اور اس کی بنا پر ایک مستقل اصول وضع کیا۔ دونوں شعروں میں کوئی مناسبت نہیں۔ مرزا کا شعر واقعی شعر ہے، لیکن رقعات عالمگیری کا شعر وزن، قافیے اور ردیف کے باوجود شعر نہیں۔

۲۔ **شرح**:۔ گریہ یعنی رونے دھونے کی یہ کیفیت ہے کہ معلوم ہوتا ہے، یہ میرا گھر برباد کرنے کے درپے ہے اور در و دیوار سے صاف نمایاں ہوتا ہے کہ یہ سیلِ گریہ میں بہ کر ناپید ہو جائیں گے اور ویرانہ گھر کی جگہ لے لے گا۔

گریہ اور ٹپکے ہے، خرابی اور بیابان کی مناسبت واضح ہے۔

۳۔ اپنے جنونِ عشق پر اظہارِ تاسف کے بجائے اور کیا کر سکتا ہوں۔ یہ ہر وقت اور ہر سانس لینے میں مجھے مجبور کر کے محبوب کی طرف لے جاتا ہے۔ میں جاتا ہوں اور سراپا حیرت بن جاتا ہوں۔

اسے مجاز کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جنونِ عشق

اسلم) اور حضرت علیؑ اس پر مرحبا کہیں تو بالکل مناسب ہے۔

۱۴- لغات : زمامِ ناقہ : اونٹنی کی مہار، نکیل۔

شرح : اب اونٹنی کی مہار اس بزرگ کے دستِ مبارک میں ہے، جسے اہلِ ایمان حضرت امام حسینؑ کے بعد پیشوا کہیں۔ بظاہر اس سے مراد ہیں امام زین العابدینؒ۔ کیونکہ اگلے شعروں میں بداہتاً اشارہ انھیں کی طرف ہے۔

۱۵- لغات : ریگِ تفتہ : تپتی ہوئی ریت۔

شرح : وہ وادی کی تپتی ہوئی ریت پر چل رہے تھے، جنھیں راہِ خدا کے طالبوں کے لیے زیبا تھا کہ اپنا رہنما قرار دیں۔

۱۶- شرح : جن بزرگ کو امامِ وقت ہونے کا شرف حاصل تھا، کیا یہ اس کی قدر و منزلت ہے کہ دشمنی رکھنے والے لوگ انھیں پیادہ ساتھ لے کر چلیں اور ان کے لیے نامناسب باتیں زبان پر لائیں؟

۱۷- شرح : یہ عجیب اجتہاد ہے کہ ایک شخص دین کا دشمن ہو کر حضرت علیؑ سے جنگ کرے اور کہا جائے کہ یہ ایک اجتہادی خطا تھی!

یہ اشارہ امیر معاویہ کی طرف ہے۔

۱۸- شرح : یزید کو تو اجتہاد کا مقام حاصل نہ تھا، وہ تو مجتہد نہ تھا۔ اگر اُسے برا کہیں تو برا نہ مانیے۔

۱۹- شرح : حضرت علیؑ کے بعد حضرت امام حسنؑ اور ان کے بعد حضرت امام حسینؑ، امام و پیشوا ہیں۔ جو ان تینوں سے برائی کرے، اُسے بھلا کیونکر کہیں؟

۲۰- شرح : جو شخص رسول اللہ (صلعم) پر ایمان نہ لائے، وہ کافر ہے۔ جو امام سے دشمنی رکھے، اسے کیا کہیں؟

۲۱- شرح : غالبؔ کا دل زخمی ہے۔ اس کے کلام میں درد بھرا ہوا ہے اگر کہیں کہ اس کی زبان پر لہو بھرے ترانے جاری ہیں تو یہ غلط نہیں۔

(مرثیہ)

خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ لکھنؤ کے مجتہد سید محمد مرحوم نے میرزا سے سید الشہداء کا مرثیہ اردو میں لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ میرزا مجتہد کی بہت تعظیم کرتے تھے۔ ان کے حکم کی تعمیل میں مرثیہ لکھنے بیٹھے اور مشکل سے مسدس کے تین بند لکھے۔ پھر مجتہد کو لکھ بھیجا! "یہ تین بند صرف امتثال امر کے لیے لکھے ہیں۔ ورنہ میں اس میدان کا مرد نہیں ہوں۔ یہ ان لوگوں کا حصہ ہے جنھوں نے اس وادی میں عمریں بسر کی ہیں۔ مجھ کو ان کے درجے تک پہنچنے کے لیے ایک دوسری

ہاں! اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو
اے دجلۂ خوں چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قُم! لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو
اے ماتمیانِ شہِ مظلوم! کہاں ہو؟
بگڑی ہے بہت بات، بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو
ماتم میں شہِ دیں کے ہیں، سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو
گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو
یہ خرگہِ نہ پایہ جو مدت سے بجا ہے
کیا خیمۂ شبیرؑ سے رتبے میں سوا ہے

کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا
کچھ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم و زباں کا
کیسا فلک اور مہرِ جہاں تاب کہاں کا
ہوگا دلِ بیتاب کسی سوختہ جاں کا

اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں اس رو سے کہو، برق نہیں ہے

مرد رکار ہے۔ بس مجھے
اس خدمت سے معذور
معاف رکھا جائے"
ان تین بندوں کی
شرح ذیل میں درج ہے:

بند ۱۔ لغات : ملائک : ملک کی جمع، فرشتے۔
قُم : اُٹھ۔ مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بیمار یا مردے سے قُم کہہ کر اسے تندرست یا زندہ کر دیتے تھے۔

شرح : اے صبح کی ہوا کے سانس! تو چنگاریاں برسانی شروع کر۔ اے خون کے دریا! تو فرشتوں کی آنکھوں سے جاری ہو جا۔ اے قُم کے نغمے! تو حضرت عیسیٰؑ کے لبوں پر فغاں بن جا۔ اے شاہِ مظلوم یعنی حضرت امام حسینؑ کے ماتمیو! کہاں ہو؟ آؤ۔ بات اس در پر بگڑ گئی ہے کہ اسے بنانے اور درست کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اب گھر کو آگ لگائے بغیر کوئی چارہ نہیں رہا۔

بند ۲۔ لغات : محابا : باک، پروا۔
خرگہِ نُہ پایہ : نُو پایوں کا بڑا خیمہ، یعنی نو آسمان۔

شرح : ہمیں بات کرنے کا یارا نہیں۔ شور مچانے کی طاقت سے محروم ہیں ہم دین کے بادشاہ حضرت امام حسینؑ کے ماتم میں بیٹھے ہیں۔ سودائی اور دیوانے نہیں۔ ہماری حالت ایسی ہے کہ گھر پھونک دیتے ہیں پھر بھی کوئی باک محسوس نہیں کرتے اگر ہماری چنگاریاں برسانے والی آہ و فغاں سے آسمان بھی جل جائے تو ہمیں کیا پروا ہے! یہ نُو درجوں والا بڑا خیمہ جو مدت سے اپنی جگہ قائم ہے یعنی یہ نُو آسمان رتبے میں حضرت شبیرؑ کے خیمے سے بڑھے ہوئے نہیں۔

بند ۳۔ شرح : اب دنیا کا اُور ہی عالم نظر آرہا ہے۔ دل، آنکھ اور زبان کا

نفشتر ہی اور ہو گیا ہے۔ کیسا آسمان اور دنیا کو روشن کرنے والا کہاں کا سورج؛ اُسے کسی جلے ہوئے کا دلِ بیقرار کہیں تو بجا ہے۔ اب سورج اور بجلی میں کوئی فرق نہیں، البتہ یہ ہم مانتے ہیں کہ بجلی گرتی ہے اور سورج نہیں گرتا، اس لیے کہ سکتے ہیں کہ سورج بجلی نہیں۔

ان تینوں بندوں میں سے پہلا بند خواجہ حالی نے "یادگارِ غالب" میں درج کیا پورے تینوں بند "جلوۂ خضر" میں درج ہوئے۔

رباعیات

اے مُنشیِ خیرہ سر سخن ساز نہ ہو
عصفور ہے تُو مقابلِ باز نہ ہو
آواز تری نکلی اور آواز کے ساتھ
لاٹھی وہ لگی کہ جس میں آواز نہ ہو

لغات :

خیرہ سر : سرکش بے سروپا۔

عُصفُور : چڑیا۔

شرح :

اے بے سروپا منشی، باتیں نہ بنا، تو چڑیا ہے۔ تیرے لیے باز سے مقابلہ زیبا نہیں۔ ادھر تیرے منہ سے آواز نکلی، ساتھ ہی وہ لاٹھی لگی جس میں کوئی صدا نہیں

یہ رباعی "لطائفِ غیبی" سے لی گئی ہے جو میرزا کی تصنیف ہے لیکن سیف الحق سیاح کے نام سے چھپی تھی۔ منشی سے مراد منشی امیرالدین پٹیالوی ہیں جنھوں نے میرزا کی کتاب "قاطعِ برہان" کے جواب میں "قاطع القاطع" لکھی تھی۔ باز سے مراد خود میرزا غالب ہیں۔ "بے صدا لاٹھی" اسکا مطلب یہ ہے کہ ادھر "قاطع القاطع" چھپی ادھر سیاح نے فوراً اس کا رد لکھ کر چھاپ دیا۔

رقعے کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے
ثاقبؔ! حرکت یہ کی ہے بیجا تم نے
حاجی کلّو کو دے کے بے وجہ جواب
غالبؔ کا پکا دیا کلیجا تم نے

شرح: اے ثاقب! تم نے میرے رقعے کا جواب کیوں نہ دیا؟ تمہاری یہ حرکت نہایت بیجا اور غیر مناسب ہے۔ میں نے حاجی کلّو کو تمہارے پاس بھیجا تھا۔ تم نے بغیر کسی سبب کے اسے صاف جواب دے دیا۔ اس طرح غالبؔ کا کلیجا پکا دیا۔

یہ رباعی شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ کے لیے ہے، جس طرح اگلی رباعی بھی انھیں کے لیے ہے۔

اے روشنیِ دیدہ، شہاب الدّین خاں
کٹتا ہے بتاؤ کس طرح سے رمضاں؟
ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک
سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآں؟

شرح: اے شہاب الدین خاں! تم میری آنکھوں کا نور ہو۔ یہ تو بتاؤ کہ رمضان کا مہینا کس طرح بسر ہو رہا ہے؟ رات کو، تراویح کی نماز پڑھنے سے کب تک فرصت ہوتی ہے اور تراویح میں روزانہ قرآن کتنا سنتے ہو؟

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے وہ رافضی و دہری
دہری کیونکر ہو، جو کہ ہووے صوفی؟
شیعی کیوں کر ہو ماوراء النہری

لغات:
رافضی: شیعہ۔
دہری: دہریہ، لامذہب

ماوراء النہری: ماوراء النہر کے لفظی معنی ہیں دریا کے پار کا علاقہ۔ ابتدا میں اسلامی فتوحات دریائے جیحوں تک پہنچ گئی تھیں اور جیحوں سے پار کے علاقے کو ماوراء النہر کہتے تھے۔ چنانچہ جیحوں اور سیحوں کا درمیانی علاقہ جسے ہم ترکستان کہتے ہیں، ماوراء النہر ہی مشہور تھا۔ یہاں کے لوگ بڑے پکے سُنّی اور شیعوں کے سخت مخالف مانے جاتے تھے چونکہ میرزا کے آباؤ اجداد ترکستان سے آئے تھے، اس لیے انھوں نے اپنے آپ کو ماوراء النہری کہا۔

شرح: جن لوگوں کو مجھ سے شدید دشمنی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں شیعہ اور دہریہ ہوں۔ سوچنے کی بات ہے، جو صوفی ہو اور جس کا مسلک تصوف ہو، وہ دہریہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ جو ماوراء النہر کا رہنے والا ہو، وہ شیعہ نہیں ہو سکتا، بلکہ پکا سُنّی ہوگا۔

یہ محض لطیفہ بازی ہے، میرزا غالبؔ کے شیعہ ہونے میں کسی کو کلام نہیں، البتہ وہ خاص وضع کے شیعہ تھے، یعنی ائمۂ کرام سے انتہائی محبت تھی۔ حضرت علیؑ کو وصی مانتے تھے۔ ساتھ ہی تمام فرقوں اور طبقوں سے گہرا میل جول تھا۔ تعصب سے بالکل پاک تھے اور بڑے بڑے صوفیوں سے بھی عقیدت مندانہ تعلق تھا، مثلاً غوث علی شاہ قلندر پانی پتی نے خود اس تعلق کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے۔

متفرق اشعار

جگر میں ٹوٹ کے سوئی ہوئی سناں پیدا
دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

۱۔ شرح: جگر کا زخم سینے کے لیے جو سوئی استعمال کی گئی۔

وہ زخم ہی میں ٹوٹ کر رہ گئی، اور اس کی جگہ سناں (تیر یا بھالے کی نوک) لے سنبھال ۔ شاعر کہتا ہے کہ پہلے ہی ہو ۔ زخم کی صورت تو منہ کی سی تھی مگر اس میں زبان نہ تھی تیر یا بھالے کی نوک اس منہ میں زبان بن گئی

خوشی جینے کی کیا، مرنے کا غم کیا
ہماری زندگی کیا اور ہم کیا

۲۔ شرح :
جینے کی خوشی، اور مرنے کا غم وہ کرے جسے پائیدار و استوار زندگی حاصل ہو۔ ہماری زندگی تو سراسر ناپائیدار ہے، بقول ذوقؔ یہ برق کی چمک یا شرارے کی مسکراہٹ ہے یعنی پلک جھپکنے میں ختم ہوجانے والی اس زندگی اور اس بے ثباتی و بے اعتباری پر نہ جینے کی خوشی کوئی معنی رکھتی ہے اور نہ مرنے کا غم کسی کسی بھی اعتبار سے مناسب ہے۔

ان دلفریبیوں سے نہ کیوں اس پہ پیار آئے
روٹھا جو بے گناہ تو بے عذر من گیا

۳۔ شرح :
محبوب کی دلفریبیوں پر کیوں نہ پیار نہ آئے۔ دیکھیے پہلے بلا وجہ بگڑا، یعنی وہ خفا ہوگیا حالانکہ مجھ سے کوئی گناہ اور جرم سرزد نہیں ہوا تھا۔ یہ بھی بہرحال ایک دلفریب ادا تھی جس پر بے اختیار پیار آیا۔ پھر خود ہی راضی ہوگیا نہ میری طرف سے کوئی عذر پیش ہونے کا انتظار کیا۔ اور نہ مجھے منت وسماجت یا خوشامد کی ضرورت پیش آئی۔

دو رنگیاں یہ زمانے کی جیتے جی تک ہیں
کہ مردوں کو نہ بدلتے ہوئے کفن دیکھا

۴۔ شرح :
دو رنگی کا مطلب ہے۔ منافقت، مغایرت، دو روئی۔۔ گرگٹ پن۔
شاعر کہتا ہے کہ زمانے کی دو رنگیاں اسی وقت تک ہیں، جب تک ہم جیتے ہیں۔ جب مرجائیں گے تو یہ دو رنگیاں ہم پر کچھ اثر انداز نہ ہو سکیں گی۔ کیا مُردوں کو کسی نے کفن بدلتے دیکھا ہے! ہرگز نہیں۔ وہ جس حالت میں قبر کے اندر رکھ دیے گئے اسی حالت پر برابر قائم رہتے ہیں۔

۵ - شرح : ساتؔ جلدوں کا پارسل پہنچا
میرزا غالب نے گلشن اَبرار کے
واہ کیا خوب برمحل پہنچا
متعلق اپنی فارسی کتاب

دستنبو، آگرہ کے مطبع مفید الخلائق میں چھپوائی تھی، جس کے مالک شیو نرائن آرام تھے۔ منشی نبی بخش حقیر، میرزا حاتم علی بیگ۔ میرزا ہرگوپال تفتہ کاپیاں دیکھنے اور تصحیح کرنے کے ذمہ دار تھے۔ ان میں سے کچھ کتابیں جو حاکموں کو بھیجنی منظور تھیں۔ جلد کرائی تھیں۔ اور یہ کام میرزا حاتم علی بیگ تہر کے حوالے ہوگیا تھا۔ یہ سات کتابیں تھیں۔ جب میرزا کے پاس ان کتابوں کا پارسل پہنچا تو عدد ہر بہ خوش ہو کر حاتم علی بیگ مہر کو خط لکھا۔ اس میں کتابوں کا ذکر اس شعر سے شروع کیا۔ یعنی سات کتابوں کا پارسل برمحل پہنچ گیا۔ آگے فرماتے ہیں !۔

واللہ اگر تصور ہی میں گزرتا ہو کہ کتابیں اس رقم کی ہوں گی، جب تک جہان ہے تم جہاں میں رہو ائمۂ اطہار علیہم السلام کی اماں میں رہو۔

میرزا نے جلدوں کی لاگت کے سلسلے میں بارہ روپے بھیجے تھے۔ انھیں یقین نہیں آتا کہ اتنی رقم میں ایسی خوبصورت جلدیں بن گئیں چنانچہ لکھتے ہیں۔

اب میں حیران ہوں کہ آیا شمار ائمۂ اطہار نے ان بارہ روپے میں برکت دی، یا کچھ تمہارا روپیہ صرف ہوا؟ دو پارسلوں کا محصول، دو رجسٹریوں کا محصول، تین کتابوں کی لوح طلائی، یہ ساری بات اس روپے میں کس طرح بن آئی !

۶ - شرح : ملے دو مرشدوں کو قدرتِ حق سے ہیں دو طالب
خدا نے دو مرشد پیدا
نظام الدین کو خسرو، سراج الدین کو غالب
کیے، جو مخلوق کو سیدھا

راستہ دکھاتے تھے اور سب کی تربیت فرماتے تھے۔ ساتھ دونوں مرشدوں کو دو قدرت کیش طلبگاران فیض بھی دے دیئے۔ حضرت خواجہ نظام الدین نظام الاولیا جیسے مرشد کو امیر خسرو جیسا طالب ملا اور سراج الدین ابوظفر بہادر شاہ غازی جیسے مرشد کے لیے

غالب جیسا طالب پیدا کردیا۔

میرزا وقتاً فوقتاً ایسے شعر ابو ظفر بہادر شاہ کی خدمت میں پیش کرتے رہتے تھے۔ خواجہ حالی یادگار میں فرماتے ہیں کہ ایک روز خواجہ نظام الدین قدس سرہ اور امیر خسرو کی خصوصیت کا ذکر دربار میں ہو رہا تھا میرزا نے اسی وقت یہ شعر انشا کر کے پڑھا۔

نیازِ عشق خرمن سوز، اسبابِ ہوس بہتر
جو ہو جائے نثارِ برق مشتِ خار و خس بہتر

۷۔ شرح: عشق کی آگ خرمنوں کو جلا دیتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ حرص و ہوس کے تمام اسباب اس آگ کی نذر کر دیے جائیں۔ خس و خار اور جھاڑ جھنکار کا بجلی پر نچھاور ہو جانا ہی اچھا ہے۔

خدا سے میں بھی چاہوں از رہِ مہر
فروغِ میرزا حاتم علی مہر

۸۔ شرح: یہ شعر میرزا غالب نے حاتم علی بیگ مہر کو ان کی ایک مثنوی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا۔

مطلب یہ کہ میں محبت کی بنا پر خدا سے حاتم علی بیگ مہر کی ترقی و سربلندی کے لیے دعا کرتا ہوں۔

یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ! غلط
کی تصور نے بہ صحرائے ہوس راہ غلط

۹۔ شرح: جب محبوب کا یہ کہنا یاد آیا کہ "نہیں، واہ! غلط" تو تصور ہوس کے صحرا میں راستہ بھول گیا۔

سنینِ عمر کے ستر ہوئے شمار برس
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

۱۰۔ شرح: یہ شعر میرزا غالب نے اپنے شاگرد رشید میر فرزند احمد صفیر بلگرامی کو ایک مکتوب مرقومہ ۲۸۔ نومبر ۱۸۶۳ء میں لکھا تھا جس میں

عمر کے ستر برس پورے ہو گئے اب اگر زندگی ہوگی تو زیادہ سے زیادہ تین چار برس کی ہوگی
یہ پیشگوئی درست ثابت ہوئی اور میرزا نے تہتر برس کچھ مہینے کی عمر میں انتقال کیا۔
شاگرد نے جواب میں لکھا!

سنا مہؔر! یہ کہتے ہیں حضرت غالبؔ تہتّر جیوں تو جیوں اور تین چار برس
مگر یہ پہلے سے اعدا غنیں کی ہے دعا خدا کرے میرزا غالبؔ جیئے ہزار برس

۱۱۔ شرح : پیر و مرشد معاف کیجے گا
میں نے جمنا کا کچھ نہ لکھا حال

یہ شعر میرزا نے برسات کا ذکر کرتے ہوئے، نواب انوار الدولہ بہادر شفق رئیس کدور اکاپس کو ۱۹۔ جولائی سنہ ۱۸۶۰ء کے ایک مکتوب میں لکھا تھا۔

مطلب یہ کہ پیر و مرشد، معاف فرمائیے گا۔ میں نے آپ کو دریائے جمنا کے بارے میں کچھ نہ لکھا۔

۱۲۔ شرح : ولی عہدی میں شاہی ہو مبارک
عنایاتِ الٰہی ہو مبارک

یہ شعر میرزا نے علاؤ الدین احمد خاں علائی کے نام سنہ ۱۸۶۶ء کے ایک مکتوب میں لکھا تھا۔ اس کا پس منظر یہ کہ علائی چونکہ امین الدین احمد خاں والی لوہارو کے فرزند کبیر تھے لہٰذا ولی عہد ریاست رہی تھے اور ان کے بارے میں ولی عہدی کا اعلان بھی ہو چکا تھا۔ جب امین الدین احمد خاں کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی اور معاملات اور امور ریاست کی دیکھ بھال میں انھیں دقت پیش آنے لگی تو حکومت کی منظوری سے علائی کو والد کی جگہ نیابتہً کاروبار ریاست سنبھالنے کا حکم ہو گیا۔ اسی کو میرزا نے "ولی عہدی" میں شاہی قرار دیا ہے یعنی ہو تو "ولی عہد" مگر ریاست کے اختیارات مل گئے، اگرچہ نیابتہً ہی سہی اس کی مبارک باد دی اور اس صورت کو عنایات الٰہی کا کرشمہ قرار دیا اور

کے باعث عاشق کے دل میں ایک ہی جذبہ رہ جاتا ہے، یعنی یہ کہ ہر لحظہ محبوب کا رُخ کرے اور اس سے نہ مل سکنے کے باعث حیرانی کا تختۂ مشق بنا رہے، حقیقت کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ہر لحظہ اس ذات کا رخ کرتا ہوں، جو وجود اور زندگی کا سرچشمہ ہے لیکن خامیوں اور نارسائیوں کے باعث اس تک پہنچ نہیں سکتا اور حیران ہوتا ہوں۔ غالباً یہی حیرانی ہے، جسے صوفیہ کی اصطلاح میں مقامِ حیرت قرار دیا جاتا ہے۔

۴۔ **لغات** ۔ **آئینہ** : یہاں اس سے مراد آئینۂ حلبی نہیں، بلکہ آئینۂ فولادی ہے۔

جوہر : فولادی آئینے کو صَیقل کیا جاتا ہے تو اس میں خط سے پڑھ جاتے ہیں، جنھیں جوہرِ آئینہ کہتے ہیں۔ ایک ایک خط بال سے مشابہ ہوتا ہے، لہذا انھیں مژگاں سے تشبیہ دی۔

شرح :۔ محبوب کا جلوۂ حسن حکماً کہ رہا ہے کہ مجھے دیکھو، کیونکہ میں اور صرف میں ہی دید کے لائق ہوں۔ یہ سن کر فولادی آئینے کے جوہروں پر بھی ایسی کیفیت طاری ہو گئی کہ وہ آئینے کی آنکھ پر مژگاں بن جانا چاہتے ہیں تاکہ حُسن کی دید سے لذت پا سکیں اور اس کا تقاضائے دید پُورا کر سکیں۔

واضح رہے کہ یہ حسن کی طرف سے سوال نہیں، تقاضا ہے اور مطلب یہ ہے کہ واقعی اس کے سوا کوئی شے قابلِ دید نہیں، اسی لیے بے جان آئینے میں بھی وہ خصوصیتیں پیدا ہو گئی ہیں، جو آلۂ دید بننے کے لیے ضروری ہیں۔

۵۔ **لغات** ۔ **اہلِ تمنّا** : اہلِ عشق، جنھیں محبوب پر قربان ہو جانے کی انتہائی آرزو ہوتی ہے۔

عیدِ نظارہ : قوتِ دید، یعنی نگاہ کی عید یا انتہائی شادمانی اور خوشی۔

شرح :۔ قتل گاہ میں پہنچ کر اہلِ عشق کو جو خوشی اور شادمانی ہو رہی ہے، اس کی کیفیت کچھ نہ پوچھیے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ جب تلوار میان سے نکلتی ہے اور قتل کے لیے اسے بلند کیا جاتا ہے تو نگاہ کے لیے وہی منظر پیدا ہو جاتا ہے، جو عام لوگوں

واقعی یہ اسی ذات پاک کی عنایت سے ہوا۔

درم و دام اپنے پاس کہاں
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

۱۳- شرح :
مولانا آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ زین العابدین خاں عارف کا فرزند حسین علی خاں جسے میرزا اور ان کی بیگم نے بیٹا بنا لیا تھا ایک دن کھیلتا کھیلتا آیا کہ دادا جان مٹھائی منگا دو۔ وہ صندوقچہ کھول کر ادھر ادھر ٹٹولنے لگا۔ میرزا نے ارتجالاً فرمایا۔

ہمارے پاس درم و دام کیوں کر ہو سکتے ہیں کبھی چیل کے گھونسلے میں بھی ماس ملا ہے یعنی چیل کو گوشت کا جو ٹکڑا مل جائے فوراً کھا جاتی ہے اور باقی نہیں چھوڑتی۔ وہی حالت ہماری ہے کہ پیسا آتا ہے اور فوراً خرچ ہو جاتا ہے۔ باقی بچتا ہی نہیں کہ محفوظ رکھا جائے۔

میکشی کو نہ سمجھ بے حاصل
بادہ غالبؔ عرقِ بید نہیں

۱۴- شرح :
اے غالبؔ! شراب نوشی کو بے حاصل اور بے فائدہ نہ سمجھ۔ شراب بید کا عرق نہیں۔ بید کا درخت بے ثمر ہوتا ہے اور اس کے عرق کو بھی میرزا نے غالباً اسی وجہ سے بے اثر قرار دیا۔

تم سلامت رہو قیامت تک
دولت و عزّو جاہ روز افزوں

۱۵- شرح :
آپ قیامت تک سلامت رہیں، اور آپ کی دولت عزت اور جاہ و مرتبہ روز بہ روز مزید اضافہ رہیں۔

تم سلامت رہو قیامت تک
صحت و لطفِ طبع روز افزوں

۱۶- شرح :
آپ قیامت تک سلامت رہیں، آپ

کی صحت اور لطف طبع برابر بڑھتے جائیں

یہ دونوں شعر میرزا غالب عموماً ان خطوں میں لکھتے ہیں جو فرمانروایانِ رامپور کے نام بھیجتے تھے۔

۱۷۔ شرح : نہیں بھولا میں تجھ کو اے میری جاں
کروں کیا کہ یاں گر رہے ہیں مکاں

یہ شعر میرزا نے مجروح کے نام ایک مکتوب (مرقومہ ۲۶۔ ستمبر ۱۸۶۱ء) میں لکھا ہے۔ اس زمانے میں بارش کی کثرت کے باعث دہلی میں مکان گر رہے تھے۔ میرزا کا مطلب یہ ہے کہ اے میر مہدی میری جان میں تجھ کو بھولا نہیں۔ مگر کیا کروں؛ یہاں مکان گر رہے ہیں فرماتے ہیں۔

برسات کا حال نہ پوچھو۔ خدا کا قہر ہے — قاسم خاں کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے

۱۸۔ شرح : ابر روتا ہے کہ بزمِ طرب آمادہ کرو
برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو

بادل اس لیے روتا ہے کہ عیش و شادمانی کی مجلس آراستہ کی جائے۔ لیکن بجلی اس پر ہنستی ہے اور کہتی ہے کہ ہمیں تو صرف کوئی دم کی فرصت ہے اس میں عیش و شادمانی کے سامان کیوں کر مہیا ہو سکتے ہیں۔ اور مہیا کر بھی لیے جائیں۔ تو ان سے کتنا عرصہ کام لیا جا سکے گا۔

ابر کے رونے سے اس کا "برسنا" اور بجلی کے چمکنے سے اس کا ہنسنا مراد ہے۔

میرزا غالب کے نزدیک شراب نوشی اور اس سلسلے میں عیش و نشاط کا موسم ہمارے ملک میں صرف برسات کا ہے۔ ایک فارسی غزل کا مقطع ہے۔

بہار ہند بود برشکال رہا غالب   دریں خزاں کدہ ہم موسم شرابے ہست

ہندوستان (جسے اب پاک و ہند کہتے ہیں) میں بہار کا موسم برسات ہے۔ گویا اس ملک میں جس کی حیثیت خزاں کی سی ہے۔ شراب نوشی کا ایک موسم ہے۔

دیکھتا ہوں اسے تھی جس کی تمنا مجھ کو
آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو

۱۹- شرح :
مجھے جس کی تمنا تھی، اسے اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ گویا میرے لیے بیداری میں زلیخا کے خواب کا سماں پیدا ہو گیا۔

ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے
یہ رنگِ زرد ہے چمنِ زعفراں مجھے

۲۰- شرح :
اس شعر کی معنویت کا انحصار صرف اس کیفیت پر ہے کہ مشہور ہے زعفران زار دیکھ کر انسان کو بے اختیار ہنسی کا دورہ پڑ جاتا ہے اور زعفران کے پھولوں کا رنگ زرد ہوتا ہے۔

کہتے ہیں: مجھے ضعیف و کمزور دیکھ کر سب ہنستے ہیں۔ ضعیف و کمزور آدمی کا رنگ، عموماً زرد ہوتا ہے۔ اس لیے کہ کمزوری خون کی قلت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ میرزا کہتے ہیں کہ پیلا رنگ ہمارے لیے چمنِ زعفران ہے۔ جسے دیکھ کر سب ہنسنے لگتے ہیں۔

ماہِ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے
عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سُلاتا ہے مجھے

۲۱- شرح :
میں نیا چاند ہوں یعنی ہلال اور آسمان مجھے عجز کا درس دیتا ہے اور عمر بھر ایک ہی پہلو پر سلاتا ہے۔

صبا! لگا وہ طمانچہ طرف سے بُلبُل کی
کہ روئے غنچۂ گل سوئے آشیاں ہو جائے

۲۲- شرح :
اے صبا بلبل کی طرف سے پھول کے منہ پر ایسا طمانچہ لگا کہ اس کا منہ بلبل کے گھونسلے کی طرف پھر جائے۔

زخمِ دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانتا ہے
ایسے ہنستے کو رلایا ہے کہ جی جانتا ہے

۲۳- شرح :
جی جانتا ہے، کا مطلب ہے۔ حقیقی

کیفیت دل ہی کو معلوم ہے۔ زخم کا ہنسنا یا مسکرانا! ٹانکے ٹوٹ جانے سے زخم کا بڑھ جانا۔

کہتے ہیں۔ تم نے دل کا زخم دکھایا۔ اس کی کیفیت دل ہی کو معلوم ہے۔ ہنستے کو رلایا اس کو بھی دل ہی بہتر جانتا ہے۔

۲۴- شرح :

ہم کیا کہیں کسی سے، اپنا طریق کیا ہے
مذہب نہیں ہے کوئی، ملت نہیں ہے کوئی

ہم کسی سے کیا کہیں کہ اپنا مسلک اور طریقہ کیا ہے! ہمارا نہ کوئی مذہب ہے اور نہ کوئی ملت۔ یہ انسان سے بلا امتیاز ملت و مذہب اور بلا اختلاف رنگ و نسل محبت و شفقت کے برتاؤ کی دعوت ہے۔ ایک جگہ میرزا کہتے ہیں!

ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

۲۵- شرح :

گلشنِ دہر بھی ہے کوئی سرائے ماتم
شبنم اِس باغ میں جب آئے تو گریاں آئے

کیا زمانے کا چمن زار ماتم و سوگواری کا مقام ہے! دیکھیے شبنم اس باغ میں آتی ہے۔ تو روتی ہوئی آتی ہے۔ شبنم کا رونا اور آنسوؤں کی شکل میں سبزہ و گل پر گرنا محتاج تشریح نہیں۔

۲۶- شرح :

پھر مرتبہ بڑھایا مرا نفیِ غیر نے
آیا ہر اک مکان نظر، لامکاں مجھے

میں نے اللہ کے سوا ہر شے کی نفی کر دی اسے بے وجود اور بے بود مان لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر مکان مجھے لامکان نظر آنے لگا۔

شعر میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ ماسوی اللہ سے قطع نظر کر کے وجود حقیقی صرف اللہ ہی کا مان لیا جائے۔ تو تعینات ختم ہو جائیں گے اور مکان یقیناً لامکان بن جائے گا۔

آج مجھ سا نہیں بد نام زمانے میں کوئی
پھر بھی دل چاہتا ہے اور ہوں بدنام ابھی

۲۷- شرح : آج زمانے میں میرے برابر بدنام کوئی نہیں۔ لیکن دیکھیے دل چاہتا ہے کہ ابھی بدنامی کا مزید سر و سامان ہونا چاہیے۔

زرافشاں مانگ ہے اور سبز اس پر اک دوشالا ہے
غضب یہ ہے پرِ طاؤس میں کالے کو پالا ہے

۲۸- شرح : مانگ (سر کے بالوں کے درمیان سیدھی لکیر) پر سونے کا برادہ چھڑک رکھا ہے۔ اور اس پر سبز دوشالہ اوڑھ لیا ہے۔ غضب کی بات ہے کہ مور کے پر میں کالے سانپ کو پالا ہے۔

بتو! توبہ کرو، تم کیا ہو، جب اِدبار آتا ہے
تو یوسفؑ سا حسین بکنے سر بازار آتا ہے

۲۹- شرح : اے بتو۔ توبہ کرو اپنے حسن پر زیادہ نہ اتراؤ۔ جب زوال کا دور آتا ہے تو یوسفؑ جیسا حسین سر بازار بکنے کے لیے آجاتا ہے۔

بجا ہے شیریں اگر چھوڑ دتی حج کو چلی
مثل ہے نو سو چوہے کھا کے بلّی حج کو چلی

۳۰- شرح : شریں طوائف تھی یعنی، اگر شریں دلی کو چھوڑ کر حج کے لیے نکلی ہے تو اس پر وہی مثل صادق آتی ہے کہ بلّی نو سو چوہے کھا کے حج کے لیے روانہ ہوتی ہے۔

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

۳۱- شرح : یہ شعر میرزا نے میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں لکھا ہے۔ یہ فروری ۱۸۵۹ء کا خط تھا۔ اس وقت تک دہلی کے حالات معرضِ تذبذب میں تھے۔ روزانہ کوئی نہ کوئی نیا حکم اہل شہر کے لیے جاری ہوجاتا

تھا۔ مرزا کہتے ہیں اس شہر میں روزانہ نیا حکم جاری ہو جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

۳۲۔ شرح :
مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

یہ شعر میرزا نے اپنے مکان کے متعلق کہا ہے جو عین مسجد کے زیر سایہ تھا۔ فرماتے ہیں :

میں نے مسجد کے زیر سایہ مکان لے لیا ہے گویا ایک بندہ جو نہایت حقیر اور فرومایہ ہے، خدا کا ہمسایہ بن گیا ہے۔ یہ اس لیے کہ مسجد کو سب لوگ خدا کا گھر کہتے ہیں اور خدا کے گھر کے ساتھ جس کا گھر ہو گا۔ وہ اپنے آپ کو ہمسایہ خدا کہلانے کا حقدار ہو جائے گا۔

خواجہ حالی یادگار غالب میں فرماتے ہیں کہ سب سے آخر مکان جس میں ان کا انتقال ہوا حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوان خانہ سے متصل مسجد کے عقب میں تھا۔ اسی کی نسبت یہ شعر کہا۔

۳۳۔ شرح :
ہو کر شہید عشق میں پائے ہزار جسم
ہر موجِ گردِ راہ مرے سر کو دوش ہے

راہ عشق میں شہادت پا کر مجھے ہزار جسم مل گئے۔ راستے میں جو گرد اٹھتی ہے اس کی ہر لہر میرے سر کے لیے کندھے کا کام دے رہی ہے۔

۳۴۔ شرح :
دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے

آخری سانس اس راستے پر ہو لیا ہے۔ جو اسے اختیار کرنا تھا۔ اے عزیزو! اب اللہ کے سوا کچھ نہیں۔
یہ شعر زندگی کے آخری دور میں میرزا عموماً پڑھتے رہتے تھے۔

مثنوی

ایک دن مثلِ پتنگِ کاغذی
لے کے دل سر رشتۂ آزادگی
خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا
اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا
میں کہا، اے دل! ہوائے دلبراں
بسکہ تیرے حق میں رکھتی ہے زیاں
پیچ میں اُن کے نہ آنا زینہار
یہ نہیں ہیں گے کسی کے یارِ غار
گورے پنڈے پر نہ کر اُن کے نظر
کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر

۱،۲۔ لغات :
کنیانا : پتنگ کا کنی کھانا، شرم وحجاب کرنا، ٹال مٹول کرنا۔

شرح :
ایک دن میرے دل نے کاغذی پتنگ کی طرح آزادی کا سررشتہ سنبھال لیا اور مجھ سے کنی کھائی۔ بہت بگڑا اور میرا سر کھانے لگا۔

۳۔ شرح :
میں نے کہا: اے دل! حسینوں کا عشق تیرے لیے نقصان کا باعث

اب تو مِل جائے گی تیری اُن سے سانٹھ
لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ
سخت مُشکل ہو گا سُلجھانا تجھے
قہر ہے دل اِن میں اُلجھانا تجھے

یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے
بھُول مت اِس پر، اُڑاتے ہیں تجھے
ایک دن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں
مُفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں

دل نے سُن کر، کانپ کر، کھا پیچ و تاب
غوطے میں جا کر، دیا کٹ کر جواب
رشتہ در گردنم افگندہ دوست
مے بَرد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

ہے

۴۔ شرح : کبھی ان کے پیچ اور بل فریب میں نہ آنا ۔ یہ کبھی کسی کے وفادار دوست نہیں ہوئے۔

۵۔ شرح : ان کے گورے بدن نہ دیکھ، یہ ڈورے ڈال کر لوگوں کو کھینچ لیتے ہیں۔

۶/۷۔ لغات :
سانٹھ : رسی یا دھاگا، جس میں گرہ پڑی ہوئی ہو، گتھی۔

شرح : اب تو ان سے تیری سانٹھ مل جائے گی لیکن آگے چل کر ایسی گانٹھ پڑے گی کہ تیرے سے اس کا کھولنا مشکل ہو جائے گا۔ غرض حسینوں میں دل الجھانا قہر ہے۔

۸ ۔ شرح : یہ تجھے محفل میں اونچا درجہ دیتے ہیں ۔ اس پر بھول نہ جا۔ حقیقت میں تیرا مذاق اُڑاتے ہیں۔

۹- شرح : کسی نہ کسی دن تجھے کہیں لڑا دیں گے اور مفت میں گنوا دیں گے۔

۱۰- شرح : دل نے میری باتیں سنیں، کانپا، پیچ و تاب کھایا، پھر سوچ بچار کے بعد کٹ کر یہ جواب دیا: میری گردن میں دوست نے دھاگا ڈال رکھا ہے اور جس طرف اُس کا دل چاہتا ہے، لیے پھرتا ہے۔

۰

ضمیمہ دوم

اس ضمیمے میں نسخۂ حمیدیہ کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ کوشش یہی رہی کہ صرف وہ شعر لیے جائیں جو ذرا سہل اور واضح ہوں، نیز ان میں فکر و خیال یا اسلوبِ بیان کی کوئی خوبی موجود ہو۔ ساتھ ساتھ یہ مقصد بھی پیش نظر رہا کہ فکرِ غالبؔ کے ارتقائی مدارج کا اندازہ کرنے والوں کے لیے اچھا سرمایہ فراہم ہو جائے اور نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت سے اصل غرض یہی تھی۔ چنانچہ اس انتخاب میں متعدد ایسے اشعار لیے گئے ہیں جن سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ابتدائی دور میں، جسے مشق و ورزش کا دور سمجھنا چاہیے، غالبؔ کس انداز میں سوچتے تھے اور کس رنگ میں اپنے افکار پیش کرتے تھے۔ ان کا طریق ابتدا ہی سے نرالا تھا، لیکن جس مقامِ بلند کی طرف ان کی پرواز کا رخ تھا، اس تک پہنچنے کے لیے بقدرِ ضرورت قوت موجود نہ تھی۔ جب قوت بہم پہنچی تو وہی شاعر، جسے شروع میں بعض دماغ سوختگانِ تقیید مہمل گو سمجھ رہے تھے، شاعری میں اس درجۂ کمال پر پہنچ گیا، جو اس سے پیشتر شاید کسی کو حاصل نہ تھا اور جو کچھ وہ کہہ گیا ہے، اسے اردو زبان میں ہمیشہ روشنی کے ایک بلند مینار کی حیثیت حاصل رہے گی۔

○

میں عید کے دن ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عشاق کے لیے محبوب کے ہاتھوں قتل ہونے سے بڑھ کر خوشی کا کوئی موقع نہیں۔

اس شعر کو قتل، شمشیر وغیرہ کے الفاظ کے پیشِ نظر محض غزل کا عام شعر نہ سمجھا جائے، اس کی ایک اصولی حیثیت بھی ہے۔ یعنی اہلِ حق کے لیے اپنے مقاصد و عزائم کے سلسلے میں قتل گاہ کے اندر پہنچنا اور قتل کے لیے شمشیر کا بلند ہونا ایسا ہی ہے، جیسے عید کا دن آ جائے، کیونکہ وہ اپنے مقاصد کے لیے کوشش میں یہ سزا پاتے ہیں اور یہ سزا ان کے لیے سرخروئی کا پروانہ ہوتی ہے۔ نیز ایسی سزائیں اصل مقصد کی اہمیت واضح کرتی ہیں اور دوسرے لوگوں میں یہی ولولہ پیدا ہوتا ہے۔

۶۔ شرح :۔ اے محبوب! ہم تو مراد حاصل کیے بغیر قبر میں جا سوئے اور وصل سے جو شادمانی حاصل ہو سکتی تھی، اس کی آرزو کا داغ سینے میں لے گئے۔ اب تو جس طرح چاہے، باغ باغ ہو اور شاد و خرم رہ۔

۷۔ لغات۔ ریش : زخم۔

شرح :۔ دل کے ٹکڑے کی خوشی یہ ہے کہ اس پر آرزو کے زخم لگتے رہیں اور جگر کے زخم پر زیادہ سے زیادہ نمک چھڑک دیا جائے تو اسے لذت حاصل ہوتی ہے۔

زخم ہر شخص کے لیے دکھ اور درد کا موجب ہوتا ہے۔ اس پر نمک چھڑکا جائے تو تکلیف بہت بڑھ جاتی ہے، لیکن اہلِ عشق کو انھیں چیزوں میں مزہ آتا ہے اور وہ ایسی ہی باتوں میں خوش رہتے ہیں کہ نہ محض زخم لگائے جائیں، بلکہ ان پر زیادہ سے زیادہ نمک بھی چھڑکا جائے۔ یہاں تک کہ ایک ایک زخم کے لیے پورا نمکدان وقف کر دیا جائے۔

۸۔ لغات۔ زود پشیماں : جلد پچھتانے والا۔

شرح :۔ محبوب نے مجھے قتل کرنے کے بعد جور و جفا سے توبہ کر لی اور

ضمیمہ دوم

نسخۂ حمیدیہ کا اِنتخاب

اسدؔ! ہر جا سخن نے طرحِ باغ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگِ بہارِ ایجادیِ بیدلؔ پسند آیا

لغات :
بہارِ ایجادی : بہار پیدا کرنے کی خصوصیت، بہار آفرینی۔

شرح : اے اسدؔ! بیدلؔ نے ہر مقام پر نئے انداز سے شعر و سخن کا ہرا بھرا باغ لگا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اس کی بہار آفرینی کا رنگ بہت پسند آیا ہے۔

تنگی رفیقِ رہ تھی، عدم یا وجود تھا
میرا سفر بہ طالعِ چشمِ حسود تھا

بازی خورِ فریب ہے اہلِ نظر کا ذوق
ہنگامہ گرمِ حیرتِ بود و نہ بود تھا

پوچھا تھا گرچہ یار نے احوالِ دل، مگر
کس کو دماغِ منتِ گفت و شنود تھا

خور شبنم آشنا نہ ہُوا، ورنہ میں، اسدؔ!
سر تا قدم گزارشِ ذوقِ سجود تھا

۱- شرح :
میں عدم کی حالت میں تھا یا وجود کی حالت میں آیا۔ دونوں جگہ تنگی میرے راستے کی ساتھی بنی رہی۔ یعنی عدم میں بھی میرے لیے کشائش کا کوئی سامان نہ تھا وہاں سے سفر کر کے عالم وجود میں آیا تو یہاں بھی یہی حالت رہی، معلوم ہوتا ہے کہ میرے سفر کی

قسمت میں حاسدوں کی آنکھ لکھ دی گئی تھی، جس کی تنگی دنیا بھر میں مشہور ہے۔

۲- **شرح** : اس دنیا میں ہستی اور نیستی کا ہنگامہ حیرت افزا صورت میں گرم تھا۔ یہی یہی سوچا جاتا تھا کہ ہم ہیں یا نہیں؟ ہمارا وجود کوئی حیثیت رکھتا ہے یا محض ایک دھوکا ہے جو لوگ اہل نظر ہونے کے مدعی تھے، وہ بھی اسی دھوکے سے بازی کھا گئے۔

مطلب یہ کہ وہ اہلِ نظر تھے، جن سے امید تھی کہ حقیقت تک پہنچ گئے ہوں گے اور کر دیں گے کہ ہماری ہستی کچھ حیثیت نہیں رکھتی، لیکن موت و حیات کا جو ہنگامہ یہاں گرم تھا، اسی نے انھیں ایک فریب میں مبتلا کر دیا۔

۳- **شرح** : میں مانتا ہوں کہ محبوب نے میرے دل کا حال پوچھ لیا تھا، مگر مجھ میں اتنا صبر و سکون ہی کہاں تھا کہ بات چیت کا احسان اٹھاتا، یعنی میں حال سناتا اور محبوب سنتا۔

۴- **شرح** : اے اسد! میں تو سر سے پاؤں تک سجدے کا ذوق پیش کر رہا تھا۔ یعنی میں تو ہمہ تن سجدہ بن گیا تھا، لیکن افسوس کہ آفتاب نے میری شبنم سے شناسائی پیدا کی۔

اوس کے قطرے واقعی ہمہ تن سجدہ ہوتے ہیں مگر انھیں جذب کرنے کے لیے سورج کی شعاعیں درکار۔ میں میرزا کہتے ہیں: میں سراپا عشق تھا اور محبوب حقیقی کی راہ میں تمام سجدے کی تمام منزلیں طے کر چکا تھا۔ صرف اتنی کسر رہ گئی تھی کہ محبوب کی توجہ ہو اور میں اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دوں۔ بس اب تک توجہ نہ ہو سکی۔

۱- **شرح** :

اے خدا! یہ دنیا جو ایک وسیع صحرا کی حیثیت رکھتی ہے، یہ تو ہمارے نزدیک تمنّا و آرزو کا ایک نقشِ قدم ہے۔ اب فرمائیے کہ

ہے کہاں تمنّا کا، دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا
بے دماغِ خجلت ہوں، رشکِ امتحاں تا کے
ایک بیکسی تجھ کو، عالم آشنا پایا

کیوں نہ وحشتِ غالب باج خواہِ تسکیں ہو
کشتۂ تغافل کو خصمِ خوں بہا پایا

اس کا دوسرا قدم کہاں پڑا؟ دنیا کو نقش قرار دینا اس اعتبار سے درست ہے کہ اس کا وجود صوفیہ کے نزدیک محبوبِ حقیقی سے فراق کا نتیجہ ہے۔ پھر اس شعر میں یہ اشارہ بھی ہے کہ محبوبِ حقیقی نے حسن کی نمائش کے لیے یہ پورا کارخانہ بنایا۔ گویا یہ سب کچھ تمنا کا ایک نقشِ قدم ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دوسرا نقشِ قدم کہاں ڈھونڈیں؟

۲- شرح : میں شرمندگی برداشت نہیں کر سکتا۔ احسان کا رشک کب گوارا کر سکتا ہوں؟ نہ میرا کوئی مونس ہے، نہ ہمدرد۔ میں اپنی ذات کے لیے کسی کا احسان قبول نہیں کر سکتا۔ اے بیکسی! جس طرح تُو دنیا بھر کی ساتھی ہے، اسی طرح میری بھی ساتھی تنہا تُو ہے۔

۳- لغات : باج : خراج۔

شرح : غالب کی دیوانگی کس لیے تسکین کا خراج وصول نہ کرے؟ جس عاشق کو محبوب کے تغافل نے مار ڈالا، وہ اپنا خوں بہا تو لے ہی نہیں سکتا کیونکہ تغافل میں مارا جانا خوں بہا کا مستحق ہی نہیں۔ صرف اتنی آرزو ہے کہ دیوانگی کی حالت میں کچھ تسلی ہو جائے۔

جس قدر جگر خوں ہو، کوچہ دادنِ دل ہے
زخمِ تیغِ قاتل کو طرفہ دل کشا پایا
ہے اسد جفا سائل، ہے ستم جنوں مائل
تجھ کو جس قدر ڈھونڈا، الفت آشنا پایا

۱- لغات : کوچہ دادن : کسی کو نکلنے کے لیے راستہ دے دینا۔

شرح : جس قدر جگر لہو ہو کر بہتا جائے، دل راستہ

دیتا جاتا ہے۔ قاتل کے زخم تیغ کو میں نے صدرِ دل کھول دینے والا پایا۔

مطلب یہ کہ قاتل کی تلوار جگر پر پڑی اور وہ خون ہو کر بہ گیا۔ ساتھ ہی دل کا راستہ کھل گیا۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ قاتل کی تلوار بڑی دلکشا ہے۔

۲- شرح : نہ اسد کا سوال یہ ہے کہ اس پر ظلم و جور ضرور کیا جائے۔ نہ محبوب کی ستمگری کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اس میں دیوانگی کی خصلت ہے، یعنی وہ اندھا دھند ستم کیے جا رہا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ ہم نے محبوب کو جس قدر ڈھونڈا، یہی معلوم ہوا کہ ہماری محبت والفت کی آزمائش ہو رہی ہے، اس کے بغیر محبوب مل نہیں سکتا۔

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہم جو ظلم و ستم اٹھا رہے ہیں، ان میں نہ ہماری خواہش و آرزو کو دخل ہے، نہ محبوب ستمگر ہے۔ یہ سب محبت کی طبعی آزمائشیں ہیں ان سے گزرے بغیر کوئی کیونکر منزلِ مراد پر پہنچ سکتا ہے؟ جس طرح کھانا اور پینا، جاگنا اور سونا زندگی کی خصوصیتیں ہیں، اسی طرح آزمائشیں محبت کے راستے کی طبعی منزلیں ہیں۔ پھر ان سے گھبرانے کا کیا مطلب؟ محبت ہے تو اس راستے کی ہر افتاد قبول کرنی پڑے گی۔ جیسے کوئی شخص پھول چنے گا تو کانٹوں کی خلش سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

۱- شرح : میرے سینے میں کوئی چیز کھٹک رہی تھی۔ لوگ کہتے تھے، یہ دل ہے، جس میں محبت کی خلش ہے۔ دیکھا تو تیر کی نوک نکلی، جو دل میں پیوست ہو گئی تھی اور برابر کھٹکتی رہی۔

کچھ کھٹکتا تھا مرے سینے میں، لیکن آخر
جس کو دل کہتے تھے، سو تیر کا پیکاں نکلا

کس قدر خاک ہوا ہے دلِ مجنوں، یارب
نقشِ ہر ذرہ سویدائے بیاباں نکلا

شورِ رسوائیِ دل دیکھ کہ یک نالۂ شوق
لاکھ پردے میں چھپا، پر وہی عریاں نکلا

شوخیِ رنگِ حنا خونِ وفا سے کب تک
آخر اے عہد شکن! تُو بھی پشیماں نکلا

۲- شرح : اے خدا! مجنوں کا دل کس قدر خاک ہو گیا ہے، یعنی خاک میں مل گیا ہے کہ ہر ذرہ بیاباں کے لیے سویدا بن گیا ہے۔

۳- شرح : دل کی رسوائی کا جنون ملاحظہ کر کہ شوق کی ایک فریاد لاکھوں پردوں میں چھپی، پھر بھی وہ عریاں ہی نکلی۔

مطلب یہ کہ نالۂ شوق کو کتنا ہی چھپایا، مگر چھپ نہ سکا سبب یہ تھا کہ دل کو رسوا ہونے کا شوق تھا اور وہ اپنا شوق پورا کر کے رہا۔

۴- شرح : اے عہدِ محبت توڑ دینے والے محبوب! تُو کب تک وفا کے خون سے اپنے لیے مہندی کا سامان فراہم کرتا رہتا۔ آخر تجھے بھی اپنے اس فعل پر پشیمانی ہوئی۔

ناتوانی ہے تماشائیِ عمرِ رفتہ
رنگ نے آئنہ آنکھوں کے مقابل باندھا

اصطلاحاتِ اسیرانِ تغافل مت پوچھ
جو گرہ آپ نے کھولی، اُسے مشکل باندھا

یار نے تشنگیِ شوق کے مضموں چاہے
ہم نے دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

مضطرب دل نے مرے تارِ نفس سے غالب
سازِ پُر رشتہ پئے نغمۂ بیدل باندھا

۱- شرح : ضعف و ناتوانی گزری ہوئی عمر کا تماشا کر رہی ہے جو گوناگوں رنگ ہم زور و قوت اور جوانی کے زمانے میں دیکھ چکے۔ وہ آنکھوں کے سامنے آئینے کی طرح آ گئے اور ان سے پوری گزشتہ کیفیت ہم پر آشکارا ہو گئی۔

مطلب یہ کہ

عمر گزر گئی، آخری منزل پر پہنچ گئے۔ اب پیری کے ضعف میں مبتلا ہیں۔ گزری ہوئی عمر پر پشیمان ہیں اور جو بہاریں ہم گزار چکے ہیں، وہ آئینۂ عبرت کی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔

۲۔ شرح : جو لوگ غفلت کے قیدی ہیں یعنی غفلت کا شکار رہ چکے ہیں، انھوں نے اپنے لیے جو عجیب و غریب اصطلاحیں وضع کر لی ہیں ان کی کیفیت کیا پوچھتے ہو؛ حالت یہ ہے کہ جس گرہ کو انھوں نے خود نہ کھولا، کہ لیا کہ اس کا کھولنا مشکل تھا۔

ظاہر ہے کہ جو کام غفلت کے باعث وہ خود نہ کر سکے، اسے مشکل بتا کر دل کی تسلّی کر لی اور اپنے خیال کے مطابق دنیا کے سامنے سرخرو ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان میں ہمت ہوتی اور وہ غور و توجہ سے کام لیتے تو یہاں کوئی گرہ ایسی نہ تھی، جو کھل نہ سکتی۔ کوئی کام ایسا نہ تھا، جو انجام نہ پا سکتا۔

۳۔ شرح : محبوب ہم سے اس بات کا طلبگار تھا کہ ہم شوق کی پیاس کا حال بیان کریں۔ ہم نے انتہائی ہمت و کشادہ دلی سے کام لیتے ہوئے دریا کو بھی ساحل باندھ دیا۔ یعنی ساحل، جو دریا سے وابستہ ہوتا ہے، مسلسل نم آلود رہنے کے باوجود پیاسا ہی رہتا ہے۔ دریا بھی پی جائے تو اس کی پیاس نہیں بجھتی لیکن حق یہ ہے کہ اتنی ہمت اور وسعتِ حوصلہ کے باوجود شوق کی پیاس کے مضمون ہمارے قابو میں نہ آئے ہم اس پیاس کی پوری کیفیت بیان نہ کر سکے۔

اس شعر کا دوسرا مصرع میرزا نے مطبوعہ دیوان کے لیے رکھ لیا اور اس پر یہ مصرع لگایا:

نہ بندھے تشنگیٔ ذوق کے مضموں غالبؔ   ہم نے دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

۴۔ شرح : اے غالبؔ! دل کے عشق نے میرے سانس کا تار لیا اور ساز پر ڈورا بنا کر باندھ دیا تاکہ میں میرزا بیدلؔ کے نغمے گاؤں۔

یہ شروع دور کی غزل ہے جب میرزا بیدلؔ پر مٹے ہوئے تھے، اس لیے تارِ نفس کو سازکا رشتہ بنا کر بیدلؔ کے رنگ میں شعر کہنے کے آرزومند ہیں۔

زبس آتش نے فصلِ رنگ میں رنگِ دگر پایا
چراغِ گل سے ڈھونڈے ہے چمن میں شمع خار اپنا

شرح: فصلِ بہار آئی اور رنگ برنگ پھولوں کے رنگ نے آگ کی صورت اختیار کر لی۔ شمع نے اپنا خار ڈھونڈنے کے لیے پھول کے چراغ سے کام لیا۔

شمع کا خار وہ دھاگا ہوتا ہے جو جلتا ہے۔ پھول رنگ کی فراوانی سے آگ بن گئے تو شمع نے پھول کا چراغ لے کر اپنا خار ڈھونڈنے کا سامان کر لیا۔

ہم نے وحشت کدۂ بزمِ جہاں میں جوں شمع
شعلۂ عشق کو اپنا سر و ساماں سمجھا

شرح: اس جہاں کی محفل جب وحشت کدے کے سوا کیا ہے! ہر شے دیوانہ وار اپنی دُھن میں لگی ہے۔ ہر محفل کے لیے شمع ضروری ہے۔ ہم نے بھی دنیا میں شمع کی طرح صرف عشق کی چنگاری کو اپنا سر و سامان قرار دے دیا۔

نہ پائی وسعتِ جولانِ یک جنوں ہم نے
عدم کو لے گئے دل میں غبارِ صحرا کا

شرح: ہمیں اس دنیا میں اتنی فراخی اور کشادگی بھی نہ مل سکی کہ ہماری ایک دیوانگی حسبِ دلخواہ ہنگامہ آرائی کر لیتی۔ اس پر حسرت اور کدورت کا غبار اس کثرت سے جمع ہوتا رہا کہ ایک صحرا بن گیا اور یہ غبار ہم اپنے ساتھ عدم کو لے گئے۔

مطلب یہ کہ یہ دنیا وسعت کے باوجود ایک جنوں کی بھی ہنگامہ آرائی برداشت نہیں کر سکتی۔

۱۔ شرح : شررِ فرصت نگہ، سامانِ یک عالم چراغاں ہے
بہ قدرِ رنگ یاں گردش میں پیمانہ ہے محفل کا
مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں، غالبؔ!
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدلؔ کا

ہمیں جو مہلت ملی، وہ تو صرف اتنی ہے، جیسے شرار چمکا اور ختم ہو گیا۔ اس کے مقابلے میں نظر کی یہ حالت ہے کہ دنیا کو چراغاں بنا دینے کا سامان لیے بیٹھی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس محفل کا پیمانہ صرف اپنے رنگ کے مطابق گردش کر سکتا ہے۔

مطلب یہ کہ زندگی حد درجہ قلیل ہے اور انسان اپنے ساتھ ہزاروں آرزوئیں لیے بیٹھا ہے۔ اتنا نہیں سمجھتا کہ کسی محفل میں پیمانہ اتنی دیر تک گردش کرے گا، جتنی دیر تک شراب ہو گی۔ شراب ختم ہو گی تو پیمانے کی گردش بھی رک جائے گی۔ گویا اس زندگی میں تمام آرزوئیں پوری نہیں ہو سکتیں۔

۲۔ شرح : اے غالبؔ! مجھے شعر گوئی کے راستے میں گمراہی کا کوئی ڈر نہیں اس صحرا میں میرزا بیدلؔ کا قلم میرے لیے خضرؑ کے عصا کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو شخص ایسے خضر کی رہنمائی میں جا رہا ہو، اسے راستے سے بھٹک جانے کا کیا ڈر ہو سکتا ہے؟

شرح : بہ صورت تکلف، بہ معنی تاسف
اسدؔ! میں تبسم ہوں پژمردگاں کا

اے اسدؔ! میں ان لوگوں کی مسکراہٹ ہوں، جن کے دل افسردہ و پژمردہ ہوں۔ اگر میری صورت دیکھی جائے تو میری مسکراہٹ سراسر تکلف کا نتیجہ نظر آئے گی۔ میری اصل حالت پر غور کیا جائے تو وہ مسکراہٹ سراسر افسوس معلوم ہو گی۔

مطلب یہ کہ جن لوگوں کے دل مرجھا چکے ہوں، وہ ہنستے بھی ہیں تو محض تکلف سے،

حقیقت میں ان کے دلوں کو تسم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور غور سے دیکھا جائے تو وہ حسرت و تاسف ہی کے مارے ہوئے نظر آئیں گے۔

ضعفِ جنوں کو وقتِ تپش در بھی دُور تھا
اک گھر میں مختصر سا بیاباں ضرور تھا
اے وائے غفلتِ نگہِ شوق، ورنہ یاں
ہر پارہ سنگ لختِ دلِ کوہِ طُور تھا
شاید کہ مر گیا ترے رُخسار دیکھ کر
پیمانہ رات ماہ کا لبریزِ نور تھا
ہر رنگ میں جلا اسدؔ فتنہ انتظار
پروانۂ تجلیِ شمعِ ظہور تھا

۱۔ شرح: دیوانگی پر ضعف کی کیفیت طاری تھی۔ سخت گرمی کا موسم تھا۔ ایسی حالت میں میرے لیے گھر کے دروازے تک پہنچنا بھی مشکل تھا۔ اس حال میں جنوں کے لیے تسکین کی صورت اس کے سوا کیا تھی کہ ایک چھوٹا سا بیاباں گھر میں بھی بنا لیتے تاکہ جب ضعف کے مارے اصل صحرا تک نہ پہنچ سکتے تو گھر ہی میں صحرانوردی کر لیتے۔

۲۔ شرح: نگاہِ شوق کی غفلت پر افسوس ہونا چاہیے کہ اس نے حقیقت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہ کیا، ورنہ اس دنیا میں پتھر کا کون سا ٹکڑا ہے، جسے کوہ طُور کے لختِ جگر کی حیثیت حاصل نہیں؟ یعنی اس میں وہ تجلی نظر نہیں آتی جو کوہ طور کی زینت بنی تھی۔

شاعر کا مقصد یہ ہے کہ جس تجلی کا ظہور کوہِ طُور پر ہوا تھا، وہ بلا شبہ ایک خاص ظہور تھا۔ لیکن کون سا پارہ سنگ ہے، جس میں صانع حقیقی کی شان نظر نہیں آتی اور جو اُس کی یاد تازہ نہیں کر دیتا؟ البتہ انسان توجہ نہ کرے اور غفلت سے کام لے تو بات دوسری ہے۔ اس صورت میں تجلی طُور بھی اس کے لیے ہرگز بصیرت افروز نہیں۔

۳۔ شرح : رات چاند کا پیمانہ نور سے بھر گیا اور پیمانہ لبریز ہونے کے معنی مر جانے کے بھی ہیں۔ اے محبوب! معلوم ہوتا ہے، تیرا چہرا دیکھ کر اسے موت آگئی۔

مطلب یہ کہ چودھویں کے چاند نے پیمانہ خوب نور سے بھر لیا، لیکن تیرا چہرہ دیکھا تو اپنی بے مائگی کی شرم میں ڈوب مرا۔

۴۔ شرح : جو اسد انتظار کی آزمائش کا شکار ہو چکا تھا، وہ ہر رنگ میں جل کر خاکستر ہو گیا۔ حقیقت یہ کہ وہ شمعِ ظہور کی تجلی کا پروانہ تھا۔ یعنی جہاں، سے محبوبِ حقیقی کے ظہور کی شمع روشن نظر آئی، وہیں جل مرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ محبوب سے فراق برداشت نہیں کر سکتا تھا اور انتظار کی گھڑیاں نہیں جھیل سکتا تھا۔

بوقتِ سرنگونی ہے تصوّر انتظارستاں
نگہ کو آبلوں سے شغل ہے اختر شماری کا

شرح : جب ہم سر جھکا کر محبوب کا تصوّر کر لیتے ہیں تو انتظار کا منظر پیدا ہو جاتا ہے۔ ہماری نگاہ جا بجا اسے ڈھونڈ پھری ہے یہاں تک کہ اس کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ پس انھیں چھالوں کو بار بار دیکھنا دراصل تارے گننا ہے۔ جو رات گزارنے کا ایک بہانہ سمجھا جاتا ہے، خصوصاً ان لوگوں کے لیے، جو اپنے محبوبوں سے جدا ہوں۔

ہر گام آبلے سے ہے، دل، در تہِ قدم
کیا بیم اہلِ درد کو سختیِ راہ K

شرح : جو بھی قدم اٹھاتا ہوں، اس کا ہر آبلہ دراصل دل ہے جو پاؤں کے نیچے رکھ دیا گیا ہے۔ اس حال میں دردمندوں کو راستے کے کٹھن اور دشوار ہونے کا ڈر کیوں؟ یعنی جو لوگ آبلوں کی جگہ دل رکھ دیتے ہیں، انھیں کتنی ہی سختی پیش آئے آسانی سے جھیل لیں گے، لہٰذا کوئی ڈر نہیں ہو سکتا۔

ارادہ کر لیا کہ آئندہ کسی کو قتل نہ کرے گا۔ ہائے! اس عہد پچتانے والے کو کس موقع پر پچتانے کی سوجھی۔

شعر کے مطلب دو ہیں، اوّل محبوب کے جلد پچتانے پر اس لیے افسوس ہے کہ قتل کے بعد اس پچتانے سے مقتول کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا، دوم یہ کہ مجھے تو قتل کر دیا اور میں نے ثابت قدمی سے وفا کا ثبوت بہم پہنچا دیا۔ اب رقیبوں کی باری آئی تو محبوب نے جور و جفا سے توبہ کر لی۔ اس طرح ان کی آزمائش بھی نہ ہو سکی اور وہ محبوب کے لطف و کرم سے بے تکلف فائدہ بھی اٹھاتے رہے۔

بعض احباب نے اس شعر کے سلسلے میں خواجہ حافظؔ کا یہ شعر پیش کیا ہے!

آفریں بر دلِ نرم تو کہ از بہر ثواب
کُشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدۂ

تیری نرم دل پر آفریں ہے کہ جسے تیرے غمزے نے قتل کیا، اس کی نمازِ جنازہ ادا کرنے کے لیے چلا آیا ہے تاکہ ثواب حاصل کرے۔

ظاہر ہے کہ دونوں شعروں کا مضمون ایک نہیں، پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حافظ نے اپنے مضمون کی بنیاد محبوب کے دلِ نرم اور "شوقِ ثواب" پر رکھی ہے اور غالب کے شعر میں زود و پشیماں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ "تیرِ نیمکش کی طرح" زود پشیماں" کا بھی کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔

۹۔ **شرح** : اے غالب! اس چار گرہ کپڑے کی قسمت پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے جس کی تقدیر میں عاشق کا گریباں بننا ہو، کیونکہ وہ ہمیشہ چاک ہوتا رہے گا۔ اور اس کی دھجیاں اڑتی رہیں گی۔

"آبِ حیات" میں ہے کہ مرزا غالب کو ایک آفتِ ناگہانی کے سبب سے اسی طرح جیل میں رہنا پڑا۔ جس طرح حضرت یوسفؑ کو مصر کے قید خانے میں رہنا پڑا تھا۔ کپڑے میلے ہو گئے، جوئیں پڑ گئیں۔ ایک دن بیٹھے جوئیں چن رہے تھے کہ ایک

خود پرستی سے رہے باہمدگر نا آشنا
بیکسی میری شریک، آئینہ تیرا آشنا

بے دماغی شکوہ سنجِ رشکِ ہمدیگر نہیں
یار تیرا جامِ مے، خمیازہ میرا آشنا

ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا

۱- شرح : ہم خود پرستی کی عادت کے لیے ایک دوسرے سے نا واقف رہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ہم دونوں خود پرست تھے، دونوں اپنے حال میں مست تھے۔ میں بیکسی کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتا تھا، اے محبوب! تو نے آئینے سے دوستی پیدا کر رکھی تھی۔ یعنی ہر وقت اسے سامنے رکھ کر بناؤ سنگار میں مصروف رہتا تھا۔

۲- شرح : بے دماغی اس امر کی روادار نہیں کہ ہم ایک دوسرے کے خلاف رشک کی بنا پر شکوہ شکایت کریں۔ مان لینا چاہیے کہ تجھے جام پر جام پینا پسند ہے اور میں برابر نشے کے اُتار میں مبتلا ہوں۔

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اے محبوب! تو پے در پے شراب کے پیالے چڑھا جاتا ہے میرا جسم خمار کے پیچ و تاب میں مبتلا ہے۔ اب بتا کہ ایک دوسرے کی حالت پر رشک کرنے یا شکایت کے دفتر کھول لینے کا کیا فائدہ ہے بلطف یہ کہ ہم دونوں بے دماغ بھی ہیں اور بے دماغی شکوہ و شکایت کی روادار ہی نہیں ہو سکتی

۳- شرح : بہار کے جتنے بھی اجزا ہیں، وہ سب بے اُنسی بلکہ نفرت کے شیرازے میں بندھے ہوئے ہیں۔ یعنی ان کی فطرت ہی یہ ہے کہ ایک دوسرے سے بھاگیں گے، کسی سے اُنس پیدا نہ کریں۔ ثبوت ملاحظہ فرمائیے: اجزائے بہار میں سے ایک سبزہ ہے۔ ساری دنیا اسے بیگانہ کہتی ہے۔ دوسرا جزو صبا ہے۔ جو سراسر آوارہ ہے، جدھر منہ اٹھتا ہے، چل نکلتی ہے۔ تیسرا جزو پھول ہے۔ وہ کسی سے آشنائی ہی پیدا

نہیں کرتا۔

دیکھیے، تین جزو پیش کیے اور تینوں میں بے اُنسی، گریز اور نفرت کی خصوصیت نمایاں کر دی۔ بیگانہ وہی ہے، جسے کسی سے آشنائی نہ ہو، سب سے الگ تھلگ رہے۔ آوارہ وہی ہے، جو کسی سے ربط ضبط نہ رکھے۔ ناآشنا وہی ہے، جو کسی سے اُنس پیدا نہ کرے۔

دُودِ میرا سنبلستاں کی کرے ہے ہمسری
بسکہ شوقِ آتشِ گُل سے سراپا جل گیا

شرح: میں سر سے پاؤں تک پھول کی آگ کے عشق میں جل گیا ہوں۔ مجھ میں سے جو دھواں اٹھتا ہے، وہ سنبل کا ہمسر بن گیا ہے۔

ہوں قطرہ زن بہ وادیِ حسرت شبانہ روز
جُز تارِ اشک جادۂ منزل نہیں رہا

اے آہ! میری خاطرِ وابستہ کے سوا
دنیا میں کوئی عقدۂ مشکل نہیں رہا

۱۔ شرح: میں حسرت کی وادی میں رات دن قطرہ قطرہ ہو کر گر رہا ہوں۔ میری منزل کا راستہ آنسوؤں کے تار کے سوا کچھ نہیں رہا۔ یعنی جس طرح آنسو مسلسل قطرہ قطرہ ہو کر گرتے ہیں اور ایک تار باندھ دیتے ہیں۔ یہی کیفیت میری ہے اور اسی کو میری منزل کا راستہ سمجھنا چاہیے۔

۲۔ شرح: میرے بندھے ہوئے دل کے سوا دنیا میں کوئی ایسی گرہ نہیں رہی، جسے کھولنا مشکل ہو۔ اے آہ! تُو ہی مہربانی کر کہ یہ کسی طرح کھل جائے۔

بہ ہوس دردِ سرِ اہلِ سلامت، تا چند
مشکلِ عشق ہوں، مطلب نہیں آساں میرا

شرح :
جو لوگ امن و اطمینان سے بیٹھے ہیں، وہ کب تک دردِ سر میں مبتلا رہیں گے کہ میرا مطلب پائیں؟ میں عشق کی مشکل ہوں اور میرا مطلب پالینا سہل نہیں۔ یعنی جن لوگوں کو سلامتی سے محبت ہے، وہ اس مشکل کا حل کیونکر تلاش کر سکتے ہیں، لہٰذا ان کا دردِ سر بالکل بے سود ہے۔

رکھا غفلت نے دُور افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ
اشارت فہم کو ہر ناخنِ بُریدہ ابرو تھا
اسد! خاکِ در میخانہ اب سر پر اُڑاتا ہوں
گئے وُہ دن کہ پانی، جامِ مے کا تا بہ زانو تھا

۱۔ شرح :
ہم غفلت کے باعث ذوقِ فنا سے دُور دُور رہے، ورنہ جن لوگوں کو حقیقت کے اشاروں کی سمجھ تھی، اُن کے لیے تو ہر کٹا ہوا ناخن بھی ابرو کی حیثیت رکھتا تھا، یعنی وہ تو کٹے ہوئے ناخن ہی کو ابرو سمجھ کر اس کے اشارے پر جان دے سکتے تھے۔ غفلت نے ہم سے فہم و بصیرت کی یہ دولت ہی چھین لی۔

۲۔ شرح : اے اسد! اب میخانے کی خاک اُڑا اُڑا کر سر پر ڈالتا ہوں، ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے، جب شراب نوش پی کر تھوڑی سی زمین پر انڈیل دیتے تھے، اور اس طرح شراب میخانے کے صحن میں گھٹنوں تک آ پہنچی تھی۔

پریشانی سے مغزِ سر ہُوا ہے پنبۂ بالش
خیالِ شوخیِ خوباں کو راحت آفریں پایا

لغات :
پنبۂ بالش : تکیے کی روئی۔

شرح : پریشانی کی حالت میں سر کے مغز کی یہ کیفیت ہوگئی جیسے تکیے کی روئی

ہے۔ حسینوں کی شوخی کا تصور بھی بڑی راحت پیدا کرنے والا ہے۔

مطلب یہ کہ میں شوخی کے تصور میں پریشان تھا۔ مغز کی یہ حالت ہو گئی، جیسے دھنکی ہوئی روئی ہو اور اسے تکیے میں بھر دیا جائے تکیہ باعث راحت ہے لہذا اس پریشانی کا انجام راحت پر ہوا۔

بہ رہنِ شرم ہے، باوصفِ شوخی اہتمام اُس کا
نگیں میں جوں شرارِ سنگ ناپیدا ہے نام اُس کا

مسی آلودہ ہے مہرِ نوازش نامہ، پیدا ہے
کہ داغِ آرزوئے بوسہ لایا ہے پیام اُس کا

بہ اُمیدِ نگاہِ خاص ہوں محمل کشِ حسرت
مُبادا ہو عناں گیرِ تغافل لطفِ عام اُس کا

۱۔ شرح : اگرچہ میرا محبوب شوخ ہے، تاہم اس کے اہتمام و انتظام کی باگ ڈور شرم کے ہاتھ میں ہے۔ مثال یہ سمجھنی چاہیے کہ اگرچہ اس سے [illegible] ہے [illegible] نگینے کے شرارے کی طرح اندر ہی اندر بند ہے۔

[illegible]

جن نسخوں میں شوخی کی جگہ شہرت کا لفظ ہے۔ اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ اگرچہ اس کی شہرت بہت ہے، لیکن وہ شرم کے تمام آداب کا پابند ہے۔ نگینہ بنایا تاکہ جا بجا مہر میں ثبت کرے، مگر نام چنگاری کی طرح نگینے کے اندر رہا۔

۲۔ شرح : محبوب کے خط پر جو مہر لگی ہوئی ہے، اس میں مسی کی آمیزش ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے بوسے کی جو آرزو کی تھی، اس کے جواب میں انکار ہی کا پیغام آگیا۔ گویا وہ پیغام آرزوئے بوسہ کا داغ ہے۔ داغ اس لیے کہ مسی کے رنگ کا ہوتا ہے۔ آرزوئے بوسہ کے لیے داغ اس بنا پر کہ مسی ہونٹوں کو سیاہی مائل کرنے کے لیے لگائی جاتی ہے۔

۳۔ لغات : محمل کش : کجاوہ اُٹھانے والا۔

شرح : میں نگاہِ خاص کی اُمید پر حسرت کا کجاوہ اٹھائے پھرتا ہوں یعنی

مجھے نگاہِ خاص کی حسرت ہے اور یہ سب کچھ اس لیے کر رہا ہوں کہ شاید اس کا لطفِ عام تغافل کا عنان گیر نہ بن جائے۔

مطلب یہ کہ سب پر اس کا لطف و کرم ہے ایسا نہ ہو کہ اسی لطفِ عام میں مجھے بھی شامل کر لیا جائے اور نگاہِ خاص کی حسرت دل ہی میں رہ جائے

عشق میں ہم نے ہی ابرام سے پرہیز کیا
ورنہ جو چاہیے اسبابِ تمنا، سب تھا

آخرکار گرفتارِ سرِ زلف ہوا
دلِ دیوانہ کہ وارستۂ ہر مذہب تھا

۱- شرح : دیکھ ہمیں کہ جو عشق [illegible] سے الگ تھلگ رہے ورنہ تمنا کے [illegible] اسباب موجود تھے [illegible] سکتے تھے۔

۲- شرح : ہمارا دیوانہ دل ہر مسلک اور ہر مذہب سے آزاد تھا۔ آخر زلف کے پھندے میں گرفتار ہو گیا۔

دود کو آج اس کے ماتم میں سیہ پوشی ہوئی
وہ دلِ سوزاں کہ کل تک شمعِ ماتم خانہ تھا

ساختہ جنبش کے بہ یک برخاستن طے ہو گیا
تو کہے صحرا غبارِ دامنِ دیوانہ تھا

دیکھ اس کے ساعدِ سیمین و دستِ پُرنگار
شاخِ گل جلتی تھی مثلِ شمع، گُل پروانہ تھا

۱- شرح : میرا جلتا ہوا دل ماتم خانے کی شمع سا ہوا تھا آج وہ شمع گل ہو گئی اور دھواں اس کے ماتم میں سیاہ لباس پہنے ہوئے ہے۔

۲- لغات :
برخاستن : اٹھنا۔

شرح :
ہیں اٹھا، ذرا جنبش
ہوئی اور پورا صحرا طے
کرلیا۔ اُس کا کوئی حصّہ باقی ہی نہ رہا۔ گویا صحرا صحرا نہ تھا۔ دیوانے کے دامن کا غبار تھا کہ ذرا
جھٹکا اور جھڑ گیا۔

س شعر میں بھی میرزا نے اپنا وہی مضمون پیش کیا ہے کہ یہ پوری کائنات ہمارے
جنونِ عشق کی تسکین کے لیے کافی نہیں ۔ یہ تو ایک ہی جنبش میں ختم ہو گئی۔

۳۔ شرح : میرے محبوب کی چاندی جیسی کلائی اور رنگے ہوئے ہاتھ دیکھ کر پھول
کی شاخ شمع کی مانند جلنے لگی اور پھول اس کا پروانہ بن گیا۔

اس شعر میں "ساعدِ سیمیں" کو "شاخِ گل" اور "دستِ پُر نگار" کو "گل" سے تشبیہ دی
گئی ہے۔

اے آبلہ کرم کر، یاں رنجہ یک قدم کر
اے نورِ چشمِ وحشت! اے یادگارِ صحرا

شرح :
اے چھالے! تو تکلیف
اٹھا کر آ۔ تو دیوانگی
کی آنکھ کا نور ہے، تو صحرا نوردی کی یادگار ہے۔

اے خوشا ذوقِ تمنائے شہادت کہ اسد
بے تکلّف بہ سجودِ خمِ شمشیر آیا

شرح :
دیکھیے، اسد بے تکلف
تو رکے جھکاؤ ہیں

کرنے کے لیے آیا ہے۔ واہ! اس کی آرزوے شہادت کا کیا عالم ہے، اور کس قدر ذوق و شوق ہے!

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

اسدؔ اے ہرزہ درا! نالہ بہ غوغا تا چند
حوصلہ تنگ نہ کر بے سبب آزاروں کا

۱۔ شرح : میرا محبوب پھر باغ کی طرف چلا آ رہا ہے۔ خدا خیر کرے، خدا جانے کیا گل کھلائے۔ بس ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ باغ میں جو بھی ہوا دار رہے ہیں، ان کے چہرے کا رنگ اڑا جا رہا ہے۔ یعنی وہ بھی پریشاں ہیں، دیکھیں، انجام کیا ہو!

۲۔ لغات : ہرزہ درا : بیہودہ گو۔

شرح : بیہودہ گو اسدؔ! تو بلند آواز سے نالے کر کر کے شور کیوں مچا رہا ہے؟ دیکھ جو محبوب بغیر کسی سبب کے عاشقوں کو دکھ دینے کے عادی ہیں کہیں وہ تیری آہ و فغاں سے گھبرا کر حوصلہ نہ ہار بیٹھیں اور شیوۂ آزار ترک نہ کر دیں۔

اسدؔ ارباب فطرت قدر دان لفظ و معنی ہیں
سخن کا بندہ ہوں لیکن نہیں مشتاق تحسین کا

شرح: اے اسدؔ! جنہیں اللہ تعالیٰ نے فطرت صحیحہ عطا کی ہے، وہ لفظ اور معنی دونوں کے قدر دان ہیں۔ میں شعر گوئی کے لئے وقف ہوں گویا اسی کا غلام ہوں، لیکن تحسین و آفرین کا مجھے کوئی شوق نہیں۔

اس مقطع سے ظاہر ہے کہ ابتدائی دور میں میرزا جو شعر کہتے تھے، عام لوگ نا سمجھی کے باعث ان کی کچھ قدر نہیں کرتے تھے۔ پھر زرا بہتر شعر کہنے لگے تو اس دور میں کچھ زیادہ قدر نہ ہوئی، اس لئے کہا:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا — گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

شرح :

عیب کا دریافت کرنا ہے ہنرمندی، اسدؔ!
نفس پر اپنے ہوا جو مطلع، کامل ہوا

اے اسدؔ! اپنا عیب دریافت کر لینا بڑی ہنرمندی اور عقل و دانش کی دلیل ہے۔ جس شخص کو اپنی خامی کا علم ہو گیا، سمجھ لیجیے کہ اس کے کامل ہوتے کا راستہ کھل گیا۔

اس سلسلے میں عرفیؔ کیا خوب کہ گیا ہے۔

خواہی کہ عیب ہائے تو روشن شود ترا — یکدم منافقانہ نشیں در کمینِ خویش

(اگر تو چاہتا ہے کہ تیرے عیب تجھ پر آشکارا ہو جائیں تو تھوڑی دیر کے لیے ہیئت بدل کر اپنی گھات میں بیٹھ جا، اپنے عیب تلاش کرنے کا اس سے بہتر ہی نہیں، بلکہ اس کے سوا بھی کوئی طریقہ نہیں۔

۱۔ شرح :

سرِ منزلِ ہستی سے ہے صحرائے طلب دور
جو خط ہے کفِ پا پہ، وہ ہے سلسلۂ پا
دیدارِ طلب ہے دلِ واماندہ کہ آخر
نوکِ سرِ مژگاں سے رقم ہو گلۂ پا

ہم جس صحرا میں پہنچنا چاہتے ہیں، وہ اس زندگی کی منزل سے بہت دور ہے۔ ہمارے پاؤں سے جو نقش بنتے

جا رہے ہیں، وہ حقیقت میں پاؤں کے لیے ایک زنجیر ہیں۔ جو آگے بڑھنے سے روکتی ہے۔

۲۔ شرح : ہمارا تھکا ہوا اور پیچھے رہا ہوا دل محبوب کے دیدار کا طلبگار ہے۔ چاہیے کہ پاؤں کا شکوہ قلم کے بجائے نوک سر مژگاں سے لکھا جائے۔ یعنی ہم چل کر محبوب کی بارگاہ میں پہنچنا چاہتے ہیں تاکہ اس کے دیدار سے شاد کام ہوں، مگر پاؤں ساتھ نہیں دیتے۔ ان کی شکایت لکھنے کے لیے نوک سر مژگاں سے بہتر قلم کیا ہو سکتا ہے۔ ؟

بہ مہرِ نامہ جو بوسہ گُل پیام رہا
ہمارا کام ہوا اور تمہارا نام رہا

دل و جگر تفِ فرقت سے جل کے خاک ہوئے
ولے ہنوز خیالِ وصال خام رہا

شکستِ رنگ کی لائی سحر، شبِ سنبل
پہ زلفِ یار کا افسانہ ناتمام رہا

نہ پوچھ حال شب و روزِ ہجر کا، غالبؔ!
خیالِ زلف و رُخِ دوست صُبح و شام رہا

۱۔ شرح : آپ نے خط پر مہر کرتے وقت جو لعاب دہن لگایا، وہ ہمارے لیے گُلِ پیغام بن گیا۔ ہمارا کام ہوا، آپ کا نام رہا۔

۲۔ شرح : دل اور جگر جدائی کی تپش سے جل کر خاک ہو گئے، لیکن وصل کا تصور ابھی تک خام چلا آتا ہے۔

مطلب یہ کہ ہم جل کر راکھ ہو گئے اور ابھی تک وصال کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی۔

۳۔ شرح : سُنبل کی رات کا رنگ فق ہو گیا اور صبح طلوع ہوئی، لیکن محبوب کی زلف کا افسانہ پورا نہ ہو سکا۔

سنبل کا رنگ سیاہی مائل ہوتا ہے، اس لیے اُسے شب کہا۔ پھر اس کا رنگ ٹوٹ گیا اور وہ سفید ہو گئی۔ گویا رات صبح کی شکل اختیار کر گئی، لیکن زلف کا افسانہ پورا نہ ہوا۔

۴۔ **شرح** : اے غالبؔ! جدائی کے شب و روز کا حال کچھ نہ پوچھ۔ محبوب کے رخسار اور زلف کا خیال صبح اور شام برابر رہا۔

شب اور روز، صبح اور شام، زلف اور رخ کی مناسبت محتاجِ بیان نہیں۔

شرح : اسدؔ! مایوس مت ہو، گرچہ رونے میں اثر کم ہے
کہ غالب ہے کہ بعدِ از زاریِ بسیار ہو پیدا

اے اسدؔ! ناامید نہ ہو۔ میں نے مانا کہ رونے میں کچھ زیادہ اثر نہیں، مگر اغلب ہے کہ زیادہ سے زیادہ رویا جائے تو کچھ اثر پیدا ہو جائے۔

شرح : عمر میری ہو گئی صرفِ بہارِ حسنِ یار
گردشِ رنگِ چمن ہے ماہ و سالِ عندلیب

ایک میں ہوں، جس کی عمر حسنِ محبوب کی بہار میں صرف ہو گئی۔ ایک طرف بلبل ہے، جس کے ماہ و سال رنگِ باغ میں ادل بدل پر موقوف ہیں، یعنی چمن میں کبھی بہار آتی ہے، کبھی خزاں ہوتی ہے۔ بہار و خزاں کے اجتماع ہی سے بلبل کے ماہ و سال بنتے ہیں۔ میرے لیے ہر وقت حسنِ یار کی بہار ہے اور میں اس کی خاطر سب کچھ قربان کیے بیٹھا ہوں۔

۱۔ **لت** : جاتا ہوں جدھر سب کی اٹھے ہے اُدھر انگشت
یک دست جہاں مجھ سے پھرا ہے، مگر انگشت

یک دست : یک قلم، سارے کا

رئیس مزاج پرسی کے لیے گئے ۔ پوچھا : کیا حال ہے ؟ مرزا نے یہ شعر پڑھا :

ہم غمزدہ جس دن سے گرفتارِ بلا ہیں !
کپڑوں میں جوئیں بخیوں کے ٹانکوں سے سوا ہیں

جس دن جیل سے نکلنے لگے اور لباس تبدیل کرنے کا موقع آیا تو وہاں کا کرتا وہیں پھاڑ کر پھینک دیا اور یہ شعر پڑھا : ہائے اس . . . . الخ

یہ واقعہ صحیح نہیں ، کیونکہ قید میں مرزا غالب صرف نظر بند تھے اور مشقت روپے دے کر معاف کر دی گئی تھی ۔ انھیں کھانا گھر سے پہنچتا تھا ور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ تیسرے روز ملاقات کے لیے جایا کرتے تھے ۔ مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے یہ قصہ نقل کرتے وقت اتنا بھی خیال نہ کیا کہ اگر مرزا غالب کو عام قیدیوں کا سا لباس ملتا تو انھیں یہ لباس پھاڑ پھینکنے کی اجازت کیونکر ہوتی ؟ ہمارے زمانے تک یہی دستور رہا کہ قیدی میعادِ قید گزارنے کے بعد جیل کا لباس اتار دیتے تھے ، پھاڑ کر نہیں پھینک سکتے تھے ۔ البتہ لمبی قید میں کسی قیدی کے لباس کا پھٹ جانا ممکن تھا ۔ بہرحال جوؤں والا شعر غالب کا نہیں بھی تو اس کا موقع اور محل ان کی قید نہیں ، بالکل یہی کیفیت دوسرے شعر کی ہے ۔

○

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادہ ، اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

۱ - **لغات** - رستخیز اندازہ : جو اندازے میں قیامت کے برابر ہو ۔ قیامت جیسا ۔ قیامت جتنا ۔

محیط : ہر چیز کو گھیرے میں لے لینے والا ۔ ہر چیز پر حاوی ۔

شرح : رات ساقی کے شوق میں خمار یعنی نشے کے ، تار کی کیفیت ایسی

سارا۔

ہر غنچۂ گُل، صورتِ یک قطرۂ خوں ہے
دیکھا ہے کسی کا جو حنا بستہ سرِ انگشت

خوں دل میں مرے جو نہیں باقی تو عجب کیا
جوں ماہیِ بے آب تڑپتی ہے ہر انگشت۔

شوخی تری کہ دیتی ہے احوال ہمارا
رازِ دل صد پارہ کی ہے پردہ درِ انگشت

ہیں اُلفتِ مژگاں میں جو انگشت نما ہوں
لگتی ہے مجھے تیر کی مانند ہر انگشت

۱- **شرح** : میں جدھر بھی جاتا ہوں ادھر ہی لوگوں کی انگلیاں اٹھتی ہیں، سارا جہان مجھ سے پھر گیا ہے، مگر انگلی نہیں پھری۔

دست اور انگلی کی مناسبت محتاجِ تشریح نہیں۔

شاعر کا مطلب یہ ہے کہ لوگ میری طرف انگلیاں اٹھاتے ہیں۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ سب مجھ سے برگشتہ ہوئے، البتہ انگلی برگشتہ نہیں ہوئی، وہ برابر میری ہی طرف اٹھتی رہتی ہے۔

۲- **شرح** : جب سے محبوب کے حنائی ہاتھ کی پور دیکھ لی ہے، ہر کلی لہو کے ایک قطرے کی صورت میں نظر آ رہی ہے

۳- **شرح** : میرے دل میں خون بالکل باقی نہیں رہا۔ وہ پورے کا پورا محبوب کے ہاتھ رنگین رکھنے میں صرف ہو گیا۔ اب اس کی انگلیاں اسی طرح تڑپ رہی ہیں، جس طرح مچھلی پانی سے باہر نکال لینے پر تڑپتی ہے۔

مطلب یہ کہ میرا خونِ دل محبوب کی انگلیوں کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے، جو پانی کو مچھلی کے تعلق میں حاصل ہے۔

۴- **شرح** : تیری شوخی ہمارا پورا حال کھول کر رکھ دیتی ہے۔ دل سو ٹکڑے ہو چکا ہے، اس کے راز کا پردہ انگلی چاک کر دیتی ہے۔

مقصود یہ ہے کہ تو ہماری طرف انگلی اٹھاتا ہے اور شوخی سے کام لیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم بیتاب و بیخود ہو جاتے ہیں اور ہمارے عشق کا بھید کھل جاتا ہے۔

۵۔ لغات : انگشت نما : جس کی طرف انگلیاں اُٹھیں۔

شرح : میں مژگاں کی محبت کا شکار ہوں اور لوگ میری طرف انگلیاں اٹھاتے ہیں، ہر انگلی مجھے تیر کی طرح لگتی ہے۔

مژگاں کو تیر سے بھی تشبیہ دیتے ہیں۔

ہے سوا نیزے پہ اس کے قامتِ نوخیز سے
آفتابِ صبحِ محشر ہے گُلِ دستارِ دوست

اے عدوئے مصلحت چندے بہ ضبط افسردہ رہ
کردنی ہے جمع تابِ شوخیِ دیدارِ دوست

لغزشِ مستانہ و جوشِ تماشا ہے اسدؔ
آتشِ مے سے بہارِ گرمیِ بازارِ دوست

۱۔ شرح : محبوب ابھی جوان ہوا ہے اور اس کے قد نے ابھی بلندی کی شان پیدا کی ہے۔ سر پر دستار باندھ رکھی ہے اور دستار پر پھول لگا ہُوا ہے۔ شاعر کہتا ہے، یہ محبوب کے قامتِ نوخیز پر گلِ دستار ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے صبحِ قیامت کا آفتاب سوا نیزے پر آگیا ہے۔

۲۔ شرح : اے مصلحت کے دشمن! جلدی نہ کر۔ اپنے آپ پر ضبط قائم رکھ اور افسردہ و پژمردہ پڑا رہ۔ تُو ابھی دوست کی شوخیِ دیدار کے قابل نہیں ہوا۔ اس غرض سے رفتہ رفتہ طاقت و توانائی فراہم کر لینا ضروری ہے۔

۳۔ شرح : اے اسدؔ! دوست کے حسن کی گرم بازاری پہلے ہی کچھ کم نہ تھی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی بہار فروغ پر ہے۔ پھر اس نے شراب پی لی۔ اس آگ بازاری کو تیز تر کر دیا۔ اب یہ صورت ہے کہ وہ قدم قدم پر لڑکھڑا رہا ہے اور ہر طرف

ے نظارے کا جوش کھولاؤ کے درجے پر پہنچا ہوا ہے۔

دو عالم کی ہستی پہ خطِ وفا کھینچ
دل و دستِ اربابِ ہمّت، سلامت

نہ اوروں کی سُنتا، نہ کہتا ہوں اپنی
سرِ خستہ و شورِ وحشت، سلامت

وفورِ بلا ہے، ہجومِ وفا ہے
سلامت، ملامت، ملامت، سلامت

نہ فکرِ سلامت، نہ بیمِ ملامت
زخود رفتگی ہائے حیرت سلامت

رہے غالبِ خستہ مغلوبِ گردوں
یہ کیا بے نیازی ہے حضرت سلامت

۱- شرح : اربابِ ہمت کے ہاتھ اور دل سلامت رہیں۔ پھر دونوں جہانوں کے وجود پر وفا کا خط کھینچ دینا چاہیئے۔ یعنی جب تک دونوں جہاں سلامت ہیں، ہمّت والے بزرگ دلوں اور ہاتھوں سے سب کچھ لٹاتے رہیں گے۔ نہ اُن کے ہاتھ رُکیں گے، نہ ان کے دلوں میں تنگی پیدا ہوگی۔

۲- شرح : نہ میں دوسروں کی سنتا ہوں، نہ اپنی کہتا ہوں۔ خدا کرے، میرا زخمی سر اور دیوانگی کا شور سلامت رہے۔

مطلب یہ کہ سر کی خستگی کے باعث اپنی کہہ نہیں سکتا، اور دیوانگی کے شور کی بنا پر دوسروں کی سُن نہیں سکتا۔

۳- شرح : وفا بدرجۂ کمال موجود ہے اور بلاؤں کا ہجوم ہے۔ ایسی حالت میں سلامتی کو ملامت سمجھنا چاہیے۔ یعنی سلامتی نصیب نہیں ہو سکتی اور ملامت بدستور قائم رہے گی۔

۴۔ شرح : نہ سلامتی کی فکر ہے، نہ ملامت کا ڈر ہے۔ ہم حیرت میں اپنا آپ کھو چکے ہیں اور وہی سلامت یعنی قائم چلی جا رہی ہے۔

۵۔ شرح : غالبِ خستہ آسمان کے ہاتھوں جبر و ظلم کا شکار بنا رہے۔ اے حضرت سلامت! اے باری تعالیٰ! یہ آپ کی عجیب بے نیازی ہے۔

آہنگِ اسدؔ میں نہیں جز نغمۂ بیدل
"عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ"

شرح : اسدؔ کی لے میں بیدلؔ کے نغمے کے سوا کچھ نہیں سار ی دنیا ہمارا افسانہ لیے بیٹھی ہے اور ہم کچھ بھی نہیں۔

آخری مصرع بیدلؔ کا ہے، جسے میرزا نے مقطع میں تضمین کر دیا ہے۔ یہ بھی اسی دور کی غزل ہے، جب میرزا پر بیدلؔ کا بہت زیادہ اثر تھا۔

تھی نگہ میری نہاں خانۂ دل کی نقّاب
بے خطر جیتے ہیں اربابِ ریا میرے بعد

تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ
متفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد

۱۔ لغات : نقّاب : نقب لگانے والا۔

شرح : میری نگاہ دل کے نہاں خانے میں نقب لگاتی تھی اور جو باتیں انسان دُنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھتا ہے، اُنھیں بھی معلوم کر لیتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میرے ہوتے ہوئے ریاکاروں کے لیے اپنا پردہ قائم رکھنا بالکل ممکن نہ تھا۔ میں مر گیا اور دل کے بھید معلوم کرنے والا کوئی نہ رہا۔ اب ریاکار لوگ بے خوف زندگی بسر کر رہے ہیں۔

بالکل یہی مضمون میرزا نے اپنے ایک مشہور فارسی قصیدے میں بھی پیش کیا ہے :

نکہتِ نقب پر گلشنِ زدہ ہامی زد   مژدہ باد اہل ریا را کہ زمیدان رفتم

۲۔ **شرح** : میں گھاس کا وہ تنکا تھا، جس سے گلدستۂ احباب بندھا ہوا تھا، میں مر گیا تو میرے تمام رفیق اور دوست بکھر گئے۔

پھولوں کو اکٹھا کر کے گھاس کے تنکے باندھ کر گلدستہ بنا لیتے ہیں۔ میرزا کہتے ہیں کہ میں اپنے احباب کے گلدستے کے لیے گھاس بن گیا تھا۔ جس سے وہ بندھے ہوئے تھے۔ میں نہ رہا، گلدستہ کھل گیا اور رفیق اُسی طرح الگ الگ ہو گئے، جس طرح گلدستے کی بندش کھل جانے سے پھول الگ الگ ہو جاتے ہیں۔

ہاتھ آیا زخمِ تیغِ یار سا پہلو نشیں
کیوں نہ ہووے آج کے دن بیکسی کی روح شاد
ہم نے سوزِ زخمِ جگر پر بھی زباں پیدا نہ کی
گُل ہُوا ہے ایک زخمِ سینہ پر خواہانِ داد
تیغ در کف، کف بہ لب، آتا ہے قاتل اس طرف
مژدہ باد! اے آرزوئے مرگِ غالبؔ مژدہ باد

۱۔ **شرح** : آج کے دن بیکسی کی روح کیوں نہ شاد ہو؟ اُسے تیغِ یار کا زخم ہاتھ آگیا، جو پہلو میں آ بیٹھا۔ مطلب یہ ہم بیکس تھے کوئی ہمارا رفیق اور ساتھی نہ تھا۔ آخر زخمِ تیغِ یار پہلو میں آکر بیٹھ گیا۔ پھر بیکسی کی روح کیوں خوش نہ ہو؟

۲۔ **شرح** : ہم نے جگر پر سیکڑوں زخم کھائے، پھر بھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے۔ پھول کو دیکھو، ایک زخم سینے پر لگا اور داد خواہ ہو گیا۔

۳۔ **شرح** : آج قاتل تلوار ہاتھ میں لیے آرہا ہے اور غصے سے لبوں پر جھاگ آیا ہوا ہے۔ خوشخبری ہو، اے غالبؔ کی آرزوئے موت! تجھے خوشخبری ہو!

بزم، داغِ طرب و باغ، کشادِ پرِ رنگ
شمع و گل تا کے و پروانہ و بلبل، تا چند

نالہ، دامِ ہوس و دردِ اسیری معلوم
شرحِ برخود غلطیہاے تحمل، تا چند

اسدِ خستہ گرفتارِ دو عالم اوہام
مشکل آساں کن یک خلق تغافل، تا چند

۱- شرح : محفل شادمانی کا داغ ہے اور باغ میں رنگ کے بال و پر کھلے رہے ہیں۔ یعنی بزم، جو شادمانی کے لیے قائم ہوئی تھی، ختم ہو گئی اور شادمانی کا داغ باقی رہ گیا، کیونکہ آرزو کے مطابق شادمانی کی بزم قائم نہ رہ سکی۔ باغ گوناگوں رنگوں سے پُر رونق تھا۔ اب سب رنگ اُڑے جا رہے ہیں۔ شمع اور پھول، پروانہ اور بلبل کب تک رہ سکتے ہیں؟ بزم کی برہمی کے ساتھ شمع گئی اور پروانے بھی چلتے بنے۔ باغ کی رونق رخصت اور پھول بھی نہ رہے، ساتھ ہی بلبلوں نے رختِ سفر باندھ لیا۔

۲- لغات : برخود غلطیہا : اپنے متعلق غلط اندازے کرنا، بے وجہ شیخیاں مارنا۔

تحمل : برداشت، ضبط۔

شرح : آہ و فریاد ایک جال ہے، جو ہوس نے تیار کیا۔ قید میں جو دکھ اور رنج پہنچتے ہیں، ان کے بارے میں کیا کہا جائے؟ میں تو یہ کہتا ہوں کہ کب تک ضبط و برداشت کے جھوٹے دعووں کی شرح کرتے رہیں؟

مطلب یہ کہ قید کا دکھ اور غم ناقابلِ برداشت ہے۔ اگر کوئی شخص برداشت کرے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے دعوے غلط ہیں اور آہ و فریاد کرنا حقیقۃً درد کا اظہار نہیں، بلکہ یہ ہوس کا ایک جال ہے۔

۳- شرح : خستہ حال غریب و دردمند اسد دو جہانوں کے وہموں میں

الجھا ہُوا ہے۔ اے وہ پاک ذات، جو مخلوق کی مشکلیں آساں کر رہی ہے اس عاجز سے کب تک تغافل برتا جائے گا؟

کمالِ بندگیِ گل ہے رہنِ آزادی
زدستِ مشتِ پر و خارِ آشیاں، فریاد
نوازشِ نفسِ آشنا کہاں، ورنہ
بہ رنگِ نَے ہے نہاں، در ہر استخواں فریاد
تغافل آئنہ دارِ خموشیِ دل ہے
ہوئی ہے محو بہ تقریبِ امتحاں فریاد
ہزار آفت و یک جانِ بے نوائے اسد
خُدا کے واسطے اے شاہِ بے کساں فریاد

۱۔ شرح : پھول کے عشق میں عجز و نیاز کو کمال پر پہنچانا اس امر پر موقوف ہے کہ تمام دوسرے تعلقات سے آزادی حاصل کر لی جائے۔ آہ! پروں کی ایک مٹھی اور چند تنکے جنھیں آشیاں کہا جاتا ہے، ان کے بارے میں فریاد و فغاں کرنی چاہیے۔

مطلب یہ کہ اگر بلبل پھول کی بندگی کو کمال پر پہنچانا چاہتی ہے تو لازم ہے کہ آشیانے سے کوئی تعلق نہ رکھے۔ یہی آشیانے کا تعلق پھول سے عشق کا حق ادا کرنے میں حائل ہو رہا ہے، لہٰذا اس کے خلاف فریاد کرنی چاہیے۔

میرزا نے چند لفظوں میں ایک بہت بڑا مضمون پیش کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان خدا کی بندگی کا مدعی ہے تو اسے ماسوا کی کسی چیز سے کسی بھی نوع کا سروکار نہ ہونا چاہیے۔ اگر ماسوا میں الجھا رہے گا تو ظاہر ہے کہ خدا کی بندگی کا حق ادا نہ کر سکے گا۔

۲۔ لغات : نوازش : بجانا۔

شرح : افسوس! مجھے کوئی ایسا سانس نہ ملا، جو آشنا کی حیثیت میں

بجانے پر آمادہ ہو، ورنہ نے کی طرح میری ہڈی ہڈی میں فریاد بھری ہوئی ہے۔

نَے کو سانس کے زور سے بجایا جاتا ہے۔ ہڈیاں اندر سے خالی ہوتی ہیں، اس لیے وہ نَے سے مشابہ ہیں۔ اگر انہیں بھی کوئی نَے نواز یعنی حقیقت شناس بجانے کے لیے سانس سے کام لے تو ہر ہڈی سے فریاد کے نوحے نکلنے لگیں۔

۳- شرح : محبوب کے تغافل نے میرے دل کو خاموشی کا آئینہ دار بنا دیا ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ میرا امتحان ہو رہا ہے اور اس سلسلے میں فریاد بھی تھوڑی دیر کے لیے رُک گئی ہے۔

۴- شرح : ہزاروں آفتیں ہیں اور ایک بے نوا اسدؔ کی جان ہے۔ اے بیکسوں کے بادشاہ! خدا کے لیے میری فریاد کو پہنچیے۔

ظلم کرنا گدائے عاشق پر
نہیں شاہانِ حسن کا دستور

دوستو! مجھ ستم رسیدہ پر
دشمنی ہے وصال کا مذکور

زندگانی پر اعتمادِ غلط
ہے کہاں قیصر اور کہاں فغفور

کیجیے جوں اشک اور قطرہ زنی
اے اسدؔ ہے ہنوز دِلّی دُور

۱- شرح : جو عاشق فقیر بن چکا ہو، اس پر ظلم و ستم کرنا حسن کے بادشاہوں کا دستور نہیں۔

۲- شرح : اے دوستو! میں ستم کا مارا ہوا ہوں۔ مجھ سے وصال کا ذکر سراسر دشمنی ہے۔

۳- شرح : زندگی پر بھروسا کرنا بالکل غلط ہے۔ بھلا بتاؤ، قیصر اور فغفور، جو جلیل القدر بادشاہ تھے، آج کہاں ہیں؟

۴۔ شرح : اے اسدؔ! آنسو کی طرح آپ بھی قطرہ زنی کرتے جایئے یعنی ابھی آپ کو بہت مشقت کاٹنی ہے اور دلّی جو آپ کی منزلِ مقصود ہے۔ قریب نہیں آئی۔ بہت دور ہے۔

ہر گردِ باد، حلقۂ فتراکِ بے خودی
مجنونِ دشتِ عشق تحیّر شکار تر

اے چرخ! خاک بر سرِ تعمیرِ کائنات
لیکن بنائے عہدِ وفا استوار تر

آئینہ داغِ حیرت و حیرت شکستِ یاس
سیماب بیقرار و اسدؔ بے قرار تر

۱۔ شرح : جو بگولا اٹھتا ہے وہ بیخودی کے شکار بند کا ایک حلقہ ہے۔ عشق کے صحرا کا مجنوں پہلے سے زیادہ تحیّر کا شکار ہو گیا ہے۔

مطلب یہ کہ ہر بگولا بیخودی کو بڑھا رہا ہے اور مجنوں کی وحشت بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

۲۔ شرح : اے آسمان! کائنات کی بناوٹ کے سر پر خاک ڈال یعنی کائنات کا انجام خواہ کچھ بھی ہو، ہرگز پروا نہیں، لیکن وفاداری کی بنیاد زیادہ پختہ چاہیے۔

۳۔ شرح : آئینہ حیرت کا داغ ہے اور حیرت ناامیدی کا شکنجہ ہے۔ پارا بیتاب ہے اور اسدؔ پارے سے بدرجہا بڑھ کر بیتاب ہے۔

فریبِ صنعتِ ایجاد کا تماشا دیکھ
نگاہ عکس فروش و خیال آئنہ ساز

۱۔ شرح : نئی چیزیں پیدا کرنے کی صنعت کا فریب قابلِ ملاحظہ ہے۔ دیکھیے

زبسکہ جلوۂ صیاد حیرت آرا ہے
اُڑی ہے صفحۂ خاطر سے صورتِ پرواز

ہجومِ فکر سے دلِ مثلِ موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

ہماری نظر عکس پہنچتی ہے اور خیال آئینہ سازی کرتا ہے۔

شعر میں ایک خوبی یہ ہے کہ آنکھ کے بلّور میں پردے پر جس شے کا عکس پڑتا ہے، وہی دل تک پہنچتا ہے اور انسان ایک لمحے سے بھی کم وقت میں جان لیتا ہے کہ وہ کیا چیز دیکھ رہا ہے۔ یہ قدرت نے چیزیں بنانے کا ایک کارخانہ قائم کر رکھا ہے۔ میرزا کہتے ہیں کہ یہ صنعت بھی ایک دھوکا ہے، لیکن دیکھنے کے لائق ہے۔

۲- شرح : صیاد کا جلوہ دیکھتے ہی ایسی حیرت طاری ہوئی کہ دل میں اُڑنے کی صورت ہی باقی نہ رہی۔

۳- شرح : افکار کی کثرت سے دل موج کی طرح لرز اُٹھا ہے یہ شیشہ بہت نازک ہے اور اس میں شراب ایسی پڑ گئی ہے، جو شیشے کو گلا دینے والی ہے۔
ہجومِ فکر کو شیشہ پگھلا دینے والی شراب اور دل کو نازک شیشہ قرار دیا۔

صد تجلّی کدہ ہے حرفِ جبینِ غربت
پیرہن میں ہے غبارِ شررِ طُور ہنوز

پا پُر از آبلہ راہِ طلبِ مے میں ہوا
ہاتھ آیا نہیں یک دانۂ انگور ہنوز

گل کھلے، غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی
سرخوشِ خواب ہے وہ نرگسِ مخمور ہنوز

۱- شرح : میں غریب الوطن ہوں، لیکن میری پیشانی میں سیکڑوں تجلّی کدے جمع ہو گئے ہیں۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ میرے لباس میں کوہِ طور کی چنگاری کا غبار ابھی باقی ہے۔

ہو گئی تھی، گویا قیامت آ گئی۔ شراب جہاں جہاں اور جس جس ظرف میں تھی، انگڑائی کا تصویر خانہ بن گئی تھی یعنی ساقی موجود نہ تھا۔ میکشوں کا مجمع نشے کے آثار کی بے مزگی اور بے لطفی کا باعث سراسیمگی و پریشانی کی ایسی حالت میں تھا، جیسی قیامت کو رونما ہوگی۔ تمام میکش لمبی لمبی انگڑائیاں لے رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہر شراب خانہ اور اس

مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے
خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا

پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حُسن
دست مرہونِ حنا، رخسار رہنِ غازہ تھا

نالۂ دل نے دیے اوراقِ لختِ دل بہ باد
یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

کا ہر ظرفِ شراب... ساغر، مینا، سبو، خُم، حوض وغیرہ سراپا انگڑائیوں کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے۔ میکشوں کو انگڑائیاں اس وقت آتی ہیں، جب نشہ اُتر رہا ہو اور شراب کی طلب انھیں پریشان کرے۔ شراب صرف ساقی پلا سکتا ہے، جس کا انتظار ہو رہا ہے۔ اسی لیے ہر شراب خانہ اور اس کی ہر شے خمیازے کی صورت اختیار کر گئی۔ شاعر نے شعر میں صرف یہ بتایا ہے کہ پینے والے خمار میں مبتلا ہیں، ساقی موجود نہیں، اس کا انتظار ہو رہا ہے۔

۲۔ **شرح** :۔ ہم نے وحشت کی پگڈنڈی پر ایک ہی قدم اٹھایا تھا، یعنی، ہم پر وحشت کی بالکل ابتدائی حالت طاری ہوئی تھی۔ ساتھ ہی اس کائنات کی کتاب کا درس ہم پر واضح ہو گیا۔ یعنی ہم نے سمجھ لیا کہ اس کتاب میں کیا کچھ لکھا ہے اور جو کچھ سمجھا، اس کی حقیقت یہ ہے کہ وحشت یعنی شوق و شیفتگی کی انتہائی حالت دونوں جہانوں کے اجزا کا شیرازہ ہے۔

مطلب یہ کہ اگر دونوں جہانوں کے اجزا کو کتاب کے اوراق فرض کیا جائے۔ تو ان اوراق کا بندھن اور انھیں اکٹھا رکھنے والا رشتہ وہ پگڈنڈی، وہ راستہ ہے، جس پر جنونِ عشق میں قدم رکھا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جنونِ عشق ہی اس

اے اسدؔ! تیرگیِ بختِ سیہ ظاہر ہے
نظر آتی نہیں صبحِ شبِ دیجور ہنوز

۲- شرح
میں نے شراب کی طلب کے رستے میں جو بھاگ دوڑ کی، اس کے باعث پاؤں چھالوں سے بھر گئے۔ شراب تو کیا تھی۔ ابھی تک "انگور" کا ایک دانہ بھی ہاتھ نہیں آیا

"پا" کے ساتھ "آبلہ"۔ "آبلے" کے ساتھ انگور کی مناسبت ظاہر ہے اور یہ سب کچھ شراب کے لیے تگ و دو میں پیش آیا۔

۳- شرح : پھول کھل گئے کلیاں چٹکنے لگیں، صبح ہو گئی، لیکن میرے محبوب کی مدھ بھری آنکھیں ابھی تک نیند میں مست ہیں۔

۴- شرح : اے اسدؔ! بختِ سیاہ کی تاریکی بالکل ظاہر ہے۔ ہمیں تو اندھیری رات کی صبح ابھی تک نظر نہیں آتی۔

کون آیا؟ جو چمن بے تابِ استقبال ہے
جنبشِ موجِ صبا ہے شوخیِ رفتارِ باغ

آتشِ رنگِ رخِ ہر گل کو بخشے ہے فروغ
ہے دمِ سردِ صبا سے گرمیِ بازارِ باغ

کون گل سے ضعف و خاموشیِ بلبل کہہ سکے
نے زبانِ غنچہ گویا، نے زبانِ خارِ باغ

۱- شرح : کون آ رہا ہے، جس کے لیے باغ پیشوائی کے استقبال میں بیتاب ہو گیا ہے۔ یہ صبا لہریں نہیں لے رہی، بلکہ باغ اسی شوخی سے رقص دکھا رہا ہے۔

۲- شرح : صبا کے ٹھنڈے سانس سے ہر پھول کے رنگ رخ کی آگ بھڑک رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ باغ کی گرمیِ بازار صبا ہی کے دمِ سرد کی برکت ہے۔

۳- شرح : بلبل کے ضعف اور خاموشی کو کون پھول تک پہنچا سکے ؟ نہ نغمے کی زبان بولتی ہے ، نہ باغ کے کانٹے کی زبان میں قوتِ گویائی ہے۔

تھی میرے ہی جلانے کو اے آہِ شعلہ ریز!
گھر پر پڑا نہ غیر کے کوئی شرار ، حیف

گل چہرہ ہے کسی خفقانی مزاج کا
گھبرا رہی ہے بیمِ خزاں سے بہار ، حیف

ہیں میری مشتِ خاک سے اس کو کدورتیں
پائی جگہ بھی دل میں تو ہو کر غبار ، حیف

بنتا ، اسدؔ ! میں سرمۂ چشمِ رکابِ یار
آیا نہ میری خاک پہ وہ شہسوار ، حیف

۱- شرح : اے چنگاریاں برسانے والی آہ ! کیا تو میرا ہی گھر جلانے کیلئے تھی ! افسوس کہ تیری کوئی چنگاری غیر یعنی رقیب کے گھر پر نہ پڑی۔

۲- شرح : پھول کسی ایسے شخص کا چہرہ معلوم ہوتا ہے ، جس کے مزاج پر خفقان غالب ہو۔ آہ ! بہار خزاں کے خوف سے گھبرا رہی ہے۔ خفقانی کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ ہر شے سے ڈرتا اور گھبراتا ہے۔ یہی کیفیت پھول پر طاری ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکالا کہ بہار خزاں کے خوف سے ڈر رہی ہے۔

۳- شرح : میری مشتِ خاک یعنی میری ذات سے محبوب مکدر ہے۔ افسوس ! مجھے اس کے دل میں جگہ بھی ملی تو غبار بن کر ملی۔

۴- شرح : اے اسدؔ ! میں محبوب کی رکاب کی آنکھ میں سرمہ بن جاتا۔ افسوس کہ وہ شہسوار میری خاک پر نہ آیا !

" خاک " سے جسم بھی مراد لی جا سکتی ہے اور قبر بھی۔

تا قیامت شبِ فرقت میں گزر جائے گی عمر
سات دن ہم پہ بھی بھاری ہیں سحر ہونے تک

شرح : قیامت تک ہماری عمر جدائی کی رات ہی میں بیت جائے گی۔ ہم پر صرف سات دن بھاری ہیں، پھر صبح ہو جائے گی۔
سات دن سے بظاہر مراد ایک ہفتہ ہے اور زندگی کا دور ہفتوں میں ہی پورا ہو جاتا ہے

آئے ہیں پارہ ہائے جگر درمیانِ اشک
لایا ہے لعلِ بیش بہا کاروانِ اشک

رونے نے طاقت اتنی نہ چھوڑی کہ ایک بار
مژگاں کو دوں فشار، پئے امتحانِ اشک

۱۔ شرح : آنسوؤں کے ساتھ جگر کے ٹکڑے بھی آ گئے ہیں۔ کہنا چاہیے کہ آنسوؤں کا قافلہ بیش قیمت لعل لے کر آیا ہے۔
شعر میں جگر کے ٹکڑوں کو بیش بہا لعلوں سے تشبیہ دی ہے۔

۲۔ شرح : میں روتے روتے اس قدر کمزور و ناتواں ہو گیا ہوں کہ اتنی طاقت بھی نہیں رہی، آنسوؤں کی جانچ پڑتال کے لیے پلکیں ایک مرتبہ جھپکا لوں۔
مطلب یہ کہ جھپکا کر دیکھ لوں، آنسو آتے ہیں یا نہیں؟

اے آرزو شہیدِ وفا! خوں بہا نہ مانگ
جز بہرِ دست و بازوئے قاتل دعا نہ مانگ

برہم ہے بزمِ غنچہ، بہ یک جنبشِ نشاط
کاشانہ بسکہ تنگ ہے، غافل! ہوا نہ مانگ

میں دور گردِ عرضِ رسومِ نیاز ہوں
دشمن سمجھ، و لے نگہِ آشنا نہ مانگ

۱۔ شرح : اے آرزو! تجھے وفا کی شہادت نصیب ہوئی ہے، اس لیے خون کی قیمت نہ مانگنا چاہیے تیرا کام صرف

یہ ہے، قاتل کے ہاتھوں اور بازوؤں کے لیے دعا مانگ کہ وہ سلامت رہیں اور مجھے سو مرتبہ قتل کریں۔

۲۔ **شرح :** کلی کی محفل خوشی کی ایک ہی جنبش سے درہم برہم ہو جاتی ہے۔ یہ گھر بہت تنگ ہے۔ اے غافل! اس کے لیے ہوا کی طلب نہ کر۔

کلی خوشی میں اگر کھلتی ہے اور اس کی پنکھڑیاں تھوڑی سی ہی دیر میں درہم برہم ہو جاتی ہیں۔ وہ ہوا کی آرزومند ہوئی اور اپنی ہستی ختم کر بیٹھی۔ اے غافل! تو اس سے سبق لے، تیرا گھر نہایت تنگ ہے، اس لیے ہوا کا طلبگار نہ ہو اسکے آتے ہی تیرا گھر بھی سلامت نہ رہے گا۔

مژگاں تلک رسائیِ لختِ جگر کہاں
اے وائے گر نگاہ نہ ہو آشنائے گل

شرح : جگر کے ٹکڑے پلکوں تک نہیں پہنچ سکتے۔ جب یہ ممکن نہیں تو افسوس! اگر تیری نگاہ پھول کی آشنا نہ ہو۔

مطلب یہ کہ اگر تُو جگر کے ٹکڑوں کو مژگاں تک نہیں لا سکتا تو کم از کم پھول کی حقیقت سے تو آشنا ہو جا، جو کھلتے ہی سراپا خون بن جاتا ہے۔

بدر ہے آئینۂ طاقِ ہلال
غافلاں! نقصاں سے پیدا ہے کمال
نور سے تیرے ہے اس کی روشنی
ورنہ ہے خورشید یک دستِ سوال
شورِ حشر اس فتنہ قامت کے حضور
سایہ آسا ہو گیا ہے پائمال

۱۔ **شرح :** ہلال کا طاقچہ ماہِ کامل کا آئینہ ہے۔ یعنی ہلال ہر حال میں بدر بنے گا۔ غافلو! ہر نقصان میں کمال نمایاں ہے۔ ہلال یعنی نیا چاند نقصان

ہو جو بلبل پیروِ فکرِ اسد
غنچۂ منقارِ گل ہو زیرِ بال

کی علامت ہے، دہی ہلال بڑھتے بڑھتے اپنا نقصان پورا کر کے ماہِ کامل بن جاتا ہے، گویا نقصان ہی سے کمال پیدا کرتا ہے۔

۲۔ شرح : اے خدا! سورج کو روشنی صرف تیرے نور سے ملتی ہے۔ اگر یہ نور اس کے لیے ضیا بخش نہ ہو تو اس کی حیثیت ایک دستِ سوال کے سوا کیا ہے! یعنی ایک ہاتھ ہے، جو مانگنے کے لیے پھیلا ہوا ہے۔

۳۔ شرح : میرے محبوب کا قامت فتنے پیدا کرتا ہے۔ اس کے سامنے قیامت کا غوغا بھی سایے کی طرح پامال ہے۔

۴۔ شرح : اگر بلبل اسد کے حسنِ فکر کی پیروی کرے تو اس کی چونچ کی کلی پروں کے نیچے خود بخود پھول بن جائے۔

ہر عضو غم سے ہے شکن آسا شکستہ دل
جوں زلفِ یار ہوں میں سراپا شکستہ دل

شرح : میرا جوڑ جوڑ غم کے ہاتھوں شکن کی مانند دل شکستہ ہے۔ بس سر سے پاؤں تک زلفِ محبوب کی طرح ایک ٹوٹا ہوا دل ہوں۔

ہم غلط سمجھے تھے، لیکن زخمِ دل پر رحم کر
آخر اس پردے میں تو ہنستی تھی اے صبحِ وصال

شکوۂ دردو و درد داغ، اے بے وفا معذور رکھ
خوں بہائے یک جہاں اُمید ہے تیرا خیال

۱۔ شرح : اے صبحِ وصال! ہم اپنی غلط فہمی سے آگاہ ہو گئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ زخم کے پردے میں تو ہی ہنستی

حتی، اب اس پر رحم کر۔ مطلب یہ کہ صبحِ وصال اُسی کو نصیب ہوتی ہے، جس کا دل زخمی ہو۔

اُس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسدؔ
مالِ سنّی کو مباح اور خونِ صوفی کو حلال

۲۔ شرح : میرا شکوہ درد بنا، درد نے داغ کی صورت اختیار کر لی۔ اے بے وفا! مجھے معذور سمجھ۔ تیرا خیال امّید کی پوری دنیا کا خوں بہا ہے۔

۳۔ شرح : اے اسدؔ! میں اُس ستم پیشہ محبوب پہ عاشق ہوں، جس کے نزدیک سُنّی کا مال جائز اور صوفی کا خون حلال ہے۔

اس شعر سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ میرزا اپنے آپ کو سُنّی اور صوفی دونوں قرار دے رہے ہیں۔

گر کرے انجام کو آغاز ہی میں یاد، گُل
غنچے سے، منقارِ بلبل وار ہو، فریاد، گُل
سعیِ عاشق ہے فروغ افزائے آبِ روئے کار
ہے شرارِ تیشہ بہرِ تربتِ فرہاد، گُل

۱۔ شرح : اگر پھول آغاز ہی میں انجام کو یاد کرے تو کلی کی حالت میں ہی بلبل کی چونچ کی طرح سراپا فریاد ہی بن جائے۔

۲۔ شرح : عاشق کی سعی و کوشش ہی سے اس کے کام میں رونق اور زیب و زینت زیادہ ہوتی ہے۔ دیکھیے، فرہاد نے پتھر پہ تیشہ چلایا۔ اس سے جو شعلے نکلے، وہی اس عاشق کی قبر کے لیے پھول بن گئے۔

شوق بے پروا کے ہاتھوں مثلِ سازِ نادرست
کھینچتا ہے آج نالے خارج آہنگ، دل

شرح : دل شوق بے پروا میں مبتلا ہے اور جیسے

ہوئے ساز کی طرح بے سُرے نالے کھینچ رہا ہے۔

"شوقِ بے پروا" کا مطلب ہے وہ عشق، جو ہر شے سے بے پروا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسے بے سُری فریاد و فغاں میں کبھی کوئی باک نہیں۔ ایسی فریاد و فغاں کو بگڑے ہوئے ساز کی صدا قرار دینا بے حد موزوں ہے۔

بہ قدرِ حوصلۂ عشق جلوہ ریزی ہے
وگرنہ خانۂ آئینہ کی فضا، معلوم

۱۔ شرح: عشق کی ہمت کے مطابق انوار کی بارش ہوتی ہے، ورنہ آئینہ خانے کی فضا میں کیا رکھا ہے!

مراد یہ ہے کہ انسان عشق میں جو درجہ حاصل کرے، اسی کے مطابق دل میں روشنی پیدا ہوگی، ورنہ دل میں، بجائے خود کیا رکھا ہے!

فرطِ بے خوابی سے ہیں شبہائے ہجرِ یار میں
جوں زبانِ شمع، داغِ گرمیِ افسانہ، ہم
بسکہ وہ چشم و چراغِ محفلِ اغیار ہے
چپکے چپکے جلتے ہیں جوں شمعِ ماتم خانہ ہم

۱۔ شرح: محبوب سے جدائی کی راتوں میں ہم سو نہ سکے اور زبانِ شمع کی طرح گرمیِ افسانہ کا داغ بنے رہے۔

مطلب یہ کہ جدائی میں داستانِ درد سناتے رہے، جس طرح شمع جل جل کر سوز کی داستان سناتی ہے۔ آخر اس جلن کے باعث ہم نے داغ کی صورت اختیار کر لی۔

۲۔ شرح: ہمارا محبوب غیروں کی محفل کا چشم و چراغ بنا ہوا ہے اور ہم ماتم خانے کی شمع کی طرح چپکے چپکے جل رہے ہیں۔

نفس ہو نہ معزولِ شعلہ دَرودَن
کہ ضبطِ تپش سے شرر کار ہیں ہم
تماشائے گلشن، تمنائے چیدن
بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم
نہ ذوقِ گریباں نہ پروائے داماں
نگہ آشنائے گل و خار ہیں ہم
اسدؔ! شکوہ کفر و دعا ناسپاسی
ہجومِ تمنا سے ناچار ہیں ہم

۱- لغات :
شعلہ درودن : شعلہ کاٹنا، یعنی شعلہ حاصل کرنا۔

شرح : ہم دل کی تپش کو ضبط کر کے چنگاریاں بو رہے ہیں۔ اس سے شعلوں کی فصل تیار ہو رہی ہے ہمارے سانس کو چاہیے کہ شعلوں کی فصل کاٹنے سے باز نہ رہے اور بدستور یہ پیداوار جمع کرتا جائے۔

۲- شرح : ہم نے کائنات کا باغ دیکھا اور اس سے پھول چننے کی تمنا پیدا ہوئی۔ اے بہار پیدا کرنے والی ذات پاک! ہمیں اپنے گناہوں کا اقرار ہے۔
مطلب یہ کہ اس دُنیا کی کسی چیز سے ہمیں سروکار نہ ہونا چاہیے تھا اور لازم تھا کہ تیرے سوا کسی کی تمنا نہ رکھتے، لیکن تیری بہار آفرینی کی بدولت ہمیں مختلف چیزیں پیاری لگیں اور ان کی طرف مائل ہو گئے یہ گناہ تھا اور ہمیں اس کا اقرار ہے۔

۳- شرح : ہمیں نہ گریبان کا ذوق ہے اور نہ دامن کی پروا ہے۔ ہم پھول اور کانٹوں سے آشنا ہو چکے ہیں۔ یعنی پھول گریبان چاک کر لیتے ہیں کانٹے دامن اُلجھا لیتے ہیں۔ جب ہم نے ان چیزوں سے آشنائی پیدا کر لی تو گریبان و دامن کو بچائے رکھنے کی کیا صورت باقی رہی؟

۴- شرح : اے اسدؔ! شکایت کرنا کفر ہے اور دعا ناشکرگزاری کی دلیل

ہے۔ آہ! تمنائیں اتنی پیدا ہو گئیں کہ ہم بالکل بے بس رہ گئے۔

مطلب یہ کہ تمناؤں کی فراوانی نے ہم سے شکایت بھی کرائی اور دعا بھی۔ پہلے دعا کرتے رہے کہ یہ تمنا پوری ہو جائے، پوری نہ ہوئی تو شکایت شروع کر دی، حالانکہ دونوں چیزیں غلط تھیں دعا کا مطلب یہ تھا کہ جو کچھ اس نے دیا اس پر ہم نے قناعت نہ کی۔ اس طرح کفر کے مرتکب ہوئے۔ شکایت اس لیے کی کہ جو کچھ اس نے عطا کیا تھا، اسے کافی نہ سمجھا۔ یہ صریح ناشکر گزاری تھی۔ ہم ایسا نہ کرتے، اگر آرزوؤں کی فراوانی ہمیں بے بس نہ کر دیتی۔

صبر اور یہ ادا کہ دل آوے اسیرِ چاک
درد اور یہ کمیں کہ رہِ نالہ وا کروں

۱۔ شرح : دعویٰ صبر کا کر رہا ہوں اور حال یہ ہے کہ چاہتا ہوں، دل چاکِ گریبان میں قید ہو کر آئے۔ یعنی گریبان چاک کروں تو دل بھی ساتھ نکل آئے۔ درد ہو رہا ہے اور اس گھات میں بیٹھا ہوں کہ آہ و فریاد کا کوئی راستہ کھل جائے تاکہ دل کی بھڑاس نکل جائے۔

وہ التماسِ لذتِ بیداد ہوں کہ میں
تیغِ ستم کو پشتِ خمِ التجا کروں

وُہ بے دماغِ منتِ اقبال ہوں کہ میں
وحشت بہ داغِ سایۂ بالِ ہما کروں

۱۔ شرح : مجھے ظلم و جور کی لذت کا اتنا شوق ہے کہ اس کے لیے باقاعدہ التماس کرتا رہتا ہوں اور التماس بھی عام طریقے پر نہیں، بلکہ ظلم و جور کی تلوار کے خم کو اپنی پیٹھ کا خم بنا کر التجا کرتا ہوں۔

۲۔ شرح : اقبال کی احسان مندی سے میں اتنا گھبراتا ہوں اور پریشان ہوتا

ہوں کہ اگر ہُما کے پروں کا سایہ مجھ پر پڑ جائے تو اس کا داغ دیکھ کر دُور بھاگ جاؤں۔
ہُما کا سایہ بہت بابرکت مانا جاتا ہے اور اسے اقبال مندی کی دلیل سمجھا جاتا ہے، لیکن غالب اس سے اتنا گھبراتے ہیں کہ سایے کا داغ بھی کہیں دیکھ لیں تو دُور بھاگ جائیں۔

فلکِ سفلہ بے محابا ہے
اس ستم گر کو انفعال کہاں

بوسے میں وہ مضائقہ نہ کرے
پر مجھے طاقتِ سوال کہاں

۱۔ لغات : بے محابا : بے ترس۔

شرح : کمینہ آسمان بالکل بے ترس اور بے رحم ہے۔ اس ظالم کو اپنے کسی ظلم پر شرمندگی کہاں ہوگی؟

۲۔ شرح : میں سمجھتا ہوں کہ محبوب بوسہ دینے میں تامّل نہ کرے گا، لیکن مجھ میں ایسا سوال کرنے کی قوت ہی کہاں رہی ہے؟ ضعف کا یہ عالم ہے کہ کوئی سوال زبان پر آ ہی نہیں سکتا۔

آنسو کہوں، کہ آہ! سوارِ ہوا کہوں؟
ایسا عناں گسیختہ آیا کہ کیا کہوں؟

لغات : عناں گسیختہ : باگ ٹوٹ، بے پناہ تیز رفتار۔

شرح : محبوب اتنی تیز رفتاری سے آیا کہ سمجھ میں نہیں آتا، اس آمد کو کس چیز سے تشبیہ دوں؟ آنسو کہوں، جو بے اختیار آنکھوں سے ٹپک پڑتا ہے یا یہ کہوں کہ ہوا کے دوش پر سوار آیا۔

دنیا کی حقیقت ہے اور اسی کے ذریعے سے سب اجزا یکجا ہوتے ہیں۔

۳۔ **لغات۔ وحشت خرامی** : بیابانوں میں چکر لگانا۔

صحرا گرد : بیابان میں پھرنے والا۔

شرح : معلوم نہیں، لیلیٰ کو بیابان کا چکر لگانے سے کون سی چیز روک رہی تھی؟ غریب مجنوں کا گھر تو پورا بیابان تھا۔ وہ جنون کی حالت میں ہر جگہ دوڑا پھرتا تھا۔ اس کے گھر کا تو کوئی دروازہ نہ تھا، جو لیلیٰ کے لیے روک بن سکتا۔

۴۔ **لغات۔ استغنا** : بے نیازی۔ بے پروائی۔ سیر چشمی۔

مرہون : گرو

شرح : حُسن بے نیازی اور بے پروائی کا دم بھرتا ہے، لیکن دیکھیے یہ بے پروائی کس طرح رسوا ہوئی؟ حُسن کے ہاتھ مہندی سے رنگے ہوئے ہیں اور چہرے پر غازہ لگا ہوا ہے۔

مطلب یہ کہ جب ہاتھ مہندی کے احسان مند ہیں اور اس کے بغیر سرخ نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح رخسار گلگونے یا کریم اور پوڈر کے بغیر آب و تاب پیدا نہیں کر سکتے تو حسن کی بے نیازی کے لیے کون سی گنجائش باقی رہ گئی؟

مرزا کہنا یہ چاہتے ہیں کہ حقیقی حُسن کو بناؤ سنگار کی کوئی حاجت نہیں۔ اسے نہ ہاتھوں میں مہندی لگانی پڑتی ہے نہ چہرے پر اُبٹنا ملنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بناؤ سنگار وہیں کیا جاتا ہے، جہاں قدرتی حسن کی کمی محسوس ہو، حالانکہ مہندی اور غازے سے کام لے کر بننا اور سنورنا حسن کی بے نیازی کے لیے رسوائی کا باعث ہے۔ یورپ میں رسوائی عام ہے اور دوسرے مقامات پر بھی رسوائی میں کوئی کمی نہیں رہی۔

۵۔ **لغات۔ لختِ دل** : دل کے ٹکڑے

بباد دادن : اُڑانا۔ ہوا کے حوالے کر دینا۔ پریشان و برباد کر ڈالنا۔

شرح : دل سے جو نالے اٹھتے رہے، انھوں نے دل کے ٹکڑے اڑا

میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ
جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

شرح :
اے غالبؔ! میر تقی کے شعر و سخن کی کیفیت کیا بیان کروں؟ اس کا دیوان تو رونق، رعنائی اور بہار میں باغِ کشمیر سے کم نہیں۔ یعنی اس میں نہایت دلکش اور شگفتہ مضامین کی فراوانی ہے۔

کسی کو ز خود رستہ کم دیکھتے ہیں
کہ آہو کو پابندِ رم دیکھتے ہیں

شرح :
ہم نے کسی کو اپنے قابو سے باہر نکلا ہوا اور بیخود بہت کم دیکھا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہرن بیخود ہو کر بھاگتے ہیں ہم نے تو انھیں بھی دوڑ کے پابند دیکھا ہے یعنی انھیں بھی از خود رفتہ نہیں کہا جا سکتا۔

ناگوارا ہے ہمیں احسانِ صاحب دولتاں
ہے زرِ گُل بھی نظر میں جوہرِ فولادیاں

شرح :
ہمیں دولت مندوں کا احسان ہرگز گوارا نہیں اور کیوں گوارا ہو! ہم تو پھول کے زیرے کو بھی فولاد کے جوہر سمجھتے ہیں۔
پھول میں جو زیرہ ہوتا ہے، اسے زرِ گُل کہتے ہیں۔ وہ حقیقت میں زر نہیں ہوتا، لیکن میرزا کو دولتمندوں کے احسان سے اتنی وحشت ہے کہ زرِ گُل کو بھی، جو محض برائے نام زر ہے، فولاد کے جوہر کی طرح کاٹ ڈالنے والی چیز سمجھتے ہیں۔

ہے نزاکت بسکہ فصلِ گُل میں معمارِ چمن
قالبِ گُل میں ڈھلی ہے خشتِ دیوارِ چمن

۱۔ شرح :
بہار کا موسم آگیا، اب نزاکت باغ کی تعمیر میں

وقت ہے گر بلبلِ مسکیں زلیخائی کرے
یوسفِ گل جلوہ فرما ہے بہ بازارِ چمن

معروف ہے کیفیت یہ ہے کہ باغ کی دیوار کو جو اینٹیں لگی ہوئی ہیں وہ بھی پھول کے قالب میں ڈھالی گئی ہیں۔

مقصود یہ ہے، فصلِ بہار میں باغ اس درجہ تر و تازہ اور شاداب ہو گیا ہے کہ وہاں کی کوئی بھی چیز سخت نہیں رہی، بلکہ صد درجہ نرم، ملائم اور نازک بن گئی، یہاں تک کہ دیوارِ چمن میں بے شمار پھول اُگ آئے ہیں۔ دیکھیں تو کہ سکتے ہیں کہ پوری دیوار کی اینٹیں قالبِ گل میں ڈھلی ہیں۔

۲۔ شرح : وقت آگیا ہے کہ بلبلِ مسکین زلیخا کا منصب اختیار کرے، کیونکہ پھول کے یوسف نے باغ کے بازار میں جلوہ دکھانا شروع کر دیا ہے۔

کس دل پہ ہے عزمِ صفِ مژگانِ خود آرا
آئینے کی پایاب سے اتری ہیں سپاہیں

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں

۱۔ شرح : اے محبوب! تیری پلکوں کی صف اپنے آپ کو آراستہ کر کے نکلی ہے۔ ذرا بتا کہ اس صف نے کس کے دل کا قصد کیا ہے اور کس پر حملہ مقصود ہے؟ آئینہ سامنے رکھ کر تُو نے جو یہ فوج تیار کی ہے، گویا یہ آئینے کا دریا پیدل عبور کر کے آئی ہے۔ یہ کس پر یورش کرے گی؟

۲۔ شرح : بتخانہ اور کعبہ کیا ہیں؟ محبوبِ حقیقی کی آرزو دل میں تازہ کرنے کے آئینے ہیں۔ یعنی دونوں جگہ اُس محبوب کی آرزو دہرائی جا رہی ہے۔ ہم سے پوچھو تو کہیں کہ عشق چلتے چلتے تھک گیا تو اس نے کچھ دیر ستانے کی غرض سے پناہ گاہیں تراش لی ہیں۔

کی متصل ستارہ شناسی میں عمر صرف
تسبیح اشکہائے ز مژگاں چکیدہ ہوں

ظاہر ہیں میری شکل میں افسوس کے نشاں
ہوں شانہ پشتِ دست بہ دنداں گزیدہ ہوں

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

پیدا نہیں ہے اصلِ تگ و تازِ جستجو
مانندِ موجِ آب، زبان بریدہ ہوں

سر پر مرے وبالِ ہزار آرزو رہا
یارب! میں کس غریب کا بختِ رمیدہ ہوں

ہیں بے ہنر کہ جوہر آئینہ تھا عبث
پائے نگاہ خلق میں خارِ خلیدہ ہوں

میرا نیاز و عجز ہے مفتِ بتان، اسد
یعنی کہ بندۂ بہ درم ناخریدہ ہوں

۱- لغات: متصل: لگاتار، مسلسل۔

شرح: میں ان آنسوؤں کی تسبیح ہوں جو مژگاں سے ٹپکے۔ گویا میری ساری عمر مسلسل لمحے گننے میں بسر ہو گئی۔ آنکھوں سے مسلسل آنسو ٹپکنے کو اختر شماری قرار دیا۔

۲- شرح: میری شکل ہی سے افسوس کی علامتیں نمایاں ہیں۔ میری مثال کنگھی کی ہے جو پشت دست کو دانتوں سے چبائے ڈالتی ہے

۳- شرح: میں تصور ہی میں عیش و نشاط کے جوش سے نغمے گا رہا ہوں۔ سمجھ لینا چاہیے کہ میں اس باغ کی بلبل ہوں، جو ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔

۴- شرح: کچھ معلوم نہیں کہ میں جستجو میں جو دوڑ دھوپ کر رہا ہوں،

اس کا مقصد اور غرض و غایت کیا ہے ؟ میں پانی لہر کی طرح کٹی ہوئی زبان ہوں۔

"موجِ آب" کو "زبانِ بریدہ" کہا، جو نہایت موزوں تشبیہ ہے۔ ساتھ ہی یہ واضح ہو گیا کہ موجِ آب ہر وقت تگ و دَو میں لگی رہتی ہے، لیکن اس کی تگ و دَو کا مقصد واضح نہیں۔ چند لفظوں میں ایسے عجیب و غریب معانی اس خوبی و دلآویزی سے جمع کر دینا واقعی ادبی معجزہ ہے۔

۵۔ لغات : بختِ رمیدہ : بھاگا ہوا نصیبا، ناسازگار بخت، پھوٹی ہوئی قسمت۔

شرح : میری گردن پر ہزاروں آرزوؤں کا وبال موجود ہے، یعنی جتنی آرزوئیں کیں، ان میں سے کوئی بھی پوری نہ ہوئی اور ان کا وبال سر پر رہ گیا۔ اے خدا! میں کس غریب کی پھوٹی ہوئی قسمت ہوں؟

آرزو پوری ہو جائے تو وہ خوش نصیبی کی دلیل ہے، پوری نہ ہو تو اسے نصیبے کے سر پر وبال سمجھنا چاہیے۔

۶۔ لغات : خارِ خلیدہ : چبھا ہوا کانٹا، کھٹکتا ہوا کانٹا۔

شرح : آپ مجھے بے ہنر سمجھ لیں، لیکن میں آئینے کا جوہر تھا، یعنی فولادی آئینے کی ساری قدر و قیمت میری وجہ سے تھی۔ افسوس کہ کسی نے قدر و قیمت نہ پہچانی اور دنیا نے مجھے پائے نگاہ میں کھٹکتا ہوا کانٹا سمجھ لیا۔

کانٹے اور جوہر کی مناسبت محتاجِ تشریح نہیں۔

۷۔ لغات : مفتِ بُتاں : بتوں کے لیے بلاقیمت۔ کچھ خرچ کیے بغیر بتوں کے لیے حاضر۔

شرح : اے اسدؔ! میری نیازمندی اور عاجزی حسینوں کے لیے مفت حاضر ہے۔ انھیں کچھ خرچ نہ کرنا پڑے گا۔ گویا میں غلام ہوں، جو دام و درم دیے بغیر خرید لیا گیا۔

نہ انشا، معنی مضموں، نہ املا، صورتِ موزوں
عنایت نامہ ہائے اہلِ دنیا ہرزہ عنواں ہیں

لغات :
ہرزہ عنوان : جن کے پڑھنے بے معنی ہوں، یعنی ایسے خط، جن سے کسی کو کوئی فائدہ نہ پہنچے۔

شرح : اہلِ دنیا جو عنایت نامے لکھتے ہیں، وہ ایسے ہیں، جن سے کسی کو کوئی فائدہ نہ پہنچے کیونکہ نہ ان کی عبادت سے کوئی مضمون نکالا جا سکتا ہے اور نہ ان کی لکھائی کی صورت درست ہوتی ہے۔

جس خط کا املا نادرست اور عبارت بے معنی ہو، اس سے کسی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

اے نوا سازِ تماشا، سر بکف جلتا ہوں میں
اک طرف جلتا ہے دل اور اک طرف جلتا ہوں میں

شمع ہوں لیکن بہ پا در رفتہ خارِ جستجو
مدعا گم کردہ ہر سو، ہر طرف جلتا ہوں میں

ہے تماشا گاہِ سوزِ تازہ ہر یک عضوِ تن
جوں چراغانِ دوالی صف بہ صف جلتا ہوں میں

شمع ہوں تو بزم میں جا پاؤں، غالب کی طرح
بے محل، اے مجلس آرائے نجف، جلتا ہوں میں

۱- لغات :
نوا سازِ تماشا : نظارہ دیکھ کر خوشی سے گیت گانے والا، یعنی خوش ہونے والا۔

شرح : اے مجھے دیکھ کر خوش ہونے والے! میں سر ہتھیلی پر رکھ کر جل رہا ہوں۔ ایک طرف میرا دل جل رہا ہے اور ایک طرف میں خود آگ کی نذر ہو رہا ہوں۔

۲۔ شرح : میں شمع ہوں، لیکن ایسی شمع، جس کے پاؤں میں جستجو کا کانٹا چبھ گیا ہو۔ میرا اصل مقصد گم ہو گیا، اب ہر طرف جلتا پھرتا ہوں۔ اسی حال میں کانٹا چبھ گیا۔ جل جل کر مقصد کو تلاش کر رہا ہوں، وہ نہیں ملتا۔

۳۔ شرح : میرے جسم کا جوڑ جوڑ نئی جلن کی تماشا گاہ ہے۔ میری کیفیت دیوالی کے چراغوں کی ہے، جو قطاروں میں جلا کرتے ہیں۔

۴۔ شرح : اگر میں شمع ہوں تو مجھے غالبؔ کی طرح کسی محفل میں جگہ مل جانی چاہیے۔ اے نجفِ اشرف میں مجلس آراستہ کرنے والے بزرگ! اے حضرت علیؑ! اب تو میں بے موقع و بے محل جل رہا ہوں۔

طلسمِ مستیٔ دل آں سوے ہجومِ سرشک
ہم ایک میکدہ دریا کے پار رکھتے ہیں

ہُوا ہے گریۂ بے باک، ضبط سے تسبیح
ہزار دل پہ ہم اک اختیار رکھتے ہیں

بساطِ ہیچکسی میں برنگِ ریگِ رواں
ہزار دل بہ وداعِ قرار رکھتے ہیں

جنونِ فرقتِ یارانِ رفتہ ہے غالبؔ!
بسانِ دشت دلِ پُر غبار رکھتے ہیں

۱۔ شرح : آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے ہیں، لیکن دل کے مست ہونے کا موقع اور محل ان آنسوؤں سے آگے ہے یوں سمجھیے کہ ہمارا ایک شراب خانہ دریا کے پار بھی ہے۔

مطلب یہ کہ جب رو لیں گے تو دل مست و بیخود ہو جائے گا۔ گویا آنسوؤں کا دریا عبور کریں گے تو شراب خانے میں پہنچ جائیں گے۔

۲۔ شرح : ہمارا رونا بے خوف و خطر جاری تھا۔ ہم نے ضبط سے کام

لیا اور وہ تسبیح بن گیا۔ دیکھیے، آنسوؤں کے ہزاروں قطرے دلوں کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ہمیں ان سب پر قابو حاصل ہے۔

۳۔ شرح : ہم بالکل بے مایہ ہیں۔ ہماری حیثیت کچھ نہیں، لیکن ہر لحظ جلتی ہوئی ریت کی طرح ہمارے پاس ہزاروں دل ہیں، جو برابر ضبط و صبر کو رخصت کرتے رہتے ہیں۔

ریگِ رواں صحرا کی وہ ریت، جو ہوا سے ہر لحظہ جگہ بدلتی رہتی ہے اور دُور سے دیکھیں تو پانی کی طرح بہتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے ذرّے کہیں ٹھہرتے نہیں، بلکہ آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ شاعر نے ان ذرّوں کو دل قرار دے لیا، جو ضبط و صبر سے یکقلم خالی ہوں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ریگِ رواں بالکل بے مایہ ہوتی ہے اور کسی کام نہیں آسکتی، لہذا اسے بیچکس کہا۔

۴۔ شرح : اے غالبؔ! ہمیں بچھڑے ہوئے دوستوں کی جدائی نے دیوانہ بنا رکھا ہے۔ ہمارا دل بھی صحرا کی طرح غبار سے بھرا ہوا ہے۔

ہوئی ہیں آب شرمِ کوششِ بے جا سے تدبیریں
عرق ریزِ تپش ہیں موج کی مانند زنجیریں

شرح : تمام تدبیریں بے سود کوشش کی شرم سے پانی پانی ہو گئیں۔ دیوانوں کو جو زنجیریں پہنائی گئیں، تپش کے باعث ان سے لہروں کی طرح پسینہ ٹپکنے لگا۔

تدبیریں یہ تھیں کہ دیوانوں کو زنجیریں پہنا دی گئیں، تاکہ وہ دیوانگی کا مظاہرہ نہ کرنے پائیں، لیکن یہ کوششیں بے سود تھیں، لہذا ناکام ثابت ہوئیں۔ دیوانگی کے جوش سے زنجیروں کو پسینہ آگیا اور لہروں کی طرح نیچے گرنے لگا، گویا بیکار ہو گئیں۔

شرح : کس کو دُوں یارب! حسابِ سوز ناکیہائے دل
آمد و رفتِ نفس جز شعلہ پیمائی نہیں

اے میرے اللہ! میں اپنے دل کی جلن کا حساب کسے دوں؟ بس یہ سمجھ لینا چاہیے کہ سانس کا آنا جانا شعلے ناپنے کے سوا کچھ نہیں۔

مطلب یہ کہ سانس آمد و رفت میں شعلوں ہی پر چلتا رہتا ہے۔ اس کا حساب کون کر سکتا ہے۔

۱۔ لغات : ہو سکے کب کلفتِ دل، مانعِ سیلابِ اشک
گردِ ساحل سنگِ راہِ جوششِ دریا نہیں

کلفت : تکلیف، سختی، بےچینی۔

شرح : دل کی تکلیف آنسوؤں کا جوش نہیں روک سکتی۔ مثال یوں سمجھیے کہ ساحلِ دریا کی مٹی دریا کے بہاؤ میں رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتی۔

ہے طلسمِ دہر میں صد حشرِ پاداشِ عمل
آگہی غافل کہ یک امروز بے فردا نہیں

۲۔ شرح : زمانے کا طلسم ایسا تیار کیا گیا ہے کہ اس میں ہر عمل کے بدلے کے لیے سیکڑوں محشر موجود ہیں۔ لیکن انسانی شعور غافل ہے اور نہیں جانتا کہ یہاں آج تک کوئی امروز پیدا نہیں ہوا، جس کے ساتھ فردا نہ لگا ہو۔ یعنی انسان آج جو کچھ کرتا ہے، کل اس کا بدلہ مل جاتا ہے۔ پھر کیوں نہ ہم سمجھیں کہ یہاں ہر وقت حشر بپا ہے، انسانی اعمال کا جائزہ لیا جا رہا ہے، ساتھ ساتھ بدلہ دیا جا رہا ہے!

۱۔ لغات : ہے وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر و منزلت
عزلت آبادِ صدف میں قیمتِ گوہر نہیں

عزلت : گوشہ گیری، تنہائی۔

باعثِ ایذا ہے برہم خوردنِ بزمِ سرور
لختِ لختِ شیشۂ بشکستہ جز نشتر نہیں

کب تلک پھیرے اسدؔ لبہائے تفتہ پر زباں
طاقتِ لب تشنگی، اے ساقیِ کوثر نہیں

شرح : دیکھیے، موتی جب تک سیپی کے گوشہ میں رہتا ہے، اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، سیپی سے نکل کر باہر آتا ہے تو کبھی تاج و تخت کی زینت بنتا ہے، کبھی ہار بن کر حسینوں کے گلے میں پہنچتا ہے۔ یہی کیفیت اہل دل کی ہے۔ وہ جب تک وطن میں رہیں، ناقدری کا شکار رہتے ہیں۔ وطن سے باہر نکلیں تو قدر و منزلت پاتے ہیں۔

۲۔ شرح : عیش و سرور کی محفل درہم برہم ہو جائے تو دُکھ کا باعث ہوتی ہے۔ شیشہ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے تو ہر کرچ نشتر کا حکم رکھتی ہے، اور نشتر کا چبھنا باعثِ ایذا ہے

۳۔ شرح : اے ساقیِ کوثر! اب پیاس برداشت کرنے کی طاقت نہیں۔ آخر آپ کا اسدؔ کب تک اپنے جلتے ہوئے لبوں پر زبان پھیر پھیر کر گزارہ کر رہے؟ اس پر رحم فرمائیے اور لطف و کرم سے اس عاجز کی پیاس بجھائیے۔

بہ یادِ قامت اگر ہو بلند آتشِ غم
ہر ایک داغِ جگر، آفتابِ محشر ہو

ستمکشی کا کیا دل نے حوصلہ پیدا
اب اس سے ربط کروں، جو بہت ستمگر ہو

۱۔ شرح : اگر محبوب کے قد کی یاد میں غم کی آگ کے شعلے بلند ہوں تو جگر کا ایک ایک داغ صبحِ قیامت کا سورج بن جائے۔

۱۔ شرح : دل نے ظلم و جور سہنے کا حوصلہ پیدا کر لیا۔ اب میں اُسی محبوب سے

ربط ضبط پیدا کروں گا، جو حد درجہ ظالم ہو تاکہ وہ ستائے اور دل لطف اٹھائے۔

۱۔ شرح : بے دردِ سر بہ سجدۂ اُلفت فرو نہ ہو
جوں شمع غوطہ داغ میں کھا، گر وضو نہ ہو

دردِ عشق کے بغیر سر کو محبت کے سجدے لیے جھکانا نہ چاہیے۔ اگر تجھے وضو نہیں تو شمع کی مانند داغ میں غوطہ لگائے۔

زلفِ خیال نازک و اظہار بے قرار
یارب! بیان شانہ کشِ گفتگو نہ ہو

تمثال ناز جلوہ نیرنگ اعتبار
ہستی عدم ہے آئینہ گر روبرو نہ ہو

شمع جلتی ہے تو پگھل پگھل کر اس میں سے قطرے نکلتے رہتے ہیں۔ یہی اس کا وضو ہے۔

یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ محبت درد کی متقاضی ہے

۲۔ شرح : خیال کی زلف نازک ہے اور قوتِ اظہار بیتاب ہو رہی ہے۔ اے میرے خدا! بیان کہیں بات چیت کی کنگھی نہ چلانے لگے

بالوں میں کنگھی کی جائے تو کچھ نہ کچھ تکلیف ضرور ہوتی ہے۔ جو بال نازک ہوں، وہ شانہ کشی کی زحمت برداشت نہیں کر سکتے۔

۳۔ لغات : تمثال : مجسمہ، پیکر۔

شرح : ہم نے ناز کا جو پیکر تیار کر رکھا ہے، یہ صرف اعتبار کی نیرنگی کا کرشمہ ہے۔ یعنی محض ایک اعتباری شے ہے۔ اگر ہم اعتبار کا آئینہ سامنے نہ رکھیں تو ہستی کیا حیثیت رکھتی ہے، وہ تو عدم ہے؟

مطلب یہ کہ اس دنیا کی ہر شے محض اعتبار کا کرشمہ ہے، اس کی حقیقت کچھ نہیں۔

شرح : بہر حال پروردن یعقوبؑ بالِ خاک سے
دام لیتے ہیں پرِ پرواز، پیراہن کی بُو

حضرت یعقوبؑ کی روح کو آرام و راحت

دیئے - یہی ٹکڑے میرے شعر تھے - میرا دیوان ان تاروں ہی کی یادگار ہے، مگر اس کا شیرازہ کوئی نہیں اور ورق ورق الگ الگ ہے -

○

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

بے نیازی حد سے گزری، بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل، اور آپ فرمائیں گے کیا

حضرتِ ناصح گر آئیں، دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو تو یہ سمجھائے کہ سمجھائیں گے کیا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا! یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

خانہ زادِ زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبرائیں گے کیا

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ اُلفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

۱- شرح :- دوست اور ہمدرد میرا غم کھانے کے سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں؟ ان کے بس میں زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ میرے ناخن کٹوا دیں تاکہ میں اپنے زخم نہ چھیل سکوں، لیکن یہ تو سوچیے کہ جب تک میرے زخم بھرنے لگیں گے، اس وقت تک ناخن نہ بڑھ جائیں گے اور میں زخموں کے مندمل ہونے سے پہلے پہلے انھیں دوبارہ نہ چھیل ڈالوں گا؟ مطلب یہ ہے کہ جنونِ عشق میں علاج کی کوئی بھی تدبیر کی جائے اسے قطعی نہیں سمجھا جا سکتا- اس میں ایک پہلو اچھائی کا ہے تو وہ عارضی ہے، جو تھوڑی دیر میں ختم ہو جائے گا، پھر پہلی حالت عود کر آئے گی -

۲- شرح :- محبوب سے خطاب ہے،

پہنچانے کی غرض سے حضرت یوسفؑ کے پیراہن کی خوشبو خاک کے بازوؤں سے پر پرواز قرض لیتی ہے۔

مطلب یہ کہ اڑنا خاک کی فطرت میں داخل ہے۔ حضرت یوسفؑ مصر میں تھے انھوں نے والدِ ماجد کے لیے اپنا پیراہن نشان کے طور پر بھیجنا چاہا۔ حضرت یعقوبؑ کو کنعان میں پہلے ہی پیراہن کی خوشبو آگئی جسے قرآن مجید نے حضرت یوسفؑ کی خوشبو قرار دیا کیونکہ حضرت یعقوبؑ کی زبان سے ارشاد ہوتا ہے۔ اِنّی لَاَجِدُ رِیحَ یُوسُف (تحقیق مجھے یوسفؑ کی خوشبو آرہی ہے)۔ میرزا فرماتے ہیں کہ پیراہن کی خوشبو نے خاک سے پر پرواز ادھار مانگ لیا تاکہ حضرت یعقوبؑ کی جان پروری کی جا سکے۔

کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بہ سوزِ دل
دردِ جدائی اسد اللہ خاں نہ پوچھ

شرح: کل میرا محبوب اپنے نامہ بر سے کہہ رہا تھا کہ اسد اللہ خاں کا جو حال جدائی نے کر دیا ہے، وہ پوچھنے یا بیان کرنے کے لائق نہیں۔

خلق ہے صفحۂ عبرت سے سبق ناخواندہ
ورنہ ہے چرخ و زمیں یک ورقِ گردانده

دیکھ کر بادہ پرستوں کی دل افسردگیاں
موجِ مے مثلِ خطِ جام ہے ہر جا مانده

خواہشِ دل ہے زباں کو سببِ گفتِ بیاں
ہے سخن، گرد ز دامانِ ضمیر افشانده

۱- شرح: مخلوق نے عبرت کے صفحے سے سبق نہیں پڑھا یعنی عبرت حاصل نہیں کی، ورنہ آسمان و زمین الٹے ہوئے ورق کے سوا کیا ہیں، ورق اس لیے کہا کہ اس کے دو صفحے ہوتے ہیں

کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہمدیگر سے
ہے ہر اک فرد، جہاں میں، ورقِ ناخواندہ

حیف ہے حاصلی اہلِ ریا پر غالبؔ
یعنی ہیں ماندہ از آں سو و ازیں سو راندہ

ایک آسمان، دوسرا زمین دونوں اُلٹے ہوئے ورق ہیں، یعنی گردش میں اُلٹے جا رہے ہیں اور انھیں کوئی ثبات و قرار نہیں، لیکن دنیا عبرت حاصل نہیں کرتی۔

۲۔ **شرح** : شراب خانے میں شراب نوشوں کی افسردگی کا یہ عالم ہے کہ شراب کی موج بھی پیالے کے خط کی طرح اپنی جگہ ٹھٹھر کر رہ گئی ہے۔

اس شعر کی ایک صورت یہ بھی ہے۔

دیکھ کر بادہ پرستوں کی دل افسردگیاں　　موجِ مے مثلِ خطِ جام ہے بر جا ماندہ

۳۔ **شرح** : دل میں کوئی بات پیدا ہوتی ہے تو زبان کے لیے کچھ کہنے اور بیان کرنے کا موقع ملتا ہے۔ گویا جو کچھ ہم کہتے ہیں، وہ ضمیر کے دامن سے جھٹکی ہوئی گرد ہوتی ہے۔

مطلب یہ کہ جب تک ضمیر میں کوئی بات پیدا نہ ہو، اسے بیان کرنے کا موقع کیونکر آئے گا؟ اس بنا پر بات کو دامنِ ضمیر سے جھٹکی ہوئی گرد قرار دیا۔

۴۔ **شرح** : کوئی بھی ایک دوسرے کے دلی بھید سے واقف نہیں۔ گویا اس دنیا کا ہر فرد کتاب کا ایسا ورق ہے، جو کبھی مطالعے میں نہیں آیا۔

۵۔ **شرح** : اے غالبؔ! ریاکاروں کی نامرادی پر دل افسوس ہے۔ انھیں لوگوں پر یہ مثل صادق آتی ہے "ازاں سو ماندہ و ازیں سو راندہ" (اُس طرف سے پیچھے رہا ہوا اور اس طرف سے دھتکارا ہوا، نہ اُدھر کا، نہ اِدھر کا، نہ دنیا کا نہ دین کا)۔

واسطے فکرِ مضامینِ متیں کے، غالبؔ!
چاہیے خاطرِ جمع و دلِ آرامیدہ

شرح :
اے غالبؔ! پختہ مضامین سوچنے کے

لیے ضروری ہے کہ خاطر جمع اور دل آسودہ ہو۔

تا تخلص جامۂ شنگرفی ارزانی اسدؔ!
شاعری جز سازِ درویشی نہیں، حاصل نہ پوچھ

لغات :
جامۂ شنگرفی : شنگرف کے رنگ کا لباس۔

یہ اس لیے کہا کہ جب شاعروں کے دیوان قلم سے لکھے جاتے تھے تو تخلص کو نمایاں اور واضح رکھنے کے لیے رنگین روشنائی سے لکھتے تھے۔

شرح : اے اسدؔ! تخلص کے لیے رنگین جامہ تجھے مبارک ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ شاعری درویشی کے سروسامان کے سوا کچھ نہیں۔ اس سے حاصل کچھ نہیں ہوتا۔

درویش بھی عموماً ایسے رنگ کا جامہ پہن لیتے ہیں، جس میں لباس جلد میلا نہ ہو۔ لہٰذا تخلص کو رنگین رکھنے کا مطلب یہ ہوا کہ شاعر نے درویشی کا جامہ پہن لیا۔ اس سے فائدہ کچھ نہیں ہو سکتا۔

شکوہ و شکر کو ثمر بیم و امید کا سمجھ
خانۂ آگہی خراب، دل نہ سمجھ، بلا سمجھ
گاہ بہ خلد امیدوار، گہ بہ جحیم بیم ناک
گرچہ خدا کی یاد ہے، کلفتِ ماسوا سمجھ
نے سروبرگِ آرزو، نے رہ و رسمِ گفتگو
اے دل و جانِ خلق تو، ہم کو بھی آشنا سمجھ

۱- شرح : ہمارا شکوہ اور شکر بیم کا پھل ہے۔ امید پوری ہو جاتی ہے تو شکر کرنے لگتے ہیں، پوری نہیں ہوتی تو شکایتیں شروع کر دیتے ہیں۔ عقل کا خانہ خراب ہو، ہمارا دل کیا ہے، ایک بلا و مصیبت ہے، جو دل ہمارے سینے میں رکھ دیا۔ چاہیے یہ تھا کہ ہم ہر وقت شکر پر کاربند رہتے۔

۲- لغات : جحیم : دوزخ، جہنم۔

بیم ناک : ڈرا ہوا، خوف زدہ۔

شرح : ہم خدا کی عبادت کرتے ہیں، مگر اس لیے کہ ہمیں بہشت کی امید ہوتی ہے اور دوزخ سے ڈرتے ہیں۔ سوچنا چاہیے کہ کس اعتبار سے خدا کی عبادت ہے؟ یہ تو خدا کے سوا جو کچھ ہے، اس کے لیے زحمت اور کلفت میں مبتلا ہیں۔

کئی مرتبہ بیان کیا جا چکا کہ میرزا غالب کا فلسفۂ جزا و سزا سب سے الگ ہے۔ وہ بہشت کی امید اور دوزخ کے خوف سے خدا کی عبادت کو خدا نہیں، ماسوا کی عبادت سمجھتے ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں:

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

یہی مضمون اس شعر کا ہے۔

۳۔ **شرح** : نہ ہمارے لیے آرزو کا کوئی سامان تو نے مہیا کیا ہے، نہ بات چیت کی راہ و رسم پیدا ہوئی ہے۔ اے خلق کی جان اور دل! آخر ہمیں کیوں بیگانے سمجھ رہا ہے؟ ہم سے بھی آشناؤں کا سا سلوک روا رکھ۔

گو تم کو رضا جوئیِ اغیار ہے، لیکن
جاتی ہے ملاقات کب ایسے سببوں سے

شرح : اے محبوب! اگرچہ تم غیروں کی رضا جوئی میں سرگرم رہتے ہو اور انھیں کی خوشی کا تمھیں خیال رہتا ہے، لیکن کیا ایسی باتوں سے ہم ملاقات چھوڑ دیں گے؟ یہ ممکن نہیں۔

مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے
کہیں ہو جائے جلد اے گردشِ گردونِ دوں وہ بھی

شرح : اے کمینے آسمان کی گردش! تو نے جو کچھ میرے متعلق سوچ رکھا ہے، مجھے معلوم ہے۔ تو جو کچھ کرنا چاہتی ہے، جلد کر گزر، تاکہ میں امید و بیم کی

کشمکش سے نجات پاؤں ۔

کرتے ہو شکوہ کس کا؟ تم اور بے وفائی
سر پیٹتے ہیں اپنا ہم اور نیک نامی

۱۔ شرح : اے محبوب! تم کس کی شکایت کرتے ہو: بھلا تم سے بے وفائی ممکن ہے؟ ہم اپنا سر پیٹ رہے ہیں، ہمارے نصیب میں کب نیک نامی ہوئی؟

۲۔ شرح : بوالہوسی اور نا امیدی ہیں، اسد کو ساقی کی بھی ضرورت نہ رہی۔ ہم نے مانا کہ ساقی دریائے لطف و کرم ہے، لیکن ہم مست ایسے ہیں کہ دریا سے بھی پیاس نہیں بجھاتے۔

گر مصیبت تھی تو غربت میں اٹھا لیتے اسد
میری دہلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے

شرح : اے اسد! اگر یہ مصیبت ہم پر پڑنے والی تھی تو کاش ایسے ہم پر ایسے وقت آتی جب وطن سے باہر ہوتے اور کسی کو اس مصیبت کا پتہ نہ چلتا، لیکن اسے کیا کیجیے کہ یہ ذلت و خواری ہمیں دہلی ہی میں اٹھانی تھی اور اٹھائی۔

کیا غم ہے اس کو جس کا علیؑ سا امام ہو؟
اتنا بھی اے فلک زدہ کیوں بے حواس ہے؟

شرح : جس شخص کو حضرت علیؑ کا سا امام نصیب ہوا اسے کیا غم ہو سکتا ہے! اے آسمان کے مارے ہوئے! تو اتنا بے حواس کیوں ہے؟ مطلب یہ کہ بیشک آسمان سے ہمیں رنج پہنچے، مگر ہم تو حضرت علیؑ کی پناہ میں بیٹھے ہیں

پھر بد حواسی سے کیوں کام لیں! ہمیں کوئی غم نہیں ہو سکتا۔

شرح :- امام ظاہر و باطن، امیر صورت و معنی
علی ولی، اسداللہ، جانشینِ نبیؐ ہے

ظاہر و باطن کے امام اور صورت و معنی کے امیر حضرت علیؓ ہیں، جو ولی ہیں، اللہ کے شیر ہیں، نبی اکرم (صلعم) کے جانشین ہیں

شرح : بے چشمِ دل نہ کر ہوسِ سیرِ لالہ زار
یعنی یہ ہر ورق، ورقِ انتخاب ہے

اگر تو لالہ زار کی سیر کو نکلے تو دل کی آنکھ کھولے بغیر نہ نکل۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں کی ایک ایک پنکھڑی چن چن کر رکھی گئی ہے۔ یعنی لالہ زار کا کوئی پتا، کوئی پھول، کوئی پنکھڑی ایسی نہیں جس سے دل کی آنکھ سیکڑوں عبرتیں اور بصیرتیں حاصل نہ کرے۔

۱- شرح : تا چند پست فطرتیِ طبعِ آرزو؟
یارب! ملے بلندیِ دستِ دُعا مجھے

یک بار امتحانِ ہوس بھی ضرور ہے
اے جوشِ عشق بادۂ مردِ آزما مجھے

اے خدا! میں کب تک طبعِ آرزو کی پست فطرتی کا شکار رہوں گا؟ یعنی کب تک چھوٹی چھوٹی آرزوؤں میں میری زندگی گزرے گی؟ تو لطف و کرم سے میرے دستِ دعا کو بلندی عطا فرما۔ یعنی میں ایسی دعائیں مانگوں، جو انسان جیسے اشرف المخلوقات کے لیے زیبا ہوں۔

۲- شرح : اے جوشِ عشق! واقعی ہوس کی آزمائش ہو جانی چاہیے۔ مہربانی

فرما کر مجھے ایسی شراب دے، جس سے مردوں کی آزمائش کی جاتی ہے اس طرح مجھے اندازہ ہو جائے گا کہ میں محض بوالہوس ہوں یا حقیقت میں مردِ میدان ہوں جو ہر قسم کی کڑیاں جھیل سکتا ہے۔

بہا یاں تک ہے اشکوں میں غبارِ کلفتِ خاطر
کہ چشمِ تر میں ہر اک پارۂ دل، پائے در گِل ہے

شرح: آنسوؤں کے ساتھ دل کی کدورت کا غبار بھی اس قدر بہ گیا کہ کیچڑ کی صورت پیدا ہو گئی اور اشکبار آنکھوں میں دل کا جو ٹکڑا پہنچا، اس کا پاؤں کیچڑ میں دھنس گیا۔

ہم مشقِ فکرِ وصل و غمِ ہجر سے، اسدؔ!
لائق نہیں رہے ہیں غمِ روزگار کے

شرح: اے اسدؔ! ہم وصل کے سوچ بچار اور جدائی کے غم کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں۔ ہم دنیا کا غم کھانے کے لائق نہیں رہے۔

پیدا کریں دماغِ تماشائے سرو و گل
حسرت کشوں کو ساغر و مینا نہ چاہیے

دیوانگاں ہیں حاملِ رازِ نہانِ عشق
اے بے تمیز گنج کو ویرانہ چاہیے

ساقی! بہارِ موسمِ گل ہے سرور بخش
پیماں سے ہم گزر گئے، پیمانہ چاہیے

۱۔ شرح: جو لوگ حسرت کا شکار ہیں، انھیں شراب کی صراحی اور پیالہ درکار نہیں، انھیں تو یہ حوصلہ پیدا کرنا چاہیے کہ سرو اور پھول کا نظارہ کریں۔

سرد کو مینا اور ساغر کو گل سے تشبیہ دی گئی ہے۔

۲۔ **شرح** : دیوانے عشق کے چھپے ہوئے بھید دل میں لیے بیٹھے ہیں۔ ایسا کیوں نہ ہو، خزانہ دفن کرنے کے لیے ویرانہ ہی بہتر ہے۔

۳۔ **شرح** : اے ساقی! فصلِ بہار سرور پیدا کر رہی ہے۔ ہم نے ترکِ شراب کا جو عہد کیا تھا، وہ چھوڑ دیا ہیں اب شراب کے پیالے کی ضرورت ہے۔

شرح :

وقت اُس افتادہ کا خوش، جو قناعت سے اسد
نقشِ پائے مور کو تختِ سلیمانی کرے

اے اسد! دعا ہے کہ اس شخص کا وقت خوش خوش گزرے، جو قناعت کرکے بیٹھا رہے، یہاں تک کہ چیونٹی کے پاؤں کا نقش بھی دیکھے تو اسے سلیمان کا تخت سمجھ لے۔

شرح :

اے سرِ شوریدہ! ذوقِ عشق و پاسِ آبرو
جوشِ سودا کب حریفِ منتِ دستار ہے

اے سر! جس میں جوشِ جنوں بھرا ہوا ہے، تجھے صرف عشق کے ذوق اور آبرو کی پاسداری سے واسطہ ہے۔ بھلا جوشِ جنوں دستار کا احسان کیونکر گوارا کر سکتا ہے؟

مطلب یہ ہے کہ دیوانے کا سر تو برہنہ ہی رہنا چاہیے، اسے دستار کی آلائش سے کیا واسطہ؟ وہ تو صرف عشق کے ذوق اور دیوانگی کی آبرو قائم رکھنے کے لیے وقف ہے۔

شرح :

ترے نوکر، ترے در پر، اسد کو ذبح کرتے ہیں
ستمگر، ناخدا ترس، آشنا کُش، ماجرا کیا ہے؟

اے ستم ڈھانے والے خدا سے بے خوف

اور دوستوں کو فلک کے گھاٹ اتارنے والے محبوب! نوکر تیرے دروازے پر سجدہ کو ڈیوٹی کر رہے ہیں، بھلا یہ تو بتا، ہوا کیا؟ اس نے کون سا گناہ کیا ہے؟

وا کیا ہرگز نہ میرا عقدۂ تارِ نفس
ناخنِ بریدہ ہے تیغِ صفاہانی مجھے

شرح: میرے سانس کے تار میں جو گرہ پڑ گئی تھی، اسے کھولا نہ گیا۔ اصفہانی تلوار بھی میرے لیے کٹا ہوا ناخن بن گئی۔

ظاہر ہے کہ کٹے ہوئے ناخن سے کوئی گرہ کھل نہیں سکتی، اس لیے کہا کہ اصفہان کی تلوار ناخن بریدہ بن گئی، گویا بالکل بیکار رہ گئی۔

تمثالِ جلوہ عرض کر اے حسن! کب تلک
آئینۂ خیال کو دیکھا کرے کوئی؟

عرضِ سرشک پر ہے فضائے زمانہ تنگ
صحرا کہاں، جو دعوتِ دریا کرے کوئی

وہ شوخ اپنے حسن پہ مغرور ہے، اسدؔ!
دکھلا کے اس کو آئینہ توڑا کرے کوئی

۱۔ شرح: اے حسن! تو مجسم صورت میں جلوہ بھی دکھا۔ آخر عاشق کب تک بیٹھا ہوا خیال کا آئینہ دیکھتا رہے؟ یعنی محض تصور پر کب تک قناعت کی جائے؟ حسن کو آنکھوں کے سامنے بھی تو جلوہ افروز ہونا چاہیے

۲۔ شرح: آنکھوں میں آنسوؤں کے جوش کا یہ عالم ہے کہ معلوم ہوتا ہے، وہ زمانے کی فضا میں سما نہ سکیں گے۔ ظاہر ہے کہ جب تک کوئی صحرا پاس نہ ہو، جس کے کنارے ناپید ہوں دریا کو بہاؤ کی دعوت کیونکر دی جا سکتی ہے؟

مطلب یہ کہ جس طرح دریا کے بہنے کے لیے بہت وسیع میدان درکار ہے، اسی

طرح میرے آنسوؤں کے لیے بہت لمبی چوڑی فضا ہونی چاہیے۔

۳۔ شرح : اے اللہ! میرا شوخ محبوب حسن پر بہت مغرور ہے۔ اب اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ اُسے آئینہ دکھا کر توڑتے رہیں؛

دکھا کر آئینہ توڑنے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اُس کا غرور ختم ہو جائے، کیونکہ غرور کو ہوا دینے کا ذریعہ آئینہ ہے، یعنی وہ آئینہ دیکھتا ہے تو دل میں غرور پیدا ہوتا ہے۔ اسے توڑ دیا جائے تو غرور کا سبب ختم ہو جائے گا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ آئینہ دکھا کر توڑیں گے تو اس کے حسن کی نمائش کے لیے ایک آئینے کی جگہ بیسیوں ٹکڑے پیدا ہو جائیں گے کیونکہ ہر ٹکڑا ایک مستقل آئینہ ہوگا۔ یوں اس کے غرور کی تسکین کے لیے خاصا سامان فراہم ہو جائے گا۔

یارب! ہمیں تو خواب میں بھی مت دکھائیو
یہ محشرِ خیال کہ دنیا کہیں جسے

شرح : اے پروردگار! ہمیں تو خیال کا وہ محشر خواب میں بھی نہ دکھانا، جسے دنیا کہتے ہیں۔

اس شعر میں دنیا کو خیال کا ایک ہنگامہ قرار دیا گیا ہے، یعنی اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ پھر اس سے بیزاری کا یہ عالم ہے کہ خواب میں بھی اس کی صورت دیکھنا منظور نہیں،

مدعا در پردہ، یعنی جو کہوں باطل سمجھ
وہ فرنگی زادہ، کھاتا ہے قسم انجیل کی

شرح : میرا محبوب فرنگی زادہ ہے اور وہ جو وعدہ کرتا ہے، اسے سچا ظاہر کرنے کے لیے انجیل کی قسم کھاتا ہے، جس سے اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ میں جو وعدہ کر رہا ہوں، اسے سراسر جھوٹا سمجھ۔

انجیل کی قسم کھانے۔ وعدے کو جھوٹا سمجھنے کی دلیل اس لیے قرار دیا کہ انجیل بیشک

آپ کی بے نیازی اور بے پروائی حد سے گزر گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔ میں بڑے شوق سے دل کا حال سنانے کے لیے حاضر ہوتا ہوں۔ کچھ کہتا ہوں تو آپ تغافل سے کام لیتے ہوئے فرما دیتے ہیں کیا کہا ؟

شعر کا جو پہلو بہ طور خاص قابلِ توجہ ہے، یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی کو دردبھری داستان سنانے لگے اور سننے والا کہہ دے کہ کیا کہا تو دردمند کے بیان میں وہ تاثیر اور گہرائی سی باقی نہیں رہتی جو اس داستان کے لیے ضروری ہے۔ غالب نے "آپ فرمائیں گے کیا" میں اسی نکتے پر زور دیا ہے۔

۳۔ لغات۔ دیدہ و دل فرشِ راہ : آنکھیں اور دل ان کے راستے میں بچھا دوں یعنی وہ سر آنکھوں پر تشریف لائیں۔

شرح : اگر حضرت ناصح وعظ و نصیحت کے لیے تشریف لانا چاہتے ہیں تو شوق سے تشریف لائیں۔ ان کا آنا سر آنکھوں پر، میری طرف سے خیر مقدم میں کوتاہی نہ ہوگی، بلکہ آنکھیں اور دل ان کے راستے میں بچھا دوں گا، مگر کوئی صاحب یہ تو سمجھا دیں کہ وہ مجھے کیا سمجھائیں گے ؟ یعنی مجھ پر ان کی نصیحت کا اثر کیا ہو سکتا ہے؟

ناصح کے رسمی خیر مقدم میں ہرگز تامل نہیں۔ یقیناً نصیحت بہتری اور بہبودی کے لیے کی جاتی ہے، مگر اصل سوال اثر اور نتیجے کا ہے۔ جب معلوم ہے کہ سمجھانے کا اثر کچھ نہ ہوگا تو ناصح کی عزت اور مرتبے کا احترام کرتے ہوئے یہ حقیقت واضح کر دی گئی کہ ان کی تکلیف فرمائی قطعاً بے نتیجہ ہوگی۔

۴۔ شرح :- آج میں تلوار اور کفن لے کر محبوب کے پاس جا رہا ہوں۔ اس کے بعد ان کے لیے میرے قتل میں کون سا عذر باقی رہ جائے گا ؟

بظاہر دو ہی عذر ہو سکتے تھے : اول یہ کہ تلوار نہیں، دوم یہ کہ قتل کے بعد کفن کا کیا انتظام ہوگا۔ یہی دونوں عذر سامنے رکھ کر تیغ و کفن کا انتظام ضروری سمجھا۔

۵۔ شرح :- ناصح نے ہمارے جنونِ عشق کو ختم کرنے کے لیے ہمیں قید میں ڈال دیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا قید جنونِ عشق کے انداز ہم سے چھڑا سکتی ہے ؟

خدا کا کلام ہے، لیکن قرآن مجید کے نزول سے منسوخ ہو چکی ہے اور منسوخ کلام الٰہی کی قسم کا اعتبار نہ ہونی چاہیے۔

کیا ہے ترکِ دُنیا کاہلی سے
ہمیں حاصل نہیں بے حاصلی سے
خراجِ دیہ، ویراں، یک کفِ خاک
بیاباں! خوش ہوں تیری عاملی سے
اسدؔ! قربانِ لطفِ جورِ بیدل
خبر لیتے ہیں، لیکن بیدلی سے

١- شرح: ہم نے دنیا کو قناعت یا عالی ہمتی کی بنا پر نہیں، بلکہ سستی اور کاہلی کی بنا پر چھوڑا ہے ایسا ترک سراسر بے سود ہے، اس سے ہمیں کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ یہی مضمون دوسرے مقام پر یوں کہا:

ضعف سے ہے، نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

٢- شرح: جو گاؤں بے چراغ ہو، اس سے مالیہ خاک کی چٹکی کے سوا کیا وصول ہو سکتا ہے؟ یعنی جب کوئی وہاں آباد ہی نہیں تو خراج کہاں سے آئے گا؟ اے بیاباں! میں خوش ہوں کہ میرے سپرد تیری عملداری ہوئی جس میں کسی کو کچھ لینا دینا نہیں پڑتا۔

شیخ سعدی فرماتے ہیں:

کہ سلطاں نہ خواہد خراج از خراب

نظیری نے کہا ہے:

بہ بتاں گنج بر دلِ تسکین منہادہ اند
ورنہ خراج بر دہِ ویراں نبودہ شرط

۳۔ **شرح** : اے اسدؔ! میں میرزا بیدلؔ کے لطف جور پر قربان ہو جاؤں ۔ مجھ پر توجہ تو فرماتے ہیں، مگر ذرا بیدلی سے۔

یہ بھی اسی زمانے کی غزل ہے، جب میرزا بیدلؔ کا اثر بہت زیادہ تھا۔

•

خراباتِ جنوں میں ہے اسدؔ! وقتِ قدح نوشی
بہ عشقِ ساقیِ کوثر، بہارِ بادہ پیمائی

شرح : اے اسدؔ! دیوانگی کے میخانے میں شراب بھر پیالہ پینے کا وقت آ گیا۔ ساقیِ کوثر کے عشق میں شراب نوشی کی بہار کا لطف ہے۔

رشک ہے آسائشِ اربابِ غفلت پر، اسدؔ!
پیچ و تابِ دل، نصیبِ خاطرِ آگاہ ہے

شرح : اے اسدؔ! غفلت کے خوگر جس آرام اور آسائش سے رہتے ہیں، اس پر رشک آتا ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ ان میں کیوں کوئی احساس پیدا نہیں ہوا۔ سچ ہے، وہی دل پیچ و تاب کا مرکز بن سکتا ہے، جو آگاہی سے بہرہ مند ہو۔ جس نے غفلت سے کام لیا، اس میں احساس کیونکر پیدا ہو سکتا ہے؟

ہم نشینیِ رقیباں گرچہ ہے سامانِ رشک
لیکن اس سے ناگوار تر ہے بدنامی تری

شرح : اے محبوب! تو رقیبوں کے پاس بیٹھتا ہے، اس پر یقیناً مجھے رشک ہونا چاہیئے، یعنی یہ کہ میرے پاس کیوں نہیں بیٹھتے؟ یہ سب کچھ اپنی جگہ درست ہے، لیکن میرے لیے اس سے بھی زیادہ ناگوار امر یہ ہے کہ رقیبوں کے پاس بیٹھنے سے تیری بدنامی ہوتی ہے۔

شعر سے صاف واضح ہوتا ہے کہ عاشق نے رقیبوں کی ہم نشینی پر محبوب سے شکایت

کی ۔ اس نے جواب دیا کہ یہ شکایت تیرے رشک کا نتیجہ ہے ۔ عاشق جواب دیتا ہے کہ بیشک رشک بھی ہے ، لیکن اس سے زیادہ بڑی چیز یہ ہے کہ تو بدنام ہوتا ہے ۔

کیا کروں، غم ہائے پنہاں لے گئے صبر و قرار
دزد گر ہو خانگی تو پاسباں معذور ہے

شرح : کیا کروں ، میرے چھپے ہوئے غم صبر و قرار چھین کرلے گئے ۔ ظاہر ہے کہ اگر چوری کرنے والا گھر کا آدمی ہو تو چوکیدار کو معذور سمجھنا چاہیے کیونکہ وہ تو باہر سے آنے والوں کے سلسلے میں روک ٹوک کرے گا ۔ گھر کے سر آدمی پر پہرا نہ دے گا ۔ غمہائے پنہاں اندر کے چور تھے ۔

نے حسرتِ تسلّی، نے ذوقِ بے قراری
یک درد و صد دوا ہے، یک دست و صد دعا ہے
بُت خانے میں اسدؔ بھی بندہ تھا، گاہ گاہے
حضرت چلے حرم کو، اب آپ کا خدا ہے

۱۔ شرح : نہ تسلی کی حسرت ہے ، نہ بیقراری کا ذوق ہے ۔ ایک درد کے ساتھ سیکڑوں دوائیں ، ایک ہاتھ کے ساتھ سیکڑوں دعائیں ۔ جب درد کے ساتھ دوا اور ضرورت کے وقت دعا موجود ہو تو نہ تسلی کی حسرت رہ سکتی ہے ، نہ بیتابی کی کوئی وجہ باقی رہتی ہے ۔

۲۔ شرح : اسدؔ بھی کبھی کبھی بتخانے میں بندگی کے لیے پہنچ جاتا تھا اب آپ حرم کو جا رہے ہیں ، آپ کا خدا حافظ ۔

آب ہو جاتے ہیں ننگ ہمتِ باطل سے مرد
اشک پیدا کر اسدؔ! گر آہ بے تاثیر ہے

شرح : غیرت والے لوگ جھوٹی ہمت کی شرم

سے پانی پانی ہو جاتے ہیں۔ اے اسد! اگر تیری آہ میں تاثیر نہیں رہی تو آنسو بہانا شروع کر دے۔
آہ کا بے تاثیر ہونا واقعی اس امر کا ثبوت ہے کہ اس میں کوئی قوت نہیں۔ اور اس وجہ سے وہ باعث ننگ ہے۔ جو انمرد ایسی حالت دیکھ کر پانی پانی ہو جاتے ہیں کہ کیا وجہ ہے، تو آنسو پیدا نہیں کرتا؟

شرح: اسد نے بے شمار لوگوں کے دل محبوب کی زلف میں پھنسے ہوئے دیکھ کر جان لیا کہ یہ زلف پریشانی کا مجموعہ ہے۔

اسد نے کثرتِ دلہائے خلق سے جانا
کہ زلفِ یار ہے مجموعۂ پریشانی

زلفِ محبوب میں عاشقوں کے دل پھنسے ہیں اور عاشقوں کے دل ہمیشہ پریشان ہوتے ہیں۔ جب بہت سے دل زلف میں پھنس گئے تو وہ پریشانی کا مجموعہ بن گئی اور بجائے خود بھی پریشانی کا مجموعہ ہے۔

۱۔ شرح: زلف کو شبِ مہتاب اس لیے کہا کہ تھی تو وہ تاریک جیسے رات تاریک ہوئی مگر چمک نے چاندنی کی بہار پیدا کر دی۔

جب محبوب کے رخسار جلوہ افروز ہوئے تو زلف سیاہ کی یہ کیفیت ہوئی کہ وہ چاندنی رات بن گئی۔

رخسارِ یار کی جو ہوئی جلوہ گستری
زلفِ سیاہ بھی شبِ مہتاب ہو گئی
موجِ تبسمِ لب آلودۂ مسی
میرے لیے تو تیغ سیہ تاب ہو گئی
بیدادِ انتظار کی طاقت نہ لا سکی
اے جانِ بر لب آمدہ! بے تاب ہو گئی
غالبؔ زبسکہ سوکھ گئے چشم میں سرشک
آنسو کی بوند گوہرِ نایاب ہو گئی

مطلب یہ کہ جلوہ افروزی کی فراوانی کے باعث زلف میں ایسی چمک پیدا ہوئی کہ اس کی سیاہی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی

۲۔ لغات : تیغ سیہ تاب : صیقل کی ہوئی تلوار پر جب تازہ عرق ڈال کر آگ میں گرم کر دیتے ہیں تو اس کا رنگ بنفشی ہو جاتا ہے، اسے تیغ سیہ تاب کہتے ہیں۔

شرح : محبوب کے مسی لگے ہوئے لب پر مسکراہٹ کی لہر آئی تو وہ میرے لیے بنفشی تلوار بن گئی۔

۳۔ شرح : اے لبوں پر آئی ہوئی جان! تو انتظار کا ظلم و جور برداشت نہ کر سکی اور نکل جانے کے لیے بیقرار ہو گئی۔

۴۔ شرح : اے غالب! آنکھوں میں آنسو خشک ہو گئے۔ کہنا چاہیے کہ اشک کی بوند ایسا موتی بن گئی، جو ہاتھ نہیں آتا۔

اسد اوارستگاں باوصفِ ساماں بے تعلق ہیں
صنوبر گلستاں میں با دلِ آزادہ آتا ہے

شرح : اے اسد! آزادوں کے ساتھ سر و ساماں بھی ہو تو اس کے باوجود وہ بے تعلق رہتے ہیں اور کسی سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے۔ دیکھیے صنوبر باغ میں آزادوں کی طرح رہتا ہے اور سب سے بے تعلق رہ کر اوپر نکل جاتا ہے۔

سرو و صنوبر کو شاعر اس لیے آزاد باندھتے ہیں کہ وہ بہت بلند ہوتے ہیں اور ارد گرد کے کسی پودے سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

خبر نگہ کو، نگہ چشم کو عدو جانے
وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے

۱۔ شرح : جیسا نگاہ کو اور نگاہ آنکھ کو دشمن سمجھتی ہے۔ کوئی

نہ ہووے کیونکہ اسے فرضِ قتلِ اہلِ وفا
لہو سے ہاتھ کے بھرنے کو جو وضو جانے

ایسا جلوہ دکھا کر نہ میں جان سکوں، نہ تُو جان سکے۔

مطلب یہ کہ میری حالت ایسی ہے، نگاہ اٹھتی ہے تو کچھ پتا نہیں چلتا اور آنکھ نگاہ کی دشمن بنی ہوئی ہے۔

۲- شرح : جو محبوب لہو میں ہاتھ بھر لینے کو وضو سمجھتا ہے، بھلا اُس کے نزدیک اہلِ وفا کو قتل کرنا کیوں فرض نہ ہو!

جب اس کے نزدیک وضو یہ ہے کہ لہو سے ہاتھ بھرے تو وہ یقیناً اہلِ وفا کو قتل کرے گا، کیونکہ اُن کے سوا اور کوئی اپنے آپ کو قتل کے لیے پیش نہیں کر سکتا۔

شرح : اے غالبؔ! جہاں بادشاہی کا وہ حال ہو،

بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غالبؔ! تو پھر
کیوں نہ دِلّی میں ہر اک ناچیز نوّابی کرے

جو ہمیں نظر آ رہا ہے، یعنی کوئی نظام اور کوئی ترتیب نہ ہو تو دہلی کا ہر حقیر و ناچیز فرد کیوں نوّابی نہ کرے!

۱- شرح : صبح کے طلوع ہوتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ شام ہونے کے نشان نمایاں ہو گئے۔ اے غفلت کے ماتو! ہر کام کا آغاز اس کے انجام کا آئینہ ہے۔

صبح سے معلوم آثارِ ظہورِ شام ہے
غافلاں! آغازِ کار، آئینۂ انجام ہے
کیا کمالِ عشق نقص آبادِ گیتی میں ملے
پختگیہائے تصوّر یاں خیالِ خام ہے

۲- شرح : یہ دنیا اتنی خامیوں سے بھری ہوئی ہے کہ اسے نقص آباد (نقصوں اور خامیوں سے بھری ہوئی) قرار دینا مناسب ہے۔ یہاں عشق کا کمال کیونکر مل سکتا ہے،

جہاں سب کچھ ناقص ہو، وہاں کامل کی تلاش عبث ہے، لہذا تصور کی پختگی سراسر خام خیالی ہے۔

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو، پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

شرح: ہم تو اپنے مٹکے اور پیالے توڑ کر بیٹھ گئے۔ اگر آسمان سے پھول کے رنگ کی شراب برسات کی طرح بھی برسے، تو ہمیں کیا فائدہ؟ ہمارے پاس مٹکے ہوتے تو بھر لیتے، پیالے ہوتے تو تھوڑی تھوڑی کر کے پیتے رہتے۔ اب تو کچھ بھی نہیں۔

مقصود یہ ہے کہ اگر انسان کے پاس کائنات کی برکات سے فائدہ اٹھانے کا سامان یا صلاحیت نہ ہو تو وہ برکات کتنی ہی زیادہ ہو جائیں، ان سے کوئی نفع نہیں اٹھایا جا سکتا

فغاں کہ بہرِ شفائے حصول نا شدنی
دماغ نازکشِ منتِ طبیباں ہے
اسدؔ! جہاں کہ علیؑ برسرِ نوازش ہو
کشادِ عقدۂ دشوار، کارِ آساں ہے

۱- **شرح:** فریاد کہ ہم اس شفا کے لیے، جو حاصل نہیں ہو سکتی اور حاصل ہونے کے لائق بھی نہیں ہے، طبیبوں کا احسان اٹھائے جا رہے ہیں۔

۲- **شرح:** اے اسد! جہاں حضرت علیؑ مہربانیوں کے لیے موجود ہوں، وہاں مشکل گرہوں کا کھلنا اور عقدوں کا حل ہونا بہت آسان ہے۔

اے اسدؔ! آباد ہے مجھ سے جہانِ شاعری
خامہ میرا تختِ سلطانِ سخن کا پایہ ہے

شرح: اے اسد! میرے ہی دم سے شاعری

کی دنیا آباد ہے۔ اگر شاعری کو بادشاہ فرض کر لیا جائے تو میرا قلم اس کے تخت کا ایک پایہ ہے۔

۱۔ لغات : تجرید : سب سے الگ تھلگ رہنا۔

کچھ نہیں حاصل تعلق میں بغیر از کشمکش
اے خوشا رندے کہ مرغِ گلشنِ تجرید ہے

شرح : اِس دنیا کی کسی چیز سے ربط ضبط قائم کر لینے کا نتیجہ کھینچ تان کے سوا کچھ نہیں۔ ہم تو اُس رند کو خوش نصیب سمجھتے ہیں، جو تجرید کے باغ کا طائر ہے یعنی جو دنیوی تعلقات سے الگ تھلگ رہتا ہے۔

کثرتِ اندوہ سے حیران و مضطر ہے اسدؔ!
یا علیؑ! وقتِ عنایات و دمِ تائید ہے

۲۔ شرح : اسدؔ غموں کی کثرت کے باعث حیران و مضطر ہو گیا ہے۔ اے حضرت علیؑ! یہ وقت ہے کہ اُس پر عنایات ہوں اور اس کی مدد فرمائی جائے۔

اسدؔ با وصفِ عشقِ بے تکلف خاک گردیدن
غضب ہے گر غبارِ خاطرِ احباب ہو جاوے

شرح : اگرچہ اسدؔ بے تکلف خاک ہو جانے کی مشق میں لگا رہا، لیکن کیا غضب ہے کہ اس کے باوجود وہ دوستوں کے دل کا غبار بن جائے۔!

۱۔ شرح : کب تک مسجد اور بتخانے کے ناز اٹھاتے رہیں؟ کیوں نہ دل کو شمع کی طرح محبوب کے خلوتکدے

تا چند نازِ مسجد و بُت خانہ کھینچیے!
جوں شمع، دل بہ خلوتِ جانانہ کھینچیے
دامانِ دل بہ وہمِ تماشا نہ کھینچیے
اے مدّعی! خجالتِ بے جا نہ کھینچیے

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وُہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

حیرت حجابِ جلوہ و وحشت غبارِ راہ
پائے نظر بہ دامنِ صحرا نہ کھینچیے

گُل سر بہ سر اشارۂ جیبِ دریدہ ہے
نازِ بہار جز بہ تقاضا نہ کھینچیے

خود نامہ بن کے جائیے اُس آشنا کے پاس
کیا فائدہ کہ منّتِ بیگانہ کھینچیے

ہے بے خمار نشۂ خونِ جگر، اسدؔ!
دستِ ہَوس بہ گردنِ مینا نہ کھینچیے

میں لے جائیں؟ مسجد اور بتخانے کے ناز اٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ کفر و ایمان کی کشمکش میں الجھے رہیں، محبوب کے خو تکدے میں پہنچ جائیں گے تو یک رخی اور یک سوئی نصیب ہو جائے گی اور کشمکش ختم ہو جائے گی۔ آخر مسجد اور بتخانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ محبوب کے خو تکدے میں پہنچیں۔

۲- شرح : نظارہ ایک وہم ہے اس کے لیے کیوں دل کا دامن کھینچیں اور خواہ مخواہ شرمندگی اٹھانے سے کیا حاصل ہوگا؟

۳- شرح : محبوب کی خدمت میں عاجزی اور نیاز مندی کرتے کرتے تھک گئے، وہ کسی طرح راہ پر آیا اور ہم سے تعلق پیدا کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اب جی چاہتا ہے کہ عجز و نیاز اور خوشامد کا طریقہ چھوڑ کر اس کا دامن حریفانہ انداز میں کھینچیں۔

۴- شرح : حیرت جلوۂ محبوب کے لیے پردہ بن رہی ہے اور دیوانگی نے راستے کے گرد و غبار کی صورت اختیار کر لی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ نگاہ کا پاؤں صحرا کے دامن کی طرف نہ لے جائیں۔

مطلب یہ کہ صحرا نوردی اور دشت گردی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس طرح محبوب کا جلوہ نصیب ہونے کے بجائے اس سے محرومی کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

۵۔ شرح : پھول سرپا پھٹے ہوئے گریبان کا اشارہ کر رہا ہے، یعنی ہمیں دعوت دے رہا ہے کہ گریبان چاک کیے بغیر بہار سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔ ہمیں بھی چاہیے کہ بہار کا نانہ اٹھائیں تو تقاضے کی بنا پر اٹھائیں۔

۶۔ شرح : دوست کے پاس خود مکتوب بن کر جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں بیگانے اور ناآشنا کا احسان اٹھانے سے کیا حاصل ہے؟

مطلب یہ کہ محبوب کے پاس پہنچنے کے لیے وسیلہ ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں جب تک خود کوشش کر کے وہاں نہ پہنچیں گے، دیدار نصیب نہ ہوگا۔

۷۔ شرح : اے اسد! جس شخص نے خونِ جگر پی لیا، سمجھ لے کہ اسے ایسی شراب مل گئی، جس کا نشہ ہمیشہ قائم رہتا ہے اور اس میں اُتار کی تکلیف نہیں ہوتی۔ پھر مینا کی گردن کی طرف دستِ ہوس کیوں کر بڑھائیں، یعنی وہ شراب کیوں پییں۔ جس کا نشہ تھوڑی دیر میں اتر جائے گا اور دوبارہ پینے کی ضرورت پیش آئے گی۔

خونِ جگر کی شراب پینے کا مطلب یہ ہے کہ دل میں حقیقی عشق کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ جو ہمیشہ مست رکھے گا اور خمار کی نوبت کبھی نہ آئے گی۔

نہ حیرت چشمِ ساقی کی، نہ صحبت دورِ ساغر کی
مری محفل میں غالبؔ! گردشِ افلاک باقی ہے

شرح : اے غالب! میری محفل میں نہ تو چشمِ ساقی کی حیرت ہے اور نہ پیالے کا دور چل رہا ہے۔ یہاں صرف ایک گردش باقی رہ گئی ہے اور وہ آسمانوں کی گردش ہے۔ یعنی گردشِ روزگار نے میری محفل کو اس طرح تلپٹ کر دیا ہے کہ نہ اس میں شراب پلانے والا موجود ہے، نہ شراب باقی

مطلب یہ ہے کہ جنونِ عشق ہماری فطرت میں سرایت کر چکا ہے۔ جس طرح فطرت کو تبدیل کرنا ممکن نہیں، اسی طرح جنونِ عشق بھی ہم سے چھڑایا نہیں جاسکتا بیشک نصیحت کرنے ازراہِ خیر خواہی تدبیر کے لیے انتہائی قدم اٹھالیا یعنی ہمیں قید میں ڈال دیا، لیکن جنونِ عشق صحرا نوردی پر موقوف نہیں، ہم سے اسیری میں بھی برابر اس کے مظاہرے سرزد ہوتے رہیں گے۔

بظاہر ناصح کا لفظ یہاں محلِ نظر معلوم ہوتا ہے، اس کی جگہ کوئی ایسا آدمی ہونا چاہیئے، جو حکومت کی طرف سے غیر مناسب افعال کے انسداد پر مامور ہو۔ مثلاً محتسب، لیکن مرزا نے یہاں "ناصح" دانستہ استعمال کیا۔ ان کا مقصود وہ فرد ہے، جو ازراہِ خیر خواہی یہ تدبیریں اختیار کر رہا ہے، لہذا یہاں ناصح ہی موزوں ہے۔ خود قید کرنا اس کا کام نہ ہو، مگر وہ قید کرا سکتا ہے۔

اس شعر کا ایک مفہوم اور بھی ہے۔ یعنی جو لوگ حق و صداقت سے سچا عشق رکھتے ہیں، اُن کے راستے میں جتنی بھی تکلیفیں اور مشقتیں آجائیں، وہ روگرداں نہیں ہوتے۔ ہر مصیبت صبر و سکون سے جھیل لیتے ہیں اور اپنے مقصد کے لیے ہر ممکن سعی پر بدستور قائم رہتے ہیں۔ گویا مرزا کا مطلب یہ ہے: ہمیں کسی بھی سلوک سے سابقہ پڑے، کتنی ہی تکلیفیں پیش آئیں، ہم حق و صداقت سے منہ نہیں موڑ سکتے۔

۲۔ **لغات**۔ **خانہ زاد**: جو کسی کے گھر میں پیدا ہوا ہو اور وہیں پلا ہو۔ بظاہر اس کا مطلب ہے وہ شخص، جو کسی گھر سے خصوصی نسبت رکھتا ہو لیکن جاگیرداری کے دور میں اس کا اطلاق غلاموں یا ان کی اولاد پر ہوتا رہا۔

شرح:۔ ہم زلف کے خانہ زاد ہیں، یعنی ہمیں زلف سے ایسی خصوصی نسبت ہے، جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتی، اس لیے ہم زنجیر سے کیونکر دور بھاگ سکتے ہیں؟ اس مصرع میں زنجیر اور زلف کی مناسبت ظاہر ہے، نیز زلف کے پیچ کو خانہ قرار دے کر وابستگی کی بنا پر اپنا خانہ زاد ہونا ثابت کیا۔ خانہ زاد کے لفظ سے مرزا کا مقصود یہ ہے کہ جس طرح خانہ زاد اس گھر کو اپنا گھر سمجھتا ہے،

جاتی ہے۔

سنگ آمد و سخت آمد دردِ سرِ خودداری
معذورِ سبکساری، مجبورِ گراں جانی

لغات :
سنگ آمد و سخت آمد :
لفظی معنی: پتھر [illegible]

بھی گرا تو بھاری اور بوجھل کہ اٹھائے نہ اٹھے۔ یہ مثل اس وقت بولتے ہیں جب کوئی کام چار و ناچار کرنا ہی پڑے۔ یعنی کوئی بہت بڑی ذمہ داری آپڑے ورنہ ممکن نہ ہو۔

شرح : بھاری کام سر پر آپڑا ہے اور اسے پورا کرنے کی کوشش کیے بغیر چارہ نہیں۔ خودداری کے لیے دردِ سر پیدا ہو گیا۔ ایک طرف سبکباری ہے، جس نے بے بس کر رکھا ہے۔ دوسری طرف گراں جانی ہے جس نے بالکل مجبور بنا دیا ہے۔ ان حالات میں خودداری کا مقصد کیونکر پورا ہو؟

بظاہر کہنا یہ چاہتے ہیں کہ انسان کے لیے خودداری آزمائش ہے۔ ایک طرف وہ ہر چھوٹی بڑی مصیبت پر گھبرا جاتا ہے دوسری طرف اس میں دم [illegible] میں نہیں۔ بہرحال ہر انسان کے لیے لازم ہے کہ خودداری کی زندگی بسر کرے یہ کام بڑا کٹھن ہے۔ لیکن اسے پورا کرنے ہی میں انسان کی شان ہے۔

جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد
صحرا ہماری آنکھ میں اک مشتِ خاک ہے

شرح :
اے اسد، جوشِ جنون کا یہ عالم ہے

کہ ہمیں کچھ نظر نہیں آتا ۔ یہاں تک کہ یا بان بھی ہماری نگاہ میں خاک کی ایک مٹھی ہے۔
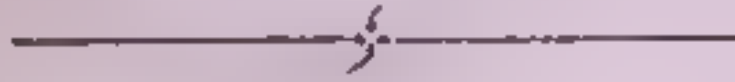
خطوطِ غالب
مولانا غلام رسول مہر نے
خطوطِ غالب کو قطعی نئے رجحانات کے ماتحت ترتیب دیا ہے۔ انھوں نے ادبی نکات کو اُبھار کر ہی نہیں بلکہ تحقیق فرمایا ہے۔ اس مجموعہ میں تمام خطوط تاریخ وار اور مکتوب الیہ کے نام کے ساتھ دیے گئے ہیں تاکہ مرزا صاحب کے ساتھ اُن کے تعلقات کی حیثیت بھی واضح ہو جائے۔
شیخ غلام علی اینڈ سنز —
لمیٹڈ، پبلشرز
199 سرکلر روڈ، چوک انارکلی
54000

جس میں وہ پیدا ہوا اور پرورش پائی اور اس گھر سے قطع تعلق کا تصور بھی نہیں کر سکتا، نہ کسی اور مکان کو اپنا مامن سمجھ سکتا ہے، یہی کیفیت زلف کے تعلق میں ہماری ہے۔ پھر ہم وفا کے پابند اور اپنے عہد پر قائم و استوار ہیں۔ کون سی وجہ ہے کہ ہم قید خانے سے گھبرا اٹھیں گے؟

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ زلفِ محبوب سے گہری اور ناقابلِ شکست وابستگی ہمارا شیوہ ہے۔ اس بنا پر ہمیں زنجیریں پہنا دی جائیں تو کچھ پروا نہیں۔ اسی طرح ہم وفا کے راستے پر قدم جمائے کھڑے ہیں اور قید سے ہمیں کوئی باک نہیں۔

اگر زلف کو کسی اعلیٰ مقصد کی لطیف تعبیر قرار دے لیا ہے تو پورا شعر دعوتِ جہاد بن جاتا ہے۔ یعنی اعلیٰ مقاصد سے سچا عشق رکھنے والوں کا شیوہ یہ نہیں کہ قید و بند سے ڈر جائیں یا گھبرا اٹھیں۔

۷۔ **لغات**۔ **معمورہ**: بستی۔ شہر آباد مقام یا زمین۔

شرح:۔ اے اسدؔ! دلّی میں تو غمِ عشق کا قحط پڑ گیا ہے، یعنی جس طرح قحط کے زمانے میں کھانے پینے کی جنسیں حد درجہ کمیاب ہو جاتی ہیں، اسی طرح یہاں عشق کی جنس کمیاب ہو چکی ہے۔ ہمیں غمِ عشق کا ایسا مزہ پڑ گیا ہے کہ اس کے سوا ہمارا گزارا ہو ہی نہیں سکتا۔ اب اس بستی میں ٹھہرے رہیں تو سوال یہ ہے کہ ہم کھائیں گے کیا اور زندہ کیونکر رہ سکیں گے؟

غم الفت یعنی غم عشق سے مراد کسی خاص محبوب کا عشق نہیں۔ یعنی یہ غم خاص نہیں بلکہ عام ہے، خواہ وہ اعلیٰ مقاصد کا عشق ہو، محبوب کا عشق ہو، ہم جنسوں کی باہم غمخواری، اخلاص اور ہمدردی ہو، غرض ہر چیز اس غم الفت میں شامل ہے۔ ظاہر ہے کہ جس بستی میں یہ جنس ناپید ہو، جو انسانیت کا زیور اور آدمیت کا جوہر ہے، وہاں رہ کر ہمارا گزارہ کس طرح ہوگا؟

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جئے ہم، تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا، کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تُو نہ توڑ سکتا۔ اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے، ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

۱۔ **شرح**: ہماری قسمت میں محبوب کا وصال تھا ہی نہیں، اچھا ہُوا کہ ہم مر گئے۔ اگر کچھ عرصہ اور جیتے رہتے تو وہ بھی اسی انتظار میں گزر جاتا۔

شعر سادگی اور حسنِ بیان کے اعتبار سے نہایت اچھا ہے۔ اس میں سے ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ اگر وصالِ یار مقدر نہ ہو تو زندگی سے موت ہی بہتر ہے۔ مشہور مثل ہے۔ الانتظار اشد من الموت یعنی انتظار موت سے بھی زیادہ سخت اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ انتظار اور وصلِ محبوب کا انتظار عاشق برداشت نہیں کر سکتا کیونکہ:

تیغِ رومی و خنجرِ ہندی
نہ کند آنچہ انتظار کند

پھر جب مقدر میں بھی نہیں تو لاحاصل انتظار کی زحمتیں اٹھانے سے کیا فائدہ؟

۲۔ **شرح**: اگر ہم تیری طرف سے وصل کا وعدہ سن کر بھی زندہ رہے تو یقیناً جان لے کہ ہم

ہوئے مر کے ہم جو رُسوا، ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا
اُسے کون دیکھ سکتا، کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دُوئی کی بُو بھی ہوتی، تو کہیں دو چار ہوتا
یہ مسائلِ تصوف! یہ ترا بیان غالبؔ!
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

نے اس وعدے کو کبھی سچا نہ سمجھا اگر سچا سمجھ لیتے اور اس پر ہمیں اعتبار ہوتا تو کیا خوشی کی فراوانی سے ہم پر شادی مرگ کی کیفیت طاری نہ ہو جاتی اور ہم جاں بحق نہ ہو گئے ہوتے؟

عاشق کے لیے محبوب کے وعدۂ وصل سے بڑھ کر خوشی کی کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی معلوم ہے کہ جس طرح لوگ رنج والم کی فراوانی برداشت نہ کر سکے اور مر گئے، اسی طرح ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ لوگوں کو اچانک انتہائی خوشی کی خبر پہنچی اور وہ خوشی میں آپے سے باہر ہو کر یا تو مر گئے یا دماغ میں خلل آگیا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ محبوب کے وعدۂ وصل پر اعتبار ہوتا تو سمجھ لینا چاہیے کہ ہمیں اس پیمانے پر خوشی حاصل ہوتی جو ہمارے ضبط وتحمل سے باہر ہوتی اور اس کا نتیجہ موت ہی ہو سکتا۔ چونکہ اصل وعدے کو جھوٹ سمجھا، اس لیے خوشی نہ ہوئی اور زندہ رہے۔

کہا گیا ہے کہ میلی ہروی نے اسی مضمون کا ایک شعر کہا ہے:

بیم از وفا مدار و بدہ وعدۂ کہ من
از ذوقِ وعدۂ تو بہ فردا نمی رسم

یعنی تو میرے ساتھ وصل کا وعدہ کرنے اور اسے پورا کرنے کا خوف دل سے نکال ڈال، کیونکہ تیرے وعدے سے جو خوشی ہوگی، وہ مجھے زندہ نہ رہنے دے گی۔

بلاشبہ ہروی نے وعدۂ وصل کو انتہائی خوشی کا موجب قرار دیا ہے، جس سے عاشق مر سکتا ہے، لیکن شعر کی عام صورت غیر طبعی ہے۔ یعنی محبوب سے یہ کہنا کہ تو وعدہ کرلے، میں اس خوشی میں مر جاؤں گا اور تجھے وعدہ پورا کرنے کی فرصت

نہ پڑے گی۔ فطری حالات سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتا۔ اُس وعدے سے شادی مرگ کیونکر ہو سکتی ہے، جس کے متعلق یقین ہو کہ اس کے پورا کرنے کی نوبت نہ آئے گی اور عاشق اس سے محظوظ ہو گا۔ غالب نے اس مضمون کو طبعی صورت دے دی کہ محبوب نے وعدہ کیا اور عاشق نے یقیناً سمجھ لیا کہ یہ وعدہ پورا نہ ہو گا، لہذا وہ خوشی ہی نہ ہوئی، جس کی فراوانی عاشق کو مار سکتی تھی۔ پھر کمال یہ ہے کہ یہ حقیقت بھی بطورِ اصول پیش نہیں کی، بلکہ متعجب ہو کر محبوب سے سوال کرتے ہیں کہ وعدے کا یقین ہوتا تو خود سوچ کر ہم زندہ رہ سکتے تھے؟ خوشی ہمیں ختم نہ کر دیتی؟

۲۔ **شرح** : محبوب سے خطاب ہے کہ تو سراپا نزاکت ہے، تیرا جسم نازک، تیرا مزاج نازک، اس حالت میں جو پیمان باندھا جاتا، وہ بہرحال نازک اور کمزور ہی ہو سکتا تھا۔ اگر وہ پیمان مضبوط اور محکم ہوتا تو تجھ ایسا پیکرِ نزاکت اسے ہرگز توڑ نہ سکتا۔

۴۔ **لغات۔ تیرِ نیمکش** : وہ تیر، جو کمان کو پورا نہیں، بلکہ آدھا کھینچ کر چھوڑا جائے۔ نشانہ جتنی دور ہوتا، اسی لحاظ سے کمان کھینچ کر تیر پھینکتے۔ اگر نشانہ بہت قریب ہوتا تو کمان کھینچنے پہ پورا زور صرف نہ کیا جاتا۔

خلش : کھٹک، چبھن۔

شرح : اے محبوب! تُو نے کمان آدھی کھینچ کر تیر پھینکا۔ وہ جگر میں پیوست ہو گیا۔ چونکہ اس پر زور کم صرف ہوا تھا۔ اس لیے جگر کو چھید کر باہر نہ نکل سکا، بیچ ہی میں اٹکا رہ گیا۔ اس کی خلش نے دل کو ایسا مزہ دیا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ اگر پورے زور سے تیر پھینکا جاتا اور وہ جگر کو چھیدتا ہوا باہر نکل جاتا تو زخم ضرور ہو جاتا، مگر مسلسل کھٹک نہ ہوتی۔ عاشق کے لیے مزہ اس کھٹک ہی میں ہے۔ "کوئی میرے دل سے پوچھے" کا جملہ لذّتِ خلش کی ایسی کیفیت واضح کر رہا ہے جس کا کوئی اندازہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔

۵۔ **شرح** : دوستی کا یہ کون سا طریقہ ہے کہ تمام دوست نصیحت گر بن گئے

ہیں۔ مجھے وعظ سناتے رہتے ہیں کہ تمھیں یہ نہ کرنا چاہیئے، وہ نہ کرنا چاہیے۔ نصیحت گری سے دوستی کا حق کیونکر ادا ہو سکتا ہے ؟ حقیقی دوستی کا تقاضا یہ تھا کہ کوئی مجھے آرام پہنچانے کی تدبیریں اختیار کرتا۔ میرے دل کے زخموں پر مرہم رکھتا۔ محبوب سے ملانے کا کوئی طریقہ سوچتا اور میرا غم غلط کرتا۔ تعجب یہ کہ دوستی کے یہ واضح صورطریقے چھوڑ کر جن سے میرے ساتھ دوستوں کی ہمدردی ظاہر ہوتی، انھوں نے نصیحتیں شروع کر دی ہیں، جو مجھے ناگوار گزرتی ہیں اور ان سے فائدہ بھی کچھ نہیں۔

۶۔ **شرح** :۔ غم ایسی جانگداز اور ہلاکت خیز چیز ہے کہ اگر یہ چنگاری بن کر پتھر کی رگوں میں داخل ہو جاتا تو اس سے یوں لہو بہنے لگتا کہ پھر رکے نہ رکتا۔ ظاہر ہے کہ جو چیز بے حس پتھر کی رگوں سے بھی لہو ٹپکا سکتی ہے، اس سے انسانی قلب پر کیا کچھ گزرتی ہوگی، جو سراپا احساس ہے۔

۷۔ **لغات۔ جانگسل** : جان کو ہلاک کر دینے والا، گھلا دینے والا۔

شرح :۔ غم یقیناً جان کو گھلا دینے والا، تباہ کر دینے والا اور ہلاکت کے گھاٹ اتار دینے والا ہے، لیکن کیا کریں کہ معاملہ دل سے آ پڑا ہے، اس لیے ہم غم سے بچ نہیں سکتے۔ فرض کر لیجیے کہ ہم نے عشق کا غم نہ لگایا۔ مگر دل کی فطرت وطبیعت ہی یہ ہے کہ کسی نہ کسی غم سے وابستگی کا رشتہ قائم رکھے۔ غم عشق نہ ہوگا تو وہ زمانے کے دوسرے غموں میں الجھ جائے گا۔ بہرحال دل غموں سے خالی نہیں رہ سکتا۔

شعر کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں ضمناً غم عشق کو برتر و بالا قرار دے کر اس کی طرف یہ کہہ کر بلایا گیا ہے کہ اگر یہ غم قبول نہ کروگے، تو دنیا کے دوسرے غموں میں مبتلا ہو جاؤ گے، مثلاً جان و مال کا غم، اہل و عیال کا غم، فراغت بال کا غم وغیرہ۔

۸۔ **شرح** ۔ میں شبِ غم کی کیفیت کہوں تو کس سے کہوں ؟ کوئی اہل ہی نظر نہیں آتا۔ گر نظر بھی آئے اور اس سے کہوں تو کیا کہوں ؟ اسے ٹھیک ٹھیک

بیان کرنے کا انداز کہاں سے لاؤں؟ بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ نہایت بڑی بلا ہے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ ایک ایک لمحہ جانکنی میں گزر رہا تھا۔ ہر سانس میں موت کی کیفیت مجھ پر گزرتی تھی۔ مرنے سے میں نہیں ڈرتا تھا، بشرطیکہ ایک ہی بار موت آتی اور میں ختم ہو جاتا، لیکن یہاں ایک ایک لمحہ موت کے مُنہ میں گزرتا رہا۔ نہ مخلصی کی کوئی صورت تھی، نہ موت کی تکلیفوں میں کوئی کمی نظر آتی تھی۔ ایک بار مر جانا بُرا نہ تھا، مگر شبِ غم نے تو مجھے ایسی حالت میں مبتلا کر رکھا تھا، گویا ہر آن موت کی تمام تکلیفیں مجھ پر طاری ہو رہی تھیں، لیکن جان نہیں نکلتی تھی۔ جان نکل جاتی تو یہ لمحہ بہ لمحہ مرنے کی تکلیفیں سہنے سے رہائی پا جاتا۔

دیکھیے، شاعر کا کمال کہ شبِ غم کے متعلق حقیقۃً کچھ نہیں کہا، مگر جو کچھ کہا جا سکتا تھا، وہ کہہ گیا۔ لفظوں میں ایسی تصویر کھینچ دی کہ کوئی بھی پہلو چھپا نہ رہا۔ پھر یہ کہ ایک بار موت آ جاتی تو مجھے اس کے لیے تیار ہونے میں کیا مضایقہ تھا۔ اس میں شبِ غم کی پوری کیفیت سامنے آ گئی۔

۹۔ **شرح**:۔ مرنے کے بعد ہماری جو رسوائی ہوئی، اس سے کہیں بہتر تھا کہ دریا یا سمندر میں ڈوب جاتے تاکہ نہ جنازہ اٹھانے کی نوبت آتی اور نہ کہیں دفن ہوتے۔

ظاہر ہے کہ رسوائی کا نقشہ شاعر نے دوسرے مصرع میں پیش کیا ہے، یعنی جنازہ اٹھا تو کوئی ساتھ نہ تھا اور بیکسی کے سوا کسی کی رفاقت حاصل نہ تھی۔ تربت بنی تو اس پر کوئی چراغ جلانے والا یا اس کی دیکھ بھال کرنے والا نہ تھا۔ اس رسوائی سے محفوظ رہنے کا صرف ایک پہلو شاعر کو نظر آیا اور وہ یہ کہ ڈوب کر مر جاتا۔

مرزا نے مرنے کے بعد بیکسی کی ایک تصویر اور بھی کھینچی، جو اس سے کم حسرت ناک نہیں اور اس تصویر کی طرح وہ بھی خیالی و قیاسی نہیں، بلکہ عین حقیقت پر مبنی ہے، یعنی:

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور　　رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

جس طرح دریا یا سمندر میں ڈوب مرنے سے بے کسی کا ہر پہلو چھپا رہ سکتا تھا اسی طرح وطن سے باہر کسی اجنبی ملک میں مرجانے سے بھی یہ مقصد پورا ہو سکتا تھا کیونکہ مسافر کے وطن یا اس کی حیثیت یا اس کے عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں کی حیثیت سے کوئی آگاہ نہیں ہوتا۔

۱۰۔ **لغات** ۔ یگانہ : واحد۔ اکیلا۔ ایک

یکتا : بے مثل، بے نظیر۔

دُوئی : وحدت کی ضد، دو ہونا (ایک کے بجائے) کسی کا خدا کے ساتھ شریک ہونا۔

دوچار ہونا : دکھائی دینا، نظر آنا۔

شرح :۔ خدا کو کون دیکھ سکتا ہے، کیونکہ وہ تو اپنی ذات میں اکیلا اور بے مثل ہے۔ اُس جیسا دوسرا وجود کوئی نہیں۔ اگر اس میں دوئی کا خفیف سا شائبہ بھی ہوتا تو ضرور کہیں نہ کہیں نظر آجاتا، لیکن اُس کی ذات تو غیریت اور دوئی سے بہت بالا ہے۔ پھر اسے ظاہری آنکھوں سے کون دیکھ سکتا ہے؟

۱۱۔ **شرح** :۔ اے غالب! تو تصوّف اور روحانیت کے مسئلے پیش کرتا ہے۔ پھر تیرا اندازِ بیان اتنا دلکش و دلآویز ہے کہ جو کچھ تُو کہتا ہے، وہ دل میں اتر جاتا ہے۔ یہ تو ولیوں کی سی باتیں ہیں۔ اگر تو شراب نوش نہ ہوتا تو ہم تجھے بھی ولی سمجھ لیتے۔

مرزا نے پہلے مصرع میں اپنی جو خصوصیتیں بیان کی ہیں، انھیں خود ستائی یا سخن طرازی نہ سمجھنا چاہیئے۔ یہ وصف ان کے کلام میں بدرجۂ اعلیٰ موجود تھے۔ محض تصوّف کے مسائل ہی نہیں، بلکہ حکمت و فلسفہ اور عام معاملاتِ محبّت بھی وہ ایسے نادر انداز میں پیش کرتے تھے، جس کی کوئی مثال مشکل سے ملے گی اور یہ جوہر ان میں فی الواقع موجود تھا۔

خواجہ حالؔی فرماتے ہیں : "بیان کیا جاتا ہے، ابوظفر بہادر شاہ ثانی نے

مرزا کی اس غزل کا مقطع سنا تو کہا: بھئی ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے، یعنی تم شراب نوش نہ ہوتے اور ایسے ہی مسائل اسی انداز میں بیان کرتے، جب بھی تمہیں ولی نہ مانتے۔" مرزا نے معاً کہا: حضور تو اب بھی مجھے ولی ہی سمجھتے ہیں مگر یہ اس لیے ارشاد ہوا کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں۔

○

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا؟ | نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا؟
تجاہل پیشگی سے مدّعا کیا؟ | کہاں تک، اے سراپا ناز کیا کیا
نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں | شکایت ہائے رنگیں کا، گلا کیا؟
نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں | تغافل ہائے تمکیں آزما کیا
فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے | ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا
نفس موجِ محیطِ بے خودی ہے | تغافل ہائے ساقی کا گِلا کیا
دماغِ عطر پیراہن نہیں ہے | غمِ آوارگی ہائے صبا، کیا
دلِ ہر قطرہ ہے، سازِ انا البحر | ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
محابا کیا ہے، مَیں ضامن اِدھر دیکھ | شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا؟
سُن! اے غارت گرِ جنسِ وفا سُن! | شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا؟
کیا کس نے جگر داری کا دعوےٰ | شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا

یہ قاتل وعدہ صبر آزما کیوں   یہ کافر فتنہ طاقت ربا کیا ؟

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات   عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

۱۔ **لغات** ۔ نشاطِ کار : کام کرنے کی اُمنگ ، سعی وجہد کا جذبہ ۔

شرح :۔ خواجہ حالی اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"جہاں تک معلوم ہوا ہے، یہ ایک نیا خیال ہے اور نرا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے ، کیونکہ دنیا میں جو کچھ چہل پہل ہے ، وہ صرف اس یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے ۔ یہ انسان کی طبعی خصلت معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر فرصت قلیل ہو ، اسی قدر زیادہ سرگرمی سے کام کو سرانجام کرتا ہے اور جس قدر زیادہ مہلت ملتی ہے ، اسی قدر کام میں تاخیر اور سہل انگاری زیادہ کرتا ہے ۔"

مطلب یہ ہوا کہ کام کرنے کا جوش اور ولولہ صرف اس وجہ سے ہے کہ موت سر پر کھڑی ہے ، معلوم نہیں ، کب آجائے ، اس لیے انسان کی ہوس چاہتی ہے ، تمام کام جلد سے جلد پورے کرے ۔ گویا دنیا میں جو چہل پہل ہے ، وہ انسان کی ہوس کا نتیجہ ہے اور ہوس کی تمام سرگرمیاں اس پر موقوف ہیں کہ زندگی کے دن تھوڑے ہیں ۔ اس سے ثابت ہوا کہ زندگی کی پوری رونق اور لطف و لذت صرف موت کا نتیجہ ہیں ۔ مرنا نہ ہوتا تو جینے میں کچھ مزہ نہ رہتا ، کیونکہ ساری چہل پہل ختم ہو جاتی ، جوش و سرگرمی کا ہنگامہ ٹھنڈا پڑ جاتا ۔

انسان کے جوش و ولولہ کو ہوس سے تعبیر کرنے کا مقصد غالباً یہ ہے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے ، وہ انسان کی خام آرزوؤں اور امیدوں کا کرشمہ ہے ۔

۲ ۔ **لغات** ۔ تجاہُل پیشگی : جان بُوجھ کر انجان بننے کی عادت ۔

شرح :۔ اے محبوب ! تم واقعی سراپا ناز ہو ۔ تمھاری ہر بات ایک ادا اور کرشمہ ہے ، لیکن یہ تو بتاؤ کہ جان بوجھ کر انجان بننے کی عادت سے تمھارا

مقصد کیا ہے ؟ میں جب کبھی اپنا دکھ درد بیان کرتا ہوں اور دل کا حال سناتا ہوں تو کہہ دیتے ہو" کیا کہا ؟" اور کوئی بھی بات توجہ سے نہیں سنتے۔ اس سے آخر تمہارا مدعا کیا ہے، تغافل کی کوئی وجہ اور سبب تو بتاؤ ؟

۳۔ شرح :۔ اے محبوب ! میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میرے رقیبوں اور حریفوں پر ایسی نوازشیں اور ایسی مہربانیاں کر رہے ہو جن کے وہ ہرگز مستحق نہیں۔ ایسی عنایتیں تو صرف مجھ پر ہونی چاہیے تھیں، جو سچا عاشق ہے۔ میں وہ بے موقع اور بے محل مہربانیاں دیکھ کر محبت بھرے انداز میں شکایت کرتا ہوں تو تم گلہ شکوہ شروع کر دیتے ہو، جب تمہیں بیجا نوازشوں کا کچھ خیال نہیں تو میری محبت پر شکایت و گلہ کیوں کرتے ہو ؟

شاعر نے محبت بھری شکایتوں کو شکایت ہائے رنگیں قرار دیا، کیونکہ عاشق کی طرف سے ہر شکایت محبت ہی کا کرشمہ ہوتی ہے۔ یہ مقصد نہیں ہوتا کہ محبوب سے تعلق توڑ لیا جائے۔ ایسی بات سچے عاشق کے خیال میں کبھی نہیں آسکتی۔

۴۔ لغات ۔ بے محابا : بے تکلف، بے حجاب، بے خوف ۔

تغافل ہائے تمکین آزما : جان بوجھ کر ایسی بے پروائی اختیار کرنا، جس کا مدعا یہ ہو کہ عاشق کے صبر و شکیب کا امتحان لیا جائے۔

شرح :۔ اے محبوب ! تمہارا شیوہ یہ ہو گیا ہے کہ مجھ سے تغافل برتو۔ مجھ پر توجہ نہ کرو اور بے پروائی سے کام لیتے رہو۔ اس طرح تم چاہتے ہو کہ میرے صبر و استقلال کو آزمایا جائے۔ امتحان لیا جائے کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔ یہ کیوں سمجھتے ہو کہ اس طرح میرے استقلال کا پیمانہ چھلک جائے گا اور میں اپنی قوت برداشت کھو بیٹھوں گا۔ اگر تم مجھے تڑپانا اور لوٹنا ہی چاہتے ہو تو تغافل چھوڑ دو اور ایک بھرپور بے باک نگاہ مجھ پر ڈالو۔

۵ ۔ لغات : فروغ : حرارت، گرمی، روشنی

شعلۂ خس : وہ شعلہ، جو تنکا جلنے سے اٹھتا ہے۔ معلوم ہے کہ تنکا ایک

لمحے ہی جل بجھتا ہے اور شعلہ بھی جلد سے جلد ختم ہو جاتا ہے۔

ہَوَس : یہاں مراد رقیب سے ہے۔

شرح : جو شعلہ تنکے کے جلنے سے اٹھتا ہے اس کی حرارت اور روشنی کی مدت ایک سانس سے زیادہ نہیں۔ یہی حالت ان رقیبوں کے دعوائے عشق کی ہے جنھیں محبت سے کوئی علاقہ نہیں، البتہ ہوس سے ان کے سینے بھرے ہوئے ہیں۔ اے محبوب! ایسے لوگوں سے آپ کیونکر امید رکھ سکتے ہیں کہ وہ وفاداری کی عزت کا پاس کریں گے۔ عشق میں وفاداری اور ثابت قدمی تو سچے عاشقوں کا کام ہے۔ رقیبوں سے ایسی توقع کیونکر ہو سکتی ہے؟

۶۔ **شرح** :- اگر ساقی نے ہم سے بے پروائی اور بے نیازی اختیار کر رکھی ہے اور شراب نہیں دیتا تو ہم شکایت کیوں کریں، جب ہمارا سانس مستی و بے ہوشی کے سمندر کی لہر بنا ہُوا ہے؟ یعنی ہم تو عشق ہی کی مستی میں گم ہیں، ہمیں ساقی کی بے پروائی کا کیا گلہ ہو سکتا ہے؟

۷۔ **لغات** ۔ **دماغ نہ ہونا** : برداشت نہ ہونا۔ گوارا نہ ہونا۔

شرح :- ہمیں پیراہن کی خوشبو سونگھنا گوارا ہی نہیں، اس لیے اگر صبا اُس خوشبو کو اِدھر اُدھر اڑائے پھرتی ہے، تو ہمیں اس کا کیا غم ہو سکتا ہے اور ہمارے لیے شکایت کی کون سی وجہ ہے؟

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں کس کے پیراہن کی بُو کا ذکر ہے؟ اگر پیراہن محبوب مراد لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم محبوب کے طلب گار ہیں، پیراہن محبوب کی خوشبو کے نہیں۔ یہ خوشبو ہمارے لیے ہرگز وجہ تسکین نہیں ہو سکتی۔ صبا بیشک اسے ہر طرف اڑائے لیے پھرے، ہمیں اس سے کیا؟ یہاں عرفیؔ کا ایک ایسا ہی شعر یاد آگیا، کہتا ہے:

قانع بہ بوے دوست نہ گردید ذوقِ ما
ایں جنس را بہ مفلسِ کنعاں فروختیم

یعنی ہم دوست کی خوشبو پر قناعت نہیں کر سکتے۔ یہ جنس ہم نے حضرت یعقوبؑ کے حوالے کر دی جو پیراہنِ یوسفؑ کی خوشبو پر خوش ہوئے تھے۔ غالب کے اس شعر کا مدعا بھی یہی ہو سکتا ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ محبوب کا پیراہن جس عطر میں بسایا گیا ہے، وہ رقیب کا عطر ہے۔ گویا محبوب رقیب کے گھر گیا اور وہاں اس کے پیراہن کو عطر لگا دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ عاشق کو یہ عطر اور یہ خوشبو کبھی پسند نہیں آسکتی۔ صبا کا خاصہ ہی یہ ہے کہ خوشبو اپنے دامن میں سمیٹ کر جا بجا بکھیرتی رہتی ہے۔ شاعر نے اس کے دَور دسیر کو آوارگی سے تعبیر کیا، جو بظاہر اک گونہ حقارت آمیز تعبیر ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ محبوب کے لباس کو جو عطر لگایا گیا، وہ عاشق کے لیے انتہائی ناپسندیدگی کا باعث تھا۔

۸۔ **لغات۔** انا البحر : میں سمندر ہوں۔

شرح :۔ ہر قطرے کا دل انا البحر کا ساز بنا ہوا ہے، یعنی ہر قطرے کے اندر سے صدا اٹھ رہی ہے کہ میں سمندر ہوں، مجھے حقیر چیز نہ سمجھنا چاہیے۔ اسی طرح ہماری انفرادی ہستی کو بھی معمولی نہ جانو، ہماری عظمت کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ جزو ہونے کے باوجود ہم جس کُل سے تعلق رکھتے ہیں، اس کی عظمت پوری کائنات پر چھائی ہوئی ہے۔ گویا قطرے کو جو نسبت سمندر سے ہے، وہی نسبت ہر وجود کو اس کے مبدء سے ہے۔

۹۔ **لغات۔** محابا : خوف۔

خوں بہا : خون کی قیمت۔ زمانۂ قدیم میں دستور تھا کہ قاتل مقتول کے وارثوں کو خون کی رقم ادا کر دیتا تھا۔ اسے دیہ بھی کہتے ہیں۔

شرح :۔ اے محبوب! تجھے خوف کس بات کا ہے؟ آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھ۔ میں ذمہ دار ہوں کہ تجھ سے کوئی بازپرس نہ ہوگی۔ بھلا یہ تو سوچ، زیادہ درست کے شہیدوں کا بھی کوئی خوں بہا ہوتا ہے؟

کسی کو قاتل ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس نے مقتول پر ضرب کا کوئی آلہ استعمال کیا ہو۔ تلوار یا خنجر یا کوئی اور چیز نگاہ ایسی چیز نہیں، جو آلۂ ضرب سمجھی جا سکے، لہذا شاعر نے بے تکلف کہا کہ اے محبوب! اگر تیرے ایک نظر دیکھ لینے سے میں یا کوئی دوسرا شہید ہو جائے تو تجھ پر خون کی قیمت ادا کرنے کی کوئی ذمہ داری نہ ہوگی۔

اِدھر دیکھ میں ایک پہلو صرف تنبیہ کا ہے، دوسرا پہلو یہ ہے کہ میری طرف دیکھ۔ گویا عاشق محبوب سے نگاہِ التفات کا طلب گار ہے اگر اس وجہ سے شہید بھی ہو جائے تو وہ خود ذمہ دار ہو کر محبوب کو یقین دلاتا ہے کہ اطمینان رکھ اس کے لیے کوئی فدیہ طلب کیا ہی نہیں جا سکتا۔

۱۰۔ **لغات۔ شکستِ قیمت** : فارسی میں اس کا مطلب یہ ہے، بھاؤ کم ہو جانا، قیمت گھٹ جانا۔

شرح :۔ اے دنیا کی جنس کو لوٹ لے جانے والے محبوب! سن اور توجہ سے سن کہ میرے دل کی قیمت تو اسی جنس کی بدولت تھی۔ یہ جنس غارت ہوئی تو دل کی کوئی قیمت ہی نہ رہی۔ اب تجھے کس بات کا خوف ہے؟ یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر چیز کے ٹوٹنے سے کوئی نہ کوئی آواز نکلتی ہے، لیکن قیمتِ دل کی شکست کی کوئی آواز نہیں۔

بعض نسخوں میں "قیمتِ دل" کی جگہ "شیشۂ دل" درج ہے اور اس کا مطلب یہ سمجھا گیا ہے کہ محبوب کو شیشۂ دل توڑنا یعنی دل شکنی کرنا پسند ہے، اس لیے اسے دعوت دی گئی ہے کہ شیشۂ دل توڑتا رہ۔ لیکن صحیح "شیشۂ دل" نہیں، بلکہ "قیمتِ دل" ہی ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ عاشق کے دل کی سب سے بڑی متاع محبوب کے ساتھ وفا اور عشق میں ثابت قدمی کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔

۱۱۔ **لغات۔ جگر داری** : حوصلہ۔ استقلال۔ ہمت۔

شکیب : صبر۔

شرح : اے محبوب! تُو میرے حوصلے اور استقلال کی آزمائش کر رہا ہے۔ ذرا یہ تو سوچ، میں نے ہمت اور ثابت قدمی کا دعویٰ کب کیا؟ اگر میں ایسا دعویٰ کرتا تو واقعی امتحان لینا بالکل بجا ہوتا۔ بھلا عاشق کے دل کو صبر و سکون سے کیا واسطہ؟

اس مقام میں شیخ سعدیؒ کا شعر نہایت دلاویز ہے:

دلے کہ عاشق و صابر بود، مگر سنگ است
زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است

یعنی جس دل میں عشق ہو اور وہ صبر سے کام لینے کا بھی دعوےٰ کرے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ دل نہیں، پتھر کا ٹکڑا ہے۔ عشق اور صبر کے درمیان ہزاروں میل کی مسافت ہے، یعنی وہ ایک دوسرے سے اتنے دور ہیں کہ اکٹھے ہو ہی نہیں سکتے۔

۱۲۔ **شرح** :۔ اے قاتل! یعنی محبوب! تُو ایسا وعدہ کیوں کرتا ہے، جو صبر کو آزمائش میں ڈال دیتا ہے۔ یعنی قدم قدم پر صبر کا امتحان ہوتا ہے۔ اے کافر! یعنی محبوب! وہ فتنہ کیوں برپا کرتا ہے، جو ہماری قوت و طاقت ہی چھین لے جانے والا ہے۔

۱۳۔ **شرح** : اے غالبؔ! محبوب کی ہر بات میرے لیے بلائے جاں ہے' یعنی سخت اضطراب و پریشانی کا باعث ہے، گویا جان لیوا ہے۔ خواہ اس کی باتیں (تحریری یا زبانی) ہوں یا اشارے کنایے ہوں یا ادائیں ہوں۔

○

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

۱۔ **لغات**۔ درخور: لائق۔ قابل۔ شایاں۔

شرح۔ جب محبوب کے

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں، کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہُوا

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
رُو برُو کوئی بتِ آئنہ سیما نہ ہُوا

کم نہیں، نازشِ ہم نامیٔ چشمِ خوباں
تیرا بیمار، بُرا کیا ہے، اگر اچھا نہ ہُوا

سینے کا داغ ہے وہ نالہ، کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ جو دریا نہ ہُوا

نام کا میرے ہے وہ دُکھ، کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہُوا

ہر بُنِ مُو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوں ناب
حمزہ کا قصہ ہُوا، عشق کا چرچا نہ ہُوا

قطرے میں، دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہُوا، دیدۂ بینا نہ ہُوا

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہُوا

عتاب اور ستم کے لائق ہم جیسا اور کوئی نہیں تو ہمارا یہ کہنا کیونکر غلط قرار دیا جا سکتا ہے کہ ہمارا ہمسر کوئی پیدا ہی نہیں ہُوا؟

شعر کی یہ تشریح عشقِ مجازی کے مطابق ہے، حقیقت کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو اس میں انسان کو اشرف المخلوقات ثابت کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ پوری کائنات میں صرف ہم یعنی انسان ہیں، جن سے اعمال کی پوچھ گچھ ہو گی اور گنہگار عذاب کے سزاوار ہوں گے۔ پھر ہمارے اس دعوے کو کون غلط ثابت کر سکتا ہے کہ ہم خدا کی مخلوق میں سب سے افضل ہیں اور ہم جیسا دوسرا کوئی نہیں؟

۲ - لغات - بندگی: عبودیت۔ فرمانبرداری۔ عبادت

خودبیں: صرف اپنے آپ پر نظر رکھنے والا۔ اس کے معنی مغرور و خود پسند بھی ہیں، لیکن یہاں مراد ہے۔ خوددار، اپنی عزت کا پاس کرنے والا، اپنا وقار قائم

رکھنے والا۔

شرح :۔ عبادت اور فرمانبرداری میں بھی ہماری آزادہ روی اور خودداری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ حالت یہ ہے کہ ہم کعبے کی زیارت کے لیے جائیں اور دروازہ بند پائیں تو وہیں سے لَوٹ آئیں گے۔ یہ گوارا نہ ہوگا کہ کسی سے دروازہ کھول دینے کی استدعا کریں۔

جو شخص دین اور عبادت میں بھی اتنا آزاد و خوددار ہے کہ کعبے کا دروازہ کھلنے کا انتظار گوارا نہیں کرتا اور نہ کسی سے درخواست گزار ہوتا ہے کہ دروازہ کھول دیا جائے، ظاہر ہے کہ دنیوی کاموں میں بھی وہ کتنا باوقار اور عزّتِ نفس کا پاسدار ہوگا۔

شعر کی دو خوبیاں خاص توجہ کی محتاج ہیں۔ اوّل یہ کہ خانۂ کعبہ کا دروازہ عموماً بند رہتا ہے اس کے کھلنے کے خاص اوقات مقرر ہیں۔ دوم یہ کہ اس آزادگی اور خودداری کے باوجود فرمانبرداری کی شان قائم رکھی کہ کعبے سے لوٹ آئے، مگر کسی دوسرے گھر یا عبادت خانے کا رخ نہ کیا۔

ایسے ہی نادر اشعار مرزا غالبؔ کی عظمت کے روشن نشان ہیں۔ خودداری کے سلسلے میں فارسی کا ایک شعر بھی قابلِ ذکر ہے، مرزا کہتے ہیں :

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم
گر بہ موج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

یعنی اگر دریا کی لہریں دیکھ کر میرے دل میں یہ شبہ بھی گزر جائے کہ دریا نے مجھے دیکھ کر پیشانی پر بل ڈال لیے ہیں تو میری غیرت کا یہ عالم ہے کہ پیاسا ساحل پر جان دے دوں گا، مگر حلق تر نہ کروں گا۔

۳۔ **لغات** :۔ آئنہ سیما : آئینے جیسی روشن پیشانی والا۔

شرح :۔ حسن میں تیرے بے مثال و یکتا ہونے کا دعوےٰ سب تسلیم کیے بیٹھے ہیں۔ اور اس سے کسی کو اختلاف کی جرأت نہیں۔ یہی سبب ہے کہ آئینے جیسی روشن پیشانی والا کوئی محبوب تیرے مقابل آنے کی جرأت نہیں کرسکا۔

شعر کی خوبی یہ ہے کہ آئینے جیسی روشن پیشانی والا کوئی محبوب سامنے آتا تو اس میں محبوب حقیقی کے حسن کا عکس نمایاں ہو جاتا اور اس طرح اس کی یکتائی اور بے مثالی قائم نہ رہتی۔ ایسے محبوبوں کا مقابل آنے کی جرأت نہ کر سکنا شاہد حقیقی کی یکتائی کی روشن دلیل ہے۔

۴۔ **لغات۔ نازش** : فخر۔ شرف۔

ہمنامی چشم خوباں : محبوبوں کی آنکھ کا ہمنام ہونا یعنی بیمار ہونا۔ چشم محبوب کی ایک صفت بیمار بھی ہے۔ چشم بیمار یعنی نشیلی اور خمار آلود آنکھ۔

اچھا نہ ہوا : تندرست نہ ہوا۔

شرح :۔ تیرا بیمار تندرست نہ ہو سکا اور صحت نہ پا سکا تو اس میں کیا برائی ہے؟ کیا یہ شرف اور یہ فخر کم ہے کہ اسے محبوبوں کی آنکھ کی ہمنامی کا مرتبہ مل گیا؟ یعنی ان کی آنکھ کو چشم بیمار کہتے ہیں تو میں بھی بیمار ہوں۔

۵۔ **شرح** :۔ جو نالہ دل سے اٹھ کر لب تک نہ پہنچا، وہ سینے کا داغ ہے یعنی سینے کے لیے باعث ننگ ہے۔ جو قطرہ دریا نہ بنا، وہ خاک میں مل کر جذب ہو جائے گا۔

مطلب یہ ہے کہ جو شے اپنے مقصد تک نہ پہنچ سکے، وہ حقیقت کھو بیٹھتی ہے اور مٹ کر رہ جاتی ہے۔ نالے کا مقصد یہ ہے کہ وہ لب تک پہنچے، یعنی بلند ہو۔ قطرے کی غرض و غایت یہ ہے کہ وہ دریا میں شامل ہو کر دریا بن جائے۔ اگر نالہ گھٹ کر سینے کے اندر رہ جائے تو وہ اپنی حقیقت کھو کر سینے کا داغ بن جائے گا۔ اسی طرح جو قطرہ دریا میں شامل نہ ہو کر اپنی حقیقت سے محروم ہو جائیگا، اسے مٹی اپنے اندر جذب کر لے گی۔

۶۔ **شرح** :۔ جو دکھ درد اور رنج و غم کسی کو نہ ملا، وہ میرے لیے مقدر ہے اور جو فتنہ آج تک کہیں برپا نہ ہوا، وہ میرے کاروبار کے لیے وقف کر دیا گیا۔ یعنی دنیا بھر کے انوکھے دکھ مجھے ملے اور دنیا بھر کے انوکھے فتنے میرے پیچھے

لگا دیے گئے۔

۷۔ **لغات۔ بُنِ مو :** ہر بال کی جڑ۔

حمزہ کا قصّہ : ایک قصّہ ہے، جسے داستانِ امیر حمزہ کہتے ہیں، لیکن امیر حمزہؓ سے اسے کوئی تعلق نہیں، اس میں حمزہ، عمرو عیّار اور لقا وغیرہ مشہور کردار ہیں۔ لوگ عموماً دلچسپی اور تفریح کے لیے یہ داستان سنا کرتے ہیں۔ مجلس میں ایک شخص پڑھتا رہتا ہے اور باقی سب ہمہ تن گوش بنے رہتے ہیں۔

شرح : کہیں یہ ممکن ہے کہ عشق کی کیفیت بیان کرنے پر ہر بال کی جڑ سے خالص خون نہ ٹپکنے لگے؟ اگر ایسا ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ عشق کی داستان نہیں بلکہ حمزہ کا قصّہ ہے، جسے لوگ تفریحاً سنتے اور ایک ایک واقع پر سر دھنتے ہیں۔

۸۔ **لغات۔ دِجلہ :** عراق کا مشہور دریا، جو بغداد کے درمیان سے گزرتا ہے اور شہر اس کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔

دیدۂ بینا : دیکھنے والی آنکھ۔ حقیقت پہچان لینے والی آنکھ۔

شرح : حقیقت پہچان لینے والی آنکھ کا وصف یہ ہے کہ وہ قطرے میں دریائے دجلہ اور جزو میں کُل کا اندازہ کر لیتی ہے اگر ایسا نہ ہو تو اسے عارف کی حقیقت رس آنکھ نہیں، بلکہ بچّوں کا کھیل سمجھنا چاہیے۔

دجلہ یا کوئی دریا حقیقت میں کیا ہے؟ محض قطروں کا مجموعہ ہے جو اکٹھے ہو کر بہتے ہیں تو دریا کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، البتہ یہ حقیقت صرف عارفوں کی چشمِ بینا دیکھ سکتی ہے اور اسی کو جزو میں کل نظر آ سکتا ہے۔

۹۔ **شرح :** یہ خبر زور شور سے پھیلی ہوئی تھی کہ آج غالب کے پرزے اڑائے جائیں گے، یعنی اسے سخت سزا دی جائے گی۔ ہم بھی یہ تماشا دیکھنے کے لیے پہنچے، مگر افسوس کہ اس کی نوبت نہ آئی۔

اسدؔ! ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں
کہ ہے سر پنجہ مژگانِ آہو، پشتِ خار اپنا

لغات:
جنوں جولاں: دیوانگی کی حالت میں چکر لگانے والا۔ وہ شخص جو دیوانہ ہو اور ادھر ادھر بھاگ دوڑا پھرے۔

گدائے بے سروپا: وہ درویش جس کے پاس کوئی سروسامان نہ ہو۔

سر پنجہ: پنجہ کا مزید علیہ۔ فارسی میں ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ کسی لفظ پر کوئی دوسرا لفظ بڑھا دیتے ہیں، اس سے معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا، مثلاً منزل کا مزید علیہ سر منزل۔

پشت خار: پیٹھ کھجانے کا آلہ۔ لوہے یا پیتل یا چاندی کی، ایک چیز ہتھیلی کی شکل کی ہوتی ہے۔ اس میں ایک ڈنڈی لگا لیتے ہیں۔ اس سے امیر یا غریب ضرورت کے وقت پیٹھ کھجا لیتے ہیں۔

شرح: اے اسد! ہم بے سروسامان فقیر ہیں اور دیوانگی کی حالت میں دشت و بیاباں کے چکر لگا رہے ہیں، بے سامانی کا یہ عالم ہے کہ ہمارے پاس پیٹھ کھجانے کا آلہ بھی نہیں۔ ہمیں ہرن کی مژگاں کا پنجہ ضرورت کے وقت یہ کام دے دیتا ہے۔

شعر مرزا غالب کے ابتدائی دور کا ہے، جب وہ زیادہ تر خیالی مضامین باندھا کرتے تھے۔ اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ جنون کی حالت میں دشت نوردی کرتے ہوئے اتنے تیز چلے جا رہے ہیں کہ ہرن بھی، جو چوکڑیاں بھرنے میں مشہور ہیں، پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی مژگاں پشت خار کا کام دیتی ہیں۔

پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

۱۔ لغات۔ کرم: یہاں اس سے مراد کریم ہے یعنی صاحب کرم و بخشش، خدا۔

نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بے وفائی کا
بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

زکاتِ حسن دے، اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو، کاسہ گدائی کا

نہ مارا جان کر بے جرم، قاتل تیری گردن پر
رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا

تمنائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے
مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی ہے

وہی اک بات ہے جو یاں نفَس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو، زنجیرِ رسوائی
عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بے وفائی کا

نہ دے نامے کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں، عرضِ ستم ہائے جدائی کا

شرمِ نارسائی : خدا کے قرب میں نہ پہنچ سکنے کی شرم، یعنی خدا نے جو حکم دیے تھے، انھیں پوری طرح بجا نہ لانے کی ندامت۔

بخوں غلطیدۂ صد رنگ : سو طرح خون میں لتھڑا ہوا، یعنی سیکڑوں گناہوں کے باعث خون میں لت پت۔

شرح :- میں رحیم و کریم خدا کی بارگاہ میں ایک تحفہ لایا ہوں۔ وہ تحفہ کیا ہے؟ شرم اور ندامت کا تحفہ ہے، کیونکہ جو حکم خدا نے دے رکھے تھے، وہ مجھ سے پورے نہ ہو سکے۔ ضروری کام پورے نہ ہونے کا نتیجہ شرم و ندامت کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ اس کی مثال یوں سمجھنی چاہیے کہ میں پارسائی کا دعویٰ کر رہا ہوں، لیکن وہ دعویٰ سو سو طرح خون میں لت پت ہے اور اس خون کے ذمہ دار میرے گناہ ہیں۔ یہی گناہ آلودہ زندگی تھی جس نے مجھے خدا کی بارگاہ میں پہنچنے نہ دیا، اس لیے شرم و ندامت کے ساتھ اس اُمید پر حاضر ہوا ہوں کہ وہ صاحب کرم و بخشش مجھے اپنی رحمت سے

معاف کر دے گا۔

۲۔ **لغات** ۔ **تماشا دوست** : جسے نمود و نمائش پسند ہو۔ جو اس امر کا مشتاق ہو کہ دنیا اسے دیکھے ۔

شرح :۔ اس شعر کے مطلب دو ہو سکتے ہیں :

۱۔ حسنِ حقیقی کا جلوہ ہر شے میں موجود ہے اور وہ اس امر کا مشتاق ہے کہ دنیا اُسے دیکھے ۔ ہر ایک کی نگاہ اس پر جمی ہوئی ہے، لیکن اس پر بے وفائی کا الزام عائد نہیں ہو سکتا، بلکہ دیکھنے والوں میں سے ہر ایک کی نظر اس کی پاکیزگی اور پارسائی کے لیے ایک مُہری دستاویز ہے۔ جس حُسن کی پاکیزگی کے لیے بے شمار مہری دستاویزیں موجود ہوں، اس کے لیے نمود و نمائش کی پسند کے باوجود کون بے وفائی کا خیال دل میں لا سکتا ہے ۔

۲۔ اگر شعر کو مجازی معنی میں لیا جائے تو اس کی حیثیت طنز کی ہے، یعنی جو حُسن خود اس امر کا طلبگار ہے کہ اسے دیکھا جائے ۔ جو ہر وقت تاک جھانک کا مرکز ہے اور اس پر سیکڑوں نگاہوں کی مُہریں لگی ہوئی ہیں۔ باایں ہمہ بیوفائی کی رسوائی سے بچنا چاہے اور پارسائی کا مدعی ہو تو اس کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے ؟ مان لینا چاہیئے کہ وہ بے وفا نہیں اور اپنی پارسائی کے لیے سیکڑوں نظروں کی مہریں پیش کر رہا ہے، جو بجائے خود پارسائی کو بے حقیقت ثابت کر رہی ہیں ۔

۳۔ **لغات** ۔ **جلوۂ بینش** : بینائی اور نظر کا لوز، یعنی محبوب ۔
مہر آسا : سورج کی طرح ۔

شرح :۔ اے میری بینائی کے لوز ! اے میرے محبوب ! مجھے بھی اپنے عالم افروز حسن کی زکوٰۃ سے سرفراز کر تاکہ میرا بھیک کا کاسہ میرے گھر کا چراغ بن کر اسے اسی طرح روشن کر دے، جس طرح سورج کی جلوہ ریزی سے پوری کائنات روشن ہو جاتی ہے ۔

کاسۂ گدائی کو اس اعتبار سے آنکھ کا استعارہ سمجھا جا سکتا ہے کہ حسن سے استفادے کا اوّلین ذریعہ آنکھ ہے اور کاسہ بہ لحاظ وضع آنکھ سے مشابہ ہوتا ہے۔

۴۔ **شرح** :۔ خواجہ حالی اس شعر کے معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "تو نے ایک مشتاقِ قتل کو بے جرم سمجھ کر اس لیے قتل نہیں کیا کہ خونِ بے گناہ اپنی گردن پر نہ لے، مگر اب تیری گردن پر بجائے خونِ بے گناہ کے حق آشنائی کا رہے گا۔

اے قاتل! تُو نے مجھے اس وجہ سے قتل کرنا گوارا نہ کیا کہ میرا کوئی جرم اور کوئی قصور نہ تھا اور بے جرم و بے گناہ کو مارنے کا خون گردن پر سوار رہتا ہے، لیکن میں تیرے ہاتھوں شہادت پانے کا آرزومند تھا اور دوستی کا حق یہی تھا کہ تو میری یہ آرزو پوری کر دیتا۔ تیرا خیال میری بے گناہی کی طرف گیا، مگر بے گناہ کے خون سے بچنے کے اضطراب میں دوستی کا حق تیری گردن پر رہ گیا۔

۵۔ **شرح** :۔ بے دست و پائی اور بیچارگی تقاضا کر رہی تھی کہ اس حالت کی شکایت ضرور کرنی چاہیے۔ میں بے زبان تھا۔ شکایت کی غرض سے یہ آرزو پیدا ہوئی کہ مجھے زبان مل جائے۔ اس اثناء میں محبوب کو میری بیچارگی و بے زبانی پر رحم آگیا اور شکایت کی نہ محض ضرورت نہ رہی، بلکہ جس حالت کی شکایت کرنی تھی وہی عین میری مراد بن گئی۔ اس لیے زبان کی آرزو میری بے زبانی کے شکر تیے میں سرگرم ہے کہ کچھ کہنا نہ پڑا اور اس کے بغیر ہی محبوب کا التفات حاصل ہو گیا۔

۶۔ **شرح** :۔ چمن کے جلوے سے مراد فصلِ بہار کی آمد ہے، کیونکہ اسی سے چمن میں شادابی اور رونق پیدا ہوتی ہے۔ پھول کھلتے ہیں اور خوشبو ہر طرف بکھرنے لگتی ہے۔ بہار ہی کا موسم شاعر کے دل میں خاص جوش اور ولولہ پیدا کرتا ہے اور اس کے بیان میں رنگینی و شگفتگی آجاتی ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ یہی بہار ہے، جس نے چمن میں رونق تازہ کر دی اور میرے دل سے رنگین و دلآویز نغمے اٹھنے لگے۔ گویا ایک ہی سبب ہے، یعنی بہار جس نے چمن میں پھولوں کی خوشبو کا رنگ اختیار کیا اور میرے لیے دلکش نغموں کا سامان مہیا کر دیا۔

۷۔ لغات ۔ پیغارہ جُو : طعنہ تلاش کرنے والا، طعنے دینے والا۔

شرح :۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر طعنے دینے والے ہر حسین کا دہن ایک حلقہ ہے اور بے شمار حلقے مل کر بدنامی کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا ہے۔ چونکہ حسینوں کے دہن کو تنگ کرتے کرتے شاعر ناپید اور معدوم کر چکے ہیں، اس لیے کہا کہ اے بے وفا! تیری بے وفائی کا چرچا عدم تک جا پہنچا اور حسینوں کے دہن مل کر رسوائی کی زنجیر بن گئے۔

یہ شعر بھی اسی قبیل کا ہے، جس میں ہم نے پشتِ خار والے شعر کو شمار کیا۔

۸۔ لغات ۔ حسرت سنج : حسرت رکھنے والا، ارمان رکھنے والا۔

شرح :۔ اے غالب! خط کو زیادہ طول دینے اور پھیلانے کی کیا ضرورت ہے؛ بس اتنا ہی لکھ دینا کافی ہے کہ فراق میں مجھ پر جو ظلم و ستم ہوئے، انھیں بیان کرنے کی حسرت دل میں لیے بیٹھا ہوں۔

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا
بے تکلف داغِ مہ، مُہرِ دہاں ہو جائے گا

زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب
پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائے گا

لے تو لوں سوتے میں اُسکے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائیگا

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا

۱۔ شرح : فراق کی رات ہے، عاشق چاند کو دیکھتا ہے۔ چاندنی رات میں محبوب سے یکجائی کا ولولہ بہت پرجوش ہے۔ ساتھ ہی فراق اسے مایوس کر دیتا ہے۔ معاً اسے خیال آتا ہے کہ محبوب سے ملنے کی تو کوئی صورت نہیں۔ الفت کا راز اور فرقت کا درد چھپایا نہیں جا سکتا۔ اگر میں نے چھپانے کی کوشش کی تو دیوانہ ہو جاؤں گا اور کسی کو یہ بھی معلوم نہ ہو گا کہ میرے جنون اور میری

سب کے دل میں ہے جگہ تیری، جو تو راضی ہُوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہربان ہو جائے گا

دیوانگی کا اصل سبب کیا ہے۔ میرے ندیموں، غمگساروں بلکہ محبوب تک کو بھی خبر نہ ہو گی۔

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی۔ تعلیم ضبط
شعلہ خس میں جیسے، خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا

گویا چاند جس کی روشنی بہ حالت فراق میرے دل میں جنون و دیوانگی کا تلاطم پیدا کر رہی ہے، سراپا ایک داغ بن کر میرے منہ پر مُہر کی طرح لگ جائیگا۔

باغ میں مجھ کو نہ لے جا، ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

بہ ظاہر داغ مہ سے وہ داغ مراد نہیں، جو چاند میں نظر آتا ہے۔ پورے چاند کا داغ بن کر مُہر کی طرح منہ پر لگ جانا مراد ہے۔ اور پورے چاند کا داغ بن جانا اس لیے کہا کہ فرق کی حالت میں چاند بھی روشنی

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائیگا

فائدہ کیا ؟ سوچ، آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ
دوستی ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہو جائیگا

اور افروزی کے باوجود ایک داغ نظر آنا چاہیے۔

غالبؔ نے ایک فارسی غزل میں کہا ہے۔

از مہر ضیا و تاب امید نظرم نیست
ایں تشت پر از آتش سوزاں بہ سرم ریز

یعنی جہان کو روشن کر دینے والے سورج سے مجھے کسی ضیا افروز نظر کی امید نہیں۔ جب صورتِ حال یہ ہے تو اسے سورج نہ سمجھنا چاہیے، جس سے ہر شے میں ارتقاد بالیدگی ہے، بلکہ یہ انگاروں سے بھرا ہوا ایک تشت ہے اور اسے میرے سر پہ الٹ دینا چاہیے۔

غرض جب کوئی شے اپنا حقیقی وظیفہ کھو بیٹھتی ہے تو اسے اصل شے نہ سمجھنا چاہیے۔ اسی طرح فراق میں پورا چاند داغ نظر آنے لگا۔

۲۔ **لغات**۔ زہرہ : پتّا۔

شرح :۔ اگر محبوب سے دوری کی شام ہو جانے پر ہر چیز کا پتّا اسی طرح پانی پانی ہوتا ہے تو چاند کی روشنی پر بھی یقیناً اس کا یہی اثر پڑے گا اور وہ روشنی پانی کا سَیل بن کر میرے گھر کو تباہ کر ڈالے گی۔ یعنی جو شے راحت و خوشگواری کا باعث ہوتی ہے، وہ بھی انتہائی مصیبت کا سامان بن جائے گی۔

۳۔ **شرح** :۔ محبوب سو رہا ہے، جی چاہتا ہے کہ فرطِ محبت سے اس کا پاؤں چوم لوں، لیکن یہ اندیشہ دامن گیر ہے کہ اس کے دل میں کوئی بُرا گمان نہ بیٹھ جائے۔ یہ نہ سمجھ لے کہ مجھے غافل پا کر یہ حد سے بڑھنے لگا یا اس نے پاک محبت کے جو دعوے کیے تھے، وہ سب جھوٹے نکلے۔

۴۔ **شرح**۔ ہم یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ہمارا دل خالصۃً وفا کے تقاضے پورے کرنے کے لیے وقف ہے۔ وہ وفا ہی کے راستے میں مٹ جائے گا، لیکن ہمیں یہ کب معلوم تھا کہ محبوب کی طرف سے امتحان و آزمائش کی منزل پیش آئے گی تو سب سے پہلے وہ اسی آزمائش کی نذر ہو جائے گا اور وفا کے سلسلے میں جو کچھ ہم پر واجب ہے، اسے بجا لانے کا دل کو موقع ہی نہ ملے گا۔

۵۔ **شرح** :۔ بظاہر اس میں خطاب اللہ تعالیٰ سے ہے۔ یعنی اے ذاتِ پاک، ہر دل میں تیری جگہ ہے۔ ہر فرد تیری محبت کے لیے وقف ہے۔ اگر تو اپنے عاجز، گنہگار بندے سے راضی ہو جائے تو سارا زمانہ مجھ پر مہربانی ہو جائیگا کیونکہ سب تیری رضا اور تیری چشمِ کرم کے منتظر ہیں۔

۶۔ **لغات**۔ نگاہِ گرم : غصّے اور عتاب کی نگاہ۔

شرح :۔ اگر تیرے عتاب اور غصّے کی نگاہ محبت کی آگ کو قابو میں رکھنے اور دل کو سنبھالے رہنے کے آداب سکھاتی رہی تو گھاس کے تنکے میں چنگاری

اسی طرح پوشیدہ ہو جائے گی، جس طرح لہو رگوں میں پوشیدہ ہوتا ہے۔

لہو رگوں میں دوڑتا رہتا ہے، لیکن کسی کو نظر نہیں آتا۔ اگر گھاس کا تنکا آگ پکڑ لے تو ایک لمحے میں جل بجھتا ہے۔ ضبط کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اپنی حالت پر قابو پا لیا جائے اور حقیقت کسی پر ظاہر نہ ہونے دی جائے۔ گویا شعلہ خس میں نمایاں نہ رہے، بلکہ اندر چھپ جائے۔ صبر و ضبط کے آداب محبوب نے عتاب اور خفگی کی نگاہ ڈال کر سکھائے۔ یعنی جب دیکھا کہ عاشق بیتاب ہو رہا ہے اور ضبط کے بند ٹوٹنے والے ہیں تو غصے سے بھری ہوئی نگاہ اس پر ڈال دی۔ وہ بیچارہ سنبھل گیا اور سنبھلنے کے لیے جان لڑا دی۔

نگاہِ گرم، شعلہ، خس، خون اور رگ کی مناسبتیں تشریح کی محتاج نہیں۔

۷۔ **شرح** ۔ اے ہمدم! مجھے باغ میں نہ لے جا، کیونکہ خستگی و اندوہ سے میری حالت اس درجہ تباہ ہے کہ ہر تر و تازہ پھول مجھے دیکھتے ہی لہو رونے والی آنکھ بن جائے گا۔ یعنی میری حالت اتنی خراب ہے کہ جس مقام پر لوگ سیر و تفریح کے لیے جاتے ہیں، وہاں ماتم کی مجلس بپا ہو جائے گی اور ماتم بھی ایسا کہ آنسوؤں کی جگہ لہو رویا جائے گا۔

گلِ تر کو سرخی و تازگی کے باعث چشمِ خوں فشاں سے تشبیہ دی گئی ہے۔

۸۔ **شرح** ۔ میں تو اب تک یہی امید لگائے بیٹھا تھا کہ قیامت کے دن میرا تیرا انصاف ہو جائے گا۔ اور منصفِ حقیقی دونوں کے درمیان فیصلہ کر دیگا۔ لیکن وہاں بھی انصاف نہ ہوا تو حسرت و افسوس کے سوا میرے لیے کیا باقی رہ جائے گا؟

۹۔ **شرح** ۔ رفیق و غمخوار کہتا ہے کہ اے اسد! تو خاصا عقلمند اور سمجھ سوچ والا آدمی ہے، لیکن ذرا سوچ کہ تو ایک کس محبوب سے دوستی کا رشتہ استوار کر رہا ہے، جسے اونچ نیچ کی خبر نہیں اور وہ اچھائی برائی سوچ نہیں سکتا۔ نتیجہ اس کے سوا کیا ہوگا کہ تجھے جان کا نقصان اٹھانا پڑے گا۔

آخری مصرع میں مرزا نے مشہور مثل سے کام لیا ہے یعنی نادان کی دوستی جی کا زیان، نیز اردو اور فارسی کے شعراء محبوب کی کم سنی پر زور دیتے دیتے یہاں تک آگے بڑھ گئے کہ اسے عقل و فکر سے عاری مان لیا۔

○

درد منت کشِ دوا نہ ہُوا ۔۔۔ میں نہ اچھا ہُوا، بُرا نہ ہُوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟ ۔۔۔ اک تماشا ہُوا گلا نہ ہُوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں؟ ۔۔۔ تو ہی جب خنجر آزما نہ ہُوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب، کہ رقیب ۔۔۔ گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہُوا

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی ۔۔۔ آج ہی گھر میں بوریا نہ ہُوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟ ۔۔۔ بندگی میں مرا بھلا نہ ہُوا

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی ۔۔۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا

زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما ۔۔۔ کام گر رک گیا روا نہ ہُوا

رہزنی ہے، کہ دل ستانی ہے؟ ۔۔۔ لے کے دل، دل ستاں روانہ ہُوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں ۔۔۔ آج غالب غزل سرا نہ ہُوا

۱۔ **لغات** ۔ منت کش : احسان اٹھانے والا۔ احسان مند۔ ممنون

شرح :۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے درد نے احسان نہ اٹھایا اور میں جیسا بھی بیمار و درد رسیدہ تھا، ویسا ہی رہا۔ یہ حقیقت پیش نظر رکھی جائے تو میرے تندرست نہ ہونے میں بھی کوئی برائی نہیں، کیونکہ اگر دوا کھاتا اور وہ کارگر

ہوتی تو دُکھ ضرور زائل ہو جاتا، بیماری ضرور رفع ہو جاتی، لیکن مجھ پر دوا کا احسان رہ جاتا، جسے میری خودداری اصل بیماری سے زیادہ مصیبت خیز سمجھتی تھی۔

۲۔ شرح :۔ قاعدہ ہے کہ جب کسی معاملے کے متعلق فیصلے کی ضرورت پیش آجائے تو بیچ بچاؤ اور صلاح مشورے کے لیے چند آدمی بلا لیے جاتے ہیں تاکہ ان کی وجہ سے اوّل فریقین کا جھگڑا کوئی نازک صورت اختیار نہ کرنے پائے، دوم سمجھانے بجھانے سے فیصلے کی کوئی صورت نکل آئے۔ اب مرزا غالب شکایتیں لے کر محبوب کی بارگاہ میں پہنچے اور گلے شکوے کی داستان شروع کر دی۔ محبوب نے یہ قضیہ نپٹانے کے لیے چند آدمی بلا لینے مناسب سمجھے، مگر ستم ظریفی یہ کی کہ غالب کے رقیبوں کو بُلا لیا، جو پہلے ہی اس غریب کے خلاف اُدھار کھائے بیٹھے تھے۔ اُن سے یہی امید ہو سکتی تھی کہ اوّل ہر معاملے میں غالب کی مخالفت اور محبوب کی پاس داری کریں گے، دوم گلے شکوے کے سلسلے میں سنجیدگی سے بات سننے اور چھان بین سے حقیقت تک پہنچنے کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن رقیبوں سے یہی امید ہو سکتی تھی کہ غالب کی مخالفت میں ایک سنجیدہ معاملے کو تماشے کی صورت دے دیں گے۔ وہ بیچارہ پریشان ہو کر کہتا ہے میں تو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ آپ نے میری وفاداری کے جواب میں کتنا بُرا سلوک کیا۔ آپ نے رقیبوں کو بُلا لیا۔ بھلا سوچیے کہ ان کی کیا ضرورت ہے؟ کیا آپ میرے گلے شکوے کو تماشا بنانا چاہتے ہیں؟

لطف کی بات یہ ہے کہ محبوب نے رقیبوں کو صرف بُلا لیا ہے، وہ پہنچے نہیں اور مرزا غالب احتجاج کر رہے ہیں کہ انھیں کیوں بُلا رہے ہو؟

۳۔ شرح :۔ ہماری قسمت کا فیصلہ تو تیرے خنجر پر موقوف تھا۔ تُو نے اس سے کام ہی نہ لیا، یعنی ہم پر اسے آزمایا ہی نہیں۔ اب تو ہی بتا کہ ہم قسمت آزمائی کے لیے کہاں جائیں؟

۴۔ لغات ۔ بے مزہ : بے لطف، بد ذائقہ، رنجیدہ، کبیدہ، ناخوش۔

شرح :- اے محبوب! تیرے لبوں میں کتنی مٹھاس ہے کہ رقیب کو تو نے برابر گالیاں دیں، مگر انھیں کھا کے بھی وہ بے لطف، رنجیدہ اور ناخوش نہ ہوا۔ یہ اس حقیقت کی روشن دلیل ہے کہ تیرے ہونٹوں کی شیرینی نے گالیوں میں بھی اتنی مٹھاس پیدا کردی، ان میں ذرا بھی تلخی باقی نہ رہی۔

شعر کا یہ پہلو بہ طورِ خاص قابلِ توجہ ہے کہ لبِ محبوب کی شیرینی کے باعث گالیاں رقیب کے لیے میٹھی بن گئیں، حالانکہ شاعروں کے مسلمات کے مطابق رقیب سچا عاشق نہیں ہوتا۔ جو ہونٹ جھوٹے عاشقوں کے نزدیک اتنے شیریں ہیں، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ سچے عاشقوں کے لیے کیا ہوں گے۔

۵۔ **شرح** :- مشہور ہے کہ محبوب میرے گھر آرہا ہے، لیکن میری بے سامانی کا یہ عالم ہے کہ بوریا تک پاس نہیں، جسے بچھا کر اسے بٹھا سکتا اور بے سامانی کی یہ کیفیت اسی روز ہوئی، جب محبوب کے آنے کی خبر گرم تھی۔

۶۔ **لغات**۔ **نمرود** : زمانۂ قدیم کا ایک بادشاہ، جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔

بندگی : عبودیت۔ بندہ ہونا۔

شرح :- خواجہ حالی اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: کہتا ہے میری بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھ کو سوا نقصان کے کچھ فائدہ نہ پہنچا؟ یہاں بندگی سے مراد عبادت نہیں، بلکہ عبودیت ہے۔ بندگی پر نمرود کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے۔"

اس شعر کی تعبیریں کئی ہو سکتی ہیں، مثلاً :

۱۔ خواجہ حالی کی تشریح کے مطابق "وہ" کا اشارہ بندگی کی طرف ہے، یعنی کیا میری بندگی نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھے کوئی فائدہ نہ پہنچا، صرف نقصان ہوا؟

۲۔ "وہ" کا اشارہ خدائی کی طرف سمجھا جائے، یعنی میں جس خدائی میں بندگی کرتا

رہا، کیا وہ نمرود کی خدائی تھی، رب العالمین کی خدائی نہ تھی کہ اس میں مجھے نقصان کے سوا کچھ حاصل نہ ہُوا؟

۲۔ پہلے مصرع کے آخر میں استفہام کے بجائے استعجاب کی علامت سمجھی جائے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ مجھے تو بندگی کا حق ادا کرتے رہنے سے بھی کوئی فائدہ نہ پہنچا، لیکن نمرود کی طرف دیکھیے کہ اس نے خدائی کا دعویٰ کیا اور بڑے رعب داب اور شان و شوکت کے ساتھ سلطنت کرتا رہا۔

۷۔ **لغات** ۔ پہلے "حق" کے معنی ہیں سچی بات، سچ، دوسرے "حق" کے معنی ہیں۔ واجب، فرض اور ذمّہ۔

شرح :۔ میں نے جان راہِ حق میں دے دی، لیکن اس میں میری کیا خوبی ہے؟ جان میری نہ تھی، خدا نے مجھے عطا کی تھی۔ اس کا عطیہ اسے لوٹا دیا تو کمال کیا ہُوا؟ سچی بات یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو کچھ ہم پر واجب تھا، جو کچھ ہمارے ذمّے عائد تھا، وہ تو پورا نہ ہو سکا، ہم اپنی کوئی چیز اس کی راہ میں قربان کرتے تو ایک بات تھی۔ اس صورت میں کہہ سکتے تھے کہ ہم نے فرض ادا کر دیا۔ اب ایسا دعویٰ کیونکر زیبا ہے؟

لطف یہ کہ انسان کی انتہائی قربانی جان دے دینا ہے۔ مرزا اسے بھی ادائے حق قرار نہیں دیتے۔ سوچیے راہ خدا میں قربانی کا تصور اور حق ادا کرنے کا مقام کتنا بلند ہے۔

۸۔ **شرح** :۔ عام قاعدے کے مطابق زخم دبا دیا جائے تو لہو تھم جاتا ہے اور رواں نہیں رہتا، لیکن غالب کو الٹی صورت پیش آئی۔ زخم باندھ دیا گیا اور لہو پھر بھی جاری رہا۔ اس کے برعکس میرے کام میں رکاوٹ پیدا ہوئی تو وہ جاری نہ رہ سکا اور وہیں اٹک گیا۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ جو بات میرے لیے فائدہ مند ہوتی ہے، وہ پیش نہیں آتی، جس میں نقصان کا پہلو ہو، وہی پیش آتی ہے۔ زخم بند ہونے سے لہو رک

جانا چاہیئے تھا اور نہ مُڑ کا۔ کام میں کوئی اڑکاؤ پیدا ہوا تھا تو اُسے دور ہو جانا چاہیے تھا، مگر نہ ہوا۔

شعر میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بدنصیبی اور سیاہ بختی کسی قاعدے کی پابند نہیں کہ جو طریقہ اس نے لہو کے معاملے میں اختیار کیا، وہی کام کے معاملے میں بھی اختیار کرتی اس کا اصول یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طریقے میں تکلیف و اذیت زیادہ ہو وہی اختیار کرے۔ خون کے معاملے میں ایک اور کام کے معاملے میں بالکل دوسرا طریقہ اختیار کیا۔

۹۔ **شرح**:۔ یہ دل لینا ہے یا ڈاکہ مارنا۔ نہ ناز و انداز دکھلائے، نہ عاشق کو دیدار سے جی بھر کر لطف اندوز ہونے کا موقع دیا۔ بس آئے، دل پر ہاتھ مارا، اور چل دیے۔ دل لینے کا یہ طریقہ تو بالکل انوکھا ہے۔

۱۰۔ **شرح**:۔ اے غالب! کچھ تو پڑھیے، کیونکہ لوگ کہتے ہیں، آج غالبؔ نے کوئی غزل نہ سنائی۔

اس غزل کے سلسلے میں ایک افسانہ تیار کر لیا گیا ہے کہ قلعے میں کسی شہزادے کے مکان پر مشاعرہ ہوا تھا۔ مرزا نے طرح میں غزل نہیں کہی تھی، اصرار ہوا تو غیر طرحی غزل پڑھ دی۔ مقطع پہلے سے اس مضمون کا کہہ لیا تھا، جیسا کہ خود واضح کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بے بنیاد افسانہ ہے۔ شاعر مقطع میں ردیف و قافیہ کی مناسبت سے عموماً ایسے مضمون باندھتے رہتے ہیں، جنھیں واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ غزل بھی مع مقطع اسی قبیل سے ہے۔ مرزا نے اکتوبر ۱۸۵۸ء میں حاتم علی بیگ مہر کو ایک خط میں لکھا: "کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی، ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اس نے جو وہ کاغذ مجھ کو دکھلایا، یقین سمجھنا کہ رونا آیا۔ غزل تم کو بھیجتا ہوں اور صلے میں خط کا جواب چاہتا ہوں۔"

غزل کے دس شعر ہیں، مرزا نے خط میں صرف آٹھ شعر کہے، باقی دو یا تو یاد نہ آئے یا بعد میں شامل کر لیے گئے۔

۱۔ لغات:

شوق: عشق

شرح: عشق کو دل جیسے وسیع مقام میں بھی جگہ کے تنگ ہونے کی شکایت ہے۔ یعنی عشق دل میں اپنی شوریدگی کا تماشا کھل کر نہیں دکھا سکتا۔ حالانکہ دل کی وسعت میں پوری کائنات سما جاتی ہے دوسری طرف سمندر کے اضطراب اور جوش و خروش پر نظر ڈالنی چاہیئے کہ وہ موتی جیسی چھوٹی سی چیز میں سما گیا اور اُسے سکون مل گیا۔

شاعر کا مطلب یہ ہے کہ سمندر کا اضطراب اور جوش و خروش اضطراب عشق کے سامنے بالکل بے حقیقت ہے۔ بیشک سمندر میں آٹھوں پہر تموج و تلاطم برپا رہتا ہے۔ طوفان آتے ہیں اور کائنات کی کوئی دوسری چیز اس مسلسل ہنگامہ آرائی کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ لیکن

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا
گہر میں محو ہُوا اضطراب دریا کا

یہ جانتا ہوں، کہ تُو اور پاسخِ مکتوب
مگر ستم زدہ ہُوں، ذوقِ خامہ فرسا کا

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوام کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ گل مت دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

ہنوز محرمیٔ حُسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بُنِ مُو کام چشمِ بینا کا

دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں، حُسن کے تقاضا کا

نہ کہہ کہ گریہ بہ مقدارِ حسرتِ دل ہے
مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ
جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا

دیکھیے، یہ پوری ہنگامہ آرائی موتی کے اندر گم ہو گئی۔ معلوم ہے کہ موتی کی پرورش سمندر کی اسی ہنگامہ آرائی کا نتیجہ ہوتی ہے گویا موتی اس ہنگامہ آرائی کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے لیکن اضطرابِ عشق دل جیسے ہمہ گیر مقام میں بھی جگہ کی تنگی کا گلہ کر رہا ہے۔ موتی یا گوہر کی موج کو ساکن قرار دینا شعرا کا عام مضمون ہے۔ مثلاً :

چیں بر جبیں زجنبش ہر خس نمے کنند
دریا دلاں چو موجِ گہر آرمیدہ اند

خواجہ میر درد نے وجودِ حقیقی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا :

ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

مگر مرزا غالب کے نزدیک میر درد کا دعویٰ صحیح نہیں۔ دل وجودِ حقیقی کے عشق کا ہرگز متحمل نہیں ہو سکتا اور وہ جگہ اس عشق کے جوش و خروش کی نمائش کے لیے قطعاً ناکافی ہے

بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ غالب کا یہ شعر بیدل کے مندرجۂ ذیل شعر سے ماخوذ ہے

دلِ آسودۂ ما شورِ امکاں در قفس دارد
گہر دزدیدہ است این جا عنانِ موجِ دریا را

یعنی ہمارا دل آسودہ یا نفسِ مطمئنہ عالم امکاں کا شور و غوغا اپنے پنجرے میں بند کیے ہوتے ہے پھر مثال دیتے ہوئے کہا کہ یہاں موتی موجِ دریا کی باگ چرا کر لے آیا ہے یعنی اس سمندر کے سارے جوش و خروش کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔

معمولی تامل سے بھی واضح ہو سکتا ہے کہ دونوں شعروں کے مضمون الگ الگ ہیں۔ بیدل کے نزدیک شورِ امکاں دل میں سما گیا۔ مرزا غالب کہتے ہیں کہ سمندر کا جوش و خروش یقیناً موتی میں سما سکتا ہے۔ لیکن اضطراب عشق کے لیے دل جیسی ناپیدا کنار جگہ میں بھی سمائی کا کوئی امکان نہیں۔

۲ ۔ **لغات : پاسخ :** جواب

ذوقِ خامہ فرسا : ایسا ذوق جسے صرف تحریر و نگارش کی دھن لگی ہو

شرح :- بیشک میں جانتا ہوں کہ تو میرے خط کا جواب کبھی نہ لکھے گا۔ ایسی امید قیامت تک ممکن نہیں، لیکن میں کیا کروں۔ قدرت نے میری فطرت میں ایسا ذوق بھر دیا ہے، جو مسلسل تحریر و نگارش کی دُھن میں لگا رہتا ہے۔ یہ ذوق مجھے چین نہیں لینے دیتا۔ سارا ستم اسی نے ڈھا رکھا ہے۔ اس کے ہاتھوں مظلوم بھی ہوں اور مجبور بھی۔ جواب خط نہ آنے کا یقین ہی سہی، مگر لکھنے سے باز نہیں رہ سکتا۔

بعض اصحاب نے فرمایا کہ یہ مضمون میر حسن نے بھی خوب باندھا ہے :

گرچہ دل کو ہے یقیں یہ خط نہیں پڑھنے کا وُہ
پر تقاضا شوق کا لکھنے سے کب رکھتا ہے باز

یعنی یہ تو یقین ہے کہ محبوب میرا خط ہرگز نہیں پڑھے گا، لیکن عشق کا تقاضا مجھے لکھنے سے باز نہیں رکھ سکتا۔

میر حسن اُردو کے مشہور استاد ہیں، مگر اس شعر میں انھوں نے ایسی بات کہ دی ہے جسے فطرت انسانی سے کوئی مناسبت نہیں۔ محبوب عاشق سے راضی ہو یا ناراض، لیکن جو کچھ لکھا ہُوا اس کے سامنے آجائے گا، اسے وہ ضرور پڑھے گا۔ نہ پڑھنا خلاف تقاضائے فطرت ہے۔ مرزا نے یہ نہیں کہا کہ محبوب خط نہیں پڑھے گا، صرف یہ کہا ہے کہ جواب نہیں دے گا۔ یہی محبوب کی عادت کا صحیح خاکہ ہے، اس لیے مرزا کا شعر میر حسن کے شعر سے بدرجہا بہتر ہے۔ مزید براں مضمون کے محض جزوی اشتراک کو پورے شعر کا مشترک قرار دے لینا ذوق کا کوئی اچھا ثبوت نہیں۔

مبادا کسی کو خیال ہو کہ غالب نے بھی ایک جگہ ایسا مضمون باندھا ہے، جو میر حسن کے مضمون سے قریب تر ہے۔ یعنی :

کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یا رب
قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

ظاہر ہے کہ اس میں بھی مرزا نے کوئی بات طبعی حالات کے خلاف نہیں کہی۔ مطلب یہ ہے کہ عاشق ذوقِ خامہ فرسائی میں خط پر خط لکھتا تھا یہاں تک کہ محبوب تنگ

آگیا۔ ہر خط میں وہی باتیں ہوتیں، جو ہزاروں مرتبہ بیان ہو چکی تھیں۔ لہذا محبوب نے فیصلہ کر دیا کہ اب عاشق کی طرف سے جو بھی خط آئے، اسے بے توقف جلا دیا جائے، کیونکہ اس میں نئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔

اس مضمون اور میر حسن کے مضمون کا فرق تشریح کا محتاج نہیں۔

۲۔ لغات : کلفتِ خاطر : دل کے لیے باعث رنج و کدورت

شرح : شاعر کہتا ہے کہ اول بہار کا وجود ہی نہیں۔ بفرض محال وجود تسلیم کر لیا جائے تو اس کی حیثیت ایسی ہے، جیسے خزاں کے پاؤں کو مہندی لگا دی جائے۔

خزاں کے پاؤں کو مہندی لگا دینے سے شاعر نے کئی پہلو پیدا کر لیے، مثلاً :

۱۔ مہندی میں رنگینی ہوتی ہے اور بہار کی بھی سب سے نمایاں خصوصیت رنگینی اور تازگی ہی ہے۔

۲۔ جب کسی کے پاؤں کو مہندی لگا دی جاتی ہے تو وہ چل پھر نہیں سکتا۔ شاعر کا تصور یہ ہے کہ خزاں کے رخصت ہونے کا وقت آیا تو بہار آکر خزاں کے پاؤں کی مہندی بن گئی۔ گویا خزاں کے لیے رخصت ہونا ممکن ہی نہ رہا اور وہ بدستور موجود رہی۔

۳۔ مہندی کا رنگ چند ہی روز میں اڑ جاتا ہے۔ اس سے شاعر نے بہار کی بے ثباتی اور بے حقیقتی اور خزاں کا ثبات و دوام واضح کیا۔

۴۔ پاؤں کو مہندی لگی جائے تو چلنے پھرنے سے عاری ہو جانے کے باعث انسان کو کلفت ہوتی ہے۔

شعر کا دوسرا مصرع اس آخری پہلو پر مبنی ہے، یعنی دنیا کا عیش بالکل عارضی ہوتا ہے اور بہر حال تکلیف، مصیبت اور کدورت کا باعث بنتا ہے۔

مرزا نے مستقل خزاں کی خوبی کے مختلف پہلو پیدا کر لیے اور ایک جگہ اسے ایسی بہار قرار دے دیا، جو خزاں کے خوف سے بالکل آزاد ہو۔ فارسی میں کہتے ہیں :

زینہار از تعب آتش جاوید مترس
خوش بہاریست کزو بیم خزاں برخیزد

یعنی اگر دائمی دوزخ کی تپش مقدر ہے تو اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ تُو سمجھ لے کہ تجھے ایسی بہار مل رہی ہے، جسے خزاں آ ہی نہیں سکتی۔

۴۔ **لغات** : **خندہ ہائے بیجا** : بے موقع، بے محل اور بے سبب ہنسنا۔

شرح : میں محبوب سے جدائی کے غم کا مارا ہوا ہوں۔ اس حالت میں مجھے باغ کی سیر کے لیے مجبور نہ کرو۔ وہاں کیا ہوگا؟ پھول ہوں گے، جو بے محل ہنستے ہیں، میں ایسی ہنسی برداشت نہیں کر سکتا۔

پھولوں کے کھلنے کو بے محل اور بے سبب ہنسی اس لیے کہا۔ کہ وہ نہ تو ہنسی کا مناسب موقع دیکھ کر ہنستے ہیں اور نہ ان کے ہنسنے کا کوئی معقول سبب ہوتا ہے۔ صبح کو نسیم چلتی ہے اور وہ کھل جاتے ہیں یہی ان کی ہنسی ہے۔

غالب نے اس شعر میں ایک اہم حقیقت بیان کی ہے۔ انسان خود رنج و الم میں مبتلا ہو تو سیر و تفریح اور دلکش مناظر اس پر الٹا اثر ڈالتے ہیں۔ اس کا دل بہلتا نہیں، بلکہ زیادہ کڑھتا ہے۔ پھولوں کا کھلنا ہر سلیم الطبع انسان کے لیے یقیناً باعث فرحت ہے۔ ان کے رنگ اور تازگی و شادابی سے آنکھیں لطف اٹھاتی ہیں۔ خوشبو سے دماغ معطر ہوتا ہے، لیکن غمزدہ انسان کو ایسے فرحت انگیز منظر میں بھی خوشی نہیں ہوتی، بلکہ افسردگی و پریشانی ترقی کرتی ہے اور وہ اپنے دل سے رنج کے پہلو پیدا کر لیتا ہے، جیسے اس شعر میں پھولوں کی شگفتگی کو بے محل اور بے سبب ہنسی قرار دے دیا، جو کسی کے بھی نزدیک پسندیدہ نہیں ہو سکتی۔

۵۔ **شرح** : اگرچہ میرے جسم کا ہر رونگٹا ایسی آنکھ بن گیا ہے جو ہر چیز کی حقیقت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر سکتی ہے، بہ ایں ہمہ حسن کا محرم بن جانے کی سعادت مجھے نصیب نہ ہوئی اور اس کے لیے ترس رہا ہوں۔

شعر میں محرمی پر خاص زور ہے، جس کا مطلب ہے، حسن کو بے پردہ دیکھ کر اس کی حقیقت پا لینا اور کنہ تک پہنچ جانا۔ حسن سے اشارہ حسنِ حقیقی کی طرف ہے۔ شاعر کہتا ہے۔ یہ حسن کائنات کی ہر شے میں نمایاں ہے، تاہم انسان کے جسم کا رواں

رذاں بھی حقیقت میں آنکھ بن جائے تو اس حسن کی محرمی نصیب نہیں ہو سکتی۔

بعض اصحاب نے اس شعر کے مقابلے میں فیضی کا مندرجہ ذیل شعر پیش کیا ہے:

در ہر بُنِ مُو کہ می نہی گوش
فوارۂ فیض اوست در جوش

یعنی تو کسی بھی رونگٹے پر کان دھرے، وہاں حسنِ حقیقی کے فیض کا فوارہ جوشاں ہو گا۔

ظاہر ہے کہ "ہر بُنِ مو" کے سوا دونوں شعروں میں کوئی بھی چیز مشترک نہیں فیضی ہر شے میں حسنِ حقیقی کا فیض ثابت کر رہا ہے۔ غالب اس لیے تڑپ رہا ہے کہ رونگٹے کو چشمِ بینا بنا لینے کے باوجود حسن کا بے حجاب نظارہ نصیب نہ ہوا۔

۶۔ **شرح** : ہم نے حُسن کو دیکھتے ہی دل اس کی نذر کر دیا اور ہرگز انتظار نہ کیا کہ وہ (حسُن) ناز و ادا سے کام لے کر ہمارا دل موہ لینے کی کوشش کرے۔ گویا شاعر کے نزدیک ناز و انداز دل چھین لینے کے حربے ہیں، جن سے حسن کام لیتا ہے اور ان کے ذریعے سے دلبری کا تقاضا کیا جاتا ہے۔ ہم ایسا تقاضا گوارا نہیں کر سکتے اور اس کے بغیر ہی حُسن پر مرمٹے ہیں۔

غالب نے یہ مضمون ایک فارسی غزل میں بھی باندھا ہے:

کمن ناز و ادا چندیں، دلے بستاں وجانے ہم
دماغِ نازک ما برنمی تابد تقاضا را

یعنی اے محبوب! تجھے ناز و انداز دکھانے میں اہتمام کی کیا ضرورت ہے؟ یہ لے، دل بھی حاضر ہے اور جان بھی۔ ہمارا دماغ اتنا نازک ہے کہ تقاضا برداشت ہی نہیں کر سکتا۔

۷۔ **شرح** : اے ہمدم! یہ نہ کہہ کہ میرا رونا دل کی حسرت کے عین مطابق ہے۔ رونے کے مقابلے میں حسرت تو بہت بڑھی ہوئی ہے۔ تو کہتا ہے کہ کیا رو رو کر دریا بہا دے گا؟ میں دریا کا جمع و خرچ جانتا ہوں۔ مجھے علم ہے، اس

میں کتنا پانی آتا ہے اور کتنے سمندریں جا ملتا ہے۔ اگر میں دل کی حسرت کے مطابق رونا شروع کروں تو ایک دریا کیا، خدا جانے کتنے دریا بہ نکلیں اور کیا قیامت آجائے۔

۸۔ **لغات**: کارفرما: کام لینے والا۔ حاکم

شعر کے پہلے مصرعہ میں "اس" سے محبوب مراد ہے اور دوسرے مصرع کے "اس" سے فلک۔

شرح:۔ میں آسمان کے جور و جفا کو دیکھتا ہوں تو اے اسد! بے اختیار محبوب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، کیونکہ آسمان کے جور و جفا میں محبوب ہی کے انداز ستم کی جھلک نمایاں ہے۔ گویا سمجھنا چاہیے، وہی آسمان سے کام لے کر یہ سب کچھ کرا رہا ہے۔

○

قطرۂ مے، بس کہ حیرت سے نفس پرور ہُوا
خطِّ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہُوا

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ، لیکن وُہ خفا مجھ پہ ہُوا

۱۔ **لغات**: نفس پرور: لفظی معنی نفس پالنے والا، مراد ہے بستہ اور جما ہُوا۔

خطِّ جامِ مے: جام میں شراب کی پیمائش کے لیے خط کھنچے ہوتے تھے اور انھیں "خطِ جام" یعنی "خطِ جامِ مے" کہتے تھے۔

شرح: خود مرزا غالب نے اس شعر کے متعلق قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی کو لکھا تھا: اس مطلع میں خیال ہے دقیق، مگر کوہ کندن و کاہ بر آوردن یعنی لطف زیادہ نہیں۔ قطرہ ٹپکنے میں بے اختیار ہے۔ بہ قدر یک مژہ برہم زدن ثبات دقرر ہے۔ حیرت ازالۂ حرکت کرتی ہے۔ قطرۂ مے افراطِ حیرت سے ٹپکنا بھول گیا۔ برابر بوندیں، جو تھم کر رہ گئیں تو پیالے کا خط بہ صورت اس تاگے کے بن گیا جس میں موتی پروئے ہوں۔

سادہ الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ ساقی کے جلوے نے شراب کے ہر قطرے کو حیرت میں مبتلا کر دیا چنانچہ قطرے ٹپکنا بھول گئے اور حیرت کے باعث خطِ جام پر برابر برابر جمع ہوتے گئے۔ گویا خط نے دھاگے کی صورت اختیار کر لی اور جمے ہوئے قطرے اس دھاگے کے لیے موتی بن گئے۔

۲۔ شرح : محبوب کو غالبؔ کے عشقِ صادق پر کامل اعتماد ہے، جو اس درجے پر پہنچا ہوا ہے کہ غیر کے مُنہ سے بھی آہ نکلے تو سمجھ لیتا ہے کہ یہ آہ یقینی طور پر غالب نے کی، لہٰذا اس پر خفا ہوتا ہے۔ گویا غالبؔ کے لیے سچا عشق اور اس پر محبوب کا اعتماد بھی خانہ خرابی اور مصیبت کا باعث بن گیا۔

اس میں قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ بعض صورتوں میں سچے عشق کا اثر بھی الٹا ہوتا ہے

○

جب بہ تقریبِ سفر یار نے محمل باندھا
تپشِ شوق نے ہر ذرے پہ اِک دل باندھا

اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیٔ ناز
جوہرِ آئنہ کو طوطیٔ بسمل باندھا

یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا
عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

نہ بندھے تشنگیٔ ذوق کے مضموں غالبؔ
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

۱۔ لغات : تقریب : ذریعہ سبب۔ اجتماع کا موقع، مثلاً شادی بیاہ یا جشن۔

محمل : کجاوہ۔ چارپائی سے ملتی جلتی دو چیزیں رسوں کے ذریعے سے باندھ کر اونٹ پر اس طرح رکھتے تھے کہ دونوں حصے دونوں پہلوؤں پر لٹک جاتے تھے۔ ان میں سواریاں بالمقابل بیٹھتی تھیں۔

شرح : جب محبوب نے سفر کی تیاری کی اور سواری کے لیے کجاوہ کس لیا تو عاشق کی گرمیٔ شوق کا یہ عالم تھا کہ راستے کی خاک کے ایک ایک ذرے پر دل باندھ دیا تاکہ محبوب کی سواری کا قدم ہو

پڑے ، عاشق کے محبت بھرے دل پر پڑے ۔

بظاہر مطلب یہ نہیں کہ واقعی ہر ذرّے پر ایک ایک دل باندھا گیا۔ مطلب یہ ہے شوق کی بیقراری اور بے تابی ایسی صورت اختیار کر گئی تھی کہ خاک کا ذرہ ذرہ عاشق کا دل معلوم ہوتا تھا تاکہ سواری کا پاؤں اسی پر پڑے۔

بقولِ طباطبائی ذرّوں کی جھلاہٹ اور تپشِ دل میں وجہ شبہ ظاہر ہے۔

۲ - لغات : اہلِ بینش : اہلِ نظر۔ حقیقت ہیں۔

شعر میں آئینے سے مراد فولادی آئینہ ہے ، اسی میں جوہر ہوتے ہیں جو زنگ لگ جانے سے سبزی مائل ہو جاتے ہیں۔ زنگ ہی کی بدولت انھیں طوطی سے تشبیہ دی گئی ہے۔

شرح :- محبوب کے پیشِ نظر آئینہ تھا اور وہ ناز و انداز کی شوخیاں دکھا رہا تھا ، جن کی وجہ سے پورا منظر حیرت خانے میں تبدیل ہو گیا اور آئینے کے جوہر اہلِ نظر کے نزدیک بیتاب ہو کر طوطیِ بسمل کی طرح تڑپ اٹھے۔ گویا آئینے کے جوہروں کو طوطیِ بسمل قرار دے دیا ہے۔

۳ - لغات - عربدہ میداں : میدانِ جنگ ۔

عجزِ ہمت : ہمت کی پستی ۔

شرح : امید اور نا امیدی میں کشمکش شروع ہوئی اور اس نے میدانِ جنگ کا سا ہنگامہ بپا کر دیا۔ پست ہمتی نے سوال کرنے والے کے دل کو اپنے طلسم میں جکڑ لیا۔

جب کوئی شخص سوالی بن کر کسی کے سامنے جاتا ہے تو اس کے دل میں امید و نا امیدی کے درمیان کھینچ تان شروع ہو جاتی ہے۔ امید یہ کہ کچھ مل جائے گا اور نا امیدی یہ کہ شاید سوال ٹھکرا دیا جائے اور کچھ نہ ملے۔ یہ کش مکش اور یہ ہنگامہ انسان کی پست ہمتی کا نتیجہ ہے۔ پست ہمتی ہی اسے سائل بناتی ہے اور سوال پہ آمادہ کرتی ہے۔ اگر اس میں ہمت ہو تو قوتِ بازو سے کام لے کر ہر مشکل کو دُور کرے اور ہر کٹھن کام کو سہل

بنالے ۔ اس حالت میں اسے امید و ناامیدی کے چکر میں پڑنے کی نوبت نہ آئے گی ۔

مرزا غالب تو خودداری اور عزیمت پر اس درجہ مٹے ہوئے ہیں کہ کسی سے عبرت حاصل کرنے کے بھی روادار نہیں، چنانچہ کہتے ہیں ۔

ہنگامۂ زبونیِ ہمّت ہے انفعال

حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

۴ ۔ شرح :۔ اے غالب! اگرچہ ہم دل کھول کر اور انتہائی سعی و کوشش سے کام لے کر عشق کی پیاس کے مضمون لکھتے رہے، یہاں تک کہ دریا کو بھی ساحل قرار دے دیا، لیکن حق یہ ہے کہ ہم اُن مضمونوں کی ترتیب و تحریر کا حق ادا نہ کر سکے اور عشق کی تڑپ کے مضمون ہمارے باندھے نہ بندھ سکے ۔

دریا کو ساحل باندھنے کا مطلب یہ ہے کہ ساحل ہر لحظہ دریا پر رہتا ہے، مگر اس کی خشکی زائل نہیں ہوتی، گویا اس کی پیاس بدستور قائم رہتی ہے ۔ دریا کو ساحل باندھنے کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پورا دریا بھی ساحل پی جائے، یہاں تک کہ ایک قطرہ بھی باقی نہ رہے، تو اس کی یعنی ساحل کی تشنہ لبی اور پیاس میں کوئی فرق نہ آئے گا، وہ بدستور خشک کا خشک رہے گا ۔

○

مَیں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں

گر مَیں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہُوا تھا

ہے ایک تیر جس میں، دونوں چھِدے پڑے ہیں

وہ دِن گئے، کہ اپنا دل سے جگر جُدا تھا

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں

جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

۱ ۔ شرح : سید محمد احمد بخود موہانی نے اس شعر کی شرح میں بڑی تفصیل سے کام لیا ہے ۔ میں اسی کا خلاصہ اپنے لفظوں میں پیش کر دیتا ہوں، کیونکہ اس شرح میں شعر کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں ہُوا ۔

وہ فرماتے ہیں: اس شعر میں کئی

ٹکڑے معنی خیز ہیں۔ مثلاً:

۱۔ "میں اور" اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ میکش بہت پینے والا ہے۔ ساقی اور رندوں کا پورا گروہ اس کے رندانہ فضائل سے واقف ہے۔ شراب نہ ملنے سے اسے اتنی تکلیف ہوئی، جتنی کسی دوسرے رند کو نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر اسے رندوں میں اپنی بے آبروئی کا بھی دُکھ تھا۔

۲۔ "بزمِ مے" اس ٹکڑے سے واضح ہوتا ہے کہ اگر تنہائی میں ساقی نے یہی برتاؤ کیا ہوتا تو ناگوار ضرور گزرتا مگر اتنا، جتنا رندوں کی بھری محفل میں۔ وہ کہتا ہے۔ میں نے تو شراب اس لیے نہ مانگی کہ توبہ کر چکا تھا۔ لیکن ساقی نے ضیافت کیوں نہ کی؟ اس نے کیوں نہ خیال کیا کہ رندوں کی توبہ ہی کیا ہوتی ہے؟ اور اگر پینے کا ذوق نہ ہوتا تو رندوں کے جمگھٹے میں آتا ہی کیوں؟ اس کا مقصد یہ تھا کہ توبہ کی لاج بھی رہ جاتے اور شراب بھی پی لے، مگر ساقی نے جھوٹوں بھی نہ پوچھا۔

۳۔ "یوں" سے سننے والے کی نظر میں رندِ ناکام کی تصویر پھر جاتی ہے۔ اسے اپنی ناکامی پر حد درجہ ملال ہی نہیں، غصہ بھی ہے اور خمار کی تکلیف الگ جان لیے لیتی ہے۔ انگڑائی پر انگڑائی آ رہی ہے۔

۴۔ "تشنہ کام" سے حلق و زبان کے کانٹوں کا تصور ہونے لگتا ہے، جو شدت تشنگی کا ترجمان ہے۔

۵۔ "آؤں" سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پُر اُمید دل لے کر بزم مے میں گیا، مگر تشنہ اور مایوس لوٹا۔

۶۔ "ساقی کو کیا ہوا تھا" اس کے بہت سے مفہوم ہو سکتے ہیں، صرف لہجہ بدلنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً

(ا)۔ کیا اس نے بھی توبہ کر لی تھی؟ (ب) کیا وہ ہوش میں نہ تھا؟ (ج) کیا حریفوں نے در اندازی کی؟ (د) اس کے لیے میکش کا احترام واجب تھا۔ (ھ) نے بیدردی اور سنگ دلی سے کام لیا۔ (س) رندوں کی حالت کا اندازہ کرنے

میں غلطی ہوئی (ز) شاید اس نے مجھے دیکھا نہیں (ح) کیا وہ میرے توبہ کرنے پر سخت خفا ہو گیا؟ (ط) کیا وہ کسی اور خیال میں تھا؟ غرض ایسے بہت سے سبب ذہن میں آ سکتے ہیں اور "ساقی کو کیا ہُوا تھا" کہہ کر ان سب کا ذکر کر دیا گیا۔

بعض اصحاب نے کہا ہے کہ یہ مضمون بیگؔی دختر امیر علی جلائر نے بھی بڑی خوبی سے باندھا ہے :

من اگر توبہ نہ کردہ ام اے سروِ سہی !
تو خود ایں توبہ نہ کردی کہ مرا می ندہی

یعنی اے سروِ سہی ! اگر میں نے شراب سے توبہ کر لی ہے، تو نے تو یہ توبہ نہیں کی کہ مجھے شراب نہ دے گا۔

اسی طرح حزیںؔ کا یہ شعر پیش کیا گیا ہے :

چہ شد از توبہ اگر دامنِ خشکے دارم
پیشِ ابرِ کرمِ پیرِ مغاں ایں ہمہ نیست

یعنی اگر توبہ کی وجہ سے میرا دامن خشک ہے تو کچھ پروا نہیں۔ پیرِ مغاں کا ابرِ کرم برسے گا تو میری توبہ اور میرا دامنِ خشک سب ہیچ رہ جائیں گے۔

حزیںؔ کے شعر کو مرزاؔ کے شعر سے کوئی مناسبت نہیں۔ بیگیؔ کا مضمون یقیناً مرزا کے مضمون سے ملتا جلتا ہے، لیکن اسے مطلع بنانے کے سلسلے میں ساقی یا محبوب کو سروِ سہی کہنا سراسر تکلف ہے۔ نیز مرزاؔ نے یہ مضمون پیش کرتے وقت اس میں جتنی خوبیاں پیدا کر لی ہیں، ان سے بیگیؔ کا شعر خالی ہے۔

۲ - **شرح** : اب وہ زمانہ نہیں رہا، جب دل اور جگر ایک دوسرے سے الگ الگ تھے۔ اب تو دونوں کو ایک ہی تیرِ نظر نے چھید رکھا ہے۔ اور دونوں کی حالت یکساں ہے۔

دل کے چھدنے کا نتیجہ یہ ہُوا کہ بے تابی کمال پر پہنچ گئی۔ جگر چھدا تو صبر و استقامت کی قوت شل ہو کر رہ گئی۔

۳۔ شرح : اے غالب! اب درماندگی اور بے چارگی کی حالت طاری ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ جب میرے ناخن میں مشکلات کی گرہیں کھولنے کی قوت تھی تو میرے رشتۂ تقدیر میں کوئی گرہ موجود ہی نہ تھی۔ اب ناخن عقدہ کشائی کی قوت سے محروم ہو گیا تو مصیبتوں کا طوفان امنڈ آیا۔ یوں بیچارگی اور عاجزی کی حالت پیدا ہو گئی۔

"خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"دوسرے مصرع میں یہ مضمون ادا کیا گیا ہے کہ جب مشکلات نے نہیں گھیرا تھا، اس وقت ان کے دفع کرنے کی طاقت تھی۔

○

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر، گر بحر نہ ہوتا، تو بیاباں ہوتا
تنگیٔ دل کا گلہ کیا، یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا
بعد یک عمرِ ورع، بار تو دیتا، بارے
کاش، رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

۱۔ شرح : ہمارے گھر کی ویرانی تو ہر حال میں مقدر تھی اس میں ہمارے رونے کا کوئی دخل نہیں اب تو سمجھا جاتا ہے کہ ہمارے رونے سے سیل آگیا اور گھر تباہ ہو گیا لیکن اگر ہم ضبطِ گریہ سے کام لیتے تو گھر پھر بھی ویران ہو جاتا۔ اس کی مثال یوں سمجھنی چاہیئے کہ سمندر سمندر نہ ہوتا اور اس کا پانی بالکل خشک ہو جاتا تو اس کی جگہ بیاباں نکل آتا، جہاں خاک اڑتی۔ پانی کی فراوانی بھی بربادی کا باعث ہے اور پانی کے ناپید ہو جانے کا نتیجہ بھی بربادی کے سوا کچھ نہیں۔

۲۔ شرح :۔ ہم دل کی تنگی کا گلہ کیا کریں؟ اس کم بخت کی حالت ایسی ہے کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشان ہوتا۔ تنگی اور پریشانی متضاد کیفیتیں ہیں۔ اگر ایک کیفیت

نہ ہوتی تو اس کی جگہ دوسری لے لیتی۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہے یعنی رنج و ملال

۲۔ لغات۔ ورع : پرہیزگاری

رضواں : بہشت کا دربان۔

شرح : غالب اکثر اپنے شعروں میں بعض باتیں مقدر چھوڑ جاتے ہیں، جو بہ یک نظر واضح ہو جاتی ہیں۔ اس شعر میں بھی ایک حصہ مقدر ہے، یعنی ہم نے محبوب کے دربان کی ہزاروں منتیں کیں۔ اس سے مسلسل التجائیں کرتے رہے۔ محبوب سے دلی عقیدت و پرستاری کا واسطہ دیتے رہے، مگر اس نے کوئی بات نہ سنی اور ہمیں بار کا موقع ہی نہ دیا۔ کاش، رضوان محبوب کے گھر کا دربان ہوتا، کیونکہ وہ تو تقویٰ اور پرہیزگاری میں ایک عمر گزار دینے کے بعد بہشت کے اندر داخلے کی اجازت دے دیتا ہے۔ اگر اسے محبوب کے گھر کی دربانی کا منصب حاصل ہوتا تو یقیناً ہم سے وہ سلوک نہ کرتا، جو محبوب کے دربان نے کیا۔

○

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے، تو زانو پر دھرا ہوتا

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا، کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

۱۔ شرح : خواجہ حالی اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

" بالکل نئے طریق سے نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے اور ایک عجیب توقع پر معدوم محض ہونے کی تمنا کی ہے۔ پہلے مصرع کے معنی تو ظاہر ہیں۔ دوسرے مصرع سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ گر میں نہ ہوتا تو کیا برائی ہوتی، مگر قائل کا مقصود یہ ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو دیکھنا چاہیے کہ میں کیا چیز ہوتا۔ مطلب یہ کہ خدا ہوتا، کیونکہ پہلے مصرع میں بیان ہو چکا ہے کہ اگر

کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا۔

مقصد یہ ہے کہ وجود حقیقی ایک ہے اور وہ خدا ہے۔ اسی مبدائے فیض سے ہر وجود پیدا ہوا، جس کی ہستی عارضی ہے۔ اگر یہ وجود پیدا نہ ہوتے تو مبدائے حقیقی میں شامل ہوتے اور اس کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ کیونکہ جب کچھ نہیں تھا تو خدا تھا اور کچھ نہ ہوتا تو اس حالت میں بھی خدا ہوتا۔

۲۔ شرح :۔ جب غم کی فراوانی نے سر کو بے حس بنا دیا اور احساس کی صلاحیت ہی اس میں نہ رہی تو اس کے کٹ جانے کا کیا غم ہو سکتا ہے کیونکہ اگر یہ تن سے جدا نہ ہوتا تو بے حس و حرکت ہونے کے باعث زانو پر دھرا رہتا۔

اس میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ جب کوئی چیز بے حس اور بے حرکت ہو جائے تو اس کے کٹنے کا بھی کوئی احساس نہیں ہوتا۔

۳۔ شرح :۔ مدت ہوئی کہ غالب کا انتقال ہو چکا ہے۔ لیکن وہ اس لیے بار بار یاد آتا ہے کہ ہر بات پر کہا کرتا تھا: "یوں ہوتا تو کیا ہوتا۔"

"یوں ہوتا تو کیا ہوتا" سے مختلف پہلو نکالے جا سکتے ہیں۔ کسی کو کوئی صدمہ پیش آ گیا اور اس نے غالب سے ذکر کرتے ہوئے کہا کہ بھائی: میں تو مصیبت کا شکار ہو گیا۔ غالب نے اس کی توجہ اصل واقعے کی طرف سے منعطف کرتے ہوئے کہا کہ اگر یوں نہ ہوتا اور یوں ہوتا تو کیا ہو جاتا؟

دوسرا پہلو یہ ہے کہ کرید غالب کی ایک فطری خصوصیت تھی۔ اسی بنا پر وہ ہر واقعے کے متعلق کہا کرتا تھا کہ اگر یوں ہوتا تو کیا ہوتا۔ کرید کے علاوہ اس میں تمنا و ارمان کا پہلو بھی نکلتا ہے۔

○

یک ذرۂ زمیں نہیں بے کار باغ کا
یاں جادہ بھی، فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

۱۔ شرح :۔ بہار آ گئی ہے باغ کی زمین کا کوئی بھی ذرہ بیکار اور جوشِ نمو سے خالی نہیں رہا۔ جگہ جگہ کثرت

بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی
کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا

تازہ نہیں ہے، نشۂ فکرِ سخن مجھے
تریاکیٔ قدیم ہوں دودِ چراغ کا

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں، کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار
یہ مے کدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

باغِ شگفتہ تیرا، بساطِ نشاطِ دل
ابرِ بہار، خمکدہ کس کے دماغ کا

سبزہ اور پھول موجود ہیں۔ نمو کی فراوانی سے روشوں کی یہ حالت ہو گئی کہ پاؤں دھرنے کو جگہ نہیں ملتی اور خالی جگہیں اس درجہ محدود ہو گئی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ روشیں نہیں، بلکہ داغِ لالہ کے چراغوں کے لیے قدرت نے بتیوں کا انتظام کر دیا ہے۔

روش بالکل تنگ ہو تو چراغ کی بتی سے اس کی تشبیہ نہایت موزوں اور بالکل اچھوتی ہے۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس تنگ اور محدود جگہ میں بھی جوشِ نمو پایا جاتا ہے جس طرح بتی شعلے کی بدولت روشنی کا سروسامان کرتی ہے۔

شعر آمدِ بہار، پھولوں کی کثرت، رنگ و بو کی فراوانی اور نمو کی بہتات کی ایک عمدہ تصویر ہے

۲۔ لغات: آشوب: فتنہ، ہنگامہ، طوفان، جوش و خروش۔
آگہی: شعور، واقفیت، ہوشیاری، علم
ایاغ: شراب کا پیالہ۔ خط سے مراد وہ خطوط ہیں، جو شراب کی مقدار جانچنے کے لیے پیالے میں لگا دیئے جاتے تھے اور آج کل بھی یہ پیمانہ میکدوں اور دواخانوں میں استعمال ہوتا ہے۔

شرح : شراب سے بدمست ہونے بغیر حقائق کائنات کے متعلق شعور اور علم کا فتنہ و ہنگامہ کس کا دل برداشت کر سکتا ہے ؛ لیکن مصیبت یہ ہے کہ شراب پلانے والے بے حوصلگی و کم ظرفی سے کام لیتے ہیں ۔ وہ ناپ تول کر مقدار کے خط دیکھ دیکھ کر شراب پلاتے ہیں، جس سے وہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی کہ آشوب علم و آگاہی کا دُکھ درد دب جائے ۔ مثلاً یہ دُکھ کہ یہاں کی زندگی عارضی ہے اور انسان کو جلد رخت سفر باندھ کر دوسری دنیا کی طرف روانہ ہونا ہے یا یہ دُکھ کہ جن عزیزوں اور دوستوں سے ہمیں محبت ہے وہ بھی ہماری طرح آگے پیچھے یہاں سے رخصت ہو جائیں گے اور ہمیں ان کے فراق کا داغ برداشت کرنا پڑے گا ۔ یہ دکھ کہ دنیا میں حقیقی دوستی اور وفاداری بالکل ناپید نظر آتی ہے یہ اور اس قسم کی تمام چیزیں انسان کے لیے دُکھ ۔ پریشانی اور اذیت کا باعث ہوتی ہیں ۔ شراب ہوش و حواس سے عاری کر دینے کا ایک ذریعہ ہے اور اس ذریعے سے کام لیے بغیر حقیقتوں کا تحمل ممکن ہی نہیں ۔ مرزا نے ایک اور شعر میں بھی، سی قسم کا خیال ظاہر کیا ہے ، اگرچہ اس میں صراحتاً علم و آگاہی کا ذکر نہیں آیا ۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

صرف وہ شے، جسے اک گونہ بیخودی قرار دیا گیا ہے ، علم و آگاہی کے فتنہ و آشوب کو قابل برداشت بنا سکتی ہے ۔

۳ ۔ لغات : کاروبار : مشغولیتیں ، حرکتیں ، پیشہ

شرح :۔ بلبل پھولوں کے ساتھ عشق کے باعث دیوانی ہو رہی ہے ۔ اور بے اختیار آہ و فغاں کر رہی ہے ، لیکن پھول اس کی ان حرکتوں اور مشغولیتوں کی ہنسی اڑا رہے ہیں ۔ نہ بلبل کو اس حالت کا کوئی احساس ہے اور نہ پھول ہنسی ضبط کر لینے پر آمادہ ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے ، جس شے کو عشق کہتے ہیں ، وہ دماغ کی خرابی اور ...تر کے سوا کچھ نہیں ۔ خصوصیت سے اس لیے کہ عموماً دیوانوں ہی کی ہنسی اڑائی

جاتی ہے۔

۴۔ **لغات۔ تریاکی** : یہ لفظ تریاک سے بنا ہے، جسے "ک" اور "ق" دونوں سے لکھتے ہیں۔ "بہارِ عجم" کا بیان ہے کہ تریاک کو افیون کے معنی میں استعمال کرنا بعد کا واقعہ ہے، پہلے محض زہر مہرہ کے معنی تھے، لہذا یہاں تریاکی بہ معنی افیونی ہے۔
بقول طباطبائی دود یعنی دھواں استعارہ ہے فکرِ سخن کا اور چراغ استعارہ ہے کلام روشن کا۔

شرح :۔ میں نے حال میں شعر کہنا شروع نہیں کیا، فکرِ سخن کا نشہ تو بہت پرانا ہے، یعنی میں مدت سے افیونی چلا آتا ہوں اور روشن کلام کے لیے ابتدا سے فکر کا عادی ہوں۔

ایک تعبیر یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تریاک سے چنڈو مراد لیا جائے۔ چنڈو افیون کو پانی میں پکا کر بناتے ہیں اور بانس کی ایک نالی سے، جس کے ایک طرف چلم سی بنی ہوتی ہے۔ حقے کی طرح پیتے ہیں۔ چراغ کی لو سے چنڈو کو آگ دی جاتی ہے۔ چند سال پیشتر تک جنوبی ہند کے مختلف حصوں اور چین میں اس کا دستور عام تھا۔ چنڈو پینے والا چند کش لے کر بالکل بیہوش سا ہو جاتا تھا اور بعض اوقات چنڈو پلانے والے اس کا مال و متاع بھی ہتھیا لیتے تھے۔

اگر افیون کی جگہ یہاں چنڈو سمجھا جائے تو اس صورت میں شعر کی مناسبتیں زیادہ واضح ہو جاتی ہیں۔ معنی دونوں صورتوں میں وہی ہیں، جو اوپر بیان کیے گئے ہیں۔

۵۔ **لغات۔ فراغ** : آزادی۔ بے فکری۔ فراغت۔

شرح :۔ سو مرتبہ ہم عشق کی بندشوں سے آزاد ہوئے، لیکن کیا کریں، ہمارے دل کو آزادی اور بے فکری سے اتنی دشمنی ہے کہ وہ پھر کوئی نہ کوئی آفت اور الجھن پیدا کر لیتا ہے۔

یہاں بندِ عشق سے مراد عشقِ حقیقی نہیں، بلکہ معاملاتِ دنیا کا عشق ہے۔ یعنی کئی مرتبہ ہم نے دنیا کی الجھنوں سے دامن چھڑایا، لیکن دل پھر اسی جال میں جا

پھنسا ہے۔

۶۔ **شرح** : مولانا حسرت موہانی اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

شاعر : "دل میں خون کے نہ ہونے کا شاکی ہے، یعنی چاہتا ہے، آنکھ میں اشکوں کی راہ خونِ دل آئے، مگر نہیں آتا۔ پس آنکھ میں موجِ نگاہ غبار بن گئی، یعنی خونِ دل کے بغیر کچھ نظر نہیں آتا۔ پھر خونِ دل کو مکرر بطورِ تشبیہ باندھتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ میکدہ (آنکھ) مے (خونِ دل) کے تجسس ہی میں خراب ہے۔ شراب ملے تو آباد ہو اور خونِ دل آئے تو غبار دُور ہو، کیونکہ تری سے غبار دور ہو جاتا ہے۔ بہت پہلودار اور نہایت نازک و بلیغ مضمون ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ جس آنکھ سے خون دل نہیں بہتا، وہ اس لیے اندھی ہو جاتی ہے کہ اس میں نگاہ کی لہریں غبار بن جاتی ہیں اور قوت بینائی ختم ہو جاتی ہے۔ آرزو یہ ہے کہ یہ شراب خانہ (آنکھ) پھر شراب (خونِ دل) سے آباد ہو، اس کی خرابی اور ویرانی کی حالت ختم ہو جائے۔ نگاہ غبار کی لہر نہ رہے، بلکہ واقعی نگاہ بن جائے جس کا جوہر کمال بینائی ہے۔

۷۔ **شرح** : تیرے حسن کا سرسبز و شاداب اور شگفتہ باغ میرے دل کی خوشی اور راحت کا سروسامان ہے۔ باقی رہا موسم بہار کا بادل تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کس کے ذوق کا شراب خانہ ہے، مجھے تو اس سے کوئی دلبستگی نہیں، کیونکہ میری تو ہر راحت تیرے ہی باغِ حسن سے وابستہ ہے۔

الفاظ کی مناسبت ظاہر ہے اور مرزا غالب کا شاید ہی کوئی شعر ہو، جو مناسبت سے خالی نظر آئے۔ یہاں خمکدہ یعنی شراب خانہ ابر بہار کی مناسبت سے لائے ہیں اور دماغ سے نشے کی مناسبت بھی محتاج تشریح نہیں۔

○

وہ مری چینِ جبیں سے، غمِ پنہاں سمجھا
رازِ مکتوب بہ بے ربطیٔ عنواں سمجھا

یک الف بیش نہیں، صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں مَیں، جب سے کہ گریباں سمجھا

شرحِ اسبابِ گرفتاریٔ خاطر، مت پُوچھ
اس قدر تنگ ہُوا دل، کہ میں زنداں سمجھا

بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرمِ خرام
رخ پہ ہر قطرہ عرق، دیدۂ حیراں سمجھا

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخُو ہوگا
نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

سفرِ عشق میں کی ضُعف نے راحت طلبی
ہر قدم سائے کو مَیں اپنے شبستان سمجھا

تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دمِ مرگ
دفعِ پیکانِ قضا، اس قدر آساں سمجھا

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار، اسدؔ
غلطی کی کہ جو کافر کو مُسلماں سمجھا

۱۔ **شرح**: محبوب نے میری پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی دیکھیں تو سمجھ گیا کہ مجھے غم نے بری طرح ستا رکھا ہے۔ حالانکہ میں نے غم کو ضبط کرنے اور چھپائے رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ یہ ایسی ہی بات ہوئی، جیسے کسی خط کا سرنامہ بے ربط سا ہو اور دیکھنے والا اندازہ کرلے کہ خط کا مضمون کیا ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ عاشق نے تو ضبط میں کوئی کوتاہی نہ کی اور اس کی کوشش یہی تھی کہ غم کا راز محبوب پر ظاہر نہ ہو لیکن پیشانی کی شکنوں نے یہ راز فاش کر دیا۔ شعر میں پیشانی کی شکنوں کو سرنامے کی ربطی سے اور غمِ پنہاں کو رازِ مکتوب سے تشبیہ دی گئی ہے۔

۲۔ **شرح**: خود مرزا غالب اس کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

پہلے یہ سمجھنا چاہیئے کہ آئینہ عبارت فولاد کے آئینے سے ہے ورنہ جلی
آئینوں میں جوہر کہاں اور ان کو صیقل کون کرتا ہے۔ فولاد کی جن چیزوں
کو صیقل کروگے، بے شبہ پہلے ایک لکیر پڑے گی۔ اسے الفِ صیقل
کہتے ہیں، جب یہ مقدمہ معلوم ہوا تو اب اس مفہوم کو سمجھیے۔
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا
یعنی ابتدائے سنِ تمیز سے مشقِ جنون ہے۔ اب تک کمالِ فن حاصل
نہیں ہوا۔ آئینہ تمام صاف نہیں ہوگیا۔ بس وہی ایک لکیر صیقل
کی موجود ہے۔ چاک کی صورت الف کی سی ہوتی ہے اور چاکِ جیب
آثارِ جنوں میں سے ہے۔"
مطلب یہ ہے کہ تمیز اور شعور پیدا ہوتے ہی میں، گریباں چاک کرنے میں مشغول
ہوگیا اور آئینے کو جلا دینے اور زنگ صاف کردینے میں لگ گیا، لیکن اب تک
صرف اتنا ہی ہوسکا کہ آئینے میں صفائی کی صرف ایک لکیر پڑی ہے، جسے صیقل گر
الفِ صیقل کہتے ہیں۔
مولانا طباطبائی شعر کا مطلب یوں فرماتے ہیں، جب سے مجھے اتنا شعور پیدا
ہوا کہ دنیا کے تعلقات قائم رکھتے ہوئے صفائے نفس حاصل نہیں ہوسکتی میں نے
دنیا کو چھوڑ دیا اور دل کے آئینے کی صفائی میں مصروف ہوگیا، لیکن اب تک یہ آئینہ
پوری طرح صاف نہیں ہوا، البتہ اس میں صفائی کی ابتدائی علامت پیدا ہوگئی ہے۔
مضمون کا اصل زور اس نکتے پر ہے کہ شعور و تمیز پیدا ہوتے ہی یہ کام شروع
کردیا۔

۳۔ شرح :۔ میرے دل کے رنج و غم اور گرفتگی کے اسباب نہ پوچھیے
دل اتنا تنگ ہوگیا ہے کہ میں نے سمجھ لیا، یہ دل نہیں قید خانہ ہے۔
چونکہ قید خانے میں قیدی تنگ رہتے ہیں اور اس میں بجائے خود بندش کا
پہلو نمایاں ہے، اس لیے اسے دل تنگی کی موزوں تشبیہ مان لیا گیا۔

۴ - شرح : میری یعنی عاشق کی بدگمانی کا یہ عالم ہے کہ گوارا نہیں ، محبوب باہر نکل کر خرام ناز میں مصروف ہو ، کیونکہ وہ چل قدمی شروع کرے گا تو نزاکت کے باعث روے انور پر پسینے کے قطرے آ جائیں گے اور مجھے یہ گمان ہوگا کہ یہ پسینے کے قطرے نہیں ، بلکہ دیکھنے والوں کی آنکھیں ہیں ، جو محبوب کا حسن دیکھ کر حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئی ہیں ۔ ظاہر ہے کہ یہ شعر مرزا غالبؔ کے قول کے مطابق کوہ کندن وکاہ بر آوردن کا مصداق ہے ۔

۵ - شرح : میں نے اپنی عاجزی سے جان لیا کہ محبوب تند خو اور شعلہ مزاج ہوگا ۔ مثال یوں سمجھیے کہ تنکے کی نبض دیکھ کر جلتے ہوئے شعلے کی حرارت ، گرمی اور تپش کا اندازہ کر لیا جائے ۔

یہاں اپنے عجز کو خس سے اور محبوب کی بدخوئی کو شعلۂ سوزاں کی تپش سے تشبیہ دی ۔

۶ - لغات ۔ شبستان : خواب گاہ ۔ رات کو آرام کرنے کی جگہ ۔

شرح : عشق کی منزل میں سفر کرتے کرتے ضعف سے میرا یہ حال ہو گیا کہ ہر قدم پر اپنے ہی سایے کو خواب گاہ سمجھتا رہا ۔

ظاہر ہے کہ عشق کا سفر دشت و بیاباں ہی میں ہو سکتا تھا ، جہاں دور دور تک مکان یا درخت کا نشان تک نہ تھا ۔ اُدھر ضعف کو ایک قدم بھی اٹھانا گوارا نہ تھا ۔ اس بیکسی اور بے سامانی کے عالم میں اپنا ہی سایہ آرام گاہ معلوم ہونے لگا ۔ شعر میں ضعف اور بے سامانی کا نقشہ عجیب انداز میں کھینچا گیا ہے ؛ نیز اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سفرِ عشق کس قدر لمبا ، قوت و طاقت کھینچ لینے والا اور مصیبت خیز ہوتا ہے ۔

۷ - شرح : دل محبوب کی پلکوں کے تیر سے بچنے کی کوشش برابر کرتا رہا ۔ یہاں تک کہ موت آ گئی ، لیکن یہ تیر تو قضا کا تیر تھا ، جس سے بچنا ممکن ہی نہ تھا ، مگر دل نے نافہمی سے بچنا آسان سمجھ لیا ۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ زندگی میں کوئی دل لگن کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لگن ہی زندگی کا جوہر اور اس کی خوبی ہے۔ کوئی چاہے بھی تو اس سے محفوظ رہنا ممکن نہیں، البتہ موت آجائے تو لگن کا سوال ہی باقی نہیں رہے گا۔

۸۔ **شرح** : اے اسدؔ! تو نے کیوں محبوب کو وفادار سمجھ کر دل دے دیا یہ تو ایسی غلطی تھی، جیسے کسی کافر کو مسلمان سمجھ لیا جائے، یعنی محبوب سے وفا کی امید کبھی نہ رکھنی چاہیے، جس طرح کافر سے اسلام و ایمان کی امید نہیں رکھی جا سکتی۔

لطف یہ کہ جب تک محبوب بے وفا ہے، عشق کی گرمجوشی اور ہنگامہ خیزی قائم ہے۔ محبوب وفا پر آمادہ ہو جائے تو عشق کی آگ خود بخود افسردہ ہو کر رہ جائے گی۔

○

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا ۔۔۔ دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز ۔۔۔ پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

سادگی ہائے تمنا یعنی ۔۔۔ پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل ۔۔۔ نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی ۔۔۔ کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی ۔۔۔ گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں ۔۔۔ دل سے تنگ آکے جگر یاد آیا

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال ۔۔۔ دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے! ۔۔۔ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ   سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

۱۔ **لغات** : **جگر تشنہ** : تشنہ جگر، جس کا جگر پیاسا ہو یعنی پیاس کی آخری حد۔

شرح : میرے دل میں فریاد کی، نہائی پیاس اور تڑپ پیدا ہوئی۔ ساتھ ہی رونے والی آنکھ یاد آگئی اور میں نے سمجھ لیا کہ دل کی اس پیاس اور تڑپ کو صرف آنکھ ہی کی اشکباری بجھا اور مٹا سکتی ہے۔

۲۔ **شرح** :۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں :

" دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گزری تھی اور جو اس کے چلے جانے کے بعد رہ رہ کر یاد آتی ہے۔ اس میں جو کبھی کبھی کچھ وقفہ ہو جاتا ہے اسے قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا۔ ایسے بلیغ شعر اردو زبان میں کم دیکھے گئے ہیں جو حالت فی الواقع ایسے موقع پر گزرتی ہے، ان دو مصرعوں میں اس کی تصویر کھینچ دی ہے جس سے بہتر کسی اسلوب بیان میں یہ مضمون ادا نہیں ہو سکتا":

تیرے رخصت ہونے پر میرے لیے قیامت آگئی۔ ابھی وہ قیامت ٹھہری اور رکی نہ تھی کہ پھر تیرے رخصت ہونے کا وقت ذہن میں تازہ ہو گیا اور قیامت از سر نو برپا ہو گئی۔

۳۔ **لغات** ۔ **نیرنگ** : جادو، طلسم، فریب، حیلہ، عجائب و غرائب

غالب نے شعر میں نیرنگ، نظر کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اسے نیرنگ نظر (بے اضافت) بھی پڑھا جا سکتا ہے، یعنی وہ محبوب جس کی نظر سراپا طلسم اور سراپا فریب ہے نیرنگِ نظر (بہ اضافت) بھی پڑھ سکتے ہیں، یعنی وہ محبوب، جو نظر کے لیے سراپا طلسم اور سراپا فریب ہے۔

شرح :۔ میری تمنا کی سادگی اور خواہش و آرزو کے بھولپن کو دیکھیے کہ پھر وہی محبوب یاد آگیا، جس کی نظر سراپا طلسم اور سراپا فریب ہے۔

تمنا کی سادگی یہ ہے کہ جو اپنی خصوصیات کے اعتبار سے کوئی آرزو پوری نہیں

کرسکتا اور اس سے کوئی امید بر نہیں آسکتی، اسی کی تمنا کی جا رہی ہے اور اسی سے لطف و نوازش کی امید رکھی جا رہی ہے۔

۴۔ لغات : واماندگی : بیچارگی، بے بسی، مجبوری۔

شرح :۔ اے دل کی حسرت! میری بیچارگی اور مجبوری کا عذر قبول کرے میں آہ و فغاں کے لیے تیار تھا مگر جگر کا خیال آگیا کہ وہ تو ایک ہی آہ میں پھٹ جائے گا۔

واماندگی کا نقشہ چند ہی لفظوں میں کس درجہ نادر طریقے پر کھینچ دیا کہ ایک طرف دل کی حسرت آہ و فغاں کا تقاضا کر رہی ہے اور اس کے بغیر وہ پوری نہیں ہو سکتی، دوسری طرف جگر کا معاملہ سامنے ہے کہ وہ آہ و فغاں برداشت نہیں کر سکتا

۵۔ شرح : زندگی تیری گزرگاہ کی یاد کے بغیر بھی بسر ہو ہی جاتی لیکن اس یاد نے مجھے انتہائی رنج و الم کا تختۂ مشق بنا دیا۔ سوچتا ہوں کہ یہ یاد میرے دل میں کیوں تازہ ہوئی؟

شعر میں گزر جانے کا مفہوم "مرجانا" نہیں، جیسا کہ بعض شارحین نے سمجھا "بسر ہو جاتا" ہے۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ گزرگاہِ محبوب کی یاد کیوں تکلیف و اذیت کا باعث بنی ہے حسرت کے نزدیک رہ گزر یاد آنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عاشق گھر چھوڑ کر دیدار کے شوق میں گزرگاہ پر جا بیٹھا کہ گھر میں بھی بہرحال انتظار ہی انتظار ہے یہی انتظار گزرگاہ پر کرے گا۔ مولوی عبدالعلی والہ کا خیال ہے کہ عاشق کی زندگی کے کچھ دن محبوب کی گزرگاہ پر بسر ہوئے تھے، وہ دور یاد آگیا، جس کی وجہ سے زندگی کا گزرنا دشوار ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ گزرگاہ محبوب کی یاد تازہ ہونا اس وجہ سے ناقابل برداشت ہو گیا کہ وہ گزرگاہ رقیب کے گھر کو جاتی تھی۔ یا رقیب کا گھر اس گزرگاہ پر تھا۔ عاشق سب کچھ برداشت کر سکتا ہے، مگر رقیب پر محبوب کا خفیف سا بھی التفات برداشت نہیں کر سکتا، گزرگاہ یاد آنے کے خلاف فریاد کا اصل سبب یہی معلوم ہوتا ہے۔

۶۔ **شرح** :۔ فرماتے ہیں، اے محبوب! تیرے گھر کی بہار، رونق اور دلآویزی بہشت میں کہاں ہو گی؟ میں وہاں پہنچوں گا اور تیرے گھر کی یاد تازہ ہو گی تو بہشت کے دربان سے لازماً میری لڑائی شروع ہو جائے گی اور نہایت ہنگامہ خیز لڑائی ہو گی۔

لڑائی کے سبب دو ہو سکتے ہیں: اوّل میں کہوں گا، محبوب کا گھر بہشت سے بدرجہا بہتر ہے۔ رضوان کہے گا، تم غلط کہتے ہو، بہشت جیسی چیز کہیں موجود نہیں۔ دوسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ میں بہشت سے نکلنا چاہوں گا تاکہ تیرے گھر پہنچ جاؤں اور رضوان روکے گا، مجھے نکلنے نہ دے گا، اس طرح ہاتھا پائی سے لڑائی کی نوبت ہو جائے گی۔

۷۔ **شرح** : جب میرے پہلو میں جگر صحیح سالم موجود تھا تو اس کے بل بوتے پر جس طرح چاہتا تھا، فریاد کر لیتا تھا۔ اب مدّت ہوئی، جگر خون ہو کر بہ گیا، صرف دل میرے پاس رہ گیا۔ اس میں اتنی طاقت ہی نہیں کہ فریاد کی بنیاد بن سکے۔ نیز وہ اس لیے ساتھ نہیں دیتا کہ میں آہ و فریاد کروں گا تو محبوب کی رسوائی ہو گی۔ اس سے سخت تنگ آ گیا ہوں اور مجھے جگر یاد آ رہا ہے۔

۸۔ **شرح** : میرا خیال پھر تیرے کوچے کی طرف جا رہا ہے۔ شاید اسے گم شدہ دل یاد آ گیا اور اس لیے اُدھر جا رہا ہے کہ دل وہاں مل جائے گا۔ کیونکہ اس کے گم ہونے کی اور کوئی جگہ تو ہو ہی نہیں سکتی۔

۹۔ **شرح** : خواجہ حالیؔ فرماتے ہیں :

"اس شعر سے جو معنی فوراً متبادر ہوتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ جس دشت میں ہم ہیں، وہ اس قدر ویران ہے کہ اسے دیکھ کر گھر یاد آتا ہے، یعنی خوف معلوم ہوتا ہے۔ مگر ذرا غور کرنے کے بعد اس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے، ایسی ویرانی کہیں نہ ہو گی، مگر دشت بھی اس قدر ویران ہے کہ اسے دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے۔"

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں : "وحشت کی ویرانی میں مبالغہ اس لیے کیا کہ گھر کی ویرانی میں زیادتی لازم آئے، یعنی دشت میں ایسی ویرانی ہے، جیسی بعینہٖ میرے گھر

میں تھی، گویا یہ تشبیہ معکوس ہے"۔

۱۰۔ **شرح**: لڑکوں کا عام دستور یہی ہے کہ وہ دیوانوں کو اینٹ پتھر مارتے ہیں۔ اے اسد! میں نے بھی لڑکپن میں عام دستور کے مطابق مجنوں کو مارنے کے لیے پتھر اٹھایا، ساتھ ہی مجھے اپنا سر یاد آگیا۔ یعنی یا تو وہ پتھر اپنے ہی سر پہ مار لیا، جس سے واضح ہوتا ہے کہ لڑکپن ہی میں مجھے جنون شروع ہو گیا تھا یا یہ خیال آگیا کہ جب مجھ پہ اسی قسم کی کیفیت طاری ہو گی تو لڑکے مجھے بھی اسی طرح اینٹ پتھر ماریں گے۔

مولوی عبدالعلی والہ فرماتے ہیں: "اپنے سر کی چوٹ یاد آگئی" اس لیے طفلی میں مجنوں کے سر پہ سنگ اندازی نہ کی۔ گویا قائل نے لڑکپن سے اپنے آپ کو شوریدہ سر فرض کیا ہے، جس کے سبب سے سنگِ طفلاں کا مزہ چکھ چکا ہے۔

○

۱۔ **لغات**: عناں گیر: باگ تھام لینے والا۔ روک دینے والا، مانع

شرح: خطاب محبوب سے ہے۔ فرماتے ہیں: آپ کے آنے میں دیر ہو گئی۔ مگر اس دیر کا کوئی نہ کوئی سبب تو ہونا چاہیے۔ آپ کی سواری یقیناً مناسب موقع پر تیار ہو گئی تھی۔ اور آپ حسبِ وعدہ وقت پر آ سکتے تھے، لیکن کسی نے باگ تھام لی اور آپ کے آنے میں رکاوٹ کا باعث بنا، اس کشمکش میں دیر ہو گئی۔

شعر میں "کوئی" سے مراد میرا

ہوئی تاخیر، تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے، مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنجِ گرانباریِ زنجیر بھی تھا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یوسف اس کو کہوں، اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا

دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا ولے طالب تاثیر بھی تھا

پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے، پاس نہ آیا نہ سہی
آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ریختے کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

غیر اور رقیب ہے۔

۲۔ لغات : شائبہ : آمیزش، ملاوٹ، شک، شبہ۔

شرح : بیشک میں تباہ ہو گیا، لیکن اس کا گلہ شکوہ تم سے کروں تو یہ بالکل بیجا اور بے محل ہوگا کیونکہ اے محبوب! تم میری تباہی کا باعث نہ تھے، بلکہ اس میں میری قسمت کی خوبی بھی کارفرما تھی گویا یہ تباہی میری تقدیر میں لکھی ہوئی تھی پھر تم سے شکایت کا کون سا موقع ہے۔

بظاہر تقدیر کی خوبی بیان طنزاً استعمال ہوئی اور شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالبؔ کی تباہی کے دو سبب ہوئے، ایک محبوب دوسرا تقدیر، لیکن شاعر کی توجہ دونوں میں سے خوبیٔ تقدیر کی طرف زیادہ ہے۔

۳۔ لغات : فتراک : شکار بند، گھوڑے کی زین سے لگے ہوئے چمڑے کے تسمے، جن میں شکاری شکار باندھ کر لے آتے تھے۔

نخچیر : شکار

شرح : ممکن نہیں کہ تو مجھے فراموش کردے۔ اگر فراموش کر گیا ہو تو میں اتنا بتا دیتا ہوں کہ تیرے شکار بند میں کبھی ایک شکار بندھا ہوا تھا۔ میں وہی ہوں۔

شعر میں دو نکتے خصوصیت سے قابلِ غور ہیں۔ اوّل پتا بتانے کے سلسلے میں واضح کر دیا کہ پہلے بھی محبوب کی طرف سے ظلم و ستم میں کوئی کمی نہ تھی، یہاں تک کہ مجھے شکار کر کے فتراک میں باندھ کر لایا۔ دوسرا نکتہ یہ کہ ظلم و ستم سہ لینے کے باوجود محبوب نے مجھے فراموش کر دیا تو یہ بھی ظلم ہی ہوگا۔

۴۔ **لغات** ۔ گرانباری : بھاری ہونا۔

شرح : تیری محبت کے دیوانے کو زنجیریں پہنا کر قید میں ڈال دیا گیا، لیکن اس حالت میں بھی زلفِ گرہ گیر کی یاد بدستور تازہ رہی۔ البتہ ساتھ ساتھ زنجیر کے بھاری ہونے کی بھی تھوڑی سی تکلیف تھی۔

قید، وحشی، زلف اور زنجیر کی مناسبت تشریح کی محتاج نہیں۔ جو بات دیوانگی کا باعث تھی اور اس لیے قید ہونا پڑا، اس میں کوئی فرق نہ آیا۔ اگر کوئی نئی چیز ہوئی تو صرف یہ کہ زنجیر کا بوجھ مستزاد ہوا۔

۵۔ **شرح** : خواجہ حالؔی فرماتے ہیں :

"یہاں اس مطلب کو کہ معشوق نے آن کی آن اپنی صورت دکھادی تو اس سے کیا تسلی ہو سکتی ہے، اس طرح ادا کیا ہے : بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا !"

محبوب نے اپنے جمال کی جھلک اس طرح دکھائی، جیسے بجلی یکایک آنکھوں کے آگے کوند جاتی ہے۔ فرماتے ہیں، بھلا اس سے میرا دل کیونکر مطمئن ہو سکتا ہے ؟ میں تو آپ کی باتیں سننے کا بھی پیاسا تھا۔ آپ آئے تھے تو میرے شوق کے مطابق جلوہ دکھاتے اور دو چار باتیں کرتے تو کسی قدر تسکین ہوتی۔

خواجہ حالؔی نے غالب کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی ہے کہ آپ نے استعارہ و کنایہ و تمثیل کو، جو ادبیت کی جان اور شاعری کا ایمان ہے، ریختہ میں اپنے فارسی کلام سے

نسبتہً کم استعمال نہیں کیا۔ ریختہ گو شعراء نے اس کی طرف کم توجّہ کی ہے۔ استعارے صرف محاوراتِ اُردو میں بلاشبہ استعمال ہوتے ہیں، لیکن استعارے کے قصد سے نہیں، بلکہ محاورہ بندی کے شوق میں استعارے بلاقصد ان کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔

غالبؔ نے ایسے کنایے استعمال کیے، جو پوری عبارت اور پورے جملے کی شکل میں ہوں۔ اردو شاعری میں ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی۔ ایسی ایک روشن مثال یہ شعر بھی ہے۔

۶۔ **لغات** : **تعزیر** : سزا

شرح :۔ میں نے محبوب کو کمالِ حسن کی بنا پر یوسفؑ کہہ دیا اور اس پہلو کا خیال نہ کیا کہ حضرت یوسفؑ مصر پہنچے تھے تو عزیزِ مصر نے انھیں غلام کی حیثیت میں خریدا تھا۔ خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ انھوں نے برا نہ مانا اور خیر گزری۔ اگر وہ ناراض ہوجاتے اور بگڑ بیٹھتے تو یقیناً میں سزا پانے کے قابل تھا۔

شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ میرا محبوب حسن میں یوسف سے بڑھا ہوا ہے۔ اگر وہ کمتر سے تشبیہ دینے پر بگڑ جاتا تو میں سزا کا مستحق تھا۔

۷۔ **شرح** : غیر کو دیکھ کر میرا کلیجا کیوں ٹھنڈا نہ ہو؟ وہ میری طرح آہ و فغاں کرنے لگا، لیکن اس میں تاثیر کوئی نہ تھی، کیونکہ وہ سچے عشق سے بے بہرہ تھا اور صرف ہوس اس کے تمام کاموں میں کارفرما تھی۔ اس کی آہ و فغاں کو بے اثر دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا ہوگیا اور میں نے سمجھ لیا کہ وہ سچے عاشق کے طور طریقوں کی پیروی کرکے اس کا درجہ نہیں پا سکتا، لہٰذا اس سے پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں اور یہی امر کلیجے کی ٹھنڈک، نیز دل کے اطمینان کا باعث بن گیا۔

۸۔ **لغات** : **نام رکھنا** : عیب لگانا۔ الزام لگانا۔

آشفتہ سر : عاشق دیوانہ

جوانمیر : جواں مرگ۔ جوانی میں مرجانے والا۔

شرح : اگر فرہاد نے تیشہ چلانا اپنا پیشہ بنا لیا تو اس میں عیب کی کون سی

بات ہے ؛ اسے الزام کی بنیاد کیوں بناتے ہو ؛ اس کی شانِ مردانگی پر نظر ڈالو کہ جوانی ہی کے عالم میں انتہائی بے پروائی سے محبوب پر جان قربان کر دی۔ غرض وہ جوانمرگ بھی ہمارے ہی زمرے میں شامل تھا، جنھوں نے عشق کو دیوانگی کی حد تک پہنچا دیا ہے۔

۹۔ **لغات :** **ترکش :** تیردان، تیر رکھنے کا خول۔

شرح : ہم تو مرنے کے لیے تیار کھڑے تھے اور جان دے دینے میں ہمیں قطعاً دریغ نہ تھا، لیکن محبوب نے ہمارے پاس آنا گوارا نہ کیا اور اس کی تلوار ہماری زندگی کا فیصلہ اسی صورت میں کر سکتی تھی کہ وہ ہمارے قریب ہوتا۔ لیکن اگر اسے کسی وجہ سے ہمارے قریب آنا منظور نہ تھا تو کوئی مضائقہ نہ تھا، وہ دور سے ہمیں تیر کا نشانہ بنا سکتا تھا یہ بھی نہ ہوا۔ پھر کیا ہم یہ سمجھیں کہ اس کے ترکش میں کوئی تیر بھی نہ تھا۔

۱۰۔ **لغات :**۔ فرشتوں سے مراد وہ فرشتے ہیں، جنھیں کراماً کاتبین کہا جاتا ہے۔ وہ ہر انسان کے دائیں بائیں مقرر ہیں اور اس کی نیکیاں یا بدیاں لکھتے جاتے ہیں۔

شرح :۔ خواجہ حالی اس شعر کے سلسلے میں فرماتے ہیں :

"ہمارے جرم کے ثبوت کے لیے کسی کی شہادت ہونی ضرور ہے، صرف فرشتوں کا لکھنا کافی نہیں۔"

خدا کے مقرر کیے ہوئے فرشتوں کے متعلق خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ کوئی چیز خلافِ واقعہ لکھیں گے، لیکن غالب نے شوخی سے کام لے کر اس پورے معاملے کو عام انسانی عدالتوں کے دستور پر ڈھال لیا۔ یہاں کوئی بیان اُس وقت تک ثبوت کے درجے کو نہیں پہنچتا، جب تک اس کے لیے ایسے گواہ موجود نہ ہوں، جن کی گواہی جھٹلائی نہ جا سکے۔ چنانچہ غالب کہتے ہیں کہ کراماً کاتبین کے لکھے ہوئے اعمال ناموں پر خواہ مخواہ ہمیں پکڑا اور مجرم ٹھہرایا جاتا ہے، حالانکہ جو کچھ وہ لکھتے ہیں، اس کے ثبوت کے لیے ہمارا بھی کوئی آدمی پاس ہوتا ہے، جس کے دستخط

تصدیق کے طور پر لیے جاتے ہوں ؛ اگر ایسا نہیں ہوتا تو فرشتوں کی لکھی ہوئی تحریر یک طرفہ ہوگی اور اسے مسلم الثبوت نہیں مانا جا سکتا۔

۱۱۔ **لغات : ریختہ** : اردو کے اشعار۔ اردو کو ریختہ اس لیے کہنے لگے کہ یہ مختلف زبانوں کی آمیزش سے بنی۔ جیسے دیوار اینٹ، مٹی، چونے، سفیدی سے پختہ کرتے ہیں، اردو بھی ہندی، فارسی، ترکی، عربی وغیرہ زبانوں کے الفاظ سے مرکب ہے۔

شرح : مقطع فخریہ کہا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اے غالب! تمھیں اردو شاعری کے استاد نہیں ہو۔ جو زمانہ گزر چکا اس میں اس شاعری کا ایک استاد میر تقی میر بھی تھا۔ بے شک اس میں میر کے کمالِ سخن کا اعتراف کیا، لیکن غالب کی نکتہ نوازی ملاحظہ ہو کہ اسے لوگوں کا قول قرار دیا۔ "کہتے ہیں" کا صاف مطلب یہی ہے۔

○

لب خشک، در تشنگی مردگاں کا
زیارت کدہ ہوں، دل آزردگاں کا

ہمہ ناامیدی ہمہ بدگمانی
میں دل ہوں، فریبِ وفا خوردگاں کا

۱۔ **لغات : در تشنگی مُردگاں** : وہ لوگ، جو پیاسے مر گئے۔ جنھوں نے پوری عمر عشق کی سختیاں سہتے سہتے گزار دی اور ان کی کوئی بھی آرزو اس زندگی میں پوری نہ ہوئی۔

دل آزردگاں : جن کے دل دکھے ہوئے ہوں۔ تباہ حال عشاق۔

شرح : میں اُن لوگوں کا خشک لب ہوں جو پیاسے مر گئے جنھوں نے عشق و محبت میں سب کچھ لٹا دیا اور ان کی کوئی آرزو پوری نہ ہوئی۔ میں ان کی اس ناکامی و مایوسی کی کھلی ہوئی اور روشن شہادت ہوں، کیونکہ پیاس سے مرے ہوئے لوگوں کی موت کا سبب اس لب سے ظاہر ہو سکتا ہے، جس پر تری کا کوئی نشان نہ ہو۔ اسی لیے میں ان عاشقوں کی زیارت گاہ بن گیا ہوں، جن کے دل دکھے ہوئے ہیں اور عمر

ثابت قدمی سے گزار دینے کے باوجود ان کی کوئی آرزو بر نہ آئی۔

۲۔ **لغات** : **فریبِ وفا خوردگاں** : وفا کا فریب کھائے ہوئے لوگ یعنی وہ لوگ، جنھیں ابتدا میں یقین ہو گیا تھا کہ محبوب محبت میں وفاداری کا ثبوت دے گا، مگر اصل میں یہ یقین بے بنیاد تھا۔ وہ لوگ دھوکا کھا گئے اور فریب میں آگئے۔

شرح :۔ میں ان لوگوں کا دل ہوں، جو وفا کا فریب کھا چکے ہیں۔ ایسے دل میں صرف دو چیزیں باقی رہ سکتی ہیں، اول سراسر ناامیدی، دوم سراسر بدگمانی۔ ناامیدی اس لیے کہ شروع میں وفا کا یقین پیدا ہوا تھا تو جتنی امیدیں دل میں تھیں، وہ ایک ایک کر کے خون ہو گئیں۔ ایسا دل پھر کسی امید کا روادار نہیں ہو سکتا اور وہ واقعی سراپا ناامیدی بن جاتا ہے۔ بدگمانی اس لیے کہ جب وفا کا یقین ہوا تھا تو صرف نیک گمان تھا، لیکن جب واضح ہو گیا کہ یہ سراسر دھوکا اور فریب تھا تو بدگمانی نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ کسی بھی چیز پر نیک گمان پیدا ہونے کی گنجائش ہی نہ رہی۔

نفسیات کا بڑے سے بڑا ماہر وفا کا فریب کھائے ہوئے لوگوں کی طلب کی کیفیات کا تجزیہ اس سے بہتر نہیں کر سکتا۔

○

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا
چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

۱۔ **شرح** : اے ستمگر! تو نے کسی سے بھی دوستی کا حق ادا نہ کیا۔ جو ظلم مجھ پر نہ ہوا، وہ دوسروں پر کیا گیا۔ آخری مصرع کی مختلف تعبیریں ہو سکتی ہے، مثلاً :

۱۔ جو ظلم مجھ پر نہ کیے، ان کا نشانہ دوسروں یعنی میرے رقیبوں کو بنایا۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہُوا تھا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہُوا تھا

میں سادہ دل، آزردگیٔ یار سے خوش ہُوں
یعنی سبقِ شوقِ مکرّر نہ ہُوا تھا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہُوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہُوا تھا

جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مرے تحصیل
آتش کدہ، جاگیرِ سمندر نہ ہُوا تھا

اس لیے ستم ہے کہ عاشق کو محبوب کا ظلم بھی دوسروں پر گوارا نہیں کیونکہ ظلم وستم بھی بہرحال ربط وتعلق ہی کی ایک شکل ہے جس کا اندازہ مرزا نے ایک سے زیادہ مقامات پر کیا ہے، مثلاً:

لاگ ہو اس کو تو ہم سمجھیں لگاؤ
یا
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے

۲۔ مجھ پر تُو نے جو ظلم کیے وہ دوسروں پر نہ ہوتے۔ یعنی تُو نے ظلم تو سب پر کیے اور تیری ستم گری یقیناً ستم ہے، اگرچہ مجھے ہدفِ ظلم بننے میں دوسروں پر امتیاز حاصل ہے۔

۲۔ **لغات۔ نخشب**: ترکستان کا ایک شہر، جسے ایرانی نخشب اور عربی نسف کہتے تھے۔ آج کل اس کا نام قرشی ہے۔ یہیں ابن المقنّع کا مرکز تھا، جسے خراسان کا نقاب پوش مدعیِ نبوت قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے یہاں کئی کرشمے دکھا کر لوگوں کو اپنا معتقد بنا لیا تھا۔ ان میں سے ایک چیز کنوئیں سے باہر نکلتی تھی اور لوگ اسے چاند سمجھتے تھے۔ کیونکہ اس کی شکل چاند سے ملتی جلتی تھی اور اس کی روشنی بھی تھوڑی سی دُور تک ہوتی تھی۔ یہی چاند فارسی اور اردو ادبیات میں مہِ نخشب کہلایا اور ایرانی ابن المقنّع کو سازندۂ ماہ یعنی چاند بنانے والا کہنے لگے۔ یہ چاند تھوڑی ہی مدّت کے بعد پھٹ کر برباد ہوگیا۔

شعر میں سورج کو اس لیے ماہِ نخشب سے تشبیہ دی کہ غالب کے نزدیک وہ بھی ابن مقنع کے چاند کی طرح ناقص الخلقت ہے۔

شرح : سورج ابھی تک حسن و جمال میں میرے محبوب کے برابر نہیں پہنچا تھا کہ نخشب کے چاند کی طرح قضا کے ہاتھ نے اسے ناقص ہی چھوڑ دیا تاکہ نہ درجۂ کمال کو پہنچے، نہ میرے محبوب کے برابر آئے، نہ میرے محبوب کی یکتائی پر کوئی اثر پڑے۔

۳۔ **شرح** : خواجہ حالی مرحوم فرماتے ہیں :

"بالکل نیا، اچھوتا اور باریک خیال ہے اور نہایت صفائی و عمدگی سے اسے ادا کیا ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ جس قدر ہمت عالی ہوتی ہے، اسی کے موافق اس کی تائید غیب سے ہوتی ہے اور ثبوت یہ ہے کہ قطرۂ اشک جیسے آنکھوں میں جگہ ملی ہے۔ اگر اس کی ہمت جب کہ وہ دریا میں تھا، موتی بننے پر قانع ہو جاتی تو اس کو، جیسا کہ ظاہر ہے، یہ درجہ یعنی آنکھوں میں جگہ ملنے کا حاصل نہ ہوتا۔"

شعر کا بنیادی مضمون خواجہ حالی کے ارشاد کے مطابق یہی ہے کہ فطرت ازل سے ہر وجود کی تائید و حمایت اس کی ہمت کے مطابق کرتی ہے۔ انسانوں میں مراتب عمل کا جو فرق ہے، وہ بھی ہمت ہی کی کمی بیشی کا نتیجہ ہے۔ اس کے لیے دلیل ایسی پیش کی، جو ہر شخص کی نگاہوں کے سامنے ہے اور اس کے ثبوت میں کسی کو بھی تامل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اگر قطرہ دریا میں رہ کر اور آغوشِ صدف کی تربیت پا کر موتی بن جاتا تو اس کے لیے بھی بلندی حاصل کرنے کے کئی موقعے تھے، جیسے ہار میں جگہ پا کر حسینوں کے گلے تک پہنچ جاتا، زیور کی آرائش بن کر کانوں تک رسائی حاصل کر لیتا، بادشاہوں کے تاج میں شامل ہو کر سر پر پہنچ جاتا۔ لیکن اس نے ایسی کوئی رفعت قبول نہ کی، کیونکہ اس کی ہمت بہت بلند تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے آنسو بن کر آنکھ میں جگہ پائی اور اس سے بلند تر رتبہ کوئی نہیں ہو سکتا۔

۴ - **شرح** :۔ قامتِ محبوب کو عموماً قیامت سے تشبیہ دیتے ہیں، کیونکہ اس کائنات کی کوئی دوسری اٹھان قامتِ محبوب کے مقابلے پر نہیں آسکتی۔ اسی لحاظ سے محبوب کے خرامِ ناز کو فتنۂ قیامت یا فتنۂ محشر کہتے ہیں اور خود قیامت کو فتنے ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ قیامت کے فتنے کی باتیں تو بارہا سنی تھیں، لیکن دل کو یقین نہیں آتا تھا۔ جب قامتِ محبوب کا رنگ ڈھنگ دیکھا تو یقین ہو گیا کہ واقعی فتنۂ محشر کے متعلق جو کچھ کہا جاتا تھا، وہ بالکل درست ہے۔

ظاہر ہے کہ کسی نادیدہ چیز کا یقین پیدا کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی مثبت شہادت سامنے ہونی چاہیئے۔ قدِ یار کے عالم نے شاعر کو فتنے کا معتقد بنا دیا۔

۵ - **شرح** :۔ میں سادہ دل اور سادہ لوح سا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ محبوب کے آزردہ و رنجیدہ ہو جانے پر خوش ہوتا ہوں، کیونکہ اس طرح معاملاتِ عشق کا سبق دہرانے کا موقع مل جائے گا۔

شاعر کا مدعا یہ ہے کہ محبوب رنجیدہ ہو گا تو مجھے موقع ملے گا کہ اس کے سامنے حاضر ہو کر اپنے عشق و محبت کی کیفیت بیان کروں۔ بتاؤں کہ میں آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس سلسلے میں گلے شکوے بھی ہوں گے۔ یہ تمام باتیں پہلے مرحلے پر دل خوشی کا باعث ہی تھیں، کیونکہ رنجیدگی کے بعد محبوب سے صلح ہو گئی تھی۔ عاشق چاہتا ہے کہ وہ سارا قصّہ نئے سرے سے دہرایا جائے۔ لہٰذا اپنی سادہ دلی سے محبوب کو رنجیدہ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ محبت کا رشتہ نئے سرے سے استوار ہو گا تو اس میں زیادہ استحکام پیدا ہو جائے گا، جس طرح سبق دُہرا لیا جائے تو خوب یاد ہو جاتا ہے۔ اس پوری آرزو کو سادہ دلی اس لیے کہا کہ عاشق یہ اندازہ نہ کر سکا۔ ایک مرتبہ تعلقات درست ہو جانے کے بعد ضروری نہیں کہ دوبارہ ویسا ہی رابطہ قائم ہو جائے۔

۶ - **لغات**۔ معاصی : معصیت کی جمع۔ گناہ

تنگ آبی : پانی کی کمی۔

دوسرے مصرع میں "دامن تر نہ ہوا تھا" میں ایک لطف یہ بھی ہے کہ محاورے میں "دامنِ تر" گنہگاری کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

شرح :۔ خواجہ حالی اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"گناہ کرنے میں ہمارا حوصلہ اس قدر فراخ ہے کہ باوجودیکہ دریائے معاصی خشک ہوگیا، مگر ابھی ہمارے دامن کا پلّہ تک نہیں بھیگا"

گناہوں کے دریا میں شاید پانی تھوڑا تھا کہ وہ بالکل خشک ہوگیا، حالانکہ ہم ابھی تک اپنے دامن کا ایک کونا بھی بھگو نہیں سکے تھے۔ شعر میں دو نکتے بہ طور خاص قابلِ غور ہیں، اوّل یہ کہ گناہوں کے دریا میں حقیقتہً پانی کم نہ تھا، لیکن گنہگار کے دامن کا گوشہ اتنا پانی اپنے اندر جذب کر گیا کہ احساس ہوا، شاید اس میں پانی ہی کم تھا۔ اگر حقیقتہً پانی کم ہوتا تو اس کے لیے "دریا" کا لفظ استعمال کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی مطلب یہ کہ دریا میں پانی کی کمی نہ تھی، مگر گنہگار کی باحوصلگی نے اسے فرومایہ بنا دیا۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ یہ دریا دامن کا گوشہ یا کنارہ بھی تر نہ کر سکا۔

۷ ۔ لغات : تحصیل : حاصل کرنا، استفادہ

سَمَندر : بڑے چوہے کے برابر ایک جانور جس کے متعلق فارسی اور اردو ادب میں یہ افسانہ مشہور ہے کہ وہ آگ میں پیدا ہوتا ہے اور وہیں رہتا ہے، جیسے مچھلیاں اور دوسرے آبی جانور پانی میں رہتے ہیں اور آگ سے باہر نکالیں تو مر جاتا ہے۔ بعض اسے پردار جانور قرار دیتے ہیں۔ اور اسی کا دوسرا نام مرغ آتش خوار ہے۔ یہ "سام" اور "اندر" سے مرکب ہے۔ سام، آگ اور اندر حرف ظرف۔ ایسا کوئی جانور یا پرندہ اب تک دریافت نہیں ہوا۔

انگریزی کا لفظ سالامنڈر SALMANDER لاطینی یونانی لفظ سالامنڈرا سے مشتق ہے۔ یہ گرگٹ جیسا ایک جانور ہوتا ہے، جس کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ آگ میں بھی زندہ رہتا ہے اگر یہ درست ہے تو ظاہر ہے کہ سَمَندر سالامنڈر سے بنا ہے

کہ سام اور اندھے ۔

شرح :۔ اے اسد! میرے جگر کا داغ اُسی وقت سے آگ کا سرچشمہ بنا ہوا ہے اور میں اس سے آگ حاصل کر رہا ہوں، جب آتش کدے میں سمندر نام جانور پیدا بھی نہیں ہوا تھا اور آتش کدے کو اپنا خاص مرکز و مقام بنا لینے کا معاملہ تو پیدائش کے بعد کا ہو سکتا ہے۔

مطلب یہ کہ میں اس وقت سے آتشِ عشق میں جل بھُن رہا ہوں، جب اس طرح جلنے بھُننے والے معرضِ وجود ہی میں نہیں آئے تھے۔ گویا ازل سے میرا شیوہ یہی ہے۔

○

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع، خارِ کسوتِ فانوس تھا

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کس قدر یا رب! ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

حاصلِ اُلفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو
دل بہ دل پیوستہ، گویا اک لبِ افسوس تھا

کیا کہوں بیماریٔ غم کی فراغت کا بیان
جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

۱۔ **لغات** ۔ **خلوت** : تنہائی علیحدگی۔ وہ مقام، جہاں کوئی دوسرا نہ ہو۔

ناموس : عزت، آبرو شرم، حیا۔

رشتۂ شمع : موم بتی کے اندر کا دھاگا۔

کسوت : لباس۔ کسوتِ فانوس اس باریک کپڑے کو کہتے ہیں، جو فانوس پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ اور آج کل بعض اوقات اسے بجلی کے بلبوں پر بھی چڑھا لیتے ہیں۔

شرح : رات میرا محبوب عزت و حرمت اور شرم و حیا کی تنہائی میں بیٹھا ہوا تھا اور پوری خلوت حسن و جمال کے جلوؤں سے جگمگا رہی تھی۔ ہر طرف شمعیں روشن تھیں

اور محبوب کی جلوہ آرائیاں دیکھ کر ندامت سے پانی پانی ہو رہی تھیں۔ ان کے اندر جو دھاگے تھے، وہ فانوس کے لباس میں کانٹوں کی طرح کھٹک رہے تھے۔

مراد یہ ہے، محبوب کی بزمِ خلوت میں شرم و حیا کا یہ عالم تھا کہ شمعیں پگھلی جا رہی تھیں اور فانوسوں کی بیقراری کا یہ عالم تھا، جیسے ان کے لباس میں کانٹے خلش کا سامان بن گئے۔

۲۔ **لغات**۔ مشہد : مقامِ شہادت۔

پابوس۔ قدم چومنا۔ پاؤں کو بوسہ دینا۔

شرح :۔ جس مقام پر عاشق نے شہادت پائی، وہاں اردگرد کوسوں تک مہندی اُگ رہی ہے۔ اس سے واضح ہو سکتا ہے، عاشق کے دل میں محبوب کے قدم چومنے کی حسرت کس قدر بھری ہوئی تھی کہ وہ جان لیوا ثابت ہوئی۔

مہندی کے اُگنے سے شاعر نے یہ مضمون پیدا کر لیا کہ یہ عاشق کے خون سے تیار ہوئی۔ اس کی آرزو یہ ہے کہ کٹے پسے اور محبوب کے پاؤں میں لگائی جائے۔ اس طرح پاؤں چومنے کی حسرت کی تلافی ہو جائے۔

۳۔ **لغات**۔ شکستِ آرزو : آرزو کا ٹوٹنا۔ یعنی خون ہونا۔

شرح : محبت و الفت کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ دیکھا کہ آرزوؤں کا خون ہوتا ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ جب محب و محبوب کے دل باہم ملتے ہیں تو وہ ایسے لبوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جن سے لفظ افسوس نکلے۔

شعر میں لطف ہر خوبی کا ایک پہلو یہ ہے کہ لفظ "افسوس" بولا جائے تو دونوں لب ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ یہاں "افسوس" کا لفظ لانے کا مدعا ہی یہ ہے کہ دو دل پیوستہ ہو کر دو لب بنتے ہیں۔ مگر "افسوس" کہتے ہی جدا ہو جاتے ہیں۔ گویا محب و محبوب کے دل ملنا ہی تفرقے اور جدائی کا سبب بن جاتا ہے۔

۴۔ **لغات**۔ کیموس : معدے میں غذا کی تحلیل کے دو مرحلے ہیں، اول کیلوس، یعنی غذا معدے میں پہنچتی ہے۔ تو حرارت اسے پکا کر عرق نکال لیتی ہے۔

دوسرا مرحلہ کیموس کا ہے۔ یہ عرق جگر میں پہنچتا ہے تو وہ اسے خون بنا دیتا ہے۔ اسے ہضم جگری بھی کہتے ہیں۔ کیلوس اور کیموس دونوں لفظ اصل میں یونانی ہیں۔

شرح :۔ غم عشق کی بیماری سے جو فراغت نصیب ہوئی، اس کا کیا بیان کروں۔ بس یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ میں نے جو خون کھایا، اس میں کیموس کا احسان نہ اٹھایا۔

انسان بیمار ہو جائے تو اس کے ہضم پر بھی کم و بیش اثر پڑتا ہے، خصوصاً خاص بیماریوں میں کیموس یعنی ہضم جگری خراب ہو جاتا ہے، لیکن غم عشق کی بیماری ایسی تھی کہ اس نے کیموس کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ اس کے بغیر ہی خون بن بن کر کھانے کو ملتا گیا۔

○

آئینہ دیکھ، اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے
اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

۱۔ **شرح** :۔ محبوب کو بڑا دعویٰ تھا کہ میں کسی کو دل نہیں دے سکتا ساتھ ہی حیرت بھی تھی کہ ہر شخص اس کا شیدائی کیوں بن جاتا ہے اور کیوں کہا جاتا ہے کہ دل مجھے دے بیٹھے۔ جب آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو اسے ایک نیا حسین سمجھ کر محبوب اپنا سا منہ لے کر رہ گیا، یعنی جھینپ کر رہ گیا، کیونکہ اسے دل دیے اور اس کا شیدائی ہوئے بغیر چارہ نہ رہا۔

اب سوچیے کہ حسن و جمال کے جس عکس پر محبوب فریفتہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اس پر دوسرے دل و جان نچھاور کرنے کے لیے تیار ہوں تو تعجب کا کون سا مقام ہے؟

۲۔ **شرح** :۔ عاشق نے خط دے کر قاصد کو محبوب کے پاس بھیجا۔ محبوب

کو اتنا غصّہ آیا کہ اپنے ہاتھ سے قاصد کی گردن اڑانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اب عاشق پریشان ہو کر کہہ رہا ہے کہ اسے کیوں قتل کرتے ہیں، اس کی تو کوئی خطا نہیں، قصوروار تو میں ہوں۔ جو سزا دینی چاہتے ہیں، مجھے دیجیے۔

" اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے" کے دو پہلو ہیں، اوّل رشک کا پہلو یعنی یہ کہ محبوب کے ہاتھ سے قاصد کا قتل ہونا منظور نہیں اور عاشق چاہتا ہے کہ اس کے ہاتھ سے مارا جائے، اور کسی پر اس کا ہاتھ نہ اُٹھے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر محبوب نے اپنے ہاتھ سے قاصد کو قتل کیا تو مجرم وہ ٹھہرے گا۔

○

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہُوں شمعِ کُشتہ، درخورِ محفل نہیں رہا

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے
یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حُسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

۱۔ شرح :- میں عشق کی نیازمندی کے وظیفے ادا کرنے کے لائق نہیں رہا اور جس دل کے بل پر یہ تمام وظیفے ادا کرنے کا مجھے فخر تھا، وہ دل ہی اصل صلاحیت کھو بیٹھا ہے۔

عشق کی نیازمندی کے فرائض کیا ہیں؟ عاجزی، حیرانی، پریشانی خانہ ویرانی، بے وفائی کے رنج، فراق کی مصیبتیں، تغافل کے صدمے محبوب کی طرف سے ہر قسم کی سختیاں ہونے کے باوجود صبر سے کام لینا بلکہ غیروں پر التفات کی جانگدازیاں بھی برداشت کر لینا۔ یہ تمام صلاحیتیں جاتی رہیں، کیونکہ دل کی پہلی حالت

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

دل سے ہوائے کِشت وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرت حاصل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

ہی باقی نہ رہی جس پر مجھے فخر و ناز تھا۔

۲۔ **لغات۔ شمعِ کُشتہ:** بجھی ہوئی شمع۔

درخورؔ: قابل، لائق، شایاں

شرح:۔ میں زندگی کی حسرت کا داغ ساتھ لیے جا رہا ہوں۔ یعنی میں نے زندگی میں کوئی راحت و آسائش نہ دیکھی۔ میری کوئی آرزو پوری نہ ہوئی، ہر قدم پر نامرادی سے سابقہ پڑا، ہر تمنا خون ہو کر بہتی رہی۔ ایسی زندگی کو حسرتِ زندگی کے داغ کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے اور اس سے بہتر تعبیر ہو بھی کیا سکتی ہے ؟ میری حالت اس شمع کی سی ہے جو گُل ہو چکی ہو اور روشنی سے بالکل محروم ہو جائے۔ ایسی شمع کو کبھی بزم میں رکھے جانے کے لائق نہیں سمجھا جاتا اور بجھتے ہی معاً اسے اٹھا دیا جاتا ہے۔

داغِ حسرتِ ہستی کو بجھی ہوئی شمع سے تعبیر کرنا سخنوری کا ایسا کمال ہے جو بیان سے کہیں زیادہ غور و فکر کا محتاج ہے۔ دیکھیے یہ ہے غالب کی حقیقی شاعری کے چند الفاظ ہیں، اور ایک عام تشبیہ، لیکن شعر میں اتنا سوز اور درد بھر دیا ہے کہ تفصیل صبح سے شام تک کرتے جائیے، مگر اس کے معارف و محاسن ختم نہیں ہو سکتے۔

۳۔ **شرح:**۔ اے دل! اب مرنے کا کوئی اور ہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے، کیونکہ میری حالت اب ایسی نہیں رہی کہ محبوب کے دست و بازو کی تیغ آزمائی کے قابل سمجھا جاؤں۔

شعر میں خوبی کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ عاشق خود اپنے آپ سے یہ سب کچھ کہہ رہا ہے۔ یعنی اسے محبوب کے دست و بازو کے کمالات اور یگانگی کا بھی

پورا اندازہ ہے، پھر اپنی حیثیت بھی ٹھیک ٹھیک سمجھا جاتا ہے۔ دونوں چیزیں برابر رکھ کر انھیں تولتے ہوئے کہتا ہے: میں تو اس قابل نہیں کہ محبوب مجھے قتل کرے، البتہ مرنا ضروری ہے، لہٰذا اس کی کوئی اور تدبیر کرلینی چاہیئے۔ لطف یہ کہ کوئی تدبیر معین نہیں کی، سننے والے کو موقع دے دیا کہ جتنی تدبیریں اس کے ذہن میں آسکتی ہیں، لے آئے۔ ان تدبیروں میں زہر کھا کر مرنے، ڈوب جانے کسی بلندی سے نیچے گرنے وغیرہ ہر قسم کی تدبیریں شامل ہیں۔ انھیں غیر معین چھوڑ دینے سے شعر میں ایک نیا لطف پیدا ہوگیا۔

بعض اصحاب نے کہا ہے کہ غالبؔ کا یہ شعر نظیریؔ کے اس شعر سے ماخوذ ہے۔

آں شکارم من کہ لائق ہم بہ کشتن نیستم
شرم می آید مرا زاں کس کہ صیادِ من است

میں وہ شکار ہوں کہ مارے جانے کے بھی لائق نہیں، مجھے اس شخص سے شرم آتی ہے، جو میرا شکاری بنے۔

ظاہر ہے کہ دونوں شعروں میں حقیقتہً کوئی مناسبت نہیں۔ ایک شخص کہتا ہے کہ میں مارے جانے کے بھی قابل نہیں، لہٰذا مجھے اپنے صیاد سے شرم آتی ہے اور یہ ایک عام شعر ہے، جس کا تغزل محلِ نظر ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ میں محبوب کے ہاتھوں مارے جانے کے لائق تو نہیں رہا۔ پھر دل سے خطاب کرتا ہے کہ مرنے کی کوئی اور ہی تدبیر کرنی چاہیئے۔

۴۔ لغات۔ **شش جہت** : چھ طرفیں یعنی دائیں بائیں آگے پیچھے اوپر نیچے، اس سے مراد ہے۔ عالم، کائنات۔

شرح :۔ کائنات کے منہ پر آئینے کا دروازہ کھلا ہوا ہے، یعنی پوری کائنات کے سامنے آئینہ رکھا ہے۔ یہاں ناقص اور کامل، کھوٹے اور کھرے کے درمیان کوئی امتیاز اور کوئی فرق باقی نہیں رہا۔

آئینے کی خاصیت ہی یہ ہے کہ جس چیز کا عکس اس میں پڑے، اسے بے کم و کاست

آشکارا کر دیتا ہے ۔ اگر ناقص اس میں اپنا چہرہ دیکھے گا تو تمام نقص واضح ہو جائیں گے ۔ آگ کا عکس آگ ہی کی شکل میں نظر آئے گا۔ نہ کہ پانی کی شکل میں۔ ناقص و کامل، کھوٹے اور کھرے کے درمیان امتیاز ہو سکتے ہیں، لیکن کائنات کے آئینے میں کسی کے لیے کوئی امتیاز نہیں۔

شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آئینہ سامنے کھلا رکھا ہے ناقص ہو یا کامل، دونوں اسے دیکھ کر حیران ہیں، کیونکہ حقیقت کا راز نہیں پا سکتے ۔ راز نہ پا سکنے میں ناقص و کامل کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

۵ ۔ لغات ۔ حائل : بیچ میں آجانے والا، روک، آڑ ۔

شرح :۔ حسنِ حقیقی کے شوقِ نمائش نے نقاب کے ہر ڈورے کی گرہ کھول دی ہے، یعنی تمام پردے اٹھا دیے ہیں، اب ہماری نگاہ کے سوا کوئی روک کوئی آڑ اور کوئی پردہ موجود نہیں رہا، یعنی ہماری نگاہ میں دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں وہ خود ایک پردہ بن گئی ہے، ورنہ حسنِ حقیقی نے تو جمال کی نمائش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

شعر میں قابل غور لفظ "شوق" ہے۔ اگر اس سے دیکھنے والے کا شوقِ بیتاب مراد لی جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس شوقِ بیتاب نے حسن کے تمام پردے اٹھا دیے وہ اپنی نگاہ کا پردہ کیوں نہ اٹھا سکا اور اس میں بینائی کی صلاحیت کیوں پیدا نہ کر سکا؟ صحیح یہ ہے کہ شوق سے حسن کی نمود و نمائش کا شوق مراد لی جائے ۔ یعنی حسن تو ذرّے ذرّے میں پھیلا ہوا ہے ، مگر ہمارے پاس دیکھنے والی نگاہ ہی نہیں۔

۶ ۔ لغات ۔ رہین : گِرو ۔ وقف ۔

شرح :۔ اگرچہ میں زمانے کے جور و ستم میں گرو رہا، یعنی جور و ستم نے مجھ پر پوری طرح قابو پائے رکھا، لیکن اس حالت میں بھی میں اے محبوب! ترے خیال سے غافل نہیں رہا ۔ تیری یاد بدستور میرے دل میں تازہ رہی ۔ زمانے کی کوئی گردش میرے عشق و محبت پر اثر انداز نہ ہو سکی ۔

۷۔ لغات۔ ہوا : آرزو۔ خواہش

شرح :۔ اب میرے دل سے وفا کی کھیتی کی آرزو ہی مٹ گئی۔ کیونکہ ہاں سے حاصل یعنی پیداوار کی حسرت و نامرادی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آسکتا۔ ظاہر ہے کہ جس فصل سے کچھ ہاتھ آنے اور کچھ پھل ملنے کی امید نہ ہو، اسے بونے یا اس کی آبیاری کرنے کی آرزو سراسر لاحاصل ہوگی۔ ہم بھی وفا کی کشت کاری میں سرگرم رہے۔ اس کے ساتھ ہماری بڑی آرزوئیں وابستہ تھیں، لیکن تجربے سے یہی ظاہر ہوا کہ یہ کھیتی کچھ پیداوار نہیں دے سکتی۔

"وفا" کو عام معنی میں بھی استعمال کر سکتے ہیں، یعنی دوستوں کی وفا، خویش و اقارب کی وفا اور وفائے محبوب بھی مراد لے سکتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ وفا سے حسرت کے سوا کچھ مل نہیں سکتا۔

۸۔ **شرح** :۔ اے اسدؔ! میں ان تکلیفوں، مصیبتوں اور پریشانیوں سے ہرگز نہیں ڈرتا، جو عشق کا خاصہ ہیں اور کسی عاشق کو ان سے مفر نہیں، لیکن کیا کروں کہ جس دل پر مجھے فخر و ناز تھا، وہی اپنی پہلی حیثیت کھو بیٹھا ہے اور میرا ساتھ نہیں دے سکتا۔

○ ○

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے، کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

ذرّہ ذرّہ ساغرِ مے خانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں، بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرّہ صحرا دست گاہ و قطرہ دریا آشنا

۱۔ **شرح** : عاشق کش مکش میں پھنس گیا ہے۔ ایک طرف رشک اسے یہ بتاتا ہے کہ محبوب نے رقیب سے اخلاص، مہر و محبت اور میل جول کی جو روش اختیار کر رکھی ہے، وہ افسوس کا باعث ہے اور رشک کا تقاضا ہی یہ ہے

میں، اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

شکوہ سنجِ رشکِ ہم دیگر نہ رہنا چاہیئے
میرا زانو مونس، اور آئینہ تیرا آشنا

ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گُل نا آشنا

کوہ کن، نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

کہ وہ نہ تو محبوب سے کسی کی محبت برداشت کر سکتا ہے اور نہ کسی پر محبوب کے التفات کا روادار ہو سکتا ہے۔ اس اثنا میں عقلِ سلیم رشک کی نفی کرتی ہے اور کہتی ہے بھلا وہ محبوب، جو سراسر بے مہر ہے اور اس کی فطرت میں محبت کا جوہر موجود ہی نہیں کسی سے دوستی اور آشنائی نباہ سکتا ہے؟ کل ہم سے دوستی کا اظہار کیا جا رہا تھا، پھر ہمیں چھوڑ کر غیر پر توجہ شروع ہو گئی، ذرا ٹھہرو، اس سے بھی وہی سلوک ہو گا، جو ہم سے ہو چکا ہے۔ لہٰذا موجودہ صورتِ حال پر رشک کی کوئی وجہ نہیں۔

۲۔ **لغات** : **نیرنگ** : گردشِ ایام۔ انقلاب۔ سحر و طلسم۔ بوقلمونی۔
چشمک : آنکھ کا اشارا۔

شرح : یہ نیرنگ زار یعنی یہ دنیا ہر وقت گردش و انقلاب میں ہے اور اس کا ہر ذرہ اسی طرح گردش و انقلاب کا پابند ہے، جس طرح شراب خانے میں ساغر گھوما کرتا ہے۔ اس کی کھلی ہوئی مثال یہ ہے کہ مجنوں کا صحرا میں مارے مارے پھرنا اس کی محبوبہ لیلیٰ کے اشارۂ چشم کا نتیجہ ہے، یعنی لیلیٰ جس طرف مجنوں کی باگ موڑ دیتی ہے وہ اسی طرف مڑ جاتا ہے۔ بالکل یہی کیفیت اس عالم کی ہے اور اس کی گردش بھی ایک محبوب کے اشارۂ چشم کا کرشمہ ہے، جسے ہم "محبوبِ حقیقی" کہتے ہیں۔

۳۔ **لغات** ۔ **سامان طراز** : سامان آراستہ کرنے والا۔

دستگاہ : قدرت ۔ قوت ۔

شرح : عاجزوں کے لیے فخر کا سامان بہم پہنچانے کا ذمہ دار ان کا ولولہ شوق اور جذبۂ عشق ہے۔ اسی کی بدولت وہ درجۂ کمال پر پہنچ جاتے ہیں، یہاں تک کہ ذرّے میں صحرا کی سی وسعت و قدرت پیدا ہو جاتی، اور قطرہ دریا کے جوش و خروش کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔

یہ شعر ایک ایسی حقیقت کا آئینہ دار ہے، جس سے کسی کو اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ اس دنیا کی زندگی میں کوئی شے بجائے خود نہ اعلیٰ ہے نہ ادنیٰ، نہ معزز ہے، نہ حقیر، صرف جذبۂ عشق کی بنا پر جو عمل و حرکت کا سرچشمہ اور سرمایہ ہے، ہر شے کی قدر و قیمت اور ہر وجود کا درجۂ رفعت و پستی متعین ہوتا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی، حقیر سے حقیر اور بے حقیقت سے بے حقیقت شے کو بھی جذبۂ عشق و عمل اتنی بلندی عطا کر سکتا ہے کہ اس سے زیادہ بلندی کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی ذرّہ صحرا بن جاتا ہے، جو اس کے لیے منتہائے کمال ہے اور قطرہ دریا کی صورت اختیار کر سکتا ہے، جو اس کے لیے ترقی کی معراج ہے۔ گویا نظر وجود کی ظاہری حیثیت پر نہیں، بلکہ اس کے جذبۂ عشق و عمل پر ہونی چاہیے۔ اسی طرح انسان جذبۂ عشق و عمل کی بنا پر ترقی کرتے کرتے اشرفیت کا وہ مقام حاصل کر سکتا ہے، جو باری تعالیٰ نے پہلے سے اس کے لیے مقرر کر رکھا ہے اور جس کی وجہ سے آدم کو پوری مخلوقات پر کرامت و فضیلت بخشی گئی۔

۴۔ **شرح** :۔ اطمینان و دلجمعی کا دَور ختم ہو گیا۔ اب تو یہ کیفیت ہے کہ مَیں ہُوں اور میرا دل، جو وحشت میں ڈوبا ہُوا ہے اور آفت و مصیبت کا پرکالہ بن کر میرے لیے وبالِ جاں ہو گیا ہے۔ اس کا حال کیا بیان کروں ؟ عافیت اور راحت و آسائش سے اسے دشمنی ہے، آوارگی اور بے مقصد گردش سے اُسے خاص دل بستگی ہے۔

۵۔ مراد ہے کہ جس دل میں وحشت بھری ہو، وہ آرام و اطمینان سے بیٹھنا کبھی پسند

نہ کرے گا اور آوارگی ہرگز نہ چھوڑے گا۔

۵۔ **لغات**۔ **شکوہ سنج** : گلہ کرنے والا۔

مونس : اُنس رکھنے والا۔ دوست۔ ہمدم۔

شرح : ہمیں رشک اور بدگمانی کے باعث ایک دوسرے کے گلے میں مشغول نہ رہنا چاہیئے۔ اگر میں نے زانو کو ہمدم بنا لیا ہے (یعنی ہر وقت گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا رہتا ہوں تو تو نے بھی آئینے کو اپنا دوست بنا لیا ہے۔ ہر وقت سامنے رکھ کر تو اسی کو دیکھتا رہتا ہے۔

بدگمانی کی کیفیت یہ ہے کہ محبوب نے عاشق کو گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا دیکھا تو خیال ہوا کہ یہ کسی اور پر عاشق ہو گیا ہے۔ حالانکہ اس کی نظریں ہر لحظ مجھ پر ہی رہنی چاہئیں۔ عاشق کو یہ بدگمانی پیدا ہوئی کہ محبوب ہر وقت آئینہ دیکھتا رہتا ہے ضرور یہ کسی دوسرے پر مرمٹا ہے۔ اور اس نے کسی اور سے رشتۂ محبت جوڑ رکھا ہے۔

۶۔ **لغات**۔ **شیرازہ** : سلسلہ۔ بندش، خصوصاً وہ بندش، جس سے کتاب کے اجزاء باہم پیوست کیے جاتے ہیں۔

سبزۂ بیگانہ : خودرو سبزہ۔ اسے بیگانہ اس لیے کہتے ہیں کہ بے موقع و بے محل اُگتا ہے اور اسے کاٹ کر باہر پھینک دیتے ہیں۔

شرح :۔ بہار کے تمام اجزا وحشت کی ایک بندش میں بندھے ہوتے ہیں یعنی ان سب میں صرف ایک شے مشترک ہے اور وہ وحشت ہے۔ مثلاً بہار کے اجزاء میں سے ایک سبزہ ہے جسے بیگانہ کہا جاتا ہے اور بیگانہ وہ ہوتا ہے، جو کسی کا آشنا نہ ہو۔ یہ وحشت کی علامت ہے۔ دوسرا جزو صبا یعنی صبح کو چلنے والی نرم نرم ہوا ہے جس سے پھول کھلتے ہیں۔ اسے دیکھیے کہ ادھر ادھر پھر رہی ہے اور اس کا کوئی طور طریقہ اور قاعدہ نہیں۔ تیسرا جزو پھول ہے، وہ بھی کسی سے آشنائی پیدا نہیں کرتا۔ ابھی نکلا اور تھوڑے ہی وقت میں افسردہ و پژمردہ ہو کر رخصت ہو گیا۔ غرض ان تمام چیزوں سے صرف وحشت ٹپک رہی ہے اور وحشت ہی ان کے درمیان مشترک ہے۔

چیز ہے۔

۷۔ لغات۔ کوہکن : پہاڑ کاٹنے والا۔ فرہاد۔

نقّاش : نقش بنانے والا۔ مصوّر۔

تمثال : تصویر۔ مجسمہ۔

شرح :۔ اے اسدؔ! فرہاد سچا عاشق نہ تھا اس کی خواہش صرف یہ تھی کہ سنگتراش کی حیثیت میں شیریں کی تصویر تیار کر دے۔ ورنہ کیا یہ ممکن تھا کہ پتھر سے سر پھوڑ کر محبوب پیدا نہ کر لیا جائے؟ فرہاد نے سر ضرور پھوڑا اور مر گیا۔ تاہم شیریں اُسے نہ ملی۔

جو معنی بیان کیے گئے ہیں، وہ اس صورت میں پیدا ہوتے ہیں کہ دوسرا مصرع استفہامی قرار دیا جائے، لیکن اگر اسے حسرت و افسوس کے انداز میں پڑھا جائے تو یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ فرہاد شیریں کا مجسمہ بنانا چاہتا تھا۔ اس نے پتھر سے پھوڑ لیا اور مجسمہ نہ بنا سکا۔ لیکن یہ نہ سوچا کہ پتھر سے سر پھوڑ کر محبوب پیدا نہیں ہو سکتا۔

○

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب
آج ہی ہُوا منظور اُن کو امتحاں اپنا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

۱۔ شرح :۔ اس پری جیسے محبوب کا ذکر تھا، پھر میری جادو بیانی اور قادر الکلامی نے ایسا سماں باندھا کہ جس شخص کو میں نے اپنا رازداں اور غمگسار بنایا تھا، وہی میرا رقیب اور دشمن بن گیا، یعنی میرے بیان سے اتنا متاثر ہُوا کہ دیکھے بغیر اس پر عاشق ہو گیا۔

خواجہ حالی اس شعر کی شرح

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

دردِ دل لکھوں کب تک؟ جاؤں ان کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا

گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا
ننگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا

تا کرے نہ غمازی، کر لیا ہے دُشمن کو
دوست کی شکایت میں، ہم نے ہم زباں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہُوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

میں فرماتے ہیں:
"میں نے جو معشوق کے حسن کی تعریف کی، تو جو شخص میرا محرم راز اور ہم نشین تھا، وہی سن کر میرا رقیب بن گیا کیونکہ اوّل تو ایسے پری وش کی تعریف تھی اور وہ بھی مجھ جیسے جادو بیان کی زبان سے پہلے مصرع کا دوسرا رکن یعنی "اور پھر بیاں اپنا" سارے شعر کی جان ہے، جس کی خوبی بغیر ذوقِ سلیم کے معلوم نہیں ہو سکتی۔"

۲ ۔ شرح ۱: اس شعر کے دو مفہوم بالکل واضح ہیں:

۱ ۔ محبوب نے غیر کی محفل میں اتنی شراب پی لی، جس کی حد و نہایت نہیں۔ لیکن، لئی! کیوں ایسا کیا؟ اس لیے کہ وہ غیر ہی کی محفل میں امتحان لینا چاہتے تھے، کس قدر پی کر ان پہ بدمستی طاری ہو سکتی ہے۔ یعنی کتنے ساغر چڑھا کر وہ مدہوش ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بزمِ غیر میں ایسی صورتِ حال کا پیدا ہونا عاشق کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔

۲ ۔ محبوب جب تک غیر کی محفل میں تھا، اسے زیادہ شراب پینے کا خیال ہی نہ آیا، لیکن میرے گھر آتے ہی اندھا دھند پی گیا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ دیکھے اور جانچے، آیا اس کی بدمستی اور مدہوشی کے عالم میں میری طرف سے کوئی نازیبا حرکت نہیں ہوئی؟ یعنی مجھے آزمانے کے لیے اس نے زیادہ شراب پی لی۔

۳ ۔ لغات ۔ منظر : جھروکا، ایسی اونچی جگہ، جہاں سے نیچے کی تمام چیزیں دیکھی جاسکیں ۔

شرح :۔ اگر ہمارا مکان عرش سے نیچے ہوتا تو ہم بلندی پر جاکر ایک اور جھروکا یا شہ نشین بنالیتے، جہاں سے اپنے مکان اور اپنی حقیقت و حیثیت کا اندازہ کرسکتے ۔ کاش ایسا ہوتا، لیکن نہ ہوا، کیونکہ عرش ہی ہمارا مکان ہے ۔

بظاہر شعر کا مفہوم یہ ہے ۔ بلندی پر منظر بنانے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ہم صرف اپنے مقام اور مرتبے کا صحیح اندازہ کر لیتے اور حقیقت سے آگاہ ہو جاتے اب ہمیں اس کے سوا کچھ معلوم نہیں کہ عرش ہمارا مقام ہے، یعنی ہم وجود مطلق ہی کا ایک جزو یا پرتو ہیں ۔ اس سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لیے ایسے مقام کا انتظام ضروری تھا، جہاں سے سب کچھ ٹھیک ٹھیک نظر آسکتا، مگر یہ نہ ہوا اور بجز اتنا جاننے کے کہ ہمارا مقام عرش ہے اور کوئی حقیقت ہم پر آشکارا نہ ہوسکی ۔

۴ ۔ شرح :۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"خوب ہی ہوا کہ محبوب کے در کا پاسبان ہمارا جان پہچان نکلا ۔ اب ہمارے لیے اس بات کا موقع حاصل ہے کہ وہ جس قدر چاہے ہم کو ذلت دے، ہم اس کو ہنسی میں ٹالتے رہیں گے اور یہ ظاہر کریں گے کہ ہمارا قدیم آشنا ہے اور ہمارا اس کا قدیم سے یہی برتاؤ ہے"

عاشق نے یہ تو پہلے ہی سے طے کر لیا ہے کہ محبوب کے دروازے کا چوکیدار ہمیں ضرور برا بھلا کہے گا اور ہماری ذلت و رسوائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گا لیکن اس رسوائی کو انگیز کر لینے کا ایک بہانہ نکل آیا، یعنی چوکیدار پہلے کا جان پہچان نکلا ۔ عاشق مطمئن ہو گیا کہ اب ہماری جتنی بھی ذلت ہو گی، اسے یہ کہ کر ہنسی میں ٹالتے جائیں گے کہ یہ پہلے سے ہمارا بے تکلف دوست ہے اور اس کے ساتھ دھول

دھپے اور لپاڈگی کا سلسلہ پہلے سے چلا رہا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں، جس پر پریشانی اور تذلیل کا احتمال ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسے اشعار دواوین میں ڈھونڈے سے نظر نہیں آتے۔

۵۔ لغات۔ نگار : زخمی۔

شرح :۔ دل کا درد لکھتے لکھتے انگلیاں زخمی ہو گئیں۔ قلم سے خون ٹپکنے لگا۔ میں کب تک اسی طرح لکھ لکھ کر بھیجتا جاؤں ؟ دل میں سوچتے ہیں، یہ کیوں نہ کروں کہ خود ان کے پاس پہنچ جاؤں اور دکھا دوں، میری زخمی انگلیاں اور خونچکاں قلم دیکھ کر میری حالت کا اندازہ فرمالیجیے۔ اسی سے آپ پر میرے درد دل کی کیفیت آشکارا ہو جائے گی۔

۶۔ شرح :۔ عاشق نے محبوب کی دہلیز پر سجدہ کر دیا۔ اس سے محبوب کو اس قدر عار محسوس ہوئی کہ دہلیز کا پتھر نکال کر اس کی جگہ دوسرا لگا لیا۔ عاشق بجز و نیاز سے کہتا ہے کہ آپ نے بے سبب پتھر بدلنے کی زحمت اٹھائی میں بدستور سجدے کرتا جاتا، یہاں تک کہ پہلا پتھر گھس گھس کر ناپید ہو جاتا۔ اس وقت آپ نیا پتھر لگا لیتے۔

۷۔ لغات۔ غمازی : چغلی کھانا۔

شرح :۔ ہم نے رقیب کے پاس محبوب کی شکایت ایسے انداز میں کی کہ وہ ہمارا ہمنوا بن گیا۔ اس سے اور کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو، لیکن اتنا تو ہوا کہ اس کے لیے چغلی کھانے کا کوئی موقع باقی نہ رہا، کیونکہ چغلی اسی صورت میں کھا سکتا تھا کہ خود اسے محبوب سے کوئی شکایت نہ ہوتی۔

یہ مرزا کے کمالات ہیں، یہاں رقیب کو باتوں سے ہمنوا بنالیا۔ ایک اور مقام پر فرمایا کہ مجھے محبوب کو فریب دینا بھی خوب آتا ہے۔

عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

۸۔ **شرح** :۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"آسمان کی دشمنی کے کیا خوب اسباب بتائے ہیں اور اپنی دانائی و ہنرمندی کس خوب صورتی سے ثابت کی ہے"۔

شاعر نے پہلے یہ حقیقت مسلّم مان لی ہے کہ آسمان انھیں لوگوں کا دشمن ہوتا ہے، جو دانا اور دانشمند ہوں، نیز کسی نہ کسی ہنر میں انھیں یکتائی کا درجہ حاصل ہو۔ پھر حیرت زدہ ہو کر اپنی حالت پر نظر ڈالتے ہوئے حسرت و افسوس کے ساتھ کہتا ہے کہ ہم تو دانشمند نہ تھے اور کسی ہنر میں یکتائی بھی ہمیں حاصل نہ تھی، پھر اے غالب! آسمان نے ہم سے کیوں بے وجہ دشمنی کی؟

بعض اصحاب نے فرمایا ہے کہ اس شعر کا مضمون عرفی کے مندرجۂ ذیل شعر سے ماخوذ ہے۔

از من بگیر عبرت و کسبِ ہنر مکن
با بخت خود عداوتِ ہفت آسمان مخواہ

مجھے دیکھ کر عبرت حاصل کر اور ہنر پیدا کرنے کا خیال چھوڑ دے۔ تجھے کیوں پسند ہے کہ اپنے ساتھ سات آسمان کی دشمنی مول لے لے۔

ظاہر ہے کہ عرفی کے شعر میں وہ حقیقت بیان کی گئی ہے، جسے غالب نے مسلّم مان کر مقدر چھوڑ دیا اور اس مضمون کو پر تاثیر شعریت کے سانچے میں ڈھالتے ہوئے کہا کہ ہم نہ عالم تھے، نہ عقل و دانش کے پیکر تھے، نہ کسی فن میں ہمیں کمال حاصل تھا پھر آسمان نے ہم سے کیوں دشمنی کی؟ عرفی کا شعر صرف فلسفہ و حکمت رہ گیا، غالب نے اسے پر تاثیر شعریت کا لباس پہنا دیا۔

بیخود کی تشریح کے مطابق غالب کے شعر کے دو پہلو ہیں :

۱۔ یہ قول مشہور ہے کہ آسمان اہل دانش و بینش اور ارباب ہنر کا دشمن ہوتا ہے۔ ہماری حالت دیکھیے کہ ہم میں کوئی خاص چیز موجود نہیں، پھر بھی زمانے کے ہاتھوں پامال ہو رہے ہیں۔ دنیا میں اس کی سیکڑوں مثالیں مل جائیں گی۔

۲۔ زیادہ لطیف پہلو یہ ہے کہ شاعر نے درجۂ کمال حاصل کر لینے کے باوجود عجز و انکسار سے ان جوہروں کی نفی کر دی، جو آسمان کی دشمنی کا باعث مانے جاتے ہیں اور یہ بھی اس کے کمال کی دلیل ہے۔

نیز اس امر کی دلیل ہے کہ درجہ کمال حاصل کر لینے کے باوجود اس پر مطمئن نہیں۔ ارتقاد کی تشنگی موجود ہے۔ جو کچھ حاصل کر چکا ہے، اسے منتہائے کمال نہیں سمجھتا، بلکہ مزید رفعت کا طلب گار ہے۔

○

سرمۂ مُفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشم خریدار پہ احساں میرا

رخصت نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غم پنہاں میرا

۱۔ لغات۔ سُرمۂ مُفت نظر: وہ سرمہ جو مفت دے دیا جائے اور کوئی قیمت وصول نہ کی جائے۔

شرح :۔ میں وہ سرمہ ہوں جو مفت سب میں بٹتا ہوں اور اس کی قیمت کوئی نہیں۔ میری قیمت صرف اتنی ہے کہ جو بھی یہ سرمہ استعمال کرے، اس کی آنکھ پر میرا احسان رہ جائے۔

مطلب یہ ہے کہ زر و جواہر کی شکل میں میرے کلام کی کوئی قیمت نہیں۔ میں یہ کحل الجواہر مفت لوگوں میں بانٹ رہا ہوں اور صرف اتنا چاہتا ہوں کہ اس فیض عام سے سب فائدہ اٹھائیں۔

۲۔ شرح :۔ اے ظالم محبوب! مجھے رونے دھونے اور آہ و فغاں کرنے کی اجازت دے دے۔ اندیشہ ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ جو غم میرے دل میں چھُپا ہُوا ہے، اگر رو دھو کر اسے ہلکا کر لینے کی رخصت نہ ملی تو مجھ پر ایسی حالت طاری ہو جائے گی، جسے دیکھ کر لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں گی اور سب کہیں گے کہ یہ شخص فلاں پر فریفتہ ہے، اسی وجہ سے اس کی یہ حالت ہو گئی ہے۔ اس طرح تیری

بدنامی و رسوائی ہو گی اور میرا غم پنہاں تیرے چہرے سے ظاہر ہونے لگے گا۔

(۰)

غافل، بہ وہمِ ناز خود آرا ہے، ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا

بزمِ قدح سے عیش تمنّا نہ رکھ کہ رنگ
صیدِ زِ دام جَستہ ہے اس دام گاہ کا

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عُذر نہ کرنا گناہ کا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پُرگُل، خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

جاں درہوائے یک نگہِ گرم ہے اسدؔ
پروانہ ہے وکیل، ترے داد خواہ کا

۱۔ لغات : طُرّہ :
زلف، کاکل، چوٹی، طرّۂ کلاہ، پھندنا اور کلغی، طرّۂ دستار، کلغی۔

شرح :۔ غفلت کا ماتا انسان اپنی کاردانی اور کارکردگی پر فخرِ زمانہ کے وہم میں مبتلا ہو گیا ہے، اس لیے خود آرائی یعنی اپنے آپ کو باکمال سمجھتے ہوئے پھولا بیٹھا ہے، حالانکہ اس کائنات کی کوئی شے ایسی نہیں جس کے لیے قدرت نے ضروری سامان بہم نہ پہنچا دیے ہوں۔ آپ گھاس جیسی حقیر چیز پر نظر ڈالیں۔ اس کی زلفوں میں کنگھی کر کے آراستہ کر دینے کے لیے نرم زد ہوا موجود ہے۔

گھاس کی مثال اس لیے لائی گئی کہ یہ عام ہے اور ہر فرد اسے دیکھتا اور دیکھ سکتا ہے۔ اس کی آرائش کے لیے ہوا ہی شانے کا کام دیتی ہے۔ یہ مثال اس لیے بھی لائے کہ خود انسان گھاس کے تنکے کی طرح بے حقیقت ہے اور اس کی بے حقیقتی ظاہر کرنے کے لیے اس سے بہتر مثال کوئی نہ تھی۔

بیشک انسان کے لیے یہی زیبا ہے کہ ہر وقت جد و جہد میں لگا رہے۔

صبر و استقامت سے کام کرے، لیکن اس کے لیے یہ زیبا نہیں کہ سب کچھ اپنی صلاحیت اور کارکردگی کا نتیجہ قرار دے دے۔ اس کارفرمائے حقیقی کو بھولنا نہ چاہیئے جو دنیا کے تمام کاموں کا کفیل، سب کی پناہ گاہ اور سب کے لیے ذریعہ کامیابی ہے۔

۲۔ **لغات : بزمِ قدح** : شراب نوشی کی محفل۔

رنگ : خوشی، خوشحالی۔

صیدِ زدام جستہ : وہ شکار، جو جال میں پھنس کر نکل گیا ہو۔

دامگاہ : وہ مقام، جہاں شکار کے لیے جال بچھا ہوا ہو۔ یہاں اشارہ ہے "بزمِ قدح" کی طرف۔

شرح :۔ شراب نوشی کی محفل عام تصوّر کے مطابق عیش و عشرت کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھی جاتی ہے، لیکن شاعر کہتا ہے کہ اس محفل سے بھی عیش کی تمنا نہ رکھنی چاہیئے، کیونکہ اس کی خوشی، شادمانی اور خوشحالی ایک ایسا شکار ہے، جو اس شکارگاہ کے جال میں پھنس کر نکل چکا ہے۔

جو شکار جال میں پھنس کر نکل جائے وہ پھر آسانی سے نہیں پھنس سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں شراب نوشی کی محفل عیش و عشرت کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھی جاتی ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہ عیش بھی حد درجہ عارضی و بے حیثیت ہے۔ شعر میں "رنگ" کا لفظ لانے سے ایک مقصود تو یہ ہے کہ عیش اور بزمِ شراب سے اسے خاص مناسبت ہے، دوسرے ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ شراب پی کر چہرے پر جو رونق و رنگینی سی نمودار ہوتی ہے، وہ بھی عارضی ہی ہوتی ہے۔

۳۔ **شرح** :۔ میں نے اتنے گناہ کیے ہیں کہ شرم و ندامت کے باعث ان کے لیے عذر پیش کرنے کی بھی ہمت نہیں رکھتا اگر خدا کی رحمت گناہ کے لیے عذر پیش کرنے کے بجائے اسی شرم و ندامت کو قبول فرمالے تو کچھ عجیب بات نہ ہوگی۔

شاعر کے حسن بیان کا کمال یہ ہے کہ گناہ کے عذر کی حقیقت پیش کردے
جب تک انسان کو اپنے کسی فعل پر ندامت نہ ہو وہ اسے ناجائز نہیں سمجھتا اور اس کے لیے عذر
پیش کرنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ شرم و ندامت کے بجائے خود عذرِ گناہ ہے، کیونکہ فاعل اپنے
افعال کو صد درجہ ناپسندیدہ سمجھتا ہے۔ گویا محض شرم و ندامت عذرِ گناہ کی
بہترین صورت ہے۔ پھر خدا کی رحمت سے کیا بعید ہے کہ اسے قبول کرے۔

۴۔ **لغات۔** مقتل: قتل گاہ۔ شہادت گاہ۔

شرح: مجھے محبوب کے ہاتھوں قتل ہونے کی بشارت مل چکی ہے۔
دیکھیے، میں کس خوشی اور شادمانی سے قتل گاہ کی طرف جا رہا ہوں۔ معلوم ہوتا
ہے کہ زخموں کا خیال آتے ہی میری نگاہ کا دامن پھولوں سے بھر گیا ہے۔ خوشی
کی یہ آخری حد ہے۔ اس کے سبب دو ہیں، اوّل یہ کہ محبوب کے ہاتھ سے قتل
ہوگا، دوم یہ کہ عشق و محبت میں جن کبھی ختم نہ ہونے والی مصیبتوں سے سابقہ
پڑا رہا، وہ ختم ہو جائیں گی اور ان کا جنجال کٹ جائے گا۔ زخموں کو پھولوں
سے رنگینی کی بنا پر تشبیہ دی گئی ہے۔

۵۔ **لغات۔** ہوا: شوق۔ لگن۔

شرح:۔ اے محبوب! اسدؔ کو تیری ایک نگاہِ گرم کی آرزو ہے اور
اسی آرزو میں اس کی جان اٹکی ہوئی ہے۔ تیرے نگاہِ گرم ڈالتے ہی وہ جل مرے گا
اور تیرے اس فریادی یعنی اسدؔ نے پروانے کو اپنا وکیل بنایا ہے وجہ یہ کہ
وہ بھی شمع کی لپیٹ میں، جسے شمع کی نگاہِ کرم کہنا چاہیے، جل مرتا ہے۔ لہٰذا جو
شخص محبوب کی نگاہِ گرم کا مشتاق ہو، اس کے لیے پروانے سے بہتر وکیل نہیں
مل سکتا۔

○

جور سے باز آئے پر، باز آئیں کیا
کہتے ہیں "ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا"

۱۔ **شرح:**۔ محبوب
نے ظلم و ستم سے ہاتھ اٹھا
لیا اور عاشق کے ساتھ سختی

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں، لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یارب! اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

عُمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے، پر دیکھیے دکھلائیں کیا

پُوچھتے ہیں وُہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

سے پیش آنا چھوڑ دیا، لیکن کیا ہاتھ اٹھایا؟ حقیقۃً ظلم کب چھوڑا؟ اور جور سے دست برداری کب اختیار کی؟ اب محبوب کہہ رہا ہے، مجھے ظلم وستم پر ایسی پشیمانی ہوئی اور اتنی شرم آئی کہ اب تجھے منہ نہیں دکھا سکتا یہ پشیمانی اور یہ شرم سب سے بڑا ظلم بن گئی، کیونکہ عاشق کے لیے محبوب کا مُنہ نہ دکھانا سراسر ناقابلِ برداشت ہے۔ ایسے نکتے غالبؔ ہی پیدا کر سکتا ہے کہ ظلم سے محبوب کی دست کشی کو بھی بے اصل قرار دینے کی ایک معقول وجہ نکال لی۔

۲۔ **شرح:**۔ ساتوں آسمان رات دن گردش کر رہے ہیں۔ اسی گردش سے دنیا کے تمام کام پورے ہو رہے ہیں۔ گردش سے واضح ہوتا ہے کہ کسی حالت کو ثبات وقرار نہیں۔ دمبدم سب کچھ بدلتا چلا جا رہا ہے۔ اگر آج ہم غم والم اور مصیبت میں مبتلا ہیں تو گھبرانے کی کون سی وجہ ہے۔ آسمانوں کی گردش جاری ہے۔ جس طرح پہلی حالت باقی نہیں رہی، یہ بھی باقی نہ رہے گی۔ کچھ نہ کچھ تو ہو ہی رہے گا۔ یہی سمجھنا چاہیئے کہ جو کچھ ہو گا، اچھّا

ہی ہوگا، پھر پریشان کیوں ہوں؟

۳۔ لغات۔ لاگ : دشمنی۔ عداوت۔

لگاؤ : محبت۔ دل کا ربط و تعلق۔

شرح :۔ خواجہ حالی اس شعر کی شرح میں فرماتے ہیں :

"یہ مضمون عجیب نہیں، کسی اور نے بھی باندھا ہو، مگر ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ اگر کسی نے باندھا بھی ہوگا تو اس خوبی و لطافت سے ہرگز نہ باندھا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کو نہ ہمارے ساتھ دشمنی ہے، نہ دوستی۔ اگر دشمنی بھی ہوتی تو اس لیے کہ اس میں ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے، ہم اسی کو دوستی سمجھتے، لیکن جب نہ دوستی ہو، نہ دشمنی تو پھر کس بات پر دھوکا کھائیں؟

"قطع نظر خیال کی عمدگی اور ندرت کے "لاگ" اور "لگاؤ" ایسے لفظ بہم پہنچائے ہیں، جن کا ماخذ متحد اور معنی متضاد ہیں اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے، جس نے خیال کی خوبی کو چہار چند کر دیا ہے۔"

خواجہ حالی کی تشریح میں اضافہ بالکل غیر ضروری معلوم ہوتا ہے، تاہم یہاں اتنا بتا دینا چاہیئے کہ غالب نے یہی مضمون ایک اور شعر میں بھی پیش کیا ہے جسے پڑھ کر معنی زیادہ بہتر طریق پر ذہن نشین ہو جائیں گے یعنی :

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

دوسرے لفظوں میں مرزا کے قول کے مطابق تعلق کی، دو صورتیں ہیں اول دوستی، جسے خوشگوار تعلق سمجھنا چاہیئے، دوم دشمنی، یعنی ناخوشگوار تعلق۔ تعلق دونوں ہیں۔ اسی نکتے پر مرزا کا زور ہے۔ وہ محبوب سے رشتہ قائم رکھنا چاہتا ہے اگرچہ محبوب دشمنی ہی کرے۔ عاشق اپنے دل کو فریب دے سکتا ہے کہ محبوب دشمنی نہیں، دوستی کر رہا ہے۔ سمجھ سکتا ہے کہ محبوب نے اس

کے ساتھ امتیازی برتاؤ اختیار کیا۔ لیکن جب دشمنی اور دوستی دونوں ناپید ہوں تو دھوکا کھانے اور فریب میں مبتلا ہونے کی کون سی وجہ رہ جاتی ہے؟

۴۔ شرح :۔ محبوب کو خط لکھا اور حالتِ اضطراب میں قاصد کے ساتھ محبوب کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ کچھ منزل طے کر چکنے کے بعد خیال آیا کہ یہ ہم سے کیسی حرکت سرزد ہوئی؟ بیشک یہ گمان تھا کہ قاصد خط کہیں راستے ہی میں ضائع نہ کر دے یا یہ آرزو تھی کہ جواب کے انتظار میں نہیں بیٹھیں گے، وہیں جواب لے لیں گے۔ لیکن راستے میں سوچ رہے ہیں کہ کیا اپنا خط ہم خود پہنچائیں، جو سراسر باعثِ ہتک اور خلافِ دستور ہے؟

دوسرے مصرع سے ایک معنی یہ بھی پیدا ہوتے ہیں کہ اگر ہم قاصد کے ساتھ ساتھ محبوب کے دولت کدے پر پہنچ گئے تو وہ تو ہماری صورت سے بھی بیزار ہے، پھر خط اسے پہنچانے کی کون سی صورت رہ جائے گی؟ بیاں کیا " بمعنی "کیونکر" سمجھا جائے گا اور " یارب" استعجاب کے لیے ہے۔

۵۔ شرح :۔ جب محبوب کے دروازے پر بیٹھ گئے تو وہاں سے اٹھنا عاشق کے لیے باعثِ ننگ ہے۔ کتنے ہی حادثے پیش آجائیں، کتنی ہی مصیبتیں نازل ہونے لگیں، یہاں تک کہ خون کی ندی بہ نکلے اور وہ ہمارے سر سے بھی گزر جائے ہم اُس آستانے کو نہ چھوڑیں گے۔

۶۔ شرح :۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں :

" دکھلائیں کا مرجع خدا کو ٹھہرایا ہے کہتا ہے کہ عمر بھر موت کا منتظر رہا کہ وہ حالت زندگی سے ضرور بہتر ہوگی۔ اب دیکھیے، مرنے کے بعد کیا حالت دکھلاتے ہیں، جس کا تمام عمر منتظر رکھا ہے :

مراد یہ ہے زندگی بھر اتنی تکلیفیں اور مصیبتیں پیش آتی رہیں کہ اکتا کر موت کا راستہ دیکھنے لگے۔ کیونکہ زندگی میں تو ان تکلیفوں اور مصیبتوں سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ پھر سوچتے ہیں کہ دیکھیے، مرنے کے بعد ہمارے سامنے کیا

صورت آتی ہے۔ آیا مصیبتوں کی کوئی تلافی ہوگی یا نہ ہوگی، دُکھ اٹھانے کا کوئی صلہ ملے گا یا نہیں؟

۷۔ **شرح** :۔ وہ یعنی محبوب پوچھتا ہے کہ غالب کون ہے؟ اب کوئی ہمیں بتائے کہ ہم کیا بتائیں اور اس سوال کا جواب کیا دیں؟ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ غالب کا یہ شعر نعمت خان عالی کے مندرجۂ ذیل شعر سے ماخوذ ہے:

زمردم یار می پرسد کہ عالی کیست طالع بیں!
کہ عمرم در محبت رفت و کار آخر رسید اینجا

محبوب لوگوں سے پوچھتا ہے کہ عالی کون ہے؟ قسمت دیکھیے کہ ساری عمر محبت میں گزر گئی اور معاملہ یہاں تک آ پہنچا۔ یعنی اسے یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ عالی کون ہے؟

مرزا غالب کا شعر بظاہر اس سے ملتا جلتا معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقۃً اس سے بالکل جداگانہ حالات و واقعات پیش کیے گئے ہیں:

۱۔ پہلے مصرع سے ظاہر ہے کہ محبوب کے سامنے غالب کا ذکر آیا اور اس نے انتہائی تجاہل کا ثبوت دیتے ہوئے پوچھا، غالب کون ہے؟

۲۔ یہ معاملہ بھری محفل میں پیش آیا، جس میں خود غالب بھی موجود تھا۔

۳۔ یہ سوال سنتے ہی بیخود کے قول کے مطابق غالب پر بجلی سی گری اور گھبرا کر اس مجمع سے خطاب کیا کہ للّٰہ بتا دو، میں کیا جواب دوں، شعر کا شعر بیانِ واقعہ نہیں واقعہ ہے۔

۴۔ جان بوجھ کر انجان بنا اور یہ سوال کیا۔ گویا اسے محبوب کی طرف سے ایک چھیڑ بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

۵۔ معلوم ہوتا ہے، یہ سوال سنتے ہی غالب بے تکلف یہ جواب دینے پر آمادہ ہو گئے کہ میں وہی ہوں، جو آپ پر جان دے رہا ہوں۔ پھر خیال آیا کہ ممکن ہے اس طرح محبوب خفا ہو جائے۔

۶۔ چنانچہ محبوب کی بزم میں بیٹھنے والوں سے پوچھا کہ تمھیں محبوب کی عادات

کا علم ہے۔ بتا تو دو، مجھے اس سوال کا جواب کیا دینا چاہیے۔ جو خلافِ مصلحت اور منافی مدعا نہ ہو۔

حالی کے شعر میں اس قسم کی حالت تو پیدا کر لی گئی، لیکن سارا معاملہ اس یاس پر ختم کر دیا گیا کہ محبت کا نتیجہ یہ نکلا۔ غالب کے شعر کا مضمون حد درجہ پہلو دار ہے اور اسلوب بیان پر ندرت و دلآویزی ختم ہے۔

○

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریٔ ساحل
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ پارسائی کا

۱۔ لغات۔ لطافت: لطیف ہونا۔ روحیت۔ یہ لفظان چیزوں کے لیے بھی مستعمل ہے، جو نظر نہ آئیں، جیسے روح۔
کثافت: گاڑھاپن، بھدا پن مادیت، وہ شے جو نظر آئے، جیسے جسم۔
زنگار: وہ مسالا جو شیشے کی پشت پر لگا دیتے ہیں اور وہ آئینہ بن جاتا ہے، جس میں عکس نظر آنے لگتا ہے۔ وہ سبزی مائل شے، جو نمی کے باعث فولادی چیزوں پر جم جاتی ہے۔

شرح:۔ شاعر نے پہلے حکیمانہ اصول پیش کیا کہ کوئی لطیف شے جب تک کثافت اختیار نہ کرے، ایسا جلوہ پیدا نہیں کر سکتی، کہ سب کو نظر آئے جیسے روح کسی کو نظر نہیں آتی، لیکن جب وہ کسی جسم میں جاری و ساری ہوتی ہے تو جسم کی تمام حرکات و سکنات اسی کی بدولت نظر آتی ہیں اور لوگ کہتے ہیں، فلاں شے زندہ ہے اور اس میں روح موجود ہے۔ گویا روح جسم کی کثافت سے وابستگی کیے بغیر جلوہ آرا نہ ہو سکی۔ شاعر نے اپنے دعوے کے لیے یہ دلیل قرار دی کہ دیکھیے فصل بہار آتی ہے اور اس کا کوئی مادی وجود نہیں کہ نظر آ سکے، البتہ اس کی آمد سے باغ میں شادابی و تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر طرف سبزہ اُگ آتا ہے۔ پودے ہرے ہو جاتے ہیں۔

پھول نکل آتے ہیں۔ یہ سب کچھ فصلِ بہار کی آمد کا روشن ثبوت ہے۔ یوں ثابت ہوگیا کہ لطافت کثافت کے بغیر جلوہ نہیں دکھا سکتی اور اگر ہم فصلِ بہار کو آئینہ فرض کریں تو اس میں عکس پیدا کرنے کے لیے پشت پر جو مسالا لگایا جاتا ہے، وہ چمن ہے۔ اگر فرض کریں کہ فصلِ بہار کے آئینے سے مقصود فولادی آئینہ ہے تو چمن اس کا زنگار ہے یہاں وجہ شبہ سبزی ہے۔

۲۔ **شرح** :۔ خواجہ حالی اس شعر کی شرح میں فرماتے ہیں:

"ساحل لاکھ اپنے تئیں بچائے، مگر جب دریا طغیانی پر آتا ہے تو ساحل محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح جہاں تو ساقی ہو وہاں ہوشیاری کا دعوٰے نہیں چل سکتا۔ یہ شعر حقیقت اور مجاز دونوں پر محمول ہو سکتا ہے"

دریا جوش میں آتا ہے اور اس میں تلاطم پیدا ہوتا ہے تو کنارے اس کے لیے روک نہیں بن سکتے۔ وہ اپنے آپ کو کتنا ہی بچائیں، مگر پانی اچھل کر کناروں سے باہر آجائے گا اور دور دور تک پھیل جائے گا۔ یہ بدیہی منظر ہے، جس سے ہر شخص آگاہ ہے۔ اسی کو سامنے رکھ کر شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب! جس محفل میں تو ساقی بن جائے اور تیرے ہاتھوں رندوں کو شراب بٹنے لگے تو سب پی پی کر مست و بیخود ہو جائیں گے اور کوئی بھی ہوش کا دعوٰے نہ کر سکے گا۔

محبوب کی ساقی گری کو دریا کے جوش و تلاطم سے اور اپنے ہوش کو ساحل کی خودداری سے تشبیہ دی ہے۔ عام مشاہدہ یہی ہے کہ جب تک دریا میں جوش نہ ہو کنارے اس کے پانی کو ایک مقررہ بہاؤ پر چلاتے ہیں اور اِدھر اُدھر نہیں ہونے دیتے لیکن تلاطم کی حالت میں وہ بھی بے بس رہ جاتے ہیں۔

○

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا | درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد | تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

دل ہُوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام — مٹ گیا گھِسنے میں اس عُقدے کا وا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم، اللہ اللہ! — اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا!

ضعف سے گریہ مُبدّل بہ دمِ سرد ہُوا — باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال — ہو گیا گوشت سے ناخن کا جُدا ہو جانا

ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھُلنا — روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

گر نہیں نکہتِ گُل کو ترے کوچے کی ہوس — کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

بخشے ہے جلوۂ گُل، ذوقِ تماشا غالبؔ! — چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

تاکہ تجھ پر کھُلے اعجازِ ہوائے صیقل — دیکھ برسات میں سبز آئنے کا ہو جانا

۱۔ **شرح**:۔ خواجہ حالیؔ فرماتے ہیں:

"جب درد حد سے گزر جائے گا تو مر جائیں گے، یعنی فنا ہو جائیں گے
گویا قطرہ دریا میں کھپ جائے گا اور یہی اس کا مقصود ہے۔ پس
درد کا حد سے گزر جانا ہی اس کا دوا ہو جانا ہے۔"

قطرے کے لیے جو نصب العین انتہائی مسرت و شادمانی کا باعث ہے، یہ ہے کہ دریا میں گم ہو جائے۔ یعنی اپنی مختصر سی ہستی کو، جو جزو کی حیثیت رکھتی ہے، کُل میں شامل کر دے۔ درد حد سے گزر جائے گا تو نتیجہ اس کے سوا کیا ہو گا کہ موت آ جائے گی۔ یہی حقیقی مقصود ہے۔ کیونکہ اس کے سوا جزو کل میں شامل نہیں ہو سکتا اور مراد کو نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا ثابت ہُوا کہ درد کا حد سے گزرنا ہی حقیقت میں اس کی دوا اور اس کا علاج ہے۔

۲۔ **لغات**۔ قفلِ ابجد: ایک قسم کا قفل، جو کُنجی کے بغیر کھُلتا اور

بند ہوتا ہے۔ اِس قفل کے حلقے ہیں، جو کنڈے کے اندر رہتا ہے چند چھلّے پڑے ہوتے ہیں، جن پر مختلف حروف کندہ کر دیے جاتے ہیں۔ قفل بنانے والا ہر خریدار کو بتا دیتا ہے کہ فلاں لفظ بننے سے یہ قفل کھلے گا، چنانچہ وہ شخص چھلّے گھما کر مطلوب لفظ بنا لیتا ہے اور قفل کھل جاتا ہے۔ پھر اسے دبا کر بند کر دیتے ہیں، جیسے آج کل قفلوں کی ایک قسم میں کھولنے کے لیئے تو کنجی استعمال کی جاتی ہے، بند کرنے کے لیے کنجی کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی، اجنبی شخص چھلّوں کو کتنا ہی گھمائے اصل لفظ بنا لینے میں شاید ہی کامیاب ہو سکے۔

بات کا بننا : بظاہر یہ الفاظ قفلِ ابجد کا مطلوب لفظ بنا لینے کی مناسبت سے لائے گئے ہیں۔ یہاں ان سے مراد ہے تدبیر کا کامیاب ہونا، یعنی محبوب سے ربط ضبط پیدا کرنے کا راستہ نکال لینا۔

شرح :- اے محبوب! میری قسمت ہی میں یہ لکھا تھا کہ بات بن جائے اور میری تدبیر کامیاب ہو جائے تو میں تجھ سے جُدا ہو جاؤں۔ یہ بالکل ایسی ہی صورت ہوئی، جیسے ابجد کے قفل میں معین لفظ بن جائے تو وہ کھُل جاتا ہے، گویا الگ ہو جاتا ہے۔

۳۔ **شرح :-** دل درد و غم میں مبتلا تھا۔ اسے دور کرنے کے لیے مختلف تدبیریں اختیار کی گئیں۔ ان سے فائدہ تو کچھ نہ ہُوا، لیکن س کشاکش میں دل ہی ختم ہو گیا۔ گویا ایک گرہ تھی، جسے کھولنے کی ہر کوشش میں وہ گھستی گئی کھُل تو نہ سکی، البتہ بار بار کی کوششوں میں گھستے گھستے وہ بالکل مٹ گئی۔

۴۔ **شرح :** مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :

"مطلب ظاہر ہے اور تعریف اس کی امکان سے باہر ہے۔ معشوق کی خفگی کی تصویر ہے اور خفگی بھی خاص طرح کی اور یہ مضمون بھی خاص مصنّف ہی کا ہے۔"

ایک اور بزرگ فرماتے ہیں :

"تعریف کے لیے مجھے الفاظ نہیں ملتے۔ ایسے ہی اشعار کی وجہ سے جن کی تعداد اس چھوٹے سے دیوان میں کثیر ہے اور اتنی تعداد دوسروں کے ضخیم دیوانوں میں بھی نہیں ملتی، حضرت غالبؔ قابلِ مدح ہیں اور خدائے سخن کہے جانے کے مستحق ہیں۔"

اے محبوب! آپ کا لطف وکرم تو مدت ہوئی، ختم ہو چکا تھا اور ظلم وستم کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔ ہم اس پر بھی خوش تھے کہ تعلق تو بہر حال قائم ہے، لیکن اب ہم جفا سے بھی محروم ہو گئے۔ اللہ اللہ! وفاکیشوں کا اس قدر دشمن ہو جانا آپ کے لیے زیبا ہے؟ ایک لفظ "بھی" نے اس پورے مقدر حصّے کو واضح کر دیا، جسے صرف سرسری طور پر بیان پیش کیا گیا ہے۔ پھر دوسرے مصرع میں جو اسلوب بیان اختیار کیا ہے، اس کی ندرت اور تاثیر ذوق سے تعلق رکھتی ہے، لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی۔

۵۔ **لغات۔ مُبَدّل** : تبدیل کیا گیا۔

دمِ سرد : ٹھنڈا سانس، آہِ سرد۔

شرح :۔ ہماری کمزوری اور ناتوانی اس حد پر پہنچ گئی کہ رونے کی کوئی صورت نہ رہی، اس کی جگہ ٹھنڈے سانس لینے اور سرد آہیں بھرنے لگے۔ یعنی رونے نے دمِ سرد کی شکل اختیار کر لی۔ یہ بدیہی واقعہ دیکھ کر ہمیں یقین ہو گیا کہ واقعی پانی شکل بدل کر ہوا کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

۶۔ **لغات** : انگشتِ حنائی : وہ انگلی، جسے مہندی لگی ہوئی ہو۔

شرح :۔ اے محبوب! تیری مہندی لگی انگلی کی یاد کا دل سے مٹ جانا اسی طرح ناممکن ہے، جس طرح ناخن سے گوشت کا جدا ہونا ناممکن ہے۔

۷۔ **شرح** :۔ محبوب کی جدائی کے غم میں روتے روتے مر جانا میرے نزدیک ایسا ہی پُرلطف ہے، جیسے موسمِ بہار کا بادل برس کر کھل جائے۔ موسمِ بہار کا بادل برستا ہے تو درختوں، شاخوں، پودوں، فصلوں اور سبزے

پر سے خزاں کے تمام اثرات دُھل جاتے ہیں۔ افسردگی تازگی سے بدل جاتی ہے، برہنہ شاخوں میں شگوفے نکل آتے ہیں۔ پتوں کی شادابی دلآویز بن جاتی ہے۔ ہر طرف سبزہ اُگ آتا ہے۔ گویا ایک ایک شے شگفتگی و شادمانی کا پیکر بن جاتی ہے اور چمن کی سیر زیادہ پُرلطف ہو جاتی ہے۔ بالکل یہی کیفیت محبوب کی جدائی کے غم میں مرجانے سے عاشق کی ہوتی ہے۔

یہاں بھی پس منظر میں شاعر کا وہی تصوّر کارفرما ہے، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، یعنی جزو کا سمٹ کر کُل میں شامل ہو جانا اور ہر وجود کا اپنے مبدا سے جا ملنا۔ یہاں فنا ہو جانا حقیقت میں محبوب سے مل جانا ہے، اسی لیے اس واقعے کو ابرِ بہار کا برس کر کُھل جانا قرار دیا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ شاعر نے معاملہ صرف تشبیہ تک محدود رکھا ہو، یعنی غمِ فرقت میں روتے روتے مرجانا میرے نزدیک ایسا ہی ہے، جیسے ابرِ بہار برسے اور برس کر کُھل جائے۔ یہ تشبیہ تام ہے، یعنی رونا اور فنا ہو جانا، جیسے بادل برس کر ختم ہو جاتا ہے۔ گویا عاشق کے نزدیک محبوب کے فراق میں روتے روتے مرجانا کوئی ایسا مرحلہ نہیں کہ اس کے لیے مشکل یا تشویش انگیز ہو۔

۸۔ **لغات**۔ نکہت: خوشبو۔

جولاں: دوڑ۔ تیز رفتاری

شرح:۔ اگر پھول کی خوشبو کو تیرے کوچے میں پہنچنے اور تجھ سے فیض حاصل کرنے کی ہوس نہیں تو کیا وجہ ہے کہ وہ صبا کی دوڑ اور تیزی رفتار کے راستے کی گرد بنی ہوئی ہے؟ یعنی صبا میں کمالِ خاکساری کے ساتھ شامل ہو کر ادھر اُدھر چکر لگا رہی ہے۔ یقیناً اس کی آرزو یہی ہے کہ اے محبوب! تجھ تک پہنچے اور تیرے گیسوے معنبر سے فیض حاصل کر کے اور معطر ہو جائے۔

۹۔ **لغات**۔ اعجاز: لفظی معنی۔ دوسرے کو عاجز کرنا۔ معجزہ۔ کرشمہ۔

ہوا: آرزو

صیقل : جِلا، چمک، صفائی۔

شرح :- آئینے سے مراد فولادی آئینہ ہے۔ ہر وجود کو جِلا پانے، روشن ہونے اور ہر داغ دھبّا محو کرا دینے کا عشق ہے اور اس عشق کی کرشمہ کاری نے ہر شے کو اتنا مسحور کر رکھا ہے کہ وہ چاہتی ہے، کوئی داغ لگے اور اسے صاف کیا جائے۔ دیکھیے فولادی آئینہ برسات میں نمی کی وجہ سے سبز ہو جاتا یعنی اسے زنگ لگ جاتا ہے۔ وہ بھی صرف اس لیے زنگ آلود ہوتا ہے کہ صیقل گر کے پاس پہنچے اور اسے صاف، روشن اور مجلّا کیا جائے۔

شاعر کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ جِلا کی آرزو ہر قلب میں انتہا پر پہنچی ہوئی ہے اور ہر دل سرمشقِ جِلا بننے کے لیے مضطرب ہے۔

۱۰۔ شرح :- اے غالب! پھولوں کا جلوہ دیکھنے سے دل میں چیزوں کے دیکھنے کا ذوق تربیت پاتا ہے اور جلوۂ گل کا حقیقی مقصد ہی یہ ہے کہ انسان میں دیکھنے کا ذوق ترقّی کرے۔ کوئی بھی منظر سامنے آئے، اس کا رنگ روپ کیسا ہی ہو، آنکھ کو چاہیے کہ ہر حال میں کُھلی رہے اور اُسے دیکھے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک آنکھ میں دیکھنے کا ذوق اور دل میں ہر شے سے فائدہ اٹھانے کی تڑپ موجود نہ ہو، اس کائنات کے حقائق انسان پر نہیں کُھل سکتے اور اللہ تعالیٰ نے اسے جو بصارت و بصیرت عطا کی ہے، اس سے پُورا فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔

○

پھر ہُوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب
دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب
پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے، ہوا موجِ شراب

ان اشعار میں برسات کے مناظر پیشِ نظر رکھے گئے ہیں اور برسات کو مرزا غالب ہندوستان کی بہار سمجھتے تھے، چنانچہ وہ خود فارسی کی ایک غزل کے مقطع

جو ہُوا غرقۂ مے، بختِ رسا رکھتا ہے
سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما، موجِ شراب
ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا، موجِ شراب
چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سُو
موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب
جس قدر روحِ نباتی ہے جگر تشنۂ ناز
دے ہے تسکین بدمِ آبِ بقا، موجِ شراب
بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر
شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا، موجِ شراب
موجۂ گل سے چراغاں ہے گزر گاہِ خیال
ہے تصور میں زبس جلوہ نما، موجِ شراب
نشے کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ
بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما، موجِ شراب
ایک عالم پہ ہیں طوفانیٔ کیفیتِ فصل
موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

میں کہتے ہیں :
بہارِ ہند بود برشکال ہاں غالبؔ
دریں خزاں کدہ ہم موسمِ شرابے ہست
۱- لغات - بال کشا ہونا
اڑنے کے لیے پَر تولنا۔
بطِ مے : شراب کی صراحی
جس کی شکل بطخ کی سی ہوتی ہے
اس قسم کی صراحیاں عموماً اس
وقت استعمال کی جاتی تھیں،
جب بزمِ شراب کسی حوض یا
ندی کے کنارے آراستہ ہوتی تھی
دل و دستِ شنا :
تیرنے کا دل اور ہاتھ یعنی حوصلہ
اور قوت۔
شرح : پھر وقت آ
گیا کہ موجِ شراب اڑنے کے
لیے پَر تولے اور شراب کی بطخ
نما صراحی میں تیرنے کا حوصلہ
اور قوت پیدا ہو۔
شراب کی صراحی کو تیرنے
کا حوصلہ اور قوت دینے کا ذکر
اس لیے کیا کہ شراب کی محفل
حوض کے کنارے آراستہ کی جاتی

شرحِ ہنگامۂ مستی ہے ازبسکہ موسمِ گُل
رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے، خوشا! موجِ شراب
ہوش اڑتے ہیں مرے، جلوۂ گُل دیکھ، اسدؔ!
پھر ہُوا وقت کہ ہو بال کشا، موجِ شراب

ہے اور بطخ نما صراحیاں حرف میں تیرتی رہتی ہیں۔ جن افراد کے سامنے صراحی آجاتی ہے۔ وہ اس سے ضرورت کے مطابق شراب اپنے اپنے پیالوں میں انڈیل لیتے ہیں اور صراحی کو آگے بڑھا دیتے ہیں۔ یہاں بطخ نما صراحی کی اسی گردش کا ذکر ہے۔

۳۔ **لغات** ۔ تاک : انگور کی بیل، انگور

شرح : یہ نہ پوچھیے کہ چمن والوں میں انتہائی مستی کس وجہ سے پیدا ہو گئی حالت یہ ہے کہ ہوَا انگور کی بیل کے سائے میں پہنچتی ہے تو شراب کی لہر بن جاتی ہے۔

سیاہ مستی اس لیے کہا کہ برسات میں درختوں کے پتے اتنے سبز ہو جاتے کہ ان کی سبزی میں ہلکی سی سیاہی آجاتی ہے۔ شاعر نے یہ کیفیت دیکھی، ساتھ ہی برسات کی ہواؤں میں ان کے جھومنے پر نظر پڑی۔ اُدھر آسمان پر سیاہ گھٹائیں دکھائی دیں تو یہ احساس پیدا ہوا کہ باغ کے چھوٹے بڑے درختوں اور پودوں پر انتہائی مستی چھائی ہوئی ہے۔ اس مستی کا یہ اثر ہے کہ انگور سے شراب بننے اور لب تک پہنچنے کی حاجت نہیں، بلکہ ہوَا انگور کی بیل کے نیچے پہنچتے ہی موجِ شراب بن جاتی ہے۔ جب حالت یہ ہو تو ہوا سے اربابِ چمن کی سیاہ مستی کا سبب پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ ہوَا انگور کی بیل کے نیچے سے گزرتی ہے اور موجِ شراب بن کر تمام درختوں اور پودوں کو مدہوش کر رہی ہے۔

۴۔ **لغات** ۔ غرقِ مے : شراب میں ڈوبا ہُوا یعنی مدہوش۔

بختِ رسا : بلند اقبالی، خوش نصیبی۔

بالِ ہُما : ہما کا پَر۔ مشہور ہے کہ ہُما کا سایہ کسی پر پڑ جائے تو وہ بلند اقبال سمجھا جاتا ہے، یہاں تک کہ بادشاہ ہو جاتا ہے۔

شرح : جو شخص شراب میں غرق ہو گیا، یعنی پی پی کر اسے کچھ ہوش نہ رہا، یہ سمجھ لیجیے کہ وہ نہایت بلند اقبال اور خوش نصیب ہے۔ شراب کی لہر ایسی عجیب چیز ہے کہ اگر سر کے اوپر سے بھی گزر جائے تو کہنا چاہیئے کہ ہما کے پر کی سعادت اور بلند بختی نصیب ہوئی۔

مے میں غرق ہونے کی مناسبت سے موجِ شراب کا سر سے گزرنا لائے۔ کوئی شخص پانی میں ڈوب جائے تو وہ زندہ نہیں رہتا اور پانی سر سے گزر جائے تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ انسان ڈوب گیا اور مر گیا۔ مرزا کے نزدیک شراب کا اثر بالکل الٹا ہوتا ہے۔ یعنی اگر اس میں ڈوب جائے تو وہ خوش نصیب ہے اور شراب سر سے گزر جائے تو سمجھنا چاہیے کہ بالِ ہما کا سایہ سر پر پڑا ہے۔

۴۔ برسات کا موسم اتنا خوشگوار اور کیف انگیز ہے کہ اگر ہوا کے فیض سے زندگی کی موج یعنی زندگی شراب کی لہر بن جائے تو تعجب نہ ہونا چاہیئے۔

شاعر کا مقصود یہ ہے کہ برسات نے ہوا میں ایک خاص کیفیت اور نشہ پیدا کر دیا ہے۔ یہ نشہ ہر شے پر اثر ڈال رہا ہے، لہٰذا زندگی کی لہر شراب کی لہر بن جائے تو کیوں تعجب ہو؟

۵۔ شرح : ہر طرف مسرت و شادمانی کا طوفان برپا ہے۔ اس طوفان میں چار موجیں بہ طورِ خاص بلند و نمایاں ہیں، اوّل موجِ گل، دوم موجِ شفق، سوم موجِ صبا چہارم موجِ شراب۔

بلاشبہ برسات میں بے شمار پھول پیدا ہوتے ہیں، خصوصاً پہاڑوں پر اور ان کے دامن میں۔

پھر برسات میں گرد و غبار دُھل کر فضا بالکل پاک و صاف ہو جاتی ہے، اس

لیے شفق کی سرخی میں زیادہ گیرائی اور دلآویزی نظر آتی ہے ۔ یہ دوسری موج ہوئی تیسری موجِ صبا کی ، جو موسم کی حدت کم ہو جانے کے باعث زیادہ خوشگوار بن جاتی ہے اور چوتھی موج یعنی موجِ شراب کسی تشریح کی محتاج نہیں ۔ ہر طرف خوشی کا جو طوفان اُمڈا ہوُا ہے ، یہی چار موجیں اس کے خاص اجزاء ہیں ۔

۶ ۔ لغات : روحِ نباتی : قوتِ نامیہ ، جس سے تمام نباتات میں نشوونما کارفرما ہے ۔

جگر تشنۂ ناز : لفظی معنی وہ شے ، جس کا جگر ناز کا پیاسا ہو ، یعنی لہلہانے کے لیے بیتابی و بیقراری ۔

دمِ آبِ بقا : آبِ حیات کا گھونٹ ۔

شرح : نباتات میں نشوونما کی جو قوت ہے ، وہ اس لیے بیتاب ہے کہ جلد سے جلد بڑھے اور لہلہانے لگے ۔ موجِ شراب اس کی بیقراری دُور کرنے کی غرض سے آبِ حیات کے گھونٹ پلا پلا کے تسکین و اطمینان کا سامان بہم پہنچا رہی ہے ۔

مطلب یہ ہے کہ روحِ نباتی لہلہانے اور اٹکھیلیاں کرنے کے لیے جس قدر مضطرب ہے ، موجِ شراب اسے آبِ بقا پلا پلا کر تسکین دے رہی ہے یعنی مست کر رہی ہے ۔ گویا شاعر کے نزدیک ایک طرف حسن میں آب و تاب پیدا کرنے کا موجب ہے ، دوسری طرف یہ برسات کے موسم کا لازمہ ہے ۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ قوتِ نامیہ :

"انسان میں بھی ہے ، مطلب یہ ہے کہ ہم میں شراب سے جو امنگ اور جوش پیدا ہوتا ہے ، وہ قوتِ نامیہ کی حرکت سے ہے ، یعنی شراب قوتِ نامیہ کے حق میں وہ کام کرتی ہے ، جو کام کہ بارش نباتات کے حق میں کرتی ہے اور ناز سے یہاں اینڈنا اور تننا مقصود ہے ، جو لوازمِ فخر و ناز سے اور نشوونما کے خواص سے ہے ۔"

۷ ۔ شرح : شراب کی موج انگور کی بیل کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہی ،

ہے۔ اس نے رنگ سے شہپر لے لیا اور اڑنے کے لیے پر تول لیے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :

"جس طرح خون رگوں میں دوڑتا ہے، اسی طرح بیلوں میں مادۂ شراب دوڑ رہا ہے اور اس کے سبب سے بیلیں سرسبز و شاداب ہیں۔ گویا اس کا دوڑنا پرواز ہوا اور سبزی و رنگینی شہپر پرواز ہے۔"

۸۔ **لغات** ۔ موجۂ گل : پھولوں کا جوش اور کثرت۔

شرح : ہمارے تصوّر میں شراب کی موج اس کثرت سے جلوے دکھا رہی ہے کہ معلوم ہوتا ہے، دور دور تک پھولوں کا جوش ہے اور ہر طرف پھولوں ہی کے تختے کھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ پھر پھولوں کے جلوے نے خیال کی گزرگاہ میں چراغاں کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

مولانا طباطبائی بالکل بجا فرماتے ہیں کہ اس شعر میں موج شراب کو پہلے موج گل سے، پھر چراغاں سے تشبیہ دی اور چراغاں کی مناسبت کے پیشِ نظر خیال کو گزرگاہ سے تعبیر کیا۔ پھر فرماتے ہیں :

"موجِ شراب کو چراغاں سے اگر تشبیہ دیں تو کوئی وجہ شبہ نہیں، ہاں موجِ شراب کو موجِ گل سے تشبیہ دیں تو وجہ شبہ رنگ دونوں میں موجود ہے اور موجِ گل کو چراغاں سے تشبیہ تام ہے، یعنی ہر گل کی افروختگی شعلۂ چراغ سے مشابہ ہے۔"

۹۔ **شرح** : موجِ شراب دماغ کو نشوونما دینے کا اتنا خیال رکھتی ہے کہ نشے کا پردہ اختیار کر کے وہ دماغ میں پہنچی اور پوری محویت سے دیکھ رہی ہے کہ یہ کیونکر بڑھتا ہے اور ترقی پاتا ہے۔

گویا غالبؔ کے نزدیک موجِ شراب اس لیے نشہ بن کر دماغ پر اثر انداز ہوئی کہ خوب دیکھ بھال کرتی ہوئی اس کے نشوونما کا فریضہ انجام دے۔

اس شعر میں "سر" "دماغ" اور "پردہ" کی مناسبت محتاجِ تشریح نہیں۔

۱۰۔ **لغات۔ طوفانی** ۔ طوفان اٹھانے والے، طوفان آفریں۔

سبزۂ نوخیز : نیا اُگا ہوُا سبزہ۔

شرح : نئے اُگے ہوئے سبزے کی موج سے شراب تک ہر موج نے برسات کے موسم کی کیفیت کا ایک ایسا طوفان بپا کر دیا ہے، جو دنیا کے ہر حصّے پر چھایا ہوُا نظر آتا ہے۔ یعنی برسات ہو رہی ہے۔ ہر طرف سبزہ لہریں لے رہا ہے۔ شراب کی محفلیں آراستہ ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نشے کا طوفان اُمنڈ آیا ہے، جس نے ساری دنیا کو آغوش میں لے لیا ہے۔

۱۱۔ **شرح** : پھولوں کا موسم کتنا اچھا ہے کہ اس سے ہستی کے ہنگامے کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ شراب کی موج کتنی مسرّت خیز ہے کہ قطرے کی رہنمائی دریا کی طرف کر دیتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ برسات میں ہر طرف سبزہ اُگ آیا۔ پھول کھل گئے، درختوں پر بہار آ گئی۔ ان سب چیزوں سے ثابت ہو گیا کہ زندگی کا ہنگامہ بھی اسی طرح گرم ہوُا۔ پھر اس میں شاعر نے ایک خاص پہلو یہ رکھا کہ جب خزاں کا موسم آتا ہے تو یہ سب چیزیں نابید ہو جاتی ہیں اور موسمِ گل میں از سرِ نو پیدا ہو گئیں۔ اس سے ہنگامہ ہستی کی بے ثباتی ثابت کی، گویا یہ وہی شے ہے، جسے عرفیؔ نے برہان حدوث قرار دیا: یعنی از سرِ نو پیدا ہوتا اور یہی اس کی بے ثباتی کی دلیل ہے، کیونکہ وہ مستقل اور قائم بالذات نہیں۔ موجِ شراب اس وجہ سے قطرے کے لیے دریا کی طرف رہبر بن گئی کہ اس کا خاصہ ہی نشہ پیدا کر دینا ہے اور انسان مدہوش ہو جائے تو وہ بیخود اور آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ یوں گرد و پیش کی ہر شے سے بے تعلق ہو کر اپنے مبدا کی طرف رجوع کر لیتا ہے۔ قطرے کا مبدا دریا، انسان کا مبدا ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔

۱۲۔ **شرح** : اے اسدؔ! پھولوں کا جلوہ دیکھ کر میرے ہوش اُڑ رہے ہیں۔ پھر وقت آ گیا ہے کہ موجِ شراب اُڑنے کے قصد سے پَر تولے۔ یعنی پھولوں کے عام جلوے نے یاد دلا دیا کہ شراب کا دَور چلنا چاہیے۔

افسوس کہ دیداں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت

کافی ہے نشانی تِری، چھلّے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بہ وقتِ سفر انگشت

لکھتا ہوں اسد! سوزشِ دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

۱۔ لغات۔ دیداں: دُودہ کی جمع، کیڑے۔
عقدِ گہر: موتیوں کی لڑی۔

شرح: افسوس کہ جن لوگوں کی ہر انگلی موتیوں کی لڑی کے لائق تھی، یعنی جسے ہر لحظہ در و گوہر ہی سے سروکار ہونا چاہیے تھا، آسمان نے اسے کیڑوں کا رزق بنا دیا۔ یعنی وہ مر گئے اور ان کے جسم اور انگلیاں کیڑوں کی نذر ہو گئیں۔

ایک نسخہ "دیداں" کی جگہ "دنداں" ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوا کہ جن لوگوں کو مال و دولت سے سرفراز رہنا چاہیے تھا۔ انھیں آسمان نے اس درجہ بدحال و نامراد رکھا کہ وہ حسرت سے اپنی انگلیاں کاٹ رہے ہیں۔

شعر کی وضع و اسلوب کے پیشِ نظر صحیح "دیداں" ہی ہے نہ کہ "دنداں"۔

۲۔ شرح: سفر کے وقت کوئی چیز نشانی کے طور پر دینے کا عام دستور ہے۔ غالب نے بھی محبوب کے رخصت ہوتے وقت اس سے نشانی کے طور پر چھلّا مانگا لیکن محبوب نے خالی انگلی دکھا دی، گویا بتا دیا کہ چھلّا میرے پاس ہے ہی نہیں، جو نشانی کے طور پر دے دوں۔ مرزا کہتے ہیں کہ تیرا چھلّا نہ دینا اور خالی انگلی دکھا دینا ہی میرے لیے ایسی نشانی ہے کہ اور کسی نشانی کی ضرورت نہیں۔

دوسرے مصرع کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محبوب نے رخصت ہوتے وقت شوخی سے انگوٹھا دکھا دیا۔

۳۔ لغات۔ سخن گرم: خوبیوں سے بھرا ہوا کلام، اعلیٰ درجے کے اشعار۔
انگشت رکھنا: عیب نکالنا، اعتراض کرنا۔

شرح : اے اسد! میں سوزِ دل سے نہایت شگفتہ اور خوبیوں سے لبریز شعر کہتا ہوں کہ کوئی شخص میرے ایک حرف پر بھی انگلی نہ رکھ سکے یعنی عیب نہ نکال سکے۔

"سوزشِ دل" اور "سخن گرم" اس لیے لائے کہ گرم چیز پر کوئی شخص انگلی نہیں رکھ سکتا۔ گویا یہ شعر محاوروں کے علاوہ بظاہر بھی بالکل درست رہا۔

رہا گر کوئی تا قیامت، سلامت   پھر اک روز مرنا ہے، حضرت سلامت

جگر کو مرے، عشقِ خوننابہ مشرب   لکھے ہے "خداوندِ نعمت، سلامت"

علی الرّغمِ دشمن شہیدِ وفا ہوں   مبارک مبارک! سلامت سلامت!

نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی   تماشائے نیرنگِ صورت سلامت!

۱۔ **شرح :** اگر کوئی شخص قیامت تک بھی سلامت رہا تو جناب والا مرنے سے تو مفر نہیں۔ بہر حال کسی نہ کسی دن اس دنیا سے رخصت ہونا ہی پڑے گا۔ یعنی موت برحق ہے اور کوئی اسے ٹال نہیں سکتا۔ آگے پیچھے سب کو مرنا ہے۔

۲۔ **لغات۔** خوننابہ مشرب : جس کا مشرب خون پینا، خون پینے کا رسیا یا عادی۔

شرح : عشق کا کام ہی یہ ہے کہ خون پیے، وہ اسی شغل کا رسیا ہے۔ میرے جگر سے اس نے خون پی پی کر خوب پرورش پائی ہے۔ اب وہ جگر کو خط لکھتا ہے تو خداوند نعمت سلامت لکھتا ہے یعنی اسے اپنا آقا و مربّی سمجھتا ہے۔

۳۔ **لغات۔** علی الرّغم : برخلاف، برعکس۔

شرح : میں رقیب کی روش اور خواہش کے خلاف وفا کے راستے کا شہید ہوں۔ میں نے وفاداری کے تقاضے پورے کرنے میں جان دی ہے، لہذا میرے

اس امتیاز پر دینا مبارک اور سلامت کہ رہی ہے۔ مبارک اس لیے کہ وفا کے سلسلے میں شہادت پائی، سلامت اس لیے کہ شہیدوں کو ہمیشہ کی زندگی حاصل ہوتی ہے۔ خواجہ حافظؔ فرماتے ہیں:

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

۴ - **لغات** - سروبرگ: سامان
ادراک: پانا - سمجھنا - دریافت۔

شرح: اگر حقیقت کا راز پا لینے اور سمجھنے کا سامان میسر نہیں تو نہ سہی، صورت کی نیرنگیوں کے تماشے ہی سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

حقیقت پا لینا اور سمجھنا معرفت کا درجۂ کمال ہے، لیکن اگر یہ درجہ حاصل نہ ہو تو اس کائنات کی تمام اشیا میں رات دن جو نیرنگیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں، ان پر توجہ جمائے رکھنے سے بھی بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ بھی درحقیقت معرفت ہی کی طرف لے جاتی ہیں، بشرطیکہ ہم توجہ سے انھیں دیکھیں اور غور کریں۔

مند گئیں، کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ
یار لائے مرے بالیں پہ اُسے، پر کس وقت؟

۱ - **لغات** - مُند جانا: بند ہو جانا
بالیں: سرہانا۔

شرح: اے غالبؔ! آنکھیں بند ہو گئیں یعنی موت آ گئی۔ انھیں کھلا رکھنے کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ دیکھیے دوست احباب محبوب کو کیسے وقت میرے سرہانے لائے۔

مراد یہ ہے کہ دوستوں نے مجھ پر احسان تو کیا، مگر ایسے وقت میں، جب میں اس

احسان سے فائدہ اٹھانے کے قابل نہ رہا۔

یہ مضمون مرزا نے تقریباً انھیں الفاظ میں ایک اور جگہ بھی لکھا ہے :

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے
خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

○

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست
دودِ شمعِ کشتہ تھا، شاید خطِ رخسارِ دوست

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
کون لاسکتا ہے تابِ جلوۂ رخسارِ دوست

خانہ ویراں سازیِ حیرت، تماشا کیجیے
صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست

عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے
کُشتۂ دشمن ہوں آخر، گرچہ تھا بیمارِ دوست

چشمِ ما روشن، کہ اُس بیدرد کا دل شاد ہے
دیدۂ پُرخوں ہمارا، ساغرِ سرشارِ دوست

غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اسکے ہجر میں
بے تکلّف دوست ہو جیسے کوئی غم خوارِ دوست

۱۔ **لغات** ۔ بازار سرد ہونا: مندا پڑجانا۔ بے رونق ہونا۔
شرح ۔ محبوب کے خط نکل آیا اور اس کے حسن و جمال کا بازار مندا پڑگیا۔ شاید اس کے رخسار کا خط بجھی ہوئی شمع کا دھواں تھا۔ شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے، گویا دھوئیں کا اٹھنا شمع کے بجھ جانے کی دلیل ہوتا ہے۔ مرزا نے دود کو خط سے، شمع کو حسن و جمال اور شمع کشتہ کو حسن و جمال کی افسردگی سے تشبیہ دی۔

۲۔ **شرح** : اے دل! تو نے کیوں اپنے انجام کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں؟ بہتر یہی ہے کہ تو شوقِ دیدار میں بیتاب نہ ہو، صبر و ضبط سے

کام لے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ دوست کے جلوے کی تاب کوئی نہیں لا سکتا؟ کیا حضرت موسیٰؑ کا واقعہ تجھے یاد نہیں کہ کس طرح وہ بیہوش ہو کر گر گئے تھے؟

۳۔ **لغات۔** خانہ ویراں سازی : گھر اُجاڑنا، گھر کو ویران کرنا۔

رفتہ : والہ و شیدا، مٹا ہوا۔

شرح : دیکھیے حیرت نے میرا گھر کس طرح اجاڑ دیا ہے؟ میں نقشِ پا کی طرح محبوب کی رفتار پر مٹا ہوا ہوں۔

نقشِ قدم کو حیرت زدہ اس لیے کہا کہ اس میں کوئی حس و حرکت نہیں ہوتی۔ جیسا نقش پڑ گیا، ویسا ہی رہتا ہے۔ جب عاشق خود نقشِ قدم کی طرح سراپا حیرت بن کر محبوب کی رفتار پر مر مٹا اور اسے گھر کی سوجھ بوجھ نہ رہی تو ظاہر ہے کہ یہی حیرت اس کا گھر برباد کرنے کا موجب بن گئی۔

۴۔ **لغات۔** بیمارِ دوست : محبوب کا بیمار یعنی عاشق۔

شرح : میں محبوب کی محبت میں بیمار تھا اور اسی بیماری میں مجھے مرنا چاہیے تھا، لیکن اس اثناء میں محبوب نے رقیب پر مہربانیاں شروع کر دیں۔ ان مہربانیوں پر رشک نے مجھے اس طرح ظلم و ستم کا نشانہ بنایا کہ میں جاں بحق ہو گیا۔ گویا اگرچہ بیمارِ دوست تھا، مگر کشتۂ دشمن بن گیا۔

تاکہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک
مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ
سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست

مہربانیہائے دشمن کی شکایت کیجیے
یا بیاں کیجے سپاسِ لذّتِ آزارِ دوست؟

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آئی ہے آپ
ہے ردیفِ شعر میں، غالبؔ زبس تکرارِ دوست

۵۔ **لغات۔** چشم مار وشن : ہماری آنکھ روشن ہو۔ فارسی کا یہ کلمہ خوشی کے موقع پر بولتے ہیں۔

ساغرِ سرشار : بھرا ہُوا اور لبالب پیالہ۔

شرح : ہمارے بیدرد محبوب کا دل خوش ہے تو ہمیں کیوں خوشی نہ ہو؟ ہماری لہو سے بھری ہوئی آنکھیں محبوب کے نزدیک شراب کے لبالب ساغر ہیں۔

"دیدۂ پُرخوں" کی مناسبت سے "چشم مار وشن" کہا اور دل کی شادمانی کے لیے ساغرِ سرشار لائے۔

۶۔ شعر نمبر ۶، ۷، ۸، ۹ مسلسل ہیں، انھیں قطعہ بند سمجھنا چاہیے۔

شرح : رقیب مجھ فرقت کے مارے کا حال اس طرح پوچھتا ہے، جیسے کوئی دوست دوسرے دوست کی غم خواری کر رہا ہو۔

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ تکلیف و اذیت کی حالت میں غمخواری انسان کو ہمیشہ پسندیدہ معلوم ہوتی ہے، لیکن مرزا اس پر سخت پرشیان ہیں، کیونکہ انھیں رشک تڑپا رہا ہے۔

۷۔ **شرح :** رقیب مجھے آکر پیغام دیتا ہے کہ محبوب نے دیدار کا وعدہ کر لیا ہے۔ اس پیغام سے اس کا مقصد کیا ہے؟ مقصد یہ ہے کہ میں جان لوں، اسے بھی محبوب تک رسائی حاصل ہے۔

۸۔ **لغات۔** سر کرنا : فارسی سر کردن سے ہے یعنی شروع کرنا۔ اس کے معنی توپ، بندوق چھوڑنا اور فتح کرنا بھی ہیں۔

شرح : جب میں یہ شکایت کرتا ہوں کہ میرا دماغ کمزور ہے اور میں باتوں کی تاب نہیں لا سکتا تو رقیب محبوب کی عنبر بار زلفوں کا قصّہ چھیڑ دیتا ہے۔

خوشبو کو ضعفِ دماغ کا علاج سمجھا جاتا ہے، چنانچہ جب کوئی بیہوش ہو جاتا ہے تو اسے لخلخہ سنگھاتے ہیں، جو مختلف خوشبوؤں سے تیار کیا جاتا ہے۔

رقیب بھی زلف عنبر بار کی بات اس لیے شروع کرتا ہے کہ ضعفِ دماغ کا مداوا

ہو جائے۔

سر، دماغ، زلف، عنبر بار وغیرہ کی مناسبت محتاجِ تشریح نہیں۔

۹۔ **شرح** : جب وہ مجھے چپکے چپکے آنسو بہاتے ہوئے دیکھتا ہے تو خود ہنس کر محبوب کی شوخیِ گفتار کا بیان شروع کر دیتا ہے۔

اس شعر میں بھی رونے کے مقابل ہنسنا اور چپکے چپکے کے مقابل بیانِ شوخیِ گفتار لائے۔

رقیب نے محبوب کی شوخیِ گفتار کا بیان یقیناً اس وجہ سے شروع کیا کہ عاشق کے لیے اس شوخیِ گفتار سے بڑھ کر دلاویز و دلپسند چیز کوئی نہیں ہو سکتی تھی، لیکن اس میں ستم ظریفی کا پہلو بالکل واضح ہے اور عاشق کی نظر اسی پر ہے۔ یعنی رقیب یہ سب کچھ عاشق کو جلانے کی غرض سے کر رہا ہے۔

۱۰۔ **لغات**۔ سپاس : شُکریہ

شرح : یہ پوری کیفیت بیان کر چکنے کے بعد مرزا فرماتے ہیں : اب بتایئے آیا رقیب کی مہربانیوں کی شکایت کریں یا محبوب عاشق کو دُکھ پہنچانے کی جس لذّت کا خوگر ہے، اس کا شکر بجا لائیں؟

دشمن یعنی رقیب کی مہربانیاں بھی عاشق کے لیے شکایت ہی کا باعث ہوتی ہیں کیونکہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے، مقصود یہ ہوتا ہے کہ عاشق کو تکلیف پہنچے، اُس کا دِل دُکھے اور محبوب کی آزار رسانی بھی بہرحال شُکر ہی کا موجب ہوتی ہے۔

۱۱۔ **شرح** : اے غالب! یہ غزل مجھے دل سے پسند آتی ہے، کیونکہ اس کی ردیف میں بار بار دوست یعنی محبوب کا لفظ آیا ہے اور عاشق اس لفظ کی تکرار سے بھی خوش ہوتا ہے۔

گلشن میں بند و بست بہ رنگِ دگر ہے آج
قمری کا طوق، حلقۂ بیرونِ در ہے آج

آتا ہے ایک پارۂ دل، ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج

اے عافیت! کنارہ کر، اے انتظام! چل
سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

۱۔ **لغات**۔ بہ رنگِ دگر: دوسرے رنگ کا، جداگانہ طرز کا۔
قمری: فاختہ کی ایک قسم، جس کی گردن میں طوق یعنی حلقہ سا بنا ہُوا ہوتا ہے۔ شعرا اسے سرو کا عاشق قرار دیتے ہیں۔
حلقۂ بیرونِ در: دروازے کے باہر کی کنڈی۔
شرح: مولانا طباطبائی فرماتے ہیں: جس شخص کو محفل میں بار نہ ہو اور اسے باہر ہی روک دیا گیا ہو، اسے بھی حلقۂ بیرونِ در کہتے ہیں۔

آج باغ میں نئی وضع کا انتظام کیا گیا ہے اور قمری کو بھی، جو باغ کا مشہور پرندہ ہے، باہر نکال دیا گیا ہے۔ گویا اس کا طوق باغ کے بیرونی دروازے کی کنڈی بنا ہُوا ہے۔ بظاہر شعر کا مطلب یہ ہے کہ وہ محبوب باغ میں آ رہا ہے، جس کا قد سرو و شمشاد کے لیے بھی باعثِ صد رشک ہے۔ اس وجہ سے انتظام کی صورت بالکل دوسری ہو گئی، جیسے کسی بڑی ہستی کی آمد پر خصوصی انتظامات کر لینے کا دستور ہے۔ اس سلسلے میں قمری تک کو باہر نکال دیا گیا ہے۔

۲۔ **لغات**۔ پارہ: ٹکڑا

شرح: آج ہر آہ کے ساتھ دل کا ایک ٹکڑا چلا آ رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرے سانس کا تار اثر کو پھانسنے کے لیے کمند بن گیا ہے یعنی میرا سانس آج اپنے اندر اثر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے دل کے ٹکڑے آہوں کے ساتھ باہر آ رہے ہیں۔

۳۔ **شرح**: اے آرام و راحت! الگ ہو جاؤ اور اے نظم و ضبط! نکل جاؤ کیونکہ میرے رونے سے جو بے پناہ سیلاب آیا ہے، وہ آج میرے گھر کے دیوار و در سلامت نہ

چھوڑے گا۔

مرزا عافیت اور انتظام کو اس لیے لائے کہ جو گھر ڈھے جانے والا ہو اور اس کے دیوار و در برباد ہو جانے والے ہوں، وہاں عافیت کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہتی اور نظم و انتظام ناپید ہو جاتا ہے۔

○

لو ہم مریضِ عشق کے تیمار دار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج؟

۱۔ **لغات**۔ تیمار: غمخواری کرنا، بیمار کی دیکھ بھال۔ تیمار دار اس شخص کو کہتے ہیں، جو بیمار کی دیکھ بھال کرتا ہو۔ بعض نسخوں میں "تیمار دار" کی جگہ "بیمار دار" ہے اور حضرت عرشی کے مرتبہ نسخے کے مطابق اصل لفظ "بیمار دار" ہی تھا۔ اس سے معنی میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔

شرح: ہم سمجھتے ہیں کہ عشق کے بیمار کا کوئی علاج نہیں۔ اگر تمہیں مسیحا سے علاج کرانے پر اصرار ہے تو مضایقہ نہیں، ہم عشق کے بیمار کی دیکھ بھال اپنے ذمے لے لیتے ہیں، لیکن یہ بتا دو، اگر بیمار کو کوئی فائدہ نہ ہوا تو مسیحا کے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہیے آخری مصرع کے مفہوم دو ہو سکتے ہیں، اول وہی، جو اوپر پیش کر دیا گیا، دوم یہ کہ اگر مریضِ عشق کو کوئی فائدہ نہ پہنچا تو مسیحا کے علاج کی حقیقت کیا رہ جائے گی؟ وہ علاج کس کام کا مقصود ہو گا۔ یعنی پہلی صورت میں "کیا" بہ طور استفہام استعمال ہوا اور دوسری صورت میں اسے تحقیر کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں، انتظارِ ساغر کھینچ

کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ
بہ رنگِ خار مرے آئنے سے جوہر کھینچ

تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل!
کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ

تری طرف ہے بہ حسرت نظارۂ نرگس
بہ کوریِ دل و چشمِ رقیب، ساغر کھینچ

بہ نیم غمزہ ادا کر حقِ ودیعتِ ناز   نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں   بہ روئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ

۱۔ لغات۔ انتظار کھینچنا : انتظار کرنا۔

شرح : ایک سانس بھی آرزو کی انجمن سے باہر نہ نکال، یعنی آرزو کا دم بھرے جا اور اس کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھ۔ اگر فی الحال تجھے شراب میسر نہیں آتی تو کچھ پروا نہ کر۔ ساغر کے دور کا انتظار کرتا رہ اور یقین رکھ کہ کسی وقت تیری باری بھی آجائے گی۔

اس شعر میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ انسان کو آرزو کا دامن کبھی نہ چھوڑنا چاہیئے اور کتنی ہی تکلیفیں پیش آئیں، صبر و استقلال کے ساتھ پیشِ نظر مقصد کے لیے کوشش جاری رکھنا لازم ہے، کیونکہ کامیابی اسی پر موقوف ہے۔ تھڑدلے پن سے یہاں کام نہیں چل سکتا۔ اقبالؒ کیا خوب فرما گئے ہیں۔

زندگی جہد است و استحقاق نیست

۲۔ لغات۔ کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید : کسی صاحبِ بصیرت قدردان کی تلاش میں سرگرم کوششوں کو انتہا پر پہنچا دینا۔

شرح : میں نے صاحبِ بصیرت قدردان کی تلاش میں جو دوڑ دھوپ اور تگ و دو کی اور اسے انتہا پر پہنچا دیا، اس کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ پوچھ۔ میں کیا بتا سکتا ہوں کہ اس دوڑ دھوپ میں مجھ پر کیا گزری؟ اب بالکل مایوس ہو چکا ہوں۔ اے ہمدم! تو اگر کوئی خدمت انجام دے سکتا ہے تو صرف یہ ہے کہ میرے آئینۂ فطرت میں کمال کے جو جوہر ہیں، انھیں اسی طرح نکال ڈال جس طرح کسی کے پاؤں سے کانٹے نکالے جاتے ہیں اور حق یہ ہے کہ ۔ کوئی قدرشناس ہی نہیں اور کسی کو اندازہ ہی نہیں ہو سکتا کہ فطرت نے مجھ میں کون کون سے کمالات بھر رکھے ہیں تو ان جوہروں کی حیثیت بھی کانٹوں کی سی رہ گئی ہے، پھر کیوں نہ انھیں نکال باہر کیا جائے؟

۳۔ **شرح** : اے دل! تُو نے محبوب کے انتظار کو راحت و آسائش کا بہانہ بنا لیا ہے۔ تجھے کس نے اشارہ کیا کہ بستر پر لیٹ رہ اور اسی کے ناز کھینچنے میں عمر بسر کر دے؟ عاشق کو راحت سے کیا واسطہ؟ اس کا کام یہ نہیں کہ بستر پر لیٹ کر آنکھیں دروازے پر لگائے رکھے، اس کا کام یہ ہے کہ آہ و فریاد کرے، صحرا کے چکر لگائے جیب و دامن تار تار کر کے دیوانوں کی طرح پھرے۔ محبوب تک پہنچنا آسان ہے؟

اس شعر میں بھی عمل کا درس دیا گیا ہے۔ کوئی مقصد ہو، وہ جد و جہد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا یہ طریقہ نہیں کہ بستر پر لیٹ گئے اور سمجھ لیا کہ سب کچھ خود بخود حاصل ہو جائے گا۔ یہ منزل انتہائی جانفشانی اور جفاکشی کی ہے۔ تن آسانوں کو اس میں قدم نہ رکھنا چاہیے۔

۴۔ **شرح** : اے محبوب! نرگس تجھے حسرت سے تک رہی ہے۔ گویا یہ بھی میری رقیب بن گئی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس کا دل بھی اندھا ہے، کیونکہ اس میں شوق و محبت کی جھلک تک موجود نہیں اور اس کی آنکھ بھی اندھی ہے۔ کیونکہ بظاہر آنکھ ہونے کے باوجود وہ نورِ بصارت سے محروم ہے۔ لہٰذا اس رقیب سے، جس کے دل اور آنکھ دونوں اندھے ہیں، بالکل بے پروا ہو کر شراب کا ساغر پی جا۔

یہ کوریِ دل و چشمِ رقیب بد دعا کے لیے بھی بولتے ہیں اور نظرِ بد کا اثر دور کرنے کے لیے بھی۔

۵۔ **لغات**۔ **ودیعت** : امانت یعنی کسی شخص کے پاس کوئی چیز حفاظت کی غرض سے رکھ دینا۔

نیام : میان، تلوار وغیرہ کا غلاف۔

شرح : تیرے ناز میرے پاس امانت کے طور پر ہے، میرے زخمِ جگر کے پردے نے ان کے لیے میان کا کام دیا۔ اب تو پورا نہیں، بلکہ نصف غمزہ دکھا کر اس امانت کا حق ادا کر دے، یعنی خنجر کو میرے زخمِ جگر کے غلاف سے باہر کھینچ۔

نیم غمزہ اس لیے کہا کہ خنجر کی ضرب لگاتے وقت تو پورے غمزے کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن خنجر باہر کھینچنے کے لیے صرف نیم غمزے ہی کی نمائش کافی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اس طرح محبوب ناز و ادا کا خنجر جگر سے کھینچنے کے لیے سامنے آئے گا اور دیدار کی آرزو پوری ہو جائے گی۔

۶۔ **لغات۔ قدح** : پیالہ۔ ساغر۔

صہبا : شراب۔

آتشِ پنہاں : چھپی ہوئی آگ۔

سفرہ : دسترخوان

شرح : میرے ساغر میں چھپی ہوئی شراب کی آگ بھری ہے یعنی آتش عشق کی شراب ہے۔ اس کا تقاضا یہی ہے کہ دسترخوان پر سمندر کا دل کباب کر کے رکھا جائے، کیونکہ اس کی زندگی آگ ہی میں گزرتی ہے۔ وہی کباب آتش عشق کی شراب کا موزوں نقل بن سکتے ہیں۔

○

حُسن غمزے کی کشاکش سے چُھٹا، میرے بعد
بارے، آرام سے ہیں اہلِ جفا، میرے بعد

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیِ انداز و ادا، میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دُھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہُوا، میرے بعد

۱۔ **لغات۔ غمزہ** : لغوی معنی چشم و ابرو کا اشارہ، مطلب ہے محبوبوں کی دلفریب ادائیں، جن سے وہ عاشقوں کو اور زیادہ مفتون و گردیدہ کر لیتے ہیں۔

کشاکش : کھینچ تان۔

اہلِ جفا : ظالم یعنی محبوب۔

شرح : میں دنیا سے رخصت ہو گیا، اب حسن یعنی حسینوں کو ناز و ادا کے کمالات دکھانے

کا کوئی موقع نہ رہا۔ یعنی حسن کو غمزے کے لیے اہتمام میں جو کچھ کرنا پڑتا تھا، اس کی ضرورت ختم ہو گئی۔ غمزے کے لیے کشاکش ہی باقی نہ رہی اور اسے سعی و کوشش سے فراغت مل گئی۔ مقام شکر ہے کہ محبوبوں اور حسینوں کو آرام مل گیا، کیونکہ میرے بعد ناز و ادا کے جور و جفا کو انگیز کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔

شعر میں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ غمزے کے لیے سعی و کوشش سے فراغت صرف اس حسین تک محدود نہ رہی، جس پر مرزا غالب فریفتہ تھے، بلکہ پورے عالمِ حسن کو اس کشاکش سے نجات مل گئی اور تمام حسینوں کو آرام حاصل ہو گیا۔ گویا حقیقی عشق کا حامل محض ایک غالب تھا۔ اس کے سوا کسی میں محبت کے لوازم پورے کرنے کی صلاحیت موجود نہ تھی۔

خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر، یعنی
اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا، میرے بعد

درخورِ عرض نہیں، جوہرِ بیداد کو جا
نگہ ناز ہے سرمے سے خفا، میرے بعد

ہے جنوں اہلِ جنوں کے لیے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا، میرے بعد

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا، میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا، میرے بعد

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا، میرے بعد

۲۔ **شرح**: اس شعر میں پہلے شعر کا مضمون نئے دلکش انداز سے دہرایا گیا ہے۔ فرماتے ہیں: عشق کے واجبات بجا لانے کے لائق کوئی نہ رہا۔ یہ سب کچھ میرے ساتھ ختم ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ناز و ادا کے لیے بھی کارفرمائی کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔

چنانچہ ان کا کام بھی ختم ہو گیا اور جس منصب کا وظیفہ ختم ہو جائے، اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں رہتی۔ ایک غالبؔ تھا، جو فرائضِ عشق ادا کر سکتا تھا۔ وہ نہ رہا تو حسن و عشق کا پورا ہنگامہ سرد پڑ گیا۔

اس شعر میں لفظ "معزولی منصب" کی رعایت سے آیا ہے۔

۲۔ لغات۔ **سیاہ پوش**: سیاہ لباس پہننے والا۔ یہ لباس عموماً سوگ میں پہنا جاتا ہے۔

شرح: جب شمع بجھتی ہے تو اس کے رشتے سے دھوئیں کی لہر اٹھتی ہے۔ اس سے شاعر نے یہ نتیجہ نکالا کہ شمع کے بجھنے پر اس کے شعلے نے سیاہ ماتمی لباس پہن لیا۔ اسی طرح جب میری شمعِ حیات گل ہوئی، جو شعلۂ عشق کا مرکز و مامن تھی تو اس کے ماتم میں شعلۂ عشق نے بھی سیاہ لباس ہی پسند کیا۔

شاعر کا مقصد یہ ہے کہ عشق کی حرارت و رونق صرف میرے دم سے تھی۔ میری ہی شمعِ حیات سے عشق کی انجمن میں روشنی کا سروسامان تھا۔ میں دنیا سے رخصت ہو گیا تو اب خود عشق کے شعلے کو سوگ میں سیاہ لباس پہننے کی ضرورت پیش آگئی۔

شمع کا بجھنا روزانہ لاکھوں آدمی دیکھتے ہیں، مگر اس سے یہ مضمون کسی نے پیدا نہ کیا۔ یہ شعر بھی اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ غالبؔ کا مشاہدہ کس قدر گہرا اور حقیقت رَس تھا۔

۴۔ شرح: جب میں زندہ تھا تو حسینوں کو مہندی کا محتاج ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ میرے خونِ دل سے اپنے ناخن رنگ لیتے تھے۔ اب میں دنیا میں نہ رہا تو انھیں مہندی کی ضرورت پیش آئی۔ یہ کیفیت دیکھ کر قبر میں میرا دل خون ہوا جاتا ہے۔ میرے ہوتے انھیں کسی کی محتاجی نہیں کرنی پڑتی تھی۔

۵۔ لغات۔ **درخورِ عرض**: پیش ہونے کے لائق۔ نمایاں ہونے کے قابل۔

جوہرِ بیداد: ظلم کا جوہر۔ شعر میں اشارہ سُرمے کی طرف معلوم ہوتا ہے، کیونکہ حسینوں کی آنکھیں جب تک سرمگیں نہ ہوں، ان کی نگاہیں دلدوزی میں درجۂ کمال

کو نہیں پہنچتیں۔ اگر جوہر بیداد سے اشارہ غمزہ و عشوہ کی طرف سمجھا جائے تو ظاہر ہے کہ سرگیں آنکھوں کے اشارے قیامت برپا کر دیتے ہیں۔

شرح : میرے مرجانے کے بعد کوئی جگہ ہی باقی نہ رہی، جہاں سرگیں آنکھوں کا غمزہ و عشوہ اپنے کمالات دکھا سکے اور اپنے جوہروں کی نمائش کر سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نگاہِ ناز سرمے سے خفا ہو گئی، یعنی حسینوں نے سرمہ لگانا چھوڑ دیا۔

سرمہ لگانا چھوڑ دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی کہ حسینوں نے مرزا کے ماتم میں یہ شیوہ اختیار کیا، کیونکہ مرزا کے بعد کوئی ایسا فرد باقی نہ رہا، جسے وہ اپنے عشوہ و ادا کا تختۂ مشق بنا سکیں۔

۶ - **لغات** - آغوشِ وداع : رخصت کے وقت دوستوں اور رفیقوں کا بغل گیر ہونا۔

شرح : میرے مرنے کے بعد دیوانگی اہلِ جنوں سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہی ہے اور بغل گیری کی غرض سے اس نے بانہیں پھیلا دی ہیں، یعنی اب دیوانگی کسی کو نصیب نہ ہو گی۔ وہ ہمیشہ کے لیے جا رہی ہے۔ جب تک میں باقی تھا دیوانگی کے تمام سامان موجود تھے، یعنی گریبان چاک ہوتے تھے اب یہ سامان بھی جا رہا ہے۔ چاک گریبان سے الگ ہو رہا ہے، آئندہ دامن تار تار نہیں ہوں گے۔

گویا مرزا کے ساتھ عشق کے علاوہ جنون بھی ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

۷ - **لغات** - مے مرد افگن : مردوں کو بے ہوش کر کے گرا دینے والی شراب۔

صَلا : کھانے یا شراب پینے کے لیے بلانے کی صدا۔ عام دعوت اور پکار کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ پنجابی میں اس لفظ نے "صلح" کی صورت اختیار کی۔ بولتے ہیں کہ فلاں نے مجھے کھانے کی "صلح" بھی نہ کی یعنی کھانے کے لیے بلایا ہی نہیں۔

شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مر گیا ہوں، مے مرد افگن عشق کا ساقی یعنی معشوق بار بار صلا دیتا ہے، یعنی لوگوں کو شرابِ عشق کی

طرف بلاتا ہے۔ مطلب یہ کہ میرے بعد شراب عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا، اس لیے اس کو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوئی ہے، مگر زیادہ غور کرنے کے بعد، جیسا کہ مرزا خود بیان کرتے تھے، اس میں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرع یہی ساقی کے صلا کے الفاظ ہیں :

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق

اور اس مصرع کو وہ مکرر پڑھتا ہے ایک دفعہ بلانے کے لہجے میں پڑھتا ہے :

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق ؟

یعنی کوئی ہے، جو مے مرد افگن عشق کا حریف ہو ؟ جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اسی مصرع کو مایوسی کے لہجے میں مکرر پڑھتا ہے !

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق !

یعنی کوئی نہیں ہوتا۔ اس میں لہجے اور طرز ادا کو بہت دخل ہے۔ کسی کو بلانے کا لہجہ کوئی اور ہے اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے۔ جب اس طرح مصرع مذکور کی تکرار کروگے تو فوراً یہ معنی ذہن نشین ہوجائیں گے "

خواجہ حالی کی تشریح پر کسی اضافے کی ضرورت نہیں، البتہ یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پورا مصرع ایسے انداز میں مرتب کر لینا بے حد دشوار ہے جسے پڑھتے وقت صرف لہجہ بدل لینے سے دو مختلف معنی پیدا ہو جائیں۔ یہ شعر اس اعتبار سے بالکل یگانہ نظر آتا ہے۔

۸۔ **لغات۔** تعزیت : ماتم پرسی، پرُسا دینا، ماتم و سوگ۔

شرح : میں مرنے سے پہلے اس غم میں گھل گھل کر مرا جا رہا ہوں کہ دنیا کی وسعت میں کوئی ایسا فرد نظر نہیں آتا، جس سے امید رکھی جا سکے وہ میرے مر جانے کے بعد مہر و محبت اور وفا و استواری کی ماتم پرسی کر سکے، کیونکہ میں مرجاؤں گا

تو ساتھ ہی مہر و وفا پر بھی موت طاری ہو جائے گی۔ اُن کی ماتم پرسی وہی کر سکتا ہے، جسے زندگی کی اس نہایت قیمتی متاع کا صحیح اندازہ ہو۔ ان کے حق تو کون پورے کرے گا؟ یہ بھی ممکن نہیں کہ ان کے مر جانے پر سوگواری ہی کا فرض ادا کر دے۔

اپنے دم کے ساتھ مہر و وفا کی عظمت اور اپنے بعد ان میش بہا اوصاف کی ناقدری و کس مپرسی کا کتنا پُر تاثیر نقشہ کھینچ دیا ہے۔

ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مہر و وفا تو مدت سے موجود ہی نہ تھے۔ میں ان پر آنسو بہاتا رہتا تھا، اب میرے بعد کوئی اتنا بھی نہیں کہ ان کا ماتم کرتا رہے۔

۹۔ **شرح:** اے غالبؔ! جب تک میں زندہ ہوں، عشق کے سیلاب بلا کو سنبھالے بیٹھا ہوں، لیکن جب میں مر جاؤں گا تو یہ سیلاب کس کے گھر کا رخ کریگا؟ کوئی گھر ایسا نظر نہیں آتا، جو اس کا مامن بن سکے۔ افسوس، میرے بعد عشق اس قدر بیکس رہ جائے گا کہ اس کے تصوّر ہی پر بے اختیار رونا آ جاتا ہے۔

اردو میں ایسی غزلیں بہت کم ملتی ہیں، جن کے تمام اشعار مسلسل ہوں اور ایک ہی مضمون کے مختلف پہلو حُسنِ ترتیب سے بیان کیے گئے ہوں۔ مرزا غالبؔ کی یہ غزل بھی مسلسل اشعار کا ایک نہایت نادر نمونہ ہے۔

○

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر، در و دیوار
نگاہِ شوق کو ہیں، بال و پر، در و دیوار

وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار

نہیں ہے سایہ کہ سُن کر نوید مقدمِ یار
گئے ہیں چند قدم پیشتر، در و دیوار

۱۔ **شرح:** اگر در و دیوار ہمارے لیے محبوب تک پہنچنے میں رکاوٹ بن گئے ہیں تو ہماری بلا سے، ہمیں ان کی کیا پروا ہے؟ نگاہِ شوق کے لیے تو یہ در و دیوار بال و پر ہیں، جن سے نگاہ میں پرواز کی قوت پیدا ہو گئی ہے؟ جو اسے اڑا کر محبوب تک پہنچا

ہوئی ہے کس قدر ارزانیِ مےَ جلوہ
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار

جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار، تو آ
کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر، در و دیوار

ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے
کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر، در و دیوار

وہ آ رہا مرے ہمسائے میں تو سایے سے
ہوئے فدا در و دیوار پر، در و دیوار

نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

نہ پوچھ بے خودیِ عیشِ مقدمِ سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے، سر بسر، در و دیوار

نہ کہہ کسی سے کہ غالبؔ! نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت، مگر، در و دیوار

سکتی ہے اور کوئی رکاوٹ دامنگیر نہیں ہو سکتی۔
کسی مقصد کے لیے سچا جذبہ ہو دل میں موجود ہو تو رکاوٹ جذبے کو تیز تر کر دیتی ہے۔ عربی کی مشہور مثل ہے: الانسان حریص علی ما منع، یعنی انسان کو جس چیز سے روکا جائے، اس کے لیے وہ اور حریص ہو جاتا ہے۔ یہ بالکل درست ہے۔ خصوصاً عشق کے معاملات میں تو یہ عام چیز ہے۔ سچے عشق کے لیے ہر رکاوٹ اس کی آگ کو بھڑکانے کا موجب ہوتی ہے۔ یہی حقیقت مرزا نے اس شعر میں بیان کی ہے۔
رکاوٹ کے باعث زور تیز تر ہو جانے کا مضمون مرزا نے ایک اور شعر میں بھی کہا ہے:

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

۲۔ لغات۔ وفور: کثرت۔ زیادتی۔
رنگ: حالت، کیفیت۔

شرح : آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور ایسا سیل بہ نکلا کہ میرے مکان کی ہر شے تلپٹ ہو گئی۔ جہاں دروازہ تھا، وہاں ملبے کا ڈھیر لگ جانے سے وہ پٹ گیا اور جہاں دیوار تھی، اس میں شگاف پڑ گئے اور اندر آنے جانے کے راستے پیدا ہو گئے۔ گویا دروازے دیواریں بن گئے اور دیواروں نے دروازوں کی شکل اختیار کر لی۔

دیکھیے در لفظوں کے اُلٹ پھیر سے کتنا وسیع مضمون اور کس خوش اسلوبی سے پیش کر دیا۔

۳۔ **لغات**۔ **نوید** : خوشخبری۔

مَقدَم : آمد، تشریف آوری۔

شرح : میرے گھر کے دیوار و در کا جو سایہ پڑ رہا ہے، اسے سایہ نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ محبوب کی تشریف آوری کی خبر پہنچی تو در و دیوار پیشوائی اور خیر مقدم کے لیے چند قدم آگے بڑھ گئے۔

معلوم ہے کہ خاص ہستیوں کا استقبال ہمیشہ چند قدم آگے بڑھ کر کیا جاتا ہے چنانچہ مرزا کے در و دیوار بھی سایے کی شکل میں آگے بڑھ گئے۔

۴۔ **لغات**۔ **ارزانی** : سستاپن۔

شرح : اے محبوب! تیری شراب دیدار اس قدر سستی اور عام ہو گئی ہے کہ اس سے تیرے کوچے کا ہر در و دیوار مست ہو گیا ہے۔

محبوب کوچے میں آتا ہے تو ہر گھر یعنی اس کے ساکن جلوۂ دیدار سے شادکام ہوتے ہیں۔ یہ شراب ان پر مستی طاری کر دیتی ہے، لہذا یہ کیفیت ہو گئی ہے کہ جسے دیکھیے، وہ اسی شراب سے بیخود نظر آتا ہے۔

۵۔ **لغات**۔ **متاع** : مال و اسباب

شرح : اے محبوب! اگر تجھے انتظار کا سودا خریدنا منظور ہے تو آ اور دیکھ تیرے گھر کے در و دیوار پر ایسی دکانیں آراستہ ہو گئی ہیں، جن میں صرف نظر کا مال بھرا

ہُوا ہے۔

محبوب کو دیکھنے کے لیے ہزاروں نگاہیں بیتاب ہیں وہ اس کے در و دیوار پر جم گئی ہیں اور اس انتظار میں ہیں کہ شاید اس کے حسن کی کوئی جھلک نظر آجائے اور ان کے لیے تسکین کا سامان بہم پہنچے۔ اب محبوب کو دعوت دے رہے ہیں کہ یہاں صرف انتظار کا سودا بکتا ہے اور خوبی یہ ہے کہ اس دعوت میں اپنا مطلب بھی پیش نظر ہے۔ یعنی محبوب آئے گا تو بہر حال اس کے دیدار سے شرف پانے کا موقع مل جائے گا۔

۶۔ **شرح** : جب کبھی میرے دل میں گریے کا طوفان اٹھا اور میں رونے پر آمادہ ہُوا تو میرے در و دیوار فوراً پاؤں پر گر پڑے اور منت و خوشامد شروع کر دی کہ خدا کے لیے رُک جا، ورنہ ہمارا کوئی ٹھکانا باقی نہیں رہے گا۔ تُو روئے گا تو اشکوں کا ایک سَیل بہ نکلے گا، جو ہمیں بہالے جائے گا۔

شعر میں لطف کا خاص پہلو یہ ہے کہ در و دیوار کا پاؤں پہ گرنا بجائے خود ان کے تباہ ہو جانے کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ یعنی شعر کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ جب میں نے رونے کا سرو سامان کیا تو در و دیوار میرے اشکوں کے سَیل میں بہ گئے۔

۷۔ **شرح** : محبوب میرے گھر کے پاس آ رہا۔ اب کیفیت یہ ہے کہ میرے در و دیوار کا سایہ اس کی قیام گاہ پر پڑ رہا ہے۔ اس طرح میرے در و دیوار سائے کے ذریعے سے محبوب کے در و دیوار پر قربان ہونے لگے۔

۸۔ **شرح** : اے محبوب! تیرے بغیر ہمیں اپنے گھر کا آباد رہنا بڑا معلوم ہوتا ہے۔ یہ آبادی نگاہوں میں کھٹک رہی ہے اور کھٹک کا خاتمہ ہی یہ ہے کہ آنکھوں میں آنسو آجائیں۔ گویا جب ہماری نظر در و دیوار پہ پڑتی ہے تو بس غذہی رونا آجاتا ہے رونے کا سبب خود بیان کر دیا، یعنی محبوب کے بغیر گھر نظروں میں کھٹکتا ہے لیکن در و دیوار کو دیکھ کر ہمیشہ رونے سے یہ مفہوم بھی پیدا ہوتا ہے کہ مسلسل رونا اور آنسو بہانا آخر انھیں بہالے جائے گا اور در و دیوار بہ جائیں گے تو گھر آباد نہیں رہے گا، برباد ہو جائے گا۔ گویا گھر کا برا انجام بھی رونے کا ایک سبب بنا۔

۹۔ **شرح** : سیلاب آرہا ہے اور اس کے آنے کی خوشی میں درودیوار پر جو بیخودی طاری ہوگئی ہے، اس کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ پوچھیے۔ بس یہ سمجھ لیجے کہ انھوں نے سراسر ناچنا شروع کر دیا ہے۔

درودیوار کے سرلبسر ناچنے سے عیاں ہے کہ سیلاب نے بنیادیں ہلا دیں اور ایک ایک چیز پیہم متزلزل ہو کر گرنے لگی۔ گویا سیلاب گھر میں جو کیفیت پیدا کر سکتا تھا، وہ عملی شکل اختیار کر گئی۔

۱۰۔ **شرح** : اے غالبؔ! تو رازِ محبت کسی سے بیان نہ کر، کیونکہ دنیا میں کوئی بھی اس راز کو چھپائے رکھنے کا اہل نہیں اور کسی پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں درودیوار کو قابلِ اعتماد سمجھا جا سکتا ہے، لیکن ان سے بات چیت کا فائدہ کچھ نہیں۔ کیونکہ نہ وہ سنتے ہیں، نہ بیان کر سکتے ہیں۔

یہ جو عاقلوں نے کہا ہے : "دیوار ہم گوش دارد" تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ واقعی دیوار کے کان ہوتے ہیں، بلکہ یہ راز کو چھپائے رکھنے میں مبالغے کی ایک صورت ہے۔

○

گھر جب بنا لیا ترے در پر، کہے بغیر
جانے گا اب بھی تُو نہ "مرا گھر" کہے بغیر

کہتے ہیں، جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن
جانوں کسی کے دل کی میں کیوں کر، کہے بغیر؟

کام اس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام، ستمگر کہے بغیر

۱۔ **شرح** : میں جب کبھی محبوب کو اپنے گھر آنے کی دعوت دیتا تھا تو وہ جواب دیتا کہ ہم نہیں جانتے، تیرا گھر کہاں ہے؟ آخر مجبور ہو کر میں نے محبوب کے دروازے پر دھونی رمالی اور وہیں گھر بنا لیا۔ کہتے ہیں کہ اے محبوب! تجھ سے اجازت لیے بغیر تیرے دروازے پر گھر بنا لیا ہے، لیکن تیرے تغافل اور بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ جب

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے، وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے، نہ رہیں پر کہے بغیر

چھوڑوں گا میں نہ اُس بُتِ کافر کا پُوجنا
چھوڑے نہ خَلق، گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ، وَلے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دُشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات، مکرّر کہے بغیر

غالب! نہ کر حضور میں تُو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر، کہے بغیر

تک بتا نہ دوں، یہ میرا گھر ہے، تجھے اس کا پتہ نہ چلے گا اور تو نہ جانے گا کہ یہ میرا گھر ہے۔

۲۔ **شرح:** جب تک مجھ میں بات کرنے کی تاب و تواں تھی، میں حالِ دل سناتا تھا اور محبوب کو اس پر کوئی توجہ نہ تھی۔ خود اس نے کبھی پوچھا ہی نہیں کہ خستہ و درماندہ عاشق کا حال کیا ہے۔ اب ضعف اور ناتوانی کے باعث مجھ میں بات کرنے کی بھی قوت نہ رہی اور اس نے میرے حال سے بے خبر رہنے کے لیے یہ تر شا ترشایا بہانہ پیش کر دیا کہ میں بتائے بغیر کسی کے دل کی بات کیونکر جانوں؟ تم کچھ کہو تو مجھے معلوم ہو کہ کیا چاہتے ہو؟ حالانکہ جانتا ہے، مجھ میں کچھ کہنے کی طاقت ہی نہیں۔ محبوب کی طرف سے یہ انتہائی ستم ظریفی ہے۔

۳۔ **شرح:** تقدیر سے میرا معاملہ ایسے محبوب کے ساتھ آ پڑا ہے، جس کا نام لیتے وقت ہر شخص اسے ستمگر کہتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو محبوب دنیا بھر کے نزدیک ظالم و ستمگر ہو، اس سے عاشق کی کوئی امید کیونکر برآ سکتی ہے؟

۴۔ **شرح** : ہم خاموش ہیں تو یہ سبب نہیں کہ کسی سے ڈرتے ہیں یا اپنا ہرکٹ جانے کا خوف ہے، ہرگز نہیں۔ ہمارے دل میں کوئی چیز ہے ہی نہیں، ورنہ ہم دُھن کے ایسے پکے اور سرپھرے ہیں کہ جان بھی چلی جائے تو سچ کہہ دینے میں کبھی تامل نہ کریں گے۔

۵۔ **شرح** : میں اپنے محبوب کو، جسے ساری دنیا بُتِ کافر کہتی ہے، پوجنا ہرگز نہ چھوڑوں گا، برابر اس کی پرستش میں مصروف رہوں گا۔ اگر دنیا اس پر مجھے کافر قرار دینے میں بھی تامل نہ کرے تو کچھ پروا نہیں۔ میری پرستش کا سلسلہ بدستور قائم رہے گا۔

یہ ثابت قدمی اور وفاداری کی آخری حد ہے کہ اپنے محبوب کے مقابلے میں بڑی سے بڑی آفت جھیل لینے میں بھی ہرگز تامل نہیں۔

۶، ۷۔ **لغات**۔ دشنہ : کٹار۔ خنجر

ولے : ولیک کا مخفف، لیکن، مگر

مشاہدۂ حق : ذاتِ باری تعالیٰ کے انوار دیکھنا۔

شرح : اگرچہ ہمارا مقصد ناز و غمزہ کا ذکر ہوتا ہے، لیکن بات چیت کرتے وقت ہم ان کے لیے کٹار اور خنجر کی اصطلاحیں استعمال کیے بغیر مطلب واضح نہیں کر سکتے۔

بیشک ذاتِ باری تعالیٰ کے انوار دیکھنے کا معاملہ ہو، مگر جب اسے معرضِ بیان میں لائیں گے تو شراب اور ساغر کا ذکر کیے بغیر بات نہیں بنے گی۔

ان دو شعروں میں مرزا غالب نے یہ حقیقت انتہائی خوش اسلوبی سے واضح کی ہے کہ حقیقت کا اظہار مجاز کا لباس اختیار کیے بغیر ممکن نہیں اور جو چیزیں نظر نہیں آتیں یا حواس کے ذریعے سے ہم ان کا ادراک نہیں کر سکتے، انھیں مشہود و محسوس چیزوں کے رنگ میں پیش کیے بغیر دل کی کیفیت واضح نہیں ہو سکتی۔ دیکھیے ناز و غمزہ کا ذکر آنے کا تو تشبیہ یا استعارے میں کٹار اور خنجر کہہ کر کام چلائیں گے۔ حقیقۃً ناز و

وہی کام انجام دیتے ہیں، جو کٹار اور خنجر سے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح روحانی انوار یا محبت باری تعالیٰ کے معاملات پوری طرح واضح کرنے کے لیے بادہ و ساغر سے کام لیا جاتا ہے، کیونکہ ان انوار کی کیفیت معنوی اعتبار سے شراب سے ملتی جلتی ہے۔

مرزا نے دوسری جگہ یہی حقیقت ایک اور انداز میں پیش کی ہے:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا

۸ ۔ **لغات** ۔ **التفات** : توجّہ۔ لطف و کرم

شرح : یہ شعر دراصل ایک قصّے کا آخری حصّہ ہے، جو مرزا کے اسلوبِ بیان سے بے تکلف سامنے آجاتا ہے۔ مرزا اور محبوب کے درمیان گفتگو جاری ہے مرزا اپنا حال بیان کرتے ہیں، محبوب کہتا ہے: "کیا کہتے ہو؛ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔" پھر محبوب کوئی بات کہتا ہے تو مرزا کی سمجھ میں نہیں آتی۔ دوبارہ پوچھتا ہے ہے تو محبوب جواب دیتا ہے: "بہرے ہو کہ بار بار پوچھتے ہو؟" یہ سن کر مرزا کہتے ہیں کہ اگر میں بہرا ہوں تو چاہیے، آپ کی توجّہ اور لطف و نوازش مجھ پر دوچند ہو جائے۔ کیونکہ جب تک بات بار بار نہ کہی جائے، میں بہرا ہونے کے باعث اسے سمجھ نہیں سکتا۔

۹ ۔ **شرح** : حضور سے مراد ابوظفر بہادر شاہ ہیں۔ کہتے ہیں، اے غالب! تو بادشاہِ سلامت کے حضور بار بار کیوں گزارشیں پیش کر رہا ہے؟ کیوں کہہ رہا ہے کہ مجھ پر خاص توجّہ فرمایئے، میرے پاس فلاں چیز نہیں ہے، فلاں شے کی ضرورت ہے، فلاں تکلیف ہے، فلاں پریشانی ہے، تیرا تو پورا حال کہے بغیر ہی حضور پر واضح ہے۔

یہ شعر بیان کی ندرت کا ایک دلکش مرقع ہے۔ زبان سے کچھ نہیں کہا، لیکن وہ سب کچھ کہہ دیا جو کہا جا سکتا تھا۔ یہ اجمال ہر اس تفصیل پر حاوی ہے، جس کی سمائی یک صفحۂ دفتر میں بھی نہ ہو سکے۔

○

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرمِ نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر

کیا آبروئے عشق، جہاں عام ہو جفا
رُکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

آتا ہے میرے قتل کو، پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ثابت ہُوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خَلق
لرزے ہے موجِ مَے تری رفتار دیکھ کر

وا حسرتا! کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

بِک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

زنّار باندھ، سُبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

۱۔ شرح: مَیں محبوب کے روئے دل افروز کی آب و تاب دیکھ کر جل کیوں نہ گیا؟ میرے لیے صحیح راستہ یہی تھا کہ عشق میں فنا حاصل کرنے کا جو مقام سامنے آیا تھا، اسے طے کر لیتا اور جل کر خاک سیاہ ہو جاتا۔ اب میرے نہ جل مرنے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اپنی تابِ دیدار پر رشک سے جل رہا ہوں اور پہلی نارسائی کی سزا یوں بُھگت رہا ہوں۔

مرزا غالب نے مضامینِ شراب کی طرح رشک کے مضمون میں بھی وہ کمال کیا ہے، جس کی مثال شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے ہاں مل سکے۔ ان میں سے ایک شعر یہ بھی ہے اور اس غزل نیز آئندہ غزلوں میں ایسے کئی مضامین آئیں گے، لیکن ایک حقیقت واضح کر دینی چاہیے کہ بیشک ہم ایسے مضامین کو رشک سے تعبیر کرنے میں حق بجانب ہیں، تاہم عشق کے مقام

اِن آبلوں سے پاؤں کے، گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہُوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر
کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے، زنگار دیکھ کر
گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی، نہ طُور پر
دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے، تری دیوار دیکھ کر

شناسوں کو معلوم ہے کہ عشق میں ایک دَور عاشق پر ایسا بھی طاری ہوتا ہے، جب وہ اپنی آرزؤں اور ارمانوں کو بھی محبوب کے مقابلے میں پسِ پشت ڈال دیتا ہے اور محبوب ہی اس کے پیشِ نظر رہ جاتا ہے۔ یہ عشق و محبت کا انتہائی مقام ہے کہ دوسرے دل کا محبوب کو دیکھنا تو ایک طرف رہا، اپنا دیکھنا بھی گوارا نہیں ہوتا۔ گویا مرزا نے محبت کے اس خاص مقام کی بات کی ہے، اگرچہ ہم اپنی اصطلاحات کے مطابق اسے رشک ہی کہیں گے۔

مرزا نے ایک اور غزل میں بھی یہ مضمون باندھا ہے:

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

۲۔ **شرح**: چونکہ میں رات دن ایسے نالے سر کرنے میں سرگرم رہتا ہوں جن سے شعلے برستے ہیں، اس لیے اہلِ جہاں نے مجھے آتش پرست قرار دے لیا ہے، یعنی اس فرقے کا آدمی، جن کے نزدیک دنیا کا مقدس ترین عنصر آگ ہے اور وہ اسی کی پرستش میں سرگرم رہتے ہیں۔

آتش، سرگرم اور شرر بار کی رعایت محتاجِ تصریح نہیں۔

۳۔ **لغات**۔ بے سبب آزار: بے وجہ ستانے والا، بے سبب اذیت پہنچانے والا۔

شرح : جہاں جور و جفا عام ہو جائے، کوئی وجہ، کوئی سبب اور کوئی علت پیش نظر نہ رہے، وہاں عشق کی آبرو کیونکر قائم رہ سکتی ہے؟ اے محبوب! میں تجھے بے وجہ اور بے سبب ستانے والا پاتا ہوں، اس لیے تذبذب میں پڑ جاتا ہوں کہ آیا محبت کے راستے میں مجھے قدم آگے بڑھانا چاہیے؟

عاشق کے نزدیک محبوب کی طرف سے جور و جفا کی صرف ایک وجہ ہو سکتی ہے اور وہ خود عشق ہے نیز عاشق محبوب کے لطف و نوازش ہی نہیں، بلکہ جور و جفا کو بھی صرف اپنا حق سمجھتا ہے۔ وہ کسی دوسرے کو اس میں شریک کرنے کے لیے تیار نہیں، لیکن جب محبوب ہر کس و ناکس پر یکساں جور و جفا شروع کر دے۔ اہل ہوس کو بھی اسی طرح ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنائے، جس طرح عاشق ہمیشہ بنا رہتا ہے تو عشق کے لیے امتیاز کی کون سی وجہ باقی رہی؟ اس کی عزت و آبرو اور یکتائی کیونکر برقرار رہ سکتی ہے؟ اس صورت حال نے عاشق پر تأمل کی کیفیت طاری کر دی۔

شعر کی ایک خوبی اس کی عمومیت و آفاقیت ہے، یعنی مضمون صرف عام عشق تک محدود نہیں، بلکہ اسے سیاسیات میں بھی بے تکلف استعمال کیا جا سکتا ہے اور مرزا غالب کے اکثر اشعار کا ایک امتیازی پہلو یہ بھی ہے۔

۴۔ **شرح :** محبوب میرے قتل کے لیے شمشیر سمیت آ رہا ہے۔ یہ دیکھتے ہی رشک اس لیے جوش میں آ گیا کہ محبوب کا ہاتھ میری گردن میں حائل ہونا چاہیے تھا، اس میں تلوار کیوں پہنچ گئی؟ لطف یہ کہ ابھی قتل کی نوبت نہیں آئی، رشک ہی عاشق کو موت کے گھاٹ اُتار رہا ہے۔

لفظی مناسبتیں تشریح کی محتاج نہیں۔

۵۔ **لغات۔** گردنِ مینا : صراحی کا بالائی حصہ نچلے حصے کے مقابلے میں تنگ ہوتا ہے، جیسے بوتلوں میں اوپر کا حصہ تنگ ہوتا ہے، اسے صراحی کی گردن کہتے ہیں۔

شرح : تو نے شراب پی کر عالم سرور میں ایسی مستانہ چال اختیار کی کہ خلقت کا خون ہو گیا۔ مینا پر نظر ڈالتے ہیں تو تیری چال سے اس پر لرزہ طاری ہے۔ وہ اس لیے

کرنہ تُو شراب پیتا، نہ تیری چال میں خلقِ خدا کا خون کر دینے والی مستی پیدا ہوتی۔ گویا خلقِ خدا کا خون تیری شراب نوشی کا نتیجہ ہے اور اس خون کا دعویٰ مینا کی گردن پر ثابت ہو گیا۔ اس کی موج کے لرزنے سے اس دعوے کا ثبوت بہم پہنچ گیا۔ یعنی وہ خوف سے کانپ رہی ہے کہ آخر میں مجرم ٹھہری۔

۶۔ **لغات۔ واحسرتا**: انتہائی حسرت و افسوس کا کلمہ۔

شرح: انتہائی حسرت و افسوس کا مقام ہے کہ جب محبوب نے دیکھا ہم اس کے ظلم و ستم اور ایذا سے لذت اٹھا رہے ہیں اور اس لذت کے ہم بہت دلدادہ ہیں تو اس نے ظلم و ستم سے ہاتھ اٹھا لیا اور بیداد و جفا ترک کر دی۔

انسان طبعاً لطف و نوازش پسند کرتا ہے اور جور و ستم سے گریزاں رہتا ہے، لیکن عاشق اپنے آپ کو جور و ستم کا خوگر بنا لیتے ہیں اور معشوق کی طرف سے جو دکھ انھیں پہنچتا ہے، اس میں خاص لذت پاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے لیے جور و ستم کا رک جانا انتہائی دکھ کا باعث ہے، مگر وہ دُکھ نہیں جس میں لذت ملے۔ مرزا کے انتہائی حسرت و افسوس کا اصل سبب یہی ہے۔

۷۔ **لغات۔ عیار**: کسوٹی۔

شرح: ہم اپنے کلام کے ساتھ خود خریدار کے ہاتھ بک جاتے ہیں، یعنی اس کے دلدادہ ہو جاتے ہیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ خریدار کی طبیعت کی کسوٹی کا اندازہ ہو جائے۔ یعنی یہ جانچ لیں کہ اسے کھرے کھوٹے کی تمیز ہے یا نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جو بھی ہمارے کلام کا خریدار ہوگا، سخن شناسی اور قدر دانی میں اس کا پایہ بلند ہونا چاہیئے۔ ایسے باکمال خریدار کے ہاتھ بکنے میں ہمیں کیا تامّل ہو سکتا ہے؟ وہ ہمارا کلام نہیں، بلکہ خود ہمیں مول لے لیتا ہے۔

۸۔ **لغات۔ زُنّار**: جنیؤ۔ وہ بٹا ہُوا دھاگا، جو ہندو اور آتش پرست لوگ گلے میں آڑا ترچھا ڈالے رہتے ہیں اور اسے مذہبی نشان سمجھا جاتا ہے۔

سُبحۂ صد دانہ: تسبیح، جس میں ایک سَو دانے ہوتے ہیں۔

شرح : توڑ زنّار پہن لے اور سَو دانوں کی تسبیح توڑ کر پھینک دے، کیونکہ راستہ چلنے والا یعنی مسافر ہمیشہ صاف اور ہموار راستہ پسند کرتا ہے۔ وہ راستہ پسند نہیں کرتا، جس میں اونچ نیچ اور نشیب و فراز ہوں۔

اس شعر میں دو باتیں خاص توجہ کی محتاج ہیں :

۱۔ تسبیح کے دانے بھی دھاگے ہی میں پروئے جاتے ہیں، جب اسے پھیرا جائے تو ہر دانہ ایک بلندی بن جاتا ہے، پھر دوسرے دانے تک نشیب آ جاتا ہے اور یہی سلسلہ آخر تک جاری رہتا ہے، اس وجہ سے تسبیح کا راستہ نشیب و فراز والا راستہ ہو گیا، جس میں قدم قدم پر اونچ نیچ ہے اور مسافر کو ایسا راستہ پسند نہ کرنا چاہیے۔

۲۔ اگر تسبیح توڑ کر دانے نکال دیے جائیں تو اصل رشتہ زنّار سے مشابہ ہو جاتا ہے یعنی تسبیح کا توڑنا ہی راستے کو نشیب و فراز سے پاک کر دیتا ہے۔

۹۔ **شرح** : میرے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے اور میں سخت گھبرایا ہوا تھا کہ ان کا کیا علاج ہو۔ یکایک سامنے کانٹوں بھرا راستہ آ گیا۔ دل خوش ہو گیا کہ اب چھالوں کا علاج ہو جائے گا۔ یعنی اب انہیں کانٹے چبھیں گے اور پانی نکل جائے گا۔ تو چھالے دب جائیں گے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ ایک دُکھ دینے والی چیز کا علاج دوسری دُکھ دینے والی چیز سے کیا یہ مرزا کی ایذا پسندی ہے کہ وہ اپنے لیے سہل اور راحت بخش طریقہ اختیار کرنے سے ہمیشہ گریزاں رہتے ہیں۔

۱۰۔ **شرح** : دیکھیے، محبوب مجھ سے کس قدر بدگمان ہے کہ میرے فولادی آئینے پر زنگ لگ گیا، جس کا رنگ سبز ہوتا ہے۔ محبوب نے سمجھ لیا کہ یہ تو طوطی کا عکس ہے کیونکہ اس کا رنگ بھی سبز ہوتا ہے۔

بدگمانی یہ ہوئی کہ محبوب نے سمجھ لیا، میری محبت میں یکسوئی اور یک جہتی نہیں بلکہ میں نے طوطی بھی پال رکھا ہے۔

طوطی اور آئینے کی مناسبت قدرے تشریح کی محتاج ہے، طوطی کو بولنا سکھا۔

والا کے لیے آئینہ رکھ لیتے تھے اور اس کے سامنے طوطی کا پنجرہ رکھ دیتے تھے سکھانے آئینے کی پشت پر بیٹھتا تھا اور منہ میں چھوٹا سا پتہ رکھ لیتا تھا۔ پتے کے ذریعے سے جو کچھ بولتا، طوطی آئینے میں عکس دیکھ کر سمجھتا کہ کوئی دوسرا ہم جنس بول رہا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ بھی ہم جنس کی نقل شروع کر دیتا اور اس طرح بولنا سیکھ جاتا۔

اس شعر سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ عاشق نے محبوب کے گمان کے مطابق کسی اور سے بھی رشتۂ محبت وابستہ کر رکھا ہے۔

۱۱۔ **لغات۔ تجلّی** : ذات باری تعالیٰ کا جلوہ، جو حضرت موسیٰؑ کو طُور پر دکھایا گیا تھا۔

طُور : جزیرہ نمائے سینا کا مشہور پہاڑ، جس کی چوٹی پر حضرت موسیٰؑ نے ذات باری کا جلوہ دیکھا تھا، نیز انھیں تورات کے دس احکام ملے تھے۔

ظرف : صلاحیت، قابلیت۔

قدح خوار : پیالہ پینے والا یعنی میکش، شراب نوش۔

شرح : ظاہر ہے کہ شعر میں برقِ تجلّی کو شراب سے تشبیہ دی گئی ہے اور طُور شاعر کے تصوّر کے مطابق ایسا شراب نوش ہے، جس کا ظرف یعنی صلاحیت عالی نہیں۔ دیکھیے :

مستی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

کی کتنی عمدہ مثال سامنے آگئی۔

خواجہ حالی فرماتے ہیں :

" اس شعر میں اُس آیت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے کہ "ہم نے امانت کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا، مگر وہ اس کے متحمل نہ ہوئے اور ڈر گئے اور انسان نے اسے اٹھا لیا" شاعر کہتا ہے۔ کہ برقِ تجلّی کے گرنے کے ہم مستحق تھے نہ کہ کوہِ طُور، کیونکہ شراب خوار کا ظرف دیکھ کر اس کے موافق شراب دی جاتی ہے۔ پس کوہِ طُور، جو

منجملہ جمادات کے ہے، وہ کیونکر تجلی الٰہی کا متحمل ہو سکتا ہے؟

آخر میں فرماتے ہیں، یہ خیال بھی بعج اس تمثیل کے، جو اس میں بیان ہوئی، بالکل اچھوتا خیال معلوم ہوتا ہے۔"

خواجہ صاحب کی تشریح میں کسی اضافے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، لیکن یہ عرض کر دینا چاہیے کہ طور تجلی کا مستحق نہ تھا، اس لیے پھٹ گیا۔ یعنی جو شراب اسے ملی وہ اس کے ظرف سے بہت زیادہ تھی، البتہ ہم پر وہ بجلی گرتی تو اسے برداشت کر سکتے تھے۔ یہاں ہم سے مراد مرزا غالب نہیں، بلکہ نوعِ انسانی ہے۔ اس شعر سے مرزا نے تمام مخلوقات پر نوعِ انسانی کے اشرف و اعلیٰ ہونے کا روشن ثبوت بہم پہنچایا ہے۔

۱۲۔ لغات۔ شوریدہ حال: پریشان حال، دیوانہ۔

شرح: اے محبوب! میں نے تیری دیوار دیکھی تو یاد آگیا کہ یہی دیوار تھی جس سے پریشاں حال اور دیوانے غالب نے سر پھوڑا تھا۔

تہ سے دو باتوں کا اظہار مقصود ہے، اوّل یہ ایک مشہور و معروف واقعہ ہے جو پیش آیا، دوم اس سے پورے واقعے کی یاد تازہ کرانا مقصود ہے۔ شعر میں خوبی کا ایک پہلو یہ ہے کہ دیوار بیشک محبوب کی تھی، لیکن اس کے سلسلہ میں جو واقعہ سب سے بڑھ کر قابلِ ذکر پیش آیا، وہ غالب کا سر پھوڑنا تھا، لہٰذا دیوار دیکھتے ہی ذہن سب سے پہلے اس واقعے کی طرف منتقل ہوا۔

○

لرزتا ہے مرا دل، زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم، جو ہو خارِ بیاباں پر

نہ چھوڑی حضرتِ یوسفؑ نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوبؑ کی پھرتی ہے زنداں پر

۱۔ شرح: میرا دل روشن سورج کی تکلیف و زحمت پر کانپ رہا ہے۔ میں اس کی وہ بوند ہوں، جو بیابان کے کانٹے کی نوک پر ہو۔

مطلب یہ ہے کہ شبنم

فنا تعلیمِ درسِ بے خودی ہوں، اُس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے
بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر

نہیں اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا
کہ پُشتِ چشم سے جس کے نہ ہووے مُہر عنواں پر

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلوُد، یاد آیا
کہ فرقت میں تِری، آتش برستی تھی گلستاں پر

بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہو گا
قیامت اک ہوائے تند ہے، خاکِ شہیداں پر

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ! کیا ہوُا، گر اُس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

کی اس حقیر بوند کے لیے سورج جیسے عظیم القدر وجود کو زحمت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے اور بوند بھی ایسی، جو صحرا کے کانٹے کی نوک پر ہو؟ سورج شبنم کو جذب کرنے کے لیے اپنی شعاعیں پھیلاتا ہے، جو حرارت پہنچا کر شبنم کو اڑا لے جاتی ہیں، لیکن شاعر کہتا ہے کہ جو قطرہ شبنم خارِ بیاباں پر ہے، اس کے لیے زحمت اٹھانا کس بنا پر گوارا کیا جائے؟
اس سلسلے میں دو پہلو قابل غور ہیں۔
۱۔ شبنم کا جو قطرہ کانٹے کی نوک پر ہو، وہ زیادہ دیر تک اپنی جگہ ٹھہر نہیں سکتا، کانٹے کو ذرا سی جنبش ہو گی تو قطرہ گر جائے گا، لہذا ایسی بے حقیقت چیز کے لیے سورج کو تکلیف اٹھانے کی کوئی حاجت نہیں۔
۲۔ جو قطرہ کانٹے کی نوک پر ہو، وہ ہر لحظہ کانپتا رہتا ہے، کیونکہ اس کا مقام بے حد تنگ اور نکیلا ہوتا ہے۔ جو قطرہ پتوں پر ہو، اس کی کیفیت یہ نہیں ہوتی۔ مرزا نے "لرزتا ہے مرا دل" لکھتے وقت نوکِ خار کے قطرے کی یہ کیفیت بھی پیشِ نظر رکھی۔

گویا لرزنے کے دو مفہوم ہوئے۔ اوّل قطرے کی حالت کا عام نقشہ، دوم اس کی معنوی پریشانی، جو سورج کی تکلیف سے پیدا ہوئی۔

شعر میں اپنی ہستی کی بے حقیقتی اور مبدائے حقیقی کی عظمت و استواری کا اظہار کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ رحیم و کریم ذات ادنیٰ سے ادنیٰ اور حقیر سے حقیر شے کے معاملات پر بھی یکساں نگاہِ لطف رکھتی ہے۔

۲۔ لغات۔ خانہ آرائی: گھر کی آرائش۔

سفیدی: یہاں اس کے دو مفہوم ہیں، اوّل وہ سفیدی، جو گھر کی صفائی اور آرائش کے لیے عموماً کی جاتی ہے، دوم وہ سفیدی، جو حضرت یعقوبؑ کی آنکھوں میں حضرت یوسفؑ کی جدائی پر روتے روتے پیدا ہو گئی تھی۔

شرح: حضرت یوسفؑ قید خانے میں پہنچ گئے، لیکن وہاں بھی انھوں نے منزل کو سجانے اور سنوارنے کا شیوہ قائم رکھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ کی آنکھیں، جو روتے روتے سفید ہو گئی تھیں، اپنے محبوب فرزند کی تلاش میں قید خانے کی دیواروں پر پھر رہی تھیں۔ اسی کو عام سفیدی قرار دیتے ہوئے مرزا نے خانہ آرائی کا ثبوت پیش کر دیا۔

۳۔ لغات۔ فنا تعلیم: فنا کی تعلیم پایا ہوا۔ وہ شخص جو فنا کی تعلیم حاصل کر چکا ہو۔

درسِ بیخودی: اپنے آپ سے بے خبر ہو جانے کا سبق۔

لام الف: لا جو عربی میں حرفِ نفی ہے اور یہاں اسے فنا کی دلیل بنایا گیا۔

دبستان: ادبستان کا مخفف۔ مکتب۔ تعلیم پانے کی جگہ۔

شرح: میں بیخودی کا سبق لیتا ہوا اس زمانے سے فنا کی تعلیم پا بیٹھا ہوں، جب مجنوں یعنی قیس عامری ابھی مکتب کی دیوار پر لام الف لکھنے کی مشق کر رہا تھا۔

شعر میں مجنوں پر اپنی فضیلت و سبقت ظاہر کی ہے، لیکن کمال یہ کیا کہ مکتب میں پڑھنے والے بچوں کا عام طریقہ بطورِ خاص پیشِ نظر رکھا۔ وہ جب تھوڑا بہت لکھنا

سیکھ لیتے ہیں تو کوئلہ یا کھریا مٹی لے کر سیکھے ہوئے حروف دیواروں پر لکھنا شروع کر دیتے ہیں اور سب سے بڑھ کر مکتب ہی کی دیواریں ان کا تختۂ مشق بنتی ہیں۔ پیر مجنوں سے ابجد نہیں لکھوائی، بلکہ لام الف لکھوایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ مجنوں نے فنا کا صرف ابتدائی سبق لیا تھا جب میں پوری تعلیم پاکر فراغت حاصل کر چکا تھا۔

۴۔ **لغات۔ تشویش** : رنج، محنت، پریشانی، تردد، دوڑ دھوپ۔

پارہ ہائے دل : دل کے ٹکڑے۔

شرح : اگر میرے دل کے ٹکڑے نمکدان پر صلح کر لیتے، یعنی سب اس امر پر راضی ہو جاتے کہ ان پر نمک چھڑکا جاتا رہے تو کتنا اچھا ہوتا؟ میں مرہم کے لیے دوڑ دھوپ اور تردد سے بالکل فارغ ہو جاتا۔ لیکن دل کے ٹکڑوں کو نمک چھڑکنے سے ایسی لذت ملی کہ ان میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے سخت جھگڑے شروع ہو گئے۔ ہر ٹکڑا یہ کہنے لگا کہ سارا نمک مجھے ملنا چاہیے۔ اس لڑائی جھگڑے کو ختم کرنے کی ایک صورت یہ نظر آئی کہ ان ٹکڑوں کو نمک کی لذت سے محروم کر دیا جائے، لہٰذا مرہم کی تلاش کا خیال آیا۔

واضح رہے کہ شاعر نے مرہم تلاش نہیں کیا بلکہ دل کے ٹکڑوں کو اس لذت سے محروم کر دینے کی ایک تدبیر سوچی، جس نے ان کے درمیان حد درجہ کش مکش اور کھینچ تان پیدا کر دی تھی اور شاعر کے لیے زندگی اجیرن بن گئی تھی۔ گویا یہاں بھی بنیادی چیز ایذا طلبی کے سوا کچھ نہ تھی۔

۵۔ **لغات۔ طومار** : کاغذ کا مٹھا، نامہ، دفتر۔ یہ لفظ اُن خطوں کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا جنھیں دفتر کی شکل میں مرتب کر لیتے تھے یا جوڑ جوڑ کر ایک لمبا کاغذ تیار کر لیتے تھے، جسے گول کر کے چونگے یعنی بانس یا ٹین کے خول میں رکھتے تھے۔ مقصود یہ ہوتا تھا کہ بچوں کو وہ خط پڑھائے جائیں تاکہ وہ مختلف دفتر کے رسم الخط اور اسلوب تحریر سے آگاہ ہو جائیں۔ ضروری کاغذات کے رجسٹروں یا دفتروں کے لیے بھی یہ لفظ مستعمل تھا۔

پُشتِ چشم : چشم پوشی، آنکھ پھیر لینا۔
مُہر : یہاں صرف یہ حقیقت ملحوظ رکھنی چاہیے کہ مُہر کی شکل فی الجملہ آنکھ سے ملتی جُلتی ہے۔

شرح : محبت والفت کی ولایت میں ناز و انداز اور حسینوں کی اداؤں کا کوئی ایسا طومار یا صحیفہ یا دفتر موجود نہیں، جس کی پیشانی پر چشم پوشی، بے رخی یا بے پروائی کی مُہر نہ ثبت ہو۔

مطلب یہ کہ محبت کی رسم و راہ میں محبوب جو کچھ بھی کرتے ہیں، وہ عاشقوں سے بے رخی بے پروائی اور تغافل کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ اس مقام کی عام رسمیں ہیں اور ان پر کسی کو تعجب نہ ہونا چاہیے، لیکن سچے عاشقوں نے ہمیشہ یہ سب کچھ برداشت کیا ہے اور یقیناً برداشت کرتے رہیں گے۔

۶- **لغات** - ابرِ شفق آلود : وہ بادل جس پر آفتاب کے طلوع و غروب کی شعاعوں سے سرخی چھا گئی ہو۔

شرح : اب میں نے شفق کی سرخی سے لالہ فام ابر کو دیکھا تو یاد آگیا کہ جب اے محبوب! میں تجھ سے جُدا تھا تو باغ پر آگ برس رہی تھی۔

مولانا طباطبائی نے بالکل بجا فرمایا کہ لفظ "اب" اس شعر میں کثیر المعنی ہے یعنی یہ کہنا کہ اب یاد آیا صاف بتاتا ہے کہ پہلے یہ بات بھولی ہوئی تھی۔ عاشق نے ہجر میں صدمے اٹھائے، وہ محبوب کو دیکھ کر انتہائی خوشی اور محویت میں سب کے سب یاد نہیں رہ سکتے۔ کچھ مدت گزر جانے کے بعد ایک ایک چیز یاد آرہی ہے اور لطف یہ کہ کوئی نہ کوئی دلکش منظر دیکھ کر ہی پرانی یادیں تازہ ہوتی ہیں اور پتا چلتا ہے کہ جو مناظر ہر لحاظ سے دلآویز تھے، محبوب کی جدائی میں وہ بھی سراسر رنج و مصیبت اور دلسوزی و دلدوزی کا باعث بن گئے۔ مثلاً یہی شفق کا منظر، جب وہ بادلوں پر چھا جاتی ہے کتنا پیارا معلوم ہوتا ہے، لیکن جب محبوب سے جدائی تھی تو یہی منظر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باغ پر آسمان سے آگ برس رہی ہے۔

اس شعر سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ گردوپیش کے مناظر کی دلآویزی بجائے خود کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتی بلکہ سب کچھ انسان کی دلی کیفیت پر موقوف ہے۔ اگر وہ خوش ہے تو غیر دلچسپ مناظر سے بھی شادمانی کے اسباب پیدا کرے گا۔ اگر وہ ناخوش، رنجیدہ اور مصیبت زدہ ہے تو بہتر سے بہتر منظر بھی اس کے لیے سوزش اور جلن کا باعث ہو گا۔

شعر میں ابرِ شفق آلود کے لیے عالمِ رنج و غم میں گلستاں پر آگ برسنے سے تشبیہ دینا بدیع تشبیہ ہے۔ یعنی جو شے اس عالمِ اسباب میں زیادہ سے زیادہ فرحت افزا ہے، وہ بھی آتش باری کا مرکز معلوم ہوتی ہے۔

۷۔ **شرح** : شہید قبروں میں جا سوئے۔ ان کے جسم مٹی میں مل گئے۔ قیامت کے دن مردے زندہ کیے جائیں گے، لیکن شہیدوں کی خاک میں اس کے سوا کیا باقی رہ گیا ہو گا کہ جلوۂ سراپا ناز کے شوق میں انتہائی بے قراری موجود ہو، لہٰذا قیامت شہیدوں کی قبر پر سے گزرے گی تو اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ہوا کے ایک تند و تیز جھونکے کی سی ہو گی، جو اس خاک کو اڑانے میں مزید مدد دے گا، جو پہلے ہی نازِ محبوب کے شوق میں پرواز کے لیے بیقرار ہے۔

حق یہ ہے کہ اس قسم کے لبریز حقیقت شعر اتنے دل پذیر اور پُر تاثیر انداز میں کہنا بے حد مشکل ہے اور ان کی مثالیں دواوین میں بہت کم ملتی ہیں۔

۸۔ **شرح** : اے غالب! اگر نصیحت کرنے والے نے سختی و درشتی سے کام لیا تو اس پر لڑنے کی کون سی وجہ ہے، ہمارے پاس اپنا گریبان ہے، اسے پھاڑ سکتے ہیں اور تار تار کر سکتے ہیں۔ اپنا زور لڑنے پر کیوں صرف کریں، گریبان پر کیوں نہ آزمائیں؟ کیا اس طرح بھی تسکین کا وہ سامان بہم نہ پہنچے گا، جو ہم ناصح سے لڑ کر بہم پہنچانا چاہتے ہیں؟

اس شعر میں قابلِ غور نکتہ ہے کہ جس قوت کے مقابلے میں انسان بے دست و پا ہو، اس میں تسکین کے لیے اپنا نقصان کر لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

شعر میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اگر ناصح نے درشت کلامی سے کام لیا تو ہم اپنا گریباں

جھاڑ کر اسے بتا سکتے ہیں کہ عشق و محبت کے معاملات میں تیری نصیحت ہمارے لیے بالکل بے حقیقت اور بے اثر ہے۔

○

ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اَور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اَور
یارب! وُہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اَور
ابرو سے ہے کیا اس نگہِ ناز کو پیوند؟
ہے تیر مقرر، مگر اُس کی ہے کماں اَور
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم؛ جب اُٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے، جا کر، دل و جاں اَور
ہر چند سبکدست ہوے بُت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اَور
ہے خونِ جگر جوش میں، دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اَور
مرتا ہوں اُس آواز پہ، ہر چند سر اُڑ جائے
جلاد کو لیکن وُہ کہے جائیں کہ "ہاں اَور"

۱۔ **لغات۔ نشان:** یہاں اس کے معنی پتا، نکتہ اور بھید ہیں۔
بسکہ: چونکہ۔

شرح: چونکہ ان کے ہر اشارے میں کوئی اَور ہی نکتہ اور ہی بھید پایا جاتا ہے، اس لیے وہ محبت بھی کرتے ہیں تو ہمارا خیال دوسری ہی طرف جاتا ہے۔ یعنی ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں بھی کوئی نہ کوئی چال اور فریب ہے۔ عاشق محبوب کی ادائیں دیکھ دیکھ کر اتنا پریشان ہو چکا ہے کہ اس کے دل میں کسی بھی بات کے لیے یقین کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ وہ یقین کا جوہر ہی کھو چکا ہے۔ لہٰذا محبوب بظاہر محبت بھی کرے تو عاشق کے لیے اطمینان کی کوئی صورت نہیں بنتی۔ بدرجۂ آخر وہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ محبت کا اظہار

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اِک داغِ نہاں اَور

لیتا، نہ اگر دِل تمھیں دیتا، کوئی دَم چین
کرتا، جو نہ مرتا، کوئی دن آہ و فغاں اَور

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اَور

ہیں اَور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ "غالب کا ہے اندازِ بیاں اَور"

اس لیے کر رہے ہیں، مجھے اپنے دام میں خوب الجھائیں، پھر محبوبانہ نازو انداز سے بری طرح خبر لیں۔

۲۔ شرح : بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ محبوب سے خلوت میں ملاقات کی درخواست کی جارہی ہے، لیکن صاف صاف اور کھُل کر اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ شاید عتاب نازل ہو۔ اشاروں کنایوں سے مطلب سمجھانا چاہتے ہیں اور محبوب سمجھتا نہیں، لہذا مجبور ہو کر خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اگر مجھے دوسری زبان نہیں مل سکتی، جو اپنا مدعا ٹھیک سمجھا سکے تو محبوب ہی کو کوئی اَور دل دے دے، جو آسانی سے میری بات سمجھ سکے۔

اس شعر کا تعلق محبوب کے ساتھ معاملات کی صفائی سے بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی محبوب نے بعض حرکتوں پر ناراضی ظاہر کی، عاشق نے اپنی طرف سے صفائی پیش کی۔ عاشق کا موقف محبوب کی سمجھ میں نہیں آتا اور عاشق پریشان ہو کر کہتا ہے کہ اے اللہ! مجھے دوسری زبان نہیں مل سکتی تو محبوب ہی کو دوسرا دل دے دے۔

خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ شعر بظاہر معشوق کے حق میں معلوم ہوتا ہے، مگر اس میں درپردہ ان لوگوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو مرزا کے کلام کو بے معنی یا بعید الفہم سمجھتے تھے۔

اس صورت میں مرزا کی مراد یہ ہے کہ اگر لوگوں نے میری باتیں نہیں سمجھیں اور آئندہ بھی ان سے سمجھنے کی امید نہیں رکھی جا سکتی تو خدا کی بارگاہ میں یہی گزارش پیش کی جا سکتی ہے کہ مجھے دوسری زبان نہیں مل سکتی تو ان لوگوں کو دوسرے دل دے دیے جائیں۔

متکلم و مخاطب کے درمیان مبادلۂ افکار کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ دونوں کے دل و زبان میں اک گونہ مناسبت ہو۔ اگر مناسبت نہ ہو گی تو ظاہر ہے کہ مبادلے کی کوئی صورت نہ رہے گی۔ مرزا نے شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا۔

۳۔ **لغات**۔ پیوند: ملاقہ، تعلق، جوڑ

مقرّر: ضرور، بلاشبہ، یقیناً۔

شرح: محبوب کی نگاہِ ناز کو بھلا ابرو سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ یعنی یہ تیر ابرو کی کمان سے نہیں نکل سکتا۔ اس کا تعلق کسی اَور ہی کمان سے ہے، یہ کسی دوسری ہی کمان سے نکلا ہے اور وہ کمان بظاہر حسن کی دلفریبی و دلاویزی ہے، لیکن اس کا ذکر نہیں کیا۔ یہ شعر کی ایک اور خوبی ہے کہ ہر فرد کو موقع دے دیا، وہ اپنے احوال و فطرت کے مطابق اس کمان کا تعین کرے۔

دیکھیے، کمان و ابرو اور تیر و نگاہ کی تشبیہ بہت پرانی اور فرسودہ تھی، مگر مرزا نے کمالِ جدّت سے کام لے کر اس میں نئی تازگی اور نیا حسن پیدا کر دیا۔

۴۔ **شرح**: اے محبوب! جب تم شہر میں موجود ہو تو ہمیں دل و جان کا کیا غم ہے؟ کیونکہ جب اٹھیں گے، بازار سے نئے دل و جان خرید لائیں گے۔ تمھارے ہوتے ہر شخص کے لیے دل و جان دوبھر ہوا ہے اور وہ سستے داموں بیچ دینے کے لیے تیار ہیں۔ جو جنس بازار میں زیادہ آ جائے، رسید و طلب کے اصول کے مطابق وہ ارزاں ہو جاتی ہے۔

اس شعر کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ دل و جان لینے میں محبوب کی مشاقی نے اس جنس کا بازار آراستہ کر دیا ہے، جہاں یہ بہ کثرت بک رہی ہے۔ مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ محبوب جس شہر میں موجود ہو، وہاں کون اس سے دل و جان بچا کر رکھنے کے لیے تیار ہو گا؟ سب اس متاعِ عزیز کو اٹھائے بہ طور نذر پیش کرنے کے لیے تیار ہیں۔

یہ شاعر کا اسلوبِ بیان ہے، جس نے اصل موضوع کو اس رنگ میں پیش کر دیا۔

۵۔ **لغات**۔ سبکدست: چابک دست۔ مشاق۔ ماہر

شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

" اس شعر میں سارا زور " ہم " کے لفظ پر ہے۔ یعنی جب تک ہماری ہستی باقی ہے، اُس وقت تک راہِ معرفت الٰہی میں ایک اور سنگِ گراں سدِّ راہ ہے۔ پس اگر ہم نے بت توڑنے میں سبکدستی حاصل کی ہے تو کیا فائدہ؟ یہ بڑا بھاری بُت یعنی ہماری ہستی تو ابھی موجود ہے "!

مطلب یہ ہے کہ ہم نے ہوا و ہوس کے بُت توڑنے میں خوب مشاقی اور مہارت حاصل کرلی۔ جو بھی بُت سامنے آیا، اسے چکنا چوُر کر کے رکھ دیا، لیکن خود ہماری ہستی کا بُت جو بڑے بھاری پتھر کی حیثیت رکھتا ہے، ہمارا راستہ بدستور روکے ہوئے ہے۔ جب تک یہ نہ ٹوٹے اور اس کا قلع قمع نہ ہو، نہ راستہ صاف ہو سکتا ہے، نہ ہم قدم آگے بڑھا سکتے ہیں اور نہ معرفت کی منزل پر پہنچ سکتے ہیں۔ غرض یہ کہ تنہا ہوا و ہوس کے بُت توڑنے سے فراغت حاصل نہیں ہوتی اور معرفت کا راستہ نہیں کھلتا، کیونکہ جب تک ہم موجود ہیں، ہوا و ہوس کا سلسلہ ساتھ رہے گا، البتہ ہمارے وجود کا بت ٹوٹے گا تو مقصود پر پہنچنے کا دروازہ کھُلے گا۔

۷۔ لغات۔ دیدۂ خوں نابہ فشاں : خون برسانے اور رونے والی آنکھیں۔

شرح : جگر کا خون جوش میں آگیا ہے، یہ غمِ ہجر اور یادِ محبوب کا نتیجہ ہے۔ اگر میرے پاس لہو رونے اور خون برسانے والی کئی آنکھیں ہوتیں تو جی بھر کے رو لیتا۔

یہ مضمون خاص مرزا غالب کا ہے کہ کبھی ان کے دل کا بوجھ ہلکا کرنے اور خونِ جگر کا جوش نکالنے کے لیے کئی آنکھوں کی ضرورت پیش آئی، کیونکہ خدا کی عطا کی ہوئی دو آنکھوں کے لیے یہ وظیفہ ادا کرنا ممکن نہیں، اصل کام ان کی بساط سے بہت زیادہ ہے۔ اسی طرح جب غموں کی فراوانی ہوئی اور اس نے سیل کی سی صورت اختیار کرلی تو فرمایا:

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

گویا جس طرح غم کی فراوانی کے اظہار کے لیے یہ کہا کہ اس کا تحمل کئی دلوں کا

تقاضا کرتا ہے، اسی طرح خونِ جگر کے جوش کی طوفانی کیفیت کے اظہار کے لیے یہ پیرایہ اختیار کیا کہ اسے مزد کرنا منظور ہو تو دو نہیں، بلکہ کئی خون رونے والی آنکھیں درکار ہیں۔ مرزا کے نزدیک دل اور آنکھیں دکھ سہنے اور رونے کا ایک پیمانہ ہیں۔ اب جتنے دُکھ زیادہ ہوں گے اور خونِ جگر کا جوش جتنے زوروں پر ہوگا، اسی کے مطابق پیمانے درکار ہوں گے۔

۷۔ **شرح** : میں تو محبوب کی آواز پر قربان ہُوا جاتا ہوں۔ بیشک سر اُڑتا ہے تو اُڑ جائے، گردن کٹتی ہے تو کٹ جائے، لیکن وہ جلاد کی ہر ضرب پر کہے جائیں کہ "ہاں اَور لگا" یہ آواز اتنی دلکش و دلفریب ہے کہ اس پر میں بے تکلف جان قربان کر سکتا ہوں۔

دیکھیے، یہاں بھی مقصود سر کٹنا نہیں، بلکہ محبوب کی دلفریب آواز کی کیفیت پیش کرنا منظور ہے، اس کے لیے جلاد کا ڈراما تیار کیا گیا۔ گویا اتنے نازک حالات میں بھی، جب جان جا رہی ہو، آوازِ محبوب کی دلفریبی ہر شے پر فائق ہے۔ اور اسی کے سننے کی آرزو ہے۔

۸۔ **شرح** : میں ہر روز اپنا نیا چُھپا ہُوا داغ دکھا دیتا ہوں۔ لوگوں کو یہ دھوکا ہوتا ہے کہ آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ میرے ہر داغ کی حرارت، جہاں تابی اور حدت بالکل سورج سے مشابہ ہے۔ اتنی مشابہ ہے کہ لوگ دیکھتے ہیں تو اوّل نظر میں سمجھ لیتے ہیں کہ سورج نکل آیا، البتہ کچھ مدت بعد انھیں دھوکے کا احساس ہوتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو مرزا غالبؔ کے سینے کا ایک نیا داغِ محبت تھا، جس پر سورج کا دھوکا ہُوا ہے۔

۹۔ **شرح** : خود مرزا غالبؔ اس شعر کی شرح میں قاضی عبدالجلیل جنوںؔ بریلوی کو لکھتے ہیں :

"یہ بہت لطیف تقدیر ہے۔ لیتا کو ربط ہے چمن سے، کرتا مربوط ہے

آہ وفغاں سے۔ عربی میں تعقید لفظی و معنوی دونوں معیوب ہیں۔
فارسی میں تعقید معنوی اور تعقید لفظی جائز بلکہ فصیح و بلیغ بہ بختہ تقلید
ہے فارسی کی۔ حاصل معنی مصرعین یہ کہ اگر دل تمہیں نہ دیتا تو کوئی
دم چین لیتا۔ اگر نہ مرتا تو کوئی دن اور آہ وفغاں کرتا۔"

فارسی میں لفظی تعقید جائز یا فصیح و بلیغ ہو تو ہو، لیکن تعقید لفظی ہو یا معنوی،
بہ ہر حال عیب ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ردیف کی پابندی نے مرزا غالب کو اس
تعقید لفظی پر مجبور کیا۔ مقصود یہ نہیں کہ ردیف و قافیہ کی پابندی پر اعتراض کیا جائے
اس کے بغیر شعر کی تین چوتھائی موسیقی ختم ہو جاتی ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ
بعض اوقات شاعر تعقید پر مجبور ہو جاتا ہے، لیکن ایسا شعر، جیسا مرزا کا ہے،
بہ آسانی چھوڑا جا سکتا تھا، کیونکہ اس میں کوئی خاص بات ہی نہیں، اس طرح تعقید
ختم ہو سکتی تھی۔

۱۰- **شرح** : خواجہ حالی فرماتے ہیں:

"نالے یعنی ندی نالے، نہ آہ و فغاں۔ مثال کس قدر مثل لہ کے مطابق
ہے اور مضمون کتنا مطابق واقعے کے ہے۔ فی الحقیقت مصیبت
اور رنج و تکلیف کے سبب جوں جوں شاعر کی طبیعت رُکتی ہے اسی
قدر زیادہ راہ دیتی ہے۔ خصوصاً جو مضمون وہ اس وقت اپنے حسب حال
لکھتا ہے، وہ نہایت مؤثر اور درد انگیز ہوتا ہے۔"

شعر میں مرزا نے اپنی طبع رواں کو ندی نالے سے تشبیہ دی ہے۔ پہاڑی ندی نالوں
میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آس پاس سے بڑے بڑے پتھر بیچ میں آگرتے ہیں اور ندی کا
بہاؤ رُک جاتا ہے، لیکن رکاوٹ پر منبع کا پانی نہیں رکتا، وہ بدستور آتا رہتا ہے اور
جمع ہو کر اتنا زور پیدا کر لیتا ہے کہ یا تو ان پتھروں کو بہالے جائے، جو راستے میں
رکاوٹ بنیں یا اس رکاوٹ کے اوپر سے بہنے لگے اور آہستہ آہستہ اسے ختم کر دے۔
اس صورت میں ندی نالے کا بہاؤ اور تیز ہو جاتا ہے۔

دومرتبہ دریائے سندھ میں ایسا واقعہ پیش آیا کہ ارد گرد کی برفانی چٹانیں دریا میں آگریں اور بہاؤ رُک گیا ، یہاں تک کہ آگے دریا بالکل پایاب رہ گیا۔ پھر جمع شدہ پانی نے یکایک برفانی چٹانوں کو توڑ دیا اور اتنا پانی آیا کہ دریا کے اصل بہاؤ سے تیرہ تیرہ فٹ اونچا بہنے لگا۔ آس پاس کی اکثر بستیاں تباہ ہوگئیں۔

یہی مثال مرزا نے اپنی طبع رواں کے لیے اختیار کی فرماتے ہیں کہ اگر کسی مصیبت یا رنج و غم کے باعث طبیعت میں رکاوٹ پیدا ہوتا ہے تو ندی نالوں اور دریاؤں کی طرح اس کی روانی تیز تر ہو جاتی ہے اور بہتر سے بہتر اور پر تاثیر مضمون تراوش کرتے ہیں۔

۱۱۔ **شرح :** دنیا میں اور بھی اچھے اچھے شاعر اور سخنور موجود ہیں ، لیکن لوگ کہتے ہیں کہ غالب کا انداز بیان ان سب سے الگ اور اچھوتا ہے۔

اس شعر میں بھی بیان کی جدت طرازی کا کمال دکھا دیا ، یعنی اپنے انداز کے اچھوتا ہونے کی کہانی خود نہ کہی ، دوسروں کی زبان سے کہلوائی اور وہ بھی اس طرح کہ لوگوں میں عام چرچا ہے ، عام شہرت ہے ، غالب کا انداز بیان سب سے الگ ہے۔

○

صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر
تغیر ، آبِ برجا ماندہ کا ، پاتا ہے رنگ آخر
نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہُوا جامِ زُمرّد بھی مجھے ، داغِ پلنگ آخر

۱۔ **لغات** ۔ **آبِ برجاماندہ :** اپنی جگہ ٹھہرا ہُوا پانی ، جیسے حوض اور تالاب کا پانی کہ وہ جاری نہیں ہوتا ، بلکہ ٹھہرا رہتا ہے۔

شرح : آئینے کی حیرت اور صفائی ہی اس کے لیے آخر زنگ کا سامان بن جاتی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھنی چاہیے کہ جو پانی اپنی جگہ ٹھہرا رہے گا اور جاری نہ ہوگا ، اس کا رنگ بدل جائے گا اور کائی جم جانے سے اس کی صفائی اور پاکیزگی باقی نہ رہے گی۔

اس شعر کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ زندگی حرکت کا نام ہے، نہ کہ جمود کا۔ جو چیز یا جو وجود اپنی جگہ ٹھہرا رہے، وہ بہرحال زندگی کی حقیقت سے محروم ہو جائے گا۔ جس طرح پانی نہایت صاف و پاکیزہ شے ہے۔ جاری رہے گا تو اس کی پاکیزگی قائم رہے گی ٹھہر جائے گا تو پاکیزگی سے محروم ہو جائے گا۔ ٹھیک اسی طرح آئینہ بھی ایک حالت پر رہے گا تو اس کی صفائی ختم ہو جائے گی اور اس میں زنگ لگ جائے گا۔

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اگر انسان مدت العمر اسی مقام میں رہے گا جسے صوفیہ مقام حیرت قرار دیتے ہیں تو اس کی صفائی اور پاکیزگی زائل ہو جائے گی۔ مرحوم ہجویری کے قول کے مطابق "وادیِ حیرت کا راستہ نہایت پُرخطر ہے۔ بہت سے طالبِ حقیقت اس سے آگے نہیں پہنچ پاتے۔ یہ سراب اور تشنہ لبی کی حقیقت ہے... لیکن جو اہلِ ظرف ہیں، وہ بہ دیر و بہ دقت اس وادی کو طے کر جاتے ہیں"۔

۲۔ **شرح**: عیش و جاہ کا سامان بھی وحشت کا علاج نہ کر سکا اور دیوانگی زائل نہ ہو سکی۔ دنیا کی دولت اور جاہ و حشمت سچے عاشق کو راہِ عشق سے باز نہیں رکھ سکتی۔ زمرد کا پیالہ دولت و حشمت کا نشان ہے۔ جو سچا عاشق ہے، اسے یہ پیالہ بھی چیتے کے جسم کا داغ نظر آتا ہے، جو بجائے خود وحشت کی علامت ہے، کیونکہ چیتے آبادیوں میں نہیں، جنگلوں، پہاڑوں اور ویرانوں ہی میں ملتے ہیں۔

○

جنوں کی دستگیری کس سے ہو، گر ہو نہ عریانی
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

بہ رنگِ کاغذِ آتش زدہ، نیرنگِ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے، بالِ یک تپیدن پر

۱۔ **لغات**۔ دستگیری: مدد، اعانت، حمایت۔
گریبان چاک: فکِ اضافت بھی مانا جا سکتا ہے، جیسے گریبان چاک، پھٹا ہوا گریبان اور اضافت مقلوب بھی ہو سکتی ہے، یعنی چاکِ گریباں۔

شرح : برہنگی کے سوا جنون کا ہاتھ کون تھام سکتا ہے؟ کون اس کا حامی و مددگار ہو سکتا ہے؟ عریانی گریبان پھاڑنے یا چاک ہونے کا نتیجہ ہے۔ لہذا اس چاک کا حقِ احسان میری گردن پر رہ گیا۔ اسی نے عریانی پیدا کی، جس کی وجہ سے جنون کی دستگیری ہوئی اور میری حالت جنون قائم رہی۔

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض، رہزن پر

ہم اور وہ بے سبب رنج، آشنا دشمن، کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے، تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

فنا کو سونپ، گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گُلخن پر

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا، قاتل سے کہتا ہے
"تو مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر"

۲۔ لغات۔ کاغذ آتش زدہ: وہ کاغذ، جسے آگ لگائی گئی ہو۔

نیرنگِ بیتابی : اضطراب اور تڑپ کی نیرنگی یعنی بوقلمونی۔

بال : پر۔ بازو

تپیدن : تڑپنا۔

شرح : میرے اضطراب اور تڑپ کی نیرنگی اس کاغذ کی طرح، جسے آگ لگادی گئی ہو، ایک ایک تڑپ کے بازو پر دل کے ہزار ہزار آئینے باندھتی ہے۔

عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کاغذ آتش زدہ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"حروف آشنا کاغذ گویا بلکہ زندہ ہوتا ہے۔ کاغذ چونکہ کلام ربی اور کلمات بشری کا حامل ہے اس لیے کاغذ کے جلانے کو عیب خیال کیا جاتا ہے، لیکن کاغذ کی تحریر مستقل سند ہوتی ہے، اس لیے شہادت کو تلف کرنے کی غرض سے کاغذ کا ضائع کرنا بسا اوقات لازمی ہو جاتا ہے۔ معشوق ابتدا سے نامہ ہائے عشاق کو جلاتے آئے ہیں، لیکن کسی شاعر کے مشاہدے میں

یہ نہ آیا کہ کاغذ کے جلنے میں کیا کیا شاعرانہ کیفیات نہاں، بلکہ عیاں ہیں
جب کاغذ کو آگ میں ڈالا جاتا ہے تو ذرا سی دیر آتش بلند ہو کر شعلہ
بجھ جاتا ہے اور سرخ و سیاہ رنگ کا غذ کا نیم جان جسم رہ جاتا ہے،
جس میں سکرات اور نزع کی تمام علامات نظر آتی ہیں۔ یہ ارتعاشِ حیات
بھی مزہ ہو جاتا ہے اور سراپا جل چکنے کے بعد ہزاروں نقطۂ ہائے روشن
کاغذ پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ آخرکار کاغذ خاکستر ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔"

آتش زدہ کاغذ کی اسی کیفیت کے پیشِ نظر مرزا نے اپنے نیرنگِ بیتابی کے حل سے تشبیہ دی۔ جو روشن نقطے آخر میں کاغذ کی سطح پر نمودار ہوتے ہیں، ان کی حیثیت ٹمٹماتے تاروں کی سی ہوتی ہے۔

یہی کیفیت مرزا نے یوں پیش کی، گویا ایک ایک تڑپ کے بازو پر ہزار ہزار آئینے باندھ دیے گئے ہیں۔ دل اس لیے لائے کہ احساس دل کی خاصیت ہے، تڑپنا اور لوٹنا دل ہی پر موقوف ہے۔ مشاہدے کے کمال کے علاوہ شاعر نے تشبیہ، پھر اس کیفیت کے بیان میں حیرت انگیز کمال دکھایا۔

ایک صاحب فرماتے ہیں: آتش زدہ کاغذ میں سکڑنے اور سمٹنے کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، اس سے بیتابی کو تشبیہ دی ہے اور ایسے کاغذ میں جو روشن نقطے، نمودار ہوتے ہیں، ان کی مناسبت سے ہزار کہا۔ مطلب یہ کہ تکلیف و بیقراری میں اگر کوئی شے موجب تسکین ہوتی ہے تو وہ تڑپنا اور لوٹنا ہے۔

۳۔ **لغات** ۔ عیشِ رفتہ: گزرے ہوئے زمانے کی راحت و آسائش۔
متاعِ بُردہ: چھپا ہوا مال، لوٹا ہوا مال۔

شرح: خواجہ حالی فرماتے ہیں:

"یہ مضمون بھی بالکل وقوعیات میں سے ہے۔ جو شخص آسودگی کے بعد مفلس ہو جاتے ہیں، وہ ہمیشہ اپنے تئیں مظلوم، ستم رسیدہ اور فلک زدہ سمجھا کرتے ہیں اور اخیر دم تک اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ ضرور کبھی

نہ کبھی ہمارا انصاف ہو گا اور ہمارا اقبال پھر عود کرے گا۔"

ہم اپنی گزری ہوئی راحت و آسائش کے لیے آسمان سے کیا کیا تقاضے کر رہے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہم سے چھن گیا، وہ واپس مل جائے تاکہ پھر امن چین کی زندگی بسر کریں، لیکن اتنا نہیں سمجھتے کہ آسمان کی حیثیت ڈاکو اور قزاق کی ہے۔ وہ جو مال و متاع لوٹ کر لے گیا ہے، اسے ہم سادہ لوحی سے رہزن پر قرض سمجھے بیٹھے ہیں، کہ جب چاہیں گے، وصول کر لیں گے یا تقاضا کر کے لے لیں گے، حالانکہ رہزنوں سے لُوٹا ہُوا مال کبھی واپس نہیں ملا۔

۴ ۔ **لغات** ۔ **بے سبب رنج** : بغیر کسی سبب کے خفا ہونے والا، بلاوجہ ناراض ہو جانے والا۔

آشنا دشمن : دوست کا دشمن، محبت کرنے والے سے عداوت رکھنے والا۔

روزن : روشن دان۔

شرح : ہمارا معاملہ ایسے محبوب سے آ پڑا ہے، جو بغیر کسی سبب کے ناراض ہو جاتا ہے۔ دوستوں اور خیر خواہوں سے دشمنی رکھتا ہے۔ اس کی بدگمانی کا یہ عالم ہے کہ اگر اس کے گھر کے روشن دان میں سے سورج کی کرن اندر چلی جائے تو فوراً غصّے سے پکار اٹھتا ہے کہ روشن دان کی آنکھ نے نگاہ پیدا کر کے مجھے دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ یہ صریح تہمت ہے۔ کیونکہ نہ روزن کی آنکھ ہوتی ہے اور نہ سورج کی کرن ایسی نگاہ بنتی ہے۔ یا یہ کہ عاشق روزن کی آنکھ سے مجھے جھانک رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی تہمت لگانا بجائے خود بلاوجہ ناراض ہونے اور دوست سے دشمنی رکھنے کا ثبوت ہے۔ جس کی بدگمانی کا یہ عالم ہو اس کے باب میں عاشق کیا کرے

۵ ۔ **لغات** ۔ **فروغِ طالع** : قسمت کے ستارے کا چمکنا۔ خوش نصیبی۔

خاشاک : کوڑا کرکٹ ۔ گھاس پھوس ۔

گلخن : گُل بمعنی آتش، خن خانے کا مخفف یعنی بھٹی۔

شرح ۔ اگر تو اپنی حقیقت تک پہنچنے کا مشتاق ہے تو اپنے آپ کو تنکے

حوالے کردے، یعنی فنا ہو جا اور اپنے آپ کو مٹا دے۔ دیکھ، گھاس پھونس اور کوڑے کرکٹ کی کیا حیثیت ہے؟ لیکن جب یہی بے حقیقت چیزیں بھٹی میں پہنچتی ہیں تو شعلے کو بلند کرنے اور آگ بھڑکانے کا موجب ہوتی ہیں۔ گویا ان کے نصیبے کا چمکنا بھٹی میں پہنچ جانے پر موقوف ہے۔ تیرا نصیبا بھی اسی صورت میں چمکے گا اور تو بھی اپنی حقیقت پر اسی حالت میں پہنچے گا، جب اپنی ہستی فنا کر کے اصل و مبدا میں گم ہو جائے گا۔

بجنوری مرحوم لکھتے ہیں:

"مرزا غالب ان تابوت بر دوش فلسفیوں میں نہیں، جو زندگی کو ماتم خانہ اور اہل دنیا کو اہل جنازہ خیال کرتے ہیں۔ وحدت الوجود کے فلسفے کا پہلا سبق یہی ہے کہ خدا اور ماسوا صرف عارضی طور پر جدا ہیں اور بعد الموت یہ جدائی ختم ہو جاتی ہے۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

انسان خود کو اپنی غلط بینی کے باعث افراد سے علیحدہ اور ماحول سے جداگانہ خیال کرنے لگتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ میں دنیا میں اجنبی ہوں اور مخالف اشخاص و قوانین میں گھرا ہوا ہوں، لیکن انسان اور عالم میں حقیقۃً کوئی رخنہ حائل نہیں، یہاں تک کہ موت بھی اس میں کوئی رخنہ پیدا نہیں کرتی۔ اُپنشدوں میں لکھا ہے: "موت اور بقا اس کا سایہ ہیں۔ موت اور حیات میں کوئی فرق نہیں، نہ تضاد ہے، بلکہ حیات میں موت ہے۔ حیات کی آمد زندگی اور رفت موت ہے۔ موت حیات عارضی کو دائمی کر دیتی ہے۔

۲۔ **شرح**: "کس" استفہام کے لیے نہیں، تعجب کے لیے ہے، اسد کس درجہ حیرت انگیز بسمل ہے کہ خود خاک و خون میں لوٹ رہا ہے، لیکن قاتل (محبوب) سے کہتا ہے کہ تُو ناز کی مشق کیے جا، انداز و ادا دکھائے جا۔ اگر لوگوں کا خون ہوتا ہے تو تجھ سے کوئی باز پُرس نہ کی جائے گی، تیرے خلاف کوئی

دعویٰ نہ ہوگا۔ دونوں جہانوں کے خون کی ذمہ داری میں اپنے اوپر لینے کے لیے تیار بیٹھا ہوں۔

○

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں
تکلف برطرف مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

۱۔ لغات۔

ستمکش: ظلم وستم اٹھانے والا

خوباں: حسین۔

تکلف برطرف: تکلف اٹھا رکھیے۔ یہ ایسے موقع پر استعمال کرتے ہیں، جب کوئی بات صاف صاف اور لگی لپٹی رکھے بغیر کہنی مقصود ہو۔

شرح: میں تیرے ظلم وستم سہتا ہوں اور اس میں میرے سامنے ایک مصلحت ہے۔ وہ یہ کہ اے محبوب! حسین لوگ تجھ پر عاشق ہیں۔ سچی اور صاف بات یہ ہے کہ کبھی نہ کسی وقت ان میں سے کوئی ایک تیرے ظلم وستم سہ کر میرا ہمنوا اور ہمدرد بن جائے گا اور یہ میں سمجھ کر دل کو اطمینان دیتا رہوں گا کہ حسن حسن کو بھی جور و بیداد کا تختۂ مشق بنانے میں تامل نہیں کرتا۔ پھر عشق کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

یہ کہنا کہ ان حسین عاشقوں میں سے غالب کسی ایک سے دل لگا کر تسکین حاصل کرے گا، غالب کی شعر گوئی کی سراسر تضحیک ہے۔

○

تمہید: یہ غزل نہیں، بلکہ مرثیہ یا نوحہ ہے، جو زین العابدین خاں عارف کی جوانمرگی پر کہا گیا۔ عارف مرزا صاحب کی بیوی کے بھانجے، آبادی بیگم اور شرف الدولہ نواب غلام حسین خاں بہادر سہراب جنگ

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائیگا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ "جاؤں"
مانا، کہ ہمیشہ نہیں، اچھا، کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو "قیامت کو ملیں گے"
کیا خوب! قیامت کا ہے، گویا، کوئی دن اور

ہاں، اے فلکِ پیر! جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چار دہم تھے، مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا، کوئی دن اور

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمھیں نفرت سہی، نیّر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہ ہر حال یہ مدت، خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ! گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ "کیوں جیتے ہیں غالب"
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

متخلص بہ مسرور (ابن فیض اللہ خاں) کے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ چونکہ آبادی بیگم اور مسرور کے تعلقات بگڑ گئے تھے، اس لیے بیگم اپنے دونوں بیٹوں عارف اور حیدر حسن کو لے کر الگ ہو گئیں۔ عارف خوش ذوق شاعر تھے۔ مرزا غالب نے انھیں بیٹا بنا لیا تھا۔ شروع میں وہ شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے۔ پھر غالب کی شاگردی اختیار کر لی۔ غالب نے فارسی میں عارف کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

صباحش چوں دلِ عارف منزّہ
نسیمش چوں دمِ غالب معنبر

ایک مستقل قطعہ عارف کی مدح میں لکھا ہے:

آں پسندیدہ خوے عارف نام
کہ رخش شمع دودمانِ منست
از نشاطِ نگارشِ نامش
خامہ رقاص در بنانِ منست
آنکہ در بزمِ قرب و خلوتِ انس
غمگسار و مزاج دانِ منست

ہم ز کلکِ تو خوش دلم خوشدل   کاں مثالِ شرفِ شانِ منست
بہ یقیں داں کہ غیرِ من نبود   گر نظیرِ تو در گمانِ منست

اے کہ میراث خوارِ من باشی
اندر اردو کہ آں زبان منست

عارف نے صرف پینتیس چھتیس برس کی عمر میں وفات پائی ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۲ء عارف کے بیٹوں باقر علی خاں کامل اور حسین علی خاں شاداں کو مرزا غالب نے اپنے بیٹے بنا لیا تھا۔ ان کا ذکر غالب کے خطوں میں جا بجا آیا ہے۔

مرثیہ یا نوحہ ایسا ہے کہ اس کی مثال اردو زبان میں ملنا مشکل ہے۔

۱۔ **شرح** : اے عارف! تمہارے لیے لازم تھا کہ کچھ دن اور میرا رستہ دیکھتے یعنی میری موت کا انتظار کرتے تاکہ میں بھی تمہارے ساتھ دوسری دنیا کو روانہ ہوتا۔ لیکن تم نے جلدی کی اور تنہا روانہ ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ کچھ دن اور تنہا رہو، یہاں تک کہ میں مروں اور تمہارے پاس پہنچوں۔

۲۔ **لغات**۔ ناصیہ فرسا : ماتھا رگڑنے والا۔

شرح : میں تیرے دروازے پر یعنی تیری قبر پر کچھ دن اور ماتھا رگڑوں گا اگر اس طرح تیرا پتھر نہیں گھسے گا تو میرا سر یقیناً ختم ہو جائیگا، یعنی دو چیزیں باہم رگڑ کھاتی رہیں تو ایک نہ ایک ضرور ختم ہو جائے گی۔

مرزا کا مقصود یہ ہے کہ میرے لیے اب تیری قبر سے سر ٹکرانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ اس میں یا تیری قبر ختم ہو گی اور وہ مادی حجاب دُور ہو جائے گا جو تم میں اور مجھ میں حائل ہے۔ یا میرا سر مٹ جائے گا اور میں مر کر تیرے پاس پہنچ جاؤں گا۔

۳۔ **شرح** : ابھی کل تو تم اس دنیا میں آئے تھے یعنی کوئی زیادہ عمر تو نہیں ہوئی تھی اور اب جانے کی تیاری کر لی اور کہتے ہو کہ آج ہی چلا جاؤں گا۔ اچھا بھئی! جانا ہی منظور ہے اور ہمیشہ نہیں رہ سکتے تو کچھ دن تو اور ٹھہرو۔

اس شعر میں مکالمے کا طریقہ اختیار کر لیا اور باتیں ایسی کیں، جو مہمانوں اور میزبانوں میں معمول ہیں۔ اس سے شعر کی تاثیر بہت بڑھ گئی، کیونکہ بالکل فطری اور طبعی حالت پیدا ہو جانے سے ایسی صورت نمایاں ہو گئی، گویا عارف سامنے بیٹھے ہیں وہ رخصت کا تقاضا کر رہے ہیں اور مرزا انھیں ٹھہرانے کی تدبیروں میں سرگرم ہیں۔

۴۔ **شرح** : جاتے ہوئے ہمیں سناتے ہو کہ اب قیامت کو ملاقات ہو گی واہ! گویا قیامت کا دن کوئی اور ہوگا، ہمارے لیے تو تمھارا جانا ہی قیامت ہے۔

۵۔ **شرح** : اب آسمان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے بوڑھے! عارف تو ابھی جوان تھا۔ اگر یہ کچھ دن اور زندہ رہتا تو تیرا کیا بگڑ جاتا؟ تجھے کون سا نقصان پہنچ جاتا؟

۶۔ **لغات** : ماہِ شب چاردہم : چودھویں رات کا چاند، یعنی پورا چاند۔

شرح : اے عارف! تم میرے گھر کے لیے چودھویں رات کا چاند تھے اور تمھاری ہی وجہ سے اس گھر کا ذرّہ ذرّہ جگمگا رہا تھا، لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ تمھارے جاتے ہی میرے گھر میں اندھیرا کیوں چھا گیا اور روشنی کی کوئی بھی جھلک کیوں باقی نہ رہی؟ چودھویں کا چاند ہر شب تھوڑا تھوڑا گھٹتا ہے اور مہینے کے آخر تک اس کی کچھ نہ کچھ روشنی قائم رہتی ہے۔ تمھاری روشنی تو رفتہ رفتہ کم نہ ہوئی یک لخت تاریکی چھا گئی۔

عارف کو چودھویں کے چاند سے اس لیے تشبیہ دی کہ بزرگوں میں بچوں اور عزیزوں کے لیے یہی تشبیہ معمول ہے۔ پھر اس سے مضمون پیدا کیا کہ روشنی رفتہ رفتہ کم ہونی چاہیے تھی، یک لخت اندھیرا کیوں چھا گیا۔

۷۔ **لغات** ۔ داد و ستد : لین دین۔

ملک الموت : موت کا فرشتہ

شرح : تم لین دین کے ایسے کھرے کیوں بن گئے کہ اُدھر موت کے فرشتے نے آ کر کہا کہ تمھاری زندگی کے دن پورے ہو گئے اور تم نے جانے کی تیاری کر لی۔

کاش ایسا ہوتا کہ تم زندگی کا خاتمہ فوراً قبول نہ کر لیتے، جو لین دین میں کھرے لوگوں کا شیوہ ہے، بلکہ فرشتے کو کچھ دن اور مستعار زندگی حوالے کر دینے کے لیے تقاضا کرنے دیتے۔

مرزا نے یہاں زندگی کو عام لین دین کے طریقے پر ڈھال لیا، جیسے کسی کے ذمّے قرض ہو اور قرض خواہ تقاضا کرے تو مقروض عذر معذرت کر کے کچھ وقت گزار لے۔

۸۔ **لغات**۔ نیّر: ضیاءالدین احمد خاں نیّر، جو امین الدین احمد خاں والی لوہارو کے چھوٹے بھائی، بیگم غالب کے برادر عم زاد اور فارسی میں مرزا کے خلیفہ تھے۔

شرح: پہلے مصرع کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ عارف کو غالب سے نفرت تھی یا نیّر سے ان کی لڑائی ہو گئی تھی۔ یہ محض دوسرے مصرع کے لیے ایک مناسب حال گنجائش پیدا کی گئی ہے۔ یعنی اگر بہ فرض محال مان بھی لیا جائے کہ مجھ سے تمھیں نفرت تھی، اس لیے منہ موڑ کر چل دیے یا نیّر سے تمھاری لڑائی ہو گئی تھی، لہٰذا اس سے دُور چلے جانے کی تدبیر کر لی۔ ان انہونی باتوں کو بھی تسلیم کر لیا جائے تو کم سے کم تمھارے چھوٹے چھوٹے معصوم بچّوں کا تو کوئی گناہ نہ تھا۔ نہ ان سے نفرت ہو سکتی تھی، نہ لڑائی کا کوئی امکان تھا۔ پھر ان کا تماشا کوئی دن اور کیوں نہ دیکھا۔

۹۔ **شرح**: تم نے اس دنیا میں بُرے بھلے پینتیس سال تو گزار لیے۔ ان میں خوشی کے موقعے بھی آئے اور غم کے بھی۔ اسے جوانی میں موت کا داغ دے جانے والے اسی طرح کچھ دن اور گزارا کر لینا تھا۔

۱۰۔ **شرح**: جو لوگ کہتے ہیں کہ اے غالب! اب تک کیوں جی رہے ہو؟ اتنا بڑا صدمہ پیش آیا، اسے برداشت کر لیا اور مر نہ گئے؟ یہ نادانی اور ناسمجھی کی بات ہے۔ میری قسمت ہی میں یہ لکھا ہے کہ کچھ دن اور مرنے کی تمنّا کروں۔

صدمہ بیشک برداشت کر لیا، لیکن زندگی میں کوئی لطف باقی نہ رہا۔ جتنی بھی رہ گئی، صرف اس لیے رہ گئی کہ موت کی تمنا کرتے رہیں۔

○

فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبح و مہر
ہے داغِ عشق، زینتِ جیبِ کفن ہنوز
ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر
ہوں گُل فروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز
مے خانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں
خمیازہ کھینچے ہے بُتِ بیدادفن ہنوز

۱۔ لغات۔ جیب: گریبان

شرح: میں مرجانے کے بعد بھی عشق کے معاملات سے فراغت نہ پا سکا۔ جو مشغولیتیں زندگی میں جاری تھیں، وہ مرجانے کے بعد بھی جاری رہیں۔ آپ نے صبح کو سورج نکلتے تو دیکھا ہو گا۔ جس طرح سورج کو صبح سے خاص مناسبت ہے، اور ایک دوسرے کے بغیر دونوں کا تصور ہو نہیں ہو سکتا۔ نیز جس طرح سورج سے صبح کے لیے زیب و زینت حاصل ہے، اسی طرح اب تک میرے کفن کے گریبان کی زینت عشق کا داغ ہے۔

مطلب یہ کہ زندگی ختم ہو جانے کے بعد بھی داغِ عشق بدستور روشن و سینہ تاب ہے۔

ظاہر ہے کہ صبح کو بہ لحاظ سفیدی کفن سے اور سورج کو بہ اعتبارِ حرارت و روشنی داغِ عشق سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ پہلو بہ طور خاص پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ صبح کے ساتھ سورج کو جو کبھی منقطع نہ ہونے والا رابطہ ہے، وہی کفن کے ساتھ داغِ عشق کو ہے۔

۲۔ لغات: زرِ از دست رفتہ: ہاتھ سے گیا ہوا مال، کھوئی ہوئی دولت۔

گُل فروش : پھول بیچنے والا۔
داغِ کہن : عشق کا پرانا داغ۔
شرح : قاعدہ ہے کہ جو دولت مند لوگ غریب ہو جائیں اور ان کا مال ہاتھ سے نکل جائے تو وہ ہمیشہ اس کھوئی ہوئی دولت پر فخر و ناز کیا کرتے ہیں کہ ہم کسی زمانے میں ایسے تھے، ایسے تھے اور ایسے تھے، وہی کیفیت میری ہے۔ میں بھی اب تک عشق و محبت کے پرانے داغوں کی آب و تاب اور چمک دمک کے پھول بیچ رہا ہوں یعنی میرا ناز و فخر بھی محبت کے پرانے داغوں پر ہے۔

دیکھیے شاعر کا کمال کہ ہاتھ سے گئے ہوئے مال کی تشبیہ پیشِ نظر رکھتے ہوئے داغِ کہن کی گلفروشی نہ کہا، بلکہ شوخی داغ کہن کی گلفروشی کہا، یعنی محبت کے داغ پھولوں کی صورت میں نہیں بیچتا بلکہ ان کی شوخی بیچ رہا ہے کیونکہ داغ تو زر از دست رفتہ ہو گئے۔

۳۔ **لغات** ۔خمیازہ کھینچنا : انگڑائیاں لینا۔
بُتِ بیداد فن : وہ محبوب، جس کا عام طریقہ اور شیوہ ظلم و جور ہو، یعنی جس نے ظلم و جور کے فن میں کمال حاصل کر لیا ہو۔
خاک بھی نہیں : اس کے ایک معنی عام ہیں، دوسرے معنی محاورے کے ہیں، دونوں یہاں ٹھیک چسپاں ہوتے ہیں۔
شرح : میرے جگر کے شراب خانے میں خون کی شراب تو رہی ایک طرف، مٹی بھی موجود نہیں یا یہ سمجھ لیجیے کہ کچھ بھی نہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ میرا ظالم و ستمگر محبوب انگڑائیاں لے رہا ہے اور اس پر خمار طاری ہے۔ کیونکہ میرے جگر کے میخانے سے خون کی شراب پینے کا وہ عادی تھا۔ اب وہاں کچھ نہیں رہا تو اس پر نشے کے اتار کی حالت طاری ہو گئی۔

صاف مطلب یہ ہے کہ میرا محبوب جس ظلم و ستم کا عادی ہے، اس کا پورا ہونا تو اب مشکل ہے۔ کیونکہ مجھ میں اب اتنی ہی طاقت ہی نہیں رہی کہ ظلم و ستم کا ساتھ دیتا

تاب و توان ختم ہو گئی، لیکن اس کی بیداد گری کے جوش میں اب تک کوئی فرق نہیں آیا۔

○

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یارب! کہ عمرِ خضر دراز!
نہ ہو بہ ہرزہ، بیاباں نوردِ وہمِ وجود
ہنوز تیرے تصوّر میں ہے نشیب و فراز
وصال، جلوہ تماشا ہے، پر دماغ کہاں
کہ دیجیے آئینہ انتظار کو پرواز
ہر ایک ذرّۂ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز
نہ پوچھ وسعتِ مے خانۂ جنوں، غالبؔ
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

۱۔ لغات ۔ حریف : حل کرنے والا، مدد دینے والا، معاون، رفیق۔
مطلبِ مشکل : کوئی مشکل کام جو آ پڑے۔
فسونِ نیاز : عجز و نیاز کا منتر۔
عمرِ خضرؑ دراز : خضرؑ کی عمر لمبی ہو۔ یہ محاورہ ایسے موقع پر بولتے ہیں، جب کوئی چیز پہلے ہی سے موجود ہو۔
شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :
"چونکہ خیال وسیع تھا اور مضمون مطلع میں بندھنے کا مقتضی تھا، اس لیے پہلا مصرع اردو روزمرہ سے کسی قدر بعید ہو گیا ہے، مگر بالکل ایک نئی شوخی ہے، جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہو گی۔ کہتا ہے کہ کسی مشکل مقصد کے حاصل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا، لہذا اب یہی دعا مانگیں گے کہ الٰہی! خضرؑ کی عمر دراز ہو،

یعنی ایسی چیز طلب کریں گے۔ جو پہلے ہی دی جا چکی ہو"
شعر سے ظاہر ہے کہ شاعر کے نزدیک عجز و نیاز کے سوا مقصد حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں، لہٰذا وہ کہتا ہے کہ عجز و نیاز کا جادو تو کسی مشکل کام کے پورے ہونے میں معاون نہیں بن سکتا۔ اس سے تو کوئی الجھا ہوا کام سلجھ نہیں سکتا اور کوئی پیچیدہ عقدہ حل نہیں ہو سکتا اور ہمارے پاس عجز و نیاز کے سوا کوئی تدبیر بھی نہیں لہٰذا بارگاہ باری تعالیٰ میں التجا کرتے ہیں (اور التجا بذاتِ خود عجز و نیاز کی ایک شکل ہے) کہ خضرؑ کی عمر لمبی ہو اور یہ التجا پہلے ہی سے پوری ہو چکی ہے۔

۲۔ **لغات**۔ بہ ہرزہ : بیہودہ طریق پر، فضول۔
بیاباں نوردی : صحرا و بیاباں میں پھرنے والا۔

شرح : تجھے وجود کے سلسلے میں وہم و گمان کی خاک نہ چھاننی چاہیے جس سے کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔ اگر تُو ایسا کرنا چاہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تیرے تصور میں ابھی تک اونچ نیچ باقی ہے۔

وجود کے سلسلے میں اوہام کا شکار ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ خود وجود کے مراتب مسلّم مانے جائیں، یعنی اس کا سب سے اونچا مرتبہ وجوب کا ہے اور سب سے نچلا امکان کا۔ یہی اونچ نیچ ہے اور ظاہر ہے کہ جس راستے میں اونچ نیچ ہو، وہ مسافر کے لیے پریشانی اور مصیبت کا باعث ہوتا ہے۔

رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

دوسری صورت یہ ہے کہ خود وجودِ حقیقی کے سوا کسی دوسرے وجود کو تسلیم کیا جائے۔ وحدت الوجود کا عقیدہ رکھنے والوں کے نزدیک یہ بھی وہم و گمان ہی کے بیابان کی خاک چھاننا ہے۔ اسے بھی اونچ نیچ کے تصور کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ انسان کی طبیعت افراط و تفریط سے پاک ہو کر اعتدال و توازن پر آ جائے تو اس قسم کے اوہام کا مُلا ختم ہو جائیں گے۔ صرف ایک ہی وجود باقی رہ جائے گا، جو وجودِ حقیقی ہے باقی سب مٹ جائیں گے، جن کی اپنی کوئی حیثیت نہیں اور صرف وہم کی تخلیق ہیں۔

اسی طرح نشیب و فراز ختم ہو گا اور یہی نظری اعتدال و توازن کی روشن دلیل ہے۔

۳۔ **لغات**۔ جلوہ تماشا : حسن کا تماشا دکھانے والا۔ وہ حسن جو دیکھے جانے کے قابل ہے۔

پرداز : جلا، صیقل، آرائش۔

شرح : یقیناً محبوب کا وصال حسن کے جلوے دکھانے والا ہے، یعنی وصال میں ہمیں حسن سے بہرہ ور ہونے کا پورا موقع ملے گا۔ یہ درست سہی، لیکن ہماری طبیعت کب برداشت کر سکتی ہے کہ انتظار کے آئینے کو صیقل کرتے اور جلا دیتے رہیں۔

مطلب یہ کہ وصال کتنی ہی محبوبیتوں کا مرکز ہو، مگر ہم میں اتنی ہمت نہیں کہ مدت درجہ لمبی مدت تک انتظار کرتے رہیں۔

۴۔ **لغات**۔ آفتاب پرست : سورج کو پوجنے والا۔

شرح : عاشق کی خاک کا ذرہ ذرہ بدستور سورج کو پوج رہا ہے۔ دیکھیے خاک ہونے اور مر جانے پر بھی جلوۂ ناز کا شوق زائل نہ ہوا۔

ذرّے کے آفتاب پرست ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر ذرہ وجودِ حقیقی پر مفتون ہے۔ اسی سے چمک دمک حاصل کرتا ہے اور اسی میں مل جانے کا آرزومند ہے۔

۵۔ **لغات**۔ کاسۂ گردوں : آسمان کا کاسہ۔

خاک انداز : وہ ظرف جس میں فرش کی صفائی کے بعد کوڑا کرکٹ ڈال کر باہر پھینکتے ہیں۔

شرح : اے غالب! جنون کے شراب خانے کی وسعت و کشادگی کا حال کچھ نہ پوچھ۔ بس اتنا سمجھ لے کہ یہ آسمان، جو ایک ساغر نا ظرف ہے، اس میخانے میں صرف اتنی حیثیت رکھتا ہے کہ اس، کوڑا کرکٹ ڈال کر باہر پھینک دیتے ہیں۔

مولانا طباطبائی درست فرماتے ہیں کہ آسمان کو مٹی یا کوڑا کرکٹ ڈال کر باہر پھینکنے کا آلہ بتانے سے مقصود یہ ہے کہ وہ نہایت حقیر چیز ہے۔

"کاسۂ گردوں اس اعتبار سے کہ کرۂ خاک کو محیط ہے، خاک انداز کی

طرح خاک سے بھرا ہوا ہے۔ غرض میخانۂ جنوں میں کاسۂ گردوں کی
اتنی بھی وقعت نہیں کہ کاسہ ہائے شراب میں اس کا شمار ہو، بلکہ خاک
انداز ہے۔ "ایک" کا لفظ اردو میں تنکیر کے لیے ہوتا ہے، یہاں تنکیر
سے تحقیر مقصود ہے کہ تنکیر کے ایک معنی یہ بھی ہیں۔"
اب غور فرمایئے، جس میخانۂ جنوں میں آسمان کو "خاک انداز" کی حیثیت حاصل
ہے، اس کی وسعت کا اندازہ کون کرسکتا ہے اور آسمان کو اس اعتبار سے بھی خاک انداز
کہنا بہت موزوں ہے کہ زمین جو سراپا خاک ہے بظاہر اسی ظرف میں پڑی ہوئی معلوم
ہوتی ہے۔

○

وسعتِ سعیِ کرم دیکھ، کہ سرتاسرِ خاک
گزرے ہے آبلہ پا، ابرِ گہربار ہنوز
یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیِ رفتار ہنوز

۱۔ لغات۔ وسعتِ سعیِ کرم: سخاوت و بخشش کی کوشش کا پھیلاؤ۔
سرتاسرِ خاک: زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک۔
آبلہ پا: جس کے پاؤں میں چھالے ہوں۔ یہ عموماً زیادہ چلنے سے پیدا ہوتے۔
ابرِ گہربار: موتی برسانے والا بادل۔
شرح: قدرت کے لطف و نوازش کی وسعت دیکھ کہ روئے زمین کے ایک
سرے سے دوسرے سرے تک بادل اب تک موتی برسا رہا ہے۔ اگرچہ مسلسل چلتے
چلتے اس کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔
مطلب یہ کہ خدائے کریم کی بخشش و نوازش کی کوئی حد نہیں۔ رب اپنی رحمت
سے بادل اٹھاتا ہے اور زمین کو بارش سے یکسر سبزہ زار بنا دیتا ہے۔
پانی کے قطروں کو پہلے موتیوں سے تشبیہ دی یعنی جو قطرے برستے ہیں، ان کو

موتیوں کی ہے، کیونکہ جہاں جہاں برستے جاتے ہیں، زمین کا دامن دولت کے موتیوں سے بھرتے جاتے ہیں۔ پھر سعی و کوشش اور تگ و دو کے پیش نظر انھیں قطروں کو پاؤں کے چھالوں سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی اگرچہ زمین تر کرنے کی کوشش میں بادل کو تگ و دو کرنی پڑتی ہے، جس سے اس کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں تاہم باری تعالیٰ کی رحمت کا فیض بدستور بہر حال ہر خطے کے لیے جاری ہے۔

۲۔ **شرح** : دشت و بیاباں کا پورا صفحہ یکسر اس کاغذ کی شکل اختیار کیے ہوئے ہے، جسے آگ لگ گئی ہو۔ کاغذ آتش زدہ کی کیفیت تفصیل کے ساتھ پہلے پیش کی جا چکی ہے اور آگ لگنے سے جو منظر پیدا ہوتا ہے، وہ بھی بیان کیا جا چکا ہے۔ اسے پیش نظر رکھیے اور غور فرمائیے کہ پاؤں کے نقش میں اب تک تیز رفتاری کی حرارت باقی ہے۔

مطلب کہ انتہائی تیز رفتاری سے میں بیابان میں پھر نکلا۔ تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ جہاں جہاں پاؤں کے نقش پڑے، ان میں اب تک اتنی حرارت باقی ہے کہ ان سے چنگاریاں ابھر رہی ہیں۔ گویا پورا بیابان آتش زدہ کاغذ کی طرح شعلہ زار بن گیا ہے۔

قلم، کاغذ اور صفحہ کی مناسبت محتاج تشریح نہیں۔ اسی طرح گرمی رفتار میں حرارت نقش پا کے اندر محفوظ ہونے کے باعث پورے دشت کو کاغذ آتش زدہ سے تشبیہ دینا انتہائی کمال ہے اور ایسی تشبیہات بڑے بڑے شعرا کے دیوانوں میں بھی نہیں ملتیں۔

○

کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز؟

دل سے نکلا، پہ نہ نکلا دل سے ہے ترے تیر کا پیکان، عزیز

تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ! واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

۱۔ **شرح** : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"اس کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ اگر اس سے جان عزیز رکھوں گا تو

وہ ایمان لے لے گا، اس لیے جان کو عزیز نہیں رکھتا اور دوسرے
لطیف معنی یہ ہیں کہ اس بت پر جان قربان کرنا تو عین ایمان ہے، پھر
اس سے جان کیونکر عزیز رکھی جا سکتی ہے؟

گویا یہ شعر غالب کے ان اشعار میں سے ہے، جنھیں خواجہ حالی پہلودار کہتے ہیں کہ بادی النظر میں کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں، مگر غور کرنے کے بعد ایک دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں، جن سے وہ لوگ لطف نہیں اٹھا سکتے جو ظاہری معنی پر قناعت کر لیتے ہیں۔

۲۔ شرح: یہ ٹھیک ہے کہ تیرے تیر کا پیکان دل سے نکل گیا، مگر اس کی لذت اب تک دل میں بدستور باقی ہے، اسی لیے دل اس کی یاد سے معمور ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے، تیرا پیکان اس قدر عزیز ہے کہ دل سے نکل جانے کے باوجود وہ نہیں نکلا۔

۳۔ شرح: اے غالب! جو حادثہ پیش آگیا ہے، وہ بہت سخت ہے۔ اتنا سخت ہے کہ جی چاہتا ہے، مر جائیں، مگر جان بھی عزیز ہے، اس لیے صبر کرنا ہی پڑے گا اور حادثے کو برداشت کیے بغیر چارہ نہیں۔

○

نے گُلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز	میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تُو اور آرائشِ خمِ کاکُل	میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز
لافِ تمکیں، فریبِ سادہ دلی	ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز
ہوں گرفتارِ الفتِ صیّاد	ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز
وہ بھی دن ہو کہ اُس ستم گر سے	ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز
نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں	جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گُل باز

اے ترا غمزہ، یک قلم انگیز! اے ترا ظلم، سر بسر انداز

تو ہُوا جلوہ گر، مبارک ہو! ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہُوا میں غریب اور تو غریب نواز

اسد اللہ خاں تمام ہُوا اے دریغا! وہ رندِ شاہد باز

۱۔ شرح : میں نہ تو نغمے کا پھول ہوں، نہ ساز کا پردہ، صرف اپنی شکست کی آواز ہوں۔

نغمے کے پھول وہاں برستے ہیں، جہاں عیش و راحت کی مجلسیں گرم ہوں، کیونکہ وہیں نغمے گائے جاتے ہیں، وہیں ساز کے پردوں سے دلاویز ترانے نکلتے ہیں۔ میں سراپا درد ہوں، مصیبت کا مارا ہُوا ہُوں اور اپنی بربادی و ویرانی کا نوحہ زبانِ حال سے سناتا ہوں، جس طرح کسی شے کے ٹوٹتے وقت اس میں سے آواز نکلتی ہے۔

۲۔ شرح : اے محبوب! تُو اپنی زلفوں کے پیچ و خم سنوارنے میں مصروف ہے، تجھے عاشق کی پریشانیوں اور مصیبتوں کا خیال کب آسکتا ہے؟ میں ایسے تفکرات میں الجھا ہُوا ہوں، جن کا سلسلہ بہت دُور تک پھیلا ہوا ہے۔

وہ تفکرات کیا ہیں؟ شاعر نے واضح نہ کیے۔ غالباً اس لیے کہ ہر شخص اپنے احوال کے مطابق ان کی تعبیر کرے۔ مثلاً مولانا حسرت موہانی کی رائے میں ایک اندیشہ یہ ہوسکتا ہے، محبوب نے زلفوں کے پیچ و خم کی آرائش اس لیے ضروری سمجھی کہ عاشق کو اس آرائش کے ذریعے سے وفا کے رشتے میں جکڑا رکھے۔ گویا اسے بدگمانی پیدا ہوگئی کہ شاید عاشق کو مجھ سے پہلے کی سی محبت نہیں رہی۔ عاشق اس بدگمانی کو اپنے عشق کے لیے باعثِ ننگ سمجھتا ہے۔ طباطبائی کے نزدیک اس آرائش سے محبوب کا مطلب یہ ہے کہ دیکھیے، اب کون کون عاشق ہے۔ عاشق کے لیے ایک اندیشہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس طرح دوسروں کو بناؤ سنگار دکھانا مقصود

ہے۔ غرض ان دور و دراز اندیشوں کی کوئی حد و نہایت نہیں اور یہی شاعر کا کمال
ہے کہ بتایا کچھ نہیں، مگر وہ سب کچھ بتا گیا، جو خیال میں آسکتا ہے۔

۳۔ لغات۔ تمکیں : وقار۔ شانِ ضبط۔
سینہ گداز : سینے کو گھلا دینے والا۔

شرح : عشق میں صبر و ضبط کی ڈینگیں مارنا سادہ لوحی کا ایک فریب ہے۔
یعنی انسان سادہ دلی سے اس قسم کے دھوکوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، لیکن عاشق کے
سینے میں ایسے راز، ایسے بھید ہوتے ہیں، جو سینہ گھلا کر رکھ دیتے ہیں۔ کون ہے
جو ان حالات میں صبر و ضبط کا دعویٰ کر سکے اور سادہ لوحی سے اس فریب میں مبتلا
ہو جائے؟

۴۔ شرح : مجھے صیاد کی الفت نے گرفتار کر رکھا ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے
کہ میرے بازوؤں میں اُڑنے کی طاقت موجود نہیں۔ میں اُڑ سکتا ہوں، لیکن صیاد
کی الفت نے مجھے قید کر رکھا ہے۔

شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ دنیوی تعلقات میں اُلجھے رہنا صرف دنیا سے
محبت کا نتیجہ ہے، ورنہ انسان چاہے تو یہ تمام بندھن توڑ کر آزاد ہو سکتا ہے۔ یہ
نہ سمجھنا چاہیے کہ اس میں ان بندھنوں کے توڑنے کی قوت موجود نہیں۔

۵۔ شرح : الٰہی! کاش وہ دن بھی آجائے کہ میں اپنے ستمگر محبوب کے
ناز و انداز سے بہرہ حاصل کر لوں، ابھی تک صرف ناز و انداز کی حسرت کا تختۂ مشق
بنا ہوا ہوں۔

۶۔ لغات۔ گلباز : پھولوں سے کھیلنے والا۔

شرح : میرے دل میں خون کا ایک بھی قطرہ ایسا نہیں، جس سے میری
پلکوں نے پھولوں کی ہولی نہ کھیلی ہو۔ یعنی دل میں جو بھی قطرۂ خون تھا، وہ آنکھوں
میں پہنچا اور پلکوں نے پھول سمجھ کر اس سے کھیلنا شروع کر دیا۔
اشکِ خونیں کو گلبازی سے تشبیہ دی گئی ہے۔

۷۔ **لغات۔** **انگیز** : اٹھانے والا۔ جذبات برانگیختہ کرنے والا۔

شرح : اے محبوب! تیرا ہر جلوہ سراسر جذبات برانگیختہ کرنے والا ہے اور تیرا ہر ظلم عین نازو انداز ہے۔

۸۔ **لغات۔** **ریزش** : گرنا۔

شرح : تُو نے اپنا جلوہ دکھایا۔ اس پر نیازمندی کی پیشانی کا سجدے میں گر جانا مبارک ہو۔

۹۔ **شرح** : اے محبوب! اگر تُو نے میرا حال پوچھ لیا تو کچھ بُرا نہ ہُوا۔ میں غریب ہوں اور تُو غریبوں پر لطف و نوازش کرنے والا ہے۔

۱۰۔ **شرح** : اسداللہ خاں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کی زندگی خاتمے پر پہنچ گئی۔ آہ! افسوس! وہ رند، جو حسینوں سے محبت رکھتا تھا جس کا شیوہ حسن پرستی تھا۔ ایسا کون ہے، جو اس کی جگہ لے سکے؟

اسد کی جگہ پورا نام استعمال کیا۔ شاید کہا جائے، بے تکلف شعر میں آ سکتا تھا۔ حقیقت یہ نہیں۔ مرزا غالب کے شعروں کو اس طرح نہ دیکھنا چاہیے۔ یہاں اسداللہ خاں میں جو ضخامت، بزرگی اور بلندی مرتبہ نمایاں ہے وہ تنہا اسد میں موجود نہیں اور یہاں رخصت ہوتے یا تمام ہونے والے وجود کی ضخامت نمایاں کرنا مضمون شعر کا خاص پہلو ہے۔ بالکل اسی طرح دوسری جگہ کہا گیا:

مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمھیں
وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی

○

مژدہ، اے ذوقِ اسیری! کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

۱۔ **شرح** : اس شعر کے دوسرے مصرع میں شکاریوں کی ایک رسم کا ذکر ہے، جو

جگرِ تشنۂ آزار، تسلی نہ ہوا

جوئے خوں ہم نے بہائی بُنِ ہر خار کے پاس

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں، ہے ہے

خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

میں بھی رک رک کے نہ مرتا، جو زباں کے بدلے

دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

دہنِ شیر میں جا بیٹھیے، لیکن اے دل!

نہ کھڑے ہو جیے خوبانِ دل آزار کے پاس

دیکھ کر تجھ کو، چمن بسکہ نمو کرتا ہے

خود بخود پہنچے ہے گل، گوشۂ دستار کے پاس

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی، ہے ہے!

بیٹھنا اُس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

تھوڑی سی تفصیل کا محتاج ہے۔ عام طریقہ یہ ہے کہ شکار کے لیے جاتے وقت جس جانور کا شکار منظور ہو، اس کے ایک یا ایک سے زیادہ ہم جنسوں کو پنجروں میں ڈال کر ساتھ لے جاتے ہیں جال بچھا کر قریب ہی جانوروں کے پنجرے رکھ دیتے ہیں۔ وہ بولنا شروع کرتے ہیں تو فضا یا جنگل سے دوسرے پرندے آواز سن کر آجاتے ہیں اور اس طرح جال میں پھنس جاتے ہیں۔ دوسرے جانوروں کے شکار کے علاوہ بٹیروں کے شکار کے لیے اب تک یہی طریقہ رائج ہے پالتو بٹیروں کو سدھا لیا جاتا ہے۔ جب ان کے پنجرے ایک نصب کردہ بانس میں لٹکا دیے جاتے ہیں تو وہ بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ جہاں جہاں تک ان کی آواز جاتی ہے، بٹیریں اڑ اڑ کر آتی ہیں اور جال میں پھنستی جاتی ہیں۔

شرح: اے اسیری کے ذوق! تجھے خوشخبری ہو، کیونکہ تیرے سامنے یہ منظر رونما ہے۔ جال بچھا ہوا ہے، مگر خالی ہے، اس میں کوئی پرندہ ابھی تک نہیں

پھنسا۔ پاس ہی پہلے سے پکڑے ہوئے پرندے کا پنجرہ پڑا ہے۔ وہ سب کو قید و بند کی دعوت دے رہا ہے۔ گویا تیرے لیے تسکین کا پورا سامان موجود ہے تو بھی تمنا پوری کر لے۔

اگر دام خالی نہ ہوتا تو ذوق اسیری کی تسکین کا معاملہ مشتبہ رہ جاتا، کیونکہ ممکن ہے، پہلے اتنے پرندے پھنس چکے ہوتے کہ کسی نئے مشتاق اسیری کے لیے گنجائش ہی نہ رہتی۔ اس لیے دام کے خالی ہونے کا پہلو بطور خاص پیش نظر لایا گیا۔

۲۔ لغات۔ جگرِ تشنۂ آزار : وہ جگر، جو دُکھ سہنے اور اذیت برداشت کرنے کا پیاسا ہو۔

بُنِ ہر خار : ہر خار دار جھاڑی کی جڑ۔

شرح : ہمارا جگر ایذا اور تکلیف کا اتنا پیاسا تھا کہ کانٹوں والی ہر جھاڑی کی جڑ میں خون کی ندی بہادی، لیکن جگر کی تسلّی نہ ہوئی۔ اس کے ذوق ایذا کی تسکین کا سامان بہم نہ پہنچ سکا۔

غور فرمائیے کہ جس جگر کے ذوقِ ایذا کی تسکین کے لیے کانٹوں والی ایک ایک جھاڑی کی جڑ میں لہو کی ندی بہادی گئی، پھر بھی اس کی تسلّی نہ ہوتی، اس کا ذوق کس پیمانے پر پہنچا ہوا ہوگا؟

شاعر کا مدعا یہ نہیں کہ جہاں کانٹوں والی کوئی جھاڑی دیکھی، وہاں خون بہانا شروع کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ کانٹوں والی ہر جھاڑی میں الجھ الجھ کر کانٹے جسم میں چبھو لیے اور زخموں سے اتنا خون بہایا کہ ندی جاری ہو گئی۔

۳۔ شرح : شعر کے پہلے مصرع کی شرح پیشتر بھی ہو چکی ہے، یعنی ضعف اتنا ہو چکا تھا کہ نظارۂ محبوب کے لیے آنکھیں کھولنے کی جتنی بھی کوشش کی گئی، کامیاب نہ ہوئی اور آنکھیں بند ہو گئیں، جان جسم سے مفارقت کر گئی۔ دیکھیے محبوب اپنے بیمار عاشق کے پاس کیسے وقت میں آیا۔ اس نے اتنا کرم فرمایا

لیکن ایسے وقت پر، جب اس کے کرم سے عاشق کوئی فائدہ نہ اٹھا سکتا تھا۔

۴۔ **شرح** : غم کھانے والے دوست نے عین آخری وقت میں لعنت ملامت شروع کر دی، طعنے دیے، ساتھ ساتھ نصیحت بھی کی کہ تمہیں اپنے آپ کو عشق میں اس طرح برباد نہ کرنا چاہیے تھا اور میری جان رک رک کر نکلتی رہی آہ! کاش غمخوار کے پاس زبان کی تیزی کے بجائے ایک تیز خنجر ہوتا، جو مارتا اور میں رُک رُک کر مرنے کے بجائے فوراً ختم ہو جاتا۔

غالبؔ کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے، غمخوار کی نصیحتیں یا ملامتیں اس قدر دل آزار ہوتی ہیں کہ کسی کا تیز خنجر مار کر ختم کر دینا بھی اس سے بدرجہا بہتر نظر آتا ہے۔

۵۔ **شرح** : اے دل! اُن حسینوں کے پاس نہ بیٹھنا چاہیے، جو ہر وقت عاشقوں کو ستانے کے درپے رہتے ہیں۔ اس سے کہیں بہتر ہے کہ انسان شیر کے منہ میں جا بیٹھے۔

مطلب یہ ہے کہ شیر کے منہ میں جا بیٹھنے سے فوری موت واقع ہو گی اور حسینوں سے دل لگانے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ آہستہ آہستہ دکھ پہنچا پہنچا کر موت کے گھاٹ اتاریں گے۔

۶۔ **لغات** ۔ نمو کرنا : بڑھنا، بالیدہ ہونا۔

شرح : اے محبوب! تجھے دیکھ کر چمن میں اس قدر بالیدگی پیدا ہوتی ہے، ہر چیز اس طرح بڑھنے لگتی ہے۔ کہ پھول خود بخود دستار کے گوشے کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ گوشۂ دستار پھولوں کے پودوں سے بہت اونچا ہوتا ہے۔ جب تک چمن میں غیر معمولی بالیدگی اور نمو پیدا نہ ہو، پھول گوشۂ دستار تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔

۷۔ **شرح** : دیوانہ غالبؔ سر پھوڑ کر مر گیا ہے یہ بڑا افسوس ہے! وہ ہر روز آ کر تیری دیوار کے پاس بیٹھا کرتا تھا۔ اُس کا وہ بیٹھنا اب یاد آ رہا ہے۔

مولانا طباطبائی نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ شعر میں خبر سے زیادہ انشا لطف

پیدا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشاق شاعر خبر کو بھی انشا بنا لیتا ہے۔ مثلاً اگر کہا جاتا کہ وہ تیری دیوار کے پاس آکر بیٹھتا تھا۔ تو یہ خبر ہوتی، لیکن موجودہ صورت میں جملہ انشائیہ بن گیا۔ پھر لفظ "وہ" سے اشارہ اس طرف ہے کہ جس محبوب سے خطاب ہے، وہ اس واقعے سے بے خبر ہے اور "وہ" کہ کر اسے غالب دیوانہ کا شیوہ یاد دلایا گیا ہے۔ لفظ "آکر" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس دیوانے کا دستور یہ تھا، جن جن اوقات میں اسے جمالِ محبوب دیکھنے یا آوازِ محبوب سننے کی امید ہوتی تھی، اس کی دیوار کے پاس آ بیٹھتا تھا۔ اگر "آکر" اس مصرع میں نہ ہوتا تو فقط اس کے بیٹھے رہنے کا واقعہ ضرور تازہ ہو جاتا، مگر غالب دیوانہ کا آکر بیٹھنا پیش نظر نہ آتا اور شعر کا حسن کم ہو جاتا، کیونکہ آکر بیٹھنا ایک حرکت اور ایک ادا ہے، محض بیٹھے رہنا سکون و طمانیت ہے اور دونوں کا فرق ظاہر ہے۔

○

نہ لیوے گر خسِ جوہر، طراوت سبزۂ خط سے
لگاوے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش
فروغِ حُسن سے ہوتی ہے حلّ مشکلِ عاشق
نہ نکلے شمع کے پا سے، نکالے گر نہ خار آتش

۱۔ لغات۔ خسِ جوہر: جوہر کا تنکا۔ جوہر کو تنکے سے تشبیہ اس لیے دی کہ وہ واقعی تنکے سے مشابہ ہوتا ہے، دوم یہ حقیقت شاعر کے پیشِ نظر ہے کہ تنکے جلد آگ پکڑ لیتے اور جل اٹھتے ہیں۔

روئے نگار: محبوب کا چہرہ۔

شرح: محبوب آئینہ دیکھ رہا ہے۔ شاعر کو معاً خیال آیا کہ ایسے مشتعل رخسارِ محبوب کا عکس تو جوہرِ آئینہ کے تنکوں کو آگ لگا سکتا ہے اور خانۂ آئینہ آگ کی نذر ہو سکتا ہے۔ پھر خیال آیا، جوہر کے تنکے اس لیے آگ

نہیں پکڑتے کہ محبوب کے سبزۂ خط سے ان تنکوں کو حرارت پہنچ رہی ہے اور جو شے نم آلود ہو جائے، وہ آگ نہیں پکڑتی۔

پورے شعر سے مقصود صرف یہ ہے کہ محبوب کے جمال کا نقشہ پیش کیا جائے، جو دوسروں کے نزدیک ممکن ہے، مبالغے پر مبنی ہو، مگر عاشق کے نزدیک احساسات کا زیادہ سے زیادہ صحیح مرقع ہوتا ہے۔

۲۔ شرح : حسن کی جلوہ آرائی ہی سے عاشق کی ہر مشکل دور ہوتی ہے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کا راستہ نکل آتا ہے۔ اس کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ شمع کے اندر جو دھاگا ہوتا ہے، وہ کانٹے کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ وہ کانٹا آگ ہی نکالتی ہے۔ یعنی شمع روشن ہو تو دھاگا جلتا رہتا ہے۔ موم پگھل پگھل کر ختم ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ شمع ختم ہو جاتی ہے اور دھاگا بھی باقی نہیں رہتا۔ اس حالت کی تعبیر یوں کی گئی کہ شمع کے پاؤں سے کانٹا نکل گیا۔

مدعا یہ کہ جس طرح آگ شمع کے پاؤں سے کانٹا نکالتی ہے، اسی طرح حسن کی جلوہ آرائی عاشق کی مشکلیں حل کر دیتی ہے۔

○

جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

۱۔ لغات : خور : خورشید۔ سورج۔

وا کرنا : کھولنا۔

وداع : رخصت۔

شرح : اس شعر میں سورج کے غروب اور ہلال کے نکلنے کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ شام کا وقت ہے۔ کرن کا تار سورج کے لیے سفر کا راستہ بن گیا ہے۔ افق پر نیا چاند طلوع ہو گیا ہے۔ چونکہ اس میں جھکاؤ ہوتا ہے، اس لیے اسے آغوش سے تشبیہ دی گئی ہے اور فرمایا گیا کہ یہ نیا چاند نہیں، بلکہ آسمان نے سورج کو رخصت کرنے کے لیے آغوش کھول دی ہے۔

عام دستور ہے کہ رخصت کے وقت دو رفیق بغل گیر ہوتے ہیں گویا بغل کھول کر ملتے ہیں۔ اسی طرح سورج کو رخصت کرنے کے لیے آسمان نے ماہِ نو سے بغل کھول دی۔

○

رخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیِ شمع
ہوئی ہے آتشِ گُل، آبِ زندگانیِ شمع

زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع

کرے ہے صرف بہ ایمائے شعلہ، قصہ تمام
بطرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیِ شمع

غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے
بہ جلوہ ریزیِ باد و بہ پرفشانیِ شمع

نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ
شگفتگی ہے شہیدِ گُل خزانیِ شمع

جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پہ مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغ بدگمانیِ شمع

۱۔ لغات۔ آتشِ گُل:
لغوی معنی پھول کی آگ، یہاں اشارہ ہے محبوب کی سرخیِ رخسار کی طرف، جو آگ سے مشابہ ہے۔

شرح: شمع میں جو مستقل سوز اور جلن موجود ہے، وہ محبوب کے رخسار کی وجہ سے ہے۔ یہی آتشِ گل ہے، جو شمع کے لیے، آبِ حیات بن گئی ہے، یعنی محبوب کے رخسار ہی کی بدولت شمع میں روشنی ہے۔

شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ محبوب کے حسن پر حسد کے باعث شمع میں جلن پیدا ہو گئی گویا اس کے جلنے کی وجہ رخسار محبوب کا حسد ہے۔ دوسرے مصرع کا مطلب اس صورت میں بھی وہی رہے گا جو بیان ہو چکا ہے، یعنی یہی رخسار جسے بہ اعتبار ملائمت و دلاویزی پھول اور ڈنڈ ہانے کے باعث

آگ بجھنا چاہیے، شمع کے لیے آب حیات بن گیا۔

۲۔ **شرح** : اہل زبان کے محاورے میں موت چپ ہو جانے کا نام ہے یہ حقیقت مجلس میں شمع کی زبانی روشن و آشکارا ہوئی۔

شعر میں نکتہ صرف اتنا ہے کہ شمع کے بجھنے کو خاموش ہو جانا بھی کہتے ہیں، جس طرح موت چپ ہو جانا ہے، اسی طرح شمع کا بجھنا اس کے لیے موت ہے، لیکن وہ روشن ہو تو اسے زندہ مانا جاتا ہے۔ محفل اس کی روشنی سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ یہ حقیقت بھی شمع نے بزم میں روشنی سے آشکارا کر دی۔ اگر وہ روشن نہ ہوتی اور بجھ جاتی تو بزم میں اسے بار ہی نہ ملتا۔

مرگ، خاموشی، بزم، روشن، شمع کی مناسبت محتاج بیان نہیں۔

۳۔ **لغات**۔ ایما : اشارہ۔

شرح : دیکھیے شمع صرف شعلے کا اشارہ پاتے ہی اپنا قصہ تمام کر دیتی ہے، یعنی جل بجھتی ہے۔ گویا شمع کی فسانہ خوانی میں بھی اہل فنا کا طریقہ نمایاں ہے۔ جس طرح ہمت ور لوگ عشق حقیقی کی لو لگا کر فنا فی الذات ہو جاتے ہیں، اسی طرح شمع شعلے کا اشارہ پاتے ہی سر سے پاؤں تک پگھل کر ختم ہو جاتی ہے۔

قصہ اور فسانہ خوانی کی مناسبت ظاہر ہے۔

۴۔ **شرح** : آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ موم بتی جلائی جائے تو اس کی لو لرزاں ہوتی ہے۔ اسے شعلے کا لرزنا قرار دیا۔ کہتے ہیں کہ اے شعلہ! تیرے لرزنے سے ظاہر ہے کہ شمع بے حد کمزور و ناتواں ہو گئی ہے۔ پھر خود ہی وجہ بیان کرتے ہیں کہ اسے پروانے کی حسرت کا غم کھا گیا، وہی غم اس کی ناتوانی کا سبب بنا۔

۵۔ **لغات**۔ اہتزاز : لغوی معنی جنبش، حرکت۔ چونکہ سرور و نشاط میں بھی جسم کے اندر ایک خاص چستی اور حرکت پیدا ہوتی ہے، اس لیے یہ لفظ سرور و نشاط کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔

جلوہ ریزی باد : ہوا کا جلوہ دکھانا یعنی چلنا۔

پر فشانیِ شمع : شمع کا پھڑپھڑانا یعنی جھلملانا۔

شرح : اے محبوب! تیرے خیال سے روح میں اسی طرح جنبش و حرکت پیدا ہوتی ہے، جس طرح ہوا کے چلنے سے شمع جھلملانے لگتی ہے۔

دوسرے مصرع میں ہوا کے چلنے اور شمع کے جھلملانے کو قسمیہ انداز میں کہا۔ یعنی دونوں کے ساتھ فارسی کا "بہ" قسمیہ لگایا۔ مطلب یہ ہوا کہ یقیناً تیرے خیال سے روح رقص کرنے لگتی ہے اور اس کے لیے ہم ہوا کے چلنے اور شمع کے جھلملانے کی قسم کھاتے ہیں۔ مطلب بہرحال وہی ہے، جو پہلے بیان ہو چکا۔

۶۔ **لغات** ۔ گُلِ خزانی : وہ پھول، جس پر خزاں نے اثر کیا ہو۔

شرح : غمِ عشق کے داغ سے ہمیں جو سرور و نشاط حاصل ہے، اس کی بہار کے بارے میں کچھ نہ پوچھ۔ یہ سمجھ لے کہ شمع کے خزاں دیدہ یعنی افسردہ و پژمردہ پھول پر شگفتگی قربان ہو رہی ہے۔ شمع کا خزاں دیدہ پھول وہ گل ہوتا ہے، جو اس کے جلنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اسے داغِ غمِ عشق سے تشبیہ دی گئی۔ بہارِ نشاط کے لیے شگفتگی وارے۔

۷۔ **لغات** ۔ بالین : سرہانا۔

شرح : شمع مجھے محبوب کے سرہانے دیکھ کر حسد سے جل رہی ہے، یعنی وہ مجھے اپنا رقیب سمجھ رہی ہے۔ اس کی بدگمانی کا داغ میرے دل سے مٹ نہیں سکتا۔

ہم رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش
مجبوریاں تلک ہوئے اے اختیار حیف!

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار، حیف!

۱۔ **شرح** : ہمارا جی تو یہ چاہتا تھا کہ ہوش و حواس کو رخصت کر دیں اور دیوانے بن کر بیٹھ جائیں، لیکن رقیب کے ڈر نے مجبور کر دیا۔ اور ہوش و حواس کو رخصت نہ کیا۔ اے اختیار! تجھ پر افسوس!

ڈر یہ ہے کہ یا تو ہوش و حواس کھو دینے سے رقیب پر رازِ عشق فاش ہو جائے گا یا

یہ اندیشہ ہے کہ ہم ہوش و حواس کھو بیٹھے تو رقیب محبوب کے التفات سے بے تکلف فائدہ اٹھائے گا۔ اختیار پر افسوس کا سبب یہ ہے کہ اگر یہ نہ ہوتا تو ہم یقیناً ہوش و حواس کھو بیٹھتے، کیونکہ ہیں، اب ہم اس درجہ مجبور ہو گئے کہ ہوش و حواس کو بھی رخصت نہیں کر سکتے۔ اس لحاظ سے اختیار پر افسوس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے کام نہیں لے سکتے ایسے اختیار اور بے اختیاری میں کوئی فرق نہ رہا۔

۲۔ **شرح:** ہمارا دل اس پر کڑھتا ہے کہ سانس نے کیوں ایسی آگ نہ برسائی، جو ہمیں ایک ہی دفعہ جلا دیتی۔ آہ! اس آگ برسانے والے سانس کی ناتمامی اور ادھورا پن کہ وہ ہلکی ہلکی آگ برساتا ہے، جو نہ ہمیں جلا سکی اور نہ جلنے سے نجات دلا سکی۔

○

زخم پر چھڑکیں کہاں، طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزہ ہوتا، اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

مجھ کو ارزانی رہے، تجھ کو مبارک ہو جیو
نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج
گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجۂ دریا نمک

۱۔ **شرح:** لڑکوں کی بے پروائی اور لاابالی پن سے کہاں امید ہو سکتی ہے کہ زخموں پر نمک چھڑکیں گے، وہ تو دیوانے کو پتھر مار مار کر ایذا دینے اور خوش ہونے کے عادی ہیں۔ کاش پتھروں میں بھی نمک ہوتا! لڑکے مجھے پتھر مارتے اور خوش ہوتے۔ اس طرح ایذا کے علاوہ زخموں کے لیے نمک کا انتظام بھی ہو جاتا اور خوب لطف آتا۔

۲۔ **شرح:** زخمِ دل کے لیے فخر و ناز کا سامان محبوب

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی، واہ وا!
یاد کرتا ہے مجھے، دیکھے ہے وہ جس جا نمک

چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق، حیف ہے
دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک

غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توفیرِ درد
زخم، مثلِ خندۂ قاتل ہے، سر تا پا نمک

یاد ہیں غالبؔ! تجھے وہ دن، کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

کے راستے کی گرد ہے۔ اسی گرد سے زخموں کو نمک کا مزہ مل سکتا ہے، اسی سے وہ بھر سکتے ہیں ورنہ دنیا میں اتنا نمک کہاں پیدا ہوتا ہے کہ زخمِ دل کے لیے بقدرِ ذوقِ لذت اور اندمال کا سامان مہیا ہو سکے۔

۳۔ لغات۔ ارزانی رہے: نصیب رہے، ملتا رہے۔

شرح: شعر میں لف و نشر مرتب ہے۔ یعنی پہلے مصرع کے پہلے ٹکڑے کا تعلق دوسرے مصرع کے پہلے ٹکڑے سے ہے اور پہلے مصرع کے دوسرے کا دوسرے مصرع کے دوسرے سے۔

مطلب یہ کہ مجھے نالۂ بلبل کا درد نصیب رہے، میرے لیے یہی مناسب ہے اور اسی کو زندگی کا حاصل سمجھتا ہوں اور اے محبوب! تجھے خندۂ گل کا نمک مبارک ہو۔

خندۂ گل سے مراد پھولوں کا کھلنا ہے، جسے پھولوں کی ہنسی قرار دیا جاتا ہے اور محبوبوں کی ہنسی شاعروں کے نزدیک نمک کا حکم رکھتی ہے، خصوصاً اس حالت میں کہ عاشق پریشاں حال اور درد سے لاچار ہوں، بہ ایں ہمہ محبوبوں کی ہنسی میں فرق نہ آئے۔ یہ کیفیت گل و بلبل کے معاملے میں بالکل آشکارا ہے۔ یعنی بلبل کے دل سے دردناک صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ پھول بدستور کھلتے رہتے ہیں اور ان کی ہنسی بلبل کے زخمِ دل پر نمک چھڑکتی رہتی ہے۔

۴۔ لغات: شورِ جولاں: گھوڑا دوڑانے اور شہسواری کرنے

کا شور ...

شرح : آج سمندر کے کنارے کس کے گھوڑا دوڑانے کا شور برپا ہوا، کہ ساحل کی مٹی موجِ دریا کے زخم کے لیے نمک بن گئی ؟ شور سے یہاں دو معنی مراد لیے، اوّل غوغا و ہنگامہ، دوم نمکینی۔ پھر سمندر کا کنارہ لائے اور اس کے اندر جو موجیں اٹھتی تھیں، ان میں زخم فرض کیے اور ان کے لیے ساحل کی مٹی کو نمک بنا دیا، جس میں حقیقۃً محبوب کے گھوڑا دوڑانے سے ملاحت پیدا ہو گئی تھی۔

مرزا نے خود عبدالرزاق شاکر کو لکھا ہے :

"پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کیے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیے"۔

مرزا نے نہیں بتایا کہ وہ کون کون سے شعر تھے، جو نمونے کی غرض سے باقی رکھے، لیکن وہ ایسے ہی ہوں گے، جیسے یہ شعر یا پوری غزل، جس کی ردیف نمک پسند فرمائی۔

۵۔ **شرح** : واہ وا ! محبوب میرے زخمِ جگر کی خوب داد دیتا ہے۔ جہاں، کہیں نمک دیکھتا ہے، میں اسے یاد آ جاتا ہوں۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے، سارا نمک میرے زخمِ جگر کے لیے وقف ہو جائے۔ دوسرے معنی یوں پیدا ہوتے ہیں کہ یاد کرنے سے مراد بلا لینا لیا جائے، یعنی محبوب کو جہاں، نمک نظر آتا ہے، مجھے بلا لیتا ہے کہ میرے زخمِ جگر پر چھڑک دے یا اس میں بھر دے۔ مقصد کہ دنیا بھر کا نمک بھی میرے زخمِ جگر کے لیے کافی نہیں۔ محبوب کو اس حقیقت کا علم ہے اور وہ میرے زخم کی داد پوری فراخ حوصلگی سے دے رہا ہے۔

۶۔ **لغات۔ تنِ مجروح** : زخموں سے چُور جسم۔

شرح : اے محبوب! عاشق کے جسم کو، جو زخموں سے چُور ہے، یوں چھوڑ جانا قابل افسوس ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ اور زخم لگیں۔ اعضا چاہتے ہیں کہ ان پر خوب نمک چھڑکا جائے۔ گویا عاشق کے زخم تو لگا دیے گئے، لیکن جتنے زخموں کا وہ طلبگار تھا، اُتنے نہ لگائے گئے اور ان پر نمک پاشی بھی نہ ہوئی۔

یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جسم کو تو مجروح کر دیا، لیکن دل پر کوئی چرکا نہ لگا، حالانکہ وہ بھی زخموں کا طلب گار ہے اور اعضا کو نمک بھی نصیب نہ ہوا غرض عاشق کی لذّتِ ایذا کے لیے تسکین کا کوئی سامان نہ ہوا۔

۷۔ **مِنّت کھینچنا** : احسان اٹھانا۔

توفیر : وافر کرنا، زیادہ کرنا۔

شرح : میں اپنا درد بڑھانے اور زیادہ کرنے کے لیے غیر کا احسان نہ اٹھاؤں گا۔ میرا زخم خود خندۂ قاتل یعنی محبوب کی ہنسی کی طرح سراسر نمک ہی ہے۔ اس لیے خود بخود میرے درد میں اضافہ ہو رہا ہے، پھر غیر کا احسان کیوں اٹھاؤں؟

۸۔ **لغات۔ وجدِ ذوق** : لطف کی سرمستی اور لذّت کی بیخودی۔

شرح : اس شعر میں ایک پرانا خیال شاعر نے پیشِ نظر رکھا، جو عموماً عورتوں میں رائج تھا۔ یعنی نمک کے سلسلے میں احتیاط کی غرض سے کہا کرتی تھیں کہ دیکھنا، نمک گرنے نہ پائے، ورنہ قیامت کے دن پلکوں سے چُننا پڑے گا۔

یہ خیال غالباً یوں پیدا ہوا کہ زمانۂ قدیم میں اُن حصّوں کے اندر نمک کمیاب تھا، جو ساحلِ بحر یا نمک کی کانوں سے دور تھے۔ اس لیے نمک کی حفاظت زیادہ سے زیادہ ضروری تھی۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ اے غالب! تجھے وہ دن بھی یاد ہیں، جب لطف

کی سرمستی اور لذت کی بیخودی میں میری حالت یہ تھی کہ اگر نمک زخم سے گرجاتا تھا تو میں اسے پلکوں سے چُنتا تھا؛

بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ یا تو "تجھے" کی جگہ "مجھے" ہونا چاہیے یا "میں" کی جگہ "تُو"۔ لیکن اس تغیر کی کوئی ضرورت نہیں۔ دو آدمی ایک کیفیت دیکھ چکے ہوں تو ایک دوسرے کو مخاطب کرکے وہ کیفیت یاد دلا سکتا ہے۔ شاعر نے غالب کو اپنا رفیق اور ساتھی قرار دے کر یہ سب کچھ کہہ دیا کہ تُو تو اس کیفیت سے واقف ہے ایک زمانے میں زخموں سے گرتا ہوا نمک پلکوں سے چنتا تھا۔

○

آہ کو چاہیے اک عمر، اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دام ہر موج میں ہے، حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ، گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں، خونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے، لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

۱۔ لغات۔ سر ہونا: اس محاورے کے معنی میں اختلاف ہے اور کسی ایک معنی کو ترجیح دینے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں۔ فارسی میں "سر شدن" شروع ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ سر شدنِ قلم کا مطلب ہے قلم بن جانا۔ مولانا طباطبائیؔ نے اس کے معنی سمجھنے اور باخبر ہونے کے لکھے ہیں۔ نور اللغات میں مرزا غالب کا یہی شعر بہ طور سند پیش کرکے سر ہونے کے معنی پیچ کھُلنے کے بتائے ہیں۔ ساتھ ہی لکھ دیا ہے کہ اب یہ معنی متروک ہیں۔ اس

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی، غافل!
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ! کس سے ہو جُز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

کے ایک عام معنی مسخر کرنا بھی ہے۔

شرح : آہ کے اثر پذیر ہونے کے لیے ایک عمر درکار ہے۔ اب محبوب! تیری زلف کے سر ہونے تک کون جیتا رہے گا؛ زندگی ختم ہو جائے گی اور تیری زلف بدستور عاشقوں کے حال زار سے بے خبر رہے گی۔ اس کے خبردار ہونے یا پیچ و خم کھلنے تک ہمارے یا کسی دوسرے کے زندہ رہنے کی اُمید ہی کب ہے؟ یا کون کہہ سکتا ہے کہ تیری زلف کب مسخر ہو گی اور ہم اس وقت تک جیتے رہیں گے۔

۲۔ **لغات :** کامِ نہنگ : مگرمچھ کا حلق۔

شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"جو مطلب اس شعر میں ادا کیا گیا ہے، وہ صرف اس قدر ہے کہ انسان کو درجۂ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

کوئی شبہ نہیں کہ اس دنیا میں حوادث کے جو طوفان اٹھتے رہتے ہیں، ان میں سے صبر و ہمت کے ساتھ گزرتے ہوئے کوئی بڑا کارنامہ انجام دینا بہت مشکل ہے اور ہر انسان کسی بلند و شایان مقصد پر نہیں پہنچ سکتا، جب تک وہ ہر قسم کی مصیبتیں برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو جائے۔ زندگی ایک ایسا سمندر ہے، جس میں قدم قدم پر جال بچھے ہوئے ہیں اور ان کے حلقے ڈوروں سے تیار نہیں ہوئے بلکہ ان کی جگہ مگرمچھوں کے حلق رکھ دیے گئے ہیں۔ پھر ایک ایک قدم پر سینکڑوں مگرمچھ حلق کھولے بیٹھے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان مصائب کو انگیز کرتے ہوئے کسی بلند مقصد کی طرف بڑھنا ہرگز سہل نہیں۔ مرزا نے پہلے مصرع میں خطرات کا منظر پیش کیا۔ دوسرے میں اصل مقصد واضح کیا۔ پوری کیفیت کا خلاصہ یہ ہے :

۱۔ زندگی کے سمندر کی ہر موج ایک جال کی حیثیت رکھتی ہے۔ موج کو جال سے تشبیہ دینا عام مشاہدہ ہے۔

۲۔ یہ جال ڈوریوں سے تیار نہیں ہوئے، بلکہ سیکڑوں مگرمچھ منہ کھول کر بیٹھ گئے، اس طرح، ان کے حلقوں کے تواتر سے جال تیار ہو گئے۔

۳۔ خطروں اور ہلاکتوں کی یہ کیفیت سامنے رکھ کر وہ سوچتے ہیں کہ ان میں سے گزرتے ہوئے قطروں کو موتی بننا ہے۔

۴۔ قطرہ سمندر سے باہر نکلے گا تو مٹی میں جذب ہو جائے گا۔ اندر ہی رہ کر اسے اوجِ کمال تک پہنچنا ہے۔

۵۔ ظاہر ہے کہ وہ جب تک خطروں کے مقابلے کے لیے صبر اور اپنے مقصد کے لیے استقامت پیدا نہ کرے گا، منزلِ مقصود پر نہ پہنچ سکے گا۔

۶۔ مرزا کا کمال یہ ہے کہ خطرات زیادہ سے زیادہ معین شکل میں پیش کر دیے۔ باقی رہا یہ امر کہ عملِ ارتقا میں قطرے پر کون کون سی آفتیں آئیں گی ان کا کوئی تعین نہ کیا اور تعین ہو بھی نہیں سکتا، کیونکہ ہر قطرے کو یکساں حالتیں پیش نہیں آ سکتیں اور ان کا اندازہ ہر پڑھنے والا خطرات پیشِ نظر رکھتے ہوئے خود کر سکتا ہے۔ حقیقۃً شعر میں یہ عدمِ تعین بھی لطف اندوزی کا ایک خاص عامل ہے۔

بہ طورِ خاص غور طلب نکتہ یہ ہے کہ ان تمام خطرات میں نصب العین قطرے کا گوہر بننا ہے، جسے شاعر قطرے کے لیے منتہائے کمال قرار دیتا ہے۔

۳۔ لغات۔ رنگ: حال۔ کیفیت۔

شرح: عشق کے لیے صبر کے سوا چارہ نہیں اور تمنا بے قرار ہے، یعنی چاہتی ہے کہ ہر مقصد ابھی پورا ہو جائے۔ اب حیران ہوں کہ جگر کا خون ہونے تک دل کا کیا حال کروں؟

تمنا کا مقام دل ہے اور صبر کا مقام جگر اور مرزا نے دل و جگر کے یہ وظیفے

الگ الگ واضح کر دیے۔ صبر کا خاصہ یہ ہے کہ جگر پر زیادہ سے زیادہ بار پڑے اور وہ خون ہو ہو کر بہتا جائے۔ مرزا پوچھتے ہیں کہ صبر کی آخری منزل پر پہنچنے تک میں دل کو کیونکر قابو میں لاؤں؟

شعر میں بے تکلفی سے جتنی مناسبتیں جمع کر دی گئی ہیں، وہ دراصل اعجاز سخنوری کا ایک کرشمہ ہیں۔

۴۔ **شرح**: عاشق محبوب سے اپنا حال بیان کر رہا ہے۔ محبوب کہتا ہے "فکر نہ کرو، میں تمھارے حال سے تغافل نہ برتوں گا"۔ عاشق کہتا ہے: "میں مانتا ہوں کہ آپ تغافل نہیں کریں گے، لیکن یہ بھی تو ظاہر ہے کہ جب تک آپ کو ہماری خبر ملے گی اور آپ ہمارے حال پر توجہ فرمائیں گے، اس وقت تک تو ہم ختم ہو کر نہ محض قبر میں جا سوئیں گے بلکہ ہمارا جسم بھی مٹی میں مل جائے گا۔

شعر میں دراصل محبوب کے تغافل کا نقشہ نہایت پرتاثیر انداز اور نہایت دلنشین الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔ کوئی مصوّر اس ذہنی کیفیت کی تصویر نہیں کھینچ سکتا اور مرزا نے چند لفظوں میں اسے ایسا پرداز دے دیا ہے کہ ہر فرد کے سامنے پوری کیفیت آ جاتی ہے۔

۵۔ **لغات**۔ **پرتوِ خور**: سورج کا جلوہ، جس کی حدت اور تمازت شبنم کو اڑا لے جاتی ہے۔

شرح: سورج کی روشنی شبنم کے لیے فنا کا سبق ہے، یعنی کرنیں پڑتے ہی شبنم کے قطرے اڑ اڑ کر غائب ہو جاتے ہیں۔ گویا سورج کی کرنیں انھیں فنا کے مقام پر پہنچا دیتی ہیں۔ اے محبوب! اسی طرح میری ہستی بھی عنایت کی صرف ایک نظر ہو جانے تک باقی ہے۔ جب آپ کی نظرِ عنایت مجھ پر پڑ جائے گی، جس طرح سورج کی کرنیں شبنم پر پڑتی ہیں، میں بھی اسی طرح فنا کے گھاٹ اتر جاؤں گا۔

شاعر نے دوسرے مصرع میں کوئی معین مخاطب نہیں رکھا۔ بظاہر اس سے مقصود وجودِ حقیقی ہے، جس کی نظرِ عنایت تمام غیر حقیقی اور اعتباری ہستیوں کو اپنے

اندر جذب کر سکتی ہے۔

۶۔ **شرح** : اے غافل انسان! زندگی کی مہلت ایک نظر سے زیادہ نہیں۔ یعنی نظر اٹھائی، دیکھا اور ختم ہو گئی۔ دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ فرصت پلک جھپکنے تک محدود ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھنی چاہیے کہ ہستی ایک بزم اور ایک انجمن ہے، اس کی گرمی اور رونق صرف اتنی ہوتی ہے، جتنی دیر میں چنگاری تڑپ کر اٹھے اور ختم ہو جائے۔

۷۔ **شرح** : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"انسان کی زندگی کو اس لحاظ سے کہ جب تک موت نہیں آتی، غم سے نجات نہیں ہوتی، شمع سے تشبیہ دی ہے کہ جب تک صبح نہیں ہوتی، وہ برابر جلتی رہتی ہے۔"

ساتھ ہی فرماتے ہیں :

"اس قسم کی نادر و بدیع تشبیہات سے مرزا کے دونوں دیوان، اردو اور فارسی بھرے ہوئے ہیں۔"

اے اسدؔ! زندگی کے غم کا علاج موت کے سوا کون کر سکتا ہے؟ یہ بیماری مرنے ہی پر ختم ہو گی۔ دیکھیے، شمع کو رات کے وقت جلاتے ہیں اور جب تک صبح نہ ہو جائے، وہ برابر جلتی رہتی ہے یعنی اس کی سوزش کا خاتمہ صبح طلوع ہو جانے پر ہوتا ہے۔ یہی کیفیت غم ہستی کی ہے اسے بھی ایک شمع سمجھنا چاہیے، جو برابر جلتی رہے گی اور صرف موت اسے بجھائے گی، کیونکہ غمِ ہستی کی شمع کے لیے موت ہی صبح کا حکم رکھتی ہے۔

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت، دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

۱۔ **لغات** ۔ اجابت : قبول ہونا۔ منظور ہونا۔

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد!
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا! نہ مانگ

دلِ بے مدعا: ایسا دل جس کا کوئی مدعا نہ ہو، جو ہر غرض سے پاک ہو۔

شرح: اگر تجھے دعا کے قبول ہونے کا یقین ہے تو ایک ایک چیز کے لیے دعا نہ مانگ۔ اگر مانگنا چاہتا ہے تو خدا سے ایسا دل مانگ لے، جس کا کوئی مدعا نہ ہو، جو غرض سے بالکل پاک ہو، جب ایسا دل مل جائے گا تو کبھی کسی چیز کے لیے دعا مانگنے کی ضرورت نہ رہے گی، کیونکہ وہ بے مدعا ہونے کے باعث کسی شے پر ملتفت ہی نہ ہوگا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرزا نے دلِ بے مدعا مانگنے کے لیے قبول ہونے کے یقین کی شرط کیوں لگائی، یعنی کیوں کہا کہ اگر تجھے دعا قبول ہونے کا یقین ہے تو یہ مانگ اور یہ نہ مانگ؟ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر شخص کو یقینِ اجابت ہو تو دعا مانگے مطلب صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر واقعی کسی کی کو قرائن سے اجابت کا یقین ہو جائے تو دلِ بے مدعا مانگنا چاہیے۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ دلِ بے مدعا کیوں مانگا جائے؟ کیا واقعی مرزا غالبؔ لوگوں کو دعا سے روک رہے ہیں اور اسی لیے انھوں نے دلِ بے مدعا مانگنے کی تلقین کی؟ بعض اہلِ تحقیق نے فرمایا ہے: خدا عالم الغیب ہے، لہذا جو تمنا کسی کے دل میں پیدا ہوتی ہے، اس کا علم عالم الغیب کو ہو جاتا ہے، پھر مانگنا فعلِ عبث ہے۔ اگر وہ تمنا پوری نہیں ہو سکتی تو اس کا بھی علم ہے اور مانگنا اس صورت میں بھی بیکار ہوگا، لیکن یہ سب تکلفات ہیں۔ مرزا نے دعا سے نہیں روکا، بلکہ ہر لحظہ ہر وقت ایک ایک چیز کے لیے دعائیں مانگنے سے روکا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیوی مقاصد اور تمناؤں کی کوئی حد و نہایت نہیں۔ انسان مانگنے پر آتا ہے تو مانگتا جاتا ہے۔ دل میں استقامت پیدا کرنی چاہیے۔ دنیا کی چیزوں سے زیادہ وابستگی نامناسب ہے، اس غرض سے دلِ بے مدعا مانگ لینا بہتر ہے۔

دلِ بے مدعا سے بھی مرزا کا مدعا یہ نہیں کہ دل میں کوئی آرزو، کوئی تمنا باقی ہی نہ رہے، مدعا صرف یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتوں کے لیے، جن کی حیثیت سراسر دنیوی ہے، مانگنا مناسب نہیں۔

۲۔ شرح: اے خدا! مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ، کیونکہ جب حساب کا معاملہ سامنے آئے گا تو گناہوں کے ساتھ مجھے یہ بھی یاد آتا جائے گا کہ کون کون سی حسرتیں دل میں رہ گئیں اور گناہ بھی بہ اندازِ شایاں نہ کر سکا۔ ان حسرتوں کے داغ دل پر موجود ہیں اور گناہوں کا حساب دیتے وقت وہ تمام داغ تازہ ہو جائیں گے۔

مرزا کو یہ مضمون بہت پسند ہے۔ اردو میں وہ دوسری جگہ کہتے ہیں۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

پھر فارسی کی ایک غزل میں فرماتے ہیں:

اندر آں روز کہ پرسشِ رود از ہر چہ گزشت
کاش با من سخن از حسرتِ ما نیز کنند

یعنی جس روز اعمال کی پرسش ہوگی، کاش اُس روز میری حسرتوں کے متعلق بھی بات چیت کر لی جائے۔

مثنوی "ابرِ گہر بار" میں یہ مضمون تفصیل سے بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ خواجہ حالیؔ مرحوم نے اس شعر کی شرح کرتے ہوئے "یادگارِ غالبؔ" میں پیش کر دیا ہے۔ خواجہ مرحوم فرماتے ہیں:

"بظاہر درخواست کرتا ہے کہ اے خدا! مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ اور در پردہ الزام دیتا ہے۔ گویا کہتا ہے کہ گناہوں کا حساب کیونکر دوں، وہ شمار میں اس قدر زیادہ ہیں کہ جب ان کو شمار کرتا ہوں تو وہ داغ، جو تُو نے دنیا میں دیے ہیں اور جو شمار میں اسی

کثرت سے ہیں جس کثرت سے میرے گناہ ہیں، ان کی گنتی یاد آ جاتی ہے۔

"گناہوں اور داغوں کے شمار میں برابر ہونے سے یہ مراد رکھتی ہے کہ جب کسی گناہ کا مرتکب ہُوا تو بہ سبب عدم استطاعت کے اسے خاطر خواہ نہ کر سکا۔ کوئی نہ کوئی حسرت ضرور باقی رہ گئی۔ مثلاً شراب پی تو وصل نصیب نہ ہُوا، وصل میسر آیا تو شراب نہ ملی"۔

"ابرِ گہربار" کی مناجات میں کم و بیش نوّے اشعار اسی موضوع پر ہیں اور وہ اس قابل ہیں کہ انھیں پڑھ کر مرزا غالبؔ کے نقطۂ نگاہ کا صحیح اندازہ کیا جائے۔ گناہوں کے سلسلے میں بے استطاعتی کے باعث حسرت رہ جانے کا قصہ اس سوز و درد سے بیان کیا ہے کہ انسان کے لیے اسے اطمینان سے پڑھنا مشکل ہے اور لطف یہ کہ بندگی اور عبودیّت کا کوئی بھی پہلو باقی نہیں چھوڑا۔ آخر میں کہتے ہیں۔

بہ ہر جرم کز روے دفتر رسد	زمن حسرتے در برابر رسد
بفرمائے کیں داوری چوں بود	کہ از جُرم من حسرت افزوں بود
ہر آئینہ ہیچوں منے را ببند	تلافی فراخور بود نے گزند
بدیں مویہ در روز امّید و بیم	بگریم بدانسان کہ عرش عظیم
شود از تو سیلاب را چارہ جُو	تو بخشی بدان گریہ ام آبرو

مطلب یہ کہ جو جو جُرم میرے اعمال نامے سے پیش کیا جائے گا، میں اس کے مقابلے میں ایک حسرت پیش کر دوں گا۔ اب فرمائیے، فیصلہ کیونکر ہو گا؟ میری حسرتیں تو جرموں سے بڑھ جائیں گی۔ میرے لیے تو سزا کے بجائے تلافی کا سروسامان ہونا چاہیے۔ قیامت کے دن میں اس درد سے روؤں گا کہ عرش عظیم تجھ سے خواہاں ہو گا، مجھے سیلاب سے بچائیے۔

پھر کہتے ہیں کہ میں رند ہوں، پارسائی کی کوئی چیز مجھ میں موجود نہیں، میری نگہ کج ہے اور میں آتش پرست ہوں، جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر رہا ہے، لیکن

میں تیری کتاب کا پرستار اور تیرے پاک نبیؐ کا محب ہوں، میرے لیے آزادی کا فرمان صادر کر دے۔

یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ مرزا غالبؔ ناسزا امور میں بھی برابر سزاوار طریقے کے قائل رہے، مثلاً وہ فرماتے ہیں:

بادہ بہ وام خوردہ و زر بہ قمار باختہ
وہ کہ زہر چہ ناسزاست ہم بہ سزا نہ کردہ ایم

یعنی شراب اُدھار پیتے رہے اور پیسے جوئے میں ہار دیے۔ افسوس کہ ہم نے غیر شایاں افعال بھی شایان طریق پر نہ کیے۔ جو پیسے جوئے میں ہارے، وہ شراب کی قیمت میں ادا کیے جا سکتے تھے، یہ شایاں طریقہ تھا۔

○

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گُل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل

آزادیِ نسیم مبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گُل

جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا
اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گُل

خوش حال اس حریفِ سیہ مست کا کہ جو
رکھتا ہو مثلِ سایۂ گُل، سر بہ پائے گُل

۱۔ لغات۔ ہلاک: مٹا ہوا، والہ و شیفتہ۔

شرح: اس شعر کا دوسرا مصرع پہلے ایک غزل میں آ چکا ہے، یعنی:

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا

شعر کا مطلب یہ ہے کہ بلبل کی حالت دیکھیے، وہ پھولوں کے عشق کے فریب میں مر مٹی ہے۔ پھول وفاداری کریں گے حالانکہ حسن اور وفا ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ یہ بلبل کی فریب خوردگی

ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لیے بہار
میرا رقیب ہے، نفَسِ عطر سائے گُل

ہے۔ پھولوں کی کیفیت یہ ہے کہ اُس غریب کے کاروبار کی ہنسی اڑا رہے ہیں۔

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گُل

پھولوں کے کھلنے کو ان کا خندہ یعنی ہنسی قرار دیا اور شاعر کے تصور کے مطابق یہ ہنسی بلبل کی نادانی اور فریب خوردگی پر ہے کہ پھولوں کی محبت پر مٹی جا رہی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اسے خوب فریب دیا۔

سطوت سے تیرے جلوۂ حُسنِ غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گُل

ایک لحاظ سے ہر عشق کی کیفیت یہی ہے کہ حق ناشناس لوگ اس کی ہنسی اُڑاتے ہیں۔ خواہ اس عشق کا تعلق کسی فرد سے ہو یا مقصد سے۔

تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گُل در قفائے گُل

غالب! مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گُلِ جیبِ قبائے گُل

۲ شرحِ نسیم کے لیے آزادی ہے کیونکہ پھولوں کے اشتیاق و آرزو کا جو جال بچھا ہوا تھا اس کے حلقے ٹوٹے پڑے ہیں۔ اس شعر میں چند امور غور طلب ہیں:

۱۔ پھولوں کے اشتیاق و آرزو کا جو جال بچھا ہوا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہار آئی تھی۔ جس میں پھولوں کی کثرت تھی اور لوگ شوق سے پھول دیکھنے آتے تھے

۲۔ اس دام کے حلقے ٹوٹے پڑے ہیں مراد یہ ہے کہ بہار ختم ہو گئی اور خزاں آگئی۔

۳۔ جب پھولوں کی کثرت تھی، نسیم کو پابندی سے ان کی خدمت بجا لانی پڑتی تھی کیونکہ پھول نسیم ہی کے چلنے سے کھلتے تھے اور وہی ان کی خوشبو جا بجا لیے پھرتی تھی۔

۴۔ جب پھول نہ رہے تو نسیم کے لیے پابندی بھی ختم ہو گئی لہذا فرمایا اسے آزادی مبارک وہ جہاں چاہے جائے۔ جس طرف چاہے چلے۔

۵۔ جال کے حلقے ٹوٹ جائیں تو وہ اس قابل نہیں رہتا کہ شکار اس میں پھنسے۔ نسیم اس اعتبار سے بھی آزاد ہو گی

۶۔ تقریباً تمام شارحین نے نسیم کے معنی خوشبو لے کر شرح کی ہے، جو موزوں معلوم نہیں ہوتی۔ اگر خوشبو ہی مراد تھی تو مرزا نے نسیم کی جگہ شمیم کیوں نہ لکھا؟

۳۔ لغات : لبِ خونیں نوا : وہ لب، جس سے لہو بھری صدائیں نکلتی ہیں۔

شرح : جسے دیکھو، وہ رنگ کی لہر بہر کے دھوکے میں پھنس گیا۔ آہ! پھول کا وہ نالہ کسی نے نہ سنا، جو لہو بھری صدائیں بلند کرنے والے لب پر جاری تھا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص ظواہر میں الجھا ہوا ہے، انھیں چیزوں پر نظر رکھتا ہے، جو اس کو اپنی طرف کھینچتی ہیں، لیکن حقیقت پر کسی کی نظر نہیں۔ پھول کے اندر سے بھی خون بھری فغاں بلند ہو رہی ہے اس پر کسی کی توجہ نہیں اور رنگ پر سب مٹے جا رہے ہیں، حالانکہ وہ محض دھوکا ہے، محض طلسم ہے، جو جلد سے جلد ٹوٹ جائے گا۔

۴۔ شرح : وہ شخص کتنا خوش نصیب ہے، جو عشق کی سیاہ مستی میں پھول کے سائے کی طرح اپنا سر پھول کے پاؤں پر رکھتے رہتا ہے۔

یہاں پھول سے مراد محبوب ہے۔ یعنی خوش نصیب وہی عاشق ہے، جو ہر تعلق سے کنارہ کش ہو کر بیخود و مدہوش آدمی کی طرح اپنے محبوب کے قدم نہ چھوڑے اور سایے کی طرح اس کے قدموں پر جھکا رہے۔

۵۔ لغات ۔ نفسِ عطر سائے گُل : پھول کا عطر بھرا سانس یعنی اس کی دلآویز خوشبو۔

شرح : اے محبوب میں جانتا ہوں کہ بہار نے پھول صرف تیرے لیے پیدا کیے ہیں کہ تو ان سے کام لے۔ مثلاً ہار بنا کر گلے میں ڈالے، زلف و کاکل میں لگائے

بستر پر بچھائے ان کی خوشبو سونگھے، ان سے نکلا ہوا عطر جسم پر ملے۔ پھول کا معطر معنبر سانس میرا رقیب بن گیا ہے اور مجھے اس کی حالت پر رشک آ رہا ہے۔ کہ وہ ہر لحظہ تیرے ساتھ رہتا ہے اور میں تجھ سے دُور ہوں۔

۶۔ **شرح** : میری صراحی شراب سے خالی ہے۔ دل میں پھولوں کی سَیر کا کوئی ولولہ نہیں۔ یہ حالت میرے لیے فصلِ بہار کے سامنے شرمندگی اور ندامت کا باعث ہے۔

بہار کا تقاضا ہی یہ ہے کہ شراب پی جائے اور پھولوں کی سَیر کی جائے، لیکن میرے پاس فصلِ بہار کے خیر مقدم کا یہ سامان موجود ہی نہیں، اس لیے میں شرمندہ ہو رہا ہوں۔

مولانا طباطبائی کے ارشاد کے مطابق شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اسے سوالِ مقدر کا جواب سمجھ لیا جائے، یعنی میرا شراب پینا اور باغوں کی سَیر کرنا لوگ بُرا سمجھتے ہیں مگر ایسا نہ کروں تو مجھے بادِ بہار سے شرمندگی ہوتی ہے، لہذا میں شرمندگی گوارا نہیں کر سکتا اور اپنا مشغلہ ضرور جاری رکھوں گا۔

۷۔ **لغات**۔ سطوت : دبدبہ۔

شرح : اے محبوب! تیرا حُسنِ غیور اس امر کی تاب نہیں لا سکتا کہ تیرے عاشق کی نظر کسی اور طرف اٹھے۔ اسی حُسنِ غیور کے دبدبے نے میری نگاہوں میں پھول کے رنگ اڑا کر لہو بنا دیا۔ یعنی میں اس کی رنگینی کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتا اور یہ سب کچھ تیرے غیور جلوۂ حسن کے رعب اور دبدبے کا کرشمہ ہے۔

۸۔ **لغات**۔ گل در تفائے گل : پھول کے پیچھے پھول۔

شرح : اے محبوب! یہ تیرے ہی جلوے کا دھوکا ہے کہ آج تک اس دھوکے میں مبتلا ہو کر پھول یکے بعد دیگرے بے اختیار دوڑے چلے آ رہے ہیں کہ شاید اُس جلوے سے فیضیاب ہو سکیں۔

مطلب یہ ہے کہ روئے زمین پر پھولوں کی نمو، شادابی اور شگفتگی کا جو کبھی ختم

نہ ہونے والا سلسلہ جاری ہے ، اس کا سبب یہ ہے کہ تیرے جلوے کے اشتیاق میں یہ بیخودانہ چلے آرہے ہیں ، حالانکہ وہ بھی جلوہ نہیں ۔ بلکہ اس کا فریب انھیں کھینچے لیے آرہا ہے ۔

۹۔ شرح : اے غالب ! مجھے اس محبوب سے ہم بغل ہونے کی آرزو ہے ، جس کا خیال بھی پھول کی جیبِ قبا کے لیے ایک آرائشی پھول کی حیثیت رکھتا ہے ۔
عام طریقہ ہے کہ قبا کی زیب و زینت کے لیے مناسب مقامات پر پھول کاڑھ لیے جاتے ہیں ۔ غالب کا محبوب ایسا ہے ، جس کا خیال اور تصور پھول کی قبا کے لیے زینت کا باعث ہے ۔

○

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن ، شمعِ ماتم خانہ ہم

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال
ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بتخانہ ہم

باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں
ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

ضعف سے ہے ، نے قناعت سے ، یہ ترکِ جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں ، اسد
جانتے ہیں سینۂ پر خوں کو زنداں خانہ ہم

۱۔ شرح : بجنوری مرحوم فرماتے ہیں :
"دنیا کی تکالیف علائق سے ہیں ۔ جو لوگ اضافت و نسبت سے بری ہیں ، وہ الم سے بھی سبکدوش ہیں ۔ آزاد بظاہر ہیں سب سے زیادہ آزار پاتے اور رنج اٹھاتے ہیں اور شب و روز تاریک ماتم خانے میں رہتے ہیں لیکن واقعۂ غم کا اثر ان پر عارضی اور وقتی ہوتا ہے مرزا اپنے اس سکون طبیعت کی کیا فوق الخیال مثال دیتے ہیں کہ جب برق بلا گرتی ہے تو ہم بجائے خوف زدہ اور پریشان ہونے کے کمال اطمینان

سے اٹھ کر جو الہ برق سے اپنے الم کدے کی خاموش و کشتہ شمع روشن کر لیتے ہیں۔"

بلاشبہ اس دنیا میں انسان کے لیے رنج و غم علائق کی بنا پر ہے اور آزاد لوگ وہی کہلاتے ہیں، جن کا دامن علائق سے پاک ہو بیشک غم انھیں بھی ہوتا ہے کیونکہ جب تک زندگی باقی ہے، علائق سے کامل علیدگی ناممکن ہے چونکہ ان کا دل کسی شے سے گہری وابستگی نہیں رکھتا، اس لیے غم بھی پائدار نہیں ہو سکتا اور مرزا کے قول کے مطابق وہ صرف دم بھر کے لیے متاثر ہوتے ہیں مصائب کی جو بجلیاں ان پر گرتی ہیں انھیں کو اپنے ماتم خانے کی شمع بنا لیتے ہیں۔ یعنی بجلی چمکی، گری، ایک لمحے میں غائب ہو گئی۔ بس یہی کیفیت آزاد لوگوں کے غم کی ہے۔

ایک اور پہلو بھی الفاظ سے واضح ہے۔ یعنی دنیا بجلی سے لرزتی اور کانپتی ہے ہمارے لیے اس کی حیثیت ایک دیا سلائی کی ہے۔ بجلی چمکی اور ہم نے سمجھ لیا کہ ہمارے ماتم خانے کے لیے روشنی کا سامان مہیا ہو گیا۔

۲۔ **لغات۔ گنجفہ** : تاش کی طرح کا ایک کھیل، جس کے پتے تاش کے پتوں کے برعکس گول ہوتے ہیں، نیز ان کی تعداد باون کے بجائے چھیانوے ہوتی ہے اور آٹھ آدمی اسے مل کر کھیلتے ہیں۔ گنجفہ باز، گنجفہ کھیلنے والا۔

ورق گردانی : تاش یا گنجفے کے پتے پھینٹنا اور ہاتھوں میں پھرانا۔

نیرنگ : عجائب۔

بُت خانہ : مراد ہے آرزوؤں اور تمناؤں کا بُت خانہ

شرح : ہمارے سامنے تمناؤں اور آرزوؤں کا ایک بُت خانہ عجائب و غرائب سے آراستہ ہے۔ اس کی ورق گردانی کا نقشہ ہم بنے ہوئے ہیں۔ خیال کا گنجفہ باز ان پتوں کو برابر پلٹتا جا رہا ہے۔ ایک نقشہ آتا ہے اور وہ برہم ہو جاتا ہے، پھر دوسرا نقشہ سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ اس طرح محفلیں قائم ہوتی اور بکھرتی چلی جا رہی ہیں۔ یہی انسانی زندگی کا عام نقشہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس نقشے کو

پیش کرنے کی یہ ایک بہترین صورت ہے۔

۳۔ **لغات**۔ پیدائی : ظہور۔ نمود و نمائش۔

شرح : ہماری حیثیت پر نظر ڈالیے، دنیا بھر کا ہنگامہ بپا کر رکھا ہے لیکن نمود و نمائش ہیچ ہے، اس کا کہیں پتا ہی نہیں چلتا۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ہم

دلِ پروانہ کے شبستاں میں چراغاں کی طرح ہیں۔

پروانے کے دل کو ایک شبستاں فرض کیا، پھر اس میں چراغاں کا انتظام ہُوا۔

گویا ایک موہوم در موہوم صورت پیدا ہو گئی۔

جس طرح شمع روشن ہوتے ہی پروانے کے دل میں شوق وصال کی بیخودی ہنگامہ بپا کر دیتی ہے اور وہ آ کر ایک لمحے میں اپنے محبوب یعنی شمع پر قربان ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہم نے دنیا بھر کے ہنگامے کا سر و سامان کر رکھا ہے، لیکن پروانے کے شوقِ دل کی محفل میں چراغاں کا خارجی وجود کوئی نہیں، وہی حیثیت ہماری ہے۔

۴۔ **لغات**۔ تکیہ گاہ : سہارے کی جگہ۔ ٹیک لگانے کا مقام۔

شرح : ہم نے تگ و دو چھوڑی ہے تو اس لیے نہیں کہ ہم میں قناعت پیدا ہو گئی ہے، بلکہ ہم اتنے کمزور و ناتواں ہو چکے ہیں کہ تگ و دو کر ہی نہیں سکتے۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں ہم ہمتِ مردانہ کی تکیہ گاہ کے لیے باعثِ ننگ ہیں۔ یعنی ہمارا موقف ایسا نہیں، جسے مردانگی کے نزدیک زیبا سمجھا جا سکے۔ مردانگی کا تقاضا یہ تھا کہ ہم آرزوؤں پر قابو پاتے۔ اور کم سے کم پر قناعت کر لیتے، مگر ہماری بھاگ دوڑ اس وقت تک نہ رکی، جب تک ہماری قوت و طاقت ختم نہ ہو گئی۔ یعنی ہم بھاگ دوڑ کے قابل ہی نہ رہے۔ پھر ہمت مردانہ کے لیے ہم وبال ثابت ہوئے تو اس پر تعجب کیا ہے؟

۵۔ **لغات** : دائم الحبس : ہمیشہ کے لیے قید۔ عمر قیدی۔

شرح : اے اسدؔ! ہم اپنے لہو بھرے سینے کو قید خانہ سمجھتے ہیں، کیونکہ اس میں لاکھوں تمنائیں ہمیشہ کے لیے قید ہیں اور انھیں کے خون ہوتے جانے سے

سینہ لہو سے بھر گیا ہے۔

○

بہ نالہ حاصلِ دل بستگی فراہم کر
متاعِ خانۂ زنجیر، جز صدا، معلوم

۱۔ لغات۔ دل بستگی: دل کا تعلق۔

شرح: اے عاشق! تو بھی آہ و فغاں کر، کیونکہ دل لگانے اور محبوب سے عشق کرنے کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں۔ تیری حیثیت زنجیر کی ہے۔ زنجیر کے گھر کا مال و متاع آواز کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

○

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا، وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے، مری بیکسی کی شرم

وہ حلقہ ہائے زلف، کمیں میں ہیں، اے خدا
رکھ لیجو میرے دعوئ وارستگی کی شرم

۱۔ شرح: خواجہ حالی فرماتے ہیں:

"پردیس میں مرنا، جو ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے، اس پر خدا کا شکر اس لیے کرتا ہے کہ اگر وہاں بے گور و کفن پڑے رہے تو کچھ مضایقہ نہیں، کیونکہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ کون تھا اور کس رتبے کا آدمی تھا، لیکن وطن میں مرنا، جہاں ایک زمانہ واقف حال ہو اور خبردار و غمخوار ایک بھی نہ ہو، وہاں مردے کی اس طرح مٹی خراب ہونی سخت رسوائی اور ذلت کا باعث ہے۔ پس خدا کا شکر ہے کہ اس نے پردیس میں مار کر میری بیکسی کی شرم رکھ لی۔ اس میں گو بظاہر خدا کا شکر ہے، مگر فی الحقیقت سراسر اہل وطن کی شکایت ہے، جس کو ایک خاص پیرایے میں ظاہر کیا۔

اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ شعر کا نمایاں پہلو بیکسی کی شرم رکھ لینے پر

خدا کا شکر نہیں، نمایاں پہلو یہی ہے کہ اہلِ وطن میری حقیقی حیثیت سے ناآشنا رہے
انھیں کچھ خیال نہ آیا کہ میں کس قدر و منزلت کا مستحق تھا۔ اس ناقدری اور کس مپرسی
کی حالت میں یہی بہتر ہوا کہ مجھے اہلِ وطن سے بہت دور ایک اجنبی ملک میں موت
آئی۔ اس طرح میرے رحیم و کریم خدا نے میری بیکسی کی شرم رکھ لی۔

مرزا نے اس سے ملتے جلتے شعر بھی کہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں
اہلِ وطن کی ناقدری کا بہت گہرا احساس تھا!

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

نیز:

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب!
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں؟

۲۔ لغات۔ کمیں: گھات۔
وارستگی: آزادی۔

شرح: اے خدا! محبوب کی زلف کے حلقے گھات میں بیٹھے ہیں اور مجھے
پھانس لینے کے درپے ہیں۔ میں آزادی کا مدعی ہوں۔ اب اس دعوے کی شرم
رکھ لینا تیرے ہی ہاتھ ہے۔

شعر کا مقصود یہ ہے کہ محبوب کے حلقہ ہائے گرفت سے بچنے کی کوئی امید نہیں۔
اب بیچارگی کی حالت میں اپنے دعوائے آزادی کی شرم محفوظ رکھنے کے لیے کوشاں
ہیں۔

○

لوں دام بختِ خفتہ سے ایک خوابِ خوش و
غالب! یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

۱۔ لغات: دام: قرض۔ اُدھار
خوابِ خوش: بے فکری

کی نیند۔ گہری نیند، جس میں خلل کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔

شرح : میرا نصیبا گہری نیند سو رہا ہے اور میری حالت یہ ہے کہ نیند آتی ہی نہیں۔ کبھی خیال آتا ہے کہ نصیبے ہی سے ایک آدھ نیند ادھار مانگ لوں، لیکن اے غالب! خوف یہ ہے کہ یہ قرض ادا کہاں سے کروں گا؟

شعر کا مقصد صرف یہ ہے کہ بدنصیبی کا اظہار کیا جائے، جو انتہا پر پہنچی ہوئی ہے اور نصیبے کا اس طرح سو جانا یقیناً انتہائی بدنصیبی ہے۔

○

وہ فراق اور وہ وصال کہاں؟ — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں؟

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے — ذوقِ نظارۂ جمال کہاں؟

دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا — شورِ سودائے خطّ و خال کہاں؟

تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے — اب وہ رعنائیِ خیال کہاں؟

ایسا آساں نہیں لہو رونا! — دل میں طاقت، جگر میں حال کہاں؟

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق — واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں؟

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں — میں کہاں اور یہ وبال کہاں؟

مضمحل ہو گئے قویٰ، غالب! — وہ عناصر میں اعتدال کہاں؟

یہ پوری غزل اس گزرے ہوئے زمانہ کی یاد میں کہی گئی ہے، جب عشق اپنے رنگ میں تھا اور پوری غزل مسلسل چلی جا رہی ہے۔

۱۔ **شرح** : وہ سے اشارہ اسی گزرے ہوئے زمانہ کی طرف ہے جس

کی یاد اس غزل میں تازہ کی گئی ہے۔

وہ دور اب کہاں جب فراق کو فراق اور وصال کو وصال سمجھتا تھا؟ یعنی جب عشق کا زور تھا، محبوب سے جدائی تڑپاتی تھی اور اس کا وصال آرزوؤں اور تمناؤں کے لیے روز عید تھا۔ وہ راتیں، وہ دن، وہ مہینے اور وہ سال اب کہاں ہیں؟ سب رخصت ہو گئے۔

۲۔ شرح : اب یہ حالت ہے کہ شوق کے کاروبار اور اس میں مشغولیت کے لیے فرصت ہی نہیں رہی۔ محبوب کے جمال سے لذت اندوز ہونے کا ذوق ہی باقی نہیں رہا۔

۳۔ شرح : دل کا تو ذکر ہی کیا، پہلے جیسا دماغ بھی باقی نہیں رہا۔ حسن کے خط و خال دیکھ کر جو بیخودی اور دیوانگی طاری ہوتی تھی، وہ اب کہاں باقی ہے؟

۴۔ شرح : جب عشق زوروں پر تھا تو خیالات میں رنگینی، رعنائی اور شوخی نمایاں تھی۔ اب وہ حالت کہاں؟ یہ کیفیت صرف ایک شخص کے تصور پر موقوف تھی۔

مولانا طباطبائی نے صحیح فرمایا ہے کہ اس شعر میں "اک شخص" کا لفظ بہت بلیغ ہے۔ اگر اس کی جگہ "اک شوخ" کہا ہوتا تو یقیناً محبوب کی تعریف نکلتی، لیکن ساتھ ہی ظاہر ہوتا کہ ابھی تک ذوق و شوق باقی ہے، لیکن یہ مقتضائے مقام کے خلاف ہوتا، کیونکہ یہاں ذوق و شوق کی نفی منظور ہے اور اس کا تقاضا یہی ہے کہ لگن کی خفیف سی کیفیت بھی باقی نہ رہے۔

۵۔ شرح : لہو رونا آسان نہ سمجھا جائے، دل میں طاقت و قوت ہو اور جگر اپنے اصل حال میں ہو، یعنی اس میں خون موجزن ہو، اس وقت لہو رویا جا سکتا ہے۔ جب دل و جگر اپنی ہر چیز کھو چکے ہیں تو لہو کیونکر رویا جائے۔

اس مقام پر لفظ "آسان" نے نظیری کا ایک شعر بے اختیار یاد دلایا:

نیست آساں بر ضعیفِ آتش زدن   می نماید گرچہ از پروانہ خوش

یعنی شعلہ افروز آگ پر مردانہ وار جا گرنا سہل کام نہیں، اگرچہ پروانے کا جل مرنا دیکھنے والے کو بڑا اچھا منظر معلوم ہوتا ہے۔

۶۔ **لغات**۔ **قمار خانہ** : جوا کھیلنے کی جگہ۔

شرح : ہم سے عشق کا جوا گھر چھوٹ گیا۔ وہاں جائیں تو ہمارے پاس مال کہاں ہے، جو داؤ پر لگائیں؟ نکتہ نوازوں نے خوب کہا کہ نہ نقد دل پاس ہے نہ داغ ہیں، جو اشرفیوں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ نہ زرد چہرہ ہے، جسے زر سمجھا جائے اور نہ صبر و شکیب کی دولت ہے۔ عاشق کے لیے یہی مال و متاع ہے، جسے لے کر وہ عشق کے قمار خانے میں بازی لگانے جاتا ہے۔

۷۔ **شرح** : اب دنیا کی پریشانیوں میں اُلجھا رہتا ہوں، حالانکہ مجھے اس وبالِ جاں مشغلے سے کوئی مناسبت نہ تھی۔

۸۔ **لغات**۔ **مضمحل** : کمزور، سُست۔ ضعیف۔

قویٰ : قوت کی جمع۔

عناصر : عنصر کی جمع یعنی وہ اجزاء، جن سے اجسام مرکب ہوتے ہیں۔

شرح : اے غالب! جسمانی قوتیں ضعیف، کمزور اور سست ہو گئیں اب اجزائے وجود میں اعتدال باقی نہ رہا۔

اجزائے وجود کا اعتدال قوتوں کے اوجِ کمال کا نام ہے۔ یہ اعتدال عموماً اہلِ شباب میں اعلیٰ پیمانے پر ہوتا ہے، جب شباب گیا، بڑھاپا آیا تو قوتوں کا ضعف اور ان کا ماتم باقی رہ گیا۔

○

کی وفا ہم سے، تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

شرح : محبوب نے ہم سے وفا کا آغاز کیا تو غیروں اور رقیبوں نے وفا کو جفا کا نام دے دیا۔ ان کا مقصد

آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھیے، کیا کہتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو، اندوہ رُبا کہتے ہیں
دل میں آ جائے ہے، ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں
ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں
پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے
خارِ رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں
اک شرر دل میں ہے، اس سے کوئی گھبرائے گا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو، جو ہوا کہتے ہیں
دیکھیے لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اس کی ہر بات پہ ہم "نامِ خدا" کہتے ہیں
وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں، شاید
مر گیا غالبِ آشفتہ نوا، کہتے ہیں

یہ تھا کہ محبوب کے حسنِ سلوک پر نکتہ چینی کر کے اسے برگشتہ کر دیں تا کہ وہ وفا ترک کر دے۔ عاشق کو یہ اندیشہ پیدا ہوا تو اس نے کہا کہ غیروں کی نکتہ چینی کوئی بات نہیں۔ دنیا کے لوگوں کا دستور ہمیشہ سے یہی چلا آتا ہے کہ وہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں اور نیک کام کی مذمت کرتے ہیں۔

۲۔ شرح: ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ دل کی پریشانی کا حال محبوب سے جا کر کہ آئیں۔ کہنے جاتے تو ہیں، لیکن دیکھیے، کیا کہتے ہیں۔

دوسرے مصرعے کے دو مطلب ہیں:

۱۔ ہم دل کی پریشانی محبوب سے کہنے کے لیے جاتے تو ہیں، لیکن دیکھیے وہاں جا کر کچھ کہا جا سکے گا

یا محبوب کو دیکھ کر ایسی محویت طاری ہو گی کہ زبان پر کچھ آ ہی نہ سکے گا۔
میر تقی نے کہا ہے :

یہ کہتے، وہ کہتے ہم، تھا دل میں جو یار آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں، کچھ بھی نہ کہا جاتا

یعنی جب تک یار سامنے نہ تھا، دل میں یہی کہتے تھے کہ یہ بات بھی اسے سنائیں گے وہ بات بھی اسے سنائیں گے، لیکن یہ سب کہنے کی باتیں ہیں، وہ سامنے آتا تو کچھ بھی نہ کہا جاتا۔

۲۔ ہم کہنے جاتے تو ہیں، مگر دیکھیے وہ یعنی محبوب سُن کر کیا کہتا ہے۔

۳۔ **لغات** ۔ اندوہ رُبا : غم دُور کرنے والا۔

شرح : جو لوگ کہتے ہیں کہ شراب اور گانے سے غم دُور ہو جاتا ہے، وہ پرانے زمانے کے بھولے بھالے اور سادہ لوح لوگ ہیں۔ جنھیں اصل حقیقت سے آگاہی نہیں۔ انھیں کچھ کہنے یا سمجھانے کا کیا فائدہ ہے؟ وہ اصل حقیقت کا اندازہ کر ہی نہیں سکتے۔

مطلب یہ ہے کہ شراب اور راگ رنگ غم عشق کو زائل نہیں کر سکتے اور دل کی لگی نہیں بجھا سکتے، بلکہ ان سے غم اور بڑھتا ہے۔

۴۔ **لغات** ۔ نالۂ رسا : ایسی فریاد و فغاں جو مقصد پر پہنچ جائے، یعنی جس میں تاثیر ہو۔

شرح : میں آہ و فغاں کرتا ہوں اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ آہ و فغاں بے اثر ہے، کیونکہ مقصد پر نہیں پہنچتی، لیکن یہ خیال غلط ہے۔ آہ کرتے ہی مجھ پر غشی طاری ہو جاتی ہے۔ جب وہ کیفیت دور ہوتی ہے تو پھر نالہ دل میں آ جاتا ہے۔ اب بتاؤ کہ اگر یہ نہیں تو کون سے نالے کو رسا کہا جا سکتا ہے، جس میں اثر ہو اور جو مقصود کو پہنچ جائے۔ عاشق محبوب کے طریق سلوک سے اتنا مایوس ہو چکا ہے کہ ہوش آتے ہی نالے کا دل میں آ جانا اس کی رسائی تصور کیے بیٹھا ہے۔

۵۔ **لغات** - اِدراک : پالینا، عقل، سمجھ۔
مسجود : جسے سجدہ کیا جائے۔
قبلہ نما : ایک آلہ، جو قبلے یعنی کعبے کا رخ بتاتا ہے، جیسے قطب نما قطب کا رخ بتاتا ہے۔ یہاں قبلہ نما سے مراد وہ مقام ہے، جو حقیقی قبلے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

شرح : ہم کعبے کی طرف سجدہ نہیں کرتے۔ ہمارا سجدہ تو اس وجودِ حقیقی کی طرف ہے، جو عقل اور سمجھ کی حدوں سے باہر ہے اور ہمارے مادی حواس اسے پا نہیں سکتے۔ جس مقام کو عام اصطلاح میں قبلہ کہا جاتا ہے، یعنی کعبہ، اس کے بارے میں تو اہلِ علم و بصیرت کا قول یہ ہے کہ وہ حقیقی قبلے کی طرف رہنمائی کرنے والا ایک مقام ہے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں، مرزا نے یہاں :

"اس مسئلے کو نظم کیا ہے کہ کعبے کی طرف سجدہ کرنے سے کعبے کو سجدہ کرنا مقصود نہیں۔ جسے ہم سجدہ کرتے ہیں، وہ جہات سے منزّہ ہے اور سجدے کے لیے جہت ضرور ہے۔ اس سبب سے جہت کعبہ کو معین کر لیا ہے۔ . . . وہ جہت بہ منزلہ قبلہ نما ہے۔"

۶۔ **لغات** : پائے افگار : زخمی پاؤں۔
مِہر گیا : ایک نباتات جس کی خاصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کی جڑ جس کے پاس ہو، لوگ اس پر مہربان ہوتے ہیں اور اس سے محبت کرتے ہیں۔

شرح : اے محبوب! میرے پاؤں تیرے راستے کے کانٹوں سے زخمی ہو گئے، انھیں لہولہان دیکھتے ہی تجھے رحم آ گیا۔ ہم نے اسی وقت سے تیرے راستے کے کانٹوں کو "مہر گیا" کہنا شروع کر دیا، کیونکہ انھیں کی وجہ سے رحم نے تیرے دل میں جوش مارا۔

۷۔ **شرح** : مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :

"یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ روحِ حیوانی جو دل میں ہے، اس کی حرارت سے گھبرا کر انسان کو سانس لینے کی ضرورت ہوتی ہے، بلکہ اصل یہ ہے کہ اُور اس کا اشتعال مطلوب ہوتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ ہوا ستّہ ضروریہ میں داخل ہے (ایسی چھ چیزیں، جن کے بغیر زندگی ممکن نہیں) تاکہ بار بار سانس لینے سے حرارت عزیزی کا اشتعال ہوتا رہے۔ اس مضمون کو مصنّف نے تو ایک تعنیۂ شعریّہ کی طرح نظم کر دیا، لیکن دورانِ خون کا مسئلہ جب سے ثابت ہوا، اس سے ظاہر ہو گیا کہ واقع میں ایسا ہی ہے۔ ہر سانس میں ہوا سے روحِ حیوانی کو اشتعال مطلوب ہے اور جو ہوا نکلتی ہے، بعینہٖ ویسی ہے، جیسی ہوا چراغ کی لَو سے پیدا ہوتی ہے۔ اس شعر سے مصنّف کے فلسفیانہ مذاق کا اندازہ ہوتا ہے۔"

ہمارے دل میں عشق یا زندگی کی جو چنگاری ہے، اس سے ہم کیا گھبرائیں گے، ہم ہوا کے نہیں، آگ کے خواہاں ہیں اور ہوا سے مقصود یہ ہے کہ یہ آگ کو خوب بھڑکا دے، کیونکہ ایک چنگاری سے ہمارے ذوق کی تسکین نہیں ہوتی، ہمیں تو زبردست اشتعال درکار ہے اور وہ ہوا کے بغیر ممکن نہیں۔

شعر کے فلسفیانہ پہلو پر جو روشنی مولانا طباطبائی نے ڈالی ہے، اس میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں۔

۸۔ **لغات۔** نامِ خدا : دعائیہ کلمہ یعنی ماشاء اللہ چشمِ بد دُور۔

شرح : ہم محبوب کی بات بات پر نامِ خدا، ماشاء اللہ، چشمِ بد دُور کہ رہے ہیں اور اس کا تکبّر بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ دیکھیے، یہ تکبّر، یہ غرور آخر کیا رنگ لاتا ہے اور کیا گُل کھلاتا ہے۔

۹۔ **لغات۔** وحشتؔ : سید غلام علی خاں وحشتؔ۔ دہلی کے ممتاز لوگوں میں سے تھے، والد کا نام سید فرحت اللہ خاں۔ خود وحشتؔ مولانا رشید الدین خاں مرحوم کے داماد تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں نہایت خوش بیان تھے۔ شعر کا مذاق

بہت بلند تھا۔ پہلے سرکار انگریزی میں ملازم رہے، پھر اودھ میں ذمہ دار ہو گئے۔ بعد ازآں لکھنؤ چلے گئے اور ایک معزز خدمت پر مامور ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سررشتہ تعلیم میں منسلک ہو گئے تھے۔ مصطفیٰ خاں شیفتہ کے نہایت عزیز دوست تھے۔ غالب سے بھی گہرے تعلقات تھے۔

شیفتہ : نواب مصطفیٰ خاں، اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص۔ (۱۸۰۶ء ۔ ۱۸۶۹ء) مومن کے بعد غالب سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ نہایت عزیز دوست تھے، جنھوں نے ہر موقع پر غالب کی مدد کی۔

آشفتہ نوا : جس کی نواؤں سے پریشانی ٹپکتی ہو، درد بھرے نغمے سنانے والا۔

شرح : درد بھرے نغمے سنانے والا۔ غالب دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اب شاید وحشت اور شیفتہ اس کا مرثیہ کہیں، کیونکہ وہ اس کے نہایت عزیز دوست تھے۔

○

آبرو کیا خاک اُس گُل کی کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن، جو دامن میں نہیں

ضُعف سے اے گریہ! کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اُڑ گیا، جو خوں کہ دامن میں نہیں

ہو گئے ہیں جمع، اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرّے اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم، اندھیر ہے
پنبہ نورِ صبح سے کم، جس کے روزن میں نہیں

۱۔ **لغات :**

ننگِ پیراہن : لباس کے لیے باعثِ ننگ و عار۔

شرح : اس پھول کی عزت و آبرو کیا ہو سکتی ہے، جو باغ میں نہ ہو؟ کیونکہ پھول باغ ہی میں بھلے لگتے ہیں، جہاں لوگ سیر و تفریح کے لیے جاتے ہیں۔ ان کے رنگ، خوشبو اور طراوت سے لطف اٹھاتے ہیں۔

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے، گر برق خرمن میں نہیں

زخم سلوانے سے، مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذّت زخم سوزن میں نہیں

بسکہ ہم ہیں اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گُل کے سوا، گرد اپنے مدفن میں نہیں

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسُور کا
خوں بھی، ذوقِ درد سے، فارغ مرے تن میں نہیں

لے گئی ساقی کی نخوت، قلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ، مینا کی گردن میں نہیں

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا، غالبؔ! کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف، ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

بالکل یہی کیفیت گریبان کی ہے۔ اگر وہ پھٹ کر دامن تک پہونچ جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ لباس کے باغ میں ایک پھول کھلا اور اس نے عزت آبرو کا مقام حاصل کر لیا۔ اگر وہ پھٹ کر دامن تک نہیں پہنچ سکتا تو لباس کے لیے باعث ننگ و عار بن جائےگا اور اس کی حیثیت وہی ہوگی، جو باغ سے باہر پھول کی ہوتی ہے۔ یعنی وہ ٹھکانے سے محروم ہو جاتا ہے۔

شعر میں پہلے گریبان کے پھٹ کر دامن تک آنے کو پھول کے کھلنے سے تشبیہ دی اور کوئی شبہ نہیں کہ جس لباس کو پارہ پارہ کر کے دامن تک پہنچا دیا جائے، وہ کھلے ہوئے پھول سے مشابہ ہوگا، کیونکہ اس کی پتیاں بھی کھلنے کے بعد ویسی ہی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ پھر دامن کے گھیرے کو گلشن کے برابر رکھا، جس میں چاک

گریباں کے پھول کھلے رہتے ہیں۔

۲۔ **شرح** : اے گریہ! کمزوری نے میرے بدن میں کچھ باقی نہیں چھوڑا۔ جب جسم میں طاقت تھی، میں خون بھی روتا تھا اور وہ خون آنسو بن کر بھی آنکھوں سے بہتا تھا۔ جب طاقت ہی نہ رہی تو روؤں کیونکر؟ میرے رونے میں جو خون پہلے بہا تھا اور دامن کو اس نے رنگین کر دیا تھا؛ وہ بھی رنگ بن کر اڑ گیا۔ غرض ضعف نے کچھ بھی میرے پاس نہ چھوڑا۔

۳۔ **شرح** : محبوب کے گھر کی دیواروں میں جو روشن دان ہیں، ان میں ذرے رقصاں نظر آتے ہیں۔ اصل میں یہ ذرے نہیں، بلکہ سورج نے اپنی نگاہ کے اجزا پھیلا دیے ہیں تاکہ کسی طرح محبوب کے جمال کی ایک جھلک دیکھ لے۔

جب سورج کی کرنیں دیوار کے روشن دان سے گزرتی ہیں تو روشنی میں نہایت چھوٹے چھوٹے ذرے رقص کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مرزا نے ان ذروں کو آفتاب کی نگاہ کے اجزا قرار دیا۔ آفتاب اتنی جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ نگاہ کو اصل حالت میں روزن سے گزار دے، لہذا اس نے نگاہ کا تجزیہ کیا اور ذرے بنا کر اسے روزن میں پہنچا دیا تاکہ وہ براہِ راست، دیدار کے الزام سے بری رہے۔

۴۔ **لغات**۔ پنبہ : پ پر زبر اور پیش سے دونوں طرح مستعمل ہے، معنی روئی، روئی کا چھوٹا سا گالا یا گولا، جو پرانے زمانے میں مینائے مے پر بھی رکھتے تھے اور کانوں میں رکھنا اب تک رائج ہے۔

شرح : غم کے قید خانے کی تاریکی کا حال کیا بتاؤں؟ اس بلا کا اندھیرا ہے کہ اگر اس کے روزن میں روئی کا چھوٹا سا گولا رکھ دیا جائے تو ایسا معلوم ہو کہ سپیدۂ سحر طلوع ہوا۔

جب تاریکی انتہا پر پہنچ جائے تو چھوٹی سے چھوٹی سفید شے بھی اس میں روشن و تاباں نظر آتی ہے۔

۵۔ لغات ۔ خانہ ویراں ساز : گھر برباد کر دینے والا ۔

شرح : خواجہ حالیؔ فرماتے ہیں ۔

" دنیا میں جو رونق اور چہل پہل ہے ، وہ عشق و محبت کی بدولت ہے خواہ زن و فرزند کی محبت ہو ، خواہ مال و دولت کی ، خواہ ملک و ملت کی خواہ کسی اور چیز کی ۔ پس اگر خرمن میں برق یعنی دلوں میں محبت نہیں تو اس کی مثال اس انجمن کی ہے ، جس میں شمع کی روشنی نہیں ۔"

یقیناً عشق گھر بھی برباد کرتا ہے یعنی انسان کو کسی چیز کی لگن ہو تو وہ اپنے نفع نقصان کی کوئی پروا نہیں کرتا ، لیکن یہی عشق ہے ، جس سے دنیا کے کارخانے میں رونق پیدا ہوتی ہے ، حتیٰ کہ ہر انسان عمل کی راہ میں جو بھی قدم اٹھاتا ہے ، وہ عشق و محبت ہی کے بل پر اٹھاتا ہے ۔ پھر عشق کی قسمیں ہیں اور مقاصد کی بنا پر اس کے درجے ہیں ، مگر اس کے بغیر ہستی کی کارگاہ میں رونق ہو ہی نہیں سکتی ۔ اگر عشق نہ ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ ہستی کے خرمن پر بجلی نہیں گری ۔ اگر اس خرمن پر بجلی نہ گرے تو یقین کر لینا چاہیے کہ یہ ایک ایسی محفل اور ایسی انجمن ہو گی ، جو شمع سے محروم ہو اور معلوم ہے کہ دنیا کی کوئی انجمن شمع کے بغیر جم ہی نہیں سکتی ۔

دیکھیے ، آٹھ آٹھ لفظوں کے دو مصرعے ہیں لیکن زندگی کی کتنی بڑی حقیقت انھیں لفظوں میں پیش کر دی اور لطف یہ کہ اس سلسلے میں شاعری کے تمام کمالات محفوظ رکھے ۔ ساتھ ہی ایک حقیقت کے سلسلے میں کئی حقیقتوں کی طرف اشارہ کر دیا پھر مثال بالکل انوکھی کہ اگر بجلی خرمن میں نہ ہو تو انجمن بے شمع رہ جائے گی ۔

۶۔ شرح : میں نے زخم سلوا لیے ۔ غیروں نے طعنہ دیا کہ دیکھو کہ یہ عاشق ہو کر زخموں کا علاج کرانے کے درپے ہے ، حالانکہ عشق صادق ہو تو وہ چارہ جوئی کا روادار ہو ہی نہیں سکتا ۔ لیکن غیر حقیقت کو کیا سمجھ سکتے ہیں ؟ انھیں یہ خیال ہو نہیں ہو سکتا کہ زخم سینے کے لیے سوئی سے کام لیا جاتا ہے اور خود سوئی بھی جلد چبھتی ہے ۔ میں ان زخموں کی لذت سے کیونکر محروم رہ سکتا ہوں ؟ غیر اس کے

اندازہ شناس نہیں ہو سکتے۔

دیکھیے، چارہ جوئی میں بھی لذتِ آزار کا پہلو پیدا کر لیا۔

۷۔ **شرح** : ہم ایسے محبوب پر مرمٹے ہیں، جو سراپا ناز و انداز کی بہار ہے، اس لیے ہماری لحد میں جو گرد نظر آتی ہے، یہ گرد نہیں، بلکہ پھولوں کا جلوہ ہے اور بہارِ ناز نے ذرّے ذرّے میں پھول ہی کھلا دیے۔

۸۔ **لغات**۔ **ہیولیٰ** : وہ مادّہ جو ہستی کی صورتوں کا محل سمجھا جاتا ہے مثلاً مٹی لے کر پہلے گھوڑا بنا لیا، پھر اسی مٹّی سے ایک پرندہ تیار کر لیا۔ گھوڑے اور پرندے کا ہیولیٰ وہ مٹّی ہے، جس سے یہ بنے۔

ناسور : وہ زخم جو ہمیشہ رِستا رہے اور کبھی اچھا نہ ہو۔

شرح : میرے جسم میں جو خون ہے، وہ بھی درد کی لذت میں ڈوبا ہُوا ہے اور اس لذّت سے اسے فراغت حاصل نہیں۔ دلیل یہ ہے کہ اس خون کی ایک ایک بوند ایک نئے ناسور کا ہیولیٰ ہی ہوتی ہے۔ گویا جسم کا ایک ایک قطرۂ خون ناسور بن جانے والا ہے، جو ہمیشہ رستا رہے گا اور کبھی اچھا نہ ہو گا۔

۹۔ **لغات**۔ **نخوت** : تکبّر۔ غرور۔

قلزم آشامی : سمندر پی جانا۔ یعنی پی جانے کی ہر حد توڑ دینا۔

شرح : ساقی کو اپنی بخشش و عطا پر بڑا غرور تھا، لیکن میں سمندر کے سمندر انڈیل لینے والا بادہ کش آ گیا تو ساقی کا تکبّر و غرور ختم ہو گیا۔ ثبوت یہ ہے، آج مینا کی گردن میں موجِ شراب کی کوئی رگ نظر نہیں آتی، یعنی صراحیاں شراب سے بالکل خالی نظر آتی ہیں۔

ساقی کا دعویٰ یہ تھا کہ میری شراب پینا سہل نہیں۔ غالب کی بادہ نوشی نے یہ دعویٰ باطل کر دیا۔ دوسرے مصرع میں موجِ مے کی رگ مینا کی گردن میں نہیں، اس لیے کہا کہ کسی کا غرور ٹوٹ جاتا ہے تو گردن جھک جاتی ہے اور رگِ گردن میں اکڑ باقی نہیں رہتی۔ چونکہ غالب کثرت سے شراب پی گیا، صراحیاں خالی ہو گئیں

گویا ان کی گردنیں موجِ مے کی رگ سے محروم رہ گئیں، اب وہ اکڑ نہیں سکتیں۔

۱۰۔ **لغات**۔ فشار : ہر طرف سے بھینچنا، چاروں طرف سے دباؤ۔

شرح : ضعف اور کمزوری نے مجھے چاروں طرف سے اس طرح بھینچ رکھا ہے کہ میرا قد جھک بھی نہیں سکتا جو ناتوانی کی بدیہی علامت ہے۔ اب فرماتے ہیں۔ اس فشار میں میں جھک کیونکر سکتا ہوں اور میری ناتوانی دنیا پر آشکارا کیونکر ہو سکتی ہے؟

۱۱۔ **شرح** : خواجہ حالی مرحوم فرماتے ہیں:

"اپنے تئیں خس یعنی پھونس وغیرہ سے اور وطن کو گلخن سے تشبیہ دی ہے، یعنی جس طرح پھونس گلخن میں ہوتا ہے تو جلتا ہے اور گلخن میں نہیں ہوتا تو اس کی کچھ قدر نہیں ہوتی، یہی حال میرا ہے کہ وطن میں تھا تو جلتا تھا اور اب پردیس میں ہوں تو بے قدر ہوں۔"

اے غالب! وطن میں میری کون سی شان تھی کہ غربت یعنی مسافری اور ملک غیر میں میری قدر ہو؟ میری مثال گھاس پھونس کی اس مٹھی کی ہے، جو گھر یا باغ میں ہو تو اسے اٹھا کر ایک طرف پھینک دیتے ہیں، پھر بھٹی میں جلا دیتے ہیں یعنی گھاس پھونس یا کانٹے بھٹی سے باہر ہوئے تو جب بھی حقیر سمجھے جاتے ہیں اور بھٹی میں ہوئے تو جب بھی ان کی قسمت میں جلنا اور دُکھ اٹھانا ہی ہے۔

کمال یہ ہے کہ وطن اور غربت دونوں جگہ بے قدری اور تکلیف و اذیت کے لیے مثال ایسی تلاش کی، جو سب کے سامنے ہے مگر کبھی کسی کو سوجھی نہیں۔ یہی غالب کی بالغ نظری ہے۔

آخر میں اتنا اور بتا دینا چاہیے کہ یہ مقطع خیال غربت سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ جب مرزا پنشن کے مقدمے کے لیے کلکتہ گئے تھے تو یہ غزل وہاں کے ایک مشاعرے میں پڑھی گئی تھی۔ گویا اس شعر میں جو کچھ کہا، وہ عالم غربت میں کہا۔ اس کی تصدیق اس دیوانِ غالب سے ہوتی ہے، جس کا خطی نسخہ حافظ شیرانی مرحوم

نے فراہم کیا تھا اور اب وہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔ دیوان کے حاشیے پر لکھا ہے کہ یہ غزل باندہ میں کہی گئی۔

○

عہدے سے مدحِ ناز کے، باہر نہ آ سکا
گر اک ادا ہو تو اسے اپنی قضا کہوں

حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بہ سوئے دِل
ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تُو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

ظالم! مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے، ہے! خدا نہ کردہ، تجھے بیوفا کہوں!

۱۔ شرح : میں نازو اندازِ محبوب کی ستائش سے عہدہ برآ نہ ہو سکا۔ اگر اس کی ادا ایک ہوتی تو میں کہہ سکتا تھا کہ میرے لیے قضا کا حکم رکھتی ہے، لیکن یہاں تو خدا جانے کتنی ادائیں ہیں؟ اب میں ایک ایک کے بارے میں کیا کہوں؟ بس یہ سمجھ لیجیے کہ اس نازو انداز اور غمزہ و ادا کی مدح کے لیے مجھ میں طاقت ہی نہیں۔

۲۔ لغات۔ نگہِ سُرمہ سا : سرگیں آنکھ کی نظر، سرمہ آلود نگاہ۔

شرح : میرے محبوب کی زلف میں جو گرہیں نظر آتی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ گرہیں نہیں، بلکہ کھُلی ہوئی آنکھوں کے حلقے ہیں، جن کا رخ دل کی طرف ہے۔ ان آنکھوں میں زلف کے ہر تار کو ایسی نگاہ کی حیثیت حاصل ہے، جو سرگیں آنکھ سے نکل رہی ہو۔

۳۔ لغات۔ نہ شنیدن : نہ سننا۔

شرح : میرے دل سے لاکھوں آہیں اٹھ رہی ہیں، جو جگر کو چیر پھاڑ کر

ٹکڑے ٹکڑے کر سکتی ہیں۔ اے محبوب! تیری حالت یہ ہے کہ تو ایک بھی آہ سننے کے لیے تیار نہیں اور ضد پر اڑا بیٹھا ہے۔ ایسے حالات میں میرے لیے کچھ کہنے کی کیا گنجائش ہے؟

۴۔ لغات۔ منفعل : شرمندہ۔ منفعل نہ چاہ۔ دراصل "منفعل مخواہ" کا اردو ترجمہ ہے اور یہ شعر یقیناً اسی دور کے ہیں، جب مرزا پر فارسیت غالب تھی۔

خدا نہ کردہ : خدا نہ کرے۔

شرح : اے ظالم محبوب! میرا گمان تو تجھے بے وفا سمجھا بیٹھا تھا، لیکن میں نے تیرے حق میں ایسا خیال گوارا نہ کیا۔ اب خدا کے لیے مجھے میرے گمان سے تو شرمندہ نہ ہونے دے کہ میں بے بس ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاؤں، تو واقعی بے وفا ہے۔

اس شعر کی لفظی اور معنوی خوبیاں بیان کرنا مشکل ہے۔ مثلاً محبوب کو ظالم کہہ کر خطاب کیا، گویا ایک لفظ میں بتا دیا کہ وہ برابر ظلم کر رہا ہے اور وفا کا اسے کچھ خیال نہیں۔ پھر فرمایا کہ گمان پہلے ہی یہی کہہ رہا تھا لیکن میں گمان کی بات ماننے کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔ پھر فرمایا کہ اب میں شرمندگی سے دوچار ہو رہا ہوں، کیونکہ گمان سچا نکلا اور میں جھوٹا ثابت ہوا۔ اس حالت میں دہائی دیتے ہیں کہ کچھ سوچ، کچھ خیال کر، ہے ہے! خدا نہ کرے میں تجھے بیوفا کہوں!

○

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے، چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں
ضعف میں طعنۂ اغیار کا شِکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

۱۔ شرح : اے محبوب! تو نے سختی کی، میں دل برداشتہ ہو کر الگ بیٹھ گیا۔ کیا تو نے یہ سمجھ لیا کہ میں دوبارہ تیرے پاس نہیں آسکتا؟ یہ بالکل غلط ہے۔ فدا مہربانی

فرمائیے اور مجھے بلا لیجیے۔ بیشک گزرا ہوا وقت دوبارہ نہیں آسکتا، لیکن کیا میں گزرا ہوا وقت ہوں کہ دوبارہ آ بھی نہ سکوں؟

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو، ستمگر! ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

۲۔ شرح: بیشک مجھ پر انتہائی ضعف طاری ہے اور غیر طعنے دے رہے ہیں۔ ان طعنوں کی کیا شکایت کروں؟ طعنے محض باتیں ہیں، پھر کیا باتیں کوئی سر ہیں کہ اٹھا بھی نہ سکوں؟

مطلب یہ کہ غیروں کے طعنے اٹھا سکتا ہوں یعنی برداشت کر سکتا ہوں، البتہ مجھ میں ضعف کے باعث سر اٹھانے کی تاب نہیں۔

۳۔ لغات۔ ملنے کی قسم کھا لینا: ملنے سے انکار کر دینا۔

شرح: خواجہ حالیؔ فرماتے ہیں۔

"جب کہا جاتا ہے کہ اس کو فلاں کام کرنے کی قسم ہے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اس کو اس کام کے کرنے سے انکار ہے۔ پس عاشق معشوق کے ملنے کی قسم کیونکر کھا سکتا ہے؟ کہتا ہے کہ زہر کچھ تیرے ملنے کی قسم نہیں کہ اس کو کھا نہ سکوں۔ چونکہ وہ ملتا نہیں، اس لیے نہیں کھا سکتا۔"

اے ظالم! مجھے زہر ملتا ہی کہاں ہے؟ ورنہ کیا وہ تیرے ملنے کی قسم ہے، جو کھا بھی نہ سکوں؟

ان تینوں شعروں میں افعال ایسے لائے، جن کے دو معنی ہیں، ایک حقیقی دوسرے مجازی یعنی ایک از روئے لغت، دوسرے از روئے محاورہ۔ مثلاً آنا وقت کا بھی ہو سکتا ہے اور اپنا بھی اٹھانا بات کا بھی ہو سکتا ہے اور سر کا بھی، کھانا زہر کا بھی ہو سکتا ہے اور محبوب سے ملنے کی قسم کا بھی۔ اس قسم کے اشعار اساتذہ کے دیوانوں میں شاذ ہی ملتے ہیں۔

ہم سے کھُل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی، ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے، رکھ کر عذرِ مستی، ایک دن

غرّۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی، ایک دن

قرض کی پیتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی، ایک دن

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل! غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی، ایک دن

دھول دھپّا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے، غالبؔ! پیش دستی، ایک دن

۱۔ لغات۔ کھُل جاؤ: بے تکلّف ہو جاؤ۔
مے پرستی: شراب نوشی۔
شرح: اے محبوب! کسی روز شراب نوشی کے وقت ہمارے ساتھ بیٹھ کر بے تکلّف ہو جاؤ، ورنہ ہم مستی اور مدہوشی کا بہانہ بنا کر تمھیں چھیڑنے لگیں گے اس طرح چھیڑ کر وہ ہی کیفیت پیدا کریں گے، جو بے تکلّفی میں ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اگر کچھ کہوگے یا اعتراض کروگے تو ہم کہ دیں گے کہ بھائی! شراب پی لی تھی، ہوش و حواس قائم نہیں تھے۔ ارادے کی باگ ڈور بے اختیاری کے حوالے ہو گئی تھی۔ اگر کوئی ایسی ویسی حرکت سرزد ہو گئی تو سمجھ لو کہ بلا ارادہ ہو گئی اور مستی میں انسان کو اپنے آپ پر قابو نہیں رہ سکتا۔

۲۔ لغات: غرّہ: غرور، گھمنڈ، ناز، فخر۔
بنا: بنیاد۔
عالمِ امکان: ممکنات کی دنیا یعنی یہ کائنات، جو بہرحال فنا ہو جائے گی۔ دنیا۔
شرح: اس دنیا کی بنیاد کے بلند ہونے پر غرور ہرگز زیبا نہیں، کیونکہ

اس بلندی کی قسمت میں ایک دن پستی لکھی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن یہ کائنات تہس نہس ہو جائے گی۔ اس کی بلند عمارتیں، عالیشان قصر، وسیع اور فرحت افزا باغ، غرض جو کچھ اس میں غرور کا باعث ہو سکتا ہے، وہ سب مٹ جائے گا۔ پھر اس پر فخر و ناز کی کون سی وجہ ہے؟

۳۔ لغات۔ فاقہ مستی: اس کے دو معنی ہیں، اوّل فاقہ و تنگدستی میں بھی مست رہنا اور تنگی کو محسوس نہ کرنا، دوم تنگدستی کے باوجود قرض لے کر شراب پینا اور مست رہنا۔

شرح: ہم قرض کی شراب پیتے تھے، لیکن اس حقیقت سے خوب آگاہ تھے کہ یہ ہماری فاقہ مستی ایک دن لازماً رنگ لائے گی اور ضرور گل کھلائے گی۔

ایک قصّہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ مرزا غالب پر قرض کے سلسلے میں دعویٰ دائر ہوا۔ مقدّمہ مفتی صدر الدین آزردہ نے سنا، جو صدر الصّدور تھے۔ مرزا کے بیان کی باری آئی تو یہی شعر پڑھ دیا۔ صدر الصدور شعر سُن کر مسکرائے۔ ڈگری غالب کے خلاف کر دی اور قرض کا روپیہ اپنی جیب سے دے دیا۔

اس قصّے کے سلسلے میں یہ تصریح کر دینی چاہیے کہ اگر ایسا ہوا تو کوئی چھوٹے سے قرض کا مقدّمہ ہوگا، کیونکہ مرزا پر قرض کی جو بڑی رقمیں واجب تھیں، وہ انھوں نے خود ہی ادا کیں۔

۴۔ شرح: اے دل! اگر مسرّت و شادمانی کے نغمے سننا ہمارے مقدر میں نہیں تو غم ہی کے نغموں کو غنیمت سمجھو، کیونکہ آخر ہستی کا یہ ساز ایک دن بے آواز رہ جائے گا اور اس سے مسرّت و شادمانی ہی نہیں، غم کے نغمے بھی نکلنے بند ہو جائیں گے۔

بلا شبہ ایک زمانے کے بعد نہ راحت باقی رہے گی، نہ رنج، نہ زندگی کے سازسے نشاط کے نغمے بلند ہوں گے، نہ درد کے۔ اگر ایک چیز نہیں ملتی، تو

دوسری ہی سہی۔

دوسری جگہ مرزا نے اس سے ملتا جلتا شعر کہا ہے۔

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

لیکن واضح ہو کہ زیرِ غور شعر میں نوحہ ہائے غم نہیں، نغمہ ہائے غم ہی کہا یعنی دونوں اصلاً نغمے ہیں۔ ایک مسرت پیدا کرتا ہے، دوسرا غم۔ پھر یہاں گھر کی رونق پیشِ نظر نہ تھی، بلکہ سازِ ہستی کا بے صدا ہو جانا پیشِ نظر تھا۔ لہٰذا جو کچھ بھی نصیب ہو، اسی کو غنیمت سمجھنا ضروری ہو گیا۔

۵۔ **شرح** : اے غالب! میرے سراپا ناز محبوب کا طریقہ تو یہ نہیں کہ دھول دھپے سے کام لے اور زدوکوب تک نوبت پہنچائے، مصیبت یہ پیش آئی کہ ہمیں سے ایک روز دست درازی میں پہل ہو گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہُوا، اب اُسے برداشت ہی کرنا ہو گا، شکوہ شکایت سے کچھ نہیں بن سکتا۔

○

ہم پر، جفا سے، ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے، وگرنہ مراد امتحاں نہیں

کس منہ سے شکر کیجیے، اس لطفِ خاص کا
پُرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستم عزیز، ستم گر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے، اگر مہرباں نہیں

۱۔ **شرح** : محبوب ہم پر جفا کر رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے ہمارے سچے عشق پر پورا بھروسا ہے اور خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ ہم کسی صورت میں وفا چھوڑ دیں گے اور اس سے رشتہ توڑ لیں گے۔ اسی یقین نے اسے بے پروا بنا

بوسہ نہیں، نہ دیجیے، دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم، گر دہاں نہیں

ہر چند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے
ہر چند پشت گرمیِ تاب و تواں نہیں

جاں، مطربِ ترانۂ ھَلْ مِنْ مَّزِیْدْ ہے
لب، پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

خنجر سے چیر سینہ، اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھُری چبھو، مژہ گر خوں چکاں نہیں

ہے ننگِ سینہ دل، اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نَفَس، اگر آذر فشاں نہیں

نقصاں نہیں، جنوں میں، بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے، بیاباں گراں نہیں

کہتے ہو: کیا لکھا ہے تِری سرنوشت میں؟
گویا جبیں پہ سجدۂ بُت کا نشاں نہیں

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
رُوح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

دیا ہے۔ جفا کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہمارا امتحان مقصود ہے، یعنی محبوب یہ بھی نہیں چاہتا کہ ہمارے عشق کے خلوص کی آزمائش کرلے۔ جب دونوں چیزیں ختم ہو گئیں، یعنی نہ ہم پر ترکِ وفا کا گمان ہے اور نہ امتحان مقصود ہے تو ظاہر ہے کہ جو بھی جفا وہ کر رہا ہے وہ محض ایک چھیڑ ہے، ایک محبوبانہ ادا ہے اور یہ بھی منجملہ ان چیزوں کے ہے، جن پر ہم فریفتہ و فدا ہیں۔

۲۔ لغات:

پائے سخن درمیاں نہیں: بات کا پاؤں درمیان نہیں یعنی بات کوئی نہیں کی، منہ سے کچھ نہیں کہا۔

شرح: محبوب کے اس خاص لطف و نوازش کا شکر ادا کرنے کے لیے مُنہ کہاں سے لاؤں؟ مجھ میں

جاں ہے بہائے بوسہ، دے کیوں کہے، ابھی
غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

اداے شکر کی مجال اور ہمت کہاں ہے ؟ لطف و نوازش یہ کہ اشاروں اور اداؤں سے حال پوچھ رہے ہیں، لیکن مجھ سے کچھ نہیں کہا، بات کوئی نہیں۔

"لطفِ خاص" اس لیے کہا کہ حال پوچھنے کا یہ طریقہ محبوب نے صرف شاعر کے لیے مخصوص رکھا، اوروں کے تعلق میں اس سے کام نہیں لیا۔

۳۔ شرح ۔ ہم اپنی ایذا دوستی کے باعث محبوب کے جور و ستم کو پسند کرتے ہیں۔ اس کے برعکس محبوب ہمیں عزیز رکھتا ہے اور جور و ستم اس پیمانے پر نہیں کرتا کہ ہمارا وجود ہی ختم ہو جائے، اس لیے ظاہر ہے کہ اگر وہ ہم پہ مہربان نہیں تو نامہربان بھی نہیں۔

شعر بہت سہل اور واضح ہے۔ مثالیں بھی مل جائیں گی کہ شاعروں نے لفظوں کے الٹ پھیر سے بڑے اچھے شعر کہہ لیے، لیکن ایسے شعر کی مثالیں بہت کم نظر آئیں گی کہ صرف دو لفظوں پر پورا مضمون قائم ہے، یعنی "ستم" اور "مہربان"۔ زیادہ سے زیادہ ایک لفظ "عزیز" اور شامل کر لیجیے۔ جو حقیقۃً بنائے شعر نہیں، بلکہ مضمون شعر کا لازمہ ہے۔

۴۔ شرح : دہن کی تنگی لوازمِ حسن میں سے ہے، مگر شاعروں نے مبالغہ کرتے کرتے محبوب کے دہن کو ایک نقطۂ موہوم بنا دیا، بلکہ معدومیت تک پہنچا دیا۔ مرزا نے بھی اس شعر میں شاعروں کے اسی تصور سے کام لیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اے محبوب! بوسہ نہ دینے کا بہانہ تو یہ ہو گیا کہ ہمارا مُنہ ہے نہیں جو بوسہ دیں۔ لیکن بوسہ نہیں دیتے تو گالی ہی دیجیے، کیونکہ آپ کا منہ معدوم ہے تو زبان تو موجود ہے، اس سے تو کام لیا جا سکتا ہے۔

۵ - ۶ - لغات ۔ **پشت گرمی** : یاوری، مدد، تقویت۔ سہارا۔ ساتھ۔
مطرب : گانے والا۔

بل من مزید : قرآن مجید کی ایک آیت کا ٹکڑا، جس کے معنی ہیں : کیا کچھ اور بھی ہے ؟ یہ ٹکڑا سورۂ ق سے ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

یوم نقول لجہنم ھل امتلئت — جس دن ہم دوزخ سے کہیں گے کہ
وتقول ھل من مزید — کیا تو بھر گئی ؟ اور وہ کہے گی : کیا کچھ اور بھی ہے ؟[1]

پردہ سنج : ساز کے پردے سے کام لینے والا یعنی نغمہ زن، نواگر۔

الاماں : پناہ۔ رحم۔

شرح : اگرچہ محبوب کا غضب اور غصہ جان گھلاتے جا رہا ہے۔ اگرچہ طاقت وقوت ساتھ دینے اور سہارا مہیا کرنے کے لیے تیار نہیں، پھر بھی جان بل من مزید کا ترانہ گا رہی ہے یعنی چاہتی ہے کہ غضب اور غصہ اور زیادہ ہو اور مجھے مزید شدت سے ان کا تختۂ مشق بنایا جائے۔ ساتھ ہی لب کی یہ حالت ہے کہ اس پر پناہ یا رحم کا زمزمہ کبھی نہیں آیا۔

مطلب یہ کہ جان گھلی جا رہی ہے، جسم کی طاقت جواب دے چکی ہے، لیکن عشق مزید قہر وعتاب کا طلب گار ہے۔ لب شدت اور سختی سے پناہ مانگنے کے لیے تیار نہیں۔

۷۔ لغات ۔ دونیم ۔ دو ٹکڑے۔

شرح : اگر تیرا دل عشق ومحبت میں دو ٹکڑے نہ ہُوا ہو تو تجھے چاہیے کہ خنجر سے سینہ چیرے۔ اگر پلکوں سے خون نہیں ٹپکتا تو ضروری ہے کہ دل میں چھری چبھودے۔

دل اسی طرح پارہ پارہ ہو سکتا ہے کہ سینہ خنجر سے چیر لیا جائے اور آنکھوں

---

[1] اُردو میں جہنم اور دوزخ مذکر استعمال ہوتے ہیں، عربی میں جہنم مؤنث ہے، لہٰذا ترجمے میں قرآن مجید ہی کی پیروی کی گئی۔

سے لہو اسی وقت ٹپکے گا، جب چھری چبھونے سے دل خون ہو جانے گا، لیکن مرزا غالب کا مطلب یہ نہیں کہ واقعۃً ایسا کیا جائے، مطلب صرف یہ ہے کہ دل کو بہر حال دو پارہ اور پلکوں کو بہر حال خونچکاں ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہو تو سینہ اس قابل ہے کہ اسے خنجر سے چیر دیا جائے اور دل اس لائق ہے کہ اس میں چھری چبھو دی جائے یہ حقیقت اگلے شعر سے بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

۸۔ **لغات**۔ آتشکدے: آتش کا گھر۔ آتش پرستوں کا عبادت خانہ، جہاں ہر وقت آگ جلتی رہتی ہے۔

آذرفشاں: آگ جلانے اور برسانے والا۔

شرح: جو دل آتش عشق سے سراپا آتش کدہ بن جائے، وہ سینے کے لیے باعث ننگ ہے اور جو سانس آگ نہ اُگلے، وہ دل کے لیے عار اور شرم کا موجب ہے۔

۹۔ **شرح**: دیوانگی کی حالت میں گھر خراب ہوتا ہے تو ہونے دو، میں بیابان کے چکر لگاؤں گا تو گھر کی دیکھ بھال کرنے والا کون ہوگا؟ اس حالت میں وہ اجڑتا ہے تو اجڑ جائے۔ اس میں میرا کیا نقصان ہے؟ گھر کی زمین زیادہ سے زیادہ سو گز ہو گی۔ اس کے بدلے میں مجھے بیابان ملتا ہے، جس کی وسعت اور پہنائی کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

ظاہر ہے کہ مرزا نے گھر اور بیابان کا موازنہ کرتے وقت صرف رقبہ ہی پیش نظر رکھا اور اندازِ بیان ایسا اختیار کیا کہ پڑھنے والے کو کسی دوسری چیز کا احساس ہی نہیں ہو سکتا۔ یہی شاعر کا کمال ہے، ورنہ گھر اور بیابان کے موازنے کی یہ کوئی اچھی صورت قطعاً نہیں۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ اگر ویرانی میں دونوں یکساں ہوں تو ترجیح کا فیصلہ وسعت رقبہ ہی کی بناء پر کیا جائے گا۔

۱۰۔ **لغات**۔ سرنوشت: تقدیر، قسمت، خط پیشانی یعنی پیش آنے والے حالات کی غیبی تحریر۔ مقدر۔

شرح : اے محبوب! تم پوچھتے ہو کہ تیری قسمت میں کیا کچھ لکھا ہے؟ مقامِ حیرت ہے کہ تمھیں میری پیشانی پر بُت کے سجدے کا نشان نظر نہیں آیا! اپنے محبوب کو سجدے کرتے کرتے میرے ماتھے پر تو گٹا پڑ گیا اور پوچھتے ہو کہ تیرے خطِ پیشانی میں کیا کچھ لکھا ہے؟ حالانکہ ماتھے کا نشان خود میرا خطِ پیشانی اور میری تقدیر واضح کر رہا ہے اور اسی پہ مجھے ناز ہے۔

۱۱۔ **لغات** ۔ روح القدس : حضرت جبریلؑ۔

شرح : اگرچہ جبریلؑ میرا ہم زبان نہیں، یعنی جو زبان مجھے ملی ہے وہ اسے نہیں ملی، لیکن اس سے اپنے کلام کی کچھ داد پاتا ہوں، یعنی وہ پورا تو نہیں کچھ کچھ میرا کلام سمجھتا ہے۔

مطلب یہ کہ میرے شعر سراسر الہامی ہیں، مگر ہندوستان کی وسیع سرزمین میں ان کے سمجھنے اور داد دینے والے کہاں ملتے ہیں، صرف روح الامینؑ سے کچھ داد پاتا ہوں۔

خواجہ حالؔی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ہمزبان کے لفظ میں ایہام ہے۔ ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ انسان اور فرشتے کی زبان ایک نہیں ہو سکتی، در پردہ اس میں یہ اشارہ ہے کہ جیسی فصیح میری زبان ہے، ویسی روح القدس کی نہیں۔

۱۲۔ **لغات** ۔ بہا : قیمت، معاوضہ۔

شرح : بیشک محبوب نے بوسے کی قیمت جان رکھ دی ہے، یعنی بوسے کے عوض میں وہ جان طلب کرتا ہے، لیکن ابھی اس کے اعلان کے لیے تیار نہیں اور کیوں اعلان کرے، جب جانتا ہے کہ ابھی غالبؔ نیم جاں نہیں ہوا۔

حاصل یہ ہے کہ جب پوری جان بوسے کی قیمت ٹھہری تو غالبؔ فوراً ادا کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا، حالانکہ محبوب کی مرضی یہ نہیں، چنانچہ وہ انتظار میں بیٹھا ہے کہ غالبؔ عشق کی سختیاں سہ سہ کر نیم جاں ہو جائے۔ اس وقت پکار کر کہہ دے گا کہ اب جان دے کر بوسہ لیا جا سکتا ہے اور غالبؔ نیم جانی کے باعث

نہ مقررہ قیمت ادا کر سکے گا اور نہ بوسے کا حق دار بنے گا۔

○

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں، زنجیر نہیں

شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہِ وفا، جز دمِ شمشیر نہیں

رنجِ نومیدیِ جاوید! گوارا رہیو
خوش ہوں، گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

سر کھجاتا ہے، جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے
لذتِ سنگ، بہ اندازۂ تقریر نہیں

جب کرم رخصتِ بے باکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بہ قولِ ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے، جو معتقدِ میرؔ نہیں

۱۔ **لغات۔ دشت نوردی:** بیابان کی خاک چھاننا، جنگل جنگل پھرنا، صحرا گردی۔
چکر: پھرنے کی لت، گردش کا عادتِ ثانیہ بن جانا۔

شرح: مجھے کوئی تدبیر صحرا و بیاباں کی خاک چھاننے سے روکنے والی نہیں۔ دیوانے کو زنجیریں اس لیے پہنائی جاتی ہیں کہ وہ جا بجا پھر نہ سکے۔ گویا یہ ایک تدبیر ہوتی ہے، جو اسے صحرا گردی سے روک دیتی ہے، لیکن جس شخص کے پاؤں کی زنجیر خود ایک چکر بن جائے، اسے زنجیر یا ایسی ہی کوئی دوسری تدبیر کیونکر روک سکتی ہے؟
جو شخص ہر وقت پھرتا ہے، اس کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کے پاؤں میں چکر ہے۔ جس شخص کے پاؤں میں زنجیر چکر بن جائے یعنی گردش سے روکنے والی چیز

خود گردش بن جائے، اسے کون روک سکتا ہے؟

۲۔ **شرح** : عشق مجھے اس صحرا میں دوڑا رہا ہے، جہاں کوئی راستہ ہے تو صرف ایک اور وہ تصویر کی آنکھ کی نگاہ ہے، گویا بالکل موہوم ہے۔

بجنوری مرحوم اس شعر پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"دشتِ وفا میں عشق کی تگ و دو کا انجام موت ہے۔ اس بحرِ سراب کا کوئی ساحل نہیں، کوئی جادہ نہیں، جس سے مسافر جان سلامت لے جا سکے۔ راہ عدم کو مرزا کمالِ شاعری سے یوں بیان کرتے ہیں کہ صرف ایک راستہ ہے اور وہ نگہِ دیدۂ تصویر ہے، یعنی کوئی راستہ نہیں۔ عدم کو وجود کے لباس میں کیا خوب جلوہ گر کیا۔"

۳۔ **شرح** : خواجہ حالیؔ فرماتے ہیں:

"جادہ یعنی بٹیا (پگڈنڈی) کو دمِ شمشیر سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ عشق کے آزار و تکلیف میں جو لذت ہے۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس لذت سے خوب دل کھول کر متمتع ہوں، مگر چونکہ وفا کی راہ سراسر تلوار کی دھار پر ہے، اس لیے پہلے ہی قدم پر موت نظر آتی ہے۔ پس افسوس ہے کہ لذتِ آزار کی حسرت دل کی دل ہی میں رہی جاتی ہے۔"

تلوار کی دھار پر جو بھی قدم رکھے گا، وہ یقیناً کٹ مرے گا اور وفا کا راستہ تلوار کی دھار کے سوا کوئی ہے بھی نہیں، اس لیے ظاہر ہے کہ عاشق دکھ اٹھانے اور ایذا سہنے کی جس لذت کے رسیا ہیں، تلوار کی دھار پر چلنے سے وہ پوری ہوتی نظر نہیں آتی، لہٰذا صورتِ حال یہ ہے کہ نہ وفا کو چھوڑ سکتے ہیں نہ دمِ شمشیر پر چلنے میں متامل ہو سکتے ہیں، نہ دکھ کی لذت بہ قدرِ ذوق حاصل کر سکتے ہیں اس لذت کی حسرت دل ہی میں رہی جاتی ہے۔

۴۔ **لغات** ۔ زبونی : بے بسی، لاچاری، ذلت، عاجزی، زبونی کش

کے معنی ہیں ذلت اٹھانے والا۔

شرح : اے ہمیشہ کی مایوسی اور نامرادی کے رنج! مجھے تو ہی خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ خدا کرے تو ہی مجھے نصیب رہے۔ میں اس بات پر خوش ہوں کہ میری آہ و فغاں نے تاثیر کی ذلت نہ اٹھائی۔

ہمیشہ کی مایوسی کا رنج گوارا کر لیا، مگر تاثیر کا احسان نہ اٹھایا۔

۵۔ لغات۔ بہ اندازۂ تقریر : وہ بات جو تقریر میں نہ سما سکے۔ جس کی حقیقت کا اظہار لفظوں سے متجاوز ہو، یعنی لفظوں میں بیان نہ کیا جا سکے۔

شرح : سر کا زخم اچھا ہو جاتا ہے تو سر کھجانے لگتا ہے، یعنی اسے پھر یہی آرزو پیدا ہوتی ہے کہ پتھر برسائے جائیں اور وہ از سرِ نو زخموں سے چور ہو جائے۔ پتھر کھانے میں ایسی لذت ہے کہ اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ تقریر کا لباس نہیں پہنایا جا سکتا۔

"سر کھجاتا ہے" میں خوبی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب زخم اچھا ہو جاتا ہے اور کھرنڈ بن جاتا ہے تو مقامِ زخم پر کھجلی شروع ہو جاتی ہے۔ اس کھجلی کو عام لوگ زخم کے اندمال کی دلیل سمجھتے ہیں۔

۶۔ لغات۔ خجلت : شرمندگی۔

شرح : جب محبوب کا لطف و کرم بیباکی و گستاخی کی اجازت دے دے تو سمجھ لینا چاہیے کہ کوتاہی پر شرمساری کے سوا اور کوئی کوتاہی نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جب محبوب نے ازراہِ کرم اجازت دے دی کہ تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو، کر لو تو جو بھی اس اجازت سے فائدہ اٹھانے میں توقف کرے گا وہ گنہگار ہوگا، کیونکہ اس نے محبوب کے کرم سے فائدہ نہ اٹھایا۔

شعر میں دراصل اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ اصل شے محبوب کی رضا اور خواہش ہے۔ گناہ وہی ہے، جو محبوب کی رضا کے خلاف ہو۔ جن امور کو اس

نے ازراہِ لطف و نوازش گناہوں سے خارج کر دیا۔ ان کا نہ کرنا یقیناً گناہ سمجھا جانا چاہیئے۔

۷۔ **شرح** : اے غالب! ناسخ کے قول کے مطابق ہمارا بھی یہ عقیدہ ہے کہ جو شخص میر تقی میر سے عقیدت نہیں رکھتا، وہ دراصل خود شاعری سے بے بہرہ ہے۔ یعنی میر سے عقیدت ہر سخنور کے لیے لازم ہے۔

نسخۂ حمیدیہ میں اس شعر کا پہلا مصرع یوں بھی ہے۔

ریختے کا وہ ظہوری ہے بہ قولِ ناسخ

اس زمین میں ایک اور شعر بھی غالب سے منسوب ہے، یعنی:

میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب!
جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

۱۔ **لغات** :

مردمکِ دیدہ : آنکھ کی پتلی۔

سُوَیدا : دل کا سیاہ نقطہ۔

مت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں
ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

شرح : یہ نہ سمجھیے کہ آنکھ کی پتلی میں نگاہیں موجود ہیں، یہ کہیے کہ آنکھ کے دل میں جو ایک سیاہ نقطہ موجود ہے، اس میں آہیں جمع ہو گئی ہیں۔

یہ کوہ کندن و کاہ بر آوردن کی عجیب مثال ہے۔ پہلے آنکھ کی پتلی کو آنکھ کا دل قرار دیا، پھر نگاہوں کو اس دل کے سیاہ نقطے میں آہیں کیا۔

برشکالِ گریۂ عاشق ہے، دیکھا چاہیے
کھِل گئی مانندِ گُل، سو جا سے دیوارِ چمن

اُلفتِ گُل سے غلط ہے دعویٔ وارستگی
سرو ہے باوصفِ آزادی گرفتارِ چمن

۱۔ لغات۔ برشکال: برکھارت۔ برسات۔

شرح: عاشق کی آنکھوں نے جو جھڑی لگا رکھی ہے دیکھیے، وہ کیا رنگ لائے۔ باغ کی دیوار سو جگہ سے پھول کی مانند کھِل گئی ہے۔

مولانا طباطبائی کی یہ رائے خاص توجّہ کی مستحق ہے کہ "ہے" کی جگہ اصل میں غالباً "بھی" کا لفظ تھا۔ کاتب نے غلطی سے "بھی" کی جگہ "ہے" بنا دیا۔ یعنی عام برساتیں تو دیکھ چکے۔ اب ذرا دیدۂ عاشق کی برکھارت بھی دیکھیے اور اندازہ کیجیے کہ یہ کیا رنگ لائے گی۔

دوسرے مصرع میں لفظ "کُھل" اور "کِھل" دونوں طرح معنی دیتا ہے۔ دیوار سے مناسبت کُھل جانے یعنی پھٹ جانے یا شگافتہ ہو جانے کو ہے اور پھول سے تشبیہ کا تقاضا یہ ہے کہ اسے "کِھل" پڑھا جائے، معنی دونوں صورتوں میں ایک ہے۔
شعر کا مفہوم بظاہر یہ ہے کہ دیدۂ عاشق کی جس برسات نے دیوارِ چمن کو پھول کی مانند سَو جگہ سے کھِلا دیا، اس نے چمن میں خدا جانے کیا گُل کھِلائے ہوں۔

۲۔ لغات۔ وارستگی: آزادی۔

شرح: خواجہ حالی فرماتے ہیں:
"مطلب یہ ہے کہ کوئی کیسا ہی آزاد و وارستہ مزاج ہو، دنیا میں عشق و محبت کے پھندے سے نہیں چھوٹ سکتا۔"

پھول کی محبت سے آزادی حاصل کرنے اور چھٹکارا پانے کا دعوے بالکل غلط ہے۔ سرو کو دیکھیے، اسے آزاد کہا جاتا ہے، لیکن آزادی کے باوجود وہ باغ میں قید ہے۔ گویا باغ کے دامِ محبت میں گرفتار ہے۔

صحیح یہ ہے کہ زندگی میں انسان دنیوی علائق سے چھٹکارا نہیں پاسکتا۔ اس کے مزاج میں کتنی بے پروائی اور بے نیازی ہو، لیکن اس کا رشتہ محبت دنیا سے بہرحال قائم رہے گا۔

فرق صرف درجوں کا ہوتا ہے۔ کسی کی گرفتاری کا درجہ بہت بڑھ جاتا ہے اور کسی کا کم رہتا ہے۔ کوئی ان رشتوں میں سرتا پا جکڑا جاتا ہے، کسی کو نسبتاً فراغت حاصل ہوتی ہے۔ مگر کامل آزادی کا دعویٰ صحیح نہیں سمجھا جاسکتا۔

عشق تاثیر سے نومید نہیں　　جاں سپاری شجرِ بید نہیں

سلطنت دست بہ دست آئی ہے　　جامِ مے، خاتمِ جمشید نہیں

ہے تجلی تری سامانِ وجود　　ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے　　ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے　　غمِ محرومیِ جاوید نہیں

کہتے ہیں، جیتے ہیں اُمید پہ لوگ　　ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

۱۔ **لغات۔ جاں سپاری**: جان سونپ دینا، یعنی جان قربان کر دینا، جان فشانی، جانبازی۔

شجرِ بید: بید کا درخت۔ بید میں کوئی پھل نہیں لگتا، اس لیے اسے بے ثمر درخت کہا جاتا ہے۔ چونکہ شعر کے مضمون کو اس پہلو سے خاص تعلق ہے، اس لیے تصریح ضروری ہوئی۔

شرح: عشق تاثیر سے نا امید نہیں ہو سکتا۔ لازم ہے کہ وہ مراد پر پہنچے

اور کامیابی حاصل کرے۔ جان پر کھیل جانا اور زندگی سے ہاتھ دھو لینا بید کا درخت نہیں کہ اسے کوئی پھل نہ لگے اور بالکل بے ثمر و بے نتیجہ رہے۔

بجنوری مرحوم فرماتے ہیں کہ مرزا غالب نے افلاطون کے استاد سقراط کی طرح زہراب کو ہمیشہ نوشِ شیریں پر ترجیح دی۔ غالب کا علم الاخلاق جاں سپاری ہے اور :

جاں سپاری شجرِ بید نہیں

مرزا نے اس شعر میں ایک بہت بڑی حقیقت واضح کی ہے۔ اس دنیا میں جتنے بھی کام ہوئے، ہو رہے ہیں یا آیندہ ہوں گے، ان کی تہ میں عشق کار فرما ہے۔ لوگ پہاڑوں کی بلند ترین چوٹیوں پر پہنچے۔ انھوں نے اتھاہ سمندر کھنگال ڈالے، برِ اعظم آباد کر دیے، صحراؤں کو گلزار بنا دیا، قطبین کے راز معلوم کر لیے۔ ایک دوسرے سے بڑھ کر حیرت انگیز ایجادیں کرتے کرتے انھوں نے زمین کا اندرون بھی دیکھ لیا۔ اب ستاروں کی طرف اُڑے جا رہے ہیں۔ ان میں سے کون سا کارنامہ ہے، جو عشق یعنی ایک خاص لگن کے بغیر انجام پایا اور لگن بھی ایسی کہ ایک کے بعد ایک پشت ہا پشت تک ایک کام کی دُھن میں مصروف رہا، یہاں تک کہ کئی پشتوں کے بعد راز ملا اور منزلِ مقصود تک رسائی نصیب ہوئی۔ اگر عشق تاثیر سے ناامید ہو جاتا اور جانبازی و جانفشانی چھوڑ دیتا تو یہ سب کچھ کیونکر بروئے کار آتا؟ انسان کسی مقصد کے لیے جان دینے پر آمادہ ہو جائے تو وہ یقیناً حصولِ مقصد میں ناکام نہ رہے گا۔ اور انسانی سعی و کوشش کی صورت ایک سلسلے کی سی ہے۔ ہر انسان قدم بہ قدم آگے بڑھتا جاتا ہے۔ جہاں ایک کی زندگی ختم ہوتی ہے، دوسرا اس کا کام سنبھال لیتا ہے۔ اسی طرح منزلِ مقصود سامنے آجاتی ہے۔ یہ بہت بڑی حقیقت ہے، جو آٹھ دس لفظوں میں مرزا غالب نے پیش کر دی۔

اس شعر کی عالمیت و آفاقیت کا یہ حال ہے کہ اسے عشقِ مجازی و عشقِ حقیقی

علم و حکمت، سیاست و ملک داری، ایجاد و اکتشاف سب پر یکساں چسپاں کر سکتے ہیں۔

۲۔ **لغات۔ جمشید** : ایران کا بادشاہ، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے سب سے پہلے شراب بنائی۔

خاتم : وہ انگشتری، جس پر مالک کا نام کندہ ہو۔

سلطنت سے اشارہ جامِ مے کی طرف ہے۔

شرح : جامِ مے کی حیثیت ایک سلطنت کی ہے اور یہ سلطنت ہاتھوں ہاتھ چکر کھاتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ آج ایک کے پاس ہے اور کل دوسرے کے پاس، ہم کیوں سمجھیں کہ جامِ مے جمشید کی انگشتری ہے، جس پر اس کا نام کندہ تھا اور وہ اسی کے لیے مخصوص تھی۔ یہاں تخصیص کی کوئی وجہ نہیں۔ کسی زمانے میں جمشید اس سلطنت کا مالک تھا، آج ہم مالک ہیں۔

۳۔ **شرح** : اے مالکِ حقیقی! تیری ہی جلوہ فرمائی سے وجود کو سر و سامان نصیب ہُوا، یعنی کائنات وجود میں آئی۔ بے شک اس کی حیثیت ایک ذرّے کی ہے، لیکن کوئی ذرّہ سورج کے جلوے کے بغیر تب و تاب کا حامل نہیں ہو سکتا۔

۴۔ **شرح** : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"بھید کے معنی پوشیدہ بات کے ہیں، خواہ پوشیدہ مصلحت ہو اور خواہ پوشیدہ قباحت ہو۔ یہاں پوشیدہ قباحت مراد ہے۔ اگر مرجانے کی جگہ نہ مرنے کا لفظ ہوتا تو بھید کے معنی پوشیدہ مصلحت کے ہو جاتے۔"

مطلب یہ ہے کہ میرے مرجانے میں کوئی پوشیدہ قباحت موجود نہیں صرف یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ اس طرح کہیں محبوب کا راز فاش نہ ہو جائے اور اس کی رسوائی نہ ہو۔ یعنی لوگ یہ نہ کہیں کہ دیکھو اس شخص کے مرجانے کا باعث

فلاں یعنی محبوب ہے۔ اس طرح مجھے اس سے جو عشق ہے، وہ سب پر کھل جائے گا۔ یہ تو محبوب کی رسوائی ہوئی۔ خود مجھے لوگ یہ طعنے دیں گے کہ دیکھو عشق کا مدعی تھا اور اس کی کڑیاں سہہ نہ سکا۔ یہ طعنے میرے علاوہ محبوب کے لیے عزت کا باعث نہ ہوں گے۔ اگر ان قباحتوں کا ڈر نہ ہوتا تو میرے لیے مر جانا کون سا مشکل کام تھا؟ میں تو موت کا خیر مقدم کرتا، کیونکہ غموں اور مصیبتوں سے نجات مل جاتی۔ لیکن کروں کیا، راز محبوب کے کھل جانے کا خوف پریشان کر رہا ہے۔

۵۔ شرح: ڈر ہے تو یہ کہ عیش و نشاط کا عالم بدل جائے گا۔ یہ گردش کی نذر ہو جائے گا اور ہمیشہ باقی نہیں رہ سکتا۔ لہذا میں عیش و نشاط کا خواہاں ہی نہیں، کیونکہ جو چیز آج ہے اور کل نہیں ہوگی، اسے لے کر کیا خوشی ہو سکتی ہے اور وہ حاصل بھی ہو جائے تو ہر لحظہ اس کے بدل جانے اور ختم ہو جانے کا دغدغہ لگا رہے گا، اس وجہ سے عیش و نشاط حاصل ہونے کی حالت میں بھی اطمینان سے فائدہ نہ اٹھایا جا سکے گا۔ اس کے برعکس ہمیشہ کی محرومی کا کوئی غم ہی نہیں، کیونکہ برابر ایک حالت قائم رہے گی اور اس میں تبدیلی کا کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔

مرزا نے یہ مضمون ایک فارسی شعر میں بھی نہایت عمدہ طریق پر باندھا ہے:

زنہار از تعب آتش جاوید مترس
خوش بہاریست کزو بیم خزاں برخیزد

یعنی ہمیشہ کے لیے آگ میں جلنے کی سزا ملنے کا اندیشہ ہو تو خوفزدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس بہار کی اچھائی میں کیسے کلام ہو سکتا ہے، جس پر کبھی خزاں نہ آئے۔

۶۔ شرح: مشہور ہے کہ لوگ اُمید پر جیتے ہیں، دنیا بہ اُمید قائم، گویا امید جینے کا سہارا ہے۔ لیکن یہاں خود زندگی ہی معرض خطر میں ہے۔ یعنی جس چیز

کے لیے امید سہارا بن سکتی ہے، وہ چیز ہی بچتی نظر نہیں آتی تو ہمارے لیے امید کیونکر تکیہ گاہ بن سکتی ہے۔ خواجہ حالی نے بالکل درست فرمایا ہے:
"یہ شعر سہل ممتنع ہے" یعنی اتنا سہل ہے کہ بظاہر معلوم ہو، ایسا کہ لینا کچھ مشکل نہیں۔ مگر جب کوئی کہنے بیٹھے تو کہہ نہ سکے۔ یقیناً اس زمین میں اس سے بہتر شعر نکالنا مشکل ہے۔

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں — خیاباں خیاباں اِرَم دیکھتے ہیں

دل آشفتگاں خالِ کُنجِ دہن کے — سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

ترے سروِ قامت سے اِک قدِ آدم — قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

تماشا کر، اے محوِ آئینہ داری — تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

سراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے — کہ شب رَو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ — تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

۱۔ لغات۔ خیاباں: پھولوں کی کیاری، باغ کی روش، تختۂ گل
فارسی کے کسی لفظ کی تکرار کثرت کے معنی دیتی ہے، یعنی خیابان خیابان کے معنی ہیں، بکثرت تختہ ہائے گل۔
اِرَم: ایک قدیم شہر کا نام، جو شداد سے منسوب تھا اور وہیں اس کا شہرۂ آفاق باغ تیار کیا جاتا تھا۔ اب یہ لفظ مطلق بہشت کے معنی میں مستعمل ہے۔
شرح: اے محبوب! جہاں کہیں ہم تیرے پاؤں کے نقش دیکھتے ہیں، ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ ہر طرف بہشت کی کیاریاں پھیلی ہوئی ہیں، جن میں کثرت

سے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ یعنی مرزا نے محبوب کے نقشِ قدم کو بہشت کی ایسی کیاری سے تشبیہ دی، جس کا دامن پھولوں سے بھرا ہوا ہو۔

۲۔ **لغات** ۔ دل آشفتگان : آشفتہ دل، وہ لوگ جن کے دل محبت سے پریشان ہوں۔ عشاق۔

خالِ کنجِ دہن : وہ تِل، جو دہن کے کسی ایک سرے پر ہو۔

شرح : شعر کا پورا مضمون شاعروں کے اس مبالغہ آمیز تصور پر مبنی ہے کہ محبوب کا دہن تنگی کے سبب معدوم ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ جو لوگ تیرے دہن کے سرے کے تِل کی محبت میں دل کھو بیٹھے ہیں، وہ اپنے دل کے سیاہ نقطے میں عدم کی سیر کرتے ہیں۔

چونکہ دہن ناپید ہے، اس لیے اسے عدم قرار دیا۔ تِل کو سویدا سے مناسبت ہے۔ لہٰذا سویدا میں بیٹھ کر عدم کی سیر ہو رہی ہے۔

۳۔ **شرح** : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"اس کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ تیرے سرو قامت سے فتنۂ قیامت کمتر ہے۔ دوسرے یہ معنی بھی ہیں کہ تیرا قد اسی میں سے بنایا گیا ہے۔ اس لیے وہ ایک قدِ آدم کم ہو گیا۔"

قامت، قیامت، سرو، قد، فتنہ وغیرہ الفاظ کی مناسبت ظاہر ہے۔ دیکھیے چھوٹی سی بحر کے شعر میں بھی دو معنی پیدا کر لیے اور کم سے کم لفظوں میں بھی شعر کو بے تکلف پہلو دار بنا دیا۔ یہ کمالات غور و فکر اور ریاضت سے حاصل نہیں ہوتے۔

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

۴۔ **لغات** ۔ آئینہ داری : آئینہ سامنے رکھنا۔ شعر میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ آئینہ سامنے رکھ کر اس میں محو ہو جانا۔

شرح : اے آئینہ سامنے رکھ کر اپنے حسن و جمال میں محو ہو جانے والے محبوب! ذرا یہ بھی تو دیکھ کہ ہم تجھے کس ذوق و شوق سے دیکھ رہے ہیں۔

اس شعر میں ایک خاص منظر پیش کیا ہے۔ جب تک اسے پیشِ نظر نہ رکھ لیا جائے، شعر کی معنویت واضح نہیں ہو سکتی۔ محبوب آئینہ رکھ کر اپنے جمال میں محو ہے۔ عاشق بار بار چاہتا ہے کہ محبوب کی نظر اُس کی طرف اٹھے۔ مگر محبوب پر بدستور محویت کا عالم طاری ہے۔ آخر پریشان ہو کر عاشق پکار اٹھتا ہے کہ اے اپنے حسن و جمال میں محو جانے والے! ذرا ہمیں بھی نگاہِ لطف سے شاد کام کر دیکھ، ہم کس آرزو اور کس محویت سے تجھے دیکھ رہے ہیں؟ محض اس لیے کہ تیری نگاہِ لطف اُٹھے گی تو ہماری آرزوؤں کے چمن میں تازگی و شادابی کی بہار آ جائے گی۔

۵۔ **لغات**۔ تفِ نالہ: آہ و فغاں۔

شب رَو: رات کو چلنے والا۔ یہ لفظ عموماً چور کے لیے مستعمل ہے اور یہاں بھی اس سے چور ہی مراد ہے۔

شرح: اگر تو ہماری آہ و فغاں کی گرمی اور تپش کا کھوج لگانا چاہتا ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ ہمارا داغِ دل دیکھ، کیونکہ عام قاعدہ ہے، چور کا کھوج لگانا ہو تو اس کے پاؤں کے نشان دیکھتے ہیں۔ گویا دل کا داغ ہماری گرم آہ و فغاں کا ایک نقشِ پا ہے۔

نالے کو شب رَو اس لیے کہا کہ آہ و فغاں عموماً رات ہی کو کی جاتی ہے۔

۶۔ **شرح**: اے غالب! ہم نے اہلِ کرم کے ظرف اور شانِ کرم کا اندازہ کرنے کے لیے فقیروں کا بھیس بنا لیا ہے۔ ہمیں مانگنے کی ضرورت نہ تھی، درویشی اختیار کر لینے پر مجبور نہ تھے، محض اس لیے درویشی کا بھیس بدل لیا کہ دیکھیں، اہلِ کرم کی داد و دہش کا کیا حال ہے؟ وہ فقیروں سے کیا برتاؤ کرتے ہیں؟ ان کے دینے کا انداز ایسا ہے کہ انھیں واقعی اہلِ کرم میں شمار کیا جائے؟

اہلِ کرم کی حقیقی حیثیت کا اندازہ کرنے کے علاوہ شعر کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگرچہ ہم محتاج نہ تھے، لیکن محض اس لیے درویشی اختیار کر لی کہ ہمیں اہلِ کرم

کا انداز بہت پیارا معلوم ہوتا ہے۔ اس نے ہمارا دل لبھایا اور ہم فقیر بن گئے۔۔
شعر میں "تماشا" بہ معنی "سیر" ہے۔

جلتی ہے خوئے یار سے نارِ التہاب میں
کافر ہوں، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

کب سے ہوں، کیا بتاؤں، جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے، آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں، جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

جو منکرِ وفا ہو، فریب اس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

۱۔ لغات۔ التہاب: اشتعال۔ شعلوں کا بھڑک اٹھنا۔

شرح: مجھے دوزخ میں ڈال دیا گیا، جہاں ہر طرف آگ بھڑک رہی ہے اور انگارے دہک رہے ہیں۔ یہ اشتعال میرے محبوب کی طبیعت و عادت سے ملتا جلتا ہے۔ اس لیے مجھے جتنا عذاب ہوتا ہے، اتنی ہی راحت نصیب ہوتی ہے کیونکہ میں اپنے آگ جیسو کا محبوب کے غیظ و غضب کا عادی چلا آتا ہوں۔ اگر اس عذاب میں راحت نہ ملے تو سمجھ لینا چاہیے کہ میرا ایمان جاتا رہا اور میں کافر ہو گیا۔

۲۔ شرح: میں کیا بتاؤں کہ اس جہانِ خراب میں کب سے مقیم ہوں؟ اگر ہجر کی راتوں کو بھی حساب میں شامل کر لوں۔

جو درازی میں اپنی مثال آپ
ہوتی ہیں تو میرے لیے اس دنیا
میں رہنے کا اندازہ ممکن ہی نہیں
یہ معاملہ حساب میں آ ہی نہیں سکتا
اور کوئی وقت معین ہو ہی نہیں
سکتا۔

اس شعر میں مرزا نے شبہلے
ہجر کی درازی کا مضمون بالکل
اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔

اس سلسلے میں دو شعر پیش
کیے جاتے ہیں، جنھیں مرزا کے
اس شعر کا ماخذ قرار دیا جاتا
ہے۔ اوّل امیر خسرو کا شعر:

زہے عمرِ درازِ عاشقاں گر
شبِ ہجراں حسابِ عمر گیرند

یعنی واہ عاشقوں کی عمر
کتنی دراز ہے، بشرطیکہ ہجر کی راتیں
بھی عمر میں شمار کی جائیں۔

میں اور حظِ وصل، خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ہے تیوری چڑھی ہوئی، اندر نقاب کے
ہے اِک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ، ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ، ایک بگڑنا عتاب میں

وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

غالبؔ چھٹی شراب، پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

دوم کمالؔ اصفہانی کا شعر:

ز خضرؑ عمر فزوں است عشقبازاں را
اگر ز عمر شمارند روزِ ہجراں را

عاشقوں کی عمر خضرؑ سے بھی بڑھ جائے، اگر وہ ہجر کے دنوں کو بھی عمر میں شمار
کرلیں۔

امیر خسروؔ کے شعر میں ہجر کی راتوں کا ذکر یقیناً ہے، مگر سارا زور عاشقوں کی درازیٔ عمر پر ہے۔ کمال اصفہانی کے شعر میں "روزِ ہجراں" رکھا، حالانکہ مقام کا اقتضا "شبِ ہجراں" تھا۔ پھر تعین کر دیا کہ عاشقوں کی عمر خضرؑ سے بڑھی ہوئی ہے۔

علاوہ بریں دونوں شعروں میں شعریت جس درجے کی ہے، اس کے متعلق کچھ کہنا غیر ضروری ہے۔ ان دونوں کے برعکس مرزا نے پہلے مصرع میں دو ابہام پیدا کیے، اول یہ کہ "کب سے ہوں" دوسرا یہ کہ "کیا بتاؤں" اور دنیا کو "جہان خراب" کہا۔ خواہ اس لیے کہ یہ ہے ہی خراب، خواہ اس لیے کہ مرزا کو ہجر و فراق کے مصائب کے باعث یہ جہان سازگار نہ ہوا۔ یہ دو ابہام اس امر کے گواہ ہیں کہ شبہائے ہجراں کو حساب میں شامل کر لینے کے بعد، نہ کوئی مدت فکر کی رسائی میں آتی ہے اور نہ اس کے متعلق کوئی معین بات زبان پر لائی جا سکتی ہے۔ پھر بہ حیثیت مجموعی شعریت کمال پر پہنچا دی۔

اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ مرزا نے اصل مضمون امیر خسروؔ اور کمال اصفہانی سے لیا تو اس میں کیا کلام ہے کہ اسے ایسے انداز میں پیش کیا، جو اس کا حق ہے ساتھ ہی واضح ہو گیا کہ امیر خسرو اور کمالؔ اصفہانی اصل مضمون پر پہنچ جانے کے باوجود اس کے بیان کا حق ادا نہ کر سکے۔

۲۔ **شرح** : میں محبوب کا انتظار کرتے کرتے سو گیا، لیکن اس شوخ کو میرا سونا پسند نہ آیا۔ چنانچہ خواب میں آیا اور وعدہ کر گیا کہ میں آؤں گا۔ یوں اس کا مقصد یہ تھا کہ اسی انتظار میں میری عمر گزر جائے۔ نہ وہ وعدہ پورا کرے اور نہ مجھے نیند آئے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ شعر میں مرزا نے "وہ" کا لفظ ترک کیا۔ اس ترک سے یہ لطیف معنی پیدا ہوئے، جیسے ہم سب جانتے ہیں کہ اس کے سوا کسی کا ذکر نہیں کرتے یا یوں سمجھو، جیسے دل سے محبوب کی باتیں کرتے کرتے یہ بات زبان سے نکل گئی اور ضمیر دل ہی میں رہ گئی۔

۴۔ شرح : خواجہ حالیؔ فرماتے ہیں :

دوسرے مصرع میں بہ طور طنز کے کہتا ہے کہ جو کچھ وہ جواب میں لکھیں گے۔ مجھے معلوم ہے، یعنی وہ کچھ نہیں لکھنے کے، اس لیے قاصد کے واپس آنے سے پہلے ایک اور خط لکھ رکھوں "۔

شعر کا مطلب صاف ہے، یعنی میں جانتا ہوں کہ وہ جواب میں کچھ نہیں لکھیں گے۔ پھر قاصد کے واپس آتے آتے کیوں نہ ایک اور خط لکھ رکھوں؟

بعض اصحاب نے اس شعر کا مآخذ مرزا بیدلؔ کا مندرجۂ ذیل شعر قرار دیا ہے:

آنجا جواب نامۂ عاشق تغافل است
بیہودہ انتظار خبر می کشیم ما

یعنی محبوب کے ہاں عاشق کے خط کا جواب تغافل کے سوا کچھ نہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم خواہ مخواہ خبر کا انتظار کر رہے ہیں۔

مرزا بیدلؔ کا شعر اچھا ہو یا بُرا، لیکن اسے غالبؔ کے شعر سے کوئی تعلق نہیں۔ بیدل نے صرف یہ کہا کہ محبوب کا پیشہ ہی تغافل ہے، وہ عاشق کے خط کا جواب کچھ نہ دے گا اور تغافل برتے گا۔ لہذا ہماری طرف سے کسی خبر کا انتظار فضول ہے۔ غالبؔ کے ہاں مضمون ملتا جلتا ضرور ہے، لیکن انھوں نے خود لکھنا ضروری سمجھا۔ اگرچہ ساتھ ہی انھیں علم ہے کہ محبوب کچھ جواب نہ دے گا۔ خواہ اس کی وجہ یہ ہو جو غالبؔ نے خود ایک جگہ بیان کی۔

یہ جانتا ہوں کہ تُو اور پاسخِ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

خواہ یہ ہو کہ :

خط لکھیں گے۔ گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

مولانا طباطبائیؔ فرماتے ہیں کہ یہ شعر بہت بلیغ ہے۔ معاملاتِ عشق میں اپنا

صاحبِ تجربہ اور معشوقوں کا مزاج داں ہونا اور معشوق کا بدعہد و حیلہ جُو ہونا، یہ سب معنی اس سے سمجھ میں آتے ہیں۔

۵۔ **شرح** : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

" اس شعر میں پہلے مصرع کے بعد اتنا جملہ محذوف ہے، " پھر آج جو خلافِ عادت جام کی نوبت مجھ تک پہنچی ہے "۔ اس حذف نے شعر کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے۔ ایسا حذف جس پر قرینہ دلالت کرتا ہو اور جو الفاظ حذف کیے گئے ہیں، وہ بغیر ذکر کیے دونوں مصرعوں میں بول رہے ہوں، محسناتِ شعر میں شمار کیا جاتا ہے "۔

خود مرزا غالب تفتہ کو لکھتے ہیں۔

" اب جو دور مجھ تک آیا ہے تو میں " ڈرتا ہوں " یہ پورا جملہ مقدر ہے میرا فارسی دیوان جو دیکھے گا جانے گا کہ جملے کے جملے مقدر چھوڑ جاتا ہوں۔"

محبوب کی بزم میں پہلے تو دورِ جام کبھی نہیں آیا تھا، یعنی مجھے شراب نہیں پلائی گئی تھی۔ پھر آج جو خلافِ عادت مجھ پر نوازش ہوئی ہے کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ ساقی یعنی محبوب نے شراب میں کچھ ملا دیا ہو؟

مرزا نے خود نہیں بتایا کہ کیا ملا دیا ؟ صرف اتنا کہا کہ " کچھ ملا نہ دیا ہو" یہاں بظاہر قرینہ زہر کا ہے، لیکن قرائن کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ جس شے کی آمیزش تصور میں آئے، وہی فرض کر لیجیے۔

۶۔ شعر میں دوست سے مراد محبوب ہے اور دشمن سے مراد رقیب۔

شرح : محبوب وفا کا منکر ہے۔ نہ خود اس نے کسی سے وفا کی اور نہ دوسروں کی وفا کا کبھی اسے یقین ہوا۔ اگر اس نے رقیب سے میل جول شروع کر دیا ہے تو میرے لیے بدگمانی کی کوئی وجہ نہیں۔ جب میں جانتا ہوں کہ وہ کسی کا بھی ہو کر نہیں رہ سکتا اور اسے کوئی فریب نہیں دے سکتا تو میرے لیے رقیب سے اس

کا میل جول پریشانی کا باعث کیوں ہو اور میں کیوں یہ خیال کروں کہ رقیب نے اسے دامِ فریب میں الجھا لیا ہے؟

کمال یہ ہے کہ مرزا کے نزدیک رقیب کے پاس فریب کے سوا اور کوئی تدبیر ہے ہی نہیں، لیکن جو محبوب وفا کا منکر ہے، اس پر کسی کا فریب کیونکر کارگر ہو سکتا ہے؟

۷۔ **شرح**: مجھ پر تو وصل میں اس لیے اضطراب طاری ہے کہ کہیں رقیب اس موقع پر نہ آ جائے اور رنگ میں بھنگ نہ پڑ جائے۔ تمھیں کس وہم نے پیچ و تاب میں ڈال رکھا ہے؟

عاشق اس لیے پریشان ہے کہ بڑی مشکل سے محبوب کے ساتھ ملاقات کا موقع ہاتھ آیا ہے۔ اگر اس موقع پر رقیب آ گیا تو لطفِ صحبت برباد ہو جائے گا۔ محبوب یہ سمجھتا ہے کہ عاشق نے کسی اور سے رشتۂ محبت استوار کر رکھا ہے اس لیے اس پر گھبراہٹ طاری ہے۔ عاشق اسے محبوب کا وہم قرار دے کر حقیقت واضح کر رہا ہے تاکہ جس پیچ و تاب میں وہ مبتلا ہے وہ زائل ہو جائے۔

۸۔ **لغات**۔ **خداساز**: خدا کا بنایا ہوا کام، خدا کی دی ہوئی نعمت، خداداد۔

شرح: میرے نصیب ایسے کہاں کہ وصل کا حظ حاصل ہوتا؟ یہ تو خدا کا بنایا ہوا کام تھا، اس کی عطا کی ہوئی نعمت تھی۔ اس خوشی میں شادی مرگ ہو جانا بعید نہ تھا۔ مگر مجھ پر ایسی گھبراہٹ اور حیرت طاری ہوئی کہ جان بہ طور نذر پیش کرنا بھول گیا۔

معاملات کے یہ دقیق پہلو اس حسن و خوبی اور اس قادر الکلامی سے بے تکلف پیش کر دینا مرزا غالب پر ختم ہے۔ وصل کی خداساز نعمت و شادی مرگ کی نوبت کیوں نہ آئی؟ صرف اس لیے کہ مجھ پر اتنے بڑے، غیر معمولی اور سراسر غیر متوقع واقعے سے حیرت طاری ہو گئی اور اس عالم میں جان کی نذر دینا بھول گیا۔

۹۔ شرح : عاشق محبوب کے دیدار سے فیض یاب ہونے کا مشتاق ہے لیکن محبوب نے عاشق کو دیکھتے ہی غصے سے تیوری چڑھا لی اور چتون پر بل ڈال لیے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نقاب کے گوشے میں شکن پڑ گئی۔ یہ دیکھتے ہی عاشق پر محبوب کا عتاب واضح ہو گیا اور اس نے سمجھ لیا کہ دیدار کی تمنا بر آنے کا کوئی امکان نہیں۔ محبوب کے عتاب کی شان ملاحظہ فرمائیے کہ اس کی چتون کا بل نقاب میں منعکس ہو کر ابھر آیا۔

۱۰۔ شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں:

"یہاں لگاؤ سے مراد لگاوٹ ہے۔ یعنی معشوق کا عاشق کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا، جس سے اس کا التفات اور میلانِ طبع پایا جائے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ دوست کی لاکھوں لگاوٹیں ایک طرف۔ اس کے لاکھوں بناؤ سنگار ایک طرف اور عتاب میں بگڑنا ایک طرف۔ یہ شعر بھی سہلِ ممتنع ہے۔ اگر الفاظ کی طرف دیکھیے تو تعجب ہوتا ہے کہ کیونکر ایسے دو ہم پلہ مصرعے بہم پہنچ گئے، جن میں حسنِ ترصیع کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے اور اگر معنی پر نظر کیجیے تو ہر ایک مصرع میں ایک ایسا معاملہ باندھا گیا ہے، جو فی الواقع عاشق و معشوق کے درمیان گزرتا رہتا ہے۔ معشوق کی لگاوٹ عاشق کے لیے بہت بڑی چیز ہے، مگر اس کا آنکھ چرانا، جو لگاوٹ کی ضد ہے، عاشق کی نظر میں لگاوٹ سے بہت زیادہ دلفریب و دلآویز ہوتا ہے۔ اسی طرح بناؤ سنگار سے معشوق کا حسن بیشک دوبالا ہو جاتا ہے، مگر اس کا غصے میں بگڑنا اس کے بناؤ سے بہت زیادہ خوش نما اور دلربا معلوم ہوتا ہے۔ اس شعر کے متعلق یہ سب ظاہری اور اوپری باتیں ہیں جو ہم لکھ رہے ہیں۔ اس کی اصل خوبی وجدانی ہے، جس کو صاحب ذوق کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔"

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں: جملوں کی ترکیب میں تماثل اور لفظوں کی نشست میں حسنِ تقابل کی مثالیں شاذ ملتی ہیں۔ اُردو میں یہ شعر بھی اس تماثل وتقابل کی نہایت نادر مثال ہے۔

۱۱، ۱۲۔ **لغات**۔ مدّعا طلبی: مقصد حاصل کرنا، مطلب برآری۔
سفینہ: کشتی۔

شرح: جس فغاں سے آفتاب میں شگاف پڑ جائے، وہ محبوب کے دل میں خس کے برابر بھی نہیں سمجھی جاتی، یعنی اس کی حیثیت ہیچ ہے، کیونکہ خس یعنی تنکا بالکل بے حقیقت شے ہے۔

وہ جادو مقصد حاصل کرنے میں کچھ کام نہیں دے سکتا، جس کے زور سے سراب میں کشتی چلائی جا سکے۔

مطلب یہ ہے کہ جن تدبیروں کو زور اور تاثیر کے اعتبار سے غیر معمولی حیثیت حاصل ہے۔ مثلاً فریاد وفغاں آفتاب میں شگاف پیدا کر دیتی ہے، حالانکہ یہ بداہتہً غیر ممکن ہے اور سراب میں کشتی چلائی جا سکتی ہے، حالانکہ اس کا بھی کوئی امکان نہیں، ایسی پُرزور اور پُرتاثیر تدبیریں بھی نہ محبوب کے دل پر کوئی اثر رکھتی ہیں نہ ان سے مطلب برآری کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔

۱۳۔ **شرح**: اے غالب! شراب تو چھوٹ گئی، اس کا بالالتزام پینا تو ختم کر دیا، لیکن اب بھی کبھی کبھی پی لیتا ہوں۔ پینے کے دو موقعے ہیں۔ دن کے وقت، جب ابر چھایا ہوا ہو اور ترشح ہو رہا ہو۔ رات کو، جب چاندنی چھٹکی ہوئی ہو۔

بادل اور برسات کے موقع پر پینے کا ذکر غالب کی زبان سے پہلے بھی آ چکا ہے، یعنی:

بہارِ ہند بود برشگال ہاں غالب!
دریں خزاں کدہ ہم موسم شرابے ہست

شب مہتاب کے سلسلے میں فرماتے ہیں :

پی جس قدر ملے شب مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

نیز :

کوئی کہے کہ شب مہ میں کیا برائی ہے
بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

مقطع میں شراب چھوڑنے کا جو ذکر ہے، وہ محض سخن گستری ہے، کیونکہ مرزا کی زندگی میں التوائے شراب کا مستند واقعہ صرف ایک ہے، یعنی ۲۲-جون ۱۸۶۲ء سے ۱۰-جولائی ۱۸۶۲ء تک، جیسا کہ علائی کے نام ایک مکتوب سے واضح ہے۔

یہ دو غزلہ بظاہر ۱۸۵۱ء کا ہے، کیونکہ اس زمین میں مومن کی بھی ایک غزل ہے اور ذوق کے بھی چند شعر ہیں۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ یہ سب ایک طرحی مشاعرے کا کلام ہے۔ مومن کا انتقال مئی ۱۸۵۲ء میں ہوا اور یہ دو غزلہ اس سے پیشتر کا ہونا چاہیے۔ گویا مقطع میں کسی واقعے کی طرف اشارہ نہیں، محض سخن طرازی کی گئی ہے۔

کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

لغات : خسّت : بخل، کنجوسی۔
سوءِ ظن : غیر شایاں گمان۔

شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"آج اس خوف سے شراب نہ پی کہ کل نہ ملے گی، ساقیِ کوثر کی فیاضی پر سوءِ ظن کرنا ہے۔"

رَو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

اُتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مُشتمل نمُودِ صُوَر پر وُجُودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

شرم اک ادائے ناز ہے، اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

ہے غیبِ غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں

غالبؔ! ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بُو تراب میں

"کل کے لیے" کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک روزِ قیامت کے لیے، دوسرا روزِ آیندہ یعنی فردا کے لیے۔ پہلے مفہوم کے مطابق شعر کا مطلب یہ ہے کہ روزِ قیامت کے خیال سے شراب پلانے میں بُخل نہ کر۔ عوام کا عقیدہ ہے کہ جو لوگ یہاں شراب سے پرہیز کریں گے، انھیں قیامت کے دن حضرت ساقیِ کوثر شرابِ طہور پلائیں گے۔ مرزا کہتے ہیں کہ ساقیِ کوثر کی فیاضی عام ہے اس میں کسی کے لیے کلام کی گنجائش نہیں۔ یہ اس پاک ذات کے متعلق غیر شایاں گمان ہے کہ وہ کسی کو اپنی عام فیاضی سے محروم رکھنا گوارا فرمائیں گے۔ اس مفہوم کے مطابق لفظ خسّت یعنی بخل کا مطلب کیا ہوگا؟ آیا بخل سے مراد یہ ہے کہ پلانے والا دل کھول کر نہیں پلاتا، تھوڑی تھوڑی

دیتا ہے۔ یا اس سے پلانے کی مطلق نفی مراد ہے؟

دوسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ مرزا نے اپنے داروغے سے شراب مانگی، جسے بقولِ حالی تاکید کر دی گئی تھی کہ نشے کی حالت میں زیادہ شراب مانگوں تو ہرگز نہ دینا۔ داروغے نے عذر کر دیا کہ کل، یعنی فردا کے لیے بھی کچھ رکھ لیجیے، مرزا کہتے ہیں کہ دیکھ تو کل کا عذر رکھ کر شراب دینے میں بخل نہ کر۔ یہ ساقیِ کوثر کے باب میں غیر شایاں گمان ہے۔ جس طرح اب تک شراب ملتی رہی، اسی طرح ساقیِ کوثر کی مہربانی سے آیندہ بھی ملتی جائے گی۔ اس پاک ذات کی مہربانی کے متعلق دل میں غلط گمان کو جگہ نہ دے۔ یعنی دنیا میں جو کچھ پینے کو ملتا ہے یہ بھی ساقیِ کوثر ہی کی مہربانی ہے۔ جس طرح قیامت کے دن جو کچھ عطا ہوگا، وہ بھی ساقیِ کوثر ہی کی مہربانی سے عطا ہوگا۔

۲۔ **لغات** ۔ کل : اس سے مراد یومِ الست ہے، جس روز روحوں سے بندگی کا اقرار لیا گیا تھا اور انسانوں کے ابوالآبا حضرت آدمؑ کی جناب میں سجدہ نہ کرنے پر عزازیل کو، جو فرشتوں میں محسوب ہوتا تھا، سزا ملی تھی۔ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا تھا یعنی آدم کی عظمت تسلیم کر لی تھی، کیونکہ آدمؑ ہی حقائقِ اشیا بیان کر سکے تھے۔

شرح : کہتے ہیں کہ آج ہم یعنی انسان اتنے ذلیل کیوں ہو گئے کہ کوئی ہماری بات بھی نہیں پوچھتا۔ یومِ الست میں تو فرشتوں کو بھی مجال نہ تھی کہ ہماری شان میں گستاخی کریں۔

یہ شعر حقیقۃً شرفِ انسانی کے لیے ایک دعوت ہے۔ یعنی مرزا ہر انسان کو اس طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارا مرتبہ فرشتوں سے بھی بالاتر تھا، لیکن اعمالِ بد کے باعث ہم ذلیل ہو گئے اور اپنے مقامِ شرف سے گر گئے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ ایسا کیوں ہوا اور ان اعمال سے دست کش ہو جانا چاہیے، جو تذلیل کا باعث ہوئے۔

اس شعر میں لفظ "کیوں" استفہام کے لیے نہیں، بلکہ تنبیہ کے لیے ہے۔

خواجہ حالی فرماتے ہیں :

" اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ معشوق کو یا تو ہماری خاطر ایسی عزیز تھی کہ اگر بالفرض فرشتہ بھی ہماری نسبت گستاخی کرتا تو اسے گوارا نہ ہوتی اور یا اب ہم کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، دوسرے عمدہ معنی یہ ہیں کہ اس شعر میں آدمؑ اور فرشتوں کے اس قصے کی طرف اشارہ ہے، جو قرآن مجید میں موجود ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عالم کو پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے کہا : " کیا تو دنیا میں اس شخص یعنی اس نوع کو پیدا کرنا چاہتا ہے، جو اس میں فساد اور خونریزی کرے ؟" وہاں سے ارشاد ہوا کہ تم نہیں جانتے، جو کچھ میں جانتا ہوں پھر آدمؑ سے ان کو زک دلوائی اور حکم دیا کہ آدمؑ کو سجدہ کریں۔ کہتا ہے کہ ہم آج دنیا میں کیوں اس قدر ذلیل ہیں، کل تک تو ہماری ایسی عزت ہوگی ؟"

۱۴۔ لغات۔ سماع : راگ۔

چنگ : ایک باجا جو ستار کی قسم سے ہے۔

رباب : سارنگی کی ایک قسم۔

شرح : اس شعر میں بھی "کیوں" استفہام کے لیے نہیں تنبیہ کے لیے ہے، اگر چنگ و رباب میں، جو آلات موسیقی ہیں، محبوب حقیقی ہی کی صدا سمائی ہوئی ہے تو عجیب بات ہے کہ یہ صدا سنتے ہی بدن سے جان کیوں نکلنے لگتی ہے ؟ وہ صدا تو بہر حال جاں بخش اور حیات افروز ہونی چاہیے، کیونکہ حقیقی محبوب کی صدا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ارباب وجد و حال اس صدا پر پورا اعتقاد نہیں رکھتے۔ اگر اعتقاد ہو تو ان کی روحوں میں بالیدگی آئے، لیکن وہ تڑپنے اور لوٹنے لگتے ہیں۔

اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ارباب وجد و حال اپنے محبوب کی صدا سُن کر اس میں جذب ہو جانے کے لیے بیتاب ہو جاتے ہیں اور ان کا تڑپنا اور لوٹنا اسی کیفیت کا نتیجہ ہے۔

۴۔ **لغات**۔ رَو: راہ، رفتار، پانی کا بہاؤ، دھارا۔ یہاں اس کے معنی گرم رو اور تیز رو کے ہیں۔

رخش: گھوڑا، رستم کے گھوڑے کا نام یہی تھا۔

شرح: عمر کا گھوڑا تیزی سے دوڑا جا رہا تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کہاں پہنچ کر ٹھہرے؟ ہم اس پر سوار ہیں، لیکن حالت یہ ہے: نہ باگ پر ہاتھ ہے، نہ پاؤں رکاب میں ہے۔

انسانی زندگی کی بے بسی اور بے اختیاری کا نقشہ اس سے بہتر الفاظ میں کھینچنا غالباً ممکن نہیں۔ گھوڑے پر انسان سوار ہو، مگر نہ باگ قبضے میں ہو، نہ رکاب قابو میں اور یہ بھی معلوم نہ ہو کہ گھوڑا سرپٹ دوڑا جا رہا ہے، اس کا رخ کس طرف ہے اور وہ کہاں پہنچ کر رُکنے والا ہے؟ اس سے بڑھ کر سوار کی بے اختیاری کیا ہوگی؟ اور انسانی زندگی کا یہ نہایت صحیح نقشہ ہے۔

خواجہ حالی فرماتے ہیں:

> "سوار کی بے اختیاری اور گھوڑے کا اس کے قابو سے باہر ہو جانا اس سے بہتر بیان نہیں ہو سکتا اور عمر کو ایسے بے قابو گھوڑے سے تشبیہ دینا حسنِ تشبیہ کا حق ادا کر دینا ہے۔"

عموماً سمجھا جاتا ہے کہ مصوّر موقلم سے جو تصویر بنا دیتا ہے، اس میں قلب و نظر کے لیے زیادہ سے زیادہ تاثیر پیدا ہو جاتی ہے، کیونکہ مجسم نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے اور ایسے معاملات میں الفاظ ایسا کام نہیں دے سکتے، لیکن مرزا غالب نے الفاظ میں جو نقشہ پیش کر دیا ہے، اس میں بڑے سے بڑا مصوّر رنگ و روغن کے ذریعے سے وہ تاثیر پیدا نہیں کر سکتا جو مرزا نے لفظوں کے

ذریعے سے پیدا کر دی ہے۔ غالب کے جن شعروں کی تصویر بنانا بظاہر دشوار ہی نہیں، محال ہے، ان میں سے ایک شعر یہ بھی ہے۔ ایسا ہی شعر یہ ہے۔

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی! کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

۵۔ **لغات**۔ بُعد : دُوری۔

شرح : عبدالرحمٰن بجنوری اس شعر کے سلسلے میں فرماتے ہیں :

"روح اور مادّے کا امتیاز حقیقت میں ایک فریب خیال ہے، ورنہ مادّہ محض مایا ہے۔ جب ادراک کامل اور عقل رسا ہو جاتی ہے تو مادّے کی غیریّت خود بخود زائل ہو جاتی ہے"۔

میں غیر کے وہم میں جتنا پیچ و تاب کھاتا ہوں اور جس قدر اس خیالی گورکھ دھندے میں الجھتا رہتا ہوں۔ اُتنا ہی اپنی حقیقت یعنی وجودِ حقیقی سے دُور ہوتا جاتا ہوں۔

خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"غیر سے یہاں ماسوی اللہ مراد ہے، جو صوفیہ کے نزدیک بالکل معدوم ہے، اس لیے کہ وہ وجودِ واحد کے سوا سب کو معدوم سمجھتے ہیں"۔

۶۔ **لغات**۔ شہود : دیکھنا۔ رویت اصطلاحِ صوفیہ میں ایک درجہ ہے، جس میں سالک مراتبِ کثرت اور موہومات صدری سے گزر کر ایسے مرتبے پر پہنچ جاتا ہے کہ اسے ساری موجودات میں جلوۂ حق بلکہ ہر شے عین حق نظر آنے لگتی ہے۔

شاہد : دیکھنے والا، شہادت دینے والا۔

مشہود : جسے دیکھا جائے۔

مشاہدہ : دیکھنا، معاینہ کرنا۔

شرح : جب شہود، شاہد اور مشہود کی اصل ایک ہے (اور یہ تینوں لفظ ایک ہی مادے سے ہیں) تو حیرت کا مقام ہے کہ مشاہدے کو کیا سمجھا جائے اور اسے کس درجے میں رکھا جائے ؟

پوری کائنات صرف وجودِ واحد یعنی وجودِ حقیقی کی وجہ سے قائم ہے تو شاہد و مشہود ایک ہی ہوئے۔ اس کے سوا دوسرا موجود نہیں۔ جو بھی شے ہے، وہ سراسر عین ذات ہے، کیونکہ ذات اور وجود میں غیریت نہیں ہو سکتی۔ مشاہدہ اسی حالت میں ہوگا، جب شاہد و مشہود میں غیریت ہوگی۔ جب غیریت ہے ہی نہیں تو مشاہدہ کہاں رہا۔ جو دو جداگانہ وجودوں کا تقاضا کرتا ہے ؟

۷۔ **لغات** ۔ مشتمل : شامل۔ محیط۔

نمود : ظہور، وجود، نمائش۔

صُوَر : صورت کی جمع۔

شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"یہ شعر) وحدتِ وجود اور کثرتِ موہوم کی تمثیل ہے۔ قطرہ و موج و حباب کے ہیچ و ناچیز ہونے کو ایک عام محاورے میں اس طرح ادا کرنا کہ "یاں کیا دھرا ہے"! منتہائے بلاغت ہے۔"

قطرے، موج اور بُلبلے کی اپنی کوئی ہستی نہیں، یہ تو سمندر ہی چند صورتیں ہیں، جو عارضی طور پر نمایاں ہو گئیں اور ان کی ہستی سمندر ہی پر موقوف ہے۔

شعر میں بطورِ تمثیل یہ بتایا گیا ہے کہ حقیقی ہستی صرف واجب الوجود کی ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے، وہ ممکنات میں شامل ہے۔ ممکنات اسی وقت تک ہیں، جب تک سمندر ہے۔ سمندر نہ ہو تو یہ بھی ناپید ہو جائیں۔ گویا بوندیں، لہریں اور بلبلے سمندر کی ذات سے الگ وجود نہیں رکھتے، لہذا انھیں کون وجود شمار کر سکتا ہے اس کی ایک مثال یوں سمجھنی چاہیے کہ قوتِ نامیہ زمین کی ہر روئیدگی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا ظہور درختوں، پودوں اور فصلوں کی شکل میں ہوتا ہے، لیکن اصل نامیہ ایک

شے ہے۔ ممکنات واجب کے مختلف شیون ہیں، ان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں۔
مولانا طباطبائی کے قول کے مطابق اس تمثیل کی غرض یہ ہے کہ ممکنات کی ہستی کو وجود واجب کے ضمن میں ثابت کیا جائے۔

۸۔ **شرح** : بیشک محبوب حقیقی کا شرمانا اور سامنے نہ آنا ایک محبوبانہ ادا ہے، اگرچہ یہ ادا اپنے ہی ساختہ ہے، کیونکہ یہاں دوسرا کوئی موجود ہی نہیں۔ گویا ان کا پردہ اختیار کرنا اور حجاب میں رہنا بھی تو بے حجابی ہی ہے۔

مقصود یہ ہے کہ وجود واجب نے کائنات کے اندر مختلف صورتوں میں ظہور کیا لیکن شرم و حجاب کا یہ عالم ہے کہ اب تک کھُل کر سامنے نہ آیا، حالانکہ اس کا پردے میں رہنا اور حجاب کرنا بھی ادائے ناز کی حیثیت میں بے حجابی ہی ہے۔ یعنی نہ کھُل کر سامنے آتا ہے، نہ پوری طرح مستور رہتا ہے، بین بین رہ کر عشاق کو تڑپاتا ہے۔

۹۔ **شرح** : بجنوری مرحوم فرماتے ہیں :

"معشوقِ عالم، جو موجودات کے نقاب میں پنہاں ہے، برابر اپنی جمال آرائی میں مصروف ہے اور آئینہ نقاب ہی میں لیے ہوئے اپنے غازے کو درست کر رہا ہے۔ جب عالم تکمیل کو پہنچ جائے گا تو نقاب الٹ دیگا عالم کو دیکھنے ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کسی چیز کی کمی ہے۔ شش جہت آراستہ ہو رہے ہیں اور منتظر ہیں۔"

مطلب یہ ہے کہ ابھی تک کائنات کی تکمیل نہیں ہوئی اور اس کی آرائش کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اس کا خالق یعنی وجود واجب نقاب میں بھی آئینہ سامنے رکھے ہوئے ہے، گویا بننا سنورنا بدستور جاری ہے اور آرائشِ جمال سے فراغت حاصل نہیں ہوئی۔ قرآن مجید کی آیت : کلّ یوم ھو فی شان (ہر روز وہ ایک شان میں ہے) بھی اسی کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

۱۰۔ **لغات**۔ غیبِ غیب : اس سے مراد مرتبۂ احدیت ہے، جہاں تک عقل، ادراک اور بصر کی رسائی ممکن نہیں۔

شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"سالک کو تمام موجودات عالم میں حق ہی حق نظر آئے تو اسے شہود کہتے ہیں اور غیب الغیب سے مراد مرتبۂ احدیت ذات ہے، جو عقل و ادراک اور بصر و بصیرت سے وراء الوراء ہے۔ کہتا ہے کہ جس کو ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں، وہ درحقیقت غیب الغیب ہے اور اس کو غلطی سے شہود سمجھنے میں ہماری مثال ایسی ہے، جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں، پس گو وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے، مگر فی الحقیقت وہ ابھی خواب ہی میں ہے۔ یہ مثال بالکل نئی ہے اور اس سے بہتر اس مضمون کے لیے نہیں ہو سکتی۔"

مطلب یہ ہے کہ ذات احدیت حقیقۃً غیب الغیب ہے یعنی غیب کے اندر غیب ہے، لیکن ہم اسے شہود سمجھے ہوتے ہیں، یعنی یہ قرار دیے بیٹھے ہیں کہ اس نے ظہور اختیار کیا۔ ہماری مثال ایسی ہے، گویا کوئی شخص سویا پڑا ہو اور خواب دیکھے کہ جاگ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ محض جاگنے کا خواب دیکھ لینے سے اسے بیدار نہیں سمجھا جا سکتا۔ ایسا سمجھنا سراسر دھوکا ہے۔

۱۱۔ لغات ۔ ندیم : ہم نشین، ہمدم، رفیق۔

بوتراب : حضرت علیؑ کی کنیت۔ اگرچہ صورت کنیت کی ہے، لیکن حقیقت میں یہ ان کا لقب ہے۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؑ مسجد نبویؐ میں فرش خاک پر سوئے ہوئے تھے اور آپ کے کپڑے خاک آلود ہو گئے تھے۔

"رسول اللہ (صلعم) تشریف لائے تو فرمایا :

"اے بوتراب! (خاک میں لپٹے ہوئے یا خاک آلود) اُٹھ"۔ بس اسی وقت سے حضرت علیؑ کا یہ لقب ٹھہر گیا۔

شرح : پہلے مصرع میں "دوست" سے دونوں جگہ خدا مراد ہے۔

اے غالب! دوست (خدا) کے رفیق اور ہم نشین (حضرت علیؑ) سے دوست

(خدا) ہی کی خوشبو آتی ہے ۔ میں حضرت علیؑ کی بندگی میں مصروف ہوں اور اس طرح عین خدا کی بندگی کر رہا ہوں ۔

۱. شرح: میرے دل اور جگر دونوں پر کاری زخم لگ چکے ہیں۔ دونوں پر گریہ و نوحہ ضروری ہے، لیکن میں بہ یک وقت دونوں کے سلسلے میں یہ فرض ادا نہیں کر سکتا۔ استطاعت ہو تو ایک ماتم کرنے والا ساتھ رکھ لوں تاکہ میں ہائے دل پکاروں اور وہ ہائے جگر کہتا جائے۔ اس طرح دونوں کے ماتم کا حق ادا ہو گا

مرزا کا مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ عشق میں دل اور جگر دونوں فنا ہو گئے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے، وہ اسلوب بیان ہے، جس نے شعر کی حیثیت کچھ سے کچھ بنا دی۔

اسلام سے پیشتر عرب میں یہ دستور تھا کہ گانے والیوں کی طرح نوحہ کرنے والوں کے

حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ "جاؤں کدھر کو میں؟"

جانا پڑا رقیب کے در پر، ہزار بار
اے کاش! جانتا نہ تری رہگزر کو میں

ہے کیا؟ جو کس کے باندھیے؟ میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں؟

لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے'
یہ جانتا اگر تو لُٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی، راہبر کو میں

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پُوجتا ہوں اُس بُتِ بیداد گر کو میں؟

پھر بیخودی میں بھول گیا، راہِ کوے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دل پذیر، متاعِ ہنر کو میں

غالب! خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

بھی طائفے ہوتے تھے جنھیں ماتم کے موقع پر بلا لیا جاتا تھا اور وہ ماتم کر کے گھر والوں کو خوب رلایا کرتے تھے۔ کچھ مدت پیشتر تک ہندوستان میں بھی پیشہ ور ماتمی عورتیں موجود تھیں۔ مرزا بھی کسی ایسے ہی سے امداد کے خواہاں تھے "تا کہ دل و جگر دونوں کا ماتم بہ یک وقت ہو سکے"۔

۲۔ شرح: عاشق بیزار ہو کر گھر سے نکل آیا ہے۔ اس کا دل کسی صورت چین نہیں پاتا اور وہ بے اختیار پکار رہا ہے۔ کیا کروں؟ کدھر جاؤں؟ تسکین کا مقام صرف محبوب کا گھر ہے، لیکن رشک کے مارے اس کا نام نہیں لیتا اور یونہی پکار رہا ہے، کدھر کو جاؤں؟ کس طرف کا رخ کروں؟ رشک یہ کہ میں نے محبوب کا نام لے لیا تو دوسرا شخص بھی اس سے واقف ہو جائے گا۔ اندیشہ ہے کہ دیکھتے ہی وہ محبوب پر عاشق ہو کر رقیب بن جائے گا۔ اس ڈر کے مارے محبوب کا نام نہیں لیتا۔

۳۔ شرح: تیری آمد و رفت کے راستے سے میرا واقف ہو جانا غضب ہو گیا۔ وہ راستہ رقیب کے گھر کے سامنے سے گزرتا ہے۔ تیرے شوقِ دیدار میں مجھے ہزار مرتبہ وہاں جانا اور رقیب کے گھر کا دروازہ دیکھنا پڑا۔ اتنی کوفت ہوئی۔ دل پر ایسی چھریاں چلیں کہ آرزو ہو رہی ہے، کاش! مجھے تیری رہگزر کا علم نہ ہوتا۔

۴۔ شرح: پہلے بتایا جا چکا ہے کہ شاعروں نے جس طرح محبوب کے دہن کی تنگی میں مبالغہ کرتے کرتے اسے معدوم قرار دے دیا، اسی طرح کمر کے نازک اور پتلے ہونے پر زور دیتے دیتے اسے ناپید کر دیا۔ اب محبوب غالب سے کہہ رہا ہے کہ میں نے تیرے قتل کے لیے کمر کس لی ہے یعنی پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ تجھے نہیں

چھوڑوں گا۔ جواب ملتا ہے کہ آپ کی کمر ہے کیا جسے کس کے باندھا جائے؟ کیا ہیں اس کی حقیقی حیثیت سے واقف نہیں؟ یعنی جو کمر اتنی پتلی ہے کہ اسے موہوم مانا جاتا ہے، اسے آپ کس کر کیا باندھیں گے؟

۵۔ **شرح**: میں نے محبوب کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے گھر بار لٹا دیا اور اپنی حیثیت بگاڑ لی۔ اس پر دوسروں کا طعنے دینا تو تعجب کا مقام نہ تھا لیکن دیکھیے، محبوب بھی یہی کہہ رہا ہے کہ یہ ایک بے ننگ و نام شخص ہے۔ نہ اس کی کوئی حیثیت ہے، نہ معاشرے میں کوئی مرتبہ ہے۔ نہ اسے کوئی امتیاز حاصل ہے، اب میں ایسے شخص سے کیا ملوں، جس کے پاس نہ گھر ہے، نہ شریفوں کا سا ساز و سامان ہے اور مال اسباب ہے۔

شعر کا اسلوب ایسا ہے کہ اسے مضامینِ غزل کے بجائے زندگی کی ہر صورتِ حال پر ڈھال سکتے ہیں۔ مثلاً سیکڑوں مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے قوموں اور ملکوں کی بہتری و برتری کے لیے اپنا سب کچھ لٹا دیا اور انھیں لوگوں کی نظروں میں بے وقعت اور ذلیل ہوئے، جن کی خاطر قربانیاں کی تھیں۔ غرض شعر میں عمومیت ہے اور اس کا اطلاق مختلف معاملات پر ہو سکتا ہے۔ مرزا کے غیر فانی شعروں میں ایک یہ بھی ہے۔

۶۔ **شرح**: خواجہ حالی فرماتے ہیں:

> "طالبِ راہِ خدا کو جو حالت ابتدا میں پیش آتی ہے، اس کو اس تمثیل میں بیان کیا ہے۔ طالب اوّل اوّل جس شخص میں کوئی کرشمہ یا وجد و سماع و جوش و خروش دیکھتا ہے، اسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پھرتا ہے۔ پھر جب کوئی اس سے بڑھ کر نظر آتا ہے تو اس کا تعاقب کرتا ہے۔ وہلم جرّا اور وجہ اس تذبذب اور تزلزل کی یہی تو ہے کہ وہ کاملین کو پہچان نہیں سکتا۔"

یہ شعر کا صرف ایک پہلو ہے۔ زندگی کے ہر دائرے میں ایسے ہی حالات پیش آتے رہتے ہیں کہ انسان جس شخص کو دوسروں کے مقابلے میں ذرا تیز چلنے والا پاتا ہے،

اس کا دامن اس امید پر تھام لیتا ہے کہ اس کے ذریعے سے وہ بھی منزلِ مقصود پر پہنچ جائے گا۔ تھوڑے فاصلے تک ساتھ چلتا رہتا ہے، پھر واضح ہو جاتا ہے کہ منزل بہت دُور ہے اور یہ شخص تو وہاں تک نہیں پہنچائے گا۔ بعد ازاں کسی دوسرے تیز رفتار کے انتظار میں بیٹھ جاتا ہے۔ یہ کیفیت اس وقت تک طاری رہتی ہے، جب تک حقیقی رہنما اور رہبر کی پہچان نہ پیدا ہو جائے۔ قومی خدمت کے دائرے میں ایسی مثالیں عموماً زیادہ ملتی ہیں۔

اس مرتبے کے اشعار اساتذہ کے دواوین میں بہت کم ملتے ہیں۔

۷۔ **شرح** : میں تو اپنے ظالم محبوب کی محض چاہ میں مبتلا ہوں۔ عقل کے اندھوں اور احمقوں نے اسے پرستش قرار دے لیا یعنی یہ سمجھ لیا کہ میں اسے خدا سمجھ کر پوج رہا ہوں۔ یہ کتنا اندھیر اور کیسی اَن ہونی بات ہے؛

شعر کی اصل خوبی یہ ہے کہ خود عاشق کو پرستش اور خواہش کے درمیان حد بندی کی تمیز نہیں۔ وہ جس شے کو خواہش قرار دے رہا ہے، عملاً وہ پرستش کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ لوگ ٹھیک کہ رہے ہیں کہ عاشق نے محبوب کو پوجنا شروع کر دیا، لیکن عاشق حقیقی حالت سے بے خبری کے عالم میں اسی بات پر زور دیے جا رہا ہے کہ میرے دل میں تو اس کے لیے صرف چاہ ہے اور جو لوگ پرستش کا طعنہ دیتے ہیں انھیں احمق قرار دے کر اپنے دعوے کو قوت پہنچا رہا ہے۔

۸۔ **شرح** : عاشق ایک مرتبہ محبوب کے کوچے میں پہنچا اور اپنا سب کچھ کھو کر بیخود واپس آ گیا۔ اسی عالم میں اس نے کئی مرتبہ کوے یار کا قصد کیا، لیکن بیخودی کے عالم میں راستہ بھول جاتا رہا اور کہیں کا کہیں جا پہنچا۔ اب وہ پریشان ہو کر کہتا ہے کہ دیکھیے، میں نے پھر کوے یار کا قصد کیا تھا اور بیخودی کے باعث راستہ بھول گیا ورنہ وہاں ضرور جاتا اور اپنی خبر لے کر آتا۔

چونکہ پہلی مرتبہ وہاں جاتے ہی بیخود ہو گیا تھا۔ یعنی اپنا آپ وہاں کھو آیا تھا، اس لیے خود تو اسے کچھ خبر نہیں۔ وہاں جائے تو اپنا پتا لے کہ کیا حالت ہوئی۔

شعر میں بیخودی کے لفظ سے جو دقیق معنی پیدا کیے ہیں، وہ مرزا غالب ہی کا حصّہ ہے۔

۹۔ **لغات**۔ دل پذیر: دل میں سما جانے والا۔ دل میں اُتر جانے والا۔

شرح: میں عقل و دانش اور بصیرت و ادراک کو دل میں اتر جانے والی چیز سمجھتا ہوں۔ یہ ایسی متاع ہے، جس کے حسن و خوبی اور فضیلت میں کلام کی گنجائش نہیں۔ اپنے آپ پر قیاس کرتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ دنیا بھر کے لوگوں کی یہی کیفیت ہے، لیکن یہ میری غلط فہمی ہے، حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اہلِ دنیا کے نزدیک یہ چیزیں کچھ قدر و قیمت نہیں رکھتیں اور میرے لیے ساری دنیا کو اپنا ہمخیال، ہم مشرب اور ہم ذوق سمجھنا قطعاً درست نہ تھا۔

اس شعر میں انتہائی خوش اسلوبی سے علم و ہنر کی بے وقعتی اور قدر ناشناسی کا اظہار کیا ہے اور یہ طریقِ اظہار بھی مرزا غالب ہی کا حصّہ ہے۔

۱۰۔ **لغات**۔ علی بہادر: اس سے مراد نوّاب علی بہادر بن ذوالفقار بہادر نوّاب باندہ ہے۔ علی بہادر ۱۸۴۹ء میں مسند نشین ہوا۔ ۱۸۵۷ء میں مجاہدینِ آزادی کے ساتھ مل گیا۔ نومبر ۱۸۵۸ء میں ملکۂ وکٹوریا کے اعلان عفو عام کی بنا پر اس نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ انگریزوں نے ریاست چھین لی اور اندور میں نظر بند کر دیا۔ صرف تین سو روپیہ ماہانہ وظیفہ دیتے تھے۔ ۱۸۶۲ء میں انگریزوں کو کچھ خیال آیا اور اسے بمبئی بُلا کر دربار میں جگہ دی گئی۔ ۱۸۷۳ء میں وفات پائی۔ مُنیر شکوہ آبادی کو نوّاب علی بہادر سے دلی تعلق تھا۔ اس کی وفات پر جو تاریخ کہی، اس میں نوّاب کی پوری سیرت کا نقشہ پیش کر دیا۔

نوّاب علی بہادر! اے بحرِ کرم — یوسف طلعت، شجاع یکتا نہ ہے ہے!!
اے قدر شناس و ناز بردارِ منیر — اے اہلِ سخن کے عزّت افزا ہے ہے!!
اے مسند نشین خلق و اقبال و شکوہ — اے بزمِ کرم کے مسند آرا ہے ہے!!

اٹھ جائے جواں جو تو زمانے سے ہائے — صد حیف افسوس، وا دریغا ہے ہے!
تاریخ تری یہ رو کے کہتا ہے منیرؔ — فیّاضِ زماں، امیرِ زیبا، ہے ہے!!

بڑا فیاض اور دوست نواز تھا۔ مرزا غالب کے ساتھ ننھیال کے ذریعے سے رشتہ داری بھی تھی۔ کلکتہ جاتے ہوئے مرزا اسی رشتہ داری کے باعث باندہ ٹھہرے تھے۔ غالباً اس زمانے میں ذوالفقار بہادر نواب تھا۔ اسی کے لیے غالب نے فارسی میں کہا ہے :

نواب ذوالفقار بہادر کہ بودہ است
نام تو در مصاف فلک ذوالفقار من

شرح : اے غالب! خدا کرے کہ میں اپنے عزیز نواب علی بہادر کو، جس کا خاندان بہت بلند ہے، فخر و امتیاز کے گھوڑے پر سوار دیکھوں۔

ذکر میرا، بہ بدی بھی، اسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دُور نہیں

وعدۂ سیرِ گلستاں ہے، خوشا طالعِ شوق!
مژدۂ قتل مقدّر ہے، جو مذکور نہیں

شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے، عالم
لوگ کہتے ہیں کہ "ہے" پر ہمیں منظور نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا، لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

۱۔ **شرح** : محبوب کو یہ بھی منظور نہیں کہ کوئی شخص اس کی محفل میں میرا ذکر برائی کے ساتھ کرے۔ یعنی اسے اتنی نفرت ہو گئی ہے کہ کسی بھی شکل میں میرا نام سننا گوارا نہیں کرتا۔ رقیب عادی ہے کہ اس سے میرا ذکر برائی کے ساتھ کرے۔ اب اس پر محبوب بگڑ جائے اور رقیب کو بھی قہر و عتاب کا تختۂ مشق بنائے تو کچھ بعید نہیں۔

حسرت اے ذوقِ خرابی! کہ وہ طاقت نہ رہی
عشقِ پُر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں

میں جو کہتا ہوں کہ "ہم لیں گے قیامت میں تمہیں"
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ "ہم حور نہیں"

ظلم کر ظلم، اگر لطف دریغ آتا ہو
تُو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

صاف دُردی کشِ پیمانۂ جَم ہیں، ہم لوگ
وائے وہ بادہ کہ اَفشردۂ انگور نہیں

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ
میرے دعوے پہ یہ حُجت ہے کہ مشہور نہیں

۲۔ لغات۔ مقدر: بات کرتے یا کہتے وقت ایسے الفاظ چھوڑ جانا جو قرینے سے سمجھ میں آجائیں۔ پوشیدہ مرموز۔

شرح: میرے عشق کی کتنی خوش نصیبی ہے کہ محبوب نے باغ کی سیر کا وعدہ کر لیا ہے۔ اس وعدے میں ایک بات مقدر چھوڑ دی اور اس کا ذکر نہ کیا۔ یعنی ضمناً قتل کی خوشخبری بھی سنا دی۔

مطلب یہ ہے کہ سیرِ باغ سے حقیقتہً سیر مقصود نہیں، بلکہ میرا خون بہانا مقصود ہے تاکہ اس کی سرخی سے گرد و پیش پھول کھلے ہوئے نظر آئیں اور زمین میرے خون سے اسی طرح آراستہ ہو جائے، جس طرح باغ پھولوں سے آراستہ ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ عاشق نے سیرِ گلستان کے وعدے سے سمجھا، یعنی سیرِ گلستان کا ذکر ہوا اور عاشق نے اسے مژدۂ قتل سمجھ لیا۔ مذکور سیرِ گلستاں ہوئی اور مقدر مژدۂ قتل۔

۳۔ لغات۔ شاہدِ ہستی مطلق: وہ محبوب، جو علی الاطلاق موجود ہے یعنی محبوبِ حقیقی۔

منظور: مولانا طباطبائی نے اسے مبصَر و مرئی (یعنی دیکھا گیا) کے

معنی پر لیا ہے، پھر فرمایا ہے کہ محاورہ ساتھ نہیں دیتا۔

لیکن اس تکلف کی ضرورت کیا ہے؟ "منظور نہیں" کو عام معنی میں کیوں استعمال نہ کیا جائے؛ یعنی ہم نہیں مانتے، ہمیں یہ تسلیم نہیں۔

شرح : لوگ کہتے ہیں کہ یہ دنیا محبوب حقیقی کی کمر ہے، جو شاعروں کے نزدیک موہوم مانی جاتی ہے۔ یقیناً اس طرح ہستیِ دنیا کی نفی تو ہو گئی، لیکن لوگ ساتھ ہی "ہے" کا لفظ استعمال کرتے ہیں، جس سے اثبات کا پہلو نکلتا ہے، لہذا ہم ان کا قول تسلیم نہیں کرتے، کیونکہ دنیا اس درجہ معدوم ہے کہ اس کی نفی کرتے ہوئے بھی کوئی اثباتی لفظ لانا قابل قبول نہیں سمجھا جا سکتا۔

۴۔ **لغات** ۔ **تنگ ظرفی** : ظرف کا تنگ ہونا، کم حوصلہ اور بے ہمت ہونا۔
منصور : اصل نام حسین تھا، منصور اس کے والد کا نام تھا، لیکن شعرا میں اصل نام کے بجائے باپ ہی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ روایت ہے کہ اس نے "انا الحق" کہا، یعنی میں خدا ہوں اور موت کی سزا پائی۔

شرح : یقیناً ہماری ہستی کا قطرہ بھی سمندر میں مل کر سمندر بن چکا ہے، یعنی ہمیں بھی فنا فی الذات کا مقام حاصل ہو چکا ہے، لیکن ہمارا ظرف منصور کی طرح تنگ نہیں کہ چھلک جائیں اور "انا الحق" پکار اٹھیں۔ ہم اس کم حوصلہ اور بے ہمت کی پیروی نہیں کر سکتے، جو فنا فی الذات کے مقام پر پہنچ جانے کے بعد اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ اور صبر و ضبط نہ کر سکا۔

۵۔ **لغات** ۔ **پُر عربدہ** : جنگجو، لڑاکا، ہنگامہ آرا۔
گوں : روش۔ ڈھب۔ قابل۔ لائق۔
رنجور : بیمار۔ کمزور۔ ناتواں۔

شرح : اے خرابی کے ذوق و شوق! افسوس کہ پہلے کی سی طاقت باقی نہ رہی۔ میرا جسم عشق کے صدمے سہ سہ کر اس درجہ بیمار، کمزور اور ناتواں ہو گیا کہ اب عشق کی معرکہ آرائیوں اور ہنگامہ خیزیوں کے قابل نہیں رہا۔

حسرت اس امر پر ہے کہ مزید تباہ و برباد ہونے کا ذوق باقی ہے، لیکن جسم اب ساتھ نہیں دیتا۔ عشق ایسی بلا ہے کہ اس کے لیے ہر قسم کی سختیاں سہنے کی تاب ہونی چاہیے۔ میرے جسم میں اب یہ خصوصیت باقی نہیں رہی۔

۶۔ **لغات** : رعونت : غرور۔ تکبر۔

شرح : جب میں اپنے محبوب سے کہتا ہوں کہ قیامت کے دن جزا و سزا کا فیصلہ ہوگا۔ ہم جنت میں جائیں گے اور حوریں ملیں گی تو ہم کہیں گے کہ ہمارا محبوب ہی ہمیں دے دیجے اور تمہیں کو ہم لے لیں گے تو دیکھیے، کس غرور و تکبر سے جواب دیتے ہیں! "جناب! ہم حور نہیں، کہ آپ ہمیں لے سکیں۔

اس شعر میں بھی اچھوتے انداز سے محبوب کو حوروں سے اعلیٰ تر ثابت کیا گیا ہے کہ وہ نفرت بھرے غرور سے اپنے حور ہونے کا منکر ہے، گویا حور کو ایک حقیر چیز سمجھتا ہے۔

۷۔ **لغات** ۔ دریغ آنا : دریغ ہونا، تامل کرنا، بخل سے کام لینا۔

معذور : عذر کیا گیا۔ مجبور۔ ناچار۔ معافی کے قابل۔

شرح : اے محبوب! اگر تجھے لطف و کرم میں تامل ہے اور اسے میرے لیے گوارا نہیں کرتا تو ظلم ہی کرتا جا۔ ظلم کی تکرار سے مقصود تاکید ہے کہ ضرور ظلم ہی کر۔ لیکن تو تغافل سے کام لینا چاہتا ہے۔ اس بارے میں تیرا کوئی عذر قابلِ تسلیم نہیں سمجھا جا سکتا۔

تغافل کا مطلب یہ ہوگا کہ تجھے ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ہمیں منظور نہیں۔ دونوں صورتوں میں سے کوئی ایک اختیار کر لے۔ تو ہمیں مہربانی کے قابل نہیں سمجھتا تو نہ سہی، ہم ظلم سہنے کے لیے تیار ہیں۔ ان حالتوں میں تجھ سے تعلق قائم رہتا ہے، جیسا کہ دوسری جگہ مرزا نے کہا ہے:

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے

کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

نیز :

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ، عداوت ہی کیوں نہ ہو

۸۔ **لغات** ۔ دُردی کَش : تلچھٹ پینے والا۔
جَم : جمشید، ایران کا بادشاہ، جس سے شراب کی ایجاد منسوب ہے۔
افشردۂ انگور : انگور کا نچوڑا ہوا عرق۔
شرح : ہم لوگ جمشید کے پیالے کی تلچھٹ پینے والے ہیں۔ اس شراب پر افسوس، جو انگور کے عرق سے تیار نہ کی گئی ہو۔
اپنی شراب نوشی کو جمشید سے منسوب کر کے اس کا رتبہ حد درجہ بلند کر دیا۔ پھر کہا کہ اس رتبے کے میکشوں کے لیے عرقِ انگور کے سوا جو شراب ملے، وہ باعثِ صد افسوس ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مرزا کو دیسی شراب سے سخت نفرت تھی، جو گڑ اور ببول کی چھال سے تیار کی جاتی تھی۔ وہ خود ایک خط میں لکھتے ہیں : "یہ گڑ چھال کی شراب مجھے پسند نہیں، یہ مجھے مضرت کرتی ہے" فارسی میں بھی کہا ہے :

غالبؔ ز شرابِ قندیِ ہندم کباب کرد
زیں بعد بادہ ہائے گوارا کشیدہ باد

نیز :

شرابِ قندیِ ہندوستاں دماغم سوخت
ز شیرہ خانۂ کشمیر آورید شراب

اسی لیے وہ انگوری شراب کے رسیا تھے، لہٰذا کہا :

وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں۔

۹۔ **لغات** ۔ ظہوری : لفظی معنی صاحب ظہور۔ یعنی ظاہر و آشکار اور مشہور۔ فارسی کا ایک مشہور شاعر و ادیب، جس نے زندگی کا بڑا حصہ بیجا پور میں گزارا

اور وہیں وفات پائی۔

خفائی : لفظی معنی چھپا ہوا اور پوشیدہ، یعنی جو شہرت سے محروم ہو۔

شرح : اے غالب! میں خفائی ہونے کے باوجود ظہوری کی ٹکر کا ہوں

میرے دعوے پر دلیل یہ ہے کہ مجھے شہرت حاصل نہیں۔

چونکہ میں مشہور نہیں، اس لیے ظہوری کے مقابلے میں مجھے خفائی کہنا چاہیے،

لیکن مشہور نہ ہونے کے باوجود میں ظہوری کا مدِ مقابل ہوں۔

- ظہور" اور "خفا" نیز ظہوری اور خفائی کا تقابل بالکل واضح ہے۔

نالہ، جُز حُسنِ طلب، اے ستم ایجاد! نہیں
ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں
عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو، کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں
کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں
اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث، مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں
وائے محرومیِ تسلیم و بدا! حالِ وفا
جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

۱۔ لغات ۔

حُسنِ طلب : کوئی چیز اچھے طریقے پر طلب کرنا۔

ستم ایجاد : وہ محبوب، جو ظلم و ستم کے نئے نئے طریقے نکالتا ہے۔

شرح : اے ظلم و ستم کے نئے نئے طریقے نکالنے والے محبوب! اگر میں آہ و فغاں کرتا ہوں تو اس سے تیرے ظلم و ستم کی شکایت مقصود نہیں، بلکہ یہ تو حسنِ طلب ہے۔ میرا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ تجھ سے مزید جور و جفا کا تقاضا

رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے ؟
گرچہ راغانِ سرِ رہگذرِ باد نہیں
سَبدِ گُل کے تلے بند کرے ہے گلچیں
مژدہ، اے مرغ! کہ گلزار میں صیّاد نہیں
نفی سے کرتی ہے اثبات ترادِش گویا
دی ہے جائے دہن اس کو دمِ ایجاد "نہیں"
کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے، ولے اِس قدر آباد نہیں
کرتے کِس مُنہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

کروں۔ لیکن ایسے طریق پر جو اچھا اور پسندیدہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اور جور و جفا کا تقاضا یوں کیا کہ آہ و فغاں شروع کر دی تاکہ محبوب ناراض ہو اور غصے میں آ کر مزید بیداد کرنے لگے۔ گویا آہ و فغاں مزید جور و جفا کی طلبی کا ایک اچھا اور احسن ذریعہ بن گئی۔

۲۔ لغات: خسرو: ایران کا ایک بادشاہ، جسے خسرو پرویز کہتے ہیں مشہور حسینہ شیریں اس کی بیوی تھی۔

عشرت گہ: وہ مقام، جہاں عیش و عشرت کی جائے۔ یہاں اس سے مقصود خسرو کا محل اور باغ ہیں۔ یہ بتا دینا چاہیے کہ بغداد سے ہمدان کی طرف جائیں تو خانقین و حلوان کے درمیان پہاڑوں میں ایک مقام آتا ہے، جہاں ایک مقام اب تک قصرِ شیریں کے نام سے معروف ہے۔ یہی مقام تھا، جسے "عشرت گہِ خسرو" کہا جا سکتا ہے۔ اب اس کے صرف کھنڈر رہ گئے ہیں۔

فرہاد: شیریں کا عاشق، جس کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اسے شیریں کے باغ کے لیے پہاڑ چیر کر نہر لانے کا حکم دیا گیا تھا اور وعدہ

کرلیا گیا تھا کہ نہر مکمل ہوتے ہی شیریں تمھیں مل جائے گی۔ فرہاد نے
نہر مکمل کر دی، لیکن اسے شیریں کے مرجانے کی جھوٹی خبر سنا کر
خودکشی پر مجبور کر دیا گیا۔ یہ عام افسانہ ہے، تاریخی حقائق سے
اسے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ سمجھا جاسکتا ہے کہ پانی مزدور پہاڑ سے
لایا گیا۔ مگر پہاڑ کاٹ کر نہیں زیادہ تر ویسی ہی محرابی گزرگاہیں
بنا کر جیسی لمبی پانی لانے کے لیے سنگ و گچ سے بنایا کرتے تھے۔

شرح : مرزا کہتے ہیں کہ فرہاد تو عشق کا دعویٰ رکھتا تھا، پھر اس نے
اپنے رقیب خسرو پرویز کے باغ اور محل کے لیے پہاڑ کاٹ کر نہر لانے کی
مزدوری کیوں قبول کی؟ بھلا سچے عاشق بھی رقیبوں کی عیش و عشرت کے لیے
مزدوری کر کے مزدوری سر و سامان بہم پہنچاتے ہیں؟ حق یہ ہے کہ ہم تو فرہاد
کی نیک نامی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

بحث یہ نہیں کہ فرہاد اچھا تھا یا بُرا، اس کا رتبہ بلند تھا یا نہیں تھا۔ یہاں
بحث صرف یہ ہے کہ مرزا نے فرہاد کے افسانے سے ایک نکتہ ایسا پیدا کر لیا،
جو یقیناً اس مسکین کے لیے نیک نامی کا باعث نہیں سمجھا جا سکتا۔ یعنی عاشق
ہو کر رقیب کی عیش و عشرت کے لیے مزدوری پر آمادہ ہو جانا کون سی خوبی کی
بات ہے؟ اگر کہا جائے کہ فرہاد شیریں کے لیے نہر نکالنے پر آمادہ ہوا تھا تو،
شیریں خسرو پرویز کی بیوی تھی، اس کے محل اور باغ کے لیے جو نہر لائی گئی،
وہ بہر حال خسرو پرویز ہی کی عشرت گاہ کے لیے تھی۔

۳ - **شرح** : پہلے مصرع میں "وہ" کا اشارہ گھر کی طرف ہے، تصریح
اس لیے ضروری ہوئی کہ مرزا غالباً ضرورت شعری سے مجبور ہو کر "دشت"
کو "گھر" سے پہلے لائے۔

بے شک میرا گھر بھی خرابی و ویرانی کے اعتبار سے دشت کے مقابلے میں کم
حیثیت نہیں رکھتا، لیکن اس میں وہ پہنائی اور کشادگی کہاں، جو دشت میں ہے

گھر کا رقبہ زیادہ سے زیادہ سو گز اور دشت کے طول و عرض کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے دشت میں میری زندگی ایسی خوش اسلوبی سے گزر رہی ہے اور میں اتنا خوش ہوں کہ گھر مجھے یاد ہی نہیں۔

۴۔ **لغات۔ اہلِ بینش** : اہلِ بصیرت، اہلِ عقل و دانش، دیدہ ور۔
حوادث : حادثہ کی جمع۔
لطمہ : تھپیڑا
سیلی : طمانچہ۔ تھپڑ۔

شرح : حادثوں کے جو طوفان اٹھتے ہیں، وہ اہلِ نظر و بصیرت کے لیے ایک درس گاہ ہیں، جہاں انھیں زندگی کے ضروری سبق ملتے ہیں۔ یعنی ان سے کوئی غلطی ہوتی ہے تو پتا چل جاتا ہے۔ کسی معاملے میں ٹھیک ٹھیک تدبیر نہ کر سکے ہوں، اس لیے نقصان اٹھایا ہو تو حقیقت ان پر واضح ہو جاتی ہے۔ گویا تمام آفتیں اور حادثے ان کے لیے رہبری اور رہنمائی کا سامان ہیں اور ہر حادثے کی لہر سے ان پر جو ضرب لگتی ہے، وہ دراصل استاد کا تھپڑ ہوتا ہے، جو شاگرد کو غلطی پر متنبہ کرتا ہے اور اس میں سراسر شفقت کا پہلو ہوتا ہے۔

مرزا نے طوفانِ حوادث کو مکتب قرار دینے میں حقیقت اس طرح واضح کر دی کہ اس سے زیادہ توضیح ممکن نہ تھی، مثلاً:

۱۔ جس طرح حصولِ علم کے لیے مکتب میں جانا ضروری ہے، اسی طرح زندگی کے مراحل میں طوفانِ حوادث سے گزرے بغیر چارہ نہیں۔

۲۔ جس طرح مکتب کا ماحول شاگرد کے لیے شفقت و تربیت اور علم و بصیرت کا ماحول ہوتا ہے، اسی طرح حوادث کو بھی خوف یا کراہت سے نہ دیکھنا چاہیے۔ قدرت کی طرف سے ان کا انتظام اس لیے ہوتا ہے کہ انسانوں نے جو باتیں سیکھی نہیں یا سیکھیں اور بھول گئے یا انھوں نے فہم و بصیرت سے ٹھیک ٹھیک کام نہ لیا، حوادث کے ذریعے سے ان کی یہ کمی پوری کر دی جائے۔ گویا زندگی کے مراحل میں حوادث کی حیثیت وہی ہے

جو مکتب میں استاد یا اساتذہ کی ہوتی ہے۔

۳۔ طوفانِ حوادث کو مکتب قرار دیتے ہیں۔ ان کی تلخی، ناخوشگواری اور دہشت زائل کر دی اور یہ بتا دیا کہ ان سے مزید علم حاصل کرنا چاہیئے اور حوادث کے بغیر علم و تجربہ میں پختگی پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔

۴۔ یہ حقیقت آشکارا کر دی کہ زندگی میں انسان کے لیے کتنے ہی ناخوشگوار واقعات پیش آئیں۔ اگر حقیقت پر نظر ہو تو وہ تمام واقعات درسگاہیں ہیں جن سے سبق سیکھا جاتا ہے تاکہ زندگی زیادہ کامیابی سے بسر کی جا سکے۔

۵۔ لغات۔ بدا : بہت بُرا۔ افسوس۔

شرح : آہ! تسلیم و رضا کا مظلوم ہونا اور افسوس! وفا کی بدحالی، ہم تو اس لیے خاموش ہیں کہ محبوب سے وفاداری پر کوئی حرف نہ آئے اور اس کے رد و بد تسلیم و رضا میں خلل نہ پڑے، لیکن اس نے یہ سمجھ لیا کہ ہم میں آہ و فغاں کی طاقت ہی نہیں رہی۔ گویا ہم نے جو طریقہ عشق و محبت کے تقاضوں کی بنا پر اختیار کیا، محبوب سمجھتا ہے کہ وہ ہماری بیچارگی و ناتوانی کا نتیجہ ہے۔ ظاہر ہے کہ تسلیم و رضا کی مظلومی اور وفا کی بدحالی اس سے بڑھ کر کیا ہو گی؟

۶۔ لغات۔ تمکین : تمکّن۔ ٹھہراؤ، جماؤ، قرار۔

شرح : اگر لالہ و گل ہوا کے راستے پر چراغاں کی حیثیت نہیں رکھتے تو ان کے ٹھہراؤ، جماؤ اور قرار کا رنگ پریشاں کیوں ہے؟

جو چراغ راستے پر جلایا جائے اور راستہ بھی ہوا کا ہو، وہ کبھی طبعی طریق پر روشن نہیں رہ سکتا، برابر جھلملاتا رہے گا اور جلد بجھ جائے گا۔ بالکل یہی کیفیت لالہ و گل کی ہے۔ ان کی حیثیت بھی ہوا کے راستے کے چراغوں کی ہے۔ وہ بھی جلد بجھ جانے والے ہیں اور ایسے چراغوں میں قیام و قرار کا رنگ لازماً پریشان ہو گا، یعنی ان کے لیے قیام و بقا کی کوئی صورت نہیں۔ آج کھلتے ہیں، تھوڑی دیر میں پنکھڑیاں ایک ایک کر کے الگ ہو جائیں گی اور وہ ناپید ہو جائیں گے۔ ایسی چیزوں کے لیے ثبات کا رنگ

جینے کی کوئی صورت نہیں۔

جو چیزیں زندگی میں حسن و جمال کے اعتبار سے بہت عزیز سمجھی جاتی ہیں، ان کی بے ثباتی ایسے عمدہ اور مناسب حال انداز میں پیش کی گئی ہے کہ اس سے بہتر طریقہ ذہن میں نہیں آسکتا۔

۷۔ **لغات۔ سَبَدِ گُل** : وہ ٹوکری جس میں پھول چن چن کر جمع کیے جاتے ہیں۔

شرح : اے پرندے! خوشخبری ہو کہ گلچیں یعنی پھول چننے والا تجھے پھولوں کی ٹوکری کے نیچے بند کر رہا ہے اور صیاد باغ میں موجود نہیں۔

مرغ سے مراد بظاہر بلبل ہے۔ پھولوں کی ٹوکری میں بند کر دینے سے اول پنجرے کی سختیاں ختم ہو گئیں، دوم پھولوں سے نہ صرف قرب حاصل ہوا، بلکہ بلبل کے ارد گرد ہر طرف پھول ہی پھول ہوں گے اور صیاد جو پرندے کے لیے سب سے بڑی مصیبت ہے، موجود نہیں۔

جس صورتِ حال پر اس کا اطلاق نہایت موزوں طریق پر ہو سکتا ہے، بہ ظاہر وہ مرزا کے سامنے نہ تھی۔ مثلاً انگریزی تسلط کے آخری دور کو لیجے۔ آزادی کا جذبہ عام ہو گیا تھا۔ انگریزوں کے لیے اطمینان سے مستقر رہنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ انھوں نے اصلاحات کا خاکہ تیار کیا۔ اور اسے نافذ کر دیا۔ یہ پرندے کو سبدِ گل کے تلے بند کرنے کی صورت تھی اور ظاہر یہ کیا گیا تھا کہ صیاد باغ سے نکل گیا ہے یا اس نے صیادی کی جگہ گلچینی اختیار کر لی ہے یعنی اب پہلے کی طرح شکار نہیں کرتا۔ قوت کے بل پر محکوموں کو نہیں دباتا صرف مالی فائدے اٹھاتا ہے، یعنی پھول چنتا ہے۔ ایسی صورتیں مختلف احوال میں مختلف مقامات پر پیش آئیں۔

۸۔ **لغات۔ نفی و اثبات** ۔ نفی کے معنی "نہیں" اثبات کے معنی "ہاں"۔ اصطلاح میں ان دونوں لفظوں کے معنی وسیع ہیں۔ کلمۂ طیبہ بھی انھیں دونوں کا مجموعہ ہے پہلے کلمۂ نفی ہے یعنی لا الٰہ (کوئی معبود نہیں) پھر کلمۂ اثبات ہے یعنی اِلّا اللہ (اللہ کے سوا) نفی اصطلاحِ تصوّف میں اپنے آپ کو وجودِ حقیقی میں فنا کر دینے

اور اس طرح اس وجود کا اثبات کرنے کو بھی کہتے ہیں۔ اذکار میں ذکر نفی و اثبات سے مقصود کلمۂ طیبہ کا ذکر ہے۔

تراوش : ٹپکنا، نکلنا، ظاہر ہونا۔

شرح : جس طرح کلمۂ توحید میں نفی سے اثبات کا ظہور ہوتا ہے، وہی کیفیت ہمارے محبوب میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تخلیق کے وقت اسے دہن تو دیا ہی نہیں، اس کی جگہ "نہیں" دے دی یعنی وہ ہر بات پر انکار کرتا ہے اور کلمۂ نفی استعمال کرنا اس کا شیوہ ہے۔ اسی "نہیں" سے ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کا دہن ہے، گویا نفی سے اثبات کا ظہور ہوتا ہے۔

بیشتر اصحاب نے اعتراض کیا ہے کہ مرزا نے یہاں اثبات کو مؤنث استعمال کیا، حالانکہ یہ مذکر ہے اور مرزا خود کہہ گئے ہیں :

ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

لیکن جن الفاظ کی تذکیر و تانیث محض اعتباری ہے، ان میں زیادہ مین میکھ نہیں نکالنی چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرزا نے ایک مضمون پیدا کیا اور "اثبات کرتا ہے" لاتے تو "کرتا" کا الف دب جاتا اور مرزا نے خود تیاّح کے نام لکھا ہے کہ جہاں الف دبتا ہے، میرے کلیجے میں ایک تیر لگتا ہے۔ یقیناً اسی وجہ سے "کرتا ہے" کے بجائے "کرتی ہے" لکھ دیا اور اعتباری تذکیر و تانیث میں اسے قابلِ گرفت نہ سمجھنا چاہیے۔

۹۔ **شرح** : ظاہری جلوہ آرائی میں بہشت بھی تیرے کوچے سے کم نہیں۔ نقشہ تو واقعی یہی ہے، لیکن وہاں اتنی آبادی نہیں۔

مطلب یہ کہ محبوب کے کوچے میں عشاق کا جو ہجوم رہتا ہے، ویسا ہجوم بہشت میں نظر نہیں آتا۔

ایک پہلو یہ نکالا جا سکتا ہے کہ محبوبِ حقیقی کے شیدائیوں کا جو ہجوم اس کا جلوہ دیکھنے کا مشتاق ہے، وہ تعداد میں اتنا زیادہ ہے کہ بہشت میں جانے والوں کی تعداد کو اس سے کوئی مناسبت نہیں۔ مرزا غالب کے فلسفے کے مطابق بہشت میں وہ جائیں گے

جو نیک عمل کی جزا پائیں گے، لیکن دیدار کے آرزومند بہشت سے کوئی سروکار نہ رکھیں گے اور دیدار ہی کے منتظر رہیں گے۔ ان کی تعداد حسنِ عمل کی جزا پانے والوں سے بہت زیادہ ہوگی۔

۱۰۔ شرح : اے غالب! تم کس مُنہ سے بے وطنی کی شکایت کر رہے ہو؟ کیا تمھیں یاد نہیں کہ وطن کے دوستوں اور رفیقوں نے کیسی بے مہری سے کام لیا اور تمھاری قدر و منزلت پہچاننے سے کس درجہ غفلت برتی۔

وطن سے محبت اہلِ وطن کی مہربانی، قدر شناسی اور ہمدردی کی بنا پر ہے۔ جہاں یہ چیزیں ناپید ہوں، وہاں وطن اور بے وطنی میں کچھ فرق نہیں رہتا۔ مرزا غالب بھی بے وطنی کی شکایت اسی بنا پر بیجا قرار دیتے ہیں کہ یارانِ وطن سے بے مہری کے انتہائی صدمے اٹھا چکے ہیں۔

دیوانِ غالب کا جو نسخہ شیرانی مرحوم نے فراہم کیا تھا، اس کے حاشیے کی تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ یہ غزل بھی باندہ میں کہی گئی تھی، جب مرزا غالب کلکتہ جاتے ہوئے باندہ میں ٹھہرے تھے اور اغلب ہے، وہاں کے کسی مشاعرے میں پڑھی گئی ہو، لہذا مقطع کی مناسبت کسی تشریح کی محتاج نہیں۔

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم؟
ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں؟

۱۔ شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں:
"اپنی مزاج کی بلند حوصلگی اور اس کے ساتھ شرافتِ نفس کا اظہار ہے۔ یعنی میں جو دونوں جہان لے کر خاموش رہا، اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ میں ان پر قانع ہو گیا، بلکہ مجھ کو زیادہ

مانگنے اور تکرار کرنے سے شرم آئی۔ اس لیے خاموشی اختیار کر لی ؎

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دونوں جہان دے دیے۔ دنیوی زندگی کی شادمانیاں اور کامرانیاں بھی عطا کیں، اُخروی زندگی کی نعمتیں بھی بخشیں اور انھیں انسان کے لیے خوشی کا سامان قرار دیا۔ انسان ان پر قناعت نہیں کر سکتا تھا، دل سے خوش نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ یہ نعمتیں ذات سے جدائی قبول کرنے کی صورت میں مل رہی تھیں، لیکن یہاں یہ شرم دامنگیر ہوئی کہ اب عطا کرنے والے سے تکرار کیا کریں۔ کیا کہیں کہ ہمیں ان نعمتوں کے بجائے صرف ذات میں ضم ہی رہنا منظور ہے۔ واقعی خواجہ حالی کے ارشاد کے مطابق یہ فراخ حوصلگی اور شرافت نفس کا اظہار ہے اور اسے انسان کی بندگی وعبودیت کا بھی ایک کرشمہ سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ مل گیا، اگرچہ اس پر قناعت کی کوئی وجہ نہ تھی، لیکن عطا کرنے والے سے تکرار کو عبودیت کے منافی سمجھا اور شرم کے مارے چُپ رہا۔

۲۔ **شرح** : تیرے شیدائی تیری تلاش میں نکلے، لیکن دو دو چار چار سلوک و معرفت کی منزلوں میں تھک تھک کر ٹھہرتے گئے۔ تُو ہی فرما کہ تیرا پتا نہ ملے تو یہ بے بس اور بے چارہ لوگ کیا کریں؟

مطلب یہ ہے کہ سلوک و معرفت کی کتنی ہی منزلیں طے کر لی جائیں، لیکن انسان کے لیے حقیقت تک پہنچنا مشکل ہے۔ جسے دیکھو سفر سے چور ہو کر کسی نہ کسی منزل پر رُک گیا ہے، آگے قدم بڑھانے کی ہمت نہیں رہی۔

۳۔ **لغات**۔ ہوا خواہ : خیر خواہ، ہمدرد، غمگسار۔

شرح : کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اہلِ بزم کے دل میں شمع کی خیر خواہی، ہمدردی اور غمگساری کا کوئی جذبہ موجود نہیں؟ یہ غلط ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ جب غم ہی جان گھُلا دینے والا ہو تو بیچارے غمخواروں کے بس میں کیا رہ جاتا ہے؟

محفل کا جما رہنا صرف شمع کے روشن رہنے پر موقوف ہے۔ شمع نہ ہو تو محفل جم ہی نہیں سکتی۔ اس صورت میں کون کہہ سکتا ہے کہ اہل محفل شمع کے ہمدرد نہیں؟ لیکن اس کے لیے قدرت نے غم کا ایسا سوز مقدر کر دیا ہے، جو اس کی روشنی کا لازمہ ہے۔

وہ جب تک روشن رہے گی، پگھلتی جائے گی۔ اس جان گھلا دینے والے غم کا علاج غمخوار نہیں کر سکتے۔ علاج یہ ہے کہ شمع بجھا دی جائے۔ شمع بجھ جائے گی تو محفل ہی باقی نہیں رہے گی۔

اس شعر میں ایک حقیقت یہ بیان کی ہے کہ ہر شے کا وجود کسی نہ کسی مقصد کے لیے ہے۔ شمع کے وجود کا مقصد یہ ہے کہ محفل میں روشنی کرے۔ روشنی ہوگی تو وہ پگھلے گی اور غمخواروں کی ہمدردی اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی، کیونکہ اسے مقصد سے ہٹانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ہستی ختم ہو جائے۔ اسی طرح کائنات کا ہر وجود قدرت کا مقرر کیا ہوا مقصد پورا کر رہا ہے اور تکمیل مقصد کے جو لوازم ہیں ان سے وہ بچ نہیں سکتا۔

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر
عشق کا اُس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

۱۔ شرح : غیر کی خوش بیانی اور چکنی چپڑی باتیں محبوب کے دل پر اثر کر گئی ہیں اور اس نے غیر کو اپنا سچا عاشق سمجھ لیا ہے۔ ہم اپنے بارے میں کچھ کہنے سے اتنا پرہیز کر رہے ہیں کہ کہنا چاہیے، ہم بے زبان ہیں۔ ہم واقعی اس کے سچے عاشق ہیں، لیکن ہم پر اسے عشق کا گمان تک نہیں۔

اس شعر میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ بسا اوقات انسان ظاہری نمود و نمائش کا اثر قبول کر لیتا ہے اور وہ حقیقت تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس وجہ سے منافق درجۂ اعتبار حاصل کر لیتے ہیں، کیونکہ وہ اپنے متعلق بے تکلف لمبے چوڑے دعوے کرتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ مخلص ہیں اور خلوص کی بنا پر زبانی دعووں کو کوئی وقعت نہیں دیتے، وہ محروم رہ جاتے ہیں۔ زندگی کے ہر دائرے میں اس صورتِ حال کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

قیامت ہے کہ سُن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا
تعجب سے وہ بولا: "یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں!"

دلِ نازک پہ اُس کے رحم آتا ہے مجھے، غالب!
نہ کر سرگرم اُس کافر کو اُلفت آزمانے میں

۱۔ شرح: عاشق نے محبوب کو رام کرنے کی غرض سے مجنوں اور لیلیٰ کا قصہ سنایا جب یہ بتایا کہ لیلیٰ قیس کی دلداری کے لیے اس کے پاس صحرا میں پہنچ گئی تھی تو ستم دیکھیے کہ اس پر محبوب کے دل میں کوئی مہربانی اور کوئی ملائمت پیدا نہ ہوئی، بلکہ وہ تعجب سے بولا کہ آیا دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے! یعنی یہ بھی ہوتا ہے کہ محبوب بے حجاب ہو کر عاشق کے پاس پہنچ جائے۔

مولانا طباطبائی نے اس شعر سے لزوم کا ایک طویل سلسلہ پیدا کیا ہے۔ فرماتے ہیں، لیلیٰ کے اس فعل پر تعجب کا سبب یہ ہوا کہ محبوب نے ایسا شرم و حیا کے خلاف سمجھا۔ شرم و حیا کے خلاف سمجھنے سے یہ معنی لازم آئے کہ لیلیٰ پر اس نے تشنیع کی، یعنی اسے طعنہ دیا۔ ساتھ ہی یہ حقیقت ظاہر ہو گئی کہ خود محبوب کے نزدیک عاشق کی خبر لینے میں شرم و حیا مانع ہے۔ غرض اس شعر میں بلاغت کی وجہ یہی سلسلۂ لزوم ہے۔

۲۔ شرح: اے غالبؔ! مجھے محبوب کے نازک دل پر رحم آتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تُو اس کافر کو عشق کی آزمائش میں سرگرم نہ کر۔

مطلب یہ کہ عاشق عشق کا امتحان دینے کے لیے نہ صرف تیار ہے، بلکہ محبوب کو آمادہ کر رہا ہے کہ وہ اٹھے اور جس طریقے پر چاہتا ہے، آزمائش کر لے۔ آزمائش کا سب سے بڑا ذریعہ وہ ہے، جس میں عاشق کو جان قربان کر دینے کی نوبت آئے۔ عاشق اس کے لیے بھی ہمہ تن تیار ہے، لیکن اس کا رفیق اور ندیم عاشق کو سمجھا رہا ہے کہ بھئی! تُو تو جاں نثاری سے اپنے عشق کا ثبوت دے دے گا، مگر محبوب کا دل نازک ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ تیرے جان دے دینے پر پشیمان و ملول ہوگا اور اس کا نازک دل ملال برداشت نہ کر سکے گا۔ بہتر یہی ہے کہ تُو اسے عشق کی آزمائش پر آمادہ نہ کر تا کہ اس

کا دل صدمہ اور ہر اندیشے سے محفوظ رہے۔

دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی داد یاں

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگزارِ باد یاں

۱۔ شرح : محبوب بھی آخر کسی سے دل لگا بیٹھا یعنی کسی پر عاشق ہو گیا۔ اب وہ بھی غمِ عشق میں تنہا بیٹھا رہتا ہے۔ بارے اس طرح ہمیں اپنی بیکسی اور تنہائی کی داد مل گئی یعنی جس طرح ہم عاشق ہو کر سب سے الگ تھلگ بیٹھے رہتے تھے، وہی کیفیت اب ہمارے محبوب کی ہے۔

۲۔ لغات۔ زوال آمادہ : فنا ہو جانے پر آمادہ، یعنی فنا ہو جانے والا۔

آفرینش : پیدائش۔ مخلوق۔

شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"یہاں سورج کو اس لحاظ سے کہ وہ بھی اجزائے عالم میں سے ہے اور تمام اجزائے عالم آمادۂ زوال و فنا ہیں، چراغِ رہگزرِ باد سے تشبیہ دی ہے، جو بالکل نئی تشبیہ ہے۔"

کائنات میں جتنی بھی چیزیں ہیں، ان کے لیے فنا ہونا مقدر ہے۔ کُلُّ من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔ ان چیزوں میں بظاہر سب سے بڑا اور نمایاں وجود سورج کا ہے، جس پر پورے نظامِ شمسی کا انحصار ہے، لہٰذا مرزا نے فنا کا ثبوت دینے کے لیے اسی کو بطورِ مثال چنا اور بتایا کہ یہ سورج، جو آسمان پر روشن نظر آ رہا ہے، یہ کیا ہے؟ ایک ایسا چراغ ہے

جو ہوا کے راستے میں روشن ہے۔ کیا کہا جاسکتا ہے کہ کس وقت کون سا جھونکا آئے گا، جو اسے گُل کردے گا؟ اور ظاہر ہے کہ جو چراغ ہوا کی گزرگاہ میں روشن ہوگا، اس کا زیادہ دیر تک جلتے رہنا ممکن ہی نہیں۔ جب سب سے بڑے وجود کا یہ حال ہے تو باقی اشیاء کا معاملہ قابلِ توجہ بھی نہیں۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں:

"باد استعارہ ہے زمانے کے تجدّد و مرور سے۔ غیر محسوس کو محسوس سے تشبیہ دی ہے، پھر وجہ شبہ حرکت ہے۔ اس سبب سے یہ استعارہ بہت ہی بدیع ہے۔"

۱۔ شرح:

یہ ہم جو ہجر میں، دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو، کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

وہ آئیں گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے!
کبھی ہم اُن کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گوہر کو دیکھتے ہیں

حالتِ فراق میں ہماری نظریں دیوار اور دروازے پر جمی ہوئی ہیں۔ دیوار پر اس لیے کہ شاید صبا ہمارے لیے کوئی پیغام لے آئے۔ دروازے پر اس لیے کہ شاید ہمارا خط پہنچانے والا جواب لے کر آجائے۔ صبا بھی شاعروں کی خبر رساں اور نامہ بر ہے۔ وہ دیوار ہی کے اوپر سے آسکتی ہے۔ لہٰذا فراق زدہ عاشق کی نظریں بار بار دیوار کی طرف اُٹھ رہی ہیں۔ قاصد دروازے

ہی سے آئے گا، اس لیے دروازہ بھی عاشق کی نظروں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اصل مقصد صرف یہ واضح کرتا ہے کہ حالتِ فراق میں بھی محبوب کی طرف سے کوئی نہ کوئی پیغام پہنچنے کا کتنا اشتیاق و انتظار ہے اور یہ طبعی حالت کا نہایت عمدہ نقشہ ہے کہ نظریں دیوار و در پر جمی ہوئی ہیں۔

۲۔ شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"اپنے گھر میں معشوق کے آنے سے جو تعجب اور حیرت ہوئی ہے۔ دوسرے مصرع میں اس کی کیا عمدہ تصویر کھینچی ہے۔ یعنی کبھی معشوق کو دیکھتا ہے، کبھی اپنے گھر کو دیکھتا ہے کہ اس گھر میں اور ایسا شخص وارد ہوا۔"

مطلب یہ ہے کہ عاشق کو اپنے گھر میں محبوب کی آمد کا یقین نہیں آتا، اگرچہ وہ آچکا ہے۔ عاشق پر حیرت کا عالم طاری ہے۔ کبھی اپنے گھر کی حالت دیکھتا ہے، کبھی محبوب پر نظر ڈالتا ہے۔ کبھی یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ گھر میرا نہیں، کسی اَور کا ہے۔ کبھی یہ خیال دامنگیر ہو جاتا ہے کہ محبوب نہیں آیا، کوئی اور آیا ہے۔ جہاں کہیں بالکل غیر معمولی اور بظاہر غیر ممکن الوقوع واقعہ پیش آجائے، وہاں صاحبِ خانہ کی کیفیت ہو بہو یہی ہوتی ہے۔

۳۔ شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

عشق حقیقی ہو یا مجازی، اس کے زخم کی گہرائی اس سے بہتر کسی اسلوب میں بیان نہیں ہو سکتی۔"

لوگ کیوں آ آ کر میرے جگر کا گھاؤ دیکھ رہے ہیں، جو حد درجہ گہرا ہے؟ مشاق ناوک فگن ایسا ہی زخم لگا سکتا تھا۔ مجھے یہ ڈر ہے، کہیں زخم کی گہرائی کا ستائش آمیز ذکر کرنے سے میرے محبوب کے دست و بازو کو نظر نہ لگ جائے عام قاعدہ یہی ہے کہ جب کسی کی تعریف کرتے ہیں تو نظر بد کا اثر رد کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی کلمہ کہہ لیتے ہیں، مثلاً چشم بد دور، ماشاء اللہ وغیرہ۔ عاشق کی

جاں نثاری اور محبت کے کمالات ملاحظہ ہوں کہ اپنے کاری زخم کا کوئی خیال نہیں، صرف یہ خیال ہے کہ محبوب کے دست و بازو کو نظر نہ لگ جائے۔

مولانا طبا طبائی بالکل بجا فرماتے ہیں:

"اس شعر کی خوبی بیان سے باہر ہے۔ بڑے بڑے مشاہیر شعراء کے دیوانوں میں اس کا جواب نہیں نکل سکتا۔"

بعض لوگوں نے اس کا مآخذ فارسی کا مندرجۂ ذیل شعر قرار دیا ہے:

ہر کس کہ زخم کاری ما را نظارہ کرد
تا حشر دست و بازوے او را دعا کند

ظاہر ہے کہ اس شعر کو مرزا کے شعر سے قطعاً کوئی مناسبت نہیں، اس کے مضمون اور مرزا کے مضمون میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ بزی مولویت ہے، وہ خالص عشق ہے۔

۴۔ **لغات۔ طرفِ کُلہ:** ٹوپی کا گوشہ۔ جہاں مرصع کلغی وغیرہ لگا لیتے ہیں۔

شرح: تُو نے اپنے کلاہ کی کلغی میں جواہرات ٹانک لیے ہیں۔ ہمارے لیے ان سے تیرے حُسن میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا کہ انھیں بار بار دیکھیں، البتہ یہ ضرور دیکھ رہے ہیں کہ ماشاء اللہ لعل و گہر کی قسمت کتنی اونچی ہے کہ انھیں تیری طرف کلاہ میں جگہ نصیب ہوئی۔ مقصود بہر حال وہی ہے۔ لیکن مرزا غالب جب ذکر کریں گے تو طرف کلاہ کی آرائش نہیں، بلکہ لعل و گہر کی بلند اختری ہی کا ذکر کریں گے۔

۱۔ **لغات۔ روزِ جزا:** وہ دن جب اعمال کا بدلا ملے گا یعنی روزِ قیامت۔

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا بُرائی ہے؟
بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

جو آؤں سامنے اُن کے، تو "مرحبا" نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو، تو "خیر باد" نہیں

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں، تو کہتے ہیں
کہ "آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں"

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم، ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

تم اُن کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالبؔ
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ "یاد نہیں"

شرح: یہ کس نے کہا کہ میں قیامت کا منکر ہو گیا ہوں؛ یہ غلط ہے میرا اعتقاد قیامت پر بدستور قائم ہے۔ البتہ یہ ضرور کہتا ہوں کہ جدائی کی رات میں جو مصیبتیں اور مشقتیں عاشق پر گزری ہیں، ویسی قیامت کے دن پیش نہیں آ سکتیں، اس لیے قیامت کا دن ہجر کی رات سے بڑھا ہوا نہیں۔

کتنا معمولی اور عام مضمون ہے، لیکن محض بیان کی خوبی سے اسے کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔

۲۔ **شرح:** اگر آج دن کو گھٹا بادل نہیں چھائے اور ٹھنڈی ہوا نہیں چل رہی، اس لیے شراب کا سازگار موسم موجود نہیں تو نہ سہی، آخر یہ تو بتاؤ کہ چاندنی رات میں محفلِ نوشا نوش جما لی جائے تو کیا مضائقہ ہے؟

میرزا غالب ہی نہیں، بلکہ ہر صاحبِ ذوق کے لیے عرق نوشی کے دو ہی موقعے ہیں۔ یا دن کے وقت ابر چھایا ہوا ہو، ترشح ہو رہا ہو اور ٹھنڈی ہوا چل رہی ہو یا رات کے وقت جب چاندنی چھٹکی ہوئی ہو۔ اس شعر میں

دونوں کا ذکر کر دیا۔

۳۔ **لغات ۔ مرحبا** : دعائیہ کلمہ ، کلمۂ تحسین ۔ یہ رحب سے ہے جس کے معنی ہیں کشائش اور فراخی ۔ مرحبا کہا جاتا ہے تو مقصود یہ ہوتا ہے ۔ کہ آنے والے کو بتایا جائے ، ہمارا گھر وسیع اور کشادہ ہے ، آپ کے لیے کوئی تنگی نہ ہوگی

خیر باد : خیریت ہو ، اچھے رہو ۔

دونوں میں سے "مرحبا" کسی کے آتے وقت اور "خیر باد" جاتے وقت کہنے کا دستور ہے

شرح : مرزا اس شعر میں محبوب کی انتہائی بے توجہی اور بے التفاتی کا نقشہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں اس کے سامنے جاتا ہوں تو کبھی اس کی زبان پر "مرحبا" کا لفظ نہیں آیا اور اس کے پاس سے کسی طرف جاتا ہوں تو کبھی اس نے "خیر باد" نہیں کہا ۔ اس سے بڑھ کر بے نیازی اور بے پروائی کیا ہوگی

۴ ۔ **شرح** : پہلے شعر سے ملا ہوا شعر ہے ۔ یعنی اگر محبوب کو کسی وقت میرا خیال آ بھی جاتا ہے تو وہ یوں ذکر کرتا ہے کہ کیا بات ہے ، آج ہماری محفل میں کوئی فتنہ و فساد نظر نہیں آتا

مطلب یہ ہے کہ جب مرزا بزم میں پہنچ جاتے تھے تو ہر ایک سے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے ۔ کبھی بے تکلفی میں کسی کی زبان سے کوئی بات نکل گئی تو مرزا الجھ پڑتے تھے ۔ کبھی کسی نے شوخ نظروں سے محبوب کو دیکھ لیا تو مرزا نے لڑائی چھیڑ دی ۔ یوں محبوب کی بزم میں ایک ہنگامہ بپا رہتا تھا ۔ مرزا موجود نہیں ہوتے تھے تو ہر طرف سکون و اطمینان نظر آتا تھا ۔ بس یہی کیفیت اس شعر میں پیش کی گئی ہے ۔

۵ ۔ **شرح** : عید کے دن تمام فقیروں میں خیرات بٹتی ہے ، لیکن میخانے کا دستور یہ نہیں کہ خیرات کے لیے خاص دن کا تعین ہو ۔ وہاں ہر وقت سلسلۂ داد و دہش جاری رہتا ہے ۔ میخانے کے کوچے میں جو درویش پھرتے ہیں ، ان کی مراد برابر آتی رہتی ہے ۔ گویا شراب خانہ ، زمانے کے عام دستوروں سے بالکل الگ اپنے خاص دستور رکھتا ہے ، جنھیں زمانے کے عام دستوروں پر قیاس نہ کرنا چاہیے ۔

۶ ۔ **شرح** : اس شعر میں غمزدگی کی انتہائی صورت پیش کی گئی ہے۔
دنیا میں خوشی اور غم ملے جلے آتے ہیں۔ آج خوشی ہے تو کل غم ہے۔ آج غم ہے تو کل خوشی ہے۔ خزاں کے بعد بہار اور بہار کے بعد خزاں آتی رہتی ہے کہتے ہیں کہ دنیا میں یہ دستور رائج ہو گا۔ شادی اور غم یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہونگے، لیکن ہمیں ان سے کیا غرض ہے ؟ ہماری حالت تو یہ ہے کہ خدا نے جو دل ہمیں عنایت کر دیا ہے، اس میں شادی اور مسرت کی کوئی صلاحیت باقی نہیں۔ وہ سراپا غم ہے۔ لہذا ہمیں غم کے ساتھ نشاط و مسرت کی کوئی امید نہ رکھنی چاہیے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں۔

"دنیا میں غم و شادی کا بہم ہونا اس مقام پر ذکر کرتے ہیں، جہاں دنیا کے سرور، خوشی سے نفرت ظاہر کرنا منظور ہو۔ اس شعر میں مصنف نے تازگی یہ پیدا کی ہے کہ غم و شادی کے بہم ہونے پر حسرت ظاہر کی ہے۔ کہتے ہیں، ہمیں کیا کام ؟ یعنی ہم تو محروم ہیں۔ ہم کو تو کبھی ایسی خوشی حاصل نہیں، جو غم سے متصل ہو اور شادی مخلوط بہ غم کی حسرت کرنے سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ شاعر کو انتہائی غمزدگی ہے کہ ایسی ہیچ و ناکارہ خوشی کی تمنا رکھتا ہے اور یہی وجہ بلاغت ہے اس شعر میں"

۷۔ **شرح** : بیشک محبوب نے وعدہ کیا اور اسے پورا نہ کیا۔ اے غالب! اب اس وعدے کا ذکر محبوب سے کیوں کرتے ہو؟ ذکر کرو گے تو نتیجہ کیا ہو گا؟ یہ کہ وہ کہہ دیں گے، ہمیں یاد نہیں رہا۔ پھر اس سے کیا فائدہ ہو گا؟ بہتر یہ ہے کہ اس ذکر ہی سے دست بردار ہو جاؤ۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :

"معشوق کی بدعہدی و وعدہ خلافی کو جو لوگ الٹ پلٹ کر کہا کرتے

ہیں، وہ اس شعر میں تامل کریں کہ اس مضمونِ کہنہ کو کیا آب دے دیا ہے۔ مطلب تو یہ ہے کہ میں جب انھیں وعدہ یاد دلاتا ہوں وُہ کہتے ہیں، یاد نہیں، مگر اس مطلب کو ملامت گر کی زبانی ادا کیا ہے، یعنی خبر کے پہلو کو ترک کر کے مضمون کو انشاء کے سانچے میں ڈھالا ہے۔"

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں — ہم بھی مضموں کی ہَوا باندھتے ہیں

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے — ہم بھی اک اپنی ہَوا باندھتے ہیں

تیری فرصت کے مقابل اے عمر! — برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

قیدِ ہستی سے رہائی معلوم — اشک کو بے سروپا باندھتے ہیں

نشۂ رنگ سے ہے واشُدِ گُل — مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

غلطیہائے مضامیں مت پوچھ — لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں — آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

سادہ پُرکار ہیں خوباں غالبؔ! — ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

۱۔ لغات۔ توسن: گھوڑا۔ کلیلیں کرنے والا گھوڑا
ہَوا باندھنا: جھوٹی ساکھ قائم کرنا۔

شرح:۔ اے محبوب! جس کلیلیں کرنے والے گھوڑے پر تو سوار ہے ہم نے اسے صبا کے ساتھ تشبیہ دے دی ہے۔ اس طرح اپنے مضمون کے لیے

مجبوٹی سا کچھ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی یہ تشبیہ ایسی نہیں کہ ہم اس پر فخر کر سکیں۔

توسن، صبا اور ہوا کی مناسبت محتاج بیان نہیں۔

۲۔ **لغات۔ ہوا باندھنا** : رعب جمانا، زور دکھانا۔

شرح : ہم آہ تو کرتے ہیں، لیکن اس کے اثر کی حقیقت ہم پر بخوبی واضح ہے۔ آج تک تو اس کا اثر دیکھا نہیں۔ بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس طرح ہم محبوب کے دل پر رُعب جمانے اور اسے اپنا زور دکھانے کی کوشش کرتے ہیں، نتیجہ معلوم۔ شعر کی ایک خوبی یہ ہے کہ فرمایا: آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے؟ یعنی اپنی آہ تو بے اثر ہے ہی، مگر اس کی بے اثری کا ایسا یقین دل میں پیوست ہو گیا ہے کہ کسی دوسرے کی آہ کا اثر بھی قابل قبول نہیں سمجھا جا سکتا۔

۳۔ **لغات۔ پا بہ حنا** : جس کے پاؤں میں مہندی لگی ہو۔

شرح : اے عمر! تیری فرصت اتنی کم، بلکہ بے حقیقت ہے۔ کہ اس کے مقابلے میں بجلی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کے پاؤں کو مہندی لگی ہوئی ہے۔

مطلب یہ کہ بجلی کی چشمک سے زیادہ کم فرصت کوئی چیز نہیں، لیکن عمر اس کے مقابلے میں بھی اتنی کم فرصت ہے کہ بجلی کے پاؤں کو بھی گویا مہندی لگی ہوئی ہے۔

جس کے پاؤں کو مہندی لگ جائے، وہ اوّل تو چل ہی نہیں سکتا، چلے گا تو تیز بالکل نہیں چلے گا۔ جس کے مقابلے میں بجلی کے پاؤں کو مہندی لگ جائے، اس کی کم فرصتی کا تصور کرنا چاہیے۔

۴۔ **شرح** : ہستی کی قید سے رہائی پانے کی کوئی صورت نہیں۔ آنسو کو دیکھیے کہ نہ اس کا سر ہے، نہ اس کے پاؤں۔ گویا وہ ہستی کی قید سے نکل جانے کی پوری تیاری کر چکا ہے، لیکن اسے بھی بے سر و پائی کے باوجود

باندھ دیا جاتا ہے یعنی شعرا مضامین میں اسے بے سروپائی کے باوجود باندھے چلے جاتے ہیں۔ پھر مستی کی قید سے رہائی پانے کی کیا صورت ہے ؟

۵۔ لغات۔ واشدِ گل : پھول کا کھلنا۔

شرح : پھول رنگ کے نشے میں بدمست ہو کر کھل جاتا ہے۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ بدمستوں کی قباؤں کے بند کب باندھے جاتے ہیں ؟

مطلب یہ کہ جب پھول نشے کے رنگ میں مست ہو گیا تو اس کی قبا کے بند کھل گئے ، گویا وہ کھل گیا۔

پھول کو رنگ کی شراب فطرت نے پلا کر مست کر دیا۔ اس قسم کی موزوں شراب فطرت نے ہر وجود کے لیے مہیا کر رکھی ہے۔ جب یہ شراب رنگ دکھاتی ہے تو ہر وجود کے دل کا غنچۂ بستہ پھول کی طرح کھل جاتا ہے۔

۶۔ شرح : اس شعر کے دو مفہوم بالکل واضح ہیں۔ اول یہ کہ نالے کو رسا کہنا اور ظاہر کرنا بالکل غلط ہے۔ دوسرا اور گہرا مطلب یہ کہ اگر نالہ رسا ہوتا تو باندھنے میں کیونکر آتا ؟ اس کا باندھا جانا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ وہ رسا نہیں۔ یعنی مضمون شعر کی غلطی بالکل ظاہر ہے۔ بندھ جانے ہی سے اس کی رسائی کا ابطال ہوتا ہے۔

۷۔ لغات : واماندگیاں : واماندگی کی جمع۔ تھکاوٹ۔ تکان۔ بیچارگی۔ لاچاری۔

شرح : جو لوگ اپنے آپ کو اہل تدبیر یعنی عقل و دانش اور چارہ گر سمجھتے ہیں، ان کی بیچارگیوں، اور لاچاریوں پر نظر ڈالیے کہ کسی کے پاؤں میں چھالے پڑ جائیں تو ان پر مہندی لگاتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ چھالے تو بذاتِ خود چلنے میں مانع ہوتے ہیں اور ان پر مہندی لگا دی جائے تو چلنا اور بھی دوبھر ہو جائے گا۔ یہ تدبیر اور چارہ گری تو نہ ہوئی۔ بلکہ لاچار کو اور لاچار بنا دیا۔

اس شعر سے ضمناً اہل جنون کی ستائش کا پہلو نکل آیا، یعنی وہ پاؤں کے چھالوں کے ساتھ صحرائے پُرخار میں بے تکلّف دوڑتے ہیں اور کانٹوں ہی سے چھالوں کا علاج کرتے ہیں۔

۸۔ **لغات** ۔ پُرکار : ہوشیار۔ چالاک۔

شرح : اے غالب! بیشک محبوب بظاہر سیدھے سادے اور حقیقۃً بڑے چالاک اور ہوشیار ہیں۔ ان کا کمال دیکھیے، ہم ایسے لوگوں سے وفاداری کا پیمان باندھتے ہیں۔ گویا ہمیں وفا کا یقین دلانا چاہتے ہیں، حالانکہ ہم اس فریب میں نہیں آسکتے۔

ان کی سادگی یہ ہے کہ سمجھ لیا، ہم ان کے فریب میں آجائیں گے اور پرکاری یہ کہ ہمیں فریب دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسدؔ
دگرنہ ہم تو توقّع زیادہ رکھتے ہیں

۱۔ **لغات** ۔ سخت کم آزار : حد درجہ کم دُکھ دینے والا۔

شرح : اسدؔ یعنی غالب کی جان کی قسم زمانہ اپنے آپ کو بہت آزار دینے والا سمجھتا ہوگا، یعنی اس کا خیال یہ ہوگا کہ میں لوگوں کو بہت دُکھ پہنچاتا ہوں، حالانکہ جتنا آزار اب تک ہمیں پہنچا ہے، وہ تو بہت کم ہے۔ ہم تو امید رکھتے بیٹھے تھے کہ اس سے بہت زیادہ دکھ دیا جائے گا۔

شعر میں بظاہر دُکھ سہنے کی زیادہ سے زیادہ ہمت کا اظہار کیا ہے۔ گویا زمانے نے مصائب کے جو جام پے در پے ہمارے لبوں کو لگائے، وہ ہمارے ظرفِ برداشت کے مقابلے میں بہت کم تھے لیکن اسی سلسلے میں یہ حقیقت بھی واضح کردی کہ زمانے نے ہمیں دکھ دینے میں اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ یہ ایں ہمہ ہم نہ صرف اس سے زیادہ دکھ برداشت کرسکتے تھے، بلکہ

امید بھی یہی تھی کہ اس سے زیادہ دُکھ دیے جائیں گے۔ گویا حقیقتہً اس شعر میں بھی اپنی پُر آلام زندگی کا نقشہ بڑے اثر انگیز انداز میں کھینچا ہے۔

دائم پڑا ہُوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گنہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زمرّد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ
رُتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں؟

۱۔ شرح: میری زندگی ناکارہ، ہیچ اور قابلِ نفرت ہے، کیونکہ میں پتھر نہ بنا۔ اے کاش! پتھر ہوتا تو ہمیشہ اے محبوب! تیرے دروازے پر پڑا رہتا۔

عام قاعدہ تھا کہ مکانوں کے صحن گلیوں سے اونچے رکھتے تھے اور آمد و رفت کی آسانی کے لیے دہلیز کے ساتھ ایک پتھر لگا دیتے تھے۔ آج کل یہی کام سیمنٹ یا اینٹوں کے پایوں سے لیا جاتا ہے۔ اس پتھر کو سنگِ در یعنی دروازے کا پتھر کہتے تھے۔

شاعر کہتا ہے، اگر میں پتھر ہوتا تو تیرے دروازے پر پڑا رہتا۔ آتے جاتے تیری پابوسی نصیب ہوتی۔ اب میری زندگی کس کام کی ہے کہ تیرے

غالب وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے، جو کہتے تھے، نوکر نہیں ہوں میں

دروازے تک نہیں پہنچ سکتا اور رویں نہیں پڑا رہتا۔

۲ - لغات - گردشِ مدام: دائمی گردش، ہمیشہ پھرتے رہنا۔

شرح: شراب کی محفل میں پیالہ و ساغر ہمیشہ گھومتے رہتے ہیں۔ ان کا وظیفہ ہی یہی ہے کہ چکر میں رہیں تاکہ مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگ باری باری نوبت بہ نوبت شراب پیتے جائیں۔ لیکن یہ کام پیالہ و ساغر کا ہے، جن کا خاصہ ہی ہمیشہ گھومتے رہنا ہے۔ میں انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں کہ پیہم اور مسلسل گردش سے میرا دل گھبرا نہ جائے۔ پھر کون سی وجہ ہے کہ میں اس مسلسل گردش میں مبتلا ہوں؟ کیا آسمان نے مجھے انسان کی جگہ پیالہ و ساغر سمجھ لیا ہے؟

۳ - لغات - حرفِ مکرّر: وہ حرف جو غلطی سے دوبارہ لکھا جائے۔ ایسا حرف مٹا دیتے ہیں اور غلطی کی تلافی ہو جاتی ہے۔ مرزا نے مٹائے جانے کی بنا پر اپنے آپ کو حرفِ مکرّر یعنی حرفِ غلط سے تشبیہ دی ہے۔

شرح: اے اللہ! زمانہ کیوں مجھے مٹا دینے کے درپے ہے؟ کیا میں جہان کی تختی پر کوئی ایسا حرف ہوں، جو دوبارہ لکھے جانے کے باعث غلط قرار پایا ہو اور اسے مٹا دینا ضروری ہو؟

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں:

"اگر یوں کہتے کہ زمانہ مجھے حرفِ غلط کی طرح مٹائے دیتا ہے تو اس قدر بلیغ نہ ہوتا، جس قدر اب بلیغ ہے اور بلاغت کی وجہ زیادتی معنی ہے۔ اب اتنے معنی اور بڑھے ہیں کہ باوجودیکہ میں حرفِ مکرّر نہیں ہوں اور کوئی وجہ میرے مٹانے کی نہیں ہے (باایں ہمہ) زمانہ مجھے مٹا رہا ہے۔"

اس شعر سے یہ نکتہ سمجھنا چاہیے کہ ایک تشبیہ مبتذل میں

زیادتی معنی پیدا کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ پھر زیادتی معنی سے
بلاغت کس قدر بڑھ جاتی ہے !!

۴۔ **لغات۔ عقوبت** : عذاب، تعذیب، سختی۔ بعض اصحاب نے سزا و عقوبت کو ہم معنی بتایا ہے، لیکن معاملہ عام و خاص کا ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے، جیسے محض سزائے قید اور قید بامشقت دونوں ایک چیز نہیں۔

شرح : جزا و سزا کا عام اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ مومن کو گناہوں کے مطابق سزا ملے گی اور وہ سزا دائمی نہ ہوگی، لیکن مشرک و منکر کے لیے سزا کی کوئی حد نہیں۔ خود قرآن کہتا ہے : ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ۔ (اللہ نہیں بخشے گا، جو اس کے بارے میں شریک کا مرتکب ہوگا) اسی عقیدے کی بنا پر مرزا کہتے ہیں کہ گناہوں کی سزا میں مجھے جو عذاب دیا جا رہا ہے اس کی کوئی حد تو ہونی چاہیے۔ میں گنہگار ہوں، کافر نہیں، یعنی مجھے گناہوں کے مطابق سزا دی جا سکتی ہے، جو بہرحال عارضی ہونی چاہیئے۔ کفر و شرک کی طرح دائمی سزا کا مستوجب تو نہ سمجھنا چاہیئے۔

۵۔۶۔۷۔ **لغات۔ قدم بوس** : پاؤں چومنا۔

شرح : یہ تینوں شعر نعتیہ سمجھے جاتے ہیں اور یقیناً انہیں اور معنی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ یا رسول اللہ (صلعم) حضور اس عاجز کو کس وجہ سے عزیز نہیں جانتے ؟ میں لعل نہیں، زمرد نہیں، سونا نہیں، موتی نہیں، یعنی مجھ میں دنیوی دولت کی کوئی خصوصیت موجود نہیں۔ دنیوی دولت تو حضور والا کی نگاہوں میں برابر بے وقعت رہی۔ جب میں دولت کے لوث سے پاک ہوں تو حضورؐ مجھے ضرور عزیز تصور فرمائیے۔ حضور والا نے معراج کی رات مہر و ماہ کو قدمگاہ بنایا۔ میں درجے میں مہر و ماہ سے کم نہیں، پھر حضور میری آنکھوں کو قدم مبارک سے کیوں مشرف نہیں فرماتے ؟ حضورؐ نے معراج کی رات آسمان کو قدم بوسی کا شرف عطا فرمایا، لیکن مجھے یہ سعادت نصیب نہیں ہوتی کیا آپ کا یہ غلام آسمان کے بھی

برابر نہیں؟

۸۔ **شرح**: اے غالب! تم بادشاہ کے وظیفہ خوار ہو۔ بارگاہِ شاہی سے تمھیں باقاعدہ تنخواہ ملتی ہے۔ لہٰذا بادشاہ کو دعا دو۔ اب وہ وقت تو نہیں رہا جب کہا کرتے تھے: "میں بادشاہ کا نوکر نہیں۔" اب تو تمھاری ملازمت کا باقاعدہ انتظام ہو گیا ہے۔

مرزا غالب ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو ملازم ہوئے تھے۔ انھوں نے بروایت عرشی صاحب خود نواب کلب علی خاں والی رامپور کو ۱۸۶۶ء میں لکھا کہ جب شاہِ دہلی نے مجھے نوکر رکھا، خطاب دیا اور خدمتِ تاریخ نگاری تفویض کی تو میں نے یہ غزل طرزِ تازہ پر لکھی۔

ظاہر ہے کہ یہ غزل ۴۔ جولائی ۱۸۵۰ء کے بعد قریبی زمانے کی ہے۔

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

تھیں بناتُ النَّعشِ گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

قید میں یعقوبؑ نے لی گو نہ یوسفؑ کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

۱۔ **شرح**: شاعر کی نظر لالہ و گل کے حسن پر پڑی تو خیال آیا کہ ایسی چیزیں تو صرف حسینوں کی مٹی سے پیدا ہو سکتی ہیں، ساتھ ہی یہ سوچا کہ خدا جانے زمین میں کیسی کیسی صورتیں جا چکی ہیں، جنھوں نے ظہورِ تازہ کے لیے لالہ و گل کی شکل اختیار کی، لیکن جتنے حسین زیرِ زمیں جا

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

اِن پری زادوں سے لیں گے خُلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھُل گیا
بلبلیں سُن کر مرے نالے، غزل خواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب! دل کے پار؟
جو مری کوتاہیِ قسمت سے، مژگاں ہو گئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینے میں اُبھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں، صرفِ درباں ہو گئیں

چکے ہیں، وہ سب تو ان پھولوں کی شکل میں نمایاں نہیں ہو سکتے، ان میں سے کچھ یُوں جلوہ گری پر آمادہ ہو گئے ہیں۔

لالہ و گل کی رعنائی اور دلربائی نے حساس شاعر کے دل میں یہ سلسلۂ خیالات پیدا کر دیا۔ کمال یہ ہے کہ اس کی نظر لالہ و گل کی رعنائی میں الجھی نہیں بلکہ معاً ان صورتوں کی طرف منتقل ہو گئی جو زمین میں جا چکی ہیں اور ان میں سے سب نہیں، کچھ یوں جمال افروز ہوئیں۔

بعض اصحاب نے اس شعر کا ماخذ خیام کی ایک رباعی اور خسرو کے ایک شعر کو قرار دیا

جاں فزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی، گویا، رگِ جاں ہو گئیں

ہم مُوَحِّد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں، اجزاے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہُوا انساں، تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پہ پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب! تو اے اہلِ جہاں!
دیکھنا اِن بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

ہے۔ خیام کہتا ہے:

ہر سبزہ کہ بر کنارِ جوے رُستہ است
گویا ز لبِ فرشتہ خوے رُستہ است
پا بر سرِ سبزہ تا بہ خواری ننہی
کاں سبزہ ز خاکِ ماہروے رُستہ است

یعنی جو سبزہ ندی کے کنارے اُگا ہے، سمجھنا چاہیے کہ کسی فرشتہ خو کے لب پر سے اُگا ہے دیکھ اس سبزے کو ذلیل سمجھتے ہوے بے خیالی سے پاؤں نہ رکھ، کیونکہ یہ چاند جیسے مکھڑے والے کی خاک سے اُگا ہے۔

خسرو کا شعر یہ ہے:

اے گل، چو آمدی ز زمیں گر چگونہ اند
آں روے ہا کہ در تہِ گردِ فنا شدند

یعنی اے پھول! تُو زمین سے نکلا ہے، بتا، ان چہروں کا کیا حال ہے جو فنا کی گردش کے نیچے دب گئے؟

ظاہر ہے کہ ان دونوں شعروں کو غالب کے شعر سے کوئی خاص نسبت نہیں۔ خیام نے سبزے کو محبوبوں کے سبزۂ خط سے لگا یا اور یہ کہا کہ اس پر پاؤں نہ رکھنا چاہیے۔ خسرو نے پھول زمین سے نکلا ہُوا دیکھا تو پوچھا کہ جو گل رُخ اس میں دفن ہو چکے ہیں، بتا ان کی کیا کیفیت ہے؟

ان کے برعکس غالب صرف یہ کہتا ہے کہ لالہ و گل کی شکل میں تمام حسین تو

نمایاں نہیں ہو سکتے تھے، ان میں سے کچھ نمایاں ہوئے ہیں، پھر لالہ و گل کی رعنائی دیکھ کر کہتا ہے: خدا جانے کیا کیا صورتیں ہوں گی، جو زمین میں جا چکی ہیں۔ اس نے پورے منظر سے دنیا کی بے ثباتی کا حکیمانہ نکتہ پیدا کیا اور اسے نہایت پُرتاثیر و دلپذیر انداز میں پیش کر دیا۔

۲۔ **لغات۔ نقش و نگارِ طاقِ نسیاں** : بھول کے طاق کی زینت و آرائش۔

شرح : ہمیں بھی رنگ رنگ کی محفلیں سجانا یاد تھا، لیکن اب وہ محفلیں بھول کے طاق کی آرائش و زیبائش بن گئیں، یعنی بالکل بھول گئیں اور فراموشی کی نذر ہو گئیں۔

یہ شعر ان لوگوں کے لیے درسِ عبرت ہے، جو جوانی کے عالم میں رنگارنگ محفلیں آراستہ کرنا کے درپے رہتے ہیں۔

مولانا طباطبائیؒ فرماتے ہیں کہ اس شعر میں "بھی" کا لفظ دیکھنا چاہیے یہ دو حرف کا لفظ نکال دیا جائے تو سوچیے، معنیٔ شعر میں کس قدر کمی آ جائے گی۔ اس لفظ نے جو زائد معنی پیدا کیے، یہ ہیں:

"جس طرح تم لوگ رنگارنگ جلسے کیا کرتے ہو، کبھی ہم کو بھی ان صحبتوں کا شوق تھا، لیکن اب ہمارا حال دیکھ کر تم کو عبرت کرنا چاہیے کہ شباب کو قیام نہیں ہے۔"

۳۔ **لغات۔ بنات النعش** : لغوی معنی نعش اٹھانے والے شمالی جانب سات ستارے ہیں۔ چار کھٹولے کی شکل میں ہیں، جنھیں نعش کہتے ہیں اور تین لٹکے ہوئے ہیں، جنھیں بنات کہا جاتا ہے یعنی نعش اٹھانے والے۔ تین ستاروں میں سے بیچ والے کے پاس ایک چھوٹا سا ستارہ ہے، جو سُہا کہلاتا ہے۔ یہ ستارے قطب کے ارد گرد گھومتے رہتے ہیں۔ جنازہ اٹھانے والے

کو عربی میں "ابن النعش" کہا جاتا ہے اور اس کی جمع عربوں کے
محاورے میں "بنات النعش" ہے۔ فارسی میں انھیں "سہ دختر"
بھی کہا گیا ہے۔ اور اردو میں ساتوں ستاروں کو سات سہیلیوں
کا جھمکا یا گچھا یا سات سہیلیاں بھی کہتے ہیں۔ ان کا ایک نام
عقدِ ثریا بھی ہے۔

شرح : بنات النعش دن کے وقت تو پردے میں چھپی رہیں اور
لڑکیوں کے لیے یہی زیبا تھا کہ دن کی روشنی میں بے پردہ نہ ہوں اور چہرے
چھپائے رکھیں۔ رات کو خدا جانے ان کے دل میں کیا آیا کہ یکایک بے پردہ
ہو گئیں اور نقاب چہروں سے اتار دیے۔

مرزا نے اس شعر میں بنات کے لفظ سے فائدہ اٹھایا ہے۔ بنات النعش
عربی محاورے میں تو ابن النعش کی جمع ہے، لیکن مرزا نے بنات سے
لڑکیاں مراد لے کر دن کے وقت ان کے چھپے رہنے اور رات کو بے پردہ
ہو جانے کا مفہوم پیدا کر لیا۔

بظاہر مرزا نے صرف ایک منظر دلکش انداز میں پیش کر دیا ہے، لیکن
کوئی شخص چاہے تو یہ بھی کہ سکتا ہے کہ سات سہیلیوں نے محبوب کی بزم شبینہ
کے نظارے سے لطف اندوز ہونے کے لیے چہروں سے نقاب الٹ دیے۔

۴۔ **شرح :** بجنوری مرحوم فرماتے ہیں :

"حضرت یعقوبؑ کی آنکھیں فرزند کے فراق میں روتے روتے
سفید ہو گئی تھیں۔ مرزا کی فکرِ رسا نے اس سے تاثیرِ عشق کا کیا
طرفہ مضمون پیدا کیا ہے۔ کہ وہ روزن، جو دیوارِ زندانِ یوسفؑ
میں ہیں، حضرت یعقوبؑ کی نابینا آنکھیں ہیں، جو اپنے فرزند کو
دیکھتی رہتی ہیں۔ سفید نابینا آنکھوں کو روزن سے جو مشابہت
ہے، ظاہر ہے، قطرہ قطرہ پانی اگر کہیں گرتا رہتا ہے تو مرور

فولاد تک میں سوراخ کر دیتا ہے۔ حضرت یعقوبؑ کی مدام اشکباری
سے دیوار زنداں میں سوراخ ہو گئے ہیں۔ جس طرح روزن
دیوار کبھی بند نہیں ہوتے، حضرت یعقوبؑ کی نابینا آنکھیں
بھی بند نہیں ہوتیں۔ رات دن بے خواب جانب یوسفؑ نگران
رہتی ہے۔ حضرت یعقوبؑ کی آنکھیں روزن دیوار زنداں ہو
گیئں تاکہ تاریکی اور حبس سے یوسفؑ کا دم خفا نہ ہو۔ آنکھیں
روزنِ دیوار زنداں ہو گئیں تاکہ یوسفؑ زنداں سے دنیا کا تماشا
دیکھ سکیں اور تنہائی سے پریشان نہ ہوں"

شاعر کی مراد یہ ہے کہ اگرچہ بظاہر حضرت یوسفؑ سے ربط و تعلق قائم
کرنے کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی، کیونکہ قدرت کو یہی منظور تھا، حضرت یوسفؑ
کو جس اوجِ کمال پر پہنچانے کے لیے مصائب کا ریلا ان پر آیا تھا، وہ اس
پر پہنچ جائیں اور ان کی معنوی تکمیل کا سلسلہ پورا ہو جائے، پھر باپ اور بیٹے
میں یکجائی کی صورتیں پیدا ہوں، بایں ہمہ حضرت یعقوبؑ فرزندِ ارجمند کی
تلاش سے ایک لمحے کو بھی غافل نہ ہوئے اور سعی و تلاش کی آخری حد یہ تھی
کہ حضرت یوسفؑ زنداں میں پہنچے تو حضرت یعقوب کی آنکھیں زندان کی دیوار
میں روزن بن گئیں۔

۵ ۔ لغات ۔ زنانِ مصر : مصر کی وہ عورتیں، جنھوں نے
عزیزِ مصر کی بیوی (زلیخا) کو طعنہ دیا تھا کہ وہ اپنے ایک غلام پر
فریفتہ ہو گئی۔ قرآن مجید کے بیان کے مطابق عزیزِ مصر کی بیوی
نے ان عورتوں کو دعوت دی۔ کھانے پینے کا سامان سجا دیا۔
جب وہ کھانے میں مصروف ہو گئیں تو یوسفؑ سے کہا کہ ان کے
سامنے آ جائیں۔ انھوں نے یوسفؑ کو دیکھتے ہی اپنے ہاتھ کاٹ
لیے اور بے اختیار پکار اٹھیں کہ یہ تو انسان نہیں، بلکہ ایک فرشتہ

ہے، بڑے مرتبے والا فرشتہ۔ اس طرح ان عورتوں پر حضرت یوسفؑ کی عظمت و فضیلت آشکارا ہو گئی اور عورتوں کا طعن و تشنیع باطل ثابت ہوا۔

شرح : مرزا نے اس داستان سے یہ مضمون پیدا کر لیا کہ دنیا بھر کے لوگ رقیبوں سے ناخوش رہتے اور جلتے ہیں، لیکن عزیزِ مصر کی بیوی یعنی زلیخا ان رقیب عورتوں سے خوش ہے، جو حضرت یوسفؑ کی عظمت کی معترف ہو گئی تھیں اور زلیخا کے خلاف طعنہ زنی پر پشیمانی ہوئی تھی۔

۶۔ **شرح** : جدائی کی شام آ گئی۔ اندھیرا چھا رہا ہے۔ میری آنکھوں سے خون کی جو ندی بہ رہی ہے، اسے بہنے دیجیے۔ میں یہ سمجھوں گا کہ اس اندھیرے میں اجالا کرنے کے لیے دو شمعیں روشن ہو گئی ہیں۔ گویا آنکھوں سے خون بہنے کو چراغ کی روشنی سے تشبیہ دی۔

۷۔ **شرح** : ان حسینوں نے دنیوی زندگی میں ہم پر جو مظالم ڈھائے اور جو آفتیں نازل کیں، ان کا بدلہ بہشت میں لیا جا سکے گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہی حسین وہاں حوریں بن جائیں۔

بدلے سے یہ مراد نہیں کہ ہم ان پر ظلم و ستم کریں گے، مراد صرف یہ ہے کہ زندگی میں ہم ان کی رضا کے تابع رہے اور بہشت میں پہنچ جانے کے بعد یہ پری زاد حوریں بن کر ہماری رضا کے تابع ہو جائیں گے۔

۸۔ **شرح** : زلفوں کے پریشان ہونے سے اشارہ اختلاط کی گرم جوشی کی طرف ہے۔ اے محبوب! تو جس خوش نصیب عاشق کے بازو پر سر رکھ کر محوِ استراحت ہو اور تیری زلفیں بازو پر بکھری ہوئی نظر آئیں تو نیند کی حقیقی راحت اسی کو حاصل ہو گی۔ وہ اپنے آپ میں پھولا نہ سمائے گا اور اس کا دماغ سب سے اونچا ہو گا۔ راتیں بھی اسی کی لطف و مسرت اور نشاط و شادمانی میں بسر ہوں گی۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ شعر بیت الغزل ہے
اور کارنامہ ہے۔

۹۔ شرح: میں نے چمن میں جاتے ہی درد بھرے نالے کیے تو بلبلوں
کے دل پر ایسا اثر پڑا کہ انھوں نے ایک دم غزل خوانی شروع کر دی۔ ایسا معلوم
ہو رہا تھا کہ یہ چمن نہیں، بلکہ ایک مکتب، ایک درس گاہ ہے، جس میں بچے اپنا
اپنا آموختہ یاد کر رہے ہیں۔

شاعر کے نالے سن کر بلبلوں کا غزلخواں ہونا اس امر کی دلیل ہے۔ کہ
بلبلوں نے ان نالوں میں عشق و محبت کا ایسا سوز پایا کہ وہ خود بے اختیار ہو کر
اپنے دردِ عشق کے اظہار پر مجبور ہو گئیں۔

بعض اصحاب نے اس سلسلے میں نعمت خان عالی کا یہ شعر پیش کرنا پسند
فرمایا ہے:

آب و رنگِ گلستانِ عشق اکنوں از من است
عندلیباں ہر چہ می گویند مضموں از من است

یعنی باغِ عشق کی رونق اب صرف میرے دم سے ہے۔ بلبلیں جو کچھ بھی
کہتی ہیں، مضمون مجھ سے لیتی ہیں۔

ہر صاحبِ ذوق پر آشکارا ہے کہ دونوں شعروں کا مضمون ایک نہیں
اور نعمت خان عالی کا شعر غالب کے شعر کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

۱۰۔ لغات۔ کوتاہیِ قسمت: کم نصیبی، بدقسمتی۔

شرح: خواجہ حالی فرماتے ہیں:

"نگاہوں کے مژگاں ہونے سے یہ مراد ہے کہ شرم و حیا کے
سبب اوپر نہیں اٹھتیں، بلکہ پلکوں کی طرح نیچے جھکی رہتی ہیں۔"

اگرچہ شرم و حیا کے باعث محبوب کی نگاہیں اوپر نہیں اٹھتیں اور میری
کم نصیبی کے باعث نیچے جھکی رہتی ہیں، گویا ان کی حیثیت بظاہر مژگاں کی ہے

لیکن اے خدا! یہی نگاہیں میرے دل کے پار کیوں ہوئی جاتی ہیں۔

مطلب یہ کہ ظاہری کوتاہی کے باوجود دل تک ان کی رسائی اور تاثیر و نفوذ میں کوئی کمی نہیں آئی۔ یہ چیزیں بیان سے نہیں، احساس سے تعلق رکھتی ہیں۔ حُسن کا ایک پہلو مژگاں کی درازی بھی ہے، لیکن مژگاں انتہائی درازی کے باوجود ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتیں۔ نگاہوں کی تاثیر دُور تک جاتی ہے، مگر جو نگاہیں شرم و حیا کے باعث سمٹ کر مژگاں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں یعنی جھکی رہتی ہیں، ان کا حسن اور ان کی جاذبیت بھی دیدنی ہے، اسے بیان میں نہیں لایا جا سکتا۔ اسی دلآویزی کو مرزا نے زیرِ غور شعر میں واضح کیا اور حق یہ ہے کہ اصل نکتے کی توضیح کے لیے اس سے بہتر طریقہ ذہن میں نہیں آ سکتا۔

۱۱۔ **شرح**: میں آہوں کو بار بار سینے میں روکتا تھا اور وہ بار بار جوشِ درد سے اُبھرتی تھیں۔ اس طرح پے بہ پے دبانے اور اُبھرنے، دبنے اور اُبھرنے کا منظر پیدا ہو گیا۔ گویا کپڑے کی سلائی کی سی صورت سامنے آ گئی کیونکہ سلائی یعنی بخیے میں بھی دھاگا نیچے اوپر، نیچے اوپر ہوتا رہتا ہے۔ اس حد تک آہوں کو روکنے اور ابھرنے کا عام منظر تھا۔ بخیے کا سلسلہ ہاتھ آ گیا تو مرزا نے اسے چاکِ گریباں کی سلائی سے تعبیر کر دیا۔ لطف یہ کہ گریباں عموماً سینے ہی پر سے چاک ہوتا ہے۔

مضمون محض خیالی ہے، اگرچہ اسے رنگ ایسا دے دیا گیا ہے کہ بالکل واقعی اور فطری معلوم ہوتا ہے۔

۱۲۔ **شرح**: خواجہ حالی فرماتے ہیں:

"اب نئی دعا تو کوئی ذہن میں باقی نہیں رہی اور وہ مستقل دعائیں جو دربان کو دے چکا ہوں، دوست کے حق میں صرف کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ شعر میں جو اصل خوبی اور لطافت ہے وہ یہ ہے کہ گالیوں کے جواب میں دعائیں دینے کو ایک ایسی ضروری بات

ہونا ظاہر کرتا ہے گویا اس کو ہر شخص ضروری جانتا ہے۔ کیونکہ
سب سے حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ بتاؤ، ان کی گالیوں کا کیا
جواب دوں گا۔ جبکہ دعائیں سب نبٹ چکیں"۔

شاعر کہتا ہے کہ میں محبوب کے پاس گیا۔ جتنی دعائیں مجھے یاد تھیں، وہ سب کی سب دربان کو دے دیں، جس کی مہربانی کے بغیر شاعر اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر محبوب سے ملاقات ہوئی تو اس نے معمول کے مطابق بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اب شاعر حیران ہو کر آس پاس والوں سے پوچھتا ہے کہ میں ان گالیوں کا جواب کیا دوں؟ صرف دعائیں دے سکتا ہوں، لیکن دعاؤں کے سلسلے میں مصیبت یہ پیش آئی کہ جتنی مجھے یاد تھیں، وہ دربان کو دے دیں۔ جو دعائیں دربان کے لیے صرف ہو چکیں، وہ محبوب کے لیے استعمال کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔

شعر میں یہ حقیقت واضح کرنا مقصود ہے کہ جتنے وسائل عاشق کے پاس تھے، وہ سب اصل مقصد کے قریب پہنچنے میں صرف ہو گئے۔ اب مقصد سے استفادے کے لیے کن نئے وسائل سے کام لیا جائے؟

۱۳۔ **شرح** : شراب جان کے لیے تازگی اور قوت و توانائی کا موجب ہے۔ جس شخص کے ہاتھ میں شراب کا پیالہ آ جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساتھ ہی اس کے ہاتھ کی لکیریں رگ جاں بن جائیں گی، یعنی شراب لکیروں کی رگوں کے ذریعے سے تازہ خون جان تک دوڑا دے گی۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ اس شعر میں لفظ "گویا" خاص توجہ کا محتاج ہے۔ عام شاعر "گویا" کا لفظ شعر میں بھرتی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اس شعر کی کیفیت بالکل دوسری ہے۔ یہاں شاعر نے اس لیے "گویا" کا لفظ استعمال کیا کہ مبالغہ حدِ امکان سے تجاوز نہ کر جائے۔ یعنی وہ یہ نہیں کہتا کہ لکیریں سچ مچ رگِ جاں بن گئیں۔ کہتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رگ جاں بن گئیں۔

گویا مبالغے کو حد کے اندر رکھا اور اغراق نہ بنایا، جو عموماً بُرا سمجھا جاتا ہے۔

۱۴۔ **لغات۔** مُوَحِّد: توحید پرست، خدا کو ایک ماننے والا۔ وحدتِ مبدا کا قائل۔

کیش: مسلک و مشرب، طریقہ۔

رسُوم: رسم کی جمع۔ مراد یہ ہے۔ بہ طور خود اختیار کردہ طور طریقے یا جنھوں نے رفتہ رفتہ مستقل مذہبی حیثیت اختیار کر لی۔

مِلّت: فرقہ، گروہ، قوم، مذہب۔

شرح: خواجہ حالی فرماتے ہیں:

"تمام ملتوں اور مذہبوں کو منجملہ دیگر رسوم کے قرار دیتا ہے، جن کا ترک کرنا اور مٹانا موحد کا اصل مذہب ہے اور کہتا ہے کہ یہی ملتیں جب مٹ جاتی ہیں تو اجزائے ایمان بن جاتی ہیں۔"

مولانا طباطبائی نے اس شعر کی تشریح فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے فرمائی ہے، وہ کہتے ہیں:

"ہم موحد ہیں یعنی وحدتِ مبدا کے قائل ہیں اور اس کی ذات کو واحد سمجھتے ہیں اور واحد وہ ہے، جس میں نہ تو "اجزائے مقداری" ہوں، جیسے طول، عرض وغیرہ اور نہ "اجزائے ترکیبی" ہوں، جیسے ہیولیٰ صورت اور نہ "اجزائے ذہنی" ہوں، جیسے جنس و فصل۔ غرض اس کا علم محض سلبیات کے ذریعے سے حاصل ہے، جیسے کہیں کہ اس کا کوئی شریک نہیں ہے، وہ جسم نہیں ہے، وہ متحیز نہیں ہے، وہ مرئی نہیں ہے۔ . . . وہ حادث نہیں ہے . . . یہی سب سلبیات ہیں کہ ان کے اعتقاد سے اور سب ملتیں باطل و محو ہو جاتی ہیں۔ اور یہی عین اجزائے توحید ہیں۔"

ظاہر ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے اس تصور سے نفیِ صفات کا راستہ

صاف ہو جاتا ہے۔ ایجاب و اثبات کا کوئی ذریعہ ہاتھ نہیں آتا۔ قرآن مجید نے خدا کا جو تصور پیش کیا، اس کا یہ پہلو تو بالکل واضح ہے کہ جس حد تک انسانی عقل کی پہنچ ہے، صفاتِ باری تعالیٰ کو مخلوق کی مشابہت سے پاک اور بلند رکھا جائے، اسی کو اصطلاح میں "تنزیہ" کہتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ "تعطیل" کا راستہ کھول دیا جائے، یعنی صفات کی نفی کر دی جائے۔ قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کے لیے صفات خیر کا تصور پیدا کیا، ساتھ ہی مشابہتِ مخلوق کی نفی بھی کر دی۔ وہ خدا کی تمام صفات کو حسن و خوبی کی صفات قرار دیتا ہے یعنی وہ حی ہے، قیوم ہے، رب ہے، قادر ہے، رحیم ہے، سمیع ہے، بصیر ہے، علیم ہے، لیکن ان صفات کا تصور عام انسانی صفات سے بالکل بالا ہے، لہذا نفی صفات کی تعبیر مرزا غالب کے اس شعر کے لیے کچھ موزوں معلوم نہیں ہوتی۔ مقصود یہ نہیں کہ مرزا غالب کے ہر شعر کو اسلامیت کی ترازو میں تولنے کی کوشش کی جائے، تاہم اگر ایسی تعبیر ممکن ہو جو تعطیل یعنی نفی ثبات کی طرف نہ لے جائے، تو اسے اختیار کر لیتے ہیں تامل نہ ہونا چاہیے

جس حد تک میں سمجھ سکا ہوں، شعر میں بنیادی حیثیت توحید کو حاصل ہے اسی پر مرزا نے زور دیا ہے اور توحید ہی ہر سچے اور الہامی مذہب کی اصل بنیاد ہے۔ مرزا سمجھتے ہیں کہ جن لوگوں نے مختلف فرقے، گروہ، جماعتیں اور قومیں بنالیں، انھوں نے اختلافات کی بنیاد ان رسوم پر رکھی، جو بہ طورِ خود اختیار کر لیں اور وہ مذہب کی بنیاد و اساس یعنی توحید کے تحفظ پر مبنی نہ تھیں۔ میں موحد ہوں، میرے مسلک کا آغاز توحید سے ہوتا ہے جن گروہوں نے توحید کو مرکز نہ مانا اور الگ الگ رسوم کے پابند ہو گئے، وہ دراصل توحید پر ایمان میں سچے اور مخلص نہ تھے۔ اب ان اختیار کردہ رسوم کو ہم جس حد تک ترک کرتے جائیں گے اور توحید کو بنیاد و اساس بنائے رکھیں گے، اصل مقصد کے قریب تر ہوتے جائیں گے۔ گویا مختلف گروہوں کے درمیان کش مکش کے

جو سامان موجود ہیں، وہ گھٹتے جائیں گے۔ ان کا زور انفرادیت کے بجائے توحید پر ہوتا جائے گا۔ اس طرح یہ خود ساختہ ملتیں، جس قدر مٹیں گی، خالص توحید پہ سچے ایمان کے اجزا بنتی جائیں گی، واللہ اعلم بالصواب۔

۱۵۔ شرح: خواجہ حالی فرماتے ہیں:

"یہ خیال بالکل اچھوتا ہے اور نرا خیال نہیں، بلکہ ٹھیک ہے۔ ایسی خوبی سے بیان ہوا ہے کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتا۔ مشکلات کی کثرت کا اندازہ ضد حقیقی یعنی ان کے آسان ہو جانے سے کرنا درحقیقت حسن مبالغہ کی معراج ہے، جس کی نظیر آج تک نہیں دیکھی گئی۔"

نفسیات کا واضح مسئلہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی رنج دہ یا اذیت رساں چیز کا عادی ہو جاتا ہے تو اس کا احساس رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے بالکل مٹ جاتا ہے۔ نماز میں التحیات کے وقت انسان بیٹھتا ہے تو ابتدا میں بائیں پاؤں پر خاصا بوجھ پڑتا ہے اور ذرا تکلیف محسوس ہوتی ہے، لیکن نماز کی عادت ہو جائے تو مقامِ نشست پر ایک گٹا سا پڑ جاتا ہے۔ پھر نشست کے وقت تکلیف کا کوئی احساس نہیں رہتا۔ مرزا یہی پہلو سامنے رکھ کر اپنی مشکلات کا ذکر کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مجھ پر اتنی مشکلیں اور مصیبتیں مسلسل نازل ہوئیں کہ میں ان کا عادی ہو گیا اور ان سے جو تکلیف پہنچتی تھی، اس کا احساس ہی باقی نہ رہا۔ انسان رنج کا عادی ہو جائے تو اس کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مشکلات کا ہجوم اور تواتر ہی میرے لیے آسانی کا موجب بن گیا۔

یہ پہلو ایسے انداز میں پیش کرنا صرف مرزا پر ختم ہے اور بقول حالی مشکلات کا اندازہ ضد حقیقی یعنی ان کے آسان ہو جانے سے کرنا حسن مبالغہ کی معراج ہے، یعنی اتنی مشکلات پڑیں کہ چار و ناچار میں ان کا خوگر ہو گیا اور ان سے جو اذیت پہنچ سکتی تھی، اس کا احساس ہی باقی نہ رہا۔ واضح ہے کہ مشکلات ختم نہیں

ہوئیں ۔ وہ بدستور قائم ہیں، لیکن ان کا احساس نہ رہا تو ظاہر ہے کہ وہ شکلیں نہ رہیں ۔ خواجہ حالی بجا فرماتے ہیں کہ اس شعر کی نظیر آج تک نہیں دیکھی گئی۔

۱۶ ۔ شرح : اگر غالب اسی طرح روتا رہا تو اے دنیا والو! تم دیکھنا کہ یہ بستیاں اور آبادیاں جو تمھیں نظر آرہی ہیں، وہ سب کی سب اس کے سیلاب اشک میں برباد و ویران ہو جائیں گی۔ غالب رو رہا ہے ۔ ابھی وہ کیفیت پیدا نہیں ہوئی کہ نوح جیسا طوفان آجائے، لیکن اگر رونا اسی طرح جاری رہا تو یقیناً وہ کیفیت بھی کچھ دُور نہ سمجھنی چاہیے۔

ایک لحاظ سے اہلِ جہاں کے لیے یہ انتباہ ہے کہ وہ غالب کو یوں رونے سے روکنے کی کوئی تدبیر کریں۔ ورنہ دنیا کے ویران ہو جانے میں کوئی کلام نہیں۔

یہ غزل ۱۸۵۲ء کی ہے، کیونکہ یہ "دہلی اردو اخبار" کی اشاعت مورخہ ۲۱۔ شوال ۱۲۶۸ھ مطابق ۲۸۔ اگست ۱۸۵۲ء میں شائع ہوئی تھی اور شائع کرتے وقت تمہید میں لکھا گیا تھا کہ مرزا نور الدین، جو مرزا سلیمان شکوہ کے پوتے تھے، لکھنؤ سے دہلی آئے تو ساتھ ہی یہ زمین لے کر آئے۔ بادشاہ نے بھی غزل کہی اور مرزا کو بھی غزل کہنے کا حکم دیا۔

خود مرزا نے منشی نبی بخش حقیر کو یہ غزل بھیجی تو ساتھ ہی لکھا:

"بھائی! خدا کے واسطے غزل کی داد دینا، اگر ریختہ یہ ہے تو میر و میرزا (میر تقی اور میرزا سودا) کیا کہتے تھے؟ اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے؟"

(نادراتِ غالب)

دیوانگی سے دوش پہ زُنّار بھی نہیں
یعنی، ہماری جیب میں اِک تار بھی نہیں

۱ ۔ شرح : دیوانگی کے جوش میں ہمارا لباس اس طرح پارہ پارہ ہو گیا کہ ایک

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے!
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بہ قدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں، اے خدا! کوئی دیوار بھی نہیں

گنجائشِ عداوتِ اغیار اِک طرف
یاں دل میں، ضعف سے، ہوسِ یار بھی نہیں

ڈر نالہ ہائے زار سے میرے، خدا کو مان
آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی
حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

تار بھی جسم پر باقی نہ رہا۔ جسے ہم زنّار قرار دے لیتے اور سمجھتے کہ صنم پرستی کے مذہب کا ایک نشان تو ہمارے جسم پر موجود ہے۔

۲۔ شرح: ہمارا دل محبوب کے دیدار کی حسرت میں ختم ہو گیا۔ گویا وہ اس حسرت کی بھینٹ چڑھ گیا، لیکن اپنی حالت پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ ہم میں محبوب کے دیدار کی تاب و توان بھی موجود نہیں۔ یعنی جس مقصد کے لیے ہم نے زندگی کے بہترین متاع صرف کر دی، اس مقصد سے فائدہ اٹھانے کی ہم میں طاقت ہی نہیں۔

۳۔ شرح: خود مرزا غالب قاضی عبدالجمیل جنوں بریلوی کو اس شعر کی شرح یوں لکھتے ہیں:
"اگر تیرا ملنا آسان

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

نہیں تو، یہ امر مجھ پر آسان ہے خیر تیرا ملنا آسان نہیں، نہ سہی۔ نہ ہم مل سکیں گے، نہ کوئی اور مل سکے گا۔ مشکل یہ ہے کہ وہی تیرا ملنا دشوار بھی نہیں۔ جس سے تو چاہتا ہے، مل بھی سکتا ہے۔ ہجر کو تو ہم نے سہل کر لیا تھا، رشک کو اپنے اوپر سہل نہیں کر سکتے۔"

خواجہ حالی فرماتے ہیں:

"ایک فیکٹ کے بیان میں ایسے متناسب محاورات کا دستیاب ہو جانا ایک عجیب اتفاق ہے۔ اس مضمون کو چاہو حقیقت کی طرف لے جاؤ۔ چاہو مجاز پر محمول کرو۔ دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آسان نہ ہوتا یعنی دشوار ہوتا تو کچھ دقت نہ تھی، کیونکہ ہم مایوس ہو کر بیٹھ رہتے اور شوق و آرزو کی خلش سے چھوٹ جاتے، مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جس طرح آسان نہیں، اسی طرح دشوار بھی نہیں۔ اس لیے شوق و آرزو کی خلش سے کسی طرح نجات نہیں ہوتی۔"

خواجہ حالی مرحوم نے شوق و آرزو کی خلش سے چھوٹنے کا جو ذکر کیا، وہ میرے نزدیک مرزا غالب کے مفہوم میں ایسا اضافہ ہے، جس کے لیے بظاہر کوئی گنجائش نہیں۔ مرزا کا مفہوم صرف یہ ہے کہ ہجر کو برداشت کر لیا، رشک برداشت نہیں ہو سکتا۔ شوق و آرزو کی خلش قائم ہے، لیکن مفارقت پر ہم صبر کر سکتے ہیں غیر کا تجھ سے ملنا گوارا نہیں ہو سکتا۔

۴۔ **شرح**: زندگی عشق کے بغیر بسر نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس کے لیے کوئی نہ کوئی لگن چاہیے، خواہ اس کی نوعیت کچھ ہو، لیکن ہر عشق اور ہر لگن میں انسان کو دکھ اٹھانے پڑتے ہیں۔ مصیبتیں جھیلنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ہماری

حالت یہ ہے کہ اتنی طاقت ہی نہیں، جو دُکھ سہ لینے اور مصیبتیں جھیل لینے کے لیے ضروری ہے۔ لطف یہ کہ محض دکھوں کا ذکر نہیں کیا، بلکہ دکھوں، مصیبتوں اور پریشانیوں سے لذت اندوز ہونے کا ذکر کیا۔ "لذتِ آزار" دو وجہ سے قابلِ توجہ ہے۔ اوّل یوں کہ جب تک شوق سے دکھ نہ اٹھائے جائیں، عشق کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ دوم یہ کہ اگر دُکھ اٹھانے میں ایک خاص لذت نہ ہو تو کون اسے قبول کرے گا اور کیونکر ممکن ہے کہ اس حالت میں اصل مقصدِ عشق کے لیے سعی و کوشش جاری رہے؟

۵۔ **لغات**۔ شوریدگی: دیوانگی، پریشانی، آشفتگی۔

شرح: حالتِ جنوں میں پریشانی اور آشفتگی کا یہ عالم ہے کہ سر کندھوں کے لیے ایک مصیبت خیز بوجھ بن گیا ہے، لیکن صحرا میں بسر ہو رہی ہے۔ وہاں کوئی دیوار بھی تو موجود نہیں کہ اس سے سر پھوڑ لوں اور اس وبال سے نجات پاؤں۔

۶۔ **شرح**: ضعف کی شدت کا یہ عالم ہے کہ اس میں رقیبوں سے دشمنی کی سمائی تو کیا ہوتی، خود محبوب کی آرزو بھی باقی نہیں رہی۔

شعر کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ محبوب کی آرزو باقی نہیں رہی۔ مرزا کا مطلب ضعف کی انتہا ثابت کرنا ہے اور اس کے لیے اس سے بہتر پیرایہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا کہ اتنا کمزور ہو چکا ہوں دل میں محبوب کے لیے آرزو بھی موہوم سی نظر آتی ہے۔

۷۔ **شرح**: اے محبوب! میری درد بھری فریاد و فغاں سے ڈر اور خدا کا خوف کر۔ کیا یہ فریاد و فغاں اس پرندے کا درد بھرا گیت ہے، جو پنجرے میں بند ہے؟ مطلب یہ کہ میری فریاد و فغاں ایسی بے اثر نہیں، جیسی کسی قیدی پرندے کی صدا ہو سکتی ہے۔

۸۔ **لغات**۔ زُدو کشی: مقابلہ

شرح : دل میں محبوب کی صفِ مژگاں کے سامنے ڈٹ جانے کا ارادہ ہے۔ یعنی ارادہ کیے بیٹھے ہیں کہ تیر پر تیر کھائیں گے اور سامنے سے نہیں ہٹیں گے، حالانکہ دل کی حالت دیکھی جائے تو ایک کانٹے کی خلش بھی برداشت کر لینے کی ہمت نہیں رکھتا۔

یہ شعر ان لوگوں کی کیفیت کا نہایت عمدہ اور مکمل مرقع ہے، جو بڑے بڑے عزائم دل میں لیے بیٹھے ہوں، لیکن ان کی خاطر خفیف سی بھی زحمت اٹھانے سے گریزاں ہو، حالانکہ کوئی بڑا عزم اور کوئی بڑا مقصد انتہائی زحمتیں مشقتیں اور اذیتیں اٹھائے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔

۹۔ شرح : محبوب کی اس سادگی اور بھولپن پر کون جان دے دینے کے لیے آمادہ نہ ہو گا کہ لڑ رہے ہیں، لیکن ہاتھ میں تلوار بھی موجود نہیں؟ مقصود یہ ہے کہ محبوب تیغ و خنجر سے نہیں لڑا کرتا، اس کی لڑائی حسن و جمال غمزہ و ادا اور ناز و انداز کے بل پر ہوتی ہے۔ اسے مرزا نے سادگی قرار دے لیا اور کہا: یہ سادگی ہی ایسی چیز ہے کہ ہر شخص اس پر جان قربان کر دے۔ تلوار لے کر چلاتے تو اس کا انجام بھی اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا؟

مولانا شبلی نے پہلی جنگ یورپ پر ایک نظم کہی تھی جس کا مفاد یہ تھا کہ ایک جرمن نے غرور میں آ کر کہا کہ ہماری فتح آسان نہیں تو دشوار بھی نہیں۔ برطانیہ کی فوج تعداد میں بھی کم ہے اور تیار بھی نہیں، فرانس رند ہے، اسے جنگ سے کیا کام؟ میں نے کہا کہ تو غلط کہتا ہے۔ ہم اہلِ ہند جرمنوں سے دس گنے ہیں۔ وہ غور سے میری بات سنتا رہا۔ پھر اس نے جو کچھ کہا، وہ لائقِ اظہار نہیں، کہا!

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

مرزا غالب کے شعر کا آفاقی پہلو ملاحظہ ہو کہ اس سے ایک خالص جنگی

مبحث میں بھی کام لے لیا گیا۔

۱۰۔ **شرح** : ہم نے اسدؔ یعنی غالبؔ کو تنہائی اور مجلس دونوں حالتوں میں بارہا دیکھا۔ اگر تم اسے دیوانہ اور پاگل نہیں سمجھتے تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ عقل و فہم سے کوئی سروکار رکھتا ہے، یعنی وہ ہوشیار ہے۔

نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور مرے تن میں
ہُوا ہے تارِ اشکِ یاس، رشتہ چشمِ سوزن میں

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا، خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے بہ رنگِ پنبہ روزن میں

ودیعت خانۂ بیدادِ کاوشہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے، مرا ہر قطرۂ خوں تن میں

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو، جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

نکوہش مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی
ہُوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

ہوئے اُس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پَرافشاں جوہر آئینے میں مثلِ ذرہ روزن میں

۱۔ **لغات**

درخور : لائق۔

چشمِ سوزن : سوئی کا ناکا۔

شرح : میرے بدن کا کوئی بھی زخم سیے جانے کے قابل نہ سمجھا گیا۔ اس سے انتہائی مایوسی ہوئی۔ سوئی کی آنکھ یعنی ناکے میں جو دھاگا تھا، وہ مایوسی کے آنسوؤں کا تار

بن گیا۔ شعر میں کوئی خاص بات نہیں، زخم، بخیہ، تار، اشک چشم، رشتہ سوزن وغیرہ الفاظ کی مناسبت ظاہر ہے۔

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں، پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں، جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

ہزاروں دل دیے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

اسدؔ زندانیِ تاثیرِ الفتہائے خوباں ہوں
خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

۲۔ **لغات۔** مانع: روکنے والا۔

شرح: ہمارے گھر کا برباد ہونا نظارے کے ذوق میں بھی رکاوٹ بن گیا۔ جو سیلاب آیا تھا اور گھر ویران کر گیا، اس کا جھاگ روزنوں کی طرح روشن دان میں نظر آ رہا ہے۔

جن لوگوں نے ندیوں اور دریاؤں کے کنارے کی آبادیوں میں رہ کر تجربہ کیا ہے یا ان کی کیفیت دیکھی ہے، انھیں معلوم ہے کہ جب طغیانی آتی ہے اور پانی زور شور سے چڑھتا ہے تو جہاں جہاں آبادی میں اسے راستہ ملتا ہے، نکل جاتا ہے۔ جہاں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، وہاں پانی کا جوش جھاگ لے آتا ہے، جو روشن دانوں یا دوسرے چھوٹے چھوٹے شگافوں میں اٹک کر جم جاتا ہے۔ اسی منظر کے پیشِ نظر مرزا غالب نے یہ شعر کہا۔ یعنی سیلاب آیا، گھر ویران ہو گیا۔ روزنوں اور شگافوں میں جھاگ اٹک گیا۔ اب یہ اندر بیٹھے ہوئے باہر کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں۔ روزن کے سوا کوئی جگہ نہیں، جہاں سے دیکھ سکیں۔ اس میں جھاگ اٹکا

ہوا ہے اور باہر کی کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ یوں خانہ ویرانی ذوقِ نظارہ میں رکاوٹ بن گئی۔

۳۔ **لغات۔ ودیعت** : امانت، ودیعت خانے سے مراد ہے وہ مکان، جہاں لوگوں کی امانتیں محفوظ رہیں۔

نگین : انگشتری کا نگینہ جس پر مالک کا نام کندہ ہوتا ہے۔

شرح : محبوب کی پلکوں نے چُبھ چُبھ کر جو ظلم کیے، میں ان کا امانت خانہ بن گیا ہوں۔ میرے بدن کے خون کا ایک قطرہ ایسا ہے، جس پر نگینے کی طرح محبوب کا نام کندہ ہو چکا ہے۔

یہ شعر بھی کوہ کندن و کاہ بر آوردن کی حیثیت رکھتا ہے مرزا غالب پہلے بھی کہہ چکے ہیں۔

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

۴۔ **لغات۔ ظلمت گستری** : ظلمت آرائی۔ اندھیرے کا پھیلاؤ۔

شبستان : رات بسر کرنے کی جگہ۔ گھر۔

شرح : میرے شبستان میں اندھیرے کا پھیلاؤ جو صورت اختیار کر چکا ہے، اس کی کیفیت کون بیان کر سکتا ہے؟ حالت یہ ہے کہ اگر روئی کا کوئی گالا دیواروں کے روزنوں میں رکھ دیں تو ایسا منظر پیدا ہو جائے، گویا چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔

پہلے ایک شعر میں روئی کے اسی گالے کو نورِ صبح فرمایا تھا۔

کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم، اندھیر ہے
پنبہ نورِ صبح سے کم اس کے روزن میں نہیں

۵۔ **لغات۔ نکوہش** : ملامت۔ تادیب۔

شرح : دوستوں نے میرے شورِ جنوں کی بے ربطی اور بے ترتیب

ملامت کی۔ میری ہنسی اڑائی۔ اس وجہ سے شورِ جنون رک گیا۔ گویا دوستوں کا خندۂ دنداں نما (وہ ہنسی، جس میں دانت ظاہر ہو جائیں) میرے جیب اور دامن کے چاک کے لیے بخیہ بن گیا۔ یعنی وہ چاک رفو ہو گئے اور شورِ جنوں ختم ہو گیا۔

خندہ کو خندۂ دنداں نما سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ اسے بخیے سے مشابہت پیدا ہو جائے۔

بے ربطی شورِ جنوں اس لیے کہا کہ جنوں کا ہر فعل بے ربط و منتشر ہوتا ہے۔

۶ ۔ **لغات**۔ **مہروش** : سورج جیسا۔

تمثال : صورت، پیکر، تصویر۔

پرافشاں : پر پھڑپھڑانے والا۔

شرح : میرے سورج جیسے محبوب کا پیکر جلوہ افروز ہوا تو اس کے آگے آئینے کے جوہر اسی طرح اڑنے اور پر پھڑپھڑانے لگے، جیسے سورج کی کرنوں میں روزن کے اندر چھوٹے چھوٹے ذرے بیتابانہ اڑتے نظر آتے ہیں۔ یعنی آئینے کے جوہر اس کے جلوے کا مقابلہ نہ کر سکے۔

۷ ۔ **لغات** ۔ **گلخن** : بھٹی۔ بھاڑ۔

شرح : مجھے کچھ خبر نہیں کہ اچھا ہوں یا بُرا، لیکن یہ جانتا ہوں کہ میرا ماحول سازگار نہیں۔ جس دائرے میں مجھے رکھا گیا ہے، اس کے ساتھ میرے لیے موافقت و مناسبت کی کوئی صورت نہیں۔ اگر میں اچھا ہوں تو میری مثال پھول کی سی ہے، جسے محبوبوں کی زلفوں میں لگنے یا بستر کی زینت بننا چاہیے۔ اس کے برعکس مجھے بھٹی میں ڈال دیا گیا ہے۔ اگر میں بُرا ہوں تو سمجھنا چاہیے کہ میری حیثیت گھاس پھونس اور خس و خاشاک کی ہے۔ گویا میرا مناسب مقام بھٹی ہے، لیکن مجھے باغ میں رکھا گیا ہے، جہاں خس و خاشا

کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا اور اٹھا کر باہر پھینکنے کی کوشش کرتا ہے۔
نہایت مختصر لفظوں میں دو عام تشبیہوں سے نیک و بد اور ناسازگاری احوال کی کیفیت اس طرح بیان کر دی کہ اس سے بہتر ممکن نہیں۔

۸۔ **شرح** : میرے بدن کے خون کا ہر قطرہ جنونِ عشق کے باعث سیاہ ہو کر سویدا بن گیا، یعنی اس سیاہ نقطے کی صورت اختیار کر گیا جو دل میں تصوّر کیا جاتا ہے۔ گویا ہر قطرہ ایک دل کی صورت اختیار کر گیا اس طرح جنونِ عشق کے جوش نے میرے لیے ہزاروں دل مہیا کر دیے۔
طبّی نقطۂ نگاہ سے معلوم ہے کہ سودا یعنی جنون کا رنگ سیاہی مائل ہوتا ہے، اسی لیے اسے سودا کہتے ہیں۔ یعنی کالا۔

۹۔ **لغات** ۔ **زندانی** : قیدی، اسیر۔
شرح : اے اسد! میں حسینوں کی تاثیرِ محبت کا قیدی ہوں۔ انھوں نے مہربان ہو کر میرے گلے میں باہیں ڈال دیں، وہی باہیں میرے لیے اسیری کا ایسا طوق بن گئیں، جس سے رہائی پانا ممکن نہیں۔
تاثیرِ الفت اس لیے کہا کہ محبت نے اثر پیدا کیا اور حسین خلافِ عادت اتنے مہربان ہوئے کہ اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں
مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے
وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

۱۔ **شرح** : ہماری نگاہ میں دنیا کی لذتیں اور راحتیں ہیچ ہو گئی ہیں۔ پیشتر خونِ جگر پینے میں مزہ آتا تھا اور یہی ہمارا دستور تھا کہ خون پی پی کر زندگی گزارا کرتے

تھے، مگر اب جگر میں بھی کچھ باقی نہیں رہا۔ خون کی جتنی دولت تھی، وہ سب ہم نے صرف کر ڈالی۔ شعر میں قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ خونِ جگر پینا کسی کے لیے بھی باعثِ راحت نہیں ہو سکتا، لیکن مرزا اس کے عادی ہو گئے تھے اور اسی میں لطف لیتے تھے۔ اب انتہائی دکھ کی یہ چیز بھی، جس سے عادی ہونے کے باعث لطف آنے لگا تھا، ختم ہو گئی۔

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیرِ جلوۂ گُل رہگزر میں خاک نہیں

بھلا اُسے نہ سہی، کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفَسِ بے اثر میں خاک نہیں

خیالِ جلوۂ گُل سے خراب ہیں میکش
شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں

ہُوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے، اسدؔ!
کھُلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

۲۔ **لغات**۔ مگر: شاید۔

شرح: میرے بال و پر میں اب طاقت و قوت بالکل باقی نہیں رہی۔ گویا یہ ممکن نہیں کہ میں خود اڑ کر اپنے آشیانے یا محبوب تک پہنچ سکوں البتہ یہ ممکن ہے کہ اب یہیں پڑے پڑے فرسودگی سے گرد و غبار بن جاؤں اور ہوا اسے اڑا کر منزلِ مقصود پہ پہنچا دے۔

۳۔ **لغات**۔ شمائل: شمیلہ کی جمع، سرشت، طبیعت، خصلت، عادت۔

شرح: یہ کون سے بہشت جیسے خصائل و سرشت کے محبوب کی

آمد آمد ہے کہ راستے میں خاک کے بجائے پھولوں کا جلوہ نظر آتا ہے۔

جس محبوب کی خصلتیں بہشت کی سی ہوں اور اس کے ذوق میں بھی انتہائی نفاست نمایاں ہو، ظاہر ہے کہ وہ آئے تو گرد و غبار کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ہاں، خاک کی جگہ پھولوں کا جلوہ ہو تو بات بنتی ہے۔

۴۔ **شرح** : اگر محبوب کو میری فریاد و فغاں پر رحم نہ آیا تو خیر، خود مجھے تو اپنے آپ پر رحم آنا چاہیئے تھا۔ اگر میری فریاد و فغاں میں اتنا اثر نہیں تھا کہ محبوب کو متاثر کر سکتا تو خود مجھے تو ضرور متاثر کر دینا چاہیے تھا لیکن ظاہر ہو گیا کہ میری فریاد و فغاں بالکل بے اثر ہے۔ یہ محبوب پہ تو کیا اثر کرے گی، ستم یہ ہے کہ مجھ پہ بھی کچھ اثر نہیں کرتی۔

۵۔ **لغات**۔ **خراب** : مست، مدہوش۔

شرح : شراب پینے والے جلوۂ گل کے تصور سے مدہوش ہو گئے ہیں۔ شراب خانے کے دیوار و در میں تو کچھ بھی نہیں۔

جلوۂ گل سے اشارہ بہار کی طرف ہے۔ بظاہر مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ شراب خانے میں تو کچھ بھی نہیں رہا۔ اس کے دیوار و در میں تو خاک اڑ رہی ہے۔ اب شراب نوش صرف بہار کے خیال سے بدمست ہیں۔

۶۔ **شرح** : عشق نے میرا سب کچھ برباد کر دیا۔ اب میرے گھر میں تعمیر کی حسرت کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ یعنی پھر سے سب کچھ بنا لینے کی آرزو ہے، لیکن بنا لینے پر قدرت حاصل نہیں وہ آرزو حسرت بن کر رہ گئی ہے۔ عشق بدستور غارت گری میں لگا ہوا ہے وہ بربادی کی خو چھوڑ نہیں سکتا۔ میں شرمندہ ہوں کہ اس کے ذوقِ غارت کی تسکین کے لیے کیا پیش کروں؟

۷۔ **شرح** : اے اسد! اب ہم صرف دل لگی کی خاطر شعر کہتے ہیں ورنہ وہ جو غرّہ تھا کہ ہم صاحبِ ہنر ہیں اور دنیا کو اپنے جوہر دکھائیں گے تو

مسرور کریں گے، وہ ختم ہوگیا۔ ہم نے دیکھ لیا کہ ہنرمندی کی کوئی بات پیش کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ یہ لوگ ہنر کو پہچان نہیں سکتے، اس کی قدر نہیں کر سکتے، لہذا ہم ان کے لیے کیا لکھیں؟ اب تو صرف اپنے دل کی تسکین کے لیے کچھ لکھ لیتے ہیں۔

معاشرے کی خیرہ ذوقی پر کتنا بڑا طنز ہے۔

۱۔ تمہید:

یہ غزل دہلی اردو اخبار کی اشاعت بابت ۲۴۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۴۔ فروری ۱۸۵۲ء میں چھپی تھی۔ تمہید میں جو عبارت لکھی گئی تھی، اس کا مفاد یہ تھا کہ مرزا نورالدین ذہیرۂ سلیمان شکوہ، مختص برشاہی دہلی آئے اور انھوں نے شاہی دربار اور مشاعروں میں شعر گوئی کے کمالات

دل ہی تو ہے، نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

دَیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم، کوئی ہمیں اٹھائے کیوں؟

جب وہ جمالِ دل فروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں؟

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

حُسن اور اس پہ حُسنِ ظن، رہ گئی بُوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں؟

واں وہ غرورِ عزّ و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بلائے کیوں؟

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں؟

غالبِ خستہ کے بغیر، کون سے کام بند ہیں؟
روئیے زار زار کیا؟ کیجیے ہائے ہائے کیوں؟

دکھائے۔ بہادر شاہ ظفر نے مرزا غالب سے فرمائش کی کہ کوئی ایسی غزل کہی جائے جس پر مصرع لگانا دشوار بلکہ ناممکن ہو۔ چنانچہ مرزا غالب نے یہ غزل کہی اور مرزا نورالدین نے ادنیٰ غور و تامل میں کمالِ عجلت سے مخمس تیار کر کے پڑھ دیا اور سب حضارِ دربار والا نے نہایت پسند کیا۔ حضور نے پانچ دفعہ اس مخمس کو پڑھوایا اور بہت خوش ہوئے"۔

مرزا نورالدین کا مخمس سامنے نہیں کہ اندازہ کیا جا سکے، وہ کیسا تھا۔ درباریوں اور بہادر شاہ کی پسندیدگی یا خوشنودی کوئی معیار نہیں۔ مرزا نورالدین شاہی خاندان کے فرد تھے۔ اس لیے سب انھیں شہزادہ سمجھ کر اندھادھند ستائش کرتے تھے اور بہادر شاہ ظفر کے اسلوبِ کلام سے بھی واضح ہے کہ ان کا ذوق کس قسم کا تھا۔

شرح : ہمارے پہلو میں دل ہی تو ہے، جو ستانے اور دکھ دینے سے الم زدہ ہو جاتا ہے، اینٹ اور پتھر تو نہیں کہ اس پر کچھ اثر نہ ہو۔ اگر ہمیں دکھ پہنچے گا تو ہزار بار روئیں گے۔ یہ بتاؤ کہ کسی کو ہمیں دکھ دینے کا کیا حق ہے؟

شعر کی وضع و سیاق سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محبوب ستم زدہ عاشق سے کہہ رہا ہے، ہم ضرور ظلم و ستم جاری رکھیں گے۔ تمھیں ہرگز رونا نہ چاہیے

اور سب کچھ صبر و تحمل سے برداشت کر لینا چاہیئے۔ غریب عاشق پریشان ہو کر کہتا ہے کہ میرے پہلو میں اینٹ یا پتھر کا بے حس ٹکڑا نہیں، دل ہے، جو الم انگیز سلوک پر درد سے بھر آتا ہے۔ ہم تو ضرور روئیں گے، کوئی ہمیں ستاتا کیوں ہے؟

لفظ "کوئی" سے مراد محبوب ہے، کیونکہ عاشق کو محبوب کے سوا کوئی نہیں ستا سکتا، لیکن "کوئی" کے لفظ سے اجنبیت ظاہر ہے اور جب انسان ظلم و ستم سے گھبرا جائے تو وہ ستانے والے کا نام لینے یا اسے براہ راست مخاطب کرنے کے بجائے ایسے ہی لفظ استعمال کرتا ہے، جن سے اک گونہ اجنبیت یا تنکیر ٹپکتی ہو۔

۲۔ **شرح** : ہم بت خانے کے سامنے نہیں بیٹھے کہ پنڈتوں اور برہمنوں کو ہمیں اٹھا دینے کا حق ہو۔ ہم نے کعبے کے دروازے پر نشست نہیں جمائی کہ ارباب انتظام ہمیں اپنے خیال کے مطابق رند یا بے مشرب سمجھ کر اٹھانے کے درپے ہوں۔ ہم نے کسی محبوب یا کسی بڑے آدمی کا دروازہ نہیں سنبھالا۔ کسی کے آستانے پر ڈیرا نہیں جمایا۔ ہم تو راستے کے کنارے بیٹھے ہیں، جو گزرگاہ عام ہے۔ پھر کسی کو کیا حق ہے کہ ہمیں اٹھائے؟

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ اس شعر کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں مل سکتے

۳۔ **لغات**۔ مِہر نیم روز : دوپہر کا آفتاب، جس کی طرف نظر اٹھاتے ہی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ یعنی وہ "نظارہ سوز" ہوتا ہے۔

"منہ چھپائے کیوں" کے معنی بداہتہً دو ہیں۔ اوّل یہ کہ اسے منہ چھپانے کی کیا ضرورت ہے؟ دوم یہ کہ اس نے منہ چھپایا ہی نہیں، بالکل بے نقاب اور آشکارا ہے۔

شرح : میرے محبوب کے جمال سے دل میں روشنی اور نور پیدا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی دوپہر کے آفتاب کی طرح وہ جمال اس درجہ بے پناہ ہے کہ اس

کی طرف آنکھ نہیں اُٹھ سکتی۔ جو آنکھ اٹھے گی، معاً چندھیا جائے گی اور اس جمال سے بہرہ اندوز نہ ہو سکے گی۔ جب حالت یہ ہے تو اسے پردے میں چھپے رہنے کی کیا ضرورت ہے؟

پردے میں چھپنے کا مدعا یہی ہو سکتا ہے کہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے جب آنکھ میں اسے دیکھنے کی صلاحیت ہی موجود نہیں تو پردہ بالکل بے سود ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا، دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ واقعی پردے میں چھپا ہوا نہیں، بلکہ پوری شان سے جلوہ آرا ہے اور جانتا ہے کہ اس کے جمال سے کوئی لطف اندوز نہیں ہو سکتا، کیونکہ کسی نگاہ کو اسے دیکھنے کی ہمت ہی نہیں۔

خواجہ حالی کے قول کے مطابق یہ شعر مجاز اور حقیقت دونوں پر محمول ہو سکتا ہے، حقیقت پر بدرجہا زیادہ، کیونکہ وجودِ حقیقی کائنات میں نمایاں اور آشکارا بھی ہے اور پنہاں و مستور بھی۔ بایں ہمہ کوئی اس کے جمال سے براہِ راست بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا۔

۴۔ **لغات**۔ دَشنہ: خنجر۔

جانستاں: جان لیوا۔

ناوک: تیر۔

شرح: غمزے کا خنجر جان لیوا اور ناز کا تیر اس درجہ سخت ہے کہ کوئی پناہ اس سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ ہم نے مانا کہ تو بھی اپنا چہرہ آئینے میں دیکھنا چاہتا ہے، لیکن خدا کے لیے غور کر کہ ناز و ادا کی ان تلواروں اور تیروں سے تیرا کیا حال ہو گا؟ ضروری ہے کہ تو اپنا چہرہ آئینے میں نہ دیکھے تاکہ وہ صورت، جس نے دنیا کو زخموں سے تڑپا رکھا ہے، تیرے لیے بھی کسی آفت کا باعث نہ بن جائے۔ تیرے سوا تو جتنے بھی وہ زخمی کر گئے، تو آپنے آپ کو کیوں ایسے خطروں میں ڈال رہا ہے؟

۵۔ **شرح** : زندگی کا ایک وقت مقرر ہے، جسے بسر کرنے پر ہم مجبور ہیں۔ ساتھ ہی غم کا سلسلہ لگا ہوا ہے۔ یہ دونوں چیزیں اصلاً ایک ہیں لہذا ممکن ہی نہیں کہ انسان زندگی کی میعاد پوری کیے بغیر غم سے نجات حاصل کرلے۔ جب دونوں چیزیں اصل میں ایک ہوئیں تو ہر حال میں ساتھ رہیں گی اور دونوں اکٹھی ختم ہوں گی۔

یہ بھی ایک حکیمانہ نکتہ ہے، جو نہایت پُرتاثیر انداز میں بیان کیا گیا ہے زندگی نام ہے احساسات و ادراکات کا۔ جب تک قوتِ احساس باقی ہے، انسان کے لیے ممکن ہی نہیں کہ اس دنیا میں چلے پھرے، زندگی گزارے اور ماحول سے متاثر نہ ہو۔ یہ تاثر بعض اوقات وقتی طور پر مسرت و نشاط بھی پیدا کرتا ہے، لیکن انجام اس کا بھی غم کے سوا کچھ نہیں۔ مثلاً کوئی اچھی چیز کھائی یا دیکھی، پھر وہ چھینی یا جاتی رہی، جس کا نتیجہ غم کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ غرض جب تک دنیا کی احساس بھری زندگی قائم ہے۔ غم زندگی کے لیے ایک ناگزیر شے ہے، جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں۔ غم اسی وقت جائے گا، جب زندگی ختم ہوگی اور زندگی کے غموں کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔

۶۔ **لغات**۔ **بوالہوس** : ہوا و ہوس سے بھرا ہوا، یعنی غیر۔

شرح : مرزا غالب نے قاضی عبدالجلیل جنونؔ کو اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے :

"مولوی صاحب! کیا لطیف معنی ہیں! داد دینا۔ حسنِ عارض اور حسنِ ظن دو صفتیں محبوب میں جمع ہیں، یعنی صورت اچھی ہے اور گمان اس کا صحیح ہے، کبھی خطا نہیں کرتا اور یہ گمان اس کو بہ نسبت اپنے ہے کہ میرا مارا کبھی نہیں بچتا اور میرا تیرِ غمزہ خطا نہیں کرتا پس جب اس کو اپنے اوپر ایسا بھروسا ہے تو رقیب کا امتحان کیوں

کرے ؛ حسنِ ظن نے رقیب کی شرم رکھ لی ۔ ورنہ یہاں محبوب نے مغالطہ کھایا تھا ۔ رقیب عاشق صادق نہ تھا ۔ ہوس ناک آدمی تھا ۔ اگر پائے امتحان درمیان آتا تو حقیقت کھل جاتی "۔

شعر کے معنی بالکل واضح ہو گئے ۔ یعنی رقیب نے عشق نہیں ، محض ہوس کی بنا پر محبت کا دعویٰ پیش کر دیا ۔ محبوب حسین بھی تھا اور اسے اپنے بارے میں انتہائی حسن ظن بھی تھا ، یعنی یہ کہ میں جس پر ایک نظر ڈال دوں ۔ وہ عاشق ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا ۔ اس وجہ سے امتحان لیے بغیر ہی محبوب کو رقیب کے عشق کا یقین ہو گیا ۔ اپنے حسن پر اعتماد اور حسن ظن پر اعتماد کی بدولت رقیب کی آزمائش کا وقت ہی نہ آیا ۔ یوں اس کی شرم رہ گئی اور بھرم نہ کھلا ۔ اگر امتحان کی نوبت آجاتی تو رقیب کے لیے یقیناً بڑی مصیبت پیش آتی ۔

۷ ۔ **لغات** ۔ **پاسِ وضع** : وضع داری کا لحاظ ۔

شرح : شعر میں لف و نشر غیر مرتب ہے ۔ یعنی غرور عزّ و ناز کا تعلق ہے ، بزم میں نہ بلانے سے اور حجاب پاسِ وضع کا تعلّق ہے راہ میں نہ ملنے سے ۔

محبوب کو اپنے وقار و تمکین کا غرور ہے ۔ لہٰذا وہ ہمیں بزم میں بلانے پر آمادہ ہی نہیں ہو سکتا ، کیونکہ بلانے سے اس کے غرور کو صدمہ پہنچے گا ۔ ہم اپنی وضع داری کے لحاظ میں ڈوبے ہوئے ہیں ۔ ہمیں یہ شرم مارے جاتی ہے کہ راستے میں اس سے کہاں ملیں ، کیونکہ راستے میں محبوب سے ملنا وضع داری کے خلاف ہے ۔ غرض اس غرور عزّ و ناز اور اس حجاب پاس وضع کا نتیجہ یہ ہوا کہ محبوب اور عاشق میں ملاقات کی کوئی صورت نہ رہی ۔ راہ میں ملنا اور بات کرنا مشکل اور بزم میں بلایا جانا غیر ممکن ۔

۸ ۔ **شرح** : شعر کے اسلوب سے ظاہر ہے کہ لوگ مرزا کو سمجھا

رہے ہیں، تو کس مصیبت میں پڑ گیا ہے ؟ جسے محبوب بنائے بیٹھا ہے اسے نہ خدا سے کوئی واسطہ ہے، نہ وفا سے ۔ وہ منکر بھی ہے اور بے وفا بھی: تیرا دین بھی برباد ہو گا اور دل بھی۔ عمر بھر بے وفائی کی ٹھوکریں کھائے گا۔ مرزا ان سمجھانے والوں کی بات کاٹتے ہوئے کہتے ہیں : اچھا بھئی! ہم نے مانا، ہمارا محبوب کافر بھی ہے اور بے وفا بھی لیکن تم میں سے جسے اپنا دین اور اپنا دل پیارا ہے، وہ اس کی گلی میں کیوں جائے، جہاں دونوں برباد ہوں گے ہم تو دین و دل دونوں برباد کر چکے ۔ ہمیں تمھاری نصیحتوں کی ضرورت نہیں۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ اس زمین میں یہ شعر بھی بیت الغزل ہے ۔ اس معاملے کی طرف اشارہ ہے کہ لوگ سمجھا رہے ہیں اور یہ ان کی بات کاٹ رہے ہیں۔

۹۔ شرح : غالب اس دنیا سے رخصت ہو گئے ۔ اب وہ اپنے کسی رفیق کی زبان سے دوستوں، عزیزوں اور ماتم داروں کو سمجھا رہے ہیں کہ بھئی ! زار زار رونے اور ہائے ہائے کرنے سے کیا فائدہ ہے ؟ کیوں اس طرح ماتم کیا جائے ؟ ایک خستہ حال غالب کے بغیر دنیا کے کون سے کام رک جائیں گے ؟ ماتم چھوڑو اور صبر سے کام لو۔

غنچۂ ناشگفتہ کو، دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں، منہ سے مجھے بتا کہ یوں

پرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا کہ بن کہے
اس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

۱۔ شرح : میں نے پوچھا کہ بوسہ کیونکر لیا جاتا ہے؟ تو نے دور سے مجھے ایک منہ بند یعنی ناشگفتہ گل دکھا دی اس کے دکھانے سے

رات کے وقت مے پیے، ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے! پر نہ کرے خدا کہ یوں
"غیر سے رات کیا بنی؟" یہ جو کہا تو دیکھیے
سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں"
بزم میں اُس کے روبرو، کیوں نہ خموش بیٹھیے
اس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں"
میں نے کہا کہ "بزم ناز چاہیے غیر سے تہی،
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ "یوں"؟
مجھ سے کہا جو یار نے "جاتے ہیں ہوش کس طرح؟"
دیکھ کے میری بیخودی، چلنے لگی ہوا کہ "یوں"
کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی، حیرتِ نقشِ پا کہ یوں"
گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال
موج محیط آب میں، مارے ہے دست و پا کہ یوں
جو یہ کہے کہ "ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی"،
گفتۂ غالب ایک بار، پڑھ کے اُسے سُنا کہ "یوں"

کیا فائدہ؟ میں نے تو یہ سوال کیا ہے، منہ سے بوسے لے کر بتا کہ یوں لیا جاتا ہے۔
اس میں خوبی صرف یہ ہے۔ کہ بوسہ لیتے وقت منہ کا نقشہ بالکل ناشگفتہ کلی کا سا ہوتا ہے۔

۲۔ شرح: میں محبوب سے دل لینے کا طریقہ کیا پوچھوں؟ کچھ بتائے بغیر ہی اس کے ہر اشارے سے کوئی نہ کوئی ادا ٹپک رہی ہے جو بتاتی ہے کہ دل یوں لیا جاتا ہے

۳۔ شرح: اس میں لف و نشر

مرتب ہے۔

رات کا وقت ہو، محبوب نے شراب پی رکھی ہو۔ خدا کرے، وہ یہاں ضرور آئے۔ ساتھ ہی خدا نہ کرے کہ وہ رقیب کو ساتھ لے کر آئے۔

۴۔ شرح : جب میں نے محبوب سے پوچھا کہ رات غیر کی صحبت میں کیا صورت پیش آئی تو دیکھیے، وہ سامنے آبیٹھا اور بولا: "دیکھنا، یوں"۔ "دیکھنا کہ یوں" کے دو مطلب ذہن میں آتے ہیں۔ اوّل یہ کہ غصّے سے عاشق کی طرف دیکھنا۔ مقصد یہ تھا کہ تمہارے لب پر ایسا گستاخانہ سوال نہ آنا چاہیے تھا۔ دوسرے یہ کہ محبوب نے ڈھٹائی اختیار کر لی اور سامنے بیٹھ کر کہا کہ یوں صورت پیش آئی تھی، گویا بے حجابی اور بے تکلفی کی صورت تھی۔

۵۔ شرح : بزم میں محبوب کے روبرو چُپ بیٹھے رہنے کے سوا چارہ نہیں، وہ خود چپ بیٹھا ہے اور اس کا مطلب یہی ہے کہ کسی اَور کو بھی کچھ نہ بولنا چاہیے۔

۶۔ لغات۔ ستم ظریف : وہ شخص، جو ظلم و ستم میں بھی ظرافت کا پہلو نہ چھوڑے۔

شرح : میں نے محبوب سے کہا کہ آپ نے بزم ناز آراستہ کر رکھی ہے۔ ایسی محفل غیر سے بالکل خالی کرا لینی چاہیے۔ یہ سنتے ہی اس ستم ظریف نے مجھے بزم سے اٹھا دیا، پھر پوچھا کہ تمہاری مراد یہ تھی؟ شعر میں ستم ظریفی کا پہلو یہ ہے کہ مرزا نے اپنے آپ کو خویش سمجھتے ہوئے غیر کو اٹھا دینے کی تدبیر کی۔ ظالم محبوب نے خود مرزا ہی کو غیر سمجھ کر اٹھوا دیا، ساتھ ہی پوچھا: "تم یہی چاہتے تھے"؟

۷۔ شرح : جب محبوب نے مجھ سے پوچھا کہ ہوش کس طرح اُڑتے ہیں تو مجھ پر بیخودی کا عالم طاری ہو گیا۔ یہ دیکھتے ہی ہوا چلنے لگی اور اس نے بتایا کہ ہوش یوں اڑتے ہیں۔ یعنی محبوب کا جلوہ دیکھ کر ہوش و حواس

اس طرح رخصت ہو جاتے ہیں، جیسے ہوا چلتی ہے۔

۸۔ **شرح** : مجھے محبوب کے کوچے میں رہنے کا طور طریقہ یاد نہ تھا۔ یہ دیکھتے ہی نقشِ پا کی حیرت میرے لیے آئینہ دار بن گئی۔ یعنی اس نے دکھا دیا کہ محبوب کے کوچے میں رہنا چاہو تو اس کی صورت یہ ہے کہ نقشِ پا کی طرح خاک میں مل جاؤ اور جلوۂ حسن سے سراپا حیرت بن کر پوری زندگی گزار دو۔

۹۔ **لغات** : موجِ محیط : سمندر کی لہر۔

شرح : اگر تیرے دل میں یہ خیال ہو کہ وصل کے بعد شوق پر زوال آ جاتا ہے تو یہ صحیح نہیں۔ سمندر کی لہروں کو دیکھ، وہ عین پانی میں بھی بدستور ہاتھ مارتی رہتی ہیں۔ یعنی وصل کا کمال بھی ان کے شوق پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا۔ وہ ہمیں بتا رہی ہیں کہ شوق سچا اور خالص ہو تو وصال کے بعد بھی اس کی بیتابی اور بیقراری میں کوئی فرق نہیں آتا۔

۱۰۔ **لغات** ۔ ریختہ : اردو غزل

شرح : اگر کوئی شخص کہے کہ اردو کی غزل کیونکر فارسی کے لیے باعثِ رشک ہوتی ہے تو اسے ایک بار غالبؔ کے کہے ہوئے شعر سنا دے ساتھ ہی کہہ دے کہ ایسے شعر واقعی فارسی کے لیے باعثِ رشک ہوتے ہیں۔

حسد سے دِل اگر افسردہ ہے، گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ، شاید، کثرتِ نظارہ سے وا ہو

بہ قدرِ حسرتِ دل، چاہیے ذوقِ معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن، گر آبِ ہفت دریا ہو

۱۔ **شرح** : خواجہ حالی فرماتے ہیں : "یہ محض خیالی مضمون نہیں ہے بلکہ حقیقت واقعی

کو ایک نہایت عمدہ پیرائے میں بیان کیا

اگر وہ سرو قد، گرمِ خرامِ ناز آ جاوے
کفِ ہر خاکِ گلشن، شکلِ قمری، نالہ فرسا ہو

ہے۔ فی الواقع جب انسان گھر کی چار دیواری میں محصور، دنیا کے حالات سے ناواقف اور لوگوں کی ترقی و تنزل کے اسباب سے بے خبر ہوتا ہے تو اپنی محدود جماعت میں سے کسی کو عمدہ حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن جس قدر اس کا دائرہ تعارف زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے، اسی قدر اس پر یہ بات کھلتی جاتی ہے کہ لوگوں کی خوش حالی محض اتفاقی نہیں ہے، جس پر حسد و رشک کیا جائے، بلکہ ان کی محنت و تدبر کا نتیجہ ہے اور اس لیے انصاف و فیاضی اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور خود بھی کوشش و تدبر کی طرف مائل ہوتا ہے۔ بجائے حسد و رشک کے اوروں کی ریس اور پیروی کرنے میں متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس معقول بات کو ایک محسوس تمثیل میں بیان کرتا ہے کہ چشم تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو۔ جس طرح شعرا نے بخیل کے دل کو تنگ باندھا ہے، اسی طرح حاسد کی آنکھ کو تنگی کے ساتھ موصوف کیا۔"

مولانا طباطبائی نے حسد کرنا اس لیے بیجا قرار دیا کہ "دنیا میں دولت کے لیے کوئی سبب درکار نہیں، ہر جگہ یہی حال ہے۔" یعنی اگر کوئی شخص پھر پھر کر دیکھے گا تو اس پر واضح ہوتا جائے گا کہ دولت خاص اسباب کی بنا پر ہاتھ نہیں آتی۔ مثلاً ایک تاجر کا بیٹا صرف اس لیے دولت مند بن جاتا ہے کہ اس کا باپ دولت مند تھا اور یہ تو سب کو معلوم ہے کہ بادشاہ کا بیٹا ملک کا والی بن جاتا ہے، حالانکہ اس میں ملک داری کی کوئی خصوصیت

نہیں ہوتی۔ جب کوئی شخص اس قسم کی مثالیں بکثرت دیکھے گا تو امید یہی ہے کہ حسد اس کے دل میں یا تو بالکل باقی نہیں رہے گا یا بہت کم رہ جائے گا۔

دونوں صورتوں میں سے خواجہ حالی کی اختیار کردہ صورت بہترین ہے۔ اسے واقعی اخلاقی سبق قرار دے سکتے ہیں۔ محض یہی نہیں کہ دنیا میں چل پھر کر حالات پر غائر نظر ڈالی جائے تو انسان کے دل میں کسی بھی نقطۂ نگاہ سے تنگی باقی نہیں رہ سکتی، بلکہ بعض ملکوں اور قوموں کا ماحول ایسا ہوتا ہے کہ دوسری قوموں کے نکمے افراد وہاں پہنچ کر اعلیٰ درجے کے کارکن بن جاتے ہیں۔ اسی طرح انسانوں کے دل سے حسد دور ہو سکتا ہے۔ مرزا نے "شاید" کا لفظ استعمال کیا، جس سے مراد یہ ہے کہ لازمی اور یقینی نہیں، ہر شخص پر کثرتِ نظارہ کا یہی اثر ہو۔ اثر زیادہ یا کم بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ بالکل نہ ہو۔ بعض طبیعتیں کسی بھی حال میں اچھا اثر قبول نہیں کرتیں، لہذا "شاید" کی قید بالکل بجا ہے اور میرزا کی گہری بصیرت کا پتا دیتی ہے۔

۲۔ **لغات**۔ معاصی: معصیت کی جمع۔ گناہ

شرح: میرے دل میں مختلف گناہ نہ کر سکنے کی جتنی حسرت ہے اسی کے مطابق گناہوں کا ذوق ہونا چاہیے۔ میری حسرت لامتناہی ہے، اس لیے ذوقِ گناہ بھی لامتناہی ہے۔ حالت یہ ہے کہ اگر گناہ سات سمندر بن جائیں تو میرے دامن کا صرف ایک گوشہ تر ہو سکے گا۔

میرزا پہلے بھی اس مضمون کا ایک شعر کہہ چکے ہیں:

ندیائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

۳۔ **لغات**۔ نالہ فرسا: آہ و فغاں کرنے والا۔

شرح : اگر میرا محبوب، جس کا قد سرو کی طرح بلند ہے، ناز و انداز سے ٹہلتا ہوا باغ میں آجائے تو خاکِ باغ کی ہر مُٹھی قمری کی طرح آہ و فغاں کر اُٹھے۔

خاک کی ہر مٹھی کو قمری اس لیے قرار دیا کہ قمری فاختہ کی ایک قسم ہے، جس کا رنگ خاکی ہوتا ہے پھر قمری کو سرو سے جو تعلق ہے، وہ محتاجِ تشریح نہیں اور سرو کے لیے خرامِ ناز کی موزونیت واضح ہے۔

کعبے میں جا رہا، تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کُنِشت کو

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے؟
ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو

غالبؔ کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے، اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

۱۔ لغات :
کنشت : بُت خانہ

شرح :
اگر میں کعبے میں جا کر مقیم ہو گیا ہوں تو مجھے طعنہ نہ دو۔ کیا میں وہاں جا کر بُت خانے کے لوگوں کا حقِ صحبت بھول گیا ہوں؟ ان میں رہ کر میں نے جو فیض پائے، جن مہربانیوں سے فائدہ اٹھایا اور جو کچھ سیکھا، اسے بھول سکتا ہی نہیں، وہ بدستور میرے دل میں تازہ ہیں۔

مقصد یہ ہے کہ مقام کی تبدیلی سے لازم نہیں آتا۔ انسان کے فکر و خیال اور عقیدت و نیاز میں بھی تغیر آجائے انسان کعبے میں جا کر بھی

بُت پرست رہ سکتا اور بُت پرستوں سے محبت رکھ سکتا ہے۔ عقیدہ و ایمان کا تعلق دل سے ہے، نہ کہ کسی خاص مقام میں قیام سے۔

۲۔ **لغات** ۔ **طاعت** : بندگی، عبادت، فرمانبرداری۔

مے و انگبیں : شراب اور شہد۔ اشارہ ہے بہشت میں شراب اور شہد کی نہروں کی طرف۔

شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"جب تک بہشت قائم ہے، لوگ عبادت اس امید پر کرتے ہیں کہ وہاں شہد اور شراب طہور وغیرہ ملے گی، پس بہشت کو دوزخ میں جھونک دینا چاہیئے تاکہ یہ لالچ باقی نہ رہے اور لوگ خالصاً لوجہ اللہ عبادت کریں۔"

عام عقیدہ یہ ہے کہ خدا کی عبادت کرنے سے بہشت میں شراب اور شہد کی نہریں ملیں گی۔ میرزا کہتے ہیں کہ عام لوگ شراب اور بہشت کی آرزو دل میں لے کر خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ سچی اور بے لوث عبادت تو نہ ہوئی، جو ہر غرض کی آلائش سے پاک ہو اور صرف خدا کے لیے ہو۔ مناسب یہ ہے کہ بہشت کو اٹھا کر دوزخ میں ڈال دیا جائے تاکہ لوگ صرف خدا کے لیے عبادت کر سکیں، اور کوئی غرض ان کے سامنے نہ رہے۔

۳۔ **لغات** ۔ **منحرف** : پھر جانے والا۔ برگشتہ

سرنوشت : تقدیر، قسمت۔

شرح : میں ان طور طریقوں سے کیوں نہ پھر جاؤں، جن پر چل کر ثواب حاصل ہوتا ہے؛ میری حالت تو یہ ہے کہ جس قلم سے میری قسمت لکھی گئی ہے، اسے قط ہی ٹیڑھا لگا تھا۔ لہٰذا جو تحریر لکھی گئی ہے، وہ بھی ٹیڑھی ہے اور میرے لیے سیدھے راستے پر چلنا اور ثواب حاصل کرنا طبعاً غیر ممکن ہو گیا ہے۔

۴۔ **لغات** ۔ **یخ** : ٹھنڈی

لہنا : قسمت، نصیب، فائدہ، حاصل

شرح : اے غالب ! میں اپنی کوشش، محنت اور جدو جہد سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کرسکتا ۔ اگر میں کھیتی باڑی کروں تو پہلے یقین ہے، ٹڈی دَل آ کر اسے صفاچٹ کر جائے گا ۔ اگر اتفاقیہ فصل ٹڈیوں سے بچ گئی اور میں نے کھلیان جمع کر لیا تو اسے بجلی جلادے گی ۔

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ، عداوت ہی کیوں نہ ہو

چھوڑا نہ مجھ میں ضُعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار، نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

پیدا ہوئی ہے، کہتے ہیں، ہر درد کی دوا
یوں ہو تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو

ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں، خجالت ہی کیوں نہ ہو

ہے آدمی بجائے خود اِک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو

۱۔ لغات:

وارستہ : آزاد

شرح : اے محبوب ! ہم اس سے آزاد ہیں کہ آپ ہم سے محبت ہی کریں ۔ اگر محبت نہیں کرنا چاہتے تو کچھ مضائقہ نہیں ۔ دشمنی ہی کا طریقہ اختیار کرلیں ۔ دونوں صورتوں میں تعلق قائم رہے گا ۔ ایک میں خوشگوار اور دوسری میں ناخوشگوار لیکن دونوں ہی صورتیں غائب ہو جائیں تو کامل بے تعلقی رونما ہو جائیگی یہ کسی بھی حالت میں منظور

ہنگامۂ زبونیِ ہمّت ہے ، انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے، عبرت ہی کیوں نہ ہو
وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں!
اپنے سے کر، نہ غیر سے، وحشت ہی کیوں نہ ہو
مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی؟
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو
اس فتنہ خُو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

نہیں میرزا خود کہتے ہیں :
لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا!
نیز
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

۲ - لغات ۔ اختلاط : میل جول ۔
شرح : ضعف اتنا بڑھ گیا کہ میل جول قائم رکھنے کی بھی تاب نہ رہی ۔ حالت یہ ہے کہ محبت کا نقش بھی دل کے لیے ایک ایسا بوجھ معلوم ہوتا ہے ، جو برداشت نہیں کیا جا سکتا ۔

اس شعر میں بھی صرف ضعف کی شدّت واضح کرنا مقصود ہے ، یہ نہیں کہ محبت ہی سے بیزار ہو گئے ۔ اسلوب بیان ایسا اختیار کیا کہ جو چیز ہمیں سب سے بڑھ کر عزیز ہے بلکہ ہمارے لیے روح و رواں کی حیثیت رکھتی ہے یعنی محبت ، وہ بھی ایسے ضعف میں بار محسوس ہو ۔

۳ - لغات ۔ بر سبیلِ شکایت : شکایت کے طور پر ، گلے کے رنگ میں ۔

شرح : اے محبوب ! مجھے تجھ سے یہ گلا ہے کہ غیر کا ذکر مجھ سے کیوں کیا ، مانا کہ تیرا مقصد اس کی شکایت کرنا تھا ، لیکن مجھے شکایت کے رنگ میں بھی اس کا ذکر گوارا نہیں ۔

۴۔ **شرح** : مشہور ہے کہ ہر درد کے لیے دنیا میں دوا موجود ہے اگر یہ قول درست ہے تو کون سی وجہ ہے کہ محبت کے غم میں کوئی دوا کہیں نہیں ملتی۔ یعنی اس قول کو، جو عام رواج پا چکا ہے، غلط ثابت کرنے کے لیے کم از کم یہ بدیہی مثال تو ضرور موجود ہے۔

۵۔ **لغات**۔ **خجالت** : شرمندگی، پشیمانی۔

شرح : میں عمر بھر بیکس رہا۔ کسی نے میرا ساتھ نہ دیا اور اس وجہ سے کسی کے ساتھ مجھے کوئی معاملہ پیش نہ آیا۔ اگر لوگوں سے تعلق ہوتا تو کوئی مجھ سے فائدہ اٹھاتا اور کسی کا حق پورا نہ کر سکنے کے باعث مجھے شرمندگی اور پشیمانی سے سابقہ پڑتا۔ جب کسی سے معاملہ ہی نہ پڑا تو شرمندگی بھی اپنے آپ ہی سے ہو رہی ہے۔ اور کسی سے نہیں۔

شرمندگی اس لیے کہ میں اتنا ناقص ہوں، کسی کو میرے ساتھ معاملے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔

۶۔ **شرح** : آدمی اپنے دل و دماغ میں گوناگوں خیالات کا ایک محشر لیے ہوئے ہے۔ کوئی وقت، کوئی صورت اور کوئی حالت ہو، ان خیالات سے الگ نہیں ہو سکتا۔ وہ مختلف منصوبے سوچتا ہے، نئی نئی سکیمیں بناتا ہے اور ایک لمحے کے لیے بھی ان باتوں سے فارغ نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ دنیا سے کٹ کر گوشۂ تنہائی میں بھی بیٹھ جائے تو وہاں بھی اپنے خیالات سے سلسلہ منقطع نہیں کر سکتا۔ گویا گوشۂ تنہائی میں بھی اس کے دل و دماغ کے اندر ایک مستقل انجمن آراستہ رہتی ہے، لہذا ہم اس کی خلوت کو خلوت نہیں، انجمن ہی سمجھتے ہیں۔

روحانی نقطۂ نگاہ سے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ انسان دنیوی تعلقات سے الگ ہو جانے کے کتنے ہی دعوے کرے، اس کے لیے الگ ہونا ہے غیر ممکن، کیونکہ وہ دنیا والوں سے الگ ہو سکتا ہے، اس کے اندر دنیوی خیالات

کا جو محشر بپا ہے، اس سے الگ نہیں ہو سکتا۔

۷۔ **لغات۔ زبونی ہمت** : ہمت کی پستی۔

انفعال : دوسرے کا اثر قبول کرنا۔

شرح : دوسرے کا اثر قبول کرنا پست ہمتی کی دلیل ہے۔ لوگ زمانے سے عبرت حاصل کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی بصیرت سے فائدہ اٹھایا، لیکن میں کہتا ہوں کہ زمانے سے عبرت بھی حاصل نہ کرنی چاہیے کیونکہ یہ بھی دوسرے کا اثر قبول کر لینا ہے اور اثر قبول کر لینا پستی ہمت کا باعث ہے۔ پھر کون سی وجہ ہے کہ انسان اپنے عزم و ہمت کے لیے ذلت و رسوائی کا سامان فراہم کرے؟

۸۔ **لغات۔ وارستگی** : آزادی

بیگانگی : بے تعلقی، اجنبیت

وحشت : دور بھاگنا۔

شرح : آزادی کے دعویدارو! آزادی کا مطلب یہ نہیں، کہ اسے لوگوں سے بے تعلقی کا بہانہ بنا لیا جائے، بے تعلقی اپنی ذات سے پیدا کرنی چاہیے، نہ کہ غیروں سے۔ وحشت و بیگانگی اپنی ہی ذات سے لازم ہے، دوسروں سے نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ گرد و پیش سے الگ ہو کر سمجھتے ہیں کہ ہم آزاد اور آزادہ رَو ہیں۔ آزادی یہ نہیں، یہ تو اپنی ذات کی خاص پاسداری اور دوسروں سے علیحدگی ہے۔ حقیقی آزادی یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ رہ کر ان کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دی جائے، ان کے دکھ بٹائے جائیں اور ان کی ہر ممکن اعانت کی جائے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اپنی ذات کو مٹایا جائے اور سب سے پیچھے رکھا جائے۔ یہی حقیقی آزادی ہے۔

اقبال اس مقام میں کیا خوب کہہ گیا ہے :

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں لمے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا، جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

۹۔ **لغات۔ فوتِ فرصت** : فرصت کا چھن جانا، ضائع ہو جانا۔

شرح : اگر انسان کی عمرِ عزیز کا ایک ایک لمحہ عبادت ہی میں صرف ہو، جو نہایت پاکیزہ مشغلہ ہے تو کیا اس حالت میں زندگی کی فرصت ضائع ہو جانے کا غم مٹ جائے گا ؟

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کی جو مہلت عطا کی ہے، وہ اتنی بیش بہا ہے کہ انسان ایک ایک لمحہ خدا کی عبادت میں بھی گزار دے تو احساس یہی ہوتا ہے کہ اس فرصت سے پورا فائدہ نہ اٹھایا گیا۔

یہاں لفظ "عبادت" حقیقی نہیں، رواجی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ حقیقی عبادت کا دائرہ نہایت وسیع اور بنی نوعِ انسان کے لیے حد درجہ فائدہ رساں ہے۔ غالباً میرزا غالب یہی واضح کرنا چاہتے ہیں کہ رواجی عبادت میں زندگی صرف کر لینے کے باوجود اس کا حق ادا نہیں ہوتا۔ مطلوب یہ ہے کہ اسے واقعی ان کاموں میں صرف کیا جائے، جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ذمّے لگا دیے ہیں اور انھیں کاموں کی بجا آوری کو حقیقی عبادت قرار دیا ہے اگر ایسا نہ ہو تو ظاہر ہے کہ زندگی کی عارضی مہلت ضائع ہوئی اور اس کا غم باقی رہ گیا۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بیشک انسان دل میں سمجھ سکتا ہے اس نے ارادۃً کسی نیک کام میں کوتاہی نہیں کی، لیکن کیا کہا جا سکتا ہے کہ تمام کام ٹھیک ٹھیک اسی طرح پورے ہوئے، جس طرح ہونے چاہییں تھے، لہٰذا یہ بھی فرصتِ ہستی کے ضائع ہونے کا سبب بنا۔

۱۰۔ **شرح** : ہمارے محبوب کی فطرت ہی فتنہ انگیزی ہے۔ اسے اسد! اب ہم اس کے دروازے پر آ بیٹھے ہیں اور پختہ ارادہ کر چکے ہیں۔ کہ یہاں سے نہیں اٹھیں گے۔ اگرچہ ہمارے سر پر قیامت ہی ٹوٹ پڑے، جو مردوں کو قبروں سے اٹھا کر باہر کھڑا کر دے گی۔

"قیامت ہی کیوں نہ ہو" میں اشارہ قیامت کی طرف بھی ہو سکتا ہے اور یہ مطلب بھی نکل سکتا ہے کہ ہم پر ایسی مصیبتیں نازل کر دی جائیں جو قیامت سے مشابہ ہوں۔

قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا بُرا کیا ہے نواسنجانِ گلشن کو
نہیں گر ہمدمی آساں، نہ ہو، یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست، دشمن کو
نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو، اس جراحت پر
کیا سینے میں جس نے خونچکاں، مژگانِ سوزن کو
خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو، کبھی جاناں کے دامن کو
ابھی ہم قتلگہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جُوئے خوں میں، تیرے توسن کو

۱۔ لغات:
شیون : نالہ، فغاں
نواسنجانِ گلشن : باغ میں گانے والے پرندے
شرح: میں پنجرے میں قید ہوں اور فریاد و فغاں کرتا رہتا ہوں۔ مان لیجیے کہ باغ کے

ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا
کیا بے تاب کاں میں، جنبش جوہر نے آہن کو

خوشی کیا، کھیت پر میرے، اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

وفاداری، بشرطِ استواری، اصلِ ایماں ہے
مَرے بُت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

شہادت تھی مری قسمت میں، جو دی تھی یہ خو مجھ کو
جہاں تلوار کو دیکھا، جھکا دیتا تھا گردن کو

نہ لُٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دُعا دیتا ہوں رہزن کو

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں، غالبؔ!
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

آزاد و خوش نوا پرندوں کو میری فریاد و فغاں اچھی معلوم نہیں ہوتی لیکن میرے ہونے میں کیا بُرائی ہے؟ میرا وجود انھیں کیوں ناگوار معلوم ہوتا ہے حالانکہ میری وجہ سے ان کی آزادی اور خوش نوائی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ ممکن ہے، میرزا غالب نے باغ کی صرف عام کیفیت پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ شعر کہہ دیا ہو اور ان کے سامنے کوئی خاص واقعہ نہ ہو، لیکن جلد ہی ہمارے ملک کی قومی زندگی میں کئی ایسے واقعات پیش آئے، جن پر یہ شعر ٹھیک ٹھیک

منطبق ہوتا تھا۔ مثلاً ابتدا میں جن لوگوں نے ہمت و جرأت سے کام لے کر آزادی کے لیے سعی و جہد شروع کی اور وہ آلام و مصائب میں مبتلا ہوئے تو ایک دو نہیں، ہزاروں افراد اپنے دلی معتقدات کی بنا پر یا حکمران قوم کو خوش کرنے کے لیے ان مجاہدین کی مذمت کرتے رہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک آزادی کا جذبہ عام نہ ہو گیا۔ ایسے مجاہد اہلِ وطن کو یہی شعر سنا کر حقیقتِ حال واضح کر سکتے ہیں کہ قید ہم ہوئے، مصیبتیں ہم پر آئیں، آزادی کی صدا ہم نے بلند کی۔ اس سے اہلِ وطن کے مشغلوں پر تو کوئی اثر نہ پڑا، پھر انھیں ہمارا وجود کیوں ناپسندیدہ معلوم ہوتا ہے؟

شاعر کے فکر و نظر کی غیر معمولی صلاحیت کا ایک منظر یہ بھی ہے کہ وہ شعر میں ایسی صورتِ حال پیش کر دے، جو اگرچہ اس کے زمانے میں موجود نہ ہو، لیکن آگے چل کر ٹھیک ٹھیک اسی طرح پیش آنے والی ہو۔ اسے بھی شاعر کے کلام کی آفاقیت کا ثبوت سمجھنا چاہیے۔

۲۔ شرح: اگرچہ رقیب کے لیے عشق و محبت اور وفا و فداکاری میں مجھ ایسا ہونا آسان نہ ہو، مگر یہ رشک کم نہیں کہ اس کے دل میں بھی میرے محبوب کی آرزو ہے۔ اے خدا! کاش یہ آرزو اسے نصیب نہ ہوتی! یعنی محبوب کے لیے کسی دوسرے کے دل میں خواہش کا پیدا ہونا بھی گوارا نہیں۔ اس سے بھی رشک کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔

کلیاتِ غالبؔ (فارسی) میں ایک شعر ہے، جس میں اس سے ملتا جلتا مضمون یوں پیش کیا ہے۔

یاد از عدو نیارم و یں ہم ز دوربینی ست
کاندر دلم گزشتن با یار ہم نشینی ست

۳۔ لغات۔ جراحت: زخم۔ گھاؤ۔

شرح: جن زخموں نے سینے کے اندر سوئی کی آنکھوں سے خون

ٹپکا دیا، اے محبوب! اُن زخموں پر تیری آنکھ سے ایک بھی آنسو نہ

بعض اصحاب نے اس لیے سوزنِ سے سوزنِ غم مراد لی کہ سینہ غم کا مقام ہے، لیکن یہ خیال نہ فرمایا کہ سوزنِ غم سے زخم سیے نہیں جاتے۔ اور جراحی میں آج کل کی طرح پہلے بھی اندرونی زخم برابر سیے جاتے تھے اور سوئیوں کی آنکھوں سے خون کے قطرے ٹپکتے تھے۔ سینہ بہ معنی صدر کی جگہ سینا بہ معنی دوختن سمجھنا بھی میرے نزدیک قرینِ صواب نہیں۔ شعر کا مضمون یقیناً زیادہ گہرا نہیں، لیکن شاعر محبوب کی بے پروائی اور بیدردی کی تصویر پیش کر رہا ہے اور اس نقطۂ نگاہ سے شعر نہایت اچھا ہے۔

۴۔ **شرح** : خدا کرے کہ میرے ہاتھوں کو شرم آئے۔ ان کے دو ہی کام رہ گئے ہیں یا تو میرے گریبان کو کھینچا تانی میں رکھتے ہیں یا محبوب کے دامن کو کھینچتے ہیں۔ کاش یہ اپنے اس فعل سے باز آئیں۔

عاشق کے لیے زندگی کی دو ہی صورتیں ہیں یا محبوب سے وصال یا ہجر و فراق۔ محبوب سے قرب ہو تو عاشق کے ہاتھ اس کا دامن کھینچنا شروع کر دیتے ہیں، یہ حرکت بھی نازیبا ہے۔ اگر محبوب سے مفارقت ہو تو بیتابی اور بیقراری میں عاشق کے ہاتھ گریبان تار تار کر دینے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ میرزا نے ہاتھوں کے لیے بد دعا ضرور کی، لیکن ہجر و وصال کا جو نقشہ پیش کر دیا، وہ بالکل بے مثال ہے۔

۵۔ **لغات**۔ شناور : تیرنے والا۔

توسن : گھوڑا۔

شرح : عشق کی قتل گاہ کوئی معمولی چیز نہیں۔ جب یہ رونق پر آتی ہے تو خون کا دریا بہ نکلتا ہے، جس میں قاتل کا گھوڑا تیرتا پھرتا ہے۔

اس شعر کی آفاقیت قابلِ غور ہے۔ قومی زندگی میں ایسے ہزاروں منظر پیش آئے اور ہمیشہ پیش آتے رہیں گے۔ لوگوں نے سمجھا کہ آزادی حاصل

کر لینا آسان ہے۔ جب قربانیوں کا موقع آیا، قرنوں اور پشتوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ واقعی خون کے دریا بہ گئے، پھر آزادی کی منزل میں قدم پہنچ سکے۔ شعر میں یہ منظر نہایت خوش اسلوبی سے پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ دو چار دس بیس قربانیوں سے یہاں کام نہیں چل سکتا۔ اس منزل کو آسان نہ سمجھو۔ یہاں واقعی بے دریغ قربانیاں کرنی پڑیں گی۔

۶ - **شرح** : میں وہ وحشی اور مجنوں ہوں کہ جب میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا چرچا ہوا تو جوہر اس طرح حرکت میں آگئے کہ فولاد کان کے اندر بیتاب و بے قرار ہو گیا۔ یعنی فولاد بھی ایسے وحشی کی زنجیر بن جانے کا انتہائی خواہاں تھا۔

شعر میں گرفتاری اور قید و بند کے ذوق کا جو جذبہ پیش کیا گیا ہے، وہ واقعی اعلیٰ مقاصد کے لیے جدوجہد کرنے والوں کے تعلق میں قابلِ تقلید ہے۔

۷ - **شرح** : اگر میرے کھیت پر بادل سو بار بھی آئے تو اس کا صرف یہی پہلو نہیں کہ کھیت پر بارش ہو گی اور اس سے فصل پک جانے میں مدد ملے گی۔ ایک پہلو یہ بھی تو ہے کہ ابر کی آمد مصیبت کا سامان بھی بن سکتی ہے، یعنی ابر کے پردے میں بجلی آئی اور تلاش کر رہی ہے کہ کب موقع پائے اور کھیت کا حاصل جلا کر راکھ کر دے۔

میرزا نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ دنیا کی ہر چیز میں دو پہلو موجود ہیں، ایک منفعت کا ہے، دوسرا نقصان کا۔ انسان کو صرف ایک ہی پہلو پر نظر نہ رکھنی چاہیے۔ لوگ ایسے اشعار کی بنا پر میرزا کو قنوطیت کا شاعر قرار دیتے ہیں، حالانکہ یہاں رجائیت و قنوطیت کا کوئی سوال نہیں۔ بصیرت کا تقاضا یہی ہے کہ دونوں پہلو پیشِ نظر رکھے جائیں۔ گویا یہ اظہارِ قنوطیت نہیں، بلکہ دعوتِ بصیرت ہے۔

۸ - شرح : ایمان کی اصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ وفاداری کے مسلک پر انسان برابر قائم و استوار رہے، یہاں تک کہ مر جائے۔ اگر برہمن اسی اصل ایمان کو پیشِ نظر رکھ کر بتخانے میں مر جائے تو وہ اس قابل ہے کہ دفن کے لیے اسے کعبے میں جگہ ملے۔

ظاہر ہے کہ نہ برہمن کو دفن کیا جاتا ہے اور نہ کعبۂ مکرمہ قبرستان ہے کہ وہاں لوگ دفن ہوں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ ایمان کی اصل (اپنے عقیدے پر پوری وفاداری سے قائم و استوار رہنا) کی اہمیت وعظمت نمایاں کی جائے۔ جس فرد میں ایمان کی یہ اصل موجود ہو، اس کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو، وہ اس قابل ہے کہ اسے دنیا کے مقدس ترین مقام میں جگہ ملے۔

بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ عرفی پیشتر ایک شعر کہہ چکا ہے، جس کا مضمون قریب قریب یہی ہے، یعنی :

بکیشِ برہمناں آں کس از شہیدان است
کہ در عبادتِ بُت روئے بر زمیں میرد

برہمنوں کے عقیدے کے مطابق شہید وہ ہے، جو بُت کے سامنے سجدے میں گرے ہوئے جان دے دے۔

ظاہر ہے کہ اس شعر کو بہ اعتبار مضمون غالب کے شعر سے کوئی نسبت نہیں۔ عرفی صرف یہ بتاتا ہے کہ برہمنوں کے عقیدے کے مطابق شہید کون ہے؟ غالب ایمان کی اصل راساس واضح کرتے ہیں اور اس پر پورے مضمون کی بنیاد رکھتے ہیں۔

۹ - شرح : میری قسمت میں شہادت لکھی تھی، لہذا اللہ تعالیٰ نے میری فطرت ہی میں یہ چیز ڈال دی کہ جہاں تلوار کھچی ہوئی دیکھتا تھا، وہیں گردن جھکا دیتا تھا۔

جن لوگوں کے عزائم بلند ہوں، ان کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے کہ وہ خطرات سے ڈرتے نہیں، بلکہ ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ یہی حقیقت اس شعر میں واضح کی گئی ہے۔

۱۰۔ **شرح** : اگر میں دن کے وقت رہزن کے ہاتھوں نہ لٹ جاتا اور جو کچھ میرے پاس تھا، وہ چھین نہ لیا جاتا تو رات کے وقت میرے لیے یوں سو جانے کی کون سی صورت تھی کہ سدھ بدھ ہی نہ رہی۔ بے خبری کی یہ نیند اس لیے آئی کہ چوری کا کوئی دغدغہ باقی نہ رہا اور رہزن کو دعا دیتا ہوا سو گیا کہ وہ دن کے وقت سب کچھ چھین لے گیا۔

اس شعر سے ملتا جلتا ایک شعر نظیری نیشاپوری کا بھی ہے۔

بہ عریانی ازاں شادم کہ از تشویش آزادم
گریبانے ندارم تا کسے از دستِ من گیرد

یعنی میں برہنگی پر اس لیے خوش ہوں کہ تشویش سے فارغ ہو گیا۔ میرے پاس کپڑا ہی نہیں، جو کوئی چھین کر لے جائے۔

دونوں کا مرکزی مضمون ایک ہے، یعنی دنیا کا ساز و سامان اور علائق انسان کے لیے تشویش و اضطراب کا سرچشمہ ہیں۔ ان سے آزاد رہنا باعثِ اطمینان ہے، لیکن دونوں کے بیان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ نظیری نے محض ایک دعویٰ کر دیا، مرزا نے پورے مضمون کو عام واقعی صورت دی اور کہا کہ رہزن دن کو سب کچھ لوٹ نہ لے جاتا تو رات کو بے خبر سونا نصیب نہ ہوتا، کیونکہ چوری کا اندیشہ باقی رہتا۔

پھر مرزا کی دقیقہ سنجی ملاحظہ فرمائیے :

۱۔ دو شخص پیدا کیے، جو سامان لے جا سکتے تھے، ایک رہزن، جو دن دہاڑے زور و قوت سے سب کچھ لوٹتا ہے، دوسرا چور، جو رات کو چھپ چھپا کر چیزیں اٹھاتا ہے۔

۲۔ رہزن اور چور دونوں موجب تشویش ہیں۔ مگر رہزن دن کو لوٹتا ہے اس لیے نیند میں خلل انداز نہیں ہو سکتا۔ چور رات کو چوری کرتا ہے اور اس کے متعلق کھٹکا مات کی نیند حرام کر دیتا ہے۔

۳۔ انسان کو اطمینان و فراغ کی ضرورت سب سے بڑھ کر رات ہی کے وقت پیش آتی ہے، کیونکہ یہی سونے کا وقت ہے۔ رہزن نے دن کو دستِ تغلب دراز کیا اور رات کے لیے اطمینان بہم پہنچا دیا، لہذا مرزا کے نزدیک وہ دعا کا مستحق ٹھہرا۔

۴۔ پھر مرزا نے یہ پورا واقعہ ایسے انداز میں پیش کیا، گویا یہ ہو چکا ہے، یہ نہیں کہ ہونے والا ہے۔

۱۱۔ **شرح** : اس شعر میں کلام کو جواہرات سے اور سخن گوئی کو کان کنی سے افضل و برتر قرار دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ کیا ہم شعر نہیں کہہ سکتے کہ جواہرات ڈھونڈتے پھریں؟ کیا ہمارے پاس جگر نہیں جس کی کاوش سے اعلیٰ درجے کے اشعار نکال سکتے ہیں کہ کانیں کھودتے پھریں؟

۱۲۔ **شرح** : بے شبہ ایران میں بڑے بڑے بادشاہ گزرے ہیں، مثلاً فریدوں، جمشید، کیخسرو، دارا، گشتاسپ اور بہمن، مگر ان سب کو میرے بادشاہ سے، جو حضرت سلیمانؑ کا سا رتبہ رکھتا ہے، کیا نسبت ہے؟

دھوتا ہوں جب میں پینے کو، اس سیم تن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد سے، کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں
دی سادگی سے جان، پڑوں کوہ کن کے پاؤں
ہیہات! کیوں نہ ٹوٹ گئے، پیرزن کے پاؤں

۱۔ **لغات** : پاؤں دھو کر پینا: انتہائی تعظیم، انتہائی فرمانبرداری اور انتہائی محبت کا ایک فعل ہے

بھاگے تھے ہم بہت، سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر داب‌تے ہیں، راہزن کے پاؤں

مرہم کی جستجو میں، پھرا ہوں جو دُور دُور
تن سے سوا فگار ہیں، اس خستہ تن کے پاؤں

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعد مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

ہے جوشِ گُل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اُڑتے ہوئے الجھتے ہیں، مرغِ چمن کے پاؤں

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دُکھتے ہیں آج اُس بُتِ نازک بدن کے پاؤں

غالب! مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو؟
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پاؤں

چنانچہ ہندو برہمنوں کے پاؤں دھو کر پیتے تھے۔ راجاؤں میں بھی یہی دستور رہا۔

شرح : میں اس حسین و جمیل کے پاؤں اس لیے دھوتا ہوں کہ دھو دن پی جاؤں تو وہ مجھ سے اپنے پاؤں کھینچ کر لگن سے باہر رکھ لیتا ہے۔ یعنی مجھے یہ سعادت بھی حاصل نہیں کرنے دیتا کہ اس سے محبت کا یہ انتہائی اظہار کر سکوں۔

۲۔ **لغات۔** ہیہات : لفظی معنی "بہت بعید ہے" اردو میں یہ کلمۂ تاسف ہے اور اس کے ایک ٹکڑے یعنی "ہات" کو پاؤں سے مناسبت ہے۔

پاؤں پڑنا : قدم چومنا، عزت اور تعظیم کرنا۔

پیرزن : مشہور ہے کہ فرہاد سے کہا گیا تھا، پہاڑ چیر کر شیریں کے باغ

کے لیے نہر لے آئے تو اسے شیریں مل جائے گی۔ فرہاد نے یہ شرط پوری کر دی۔ اب خسرو کو تشویش ہوئی۔ آخر ایک بڑھیا کو یا ایک روایت کے مطابق ایک مصاحب کو بڑھیا کا بھیس بدلوا کر فرہاد کے پاس بھیجا گیا۔ وہ روتی چلاتی گئی۔ فرہاد نے سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ میں شیریں کی دایہ ہوں، میں نے ہی اسے پالا تھا۔ وہ آج مر گئی۔ فرہاد نے یہ سنتے ہی تیشہ سر پر مارا اور مر گیا۔

شرح: فرہاد نے بھولپن سے جان دے دی۔ میرے دل میں اس کی اس سادگی کی انتہائی عزت ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس کے پاؤں چوم لوں۔ افسوس، صد افسوس، اُس بڑھیا کے پاؤں کیوں نہ ٹوٹ گئے، جس نے شیریں کی موت کی جھوٹی خبر فرہاد تک پہنچائی اور اسے یوں موت کے گھاٹ اتارا۔

فرہاد کی سادگی یہ کہ محبوبہ کی خبر موت سنتے ہی چھان بین بھی نہ کی اور اسے درست مان کر جان دے دی۔

۳۔ **شرح**: انسان سے جیسا جرم سرزد ہو، ویسی ہی اسے سزا ملتی ہے۔ اس کا نہایت اچھا نمونہ یہ اور اس سے اگلا شعر ہیں۔ کہتے ہیں کہ راہزن کا حملہ ہوا اور ہم نے اس کی گرفت سے بچ نکلنے کے لیے بھاگنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ لیکن پکڑے گئے اور ہمارے لیے یہ سزا تجویز ہوئی کہ راہزن کے پاؤں دبائیں۔ گویا گرفتاری اور اسیری سے بچنے کے لیے راہزن کو جتنا دوڑایا تھا، اتنی ہی سزا مل رہی ہے اور سزا میں مشقت یہ ہے کہ راہزن کے پاؤں دبائیں۔

۴۔ **شرح**: میرا بدن زخموں سے چور تھا۔ اُن زخموں کے لیے مرہم کی تلاش میں بہت دُور دُور پھرنا پڑا۔ اب حالت یہ ہے کہ پاؤں بدن سے زیادہ زخمی ہیں۔ دُور دُور پھرنے کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ پاؤں کو زیادہ سے زیادہ تکلیف پہنچے۔ شعر کی عمومی صورت ایسی ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ مرہم کی تلاش میں دُور دُور پھرنے کا تو کچھ فائدہ نہ ہوا، یعنی بدن جیسا زخمی

تھا، ویسا ہی رہا۔ مزید مصیبت یہ پیش آئی کہ پاؤں تن سے بھی بڑھ کر زخمی ہو گئے۔

یہ صورت حال بھی زندگی میں پیش آتی رہتی ہے۔ مثلاً تکلیفوں کو دور کرنے کے لیے تگ و دو شروع کر دی، لیکن سوء تدبیر یا سعی کی خامی کے باعث پہلی تکلیفیں دور ہونے کے بجائے مزید تکلیفیں پیش آ گئیں۔

۵۔ **شرح** : صحراؤں میں پھرنے کا ذوق اس طرح فطرت میں رچ گیا تھا کہ مرنے کے بعد غسل بھی دے دیا گیا، کفن بھی پہنا دیا گیا، لیکن پاؤں بدستور چل رہے ہیں۔ یہ اسی فطری ذوق کا کرشمہ ہے۔

۶۔ **شرح** : بہار کے موسم میں ہر طرف پھولوں کے جوش کا یہ عالم ہے کہ پرندے باغ میں اُڑتے ہیں تو ان کے پاؤں جا بجا الجھتے ہیں۔ اس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں، اول یہ کہ پھولوں کا جوش تو جال کی طرح پورے باغ پر چھا گیا ہے اور اس میں پرندوں کے پاؤں الجھ رہے ہیں۔ دوم یہ کہ پھولوں کے جوش نے باغ میں ہر طرف عجیب کیفیت پیدا کر رکھی ہے، پرندہ اڑتا ہے، لیکن پھولوں کی کیفیت دیکھتے ہی پر سمیٹ کر نیچے اتر آتا ہے، گویا وہ جانا نہیں چاہتا۔

۷۔ **شرح** : پرانے انداز کا ایک خیالی شعر ہے۔ محبوب کی نزاکت کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں، آج اس نازک بدن کے پاؤں دُکھ رہے ہیں، کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ رات کو کسی کے خواب میں آیا ہو۔ اس نزاکت کا کیا کہنا کہ محبوب خواب میں بھی چل کر جائے تو اس کے پاؤں دُکھنے لگتے ہیں۔

۸۔ **شرح** : اے غالب! میرا کلام کیوں پر لطف اور مزیدار نہ ہو؟ میں تو شیریں سخن خسرو کے پاؤں دھو کر پیتا ہوں۔

آخری مصرع میں خسرو سے مراد بادشاہ بھی ہو سکتا ہے اور امیر خسرو بھی، دونوں شاعر تھے، اگرچہ شعر کے مدارج میں بڑا فرق تھا۔

یہ غزل ۱۸۲۱ء کے دیوان میں چھپی تھی، گویا یہ قلعے کے ساتھ ملازمت کے تعلق سے پیشتر کی ہے۔ لہذا قرینہ یہی ہے کہ میرزا کے پیش نظر امیر خسرو ہوں۔ لیکن عموماً یہی سمجھا گیا ہے کہ اشارہ ابوظفر بہادر شاہ کی طرف ہے۔

خسرو، شیریں اور مزہ کی مناسبت واضح ہے۔

واں اس کو ہولِ دل ہے، تو یاں میں ہوں شرمسار
یعنی، یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

اپنے کو دیکھتا نہیں، ذوقِ ستم تو دیکھ
آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

۱۔ لغات۔ ہَولِ دِل: ہَول بہ معنی خوف، ہَولِ دل ایک بیماری ہے، جس میں دل دھڑکنے لگتا ہے اور اختلاج شروع ہو جاتا ہے۔

شرح: محبوب کو ہولِ دل کی بیماری ہو گئی ہے اور میں یہاں نادم و شرمسار بیٹھا ہوں کہ یہ کہیں میری آہ و فغاں ہی کا اثر نہ ہو۔

کبھی تو یہ عالم ہوتا ہے کہ جیس آہ و فغاں سے سورج میں شگاف پڑ جائے، وہ محبوب کے دل پر خس برابر اثر نہیں رکھتی اور کبھی خوش فہمی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ محبوب کو ہولِ دل کی بیماری ہوئی اور عاشق نے سمجھ لیا کہ یہ میری آہ کا اثر ہے اور آہ کے کرنے پر شرمندہ ہیں۔

۲۔ لغات۔ تاکہ: جب تک۔

نخچیر: شکار۔

شرح: محبوب کا ذوقِ ستم ملاحظہ فرمایئے کہ جب تک کسی جانور کو شکار کرکے نہ لائے اور اس کی آنکھوں کو آئینہ بنا کر سامنے نہ رکھ لے ،

زیبائش و آرائش اور بننے سنورنے ہی کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

شکار مارا جائے تو اس کی آنکھیں یا تو بالکل کھلی ہوتی ہیں یا نیم وا رہتی ہیں اور صاف و شفاف آئینے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ محبوب ایسا ظالم ہے کہ ان آنکھوں کو آئینہ بناتا ہے، پھر کنگھی چوٹی کرتا ہے۔

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صد رہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو

دل کو میں اور مجھے دل، محوِ وفا رکھتا ہے
کس قدر ذوقِ گرفتاریِ ہم ہے ہم کو

ضعف سے نقش پئے مور ہے طوقِ گردن
تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں
نالۂ مرغِ سحر، تیغِ دو دم ہے ہم کو

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ "ترے سر کی قسم ہے ہم کو"

۱۔ **لغات** :

پئے ہم : پیہم، لگاتار، مسلسل۔

صد رہ : سو سو طرح، سو سو بار۔

آہنگ : ارادہ

زمیں بوس : زمین چومنا۔

شرح : محبوب کے کوچے میں پہنچ کر مجھے لگاتار غش پر غش آتے ہیں، گویا میں اپنے قدموں کی زمین چومنے کے لیے سو سو طرح ارادہ کرتا ہوں۔

قدموں نے محبوب کے کوچے میں پہنچایا

دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ ؟ ولیکن ناچار
پاسِ بے رونقیِ دیدہ اہم ہے ہم کو

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافُل بھی ستم ہے ہم کو

مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

لیے جاتی ہے کہیں، ایک توقّع، غالب!
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

وہاں پہنچ کر غش آنے لگے۔ عاشق نے سمجھا کہ یہ غش نہیں بلکہ یں قدموں کے احسان سے اتنا زیربار ہوں کہ جی چاہتا ہے سو سو طرح ان کی زمین چوموں، کیونکہ انھیں کی بدولت میں یہاں پہنچا۔ جسے میرے شوق اور میری آرزو کی معراج سمجھنا چاہیئے۔

۲۔ لغات۔ ہَم : ایک دوسرا، جیسے باہم دگر۔

شرح : اگرچہ وفا کے واجبات ادا کرنے میں بڑی مصیبتیں اور بڑی پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں، پھر بھی میں دل پر زور دیتا رہتا ہوں کہ وفا کا راستہ نہ چھوڑنا چاہیے اور دل مجھے سمجھاتا رہتا ہے کہ آدابِ وفا سے الگ نہ ہونا۔ اسی سے اندازہ کر لیجیے کہ مجھے اور میرے دل کو باہم دگر عشق میں الجھائے رکھنے کا کتنا شوق ہے!

۳۔ لغات۔ نقشِ پےِ مور : چیونٹی کے پاؤں کا نقش۔
رَم : بھاگنا، چلا جانا۔

شرح : ہماری کمزوری کا یہ عالم ہے کہ چیونٹی کے پاؤں کا نقش میری گردن میں طوق کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے بعد اِدھر اُدھر جنبش محال

ہے۔ اے محبوب! سوچ کہ اس حالت میں ہمارے لیے تیرے کوچے سے بھاگنے یا چلے جانے کی کون سی صورت ہے؟

اس شعر میں ضعف کی شدت پر اس لیے زور دیا گیا کہ اگر چلے جانے کی طاقت ہوتی تو اس کا امکان خیال میں آسکتا تھا۔ جب طاقت ہی نہیں رہی تو امکان ہی خارج از بحث ہے، ہم جا سکتے ہی نہیں۔

۴۔ **لغات۔** **نگاہِ غلط انداز** : وہ نظر جو غلطی سے، بھولے سے بے التفاتی سے بلا ارادہ کسی پر پڑ جائے۔

سَم : زہر۔

شرح : شناسائی اور جان پہچان کا سا تغافل کیجیے تاکہ دل کے لیے امید کی کوئی روشنی باقی رہے۔ یہ آپ انجانوں کے سے انداز میں بے التفاتی سے بلا ارادہ جو نظر ڈال رہے ہیں، یہ تو ہمارے لیے زہر ہے، جو ہمیں موت کا پیغام دیتی ہے۔

میرزا نے اس شعر میں تغافل کی دو صورتیں پیدا کی ہیں، ایک وہ جو جانے پہچانے آدمیوں سے برتا جاتا ہے، دوسرا وہ جو انجانے آدمیوں سے کیا جاتا ہے۔ میرزا تغافل پر راضی ہیں، لیکن ایسا تغافل، جو جانے پہچانے آدمیوں سے روا رکھا جاتا ہے، کیونکہ اس میں عاشق کے لیے یہ امید باقی رہتی ہے کہ کسی وقت تغافل ختم ہو جائے گا اور محبوب کے التفات سے جی بھر کر محظوظ ہونے کا موقع ملے گا، لیکن جو تغافل انجانے آدمیوں سے کیا جاتا ہے، اس میں امید کی کون سی صورت ہو سکتی ہے وہ تو ہر انجان آدمی کے لیے برتا جاتا ہے۔ وہ تو یقیناً عاشق کے لیے زہر کا حکم رکھتا ہے۔

۵۔ **لغات۔** **ہم طرحی**۔ ہم مشربی، یک رنگی، ایک جیسا ہونا۔

بانگِ حزیں : درد بھری صدا، غم انگیز آواز

تیغِ دو دَم : دو دھاری تلوار۔

شرح: صبح کو پرندہ جو فریاد و فغاں کرتا ہے، وہ میرے لیے دو دھاری تلوار ہے۔ اس کی ایک دھار تو یہ ہے کہ اس فریاد و فغاں میں میرا انداز ہے اور وہی سوز ہے، جو میری فریاد و فغاں میں پایا جاتا ہے۔ یہ رشک مارے ڈالتا ہے۔ دوسری دھار یہ ہے کہ اس کی صدا نہایت غم انگیز ہوتی ہے اور وہ جہاں جہاں پہنچتی ہے، درد کی آگ بھڑکا دیتی ہے۔

۶۔ شرح: خواجہ حالی فرماتے ہیں:

"ترے سر کی قسم ہے ہم کو" اس جملے کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ تیرے سر کی قسم ہے، ہم ضرور اڑا دیں گے اور دوسرے یہ کہ ہم کو تیرے سر کی قسم ہے، یعنی کبھی ہم تیرا سر نہ اڑائیں گے جیسے کہتے ہیں کہ آپ کو تو ہمارے ہاں کھانے کی قسم ہے، یعنی کبھی ہمارے ہاں کھانا نہیں کھاتے۔"

ہم نے محبوب سے سر اڑانے کا وعدہ دوبارہ لینا چاہا۔ اس نے کہہ دیا کہ تو تیرے سر کی قسم ہے، گویا عاشق کو ضبطے میں ڈال دیا، کیونکہ سر کی قسم کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے: "تیرا سر ضرور اڑا دیں گے" اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے: "ہرگز نہ اڑائیں گے۔" اور لطف یہ ہے کہ "تیرے سر کی قسم ہے ہم کو" کہا تو ہنس کر کہا۔

۷۔ لغات۔ اہم: بہت زیادہ، بے حد۔

شرح: ہمارے لیے دل کو خون کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی، لیکن کیا کرتے، مجبور ہو گئے۔ آنکھیں بالکل بے رونق ہو رہی تھیں۔ دل خون ہو کر ان میں نہ پہنچتا تو بے رونقی دور نہ ہو سکتی اور آنکھوں کی بے رونقی کا ہمیں بے حد پاس و لحاظ تھا، لہذا دل کو لہو میں تبدیل کر دیا تاکہ وہ بہ کر آنکھوں میں پہنچے اور ان میں خونیں آنسوؤں سے تازگی و شادابی پیدا ہو۔

۸۔ شرح: تمہاری نزاکت کا یہ حال ہے کہ میں نے فریاد و فغاں چھوڑ

کر خاموشی اختیار کر لی - اور نزاکت کے باعث تم اس خاموشی کو بھی فریاد و فغاں قرار دے رہے ہو۔ میری عاجزی اور ناتوانی کی یہ کیفیت ہے کہ تم نے ستم سے ہاتھ کھینچ کر تغافل اختیار کر لیا تو میں اسے بھی اپنے لیے ستم سمجھ رہا ہوں۔

میرزا کا مقصد صرف یہ ہے کہ محبوب کی نزاکت اور اپنے عجز و ناتوانی کی کیفیت واضح کر دیں۔ اس کی نزاکت کے لیے خاموشی کو فریاد و فغاں قرار دیا، اور اپنی ناتوانی کے لیے تغافل کو ستم بنا دیا۔

۹۔۱۰۔۱۱۔ **لغات۔ مقطع** : سفر ختم ہونے کا مقام، آخری منزل۔

نجف : عام روایت کے مطابق وہ مقام، جہاں حضرت علیؑ کا روضہ ہے۔

طوفِ حرم : خانہ کعبہ کے گرد طواف کرنا، یعنی گھومنا۔

کششِ کافِ کرم : لفظ "کرم" کے کاف کی کشش۔ چونکہ یہ کشش لمبی ہوتی ہے، اس لیے اسے راستہ قرار دیا۔ اس سفر کا مقصد حصولِ کرم تھا یعنی لطف و کرم سے فائدہ اٹھانے کی آرزو تھی، لہٰذا کششِ کافِ کرم کی مناسبت بالکل واضح ہے۔

شرح : ہمارے لکھنؤ آنے کا سبب واضح نہیں ہوتا۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم سیر و تماشا کے لیے آئے، لیکن اس کے ہم چنداں شائق نہیں۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ لکھنؤ ہمارے سفر کا مقام اختتام اور ہمارے سلسلہ شوق کی آخری منزل ہے، کیونکہ ہمارا ارادہ تو یہ ہے، نجف اشرف پہنچیں، حضرت علیؑ کے روضے کی زیارت سے مشرف ہوں، پھر مکہ مکرمہ پہنچ کر خانہ کعبہ کا طواف کریں اور فریضۂ حج سے فارغ ہو جائیں۔ گویا ہماری آخری منزلیں تو نجف اور مکۂ مکرمہ ہیں۔

اے غالب! ایک اُمید ہمیں لیے جا رہی ہے اور کرم کے کاف کی کشش ہمارے لیے راستہ بن گئی ہے۔

یہ غزل میرزا غالب نے اُس زمانے میں کہی تھی، جب وہ پنشن کے لیے

مقدمے کے سلسلے میں کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ ٹھہرے تھے۔ غالباً وہاں کوئی طرحی مشاعرہ ہُوا، جس کے لیے غزل کہی گئی، ورنہ ایسی زمین میں مرزا خود کوئی غزل لکھنے کے لیے تیار نہ ہوتے۔

میرزا کے خاندان کے لیے ابتدا میں دس ہزار روپے پنشن مقرر ہوئی تھی، لیکن نواب احمد بخش خاں والی فیروز پور جھرکہ نے پہلے یہ رقم نصف کرائی، پھر اس میں دو ہزار روپے کا حصّہ دار ایک ایسے شخص (مرزا حاجی) کو بنا دیا، جو مرزا کے خاندان میں شامل نہ تھا۔ گویا پنشن دس ہزار کے بجائے تین ہزار رہ گئی۔ میرزا غالب اس لیے کلکتہ گئے تھے کہ دس ہزار کی ابتدائی پنشن بحال کرائیں اور جتنی رقم بقایا رہ گئی، وہ یکمشت وصول کریں۔ اسی امید کا ذکر انھوں نے مقطع میں کیا ہے۔ مقدمے میں کئی سال صرف ہوگئے، نتیجہ میرزا کے خلاف نکلا۔

مقطع کا پہلا مصرع ابتدا میں یوں تھا:

لائی ہے معتمد الدّولہ بہادر کی امید

معتمد الدّولہ آغا میر اس زمانے میں اودھ کے نائب السلطنت یعنی وزیرِ اعظم تھے، لیکن ان سے ملاقات کی مناسب صورت پیدا نہ ہوئی اور میرزا نے یہ مصرع بدل دیا۔

تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو؟

بچتے نہیں مُواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

۱۔ **شرح**: شعر سے واضح ہے کہ اس میں ایک حصّہ مقدر ہے، یعنی محبوب سے بہت کہا کہ رقیب سے میل جول نہ رکھو اور ہمیں تختۂ مشق نہ بناؤ لیکن محبوب نے عاشق کی التماس و التجا کا خیال نہ کیا اور رقیب کے ساتھ سلسلۂ روابط بدستور قائم رکھا۔ اس کے برعکس خود عاشق سے ربط ضبط

کیا وہ بھی بیگنہ کُش و حق ناشناس ہیں ؟
مانا کہ تم بشر نہیں ، خورشید و ماہ ہو
ابھرا ہُوا ، نقاب میں ہے ان کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
جب میکدہ چھٹا ، تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو ، مدرسہ ہو ، کوئی خانقاہ ہو
سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف ، سب درست
لیکن خدا کرے ، وہ تِری جلوہ گاہ ہو
غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو یارب ! اور مرا بادشاہ ہو

منقطع کرلیا ۔ اب عاشق بے بس سا ہو گیا تو پریشان ہو کر کہتا ہے کہ اگر تم رقیب سے رسم و راہ قائم رکھنے پر تلے بیٹھے ہو اور کسی طرح رک نہیں سکتے تو بہتر، تم جانو اور رقیب جانے ۔ میں رشک کی مصیبت جھیل لونگا لیکن مجھ سے بھی تعلق قائم رکھو تو کون سا گناہ ہو جائے گا ۔ جب میں نے اقرار کر لیا کہ رقیب سے تمہارے تعلق پر اعتراض نہ کروں گا تو تمھیں میری پرسش حال میں کیوں تامل ہے ۔ کبھی کبھار ہی پوچھ لیا کرو کہ بھئی ! کیسے ہو ، زندگی کیونکر گزرتی ہے ؟

۲ ۔ لغات ۔ مواخذہ : جواب دہی ۔ پوچھ گچھ ۔

شرح : اے محبوب ! روز حشر کی جواب دہی اور پوچھ گچھ سے تمہارے بچے رہنے کی کوئی صورت نہیں بیشک قتل کا ذمّہ دار رقیب تھا ، لیکن تم اس قتل کے گواہ ہو ۔ جس طرح جرم کا مرتکب لازماً سزا پائے گا ، اسی طرح جرم کا گواہ پوچھ گچھ سے بچ نہیں سکتا ۔ ضروری ہے کہ اس سے گواہی لی جائے ۔

۳۔ شرح : ہم نے مانا کہ تم بشر نہیں ہو، بلکہ سورج اور چاند ہو، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا سورج اور چاند بھی بے گناہوں کو مارتے ہیں اور لوگوں کا حق نہیں پہچانتے ؟

مطلب یہ ہے کہ بے گناہ کو مارنا اور حق نہ پہچاننا محبوب کی خاص صفتیں ہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ محبوب حسن و جمال کے بل پر سورج اور چاند ہونے کا مدّعی بن گیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا سورج اور چاند میں بھی وہ صفتیں موجود ہیں، جو محبوب کا خاصہ ہیں ؟

۴۔ شرح : محبوب کے نقاب میں ایک تار ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔ بدگمانی عاشق کا خاصہ ہے۔ اسے فوراً خیال ہوا کہ مبادا یہ کسی کی نگاہ ہو، جو عین نقاب پر آکر جم گئی ہے اور اسی غم کے مارے عاشق مرا جا رہا ہے۔

۵۔ شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"اس شعر میں ازراہ تہذیب اس کام کا ذکر نہیں کیا، جس کے کرنے کے لیے مسجد و مدرسہ و خانقاہ کو مساوی قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میکدہ، جہاں حریفوں کے ساتھ شراب پینے کا لطف تھا، جب یہی چھوٹ گیا تو اب مسجد مل جائے تو اور مدرسہ و خانقاہ ہاتھ آجائے تو سب جگہ پی لینی برابر ہے۔ مسجد وغیرہ کی تخصیص ازراہ شوخی کی گئی ہے۔ یعنی یہ مقامات، جو اس شغل کے بالکل لائق نہیں ہیں، وہاں بھی میکدہ چھٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے اور شراب پینے کی تصریح نہ کرنا عین مقتضائے بلاغت ہے۔"

جو مقام شراب نوشی کا مرکز تھا، جہاں پینے کی تمام لذتیں مہیا تھیں، جب وہی ہاتھ سے نکل گیا تو اب کسی خاص جگہ کی قید کیا ہے ؟ جہاں بھی موقع ملے، پی لینے سے انکار نہیں۔ مسجد، مدرسہ اور خانقاہ تینوں ایسے مقام ہیں

جہاں شراب نوشی ہو ہی نہیں سکتی۔ مقصود یہ ہے کہ جب ہم ان مقامات میں بھی پینے کے لیے تیار ہیں، جو شراب نوشی کے لائق نہیں تو باقی مقامات میں ہمیں کب انکار ہو سکتا ہے ؟

مولانا طباطبائیؒ بجا فرماتے ہیں کہ حاصل زمین یہی شعر ہے اور اس کا اطلاق زندگی کے مختلف دائروں میں یکساں ہو سکتا ہے۔ میرزا نے اپنے دل کی جو کیفیت بیان کی ہے، وہ بالکل طبعی اور عام ہے، جب وہ مقام ہاتھ سے نکل جائے، جس میں دل الجھا ہوا ہو اور جو مختلف اعتبارات سے انسانی روابط کا مرکز ہو تو ایسی حالت پیدا ہو جاتی ہے کہ انسان کو کسی اچھے یا بُرے مقام کا کوئی خاص لحاظ نہیں رہتا۔ تقسیم کے دوران میں ہم نے دیکھا کہ جن آبادیوں کو صدیوں کے وطن چھوڑنے پڑے، وہ عالمِ غربت میں جہاں کہیں پہنچے، ٹھہر گئے اور ان کے دلوں میں کسی بھی مقام سے کوئی وابستگی باقی نہیں رہی تھی۔ یہ بھی اسی حقیقت کی دلیل تھی کہ جب میکدہ چھوٹ گیا تو کسی جگہ کی قید کا سوال ہی باقی نہیں رہ سکتا۔

۶۔ **شرح** : بہشت کی ستائش میں جو کچھ کہا جاتا ہے، اس سے اختلاف کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم مانے لیتے ہیں کہ وہ بالکل درست ہے۔ ہمیں اس کی خوبی میں کوئی کلام نہیں، لیکن ہمارے لیے اصل معیار یہ ہے کہ تیرا جلوہ وہاں نظر آئے، خدا کرے کہ ایسا ہو! اگر یہ جلوہ موجود نہیں، ہم دیدار سے فیض یاب نہیں ہو سکتے تو جو بھی خوبی بیان کی جاتی ہے، ہماری نظروں میں ہیچ ہو گی۔ اے محبوب حقیقی ! ہمارے لیے بہشت وہی ہے، جہاں تیرا قرب نصیب ہو تیرا دیدار میسر آئے۔ اگر یہ دولت نہیں مل سکتی تو سب کچھ ہیچ ہے۔

میرزا غالب نے جزا و سزا کے باب میں جو کچھ کہا، اس میں دو چیزیں بالخاصہ قابلِ توجہ ہیں۔ اوّل یہ کہ عبادت میں کسی ایسے عیش و راحت کی کوئی ترغیب نہ ہو، جیسا مادی صورت میں یہاں میسر آ سکتا ہے، دوم بہشت سے

مقصودِ حقیقی باری تعالیٰ کا دیدار ہے۔ اس کے سوا جو کچھ بھی ہے، وہ یکسر ناقابلِ توجہ ہے۔

ایک نسخہ "تری جلوہ گاہ" کی جگہ "ترا جلوہ گاہ" بھی ہے۔

۷۔ **شرح**: اے خدا! تجھ سے میری دعا ہے کہ دنیا قائم رہے۔ اور میرا بادشاہ یعنی ابوظفر بہادر شاہ ہمیشہ تختِ حکومت پر جلوہ افروز ہو۔ بہتر تو یہ ہے کہ غالب جیسا باکمال بھی ساتھ رہے۔ لیکن اگر یہ منظور نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں، اس سے کوئی نقصان نہ ہو گا۔ مگر دنیا اور بادشاہ کا ہونا بہرحال ضروری ہے۔

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا، پھر کہو تو کیونکر ہو؟

ہمارے ذہن میں اِس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں؟ ہو تو کیونکر ہو؟

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے؟
حیا ہے اور یہی گومگو تو کیونکر ہو؟

تمھیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو؟

اُلجھتے ہو تم، اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو؟

۱۔ **شرح**: وہ دن ہی نہ رہے جب کہا کرتے تھے کہ محبوب سے گفتگو ہو گی تو دیکھیے کیا کچھ کہا جائے! ہمیں جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکے محبوب سن چکا اور کچھ بھی نہ ہوا۔ اب بتاؤ کہ دوبارہ کہیں تو کیا ہو، یعنی دوبارہ کہنے کا نتیجہ کیا نکلے گا؟

۲۔ **شرح**: ہمارے ذہن میں

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو؟

ہمیں پھر ان سے امید اور انھیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو؟

غلط نہ تھا، ہمیں خط پر گماں تسلی کا
نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو؟

بتاؤ اُس مژہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قرار
یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیونکر ہو؟

مجھے جنوں نہیں، غالب ولے بہ قولِ حضور
"فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو"

ایک فکر اور ایک سوچ ہے اسی کو ہم وصال سمجھ رہے ہیں۔ سوچ یہ ہے کہ اگر وصال نہ ہو تو کہاں جائیں اور ہو تو اس کی صورت کیونکر بنے؟

ہم رات دن اسی سوچ میں ڈوبے رہتے ہیں۔ گویا اس سوچ سے آگے کوئی قدم نہیں اٹھا۔ صاف مطلب یہ ہے کہ وصال نہیں ہوا۔ بس اس سوچ ہی میں ہم گمن ہیں۔

۳۔ شرح :
ہم محبوب کا ادب اور پاس و لحاظ کرتے ہیں۔ اُدھر آرزوؤں اور ارمانوں نے دل پر اضطراب طاری کر رکھا ہے۔ اس طرح ہم کشمکش کی بلا میں پھنسے ہوئے ہیں اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں؟ دوسری طرف محبوب کی حالت یہ ہے کہ اس پر حیا طاری ہے اور وہ گو مگو میں مبتلا ہے۔ اس گو مگو سے نجات کیونکر ہو سکتی ہے؟

۴۔ شرح : اے محبوب! ہم تمھیں سے پوچھتے ہیں کہ اگر تم لوگوں یعنی حسینوں کی عادت ایسی ہو جیسی تمھاری ہے تو جن لوگوں کا شیوہ صنم پرستی ہے، یعنی وہ حسینوں پر جان دیتے ہیں اور انھیں پوجتے ہیں، ان کا گزارہ کیونکر ہو؟
مطلب یہ ہے کہ بیشک حسینوں کے لیے خفگی اور عتاب زیبا ہے، لیکن اس حد تک کہ عاشق اسے برداشت کر سکیں اور اس طرح گزارہ ہوتا جائے اگر

خفگی اور عتاب ہی پر سلوک کا مدار ہو تو ظاہر ہے کہ بیچارے عاشق زیادہ عرصے تک گزارہ نہ کر سکیں گے اور ختم ہو جائیں گے۔

۵۔ **شرح** : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

" اس کا مطلب ایک تو یہ ہے کہ تم جیسے نازک مزاج شہر میں ایک دو اور ہوں تو شہر کا کیا حال ہو ؟ دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب تم کو اپنے عکس کا بھی اپنی مانند ہونا گوارا نہیں تو شہر میں اگر فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین موجود ہوں تو تم کیا قیامت برپا کرو ؟ "

محبوب آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر غصے اور جوش میں آجاتا ہے۔ گویا اسے اپنا عکس دیکھنا بھی گوارا نہیں۔ جب حالت یہ ہے تو واقعی شہر میں ایک دو حسین محبوب جیسے موجود ہوں تو خدا جانے، اس کا غصہ اور عتاب کیا رنگ لائے ؟

دوسرے معنی بقولِ حالی یہ ہیں کہ ایک ہی حسین نے قیامت برپا کر رکھی ہے، اگر ایسے ہی ایک دو اور شہر میں موجود ہوں تو واقعی اہلِ شہر کا جینا دوبھر ہو جائے۔

۶۔ **شرح** : جس سیاہ نصیب کو ایسا ہی تیرہ و تاریک دن نصیب ہو، جیسا میرے لیے مقدر ہے، وہ شخص رات کو دن نہ کہے تو کیا کرے ؟

مطلب یہ ہے کہ میرے روزگار کی تاریکی اس درجے پر پہنچی ہوئی ہے کہ رات اس کے مقابلے میں بہ منزلہ دن کے ہے۔

بعض اصحاب نے اسے عرفی کے مندرجہ ذیل شعر سے ملتا جلتا قرار دیا ہے :

زفروغ آفتابم نبود خبر کہ بے تو !
چو دو زلف تست یکساں شب و روزم از سیاہی

مجھے سورج کی روشنی کی خبر ہی نہیں ہوتی، کیونکہ اے محبوب ! تیرے بغیر

میرے دن اور رات تیری دو زلفوں کی طرح یکساں سیاہ ہیں۔

ظاہر ہے کہ دونوں مضمون یقیناً سیاہ نصیبی کے ہیں، لیکن دونوں میں حقیقۃً کوئی یکسانی نہیں، نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دوسرا پہلے سے ماخوذ ہے۔ عرفی کہتا ہے کہ سورج کے روشن ہونے کی مجھے خبر بھی نہیں ہوتی، کیونکہ میرے دن اور رات یکساں سیاہ ہیں، جس طرح تیری زلفیں سیاہ ہیں۔ غالب کہتا ہے میرا دن اتنا تاریک ہے کہ اس کے مقابلے میں رات، دن معلوم ہوتی ہے۔

سیاہ نصیبی کے اَور بھی بہت سے مضمون کہے گئے، مثلاً میرزا غالب:

نومیدیِ ما گردشِ ایّام ندارد
روزے کہ سیہ شد، سحر و شام ندارد

ہماری مایوسی میں دن رات کی گردش ناپید ہے۔ جو دن تاریک ہو جائے، اس کی صبح و شام کیا ہو سکتی ہے؟ یا

گشت در تاریکی روزم نہاں
کو چراغے تا بجویم شام را

میری شام دن کی تاریکی میں چھپ گئی۔ چراغ کہاں ہے تاکہ میں اسے ڈھونڈوں۔

جوہرِ طبعم درخشاں است لیک
روزم اندر ابرِ پنہاں می رود

میری طبیعت کے جوہر یقیناً درخشاں ہیں، لیکن میرا دن تاریک گھٹاؤں میں چھپا ہوا گزر رہا ہے۔

۶۔ **شرح**: جب محبوب ہماری بات ہی نہ پوچھے تو ہمیں اس سے کیا امید ہو سکتی ہے اور اس کے دل میں ہمارے لیے قدر و منزلت کی کون سی گنجائش رہ جاتی ہے؟

۸۔ **شرح** : ہم سمجھتے تھے کہ اے محبوب! تمہارا خط آنے سے دل کو تسکین ہو جائے گی، لیکن دیدار کی مشتاق آنکھیں نہ مانیں تو کیا کیا جائے وہ تو خط پر مطمئن نہیں، بلکہ جلوہ دیکھنے کی طلب گار ہیں۔

۹۔ **شرح** : اس شعر میں خاصی تعقید ہے۔ کہتے ہیں کہ محبوب کی مژہ کو دیکھ کر قرار کیونکر آسکتا ہے؟ یہ تو ڈنک بن کر رگِ جاں میں اُتر جاتی ہے اور جو چیز ڈنک بن کر رگِ جاں میں اُتر جائے۔ وہ قرار کیونکر آنے دے گی۔

"قرار کا تعلق کیونکر ہو" سے ہے اور "نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو، بیچ میں جملۂ معترضہ ہے۔

۱۰۔ **شرح** : بہ قولِ حضور سے واضح ہے کہ مقطع کا دوسرا مصرع ابوظفر بہادر شاہ کا ہے، جس کی تضمین مرزا نے کر دی۔

کہتے ہیں کہ اے غالب! میں دیوانہ نہیں، اس لیے بیقرار ہوں کہ محبوب سے جدائی کا عالم ہے اور بہادر شاہ بجا فرما چکے ہیں کہ محبوب کے فراق میں تسکین و تسلی پانے کی کوئی صورت نہیں۔

کسی کو دے کے دِل کوئی، نوا سنجِ فغاں کیوں ہو؟
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو؟

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں؟
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو؟

کیا غم خوار نے رسوا، لگے آگ اِس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی، وہ میرا رازداں کیوں ہو؟

۱۔ **لغات** :
نوا سنجِ فغاں : فریاد کرنے والا۔

شرح : عشق کا تقاضا یہ ہے کہ صبر و ضبط کیا جائے۔ عاشق کے لیے فریاد و فغاں

زیبا نہیں۔ جب دل کسی کو دے دیا تو رونے دھونے اور فریاد و فغاں کرنے کا مطلب کیا؟ زبان دل کے جذبات کی ترجمان ہے۔ جب دل ہی پہلو میں نہ ہو تو زبان کیوں کھولی جائے؟

۲۔ **لغات** : **وضع** : روش، دستور، طور طریق، انداز یہاں بہ معنی خود داری۔

سبک سر : اوچھا، کم حوصلہ

سرگراں : خفا، ناراض، ناخوش۔

شرح : محبوب ناراضی اور خفگی کی عادت نہیں چھوڑ سکتا۔ ہم اپنی وضع یعنی خودداری کیوں ترک کریں؟ کیا اوچھے اور کم حوصلہ ہو کر ہم ان سے پوچھیں کہ ہم سے ناراض کیوں ہوں؟

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں: "اس نے وہ بندش پائی کہ نثر میں بھی ایسے برجستہ فقرے نہیں ہو سکتے۔"

۳۔ **لغات** ۔ **محبت** : مراد ہے، غمخوار کی محبت، دل سوزی اور ہمدردی۔

شرح : غم خوار نے میری تھوڑی سی کیفیت سنی اور اس درجہ مضطرب ہو گیا کہ سب کے سامنے رازِ عشق فاش کر دیا۔ اس طرح میں رسوا ہوا۔ میرے عشق کا بھید کھل گیا، جسے میں انتہائی صبر و ضبط سے چھپائے بیٹھا تھا۔

محبوب کے لیے بھی رسوائی پیدا ہوئی۔ ایسی محبت، دلسوزی اور غمخواری کو آگ لگ جائے جس شخص میں غم کو ضبط کرنے کا حوصلہ نہیں، وہ میرا رازداں کیوں بنے؟

شعر کا غور طلب پہلو یہ ہے کہ خود ہر مصیبت سہ رہے تھے، لیکن انتہائی ضبط سے کام لے رہے تھے اور عشق اسی امر کا متقاضی تھا۔ غم خوار سے سرسری بات بھی برداشت نہ ہو سکی اور اس نے رسوائی تک نوبت پہنچا دی: "لگے آگ

وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر' اے سنگ دِل! تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

قفس میں مجھ سے رُوداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم!
گری ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟

یہ کہہ سکتے ہو "ہم دِل میں نہیں ہیں" پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو؟

غلط ہے جذبِ دِل کا شکوہ دیکھو، جرُم کس کا ہے؟
نہ کھینچو گر تم اپنے کو، کشاکش درمیاں کیوں ہو؟

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے؟
ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو؟

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں؟
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو؟

کہا تم نے کہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی"؟
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ "ہاں، کیوں ہو"

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تُو غالب؟
ترے بے مہر کہنے سے، وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو؟

اس محبت کو" سے آخر شعر تک غم خوار کی مذمت سے واضح ہے کہ دلسوزی اور ہمدردی کا یہ طریقہ انتہائی ناراضی کا باعث ہوا۔ نہیں چاہتے تھے کہ ایسا ہو، مگر غم خوار کی بے حوصلگی نے کہیں کا نہ رکھا۔

۴۔ **شرح**: جب ہماری وفا اور ہمارے عشق کی کوئی قدر نہ ہوئی اور صرف سر پھوڑ کر مرجانا ہی باقی رہ گیا۔ تو اے پتھر جیسے دل والے محبوب! بتا کہ تیرے ہی دروازے کے پتھر سے کیوں ٹکرائیں؟ جہاں کہیں موقع ملے گا، یہ بھی کرلیں گے۔

مطلب یہ کہ محبوب کے سنگِ آستاں سے جو بھی تعلق ہے، اس کی بنیاد تو یہ ہے کہ عاشق کی وفاداری اور پُر خلوص عشق کا پاس و لحاظ کیا جائے۔ جب پاس و لحاظ ہی نہ رہا تو سر پھوڑنا باقی رہ گیا۔ اس کے لیے محبوب کے سنگِ آستاں کی تخصیص کیوں؟

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں: "یہ شعر رنگ و سنگ میں گوہر شہوار ہے۔" مولانا نے شعر کے اس پہلو پر بھی بحث کی ہے کہ "سنگ دل" کی جگہ "بیوفا" کا لفظ بھی آسکتا تھا، لیکن میرزا نے سنگدل کو اس لیے ترجیح دی کہ یہ سنگِ آستاں سے قریب تھا اور بے وفا اس لیے نظر انداز کیا کہ وہ لفظ "وفا" سے دور ہوگیا تھا۔

۵۔ **شرح**: مولانا طباطبائی نے بجا فرمایا ہے کہ ان دو مصرعوں میں اس قدر معانی سما گئے ہیں، جن کی تفصیل لطف سے خالی نہیں، مثلاً:

۱۔ لفظ "قفس" سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک پرندہ نشیمن سے جدا ہو کر قید ہوگیا ہے۔ یہ پورا ٹکڑا اصل شعر میں مقدر ہے۔ صرف لفظ "قفس" سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے۔

۲۔ اس پرندے نے باغ میں بجلی گرتے ہوئے دیکھی اور بہ حالت اسیری سے تشویش ہوئی کہ خدا جانے، میرا نشیمن اجڑ گیا یا جل گیا۔ کمال یہ ہے کہ

دوسرے مصرع کا صرف ایک لفظ، یعنی "کل" اس پورے مضمون پر دلالت کر رہا ہے۔

۳۔ ایک اور پرندہ، جو طائرِ اسیر کا ہم سفیر و ہمدم ہے، پنجرے کے سامنے کسی شاخسار پر آ بیٹھا ہے۔ اس مضمون پر صرف لفظ "ہمدم" دلالت کر رہا ہے۔

۴۔ طائرِ اسیر ہمدم سے پوچھتا ہے کہ خدا باغ کی روداد تو بتاؤ۔ لیکن اس کا آشیانہ جل چکا ہے اور ہمدم روداد سنانے میں متردّد ہو گیا ہے۔

۵۔ طائرِ اسیر نے ہمدم کے تردّد سے اندازہ کر لیا کہ اس کے نشیمن پر آفت آئی، مگر اپنے آپ کو یہ کہ کر مطمئن کر لیا کہ باغ میں سیکڑوں آشیانے ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ بجلی میرے ہی آشیانے پر گری ہو؟

۶۔ اس طرح اپنے دل کو سمجھا کر ہمدم سے کہتا ہے کہ بھائی! تو باغ کی کیفیت بتانے میں کیوں متذبذب ہے۔ جو بجلی کل گری تھی، کیا ضروری ہے کہ وہ میرے ہی آشیانے پر گری ہو؟

۷۔ یہ پوری داستان اس درجہ درد انگیز اور غم ناک انداز میں بیان کی گئی ہے کہ ہر سننے والا تڑپ اٹھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسے شعر کہے نہیں جاتے، القا ہوتے ہیں۔

۶۔ **شرح** : پہلے مصرع میں استفہام انکاری ہے۔ یعنی تم یہ نہیں کہ سکتے کہ ہم دل میں موجود نہیں۔ جب حقیقت یہی ہے، یعنی دل میں تمھارے سوا کوئی موجود نہیں تو ہمیں بتاؤ کہ آنکھوں سے کیوں پوشیدہ ہو؟

بظاہر یہ خطاب محبوبِ حقیقی سے ہے اور تقاضا یہ ہے کہ محض دل میں موجود رہنا کافی نہیں، ذرا آنکھوں کو جمال سے بھی شرف بخشیے۔

۷۔ **شرح** : تمھارا کسی پر مہربان ہونا اور دوست بننا ایک ایسا فتنہ ہے، جو کسی کا گھر برباد کرنے کے لیے کم نہیں۔ پھر آسمان کو اس سے

دشمنی کرنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟ یعنی اے محبوب! تمہاری دوستی کی حیثیت وہی ہے جو آسمان کی دشمنی کی ہے۔

اس شعر میں عشق کے لوازم کی تصویر نہایت عمدگی سے کھینچی گئی ہے۔

۹۔ شرح: جب تم نے میرے دشمن یعنی رقیب سے دوستی کا رشتہ جوڑ لیا اور اس کے محبوب بن گئے تو مجھے کیوں آزماتے ہو؟ میرا امتحاں کیوں لیتے ہو؟ اگر اسی کا نام آزمانا ہے تو بتاؤ ستانا کسے کہتے ہیں؟

آزمائش کے لیے ضروری تھا کہ رقیب کے ساتھ محبوب کا کوئی قطعی فیصلہ نہ ہوتا۔ جب فیصلہ ہو چکا تو آزمائش واقعی دل آزاری ہے، بالکل بے سبب اور بے وجہ۔

۱۰۔ شرح: ہم ہر چند کہتے رہے کہ غیر سے نہ ملو، رسوا ہو جاؤ گے۔ تم نے کہا: "بھلا اس میں رسوائی کی کیا بات ہے؟" ہاں صاحب! ٹھیک کہا، سچ کہا، پھر فرمائیے کہ "ہاں رسوائی کیوں ہو؟"

دوسرے مصرع کا حرف حرف محبوب کے قول پر ایک بھرپور طنز ہے کہ اس سے بہتر طنز کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ مولانا طباطبائی بے اختیار پکار اٹھے کہ "اس کی بندش سحر کے مرتبے تک پہنچ گئی ہے"۔ یقیناً سحر ہے۔

۱۱۔ شرح: اے غالب! کیا اب طعنوں سے مطلب برآری مقصود ہے؟ یعنی محبوب کو بے مہر کہہ کر مہربان بنا لینا چاہتے ہو؟ تم لاکھ ایسے طعنے دو بھلا وہ تم پر مہربان کیوں ہونے لگا۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر، جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

۱۔ شرح: "اب" کے لفظ سے ظاہر ہے کہ شاعر کو دوستوں، رفیقوں

اور ہم وطنوں سے اتنے آزار پہنچے ہیں کہ وہ ان کی صحبت سے بیزار ہو گیا ہے اس درجہ بیزار ہو گیا ہے کہ کسی ایسی جگہ جا رہنے کا ارادہ کر لیا ہے، جہاں کوئی موجود نہ ہو۔ نہ کسی سے بات ہو سکے، نہ کوئی اس کی بات سمجھ سکے۔

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

"ہم سخن" سے واضح ہے کہ کوئی ایسا شخص موجود نہ ہو، جس سے بات کی جا سکے۔ "ہم زباں" سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی ایسا شخص نظر نہ آئے، جو اس کی بات سمجھ سکے، کیونکہ بات سمجھنے کے لیے ہم زبانی لازم ہے۔ ہم جنسوں کی صحبت سے اتنی بیزاری اس امر کی دلیل ہے کہ اسے بدرجۂ کمال رنج پہنچے۔

۲۔ **شرح** : ایک ایسا گھر بنایا جائے، جس کی نہ کوئی دیوار ہو اور نہ کوئی دروازہ۔ مقام ایسا ہو، جہاں نہ کوئی پڑوسی ہو اور نہ کسی چوکیدار کی ضرورت پیش آئے۔ گویا ساری دنیا سے علیحدگی ہو۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ دیوار نہیں ہوگی تو پڑوسی بننے کا امکان ہی نہ رہے گا۔ کوئی شخص پڑوسی اس صورت میں بن سکتا ہے کہ اس کی جگہ متعین ہو جائے۔ تعین کے لیے دیوار لازم ہے، جب دیوار بنانی ہی منظور نہیں تو پڑوس خود بخود خارج ہو گیا۔ چوکیدار دروازے پر مقرر کیا جاتا ہے۔ جب دروازہ ہی نہ ہوگا تو چوکیدار کی کیا ضرورت رہی۔ کمال یہ ہے کہ "بے در و دیوار گھر" نہیں کہا "بے در و دیوار سا اک گھر" اگر بالکل بے در و دیوار کر دیتے تو گھر ہی نہ بنتا۔ اس لیے فرمایا ایسا گھر جو بے در و دیوار معلوم ہو۔

۳۔ **لغات** ۔ تیمار دار : بیمار کی دیکھ بھال، علاج معالجہ اور خدمت

کرنے والا۔

شرح : اگر بیمار پڑ جائیں تو دوا دارو، دیکھ بھال اور خدمت کرنے والا کوئی موجود نہ ہو۔ اگر مر جائیں تو نہ کوئی ماتم کرے، نہ کوئی نوحے پڑھے اور نہ کوئی سوگ منائے۔

از مہر تا بہ ذرّہ دِل و دِل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

لغات : شش جہت : چھ طرفیں۔ مشرق مغرب شمال جنوب اوپر نیچے یعنی دنیا۔

شرح : سورج سے ذرّے تک ہر دل ایک آئینہ ہے۔ گویا طوطی کے لیے اس کائنات کی ہر شے آئینے کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں اسے اپنی شکل نظر آ رہی ہے۔

یہاں بظاہر طوطی سے مراد صاحب علم و عرفان ہے، جس پر حقیقت واضح ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کی کوئی شے ایسی نہیں، جس میں ہر وجود کو اپنی حقیقت اسی طرح نظر نہ آئے۔ جس طرح آئینے میں نظر آتی ہے۔ صاحب علم و عرفان کے لیے پوری کائنات وجود حقیقی کا مظہر ہے اور اسے ہر شے میں وہی وجود نظر آتا ہے۔

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ
جس کی بہار یہ ہو پھر اُس کی خزاں نہ پوچھ
ناچار بیکسی کی بھی حسرت اُٹھائیے
دشوارئ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

۱۔ لغات : غمکدہ : غم خانہ، غم کا گھر، غم کا مرکز، مراد عاشق کا گھر۔

شرح : میرے غم خانے کی دیواروں اور

دروازے پر اتنا سبزہ اُگ آیا ہے کہ اسے سبزہ زار کہنا چاہیے۔ جس کی بہار کا یہ عالم ہو، اس کی خزاں کے متعلق کیا کہا جائے؟

کچے مکانوں یا ان مکانوں میں، جو اینٹ گارے یا پتھر گارے سے بنے ہوں، برسات کے موسم میں سبزہ اُگ آتا ہے۔ اہلِ خانہ موجود ہوں تو دیکھ بھال کے سلسلے میں سبزہ بھی الگ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب گھر میں کوئی موجود نہ ہو تو دیکھ بھال نہیں ہوتی اور سبزہ فروغ پا کر درودیوار پر چھا جاتا ہے۔ کھنڈروں میں ایسے نظارے عموماً ملتے ہیں۔ چونکہ سبزے کا اُگنا اور لہلہانا بہار کا منظر ہے اس لیے کہا کہ جس ویران اور برباد گھرانے کی بہار یہ ہے کہ ہر طرف سبزہ اُگا ہُوا ہے، اس کی خزاں کے متعلق کچھ نہ پوچھنا چاہیے۔

۲۔ شرح: راستہ حد درجہ دشوار ہے اور ساتھی مسافروں نے جو ظلم کیے اور ستم توڑے، وہ ناقابل بیان ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ کاش ہم تنہا ہوتے، کوئی ہمارا ساتھی نہ ہوتا۔ راستے کی دشواری تو برداشت کر لیتے، مگر ساتھیوں کے ظلم و ستم سے تو محفوظ رہتے۔ اب تنہائی اور بیکسی کی حسرت دل میں لیے بیٹھے ہیں۔ ساتھیوں سے الگ ہو نہیں سکتے اور ان کے ظلم و جور برداشت کیے بغیر چارہ نہیں۔

صد جلوہ رو بروہے، جو مژگاں اٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق
یعنی ہنوز منّتِ طفلاں اٹھائیے

۱۔ شرح: آنکھ اٹھاتے ہی محبوب کے سیکڑوں جلوے سامنے آجاتے ہیں۔ اس کی ہر جلوہ گری نگاہِ شوق پر احسان خاص ہے ہم میں اتنی طاقت کہاں

دیوار، بارِ منّتِ مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب! نہ احسان اٹھائیے
یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے
یا پردۂ تبسمِ پنہاں اٹھائیے

کہ دیدار کا احسان، اٹھاتے جائیں۔ میرزا کا مقصود یہ ہے کہ جس طرف بھی آنکھ اٹھے، محبوب ہی مختلف شکلوں میں جلوہ گر نظر آتا ہے اور جلووں کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ ہم میں ان کے دیکھنے کا احسان اٹھانے کی تاب ہی نہیں۔ حقیقتہً وہ محبوبِ حقیقی کے جلووں کی فراوانی نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔۔ اس کے لیے پیرایہ یہ اختیار کیا کہ ہم میں ان کے دیکھنے اور احسانِ دید اٹھانے کا یارا ہی نہیں۔

۲۔ **لغات۔ براتِ معاش** : روزی کا فرمان یا حکم، حصّہ

شرح : جنونِ عشق کی روزی کا حکم پتھر پر ہے، یعنی پتھر کھائیے اور سنگباری کا تختۂ مشق بنیے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی لڑکوں کا احسان ٹھانا ضروری ہے۔

کوئی شخص جنون کا شکار ہو جائے تو لڑکے عموماً اسے پتھر مارتے ہیں۔ غالبؔ کہتے ہیں کہ جنونِ عشق کے لیے روزی کا جو فرمان صادر ہوا، وہ پتھروں کے لیے صادر ہوا یا جو حصّہ ہماری قسمت میں لکھا گیا، وہ پتھروں کا تھا۔ جس طرح جاگیریں زمینیں ملتی ہیں یا نقد روپے کے لیے خزانے کے نام حکنامے جاری ہوتے ہیں اسی طرح جنونِ عشق کی روزی میں پتھر لکھ دیے گئے اور پتھر لڑکے رتے ہیں۔ گویا اس روزی کا انحصار لڑکوں کا احسان اٹھانے پر ہے۔ وہ پتھر ماریں تو جنونِ عشق کی روزی کا سرو سامان ہو۔

۳۔ **لغات۔ خانماں خراب** : وہ شخص، جس کا گھر ویران ہو۔

شرح : دیوار کو دیکھیے، یہ مزدور کے بار احسان سے جھک گئی ہے

اس سے واضح ہوا کہ احسان اٹھانا ٹھیک نہیں ۔ اس کا بوجھ دیوار تک کو جھکا دیتا ہے ، انسان کا تو ذکر ہی کیا ۔ اے وہ شخص ! جس کا گھر ویران ہے ، اس منظر سے عبرت حاصل کر اور ہم سب کے لیے یہی لازم ہے کہ کسی کا احسان نہ اٹھائیں ۔

خانماں خراب کا خطاب قابلِ توجّہ ہے ۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ جس شخص کا گھر ویران ہو چکا ہو ، وہ اسے دوبارہ تعمیر کرنے کے لیے مضطرب ہوتا ہے ، لہٰذا اسے عین موقع پر عبرت دلا رہے ہیں ۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ خانہ ویرانی قبول کر لینی چاہیے ، احسان نہ اٹھانا چاہیے ۔

۴ ۔ **شرح :** یا تو میرے دل کے زخم رشک کو بدنام نہ کیجیے ، یعنی لوگوں سے یہ نہ کہتے پھریے کہ دیکھو ، یہ شخص غیروں سے میرے بے تکلّف میل جول پر جل رہا ہے اور رشک کے باعث اس کے دل میں گھاؤ پڑ رہے ہیں یا غیروں سے پردے میں چھپ چھپ کر مسکرانا اور ناز و انداز کرنا چھوڑ دیجیے ان سے جو بھی سلوک کرنا چاہتے ہیں ، وہ خلوت میں نہیں ، بلکہ بر سرِ عام کیجیے گویا زخم کے باعث دل پر چرکے اس وقت لگتے ہیں ، جب آپ پردے میں غیروں کے ساتھ بیٹھ کر مسکراتے اور ہنستے ہیں ۔

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ ، قبلۂ حاجات چاہیے

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی ، اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

دے داد ، اے فلک ! دلِ حسرت پرست کو
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے

۱ ۔ **لغات ۔ خرابات :** شراب خانہ ۔

قبلۂ حاجات : سب کی ضرورتیں پوری کرنے والا ۔ تعظیم کا کلمہ ہے ۔ اس کا حقیقی محلِ استعمال تو خدا کے لیے ہے ، لیکن عموماً والد ، شیخ اور بزرگ کے

بیٹھے ہیں مہ رُخوں کے لیے ہم مصوّری

تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

مَے سے غرض نشاط ہے، کس روسیاہ کو

اِک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

نشو و نما ہے اصل سے، غالبؔ! فروع کو

خاموشی ہی سے نکلے ہے، جو بات چاہیے

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا

ہر رنگ میں بہار کا اِثبات چاہیے

سرپائے خُم پہ چاہیے ہنگام بےخودی

روسوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات

عارف، ہمیشہ مستِ مےِ ذات چاہیے

لیے بھی مستعمل ہے۔

شرح: شعر میں شراب خانے کو آنکھ سے اور مسجد کو بہ اعتبارِ محراب ابرو یعنی بھووؤں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ شراب خانہ مسجد کے زیرِ سایہ یعنی پاس ہونا چاہیے دیکھیے قبلۂ حاجات! آنکھ ابرو کے پاس ہوتی ہے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ قبلۂ حاجات، مسجد کے ضلع کا لفظ ہے۔ جہاں محض ضلع بولنے کے لیے محاورے میں تعرف کرتے ہیں، وہاں ضلع بُرا معلوم ہوتا ہے اور محاورہ پورا اترے تو ضلع بولنا حسن پیدا کرتا ہے۔ یہاں یہ لفظ محاورے کے لحاظ سے آیا ہے۔

۲۔ **لغات۔** مکافات: بدلا۔

شرح: اے محبوب! ہم آپ پر عاشق تھے اور آپ نے جی بھر کر ہم پر ستم توڑے۔ اب ماشاء اللہ آپ کو بھی کسی سے عشق ہوا اور جتنے

ظلم آپ نے کیے تھے، ان کا بدلا ملنا چاہیے تھا، چنانچہ مل جائے گا۔ جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا۔

۳۔ لغات۔ تلافی مافات : جو کچھ گزر چکا، اس کی تلافی ۔ نقصان کا پورا ہونا۔

شرح : اے آسمان! تونے میری کوئی بھی آرزو پوری نہ کی۔ ہر آرزو کا نتیجہ حسرت کی شکل میں نکلا اور میرا دل پے در پے حسرتوں سے لبریز ہوتا رہا، یہاں تک کہ اس کے حصے میں حسرتوں کے سوا کچھ نہ آیا۔ اب میرے دل کی حسرت پرستی ہی کی داد دے دے۔ میں پہلے جو دکھ اٹھا چکا ہوں، جو مصیبتیں برداشت کر چکا ہوں ان کی کچھ نہ کچھ تلافی تو ہو جانی چاہیے۔

مطلب یہ ہے کہ حقیقی آرزو تو کوئی پوری نہ ہوئی، اب آسمان سے صرف یہ کہ رہے ہیں کہ دل نے جس ہمت و استقامت سے حسرتیں برداشت کیں، اسی کی داد مل جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انسان پر ہر قسم کی رنج و غم کا ہجوم ہو تو محض اتنی بات بھی بڑی تسکین کا باعث ہوتی ہے کہ کوئی کہ دے، واہ! فلاں شخص نے کس پامردی سے کام لیا۔ میرزا آسمان کی طرف سے اتنے کلمۂ تحسین کو بھی اپنی برداشت کی ہوئی مصیبتوں کی ایک حد تک تلافی سمجھتے ہیں۔

۴۔ لغات۔ تقریب : ذریعہ، سبب، باعث، شادی بیاہ، جلسہ، موقع، محل، سفارش، ذکر۔

شرح : ہم نے چاند جیسے چہرے والے۔ محبوبوں کی خاطر مصوری سیکھی ہے۔ آخر ان سے ملاقات کے لیے کوئی نہ کوئی سبب اور وسیلہ تو ہونا چاہیے۔

مصوری اس لیے سیکھی کہ حسینوں کو ہمیشہ تصویریں کھچوانے کا شوق ہوتا ہے اور وہ وقتاً فوقتاً انھیں بلاتے رہیں گے اور تصویر کھینچنے کے سبب

میں ان کے پاس بیٹھنے اور دیدار سے لذّت اندوز ہونے کا موقع ملتا رہے گا۔
شعر میں مقصود کیمرے کے ذریعے سے تصویر لینا نہیں، بلکہ وہ تصویر مراد ہے، جس میں صاحبِ تصویر سامنے بیٹھ کر مصوّر سے تصویر اتروا تا ہے اور اس کی تکمیل میں کئی کئی دن صرف ہو جاتے ہیں۔

۵۔ **شرح** : شراب پینے سے کس روسیاہ کا مقصد ہے کہ نشاط و شادمانی حاصل ہو ؟ حاشا و کلاّ۔ میرا مقصد تو صرف اتنا ہے کہ دن رات ایک طرح کی بیخودی طاری رہے۔

کمال یہ ہے کہ عیش و نشاط کی خاطر شراب پینے کو روسیاہی قرار دے دیا۔
بعض اصحاب کہتے ہیں کہ میرزا کا یہ شعر عمر خیّام کی مندرجۂ ذیل رباعی سے ماخوذ ہے۔

مے خوردنِ من نہ از برائے طرب است ۔۔۔ نے بہرِ فسادِ دین و ترکِ ادب است
خواہم کہ بہ بیخودی بر آرم نفسے ۔۔۔ مے خوردن و مست بودنم زین سبب است

یعنی میں جو شراب پیتا ہوں تو اس لیے نہیں کہ خوشی حاصل ہو، اس لیے بھی نہیں کہ دین برباد ہو اور ادب کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ بیخودی کی حالت میں ایک سانس لوں۔ میرے شراب پینے اور مست رہنے کا سبب یہ ہے۔

بلاشبہ خیّام نے دوسرے بعض امور کے علاوہ عیش و طرب کی بھی نفی کی اور بیخودی کا لفظ بھی استعمال کیا، لیکن مرزا کا پورا مضمون اس سے الگ ہے۔ انھوں نے صرف نشاط کی نفی کی اور عام شراب نوشوں کے سامنے صرف یہی مقصد ہوتا ہے۔ ایک ہی مصرع میں نہ محض نشاط کی نفی کی، بلکہ یہ مقصد پیشِ نظر رکھنے کو روسیاہی قرار دے دیا، گویا نفی آخری حد پر پہنچا دی۔ پھر یہ نہیں کہا کہ ایک دو سانس حالتِ بیخودی میں لے لوں، بلکہ فرمایا : دن رات ایک طرح کی بیخودی چاہیے۔ نشاط کی نفی کے بعد کسی دوسری غرض کی طرف اشارہ تک نہ کیا اور یہ معاملہ

سامع پر چھوڑ دیا کہ وہ اپنے حالات کی مناسبت سے جو مقصد چاہے، پیش نظر رکھ لے۔ لیکن میرزا کو صرف دن رات کی ایک خاص بیخودی درکار ہے۔ دن کو بیخودی اس لیے مطلوب ہے کہ زندگی میں قدم قدم پر تکلیف دہ حالتیں پیش آ رہی ہیں۔ بیخودی کی حالت میں ان کا احساس تک نہ ہوگا۔ رات کو اس لیے بیخودی درکار ہے کہ وسوسے اور خواب پریشان نہ کریں گے۔

سب سے آخر میں یہ کہ خیام کی رباعی میں وہ کیفیت موجود نہیں، جو اس کی اکثر رباعیات کا خاصّہ ہے، اگر مرزا نے دو مصرعوں میں تمام حقائق یکجا کر دیے۔ اور شعر کو اس درجہ پر کیف بنا دیا کہ انسان پڑھے اور وجد و سرخوشی میں گم ہو جائے۔

۶ - ۹ - **لغات** - **فروع** : فرع کی جمع، شاخیں۔

نسریں : سیوتی کا پھول۔

عارف : خداشناس، صاحب عرفان۔

شرح : اے غالب! شاخوں کا بڑھنا اور پھولنا پھلنا جڑ پر موقوف ہے جڑ چھپی ہوئی ہے اور شاخیں نمایاں ہیں۔ دوسری مثال یہ ہو سکتی ہے کہ ہر بات خاموشی سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی پہلے بات کا تصور ذہن میں آتا ہے پھر موزوں الفاظ کی شکل میں وہ زبان پر آجاتی ہے۔ پہلی حالت اس کے چھپے ہوئے ہونے کی تھی، دوسری حالت نمود و نمائش کی ہوئی۔ گویا خاموشی اصل ہے، باتیں اس کی فروع ہیں۔

ایک اور مثال لیجیے۔ دیکھیے، لالے، گلاب اور سیوتی کے پھولوں کا رنگ وضع قطع، خوشبو اور ہر چیز مختلف ہے، لیکن ان سب کا پیدا ہونا بہار پر موقوف ہے، جس کا ظاہری وجود کوئی نہیں۔ پھول رنگ لاتے ہیں تو ہم کہتے ہیں، بہار آ گئی۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ پھولوں کے رنگوں میں نہ الجھیں۔ بلکہ بہار کے اثبات پر نظر رکھیں۔ بہار اصل ہے، لالہ و گل و نسریں اس کی فروع ہیں۔

انسان کو زندگی میں مختلف حالتوں سے سابقہ پڑتا ہے اور ہر حالت کا

ایک خاص مقتضا ہے، وہ ضرور پورا ہونا چاہیے۔ مثلاً بیخودی اور مستی کا وقت ہو تو سر شراب کے مٹکے کے پاؤں یعنی نچلے حصے پر ہونا چاہیے اور دعا و مناجات کا موقع آجائے تو منہ قبلے کی طرف کر لینا چاہیے۔ گویا بیخودی ایک کیفیت ہے، جس کی اصل شراب کا خم ہے اور مناجات ایک کیفیت ہے، جس کی اصل قبلہ ہے۔

ان تمام بیانات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صفات باری تعالیٰ کا پیمانہ جس طرح گردش کرتا جائے، یعنی مختلف صفات جس طرح وقتاً فوقتاً ظہور کریں، ان کے تقاضے ضرور پورے کیے جائیں، لیکن خدا شناس اور صاحب عرفان کے لیے لازم ہے کہ صفات کے تقاضے پورے کرنے کے ساتھ ساتھ ذات کو ہرگز نہ بھولے، بلکہ اسی کی شراب سے ہمیشہ مست رہے۔

ان چاروں شعروں میں مرزا نے اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ کائنات کا مبدا ایک ہے۔ زندگی میں اس کے مظاہر سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ ہر مظہر جن واجبات کا طلب گار ہے، وہ ضرور پورے کیے جائیں، لیکن مبدا کو ایک لمحے کے لیے بھی بھولنا نہ چاہیے، مقصود حقیقی مبدا ہی ہے۔

مروجہ دیوانوں میں تخلص والا شعر سب سے آخر میں رکھ لیا گیا، حالاں کہ اس کا اصل مقام اس قطعے کا آغاز ہے۔

بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرہ خوں، وہ بھی
سو رہتا ہے، بہ اندازِ چکیدن سرنگوں، وہ بھی
رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف، تھا ایک اندازِ جنوں، وہ بھی

۱۔ لغات:
بساطِ عجز: عاجزی کی بساط، عاجزی کی حیثیت۔
سر و سامان

خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں، وہ بھی
نہ کرتا کاش ! نالہ، مجھ کو کیا معلوم تھا، ہمدم
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں، وہ بھی
نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بے تابی میں ہے اک موجِ خوں، وہ بھی
مےِ عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک، دو، چار، جامِ واژگوں، وہ بھی
مرے دل میں ہے غالبؔ! شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے، جو اس سے میں یہ بھی کہوں، وہ بھی

بہ اندازِ چکیدن: ٹپکنے کے طور پر۔

شرح:
مجھ عاجز کی بساط میں جو سرو سامان ہے، وہ صرف ایک ہے، یعنی دل اور اس کی کیفیت بھی یہ ہے کہ صرف خون کا ایک قطرہ ہے۔ وہ قطرہ بھی سر جھکائے نیچے کی طرف لٹکا رہتا ہے گویا ابھی ٹپک پڑے گا۔

مطلب یہ ہے کہ دل کے سوا میرے پاس کوئی سرو سامان نہیں اور دل کی کیفیت وہ ہے، جس کی تفصیل بتا دی گئی ۔ یعنی ایک قطرۂ خون ہے اور وہ بھی ٹپکا ہی چاہتا ہے۔

بعض اصحاب نے اس شعر کو فیضیؔ کے مندرجہ ذیل شعر سے ماخوذ بتایا ہے

دریاب کہ ماندہ است ز دل قطرۂ خونے
آں قطرہ ہم از دستِ تو لبریزِ چکیدن

یعنی اے محبوب! جان لے کہ دل میں سے خون کا ایک قطرہ باقی رہ گیا

ہے اور اس قطرے کی حالت بھی تیرے ظلم و جور کے ہاتھ سے ایسی ہو گئی ہے، گویا اس کا پیمانہ ٹپکنے سے لبریز ہو گیا ہے، یعنی ابھی گرا اور ٹپا ہوا چاہتا ہے۔

بلاشبہ غالب کے شعر میں بھی دل، قطرۂ خون اور چکیدن کے الفاظ آئے ہیں، مگر دونوں کا مضمون ایک نہیں۔ فیضی نے بتایا ہے کہ دل میں سے صرف ایک قطرۂ خون باقی رہ گیا۔ غالب نے اپنا کل سرو سامان دل بتایا اور وہ صرف لہو کی ایک بوند ہے۔ فیضی نے اس قطرۂ خون کو محبوب کے ہاتھوں ٹپکنے پر آمادہ قرار دیا۔ غالب نے یہ کہا کہ لہو کی جو بوند میرے پاس ہے، وہ ٹپکنے کے انداز میں سر نیچے کیے ہوئے ہے۔ فیضی کا مضمون خاص ہے، غالب کا عام۔

بجنوری مرحوم فرماتے ہیں کہ پرانی عمارتوں میں آب و ہوا کے اثرات سے جا بجا کائی جم جاتی ہے اور دیواروں سے پانی رسنے لگتا ہے۔ یہ پانی قطرہ قطرہ گرتا رہتا ہے۔ قطرے ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے آتے ہیں جو سب سے آگے ہوتا ہے، وہ ذرا سے توقف کے بعد گر پڑتا ہے۔ جو چیز اُن کو فوراً گر پڑنے سے روکتی ہے، وہ پانی کے سالمات کا باہم ملحق ہونا ہے، لیکن کہاں ایک قطرے کی قوت قرار، کہاں کرۂ ارض کی کششِ ثقل قطرہ کیا تاب لا سکتا ہے؟ مرزا غالب نے اپنے دل کو ٹپکتے ہوئے قطرے سے مشابہ قرار دیا۔ اطبائے فرنگ نے دل کو ناشپاتی سے تشبیہ دی ہے، حالانکہ اس کا بالائی حصہ چھوٹا اور زیریں حصہ بڑا ہوتا ہے، حالانکہ دل کی کوئی تشبیہ ٹپکتے ہوئے قطرے سے بہتر ممکن نہیں۔

۲۔ لغات۔ تکلف برطرف : حق یہ ہے، سچ یہ ہے۔

شرح : ہم اپنے شوخ و شنگ محبوب سے تھوڑی سی مدت کے لیے تصنع اور بناوٹ کے طور پر ملول و ناخوش رہے۔ حق یہ ہے کہ ہمارا یہ طریقہ

بھی جنونِ عشق ہی کا ایک انداز تھا۔

مطلب یہ کہ محبوب سے آزردہ ہونے کی حقیقۃً مجال ہی نہیں، لیکن تکلّف سے آزردگی کی صورت پیدا کر لی۔ گویا سمجھ لیا کہ ایسا طریقہ اختیار کرینگے تو محبوب کو خیال ہو گا، وہ پوچھے گا کہ آزردگی کا سبب کیا ہوا؟ اس طرح قدر و منزلت بڑھ جائے گی، لیکن حتی یہ بناوٹ، جو جنونِ عشق کے انداز میں اختیار کی گئی۔ جب دیکھا کہ محبوب پر کچھ اثر نہیں ہوا تو تکلّف اٹھا دیا، پھر پہلے کی طرح اس سے ربط ضبط پر آمادہ ہو گئے۔

۳۔ **لغات۔ صیدِ زبوں:** دبلا اعلا عز و ناتواں شکار، جسے شکاری پسند نہیں کرتے۔

شرح: جب دل رنجیدہ و غمزدہ ہو تو اسے موت کے خیال سے کیا تسلی ہو سکتی ہے؟ اگر ہو بھی تو میری یہ حالت ہے کہ آرزو کے جال میں جتنے شکار میں نے پھانس رکھے ہیں، ان میں سے ایک دبلا اور مریل شکار خیالِ مرگ بھی ہے۔ یعنی مدّت سے یہ سمجھے بیٹھا ہوں کہ موت آئے گی اور غمزدہ دل کے لیے تسکین کا سامان بہم پہنچے گا۔ لیکن موت آتی ہی نہیں اور یہ مریل شکار میری تمنا کے دام میں مدت سے الجھا ہوا ہے۔ گویا یہ ایک فضول اور بے مصرف خیال ہے، جو پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔

۴۔ **شرح:** اے ہمدم! کاش مجھے معلوم ہوتا کہ فریاد و فغاں نہ کرنی چاہیے۔ میں نے بے خبری میں کی، نتیجہ یہ نکلا کہ اس سے دل کا درد اور بھی بڑھ گیا۔

فریاد و فغاں کی غرض تو یہ تھی کہ دل کا بخار نکل جائے گا۔ جس درد نے مجھے پریشان کر رکھا ہے، اس میں کمی آ جائے گی، مگر اس نے الٹا اثر کیا۔ درد میں اضافہ کر دیا۔ اگر پہلے سے مجھے اس نتیجے کی خبر ہوتی تو فریاد و فغاں کیوں کرتا؟

یہ بھی ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ انسان بعض اوقات اپنے مصائب کی تخفیف کے لیے ایسی تدبیر اختیار کرتا ہے، جس سے پریشانی میں کسی قدر تخفیف ہو جائے، لیکن وہ تدبیر مصیبتوں اور پریشانیوں کی شدت میں اضافے کا باعث بن جاتی ہے۔

۵۔ لغات۔ بُرِش : کاٹ۔

شرح : اے محبوب! تیغِ جفا کی کاٹ پر ناز کرنے کی کون سی وجہ ہے؟ میرے دل میں بیتابی کا دریا لہریں لے رہا ہے۔ اُن لہروں میں سے ایک خونیں لہر آپ کی تیغِ جفا بھی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جن لہروں نے مجھے بیتابی و اضطراب کا تختۂ مشق بنا رکھا ہے، آپ کی تیغِ جفا ان میں سے صرف ایک لہر ہے۔ اس کے علاوہ بھی خدا جانے کتنی لہریں اس دریاے اضطراب کی تصویر بنی ہوئی ہے؟

۶۔ لغات۔ واژگوں : اُلٹا۔

شرح : جب جام الٹ دیا جائے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ جتنی شراب تھی، وہ پی جا چکی۔ اب کچھ باقی ہی نہیں، جس کی خاطر جام سے کام لینے کی ضرورت ہو۔

آسمان کے ساقی سے عیش و عشرت کی شراب کی خواہش کا کون سا مقام ہے؟ اس کے پاس ہے ہی کیا؟ اک دو چار جام، جو اس کے پاس ہیں۔ انھیں بھی اوندھا کر رکھا ہے۔ گویا جتنی شراب اس کے میخانے میں تھی، وہ ختم ہو چکی۔

اک دو چار کو جمع کیا جائے تو سات بنتے ہیں، یہ اشارہ سات آسمانوں کی طرف بھی ہو سکتا ہے اور سات سیاروں کی طرف بھی۔

مراد یہ ہے کہ اب آسمان کے ساقی سے کسی کو شرابِ عشرت نہیں مل سکتی، کیونکہ وہ سب کچھ ختم کر کے دکان بڑھائے بیٹھا ہے۔

بعض اصحاب نے کہا ہے کہ غالبؔ کا یہ شعر جامیؔ کے اس شعر سے ماخوذ ہے۔

چرخ را جامِ نگوں داں کز مے عشرت تہیست
بادہ از جامِ نگوں جُستن نشانِ ابلہیست

آسمان ایک اوندھا پیالہ ہے۔ یہ عشرت کی شراب سے خالی ہے۔ جو پیالہ اوندھا ہو، اس سے شراب ڈھونڈنا حماقت کا نشان ہے۔

بلاشبہ دونوں شعروں کی ظاہری وضع سے مضمون ملتا جلتا معلوم ہوتا ہے، لیکن اسے پیش کرنے کا جو انداز غالبؔ نے اختیار کیا، وہ جامیؔ کے ہاں ناپید ہے۔ جامیؔ نے صرف یہ کہا کہ آسمان خود الٹا پیالہ لیے بیٹھا ہے۔ الٹے پیالے سے شراب کیونکر حاصل کی جا سکتی ہے؟ غالبؔ نے یہ مضمون واعظانہ نہیں، حقیقی شاعرانہ رنگ میں پیش کیا اور کہا، آسمان کے ساقی سے مے عشرت نہیں مل سکتی۔ کیونکہ وہ تو خود اک دو چار پیالے الٹائے بیٹھا ہے

بیخودؔ موہانی کہتے ہیں کہ غالبؔ کو اپنی بے سروسامانی پر کڑھتے کڑھتے یہ خیال گزرا کہ آسمان کے ساقی سے سوال کرنا چاہیے۔ شاید وہ ہمارے جام میں بھی کچھ ڈال سکے۔ پھر یکایک خیال آیا کہ وہ تو خود جام الٹائے بیٹھا ہے گویا اس کے اپنے پاس ہی کچھ نہیں، وہ دوسرے کو کیا دے سکے گا؟

بقولِ بیخودؔ : " دونوں شعروں میں واقعہ اور بیانِ واقعہ کا فرق ہے ایک پیکرِ بے جان ہے اور ایک پیکرِ ذی روح "

۷ - **شرح** : اے غالبؔ! میرے دل میں وصل کا شوق بھی ہے اور جدائی کی شکایتیں بھی - خدا وہ دن لائے کہ میں اپنے محبوب سے دونوں چیزیں کہہ سکوں - یعنی وصل کا شوق بھی عرض کروں اور ہجر کی جتنی شکایتیں ہیں، ان کا بخار بھی نکال لوں۔

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم، ایسے خوشامد طلبوں سے

ہے دورِ قدح وجہ پریشانیِ صہبا
یک بار لگا دو خُمِ مے میرے لبوں سے

رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں، زاہد!
زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

بیدادِ وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر!
ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

۱۔ شرح: محبوبوں کی بزم میں کلام لبوں سے آزردہ اور دکھی ہے۔ گویا لبوں تک آنا نہیں چاہتا یہ لوگ اتنے خوشامد طلب ہیں، چاپلوسی کے اتنے عادی ہیں کہ ہم تنگ آ گئے ہیں خوشامد طلبی کا مطلب یہ ہے کہ ان کی مجلس میں کوئی ایسی بات زبان پر لا ہی نہیں سکتے، جو سچائی اور راستبازی پر مبنی ہو یا ان کے حسن کی تعریف کریں گے یا معمولی نوازشوں کو اپنی خوش نصیبی قرار دیں گے یا ان کے ظلم و جور کی مدح و ستائش کریں گے۔ غرض وہی باتیں زبان پر آئیں گی، جو ان کے لیے خوشی اور ان کی خوشنودی کا باعث ہوں، اس وجہ سے کوئی بات بے تکلف لبوں تک نہیں آتی۔ اسے کھینچ تان کر ہی لانا پڑتا ہے۔

محبوبوں کے تعلق میں بھی اس شعر کی موزونیت محتاجِ تشریح نہیں، لیکن کم ظرف اور خود غرض حاکموں کی مجلس کے تعلق میں تو یہ ہر اعتبار سے موزوں و برمحل ہے۔

۲۔ **لغات**۔ دَورِ قدح: شراب پینے کا دَور، جس میں پیالہ باری باری ایک ایک میکش کے سامنے آتا ہے۔

صہبا: شراب۔

شرح : یہ جو باری باری ساغر ایک ایک کے سامنے دیا جاتا ہے، اس سے تو شراب جزو جزو ہو کر بکھر جاتی ہے۔ چاہیے کہ شراب کا خم میرے لبوں سے لگا دو تاکہ اسے یکدم پی جاؤں اور پیالہ بھر بھر کر باری باری دینے کی ضرورت نہ رہے۔

۳۔ **لغات** ۔ **طرف ہونا** : مقابل ہونا۔ بحث و تکرار کرنا۔
زنہار : ہرگز۔

شرح : اے زاہد! میخانے کے دروازے پر جو رند ہیں، وہ بڑے گستاخ اور منہ پھٹ ہیں۔ ان بے ادبوں سے ہرگز ہرگز بحث و تکرار نہ کر بیٹھنا۔

۴۔ **شرح :** اگرچہ میری جان کو لبوں سے گہرا ربط ضبط تھا، یعنی وہ ہر وقت لبوں پر رہتی تھی اور وفا کا پورا حق ادا کرنا چاہتی تھی، لیکن وفا کے تقاضے اتنے کڑے، اتنے سخت اور اتنے جانگداز ہونے کہ اس نے لبوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور نکل گئی۔

مقصودِ شعر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وفا کے سلسلے میں عاشق کو جن مصیبتوں اور آفتوں سے سابقہ پڑتا ہے، ان کا بے پناہ ہونا واضح کیا جائے۔

تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
سن لیتے ہیں، گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

غالبؔ! ترا احوال سنا دیں گے ہم ان کو
وہ سن کے بُلا لیں، یہ اجارا نہیں کرتے

۱۔ **شرح :** اب محبوب نے یہ طریقہ اختیار کر لیا ہے کہ جب کوئی شخص میرا ذکر ان کے سامنے چھیڑ دیتا ہے تو اسے منع نہیں کرتے چپ چاپ سن لیتے ہیں تاکہ میرے لیے شکایت کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ البتہ خود میرا ذکر کبھی نہیں کرتے

اگر کسی کی طرف سے ذکر کریں کر دیتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ سخت بگاڑ ہو گیا ہے اور عاشق کے لیے شکایت کا موقع پیدا ہوتا۔ اب صورت یہ ہے۔

۱۔ محبوب ذکر پر خفگی کبھی ظاہر نہیں کرتا۔ اگر ایسا ہوتا تو عاشق معذرت کر دیتا۔

۲۔ نفرت بھی ظاہر نہیں کرتا۔ اگر ایسا ہوتا تو شکایت کی گنجائش پیدا ہو جاتی۔

۳۔ اظہارِ ملال بھی نہیں کرتا کہ عاشق کے لیے منا لینے کا موقع نکل آتا۔

یہ تمام صورتیں ختم کر دیں، البتہ اگر کوئی ذکر چھیڑ دے تو سن لیتا ہے۔ نہ کامل بے تعلقی ہے، نہ خفگی ہے، نہ ملال ہے اور عاشق کے لیے یہ صورتِ حال گومگو کی ہے۔ نہ وہ اسے توجہ قرار دے سکتا ہے، نہ بے توجہی۔

۲۔ **شرح** : اے غالب! ہم تیرا احوال محبوب کو ضرور سنا دیں گے، لیکن وہ سب کچھ سن کر تجھے بلا لے، اس کا ذمہ ہم نہیں لے سکتے۔

مولانا طباطبائی نے لکھا ہے کہ اس شعر کے وجوہِ بلاغت بہت دقیق ہیں۔ بیچ والوں کا کہنا کہ سنا دیں گے ہم ان کو" اس کے معنی محاورے کے رو سے یہ ہیں۔ کہ کسی نہ کسی طرح مناسب موقع دیکھ کر اور محبوب کے مزاج کا اندازہ کر کے باتوں باتوں میں یا ہنسی ہنسی میں تیرا حال گوش گزار کر دیں گے۔ اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ تمام معنی الفاظ کے موقع استعمال سے ظاہر ہیں اور پتا چلتا ہے کہ محبوب بڑا مغرور، نازک مزاج، خود بیں اور خود آرا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اگر ان الفاظ کی جگہ کہتے : "کہ دیں گے ہم ان سے" تو ان میں سے اکثر معانی فوت ہو جاتے۔ پھر" اجارہ نہیں کرتے۔ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے، جب کوئی شخص اصرار سے کہے، کہ جس طرح بنے، میرا ان کا ملاپ کرا دو۔ غرض شعر سے عاشق کی بیتابی اور اصرار، محبوب کا غرور و ناز دونوں تصویریں واضح ہو گئیں۔

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا؛
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر، سو ہے

شرح:
میرے گھر میں کوئی چیز تھی ہی کہاں، جسے اے محبوب! تیرا غم عشق برباد کرتا؟ بس ایک تعمیر کی حسرت پہلے سے چلی آتی تھی، وہ بدستور باقی ہے۔ تعمیر کی حسرت سے مراد ہے کہ تعمیر کا خیال تو ہے، مگر کوئی سامان موجود نہیں، جس سے یہ آرزو پوری کی جاسکے۔ حسرت باقی ہے۔

غمِ دنیا سے، گر پائی بھی فرصت، سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا، تقریب تیرے یاد آنے کی

کھُلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا، یارب
قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

انھیں منظور اپنے زخمیوں کو دیکھ آنا تھا
اٹھے تھے سیرِ گُل کو، دیکھنا شوخی بہانے کی

ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا ظالم، مگر تمہید جانے کی

۱۔ لغات۔
تقریب: یہاں یہ لفظ ذریعہ، باعث، سبب کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اصطلاحِ منطق میں "تقریب" کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ بات ایسے طریقے پر کی جائے، جس سے دلیل یا نتیجہ ذہن میں آجائے۔

شرح:
غمِ دنیا ہم پر اس طرح مسلط ہے کہ اول تو سر اٹھانے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ اگر کبھی اتفاق سے سر اوپر

ملکہ کوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی
مِری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالبؔ
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

اٹھتا ہے اور جو نظر آسمان پر پڑتی ہے تو ساتھ ہی اے محبوب! تُو یاد آجاتا ہے۔ گویا آسمان پر نظر پڑنا تیرے یاد آنے کا سبب بن جاتا ہے۔ پھر اسی طرح غم کا سامنا ہو جاتا ہے۔

۲۔ **لغات** ۔ **قسم کھانا** : جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، اس کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ محبوب نے فیصلہ کر رکھا ہے، جو کاغذ اس کے پاس پہنچے گا اسے جلا دے گا۔ دوسرے یہ کہ وہ ہرگز نہ جلائے گا۔

شرح : فرماتے ہیں، اے اللہ! میرے خط کا مضمون محبوب پر کیونکر کھُلے گا؟ اسے کیونکر معلوم ہو گا کہ مجھ پر کیا کچھ گزر رہی ہے؟ اس کافر نے تو فیصلہ کر رکھا ہے کہ جو کاغذ اس کے پاس پہنچے گا، اسے دیکھے اور کھولے بغیر ہی جلا دے گا۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ خط کھول کر مضمون پڑھ لینے کی تو اس سے کوئی امید ہی نہ تھی، البتہ اس نے ہر کاغذ جلا دینے کی قسم کھا رکھی تھی۔ میرا خط جاتا تھا، وہ آگ کی نذر ہوتا تھا، اس سے شعلے اٹھتے تھے، یوں میرا سوزِ غم اس پر واضح ہو جاتا تھا۔ اب اس ظالم نے خط نہ جلانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ گویا میرے سوزِ غم کے اظہار کی جو گنجائش باقی تھی، اس کا دروازہ بھی بند ہو گیا۔ لہٰذا میں اپنے مکتوب کا مضمون کھلنے سے بالکل محروم رہ گیا۔

پہلا مطلب کسی پیچیدگی کے بغیر واضح ہے، دوسرے میں کسی قدر پھیر ہے، لیکن مرزا غالبؔ کے ہاں معمولی پھیر کی کوئی حیثیت نہیں۔

۳۔ **لغات** ۔ **پرنیاں** : ریشم

شرح : معلوم ہے کہ شعلہ ریشم میں لپٹا ہوا نہیں رہ سکتا، وہ ذرا بھڑک اٹھتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ شعلہ ریشم میں بہ آسانی لپیٹا جا سکتا ہے، لیکن سوزِ غم کو دل میں چھپائے رکھنے کی تدبیر بہت مشکل ہے۔

گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ دل ریشم سے بدرجہا زیادہ آتشگیر اور غمِ عشق کا سوز آگ سے زیادہ سرکش و بے پناہ ہے۔

۴۔ شرح : محبوب نے باغ کی سیر کا قصد کیا۔ شاعر کہتا ہے کہ حقیقۃً وہ باغ کی سیر کے لیے نہیں نکلے، بلکہ یہ ایک شوخی آمیز بہانہ ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے فدا کار زخمیوں کو ایک نظر دیکھ آئیں۔ گویا باغ میں پھولوں کے کھلنے کا منظر وہی حیثیت رکھتا ہے، جو محبوب کے تیرِ نگاہ اور تیغِ غمزہ کے گھایلوں کا ہے۔ بہانے کی شوخی کا مطلب یہی ہے کہ وہ ان گھایلوں کو دیکھنا سیرِ باغ کی طرح فرحت و انبساط کا باعث سمجھتے ہیں۔

۵۔ لغات۔ التفات : توجہ، مہربانی، لطف، کرم

تمہید : ابتدا۔ آغاز۔ پیش خیمہ۔

شرح : تو آیا، ہم سادگی سے یہ سمجھتے رہے کہ ہم پر خاص توجہ اور لطف و کرم ہوا ہے ہمارے لیے یہ لطف و کرم ایسی خاص چیز تھا جس پر جان تک نثار کر دینے کے لیے آمادہ تھے۔ لیکن اے ظالم! تیری حالت یہ کہ ادھر آیا، اُدھر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ گویا تیرا آنا التفات اور لطف و کرم کی بنا پر نہ تھا، بلکہ تیرے چلے جانے کی تمہید تھا۔

دوسرے مصرع سے اوّل یہ واضح ہوتا ہے کہ محبوب صرف روا روی آیا اور چل دیا، دوم اس میں خوبی یہ ہے کہ کوئی بھی آنا ہو، وہ بہرحال جانے کی تمہید ہوتا ہے۔

۶۔ لغات۔ لگد کوب : لات مارنا، ٹھکراؤ، پامالی، کڑی ضربیں۔

شرح : میری طاقت کسی زمانے میں حسینوں کے نازِ بے تکلف اٹھایا

کرتی تھی، اب حالت یہ ہے کہ زمانے کے حادثات کی ضربیں بھی برداشت نہیں کر سکتی۔

اس شعر سے جہاں اپنے ضعف اور ناتوانی کا اظہار مقصود ہے وہاں یہ بھی واضح کرنا چاہتے ہیں کہ زمانے کے حادثات کی ضربیں بتوں کے ناز اٹھانے کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

۷۔ **لغات۔ اوضاع** : وضع کی جمع۔ طور طریقے۔ سلوک، برتاؤ دستور۔

ابنا : ابن کی جمع : ابنائے زماں سے مراد ہے۔ دنیا والے، عام لوگ۔

شرح : اس دور کے لوگوں نے جو طور طریقے اختیار کر رکھے ہیں، اے غالب! میں ان کے بارے میں کیا کہوں؟ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جس فرد سے ہم نے ایک مرتبہ نہیں، بار بار نیک برتاؤ کیا، اسے جب موقع ملا، ہمارے ساتھ برائی ہی کی۔

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ، اے آرزو خرامی
دِل جوشِ گریہ میں ہے، ڈوبی ہوئی اسامی

اس شمع کی طرح سے، جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں، ہوں داغ ناتمامی

۱۔ **لغات** :
حاصل : پیداوار محصول۔ فائدہ۔ نفع۔
آرزو خرامی : خرام بر حسب آرزو یعنی اپنی آرزو کے مطابق چلنا۔

شرح : اے آرزو کے مطابق نفع حاصل کرنے کی امید رکھنے والے! تو پیداوار سے ناامید ہو جا، کیونکہ رونے دھونے کے جوش میں دل کی اسامی ڈوب چکی ہے۔ یعنی اس کے پاس کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہی، جو ہاتھ آ سکے۔

مطلب یہ ہے کہ خیال تھا، رو دھو کر مدّعا حاصل کر لینے کی کوئی صورت نکل آئے گی، لیکن رونے دھونے نے دل کی رہی سہی حیثیت بھی ختم کر ڈالی۔

۲۔ **شرح :** میری مثال اس شمع کی سی ہے جسے جلتے جلتے کسی نے پھونک مار کر بجھا دیا ہو اور سراپا جل جانے کا موقع نہ ملا ہو۔ اس طرح وہ جلے ہوؤں میں تو شمار ہو گئی، ساتھ ہی اس پر ناتمامی کا داغ لگ گیا۔ یہی کیفیت میری ہے کہ جلے ہوؤں میں تو شمار ہوتا ہوں، لیکن پورا نہ جل سکا اور ناتمام رہ گیا۔

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پر تو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

حالانکہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے

کی اُس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چُپ رہو، ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

۱۔ **لغات :**
ستم زدگاں : ستم زدہ کی جمع: غم کے مارے ہوئے۔
بیضۂ مور : چیونٹی کا انڈا۔

شرح : ہم لوگ ظلم کے مارے ہوئے ہیں۔ دیکھیے ہماری دنیا کتنی تنگ ہے، جس میں چیونٹی کے انڈے تک کو آسمان کی حیثیت، حاصل ہے۔ بظاہر یہ مبالغہ

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرماں روائے کشورِ ہندوستان ہے

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغ، جگر کا نشان ہے

ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر
غالبؔ ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہرباں ہے

ہی نہیں، غلو معلوم ہوتا ہے، لیکن نفسیات کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو اس کا نقشہ بالکل مختلف نظر آئے گا۔ ہر انسان کے لیے دنیا کی وسعت محض محبت اور ہمدردی کے نقطۂ نگاہ سے ہے جہاں تک ہمدردی اور محبت کا سلسلہ چلا جائے گا، دنیا وسیع ہوتی چلی جائے گی۔ مگر جو لوگ مظلوم اور ستم زدہ ہیں، انھیں کسی سے محبت اور ہمدردی کی توقع کیا ہو سکتی ہے؟ ظلم و ستم کی فراوانی کے ساتھ ان کی دنیا تنگ ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ یہ کہنا بھی بے جا نہیں، ان کی دنیا کا آسمان چیونٹی کے انڈے کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ **شرح:** بجنوری مرحوم اس شعر کی شرح میں فرماتے ہیں:
"مادّہ خود بیجان اور جامد ہے۔ جو چیز مادّے کو تحریک و جنبش میں لاتی ہے، وہ حرکت ہے، مگر حرکت خود اپنی ذات سے آفرینش کی قدرت نہیں رکھتی، جب تک کہ معیّن نہ ہو۔ اگر حرکت میں قاعدہ نہ ہوتا، دنیا عالمِ فساد سے عالمِ کون میں نہ آسکتی۔ بس علّت العلل وہ ذات یا طاقت ہے، جو حرکت کے پسِ پشت حرکت کو تعیّن دیتی ہے۔"
کائنات میں جو حرکت نظر آتی ہے، اے مالکِ کُل! وہ تیرے ذوق و شوق کی وجہ سے ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ذرّہ خود کوئی حیثیت نہیں رکھتا،

لیکن دنیا بھر کو تاباں و درخشاں بنا دینے والا آفتاب ذرّے پر جلوہ افگن ہوتا ہے تو اس میں جان پڑ جاتی ہے۔

یہ حقیقی منظر کی تصویر ہے۔ آپ اسے دیکھنا چاہیں تو کسی روزن میں سے سورج کی کرنیں گزرنے کا سماں دیکھ لیں۔ اس میں اَن گنت ذرّے حرکت کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ گویا آفتاب کی روشنی نے کرنوں کے ذریعے سے ان میں جان ڈال دی۔ یہی کیفیت کائنات کی ہے۔ اس میں جو جنبش، تڑپ اور اضطراب نظر آتا ہے، وہ کائنات کے خالق کے ساتھ، عشق و محبت کا کرشمہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے، ہر چھوٹا بڑا وجود عشق میں سرشار اُسی کی طرح دوڑا چلا جا رہا ہے۔

میرزا غالب نے یہ مضمون مختلف صورتوں میں باندھا ہے، مثلاً:

ہے تجلّی تری سامانِ وجود
ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں

طبیعیات کے نقطۂ نگاہ سے بھی یہ مضمون بالکل مطابق حقیقت ہے آفتاب کے پرتو یعنی حرارت کے باعث ہوا گرم ہو کر پھیلتی ہے اور پھیلنے کے باعث ہلکی ہو کر اوپر چڑھتی ہے۔ دوسری جگہ سے ہوا دوڑ کر اوپر چڑھنے والی ہوا کی جگہ لیتی ہے اس طرح ایک حرکت ایک تسلسل قائم ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ کہنا بالکل درست ہے کہ آفتاب کے پرتو سے ذرّوں میں جان پڑ گئی گویا جہاں یہ پرتو پڑا پوری فضا میں مسلسل حرکت شروع ہو جاتی ہے اور یہ تعبیر بالکل درست ہے کہ ذرّوں میں جان پڑ جاتی ہے۔

۳۔ لغات۔ ریلی: تھپیڑ، ضرب

شرح: حقیقت یہ ہے کہ میرے دل کا شیشہ سنگِ خارا کی ضرب کھا کر مانے کی طرح سرخ ہو گیا۔ جن لوگوں کو حقیقت کی روشنی نہیں ملی، وہ سمجھتے ہیں کہ میرے دل کے شیشے میں شراب بھری ہوئی ہے۔

شاعر کا مقصود یہ ہے کہ حقیقت ناشناس لوگ میری ظاہری حالت دیکھ کر سمجھتے ہیں، گویا میں اطمینان و دلجمعی سے عیش و عشرت میں مصروف ہوں، حالانکہ دنیا کے آفات و مصائب کی ضربوں سے میرا وجود سراپا خون آلود ہے۔

شاعر نے دونوں صورتوں میں سرخی کو مابہ الاشتراک قرار دیا۔ غافل اسے شراب کی سرخی سمجھتے ہیں، حالانکہ اصلاً یہ سرخی حوادث کی چوٹ کا نتیجہ ہے۔

بعض اصحاب کو یہ وسوسہ ہوا کہ پتھر کی ضرب شیشے کو چکنا چور کر دیتی ہے، اس میں سرخی پیدا نہیں کرتی، لیکن شعر میں یہ کوئی پیچیدہ معاملہ نہیں۔ شاعر نے شیشے کو دل کا استعارہ ٹھہرایا اور اس کے لیے چوٹ کے آثار کی عمومی حیثیت پیش کر دی۔ یعنی ضرب شیشے پر نہ لگی، دل پر لگی اور وہ پتھر کی چوٹ نہ تھی، بلکہ حوادث کی چوٹ تھی، لہذا اس شیشے کا لالہ رنگ ہو جانا تعجب خیز نہیں سمجھا جاتا۔

۴۔ **شرح :** محبوب نے اہل ہوس یعنی رقیب کے سینے میں رونق افروز ہونا مناسب سمجھا۔ ہاں، جو مکان ٹھنڈا ہو، وہ مجلس آرائی کے لیے کیوں پسند نہ آئے۔

اہل ہوس کے سینے کو ٹھنڈا اس لیے قرار دیا کہ وہ عشق کی حرارت سے ناآشنا ہوتا ہے۔

شعر میں الفاظ کی مناسبت محتاج تشریح نہیں، معنوی اعتبار سے اس کی حیثیت معمولی ہے۔

۵۔ **شرح :** خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"ہمارے بھی منہ میں زبان ہے" اس میں دو معنی رکھتے ہیں، ایک یہ کہ ہمارے پاس ایسے ثبوت ہیں کہ اگر بولنے پر آئے تو تم کو قائل کر دیں گے اور دوسرے شوخ معنی یہ ہیں کہ ہم زبان سے چکھ کر بتا سکتے ہیں کہ غیر نے بوسہ لیا یا نہیں۔"

شعر کے عام انداز سے ظاہر ہے کہ عاشق اور محبوب میں بوسۂ رقیب کے

متعلق بحث اور ردّ و کد شروع ہو گئی تھی۔ عاشق محبوب پر الزام لگاتا تھا کہ تم نے ضرور رقیب کو بوسہ دیا۔ محبوب انکار کرتا تھا۔ جب جھگڑے نے طول کھینچا تو عاشق نے کہا: "اچھا، ہمارے سامنے مکرتے ہو؟ ہم ثبوت پیش کر سکتے ہیں یا زبان سے چکھ کر بتا سکتے ہیں کہ تم نے رقیب کو بوسہ دیا۔

اس میں بھی لفظی مناسبتیں واضح ہیں۔

۶۔ **شرح** : جو شخص محبوب کی دیوار کے سائے میں جا بیٹھا اُسے وہی حیثیت اور وہی شان و عظمت حاصل ہو جاتی ہے، جو ہندوستان جیسے وسیع و عظیم ملک کے فرمانروا کو حاصل ہو۔ ہندوستان سے صرف موجودہ ہندوستان مقصود نہیں، بلکہ وہ ملک مقصود ہے، جس میں پاکستان بھی شامل تھا اور جس کی حدیں خیبر سے برما تک اور قراقرم سے راس کماری تک پھیلی ہوئی تھیں۔

کشورِ ہندوستان کا فرمانروا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مرزا کے تصور کے مطابق جو شخص اس وسیع ملک کے تخت کا مالک ہو، نہ کوئی اس کی عظمت کا مقابلہ کر سکتا ہے اور نہ اس کی کوئی آرزو و اماندۂ تکمیل رہ سکتی ہے، یقیناً محبوب کے سایۂ دیوار میں بیٹھنے کا نتیجہ بھی یہی ہو سکتا ہے۔

ایک پہلو یہ بھی نکالا گیا ہے کہ سایے میں اک گونہ تیرگی ہوتی ہے۔ "ہند" کے معنی بھی "سیاہ" کے ہیں اور یہ ہے بھی کالے لوگوں کا ملک، لہذا اسے سایے کے ساتھ مناسبت پیدا ہو گئی۔ یہ مناسبت کسی دوسرے ملک کی فرمانروائی میں نہ تھی۔

۷۔ **شرح** : ہمارا جگر سوزِ عشق سے جلتے جلتے محو ہو گیا اور اس کی جگہ ایک داغ پڑ گیا، جو جگر کی نشان دہی کر رہا ہے، لیکن غموں کے ہجوم نے میری یہ حالت کر رکھی ہے کہ ہستی کا اعتبار ہی باقی نہیں رہا۔ وہ اعتبار ہی بالکل مٹ گیا۔ بیشک داغ جگر کی نشانی موجود ہے۔ مگر اپنی نفسیاتی کیفیت کے

پیشِ نظر کس سے کہوں اور کیونکر کہوں کہ یہ داغ جگر کا قائم مقام ہے ؟ ایسا کہنا ہستی کے اعتبار کی دلیل ہو گا اور میرے دل سے وہ اعتبار بالکل زائل ہو چکا ہے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں " یہ مضمون بہت نیا اور خاص مصنف مرحوم کا نتیجۂ فکر ہے۔

۷۔ **شرح** : اے غالبؔ! ہم اس میں خوش ہیں کہ محبوب ہم پر نامہربان ہے۔ کسی بھی صورت میں لطف و کرم سے نوازنے کے لیے تیار نہیں، ظلم و ستم ہی میں سرگرم رہتا ہے۔ اس سے واضح ہو گیا ہے کہ اسے ہماری وفاداری پر پورا بھروسا ہے اور جانتا ہے کہ کتنی ہی بے رخی اور سختی کا برتاؤ کیا جائے ۔ یہ عاشق محبت ترک نہیں کرے گا۔

نامہربانی، بے رخی اور کثرتِ ظلم و ستم کو اپنی وفاداری کے لیے سندِ اعتماد بنانا مرزا غالبؔ ہی کا حصّہ ہے۔

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری، ہائے ہائے!
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری، ہائے ہائے!

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری، ہائے ہائے!

کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال؟
دشمنی اپنی تھی میری دوست داری ہائے ہائے!

یہ پوری ماتمی غزل کسی محبوب کا مرثیہ ہے۔ مختلف شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں زیادہ تر اشعار اس وقت کی کیفیت پیش کر رہے

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے!

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری، ہائے ہائے!

گل فشانیہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا؟
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری، ہائے ہائے!

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے!

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئے
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری، ہائے ہائے

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے

کس طرح کاٹے کوئی شبہائے تارِ برشکال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری، ہائے ہائے!

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل، تس پر یہ ناامیدواری، ہائے ہائے!

ہیں احبّ محبوب پر حالتِ نزع طاری تھی۔

۱۔ شرح

اے محبوب! آج تجھے نزع کی حالت میں دیکھ کر میں تڑپ رہا ہوں تو تو بھی بیتاب و بیقرار ہے۔ وہ دن کدھر گئے، جب میں تجھ پر مرتا تھا اور تو تغافل سے کام لیتے ہوئے میری بات تک نہ پوچھتا تھا۔

۲۔ لغات

آشوبِ غم: غم کا طوفان، غم کا ہجوم۔

عشق نے پکڑا نہ تھا، غالب! ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری، ہائے ہائے!

شرح: اگر تیرے دل میں غم کے طوفان برداشت کر لینے کی ہمت نہ تھی، تو تُو نے کیوں مجھ سے ہمدردی اور غمخواری کا شیوہ اختیار کیا تھا؟ بہتر ہوتا کہ مجھ سے ناآشنا اور بے پروا رہتا تاکہ آج میری پریشاں حالی پر تجھے پریشان نہ ہونا پڑتا۔

۲۔ شرح: تجھے کیوں میری غمخواری کا خیال آیا؟ کیوں میرے دل کو سہارا دینے کے لیے قدم بڑھایا؟ آہ! مجھ سے دوستی کر کے تو نے اپنے ساتھ دشمنی کی۔

۴۔ شرح: بیشک تو نے عمر بھر کے لیے وفاداری کا عہد کر لیا، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ عمر کو بھی تو پائداری اور استواری حاصل نہیں یعنی جو عہدِ وفا باندھا تھا، وہ اس اعتبار سے بھی تو نا استوار ہی رہا۔

۵۔ شرح: اس دنیا کی آب و ہوا مجھے زہر معلوم ہوتی ہے، کیونکہ یہ آب و ہوا تیرے لیے سازگار نہ ہوئی۔ تو نے کوچ کی تیاری کر لی تو میں بھی جینے سے بالکل بیزار ہوں۔

۶۔ شرح: پہلے تیری جلوہ افروزی کے وقت عشوہ و ناز کے پھول جھڑتے تھے، آج یہ حالت ہے کہ تیری تربت پر پھول اگائے جا رہے ہیں۔

۷۔ شرح: تُو نے خاک کا پردہ اوڑھ لیا، لیکن عشق کی نیک نامی پر حرف نہ آنے دیا اور رسوائی کی شرم گوارا نہ کی۔ اے میرے محبوب! تجھ پر محبت کی پردہ داری ختم ہو گئی۔ اس میں تُو نے وہ کمال کر دکھایا، جو دوسرے سے ممکن نہ تھا۔

۸۔ شرح: افسوس عہدِ محبت کی عزت خاک میں مل گئی اور دنیا میں

دوستی کی راہ و رسم باقی نہ رہی۔

۹۔ **شرح**: جس محبوب سے برابر زخم کھاتے رہنے کی آرزو تھی اس کا تیغ آزما ہاتھ ہی معطل ہو کر رہ گیا اور ابھی میرے دل پر ایک بھی کاری زخم نہیں لگا تھا۔

اس شعر اور اس سے پہلے شعر میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ ابھی محبت کی ابتدا ہوئی تھی، اسی حالت میں محبوب دنیا سے رخصت ہو گیا۔ دل کی تمنائیں اور آرزوئیں دل ہی میں رہ گئیں۔

۱۰۔ **لغات**۔ **برشکال**: برسات۔

شرح: ہماری نگاہیں تو ہجر کی راتیں تارے گن گن کر کاٹنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ برسات کی اندھیری راتیں آ گئیں، انھیں کوئی کس طرح کاٹے؟

برسات کی راتیں اس لیے کہا کہ فراقِ محبوب میں مسلسل رونے دھونے کے سوا کچھ کام نہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ برسات کی کالی راتوں میں ابر کے باعث تارے عموماً نظر نہیں آتے اور جو شخص تارے گن گن کر رات کاٹنے کا عادی ہو، اس کی محرومی محتاجِ بیان نہیں۔

۱۱۔ **شرح**: کان محبوب کا پیغام سننے کے لیے ترستے ہیں اور آنکھیں جمال دیکھنے کے لیے تڑپ رہی ہیں۔ پہلو میں ایک دل ہے اور اس پر مایوسی و ناامیدی کا یہ طوفان اُمڈ آیا ہے، کوئی کرے تو کیا کرے؟

۱۲۔ **شرح**: اے غالب! میرا عشق ابھی وحشت کے درجے پر نہیں پہنچا تھا۔ یعنی دنیا اور اہلِ دنیا سے بے پروا ہو کر رسوائی اور بدنامی کی طرف سے آنکھیں بند کرتے ہوئے صحرا گردی اور دشت نوردی کی نوبت نہیں پہنچی تھی۔ دل میں ذلت و رسوائی اور خواری و بدنامی کا جو ذوق تھا، وہ دل ہی میں رہ گیا۔

شعر میں عشق اور وحشت کے آثار واضح کر کے دونوں میں جو فرق نمایاں کیا

وہ خاص توجّہ کا محتاج ہے۔

سرگشتگی میں، عالمِ ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

کیجے بیاں سرورِ تپِ غم کہاں تلک
ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا
ہرچند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے

پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ!
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

۱۔ لغات۔
سرگشتگی: سر پھرنا
جنون، دیوانگی۔
شرح: جنون و دیوانگی نے یہ حال کر دیا ہے کہ اب زندگی سے بالکل نا امیدی ہو گئی۔ آرام و سکون کی خواہش کو خوشخبری سنا دو کہ مر جانے کی امید ہے اور مرتے ہی جنون و دیوانگی سے نجات مل جائے گی۔ یعنی جو چیز موت کا سبب ہے، وہی آخر تسکین و آرام کا باعث بن جائے گی۔

۲۔ شرح:
محبوب مضطر و بے اختیار دل کی ذرا پروا نہیں کرتا۔ یعنی وہ اس سے تغافل برت رہا ہے اور یہی سمجھتا ہے کہ اب تک دل میرے ہی پاس ہے، حالاں کہ وہ میرے اختیار سے باہر نکل چکا ہے۔

"میرے ہی پاس ہے" کے دو مفہوم ہیں۔ اول یہ کہ عاشق کے پاس ہے، جس کی تشریح اوپر ہو چکی، دوم یہ کہ محبوب ہی کے پاس ہے اور جو چیز اس کے پاس ہے، اس کے متعلق بے خبری اور تغافل کسی تشریح کا محتاج نہیں۔

۳ **لغات** - سپاس: شکر، شکرگزاری

شرح: تپ چڑھنے کے وقت بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اسی کیفیت کے پیشِ نظر فرماتے ہیں کہ تپ غم چڑھنے کی لذت وشادمانی کہاں تک بیان کی جائے؟ میرے جسم کا ایک ایک رونگٹا شکرگزاری کے لیے زبان بنا ہوا ہے۔ بہ ایں ہمہ وہ لذت معرضِ بیان میں نہیں آ سکتی۔

۴ - **شرح**: محبوب کو حسن کے گھمنڈ نے وفاداری سے بے پروا کر دیا ہے، حالانکہ اس کے پاس حق پہچاننے والا دل موجود ہے۔

حق پہچاننے والا دل محبوب کا دل نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو غرورِ حسن اسے وفاداری سے برگشتہ نہ کر سکتا۔ یہ عاشق کا دل ہے۔ یعنی اگرچہ عاشق کا حق شناس دل اس کے پاس ہے، جو وفا کے تقاضوں سے اسے آگاہ کر رہا ہے، لیکن حسن کے غرور نے اس میں حق شناسی کا جوہر باقی ہی نہیں چھوڑا

۵ - **شرح**: چاندنی رات مرطوب ہونے کے باعث ٹھنڈی ہوتی ہے، اس لیے کہتے ہیں کہ چاندنی رات میں جتنی بھی شراب ملے، پیتا جا کیونکہ بلغم کی اصلاح شراب ہی سے ہو سکتی ہے۔

۶ - **لغات** - مکین: رہنے والا۔ سکونت رکھنے والا۔

شرح: اے اسدؔ! ہر مکان کی عزت وبرتری اور رونق وآبادی اس میں رہنے والے پر موقوف ہے۔ دیکھیے، مجنوںؔ جب تک صحرا میں مقیم تھا وہاں رونق اور چہل پہل تھی۔ جب سے وہ مرا ہے، پورے صحرا پر اداسی چھائی ہوئی ہے۔ نہ کہیں کوئی ہنگامہ ہے، نہ کہیں آبادی نظر آتی ہے۔ ایک سناٹا ہے، جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک یکساں طاری ہے۔

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے
کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ
دل فردِ جمع و خرچِ زباں ہائے لال ہے
کس پردے میں ہے آئنہ پرداز اے خدا
رحمت کہ عذر خواہِ لبِ بے سوال ہے
ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوقِ منفعل! یہ تجھے کیا خیال ہے
مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان
نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے
وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے
ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

۱۔ لغات۔
اِخفاء: چھپانا پوشیدہ رکھنا۔
شرح: اگر خاموشی کا فائدہ یہی ہے کہ انسان کی دلی کیفیات اور حقیقی حالات چھپے رہتے ہیں اور لوگوں پر واضح نہیں ہوتے تو میں اس بات پر خوش ہوں کہ یہ فائدہ مجھے بولنے کے باوجود حاصل ہے، کیوں کہ جو باتیں میں کہتا ہوں ان کا سمجھنا بے حد مشکل ہے۔

خاموشی کا مطلب یہ ہے کہ انسان چپ رہے اور کوئی بات زبان پر نہ لائے لیکن اگر کوئی شخص باتیں کرتا ہے اور ان کا سمجھنا ممکن نہیں تو بولنے کے باوجود اسے خاموشی کا حقیقی فائدہ حاصل ہے۔ یہی حقیقت مرزا غالب اس شعر کے ذریعے سے واضح کر رہے ہیں

اغلب ہے، یہ اشارہ مرزا کے کلام کی طرف ہو، جسے عام اسلوبِ بیان کے عادی مشکل سمجھتے تھے اور آسان کہنے کی فرمائشیں کرتے رہتے تھے۔

۲۔ **لغات۔** **فردِ جمع و خرچ** : وہ رجسٹر، جس میں آمدنی اور خرچ کا اندراج ہوتا رہے۔

زبانہاے لال : گونگی زبانیں۔

شرح : جو کچھ میرے دل میں ہے، افسوس کہ اسے کبھی بیان نہ کر سکا۔ اس باب میں جو حسرت رہ گئی، اس کا گلہ کس سے کروں؟ دل کی یہ کیفیت ہے کہ وہ گونگی زبانوں کی آمد و خرچ کا رجسٹر بنا ہوا ہے۔ یعنی اس کا پورا اندوختہ گونگی زبانوں پر مشتمل ہے، جن سے مناسب موقع پر حقیقی کیفیت ظاہر نہ ہو سکی۔

دلی کیفیات کا اظہار زبانِ گویا پر موقوف ہے۔ جو زبان گویائی کی صلاحیت سے محروم ہو، وہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔ مرزا کہنا یہ چاہتے ہیں کہ دل میں جتنی بھی کیفیات تھیں، وہ اس لیے معرضِ بیان میں نہ آسکیں کہ جو زبانیں تھیں وہ گونگی تھیں، لہٰذا ان کیفیات کے اظہار کی حسرت باقی رہ گئی اور لطف یہ کہ اس حسرت کا شکوہ بھی کسی سے نہیں کر سکتا۔

۳۔ **لغات۔** آئینہ پرداز : آئینے کو جلا دینے اور روشن کرنے والا۔

عُذر خواہ : خود عذر کرنے یا کسی کا عذر قبول کرنے والا، یعنی وہ، جو خود عفو خواہ ہو یا دوسرے کو معذور سمجھے۔

شرح : اے خدا! تیری رحمت کس پردے میں آئینے کو جلا دے رہی ہے؟ یہی اس لب کی عذر خواہ ہے، جسے سوال کا حوصلہ نہیں اور وہ گناہوں کی کثرت کے باعث کچھ کہتا ہوا شرماتا ہے۔

رحمت کے لیے آئینہ پردازی کا ذکر غالباً اس لیے کیا کہ اسی کی برکت سے

گناہوں کے زنگ زائل ہوتے ہیں۔ لب بے سوال اس بنا پر بھی ہو سکتا ہے کہ گناہوں کی فراوانی کے پیش نظر کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی ، اس بنا پر بھی ہو سکتا ہے کہ نظر صرف اللہ کی رضا پر ہے اور اپنی طرف سے کچھ کہنا رضا کے منافی ہے۔

مولانا طباطبائی نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ جو لب بے سوال ہوگا، اس کا بے نفس ہونا ضروری ہے۔ انسان بولے اور آئینہ منہ کے پاس ہو تو وہ سانس سے مکدر ہو جاتا ہے۔ غالباً اسی لیے رحمت کو آئینہ پرداز قرار دیا۔

۴۔ **لغات**۔ منفعل : شرمندہ۔ پشیمان۔

شرح : شوق اپنی تمام کوششوں کو بے نتیجہ دیکھ کر شرمندہ و پشیمان ہے اور اسے یہ خیال ہو رہا ہے کہ میں نے جس سے محبت کی، وہ دوست نہیں۔ دشمن ہے۔ شاعر شوق کو سمجھا رہا ہے کہ تجھے یہ خیال کیونکر آیا؟ خدانہ کرے کہیں یہ ممکن ہے کہ محبوب ہم سے دشمنی کا طریقہ اختیار کرے۔

اصل مدعا یہ ہے کہ محبت کے راستے میں مختلف منزلیں آتی ہیں۔ سختیوں پریشانیوں، مصیبتوں اور ناکامیوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔ تھڑدلے لوگ ایسے مواقع پر ہمت ہار بیٹھتے ہیں، لیکن مرزا اپنے شوق کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ محبوب کی طرف سے دشمنی کا خیال بھی نہیں ہو سکتا۔ شوق کی سرگرمی بدستور جاری رہنی چاہیے۔

۵۔ **لغات** ۔ لباسِ کعبہ : اس سے مراد وہ کپڑا ہے، جو حرم پاک کی دیواروں کو باہر سے ڈھانپے رہتا ہے اور جسے عام اصطلاح میں غلافِ کعبہ کہتے ہیں۔ ابتدا میں غلاف کے لیے رنگ کی کوئی تخصیص نہ تھی، اب مدت سے سیاہ رنگ ہی کا غلاف چڑھایا جاتا ہے۔ یہ غالباً عباسیوں کے عہد میں شروع ہوا، جنھوں نے خاندانی نشانوں کے لیے کالا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اس رنگ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں میلے پن کا اثر نمایاں نہیں ہوتا، نیز

دھوپ یا بارش کے باعث اس میں تغیر نہیں آتا۔

نافِ زمین : زمین کا مرکز۔

نافِ غزال : ہرن کی ناف، جہاں ایک خاص قسم کے ہرن میں مشکِ نافہ پیدا ہوتا ہے۔

شرح : حرمِ پاک کے لباس کا مشک جیسا رنگ حضرت علیؑ کے قدم کی برکت ہے، ورنہ یہ مقدس مقام زمین کا مرکز تو یقیناً ہے، لیکن ہرن کی ناف قطعاً نہیں۔

لوگوں نے نافِ زمین پر بحثیں کی ہیں، حالانکہ ان کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ کعبے کو نافِ زمین کہنا حدیث کا مضمون ہے۔ اور نافِ زمین سے وسطی زمین مراد ہے، لیکن کعبہ وسطِ زمین نہیں، کیونکہ خطِ استوا سے ہٹا ہوا ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ ایسی حدیثیں بہت کم ہیں، جن کا محفوظ المتن اور قطعی الصّدور ہونا ثابت ہو۔ ایک توجیہ انھوں نے یہ بھی کی ہے کہ جن خطوں میں برف اور سردی کی انتہا ہے، وہاں ایسے جانوروں کی ہڈیاں ملتی ہیں، جو گرم ملکوں کے رہنے والے ہیں۔ گویا ایک زمانے میں اقصائے شمال کا منطقۂ باردہ منطقۂ حارہ میں تھا۔ اس وقت عرب کا ملک ضرور خطِ استوا پر ہوگا۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، یہ بحث بالکل بے محل ہے۔ حرمِ پاک کو نافِ زمین جغرافیائی اعتبار سے نہیں کہا گیا کہ اس بارے میں خطِ استوا کی بحث ضروری ہوتی۔ یہ متبرک مقام اپنی عظمت و جلال اور تقدس و پاکیزگی کے اعتبار سے زمین کا مرکز اور اس کی ناف ہے، کیونکہ ہدایت و ارشاد کی ہر کرن اسی سے نکل کر اقصائے عالم میں پھیلتی ہے۔

۶۔ **لغات** ۔ **عرصۂ آفاق** ۔ روئے زمین کی وسعت۔

عرقِ انفعال : شرمندگی اور ندامت کا پسینا۔

شرح : جب مجھ پر وحشت طاری ہوئی اور میں نے صحرا گردی شروع

کی تو دنیا وسعت کے باوجود میرے لیے تنگ نظر آئی۔ اس پر اسے ندامت کا پسینا شروع ہوا۔ وہی پسینا ہے، جس نے بہ بہ کر دریاؤں اور سمندروں کی شکل اختیار کر لی ہے۔

۷۔ **شرح** : یہ دنیا محض خیالی اور اعتباری حیثیت رکھتی ہے یعنی فکر و خیال کا پیدا کیا ہوا ایک حلقہ ہے، اس کی حقیقت کوئی نہیں۔ اے اسد! کہیں اس دھوکے میں مبتلا نہ ہو جانا کہ دنیا کا وجود حقیقی ہے اور ہستی کوئی خارجی حیثیت رکھتی ہے۔ اعتباری اور خیالی شے کو حقیقی سمجھ لینا یقیناً عقل و فہم کا فریب ہے، جس سے دور رہنا چاہیے۔

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کر پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے نہ آہ نیم شبی ہے

۱۔ **شرح** : میرے دل میں بے شمار شکوے موجود ہیں اور ان کی حیثیت ایسی ہے گویا راکھ کے نیچے انگارے دبے ہوئے ہیں۔ اے محبوب! تم کرید کرید کر پوچھ رہے ہو کہ آخر تمھیں کیا شکایت ہے؟ خدا کے لیے اس سے قطع نظر کرو۔ اگر تم اس طرح کریدتے رہے تو راکھ کے نیچے سے دبے ہوئے انگارے نکل پڑیں گے اور آگ بھڑک اٹھے گی۔

راکھ کے نیچے دبے ہوئے انگاروں سے ضبط کیے ہوئے شکووں کی تشبیہ بدیع تشبیہ ہے۔

۲۔ **لغات**۔ **مُغتنم** : غنیمت سمجھا گیا یعنی غنیمت۔

شرح : اے دل! تو دکھ اور غم سے کیوں گھبرا رہا ہے؟ یہ بھی

تو بہرحال ایسی چیز ہے، جو غنیمت سمجھنی چاہیے، کیونکہ آخر صبح کا رونا بھی ختم ہو جائے گا اور آدھی رات کی آہ و فغاں کا ہنگامہ بھی سرد پڑ جائے گا۔

یہ مضمون مرزا نے مختلف شعروں میں باندھا ہے، مثلاً:

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل! غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

نیز:

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا وہ بھی مٹ گیا
ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

ہے وہی بدمستیٔ ہر ذرّہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

مجھ سے مت کہہ "تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

۱۔ لغات:
غلط بردار کاغذ: وہ کاغذ، جس پر سے کوئی لفظ یا حرف بہ آسانی مٹایا جا سکے اور اس کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔ غالباً یہ اس مسالا لگے ہوئے کاغذ کا نام تھا، جیسا آج کل کاتب کاپیاں لکھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس پر سے بھی حروف چھری یا چاقو دگز (لکھ تصحیح)

آنکھ کی تصویر سرِ نامہ پہ کھینچی ہے کہ تا
تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرت دیدار ہے

کے ذریعے سے بہ آسانی مٹائے جا سکتے ہیں اور کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔

شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

" یہاں ازراہِ ظرافت غلط بردار کے یہ معنی لیے ہیں، جس پر سے حرف غلط خود بخود اڑ جائے۔ کہتا ہے، خط میں صرف ایک جگہ حرف وفا لکھا تھا، سو وہ بھی مٹ گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے خط کا کاغذ غلط بردار ہے کہ جو بات سچے دل سے اس پر نہیں لکھی جاتی، وہ خود بخود مٹ جاتی ہے "۔

محبوب نے خط میں حرفِ وفا لکھا۔ چونکہ وہ محض رسماً لکھ دیا تھا اور خلوص پر مبنی نہ تھا، اس لیے کاغذ نے غلط بردار ہونے کے باعث اسے خود بخود مٹا دیا۔ مراد صرف یہ ہے کہ محبوب کہیں وفا کا ذکر بھی کر دیں تو اسے بے بنیاد سمجھنا چاہیے، کیونکہ اس طبقے سے وفا کی امید ہو ہی نہیں سکتی۔

۲۔ **شرح :** سانس پے در پے آگ برسا رہا ہے، لیکن ہم جیسے تھے ویسے ہی رہے اور جلے نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال دل کی جلن کا باعث ہے، کیونکہ ذوقِ فنا ناتمام کا ناتمام رہا۔ سانس کی آتش باری کے باوجود ہمیں جلا نہ سکا۔ اس مضمون کا ایک شعر پہلے بھی آ چکا ہے :

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار حیف

مولانا طباطبائی نے اس کی سائنٹیفک توجیہ فرمائی ہے، یعنی ہر نفس سینے میں جا کر اشتعال پیدا کرتا ہے اور وہی اشتعال باعثِ حیات ہے، حالاں کہ ہر

اشتغال میں جسم کا اُنس اور بدن کا بیر (جوہر، سَت) فنا ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات صاف نکلی کہ بہ حسب طبیعت و بہ مقتضائے فطرت ہر ذی حیات کو ذوقِ فنا ہے اور وہی اشتغال، جو فنا کرتا ہے، عینِ حیات ہے، لیکن اس ذوقِ فنا کی ناتمامی پر جی جلتا ہے کہ ایک بار جلا کیوں نہیں دیتا۔ جو لوگ مصنف کی سوانح عمری سے واقف ہیں، انھیں حیرت ہو گی کہ ان کو یہ مسئلہ دورانِ خون کہاں سے معلوم ہُوا؟

۳۔ شرح : اگرچہ آگ خاموش ہے اور اسے زبان عطا نہیں ہوئی لیکن جب بجھانے کے لیے اس پر پانی ڈالا جائے تو اس سے ایک صدائے واویلا اٹھتی ہے۔ اس سے یہ نظریہ پیدا ہوا کہ حالتِ درماندگی میں ہر وجود کو نالہ وفغاں کے سوا چارہ نہیں رہتا لفظ "درماندگی" خاص توجہ کا محتاج ہے۔ آگ جل رہی ہو اور اس پر پانی ڈال دیا جائے تو وہ چار و ناچار بجھتی ہے، اس لیے درماندگی پر آہ کرتی ہے۔ نظریے کے لیے جو مثال پیدا کی ہے، وہ یقیناً بے مثال ہے۔

بجنوری فرماتے ہیں :

"کس شاعر نے آج تک آتش کے فرد ہونے کی اس ظاہر اور ادنیٰ کیفیت کو مشاہدہ اور محسوس کیا ہے؟ لفظ "بر کوئی" میں آگ کے طبعاً مغرور اور سرکش ہونے کا اشارہ نہایت خوبی سے مضمر ہے۔"

۴۔ لغات۔ سرشار : لبریز، لبالب، فراواں۔ بعض اصحاب نے اسے مست و بیخود کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے۔ یہاں بظاہر یہی معنی قابلِ ترجیح معلوم ہوتے ہیں۔

شرح : خواجہ حالیؔ فرماتے ہیں :

اس شعر میں دعویٰ ایسے طریق پر کیا گیا ہے کہ خود دعویٰ متضمنِ دلیل واقع ہُوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذراتِ عالم یعنی ممکنات، جو

فی الحقیقت معلوم محض ہیں، ان کی بدمستی و غفلت کا عذر
خواہ وہی ہے، جس کے پرتوِ وجود سے یہ تمام معدومات وجود
کا دم بھرتے ہیں۔"

اس کائنات کی مخلوقات سے بدمستی اور از خود رفتگی میں جو کچھ سرزد ہو رہا ہے، اس کا الزام ان پر عائد نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ تو صرف اعتباری وجود رکھتی ہیں۔ ان کے اندر جان اور حرکت تو اس حقیقی وجود کی وجہ سے ہے، جس کے جلوؤں کی فراوانی زمین و آسمان پر چھائی ہوئی ہے اور کوئی وجود ایسا نہیں، جو اس جلوہ افروزی سے مست و سرشار نہ ہو۔

گویا ذمہ داری اسی حقیقی وجود کی ہے، ان ذرات یا ممکناتِ عالم کی کیا ذمہ داری ہو سکتی ہے، جو صرف اس وجود کے پرتو کی بدولت زندہ ہیں:

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

۵۔ **شرح :** شعر سے بظاہر یہ واضح ہوتا ہے کہ عاشق یعنی مرزا غالب محبوب سے خفا ہو گئے ہیں۔ محبوب انھیں منا رہا ہے۔ باتوں باتوں میں اس نے کہہ دیا: "بھئی! تُو تو ہمیں اپنی زندگی قرار دیا تھا، یعنی یہ کہتا تھا کہ میرے جینے کا مدار تُو ہے۔" یہ خفگی کے عالم میں فرماتے ہیں کہ ایسی بات منہ سے نہ نکالیے، میرا دل ان دنوں زندگی سے بیزار ہے۔ یعنی جب حقیقی چیز سے بیزار ہیں تو اس سے بیزار کیوں نہ ہوں گے، جسے مجازاً زندگی کہتے تھے۔

عشق و محبت میں اس قسم کے معاملات بھی پیش آتے رہتے ہیں اور عین ممکن الوقوع ہیں، لیکن مرزا غالب کے سوا کون ہے، جس نے انھیں ایسے دلکش انداز میں باندھا ہو؟

۶۔ **شرح :** میں نے حنا لکھنے کے مقام پر آنکھ کی تصویر کھینچ دی ہے تاکہ اے محبوب! تجھ پر واضح ہو جائے کہ میری حسرتِ دیدار کا کیا عالم ہے

"کھل جائے" کو سرنامے سے بھی مناسبت ہے اور آنکھ سے بھی۔

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچہ سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

لغات:
پینس: فنس یا چنس یا پالکی۔ ایک سواری جسے کہار اٹھاتے تھے اور عموماً امراء یا عورتوں کے لیے استعمال ہوتی تھی۔

شرح: محبوب پینس میں سوار ہو کر میرے کوچے سے گزرتا ہے تو اتنی تیزی سے نکل جاتا ہے کہ کہاروں کو کندھا بدلنے کا موقع بھی نہیں دیتا۔ مبادا ایک دو لمحے کی دیر ہو جائے اور مرزا غالب گھر سے باہر آ کر اتفاقیہ دیدار کر لیں۔ اس سے محبوب کی انتہائی بے رخی واضح کرنا مقصود ہے۔

مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنّا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

خزاں کیا؟ فصلِ گل کہتے ہیں کسکو؟ کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

وفائے دلبراں ہے اتّفاقی ورنہ اے ہمدم
اثر فریادِ دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

نہ لائے شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنّا ہے

۱۔ لغات:
عنقا: ایک پرندہ جو مشہور بے حد ہے لیکن اس کا وجود کوئی نہیں۔

شرح: محبوب کی تمنّا نے اس درجہ حیرت میں ڈال رکھا ہے، گویا حیرت کی ایک بستی آباد ہو گئی ہے۔ میرا وجود اور

میری ہستی اسی بستی کی فضا ہے۔ تمنا کے لیے آہ و فغاں ضروری ہے، لیکن حیرت کا تقاضا یہ ہے کہ حرکت اور آواز دونوں چیزوں کی نفی ہو جاتے۔ کہتے ہیں کہ جس حد تک نالہ و فریاد کا تعلق ہے، اسے اس فضا کا عنقا سمجھنا چاہیے کہ اس کی شہرت تو ہے، مگر کبھی کسی نے دیکھا نہیں، سراسر معدوم و موہوم ہے۔
صاف الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ تمنا نے سراپا حیرت بنا رکھا ہے اور فریاد و فغاں کوئی نہیں۔

۲ ۔ لغات۔ فصلِ گُل : پھول کھلنے کا موسم۔ موسمِ بہار۔

شرح : ہمیں معلوم نہیں کہ خزاں کیا ہوتی ہے اور بہار کسے کہتے ہیں۔ کوئی بھی موسم ہو، ہماری کیفیت یہ ہے کہ اپنے حال پر قائم ہیں۔ پنجرے میں بند ہیں اور بال و پر کا ماتم کر رہے ہیں :

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :

"اس شعر کی بندش میں یہ حسن ہے کہ چھ جملے دو مصرعوں میں آ گئے اور ادائے معانی میں یہ حسن ہے کہ بلبل کی زبانی شکایتِ اسیری ہے اور شکایت میں اطناب لطف دیتا ہے۔ معنیٔ قلیل کو الفاظ کثیر میں یہاں مصنف نے ادا کیا ہے اور اطناب کا زیادہ لطف اسی میں ہوتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے جملے بہت سے ہوں، نہ یہ کہ ایک طولانی جملہ ہو، گویا اس میں الفاظ زیادہ تر ہوں، مگر اطناب کا لطف نہیں پیدا ہوتا۔"

۳ ۔ شرح : اے ہم نشین! اگر محبوب عاشقوں سے وفا کرتے ہیں اور ان پر مہربان ہوتے ہیں تو اسے ایک اتفاقی خوش نصیبی سمجھنا چاہیے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ دردمندوں کی فریاد کا اثر کس نے دیکھا ہے؟ کون ان کی مہربانی کو آہ و فغاں یا محبت کی تاثیر کا نتیجہ قرار دے سکتا ہے؟ مقصود یہ ہے کہ ہم تاثیر کے قائل نہیں۔

۴۔ **لغات۔ کفِ افسوس ملنا :** افسوس کے عالم میں ہاتھ ملنا جب کوئی شخص افسوس اور پشیمانی کے عالم میں ہو تو طبعاً ہاتھ ملنے لگتا ہے۔
عہدِ تجدیدِ تمنّا : تمنّا تازہ کرنے کا عہد۔ جب کوئی عہد تازہ کیا جاتا ہے تو بیعت کی طرح ہاتھ پہ ہاتھ رکھا جاتا ہے۔ کفِ افسوس ملنے اور تجدیدِ تمنّا کا عہد کرنے کی مناسبت واضح ہے۔

شرح : ہمارے اندیشے کی شوخی ناامیدی اور مایوسی کا رنج برداشت نہ کر سکی۔ مایوسی کے عالم میں ہم نے ہاتھ ملنے شروع کر دیے۔ یہ دراصل مایوسی کا اظہار نہیں، بلکہ ہم تمنّا تازہ کرنے کا عہد باندھ رہے ہیں۔
ہاتھ دونوں صورتوں میں مل جاتے ہیں، افسوس کی صورت میں بھی اور عہد باندھنے کی صورت میں بھی مرزا کی شوخیِ اندیشہ نے افسوس کی کیفیت کو ازسرِنو تمنّا کرنے کی کیفیت سے تعبیر کر دیا۔

رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ کُشتہ ہے
نبضِ بیمارِ وفا دُودِ چراغِ کُشتہ ہے
دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں
ورنہ یاں بے رونقی سودِ چراغِ کُشتہ ہے

۱۔ **لغات۔**
بُود : ہستی۔
چراغِ کُشتہ : بجھا ہوا چراغ۔
بیمارِ وفا : جو شخص وفا کا بیمار ہو، جیسے بیمارِ محبت۔ جسے کوئی چیز راہِ وفا سے ہٹا نہ سکے، عاشقِ صادق و جانباز۔

شرح : اے ظالم محبوب! میں عشق میں بجھے ہوئے چراغ کی صورت اختیار کر گیا ہوں۔ تُو خود سوچ، بجھے ہوئے چراغ کی ہستی ہی کیا ہوتی ہے؟ سچے اور جانباز عاشق کی نبض وہی حیثیت رکھتی، جو بجھے ہوئے چراغ سے اٹھنے

والے دھوئیں کی ہوتی ہے کہ اُٹھا اور ختم ہو گیا۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :

"نبض کو دودِ چراغ کشتہ سے تشبیہ متحرک با متحرک ہے اور وجہ شبہ میں حرکت ہے یعنی سرد ہونا، کمزور ہونا، بتدریج کمزور ہوتے جانا وغیرہ جتنے یہ سب صفات بجھے ہوئے چراغ کے دھوئیں میں ہیں، وہ سب دم نکلتے وقت نبضِ بیمار میں ہوتے ہیں۔ انصاف یہ ہے کہ متحرک کی تشبیہ میں مصنّف کو ید طُولیٰ ہے۔

اطبا اس وقت کی نبض کو دودی کہتے ہیں، یعنی کیڑے کے رینگنے سے تشبیہ دیتے ہیں کہ عربی میں دود کیڑے کو کہتے ہیں۔

دونوں تشبیہوں کے مقابلے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف کی تشبیہ اس سے زیادہ ترجیح ہے۔"

۲۔ شرح : ہر شخص کا مشاہدہ ہے کہ شمع ہو یا چراغ، ان کے لیے روشن ہونا اور جلنا نقصان کا باعث ہے، کیونکہ جلنے سے شمع گھل گھل کر ختم ہوتی جائے گی۔ چراغ کا تیل اور فتیلہ دونوں کم ہوں گے۔ لیکن ان کی رونق روشن رہنے اور جلنے ہی سے ہے اگر انھیں جلایا نہ جائے تو بالکل بے رونق رہیں گے گویا روشن نہ ہونا اور بے رونق رہنا شمع و چراغ کے لیے نفع بخش ہے یہی کیفیت ہماری ہے۔ ہم بھی بے رونقی قبول کر لیں اور عشق کے چکر سے نکل جائیں تو اس میں ہمارا نفع ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ہمیں کہیں نہ کہیں دل لگا لینے کی آرزو بے چین رکھتی ہے۔ یہی بے چینی ہمارے لیے نقصان کا باعث ہے۔

غرض انسان میں دل لگا لینے کی جو فطری تڑپ موجود ہے، اس کی حیثیت وہی ہے، جو شمع و چراغ کے روشن ہونے کی ہے۔ انسانی زندگی کی رونق

اسی تڑپ سے ہے، جس طرح شمع و چراغ کی رونق ان کی روشنی سے ہے۔ روشنی شمع و چراغ کو رفتہ رفتہ فنا کے گھاٹ اُتار دیتی ہے۔ اسی طرح انسان کے لیے عشق کی تڑپ پیغامِ اجل بن جاتی ہے۔

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سُرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

پیکرِ عشاق، سازِ طالعِ ناساز ہے
نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے

دست گاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے

۱۔ لغات۔

نوا پرداز:۔ بولنے والا، باتیں کرنے والا۔

شعلۂ آواز: آواز کا شعلہ۔ اس سے مراد وہ پُرسوز آواز ہے، جو دلوں میں اثر کر جائے۔

شرح:

حسینوں کی آنکھ خاموشی میں بھی بڑی دل پذیر باتیں کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے ہر لحظہ ایسے عشوے اور اشارے ہوتے رہتے ہیں، جو دلوں میں اُتر جاتے ہیں اور عاشقوں کے لیے ان میں باتوں سے بدرجہا زیادہ دلآویزی ہوتی ہے۔ پھر وہ آنکھوں میں سرمہ لگا لیتے ہیں۔ یہ سرمہ گویا آواز کے شعلے کا دھُواں بن جاتا ہے۔

سرمے کی خاصیت یہ ہے کہ اس کے کھانے سے آواز بیٹھ جاتی ہے، لیکن حسینوں کی آنکھ کے سرمے کو ان کی دلآویز گفتگو کے شعلے کا دھوآں سمجھنا چاہیے۔

۲۔ لغات۔ طالعِ ناساز: ناسازگار قسمت۔ بدنصیبی۔

گردشِ سیارہ : ستارے کی گردش یعنی قسمت کا پلٹا۔

شرح : عاشقوں کا وجود ہی تقدیر کی ناسازگاری اور بدنصیبی کا ساز ہے اور جو وہ فریاد وفغاں کرتے ہیں، اسے ستارے کے پلٹا کھا جانے کی آواز سمجھنا چاہیے۔

مطلب یہ کہ عاشق بہرحال سیاہ بخت ہیں اور تقدیر ان کا ساتھ نہیں دیتی، ہمیشہ خلاف رہتی ہے۔ پیکر، ساز، ناساز، نالہ، گردشِ سیارہ، آواز کی مناسبت محتاجِ تشریح نہیں۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ عشاق بھی ساز کے ضلع کا لفظ ہے، کیونکہ اہلِ فارس کی موسیقی میں مقامِ عشاق ایک راگ کا نام ہے۔

۳۔ **لغات**۔ **دستگاہ :** قوت، قدرت، مہارت، طاقت، دسترس۔

یک بیاباں جلوۂ گل : پھولوں کی انتہائی کثرت۔

فرشِ پا انداز : وہ فرش یا ٹاٹ، جو جوتوں کی گرد صاف کرنے کے لیے کمرے کی بیرونی چوکھٹ سے ملا کر بچھا دیتے ہیں۔

شرح : دیکھیے، مجنوں کی لہو رونے والی آنکھ کی قدرت و دسترس کا کیا عالم ہے! نجد کے صحرا میں پھولوں کی کثرت اس پیمانے پر پہنچ گئی ہے کہ پھول ہی فرشِ پا انداز کا کام دے رہے ہیں۔

دستگاہ، دیدۂ خونبار، یک بیاباں جلوۂ گل، فرشِ پا انداز کی مناسبت واضح ہے۔

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی — میری وحشت تری شہرت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی ‌‌ ‌ لے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے ‌ ‌ غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو ‌ ‌ آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام ‌ ‌ دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں ‌ ‌ نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف ‌ ‌ آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے ‌ ‌ بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ ‌ ‌ گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

۱۔ **شرح** : محبوب عاشق کے بیتابانہ اظہارِ عشق پر کہتا ہے کہ یہ عشق ہے؟ یہ تو وحشت و دیوانگی ہے۔ عاشق جواب دیتا ہے۔ " بہتر! وحشت و دیوانگی ہی سہی اور میری دیوانگی بہر حال آپ کی شہرت کا باعث ہوگی۔

۲۔ **شرح** : یہ مضمون مرزا غالبؔ کا خاص ہے اور ایک سے زیادہ شعروں میں مختلف انداز میں کے ساتھ آچکا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر محبوب التفات کے بجائے دشمنی سے کام لے تو یہ بھی تعلق کی ایک صورت ہے اس لیے محبوب سے التجا کرتے ہیں کہ آپ ہم سے رشتۂ تعلق نہ توڑیں، اور کچھ نہیں تو دشمنی ہی قائم رکھیں۔

اس مضمون کے بعض دوسرے اشعار ملاحظہ فرمایئے:

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ، عداوت ہی کیوں نہ ہو
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمن اربابِ وفا ہو جانا

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :

" معاملاتِ عاشقانہ میں یہ مضمون بھی مصنّف کے حصّے کا ہے ۔ خوب خوب اسے نظم کیا ہے اور جہاں نظم کیا ہے، نئے انداز سے باندھا ہے ۔"

۳ ۔ **شرح** : محبوب سے پوچھتے ہیں کہ آپ فرمائیں، میرا موجود ہونا آپ پر کیوں گراں گزرتا ہے ؟ اس میں آپ کی کیا رسوائی ہے ؟ اگر مجلس میں میرے حاضر ہونے سے آپ کو یہ خیال ہو کہ لوگوں کی انگلیاں میری طرف اُٹھیں گی اور اس طرح آپ کی بدنامی ہو گی تو میں مجلس سے درگزرا تنہائی میں بُلا لیجیے ۔

شعر کی خوبی یہ ہے کہ جس ملاقات کو بدرجۂ تنزل قبول کرتے ہیں، وہ معاملاتِ عاشقانہ میں آرزو کی آخری منزل ہے ۔

۴ ۔ **شرح** : اگر غیر کو تجھ سے محبت ہے تو ہو، ہم بھی تو اپنے دشمن نہیں ۔

شاعر کا مقصود یہ ہے کہ محبوب سے محبت نہ کرنا اپنے سے دشمنی ہے لہٰذا وہ کہتا ہے کہ ہم اپنے دشمن نہیں گویا اگر تو سمجھتا ہے کہ غیر کو تجھ سے محبت ہے تو ہماری محبت کا بھی یقین ہونا چاہیے، کیونکہ اگر تجھ سے محبت نہ کی جائے تو وہ اپنے سے دشمنی ہو گی ۔

جن اصحاب نے اس شعر کا مطلب یہ سمجھا کہ اگر تجھے غیر کی محبت کا یقین ہو گیا ہے تو ہم تجھ سے محبت کر کے اپنے ساتھ دشمنی کیوں کریں ۔

انھوں نے مرزا کے اسلوب بیان پر پورا غور نہیں کیا اور دوسرے مصرع کا مفہوم بھی ٹھیک ٹھیک ذہن نشین نہیں فرمایا۔ ان کا بیان کردہ مفہوم آداب عشق کے اعتبار سے سراسر نازیبا ہے اور مرزا غالب سے ایسا مفہوم منسوب ہی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عشق نہیں، بلکہ ایک عام بازاری جنس ہے کہ ایک دکان سے نہ ملی، دوسری سے لے لی۔

۵۔ شرح: اس دنیا کے تعلق میں انسان کے لیے روش کی دو صورتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ مختلف اشیاء سے کچھ حاصل کیا جائے، دوم یہ کہ ان سے غفلت اور بے پروائی اختیار کر لی جائے۔ مرزا کہتے ہیں کہ انسان کو اپنی ذات کے سوا کسی کا خیال تک دل میں نہ لانا چاہیے۔ اگر آگاہی مقصود ہے، حقیقت مخفی منظور ہے تو وہ بھی اپنی ہی ذات سے ہو۔ اگر غفلت و بے پروائی اختیار کرنی ہے تو وہ بھی اپنی ہی ذات سے کرنی چاہیے۔

تصوّف کا بہت بڑا مسئلہ ہے، جو مرزا نے ان چند الفاظ میں پیش کر دیا ہے اور الفاظ نہایت موزوں ہیں۔ اپنی ذات سے آگاہی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی حقیقت سے آشنا ہو جائے، سمجھ لے کہ وہ بندہ ہے اور دنیا میں اس کے پیدا کرنے کا ایک خاص مقصد و نصب العین ہے، جو پورا ہونا چاہیے اور یہ نصب العین خالق کا مقرر کیا ہوا ہے۔

وما خلقت الجن والانس	اور میں نے جنوں اور انسانوں
الّا لیعبدون	کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ
	وہ میری عبادت کریں۔

عبادت سے مقصود احکام الٰہی کی پیروی ہے۔ اسی طرح اصل مقصد پورا ہوتا ہے۔

ایک روایت مشہور ہے، جسے حدیث بتایا جاتا ہے، اگرچہ انتساب صحیح نہیں یعنی:

من عرف نفسہ فقد عرف ربہٗ — جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے اپنے پروردگار کو پہچان لیا۔

یہ اپنی ذات سے آگاہی ہے۔

غفلت و بے پروائی یہ ہے کہ اپنے آپ کو بالکل بے وجود اور نیست سمجھے۔ اس کا نتیجہ بھی خدا کو وجودِ حقیقی ماننے کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ گویا اپنی ذات کے متعلق آگاہی اور غفلت دونوں صورتیں اختیار کرنا انسان کو اس منزل پر پہنچا دیتا ہے کہ اس کے نزدیک خدا کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔

مولانا طباطبائی کیا خوب فرماتے ہیں:

"اس شعر کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ حق یہ ہے کہ مشائخ طریقت جن کا کلام ترجمانِ حقیقت ہوا کرتا ہے ان کے دیوان بھی آج اس شعر کی نظیر سے خالی ہیں۔"

۲۔ **لغات**۔ برق خرام: بجلی کی طرح تیز رفتار۔

شرح: ہم نے مانا کہ عمر بجلی کی طرح تیز رفتار ہے یعنی ادھر آئی اور اُدھر گئی، چمکی اور ناپید ہو گئی۔ گویا فرصت اتنی کم ہے کہ کوئی خاص کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔ چلو اور کچھ نہیں ہو سکتا تو اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر دل ہی کو خون کر لینا چاہیے۔

اکثر لوگ اس وہم میں مبتلا رہتے ہیں کہ عمر کی مہلت بے حد قلیل ہے، کریں تو کیا کریں۔ مرزا فرماتے ہیں کہ اگر اس فرصت کو چشمک برق بھی تصور کر لیا جائے تو مضائقہ نہیں۔ مگر کچھ کرنے سے باز نہ رہنا چاہیے۔ مرزا کے نزدیک سب سے اہم اور ضروری کام یہ ہے کہ دل کو خون کر لیا جائے۔ یقیناً یہی زندگی کا دیپاترین کام ہے۔ دل کے خون کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ وجودِ حقیقی سے سچا عشق پیدا کیا جائے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں: "وجہِ مناسبت یہ کہ برق بھی تو خونِ رگِ ابر ہے"

۷۔ شرح : ہم نے عشق کیا۔ اگر تکلیفوں اور سختیوں کی فراوانی کے باعث عشق مصیبت بن گیا تو کچھ پروا نہیں، ہم صبر و سکون سے ہر آفت اور ہر مصیبت برداشت کریں گے۔ لیکن ترکِ وفا پر کبھی آمادہ نہ ہوں گے۔

۸۔ شرح : اے ناانصاف آسمان! میں یہ نہیں کہتا کہ وہی مجھے دے، جس کی آرزو ہے۔ فریاد و فغاں کی مہلت ہی دے دے۔

شعر میں جو کیفیت بیان کی گئی ہے، اسے سادہ الفاظ میں پیش کرنا سہل نہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک مصیبت زدہ شخص ایک ایک آرزو اور مراد کے لیے کوششیں کر چکا ہے، مگر ناکامی کے سوا کچھ اس کے ہاتھ نہیں آیا۔ انتہائی یاس و ناامیدی کی حالت میں وہ کہتا ہے کہ اے آسمان! اگر تو کوئی مراد پوری نہیں کرتا تو اتنی ہی رخصت دے دے کہ میں اپنی حالت پر رو پیٹ لیا کروں۔

لفظ "ناانصاف" سے واضح ہے کہ آسمان نے شاعر کی کوئی بھی مراد بر نہ آنے دی اور اتنی بے انصافی کی کہ اسے فریاد و فغاں کا بھی موقع نہ دیا گیا اور وہ بیچارگی کے عالم میں اور کچھ نہیں مانگتا، صرف رونے پیٹنے کی اجازت مانگتا ہے۔ یہ آسمان کی ناانصافی اور شاعر کی مایوسی و نامرادی کی انتہا ہے۔ آسمان کے ہاتھوں وہ اتنا تنگ ہے کہ رونے پیٹنے کو بھی ایک نعمت سمجھ کر آسمان سے طلب کرتا ہے۔

جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

۹۔ شرح : ہم نے مانا کہ بے نیازی تیری عادت ہے۔ تو کسی مسکین کی حالت پر متوجہ نہیں ہوتا اور تیرا عام شیوہ ہی یہ ہے کہ ہر ایک سے بے پروائی اختیار کیے رہے۔ اگر حقیقت یہی ہے تو ہم بھی رفتہ رفتہ تسلیم کی خو پیدا کریں گے اور تیری بے نیازی کو برداشت کرنے کے عادی بن جائیں گے۔

"خو ڈالیں گے" سے واضح ہوتا ہے کہ ابھی طبیعت برداشت کی عادی

نہیں، رفتہ رفتہ اسے قابو میں لاکر عادی بنا ئیں گے۔

۱۰۔ **شرح** : میر غلام حسین قدرؔ بلگرامی نے یہی شعر، نیز ناسخؔ کا ایک شعر مرزا غالبؔ کی خدمت میں پیش کر کے پوچھا تھا کہ "سہی" اور "تو سہی" کا ترجمہ فارسی لغت میں کیا آیا ہے۔ جواب میں مرزا فرماتے ہیں!

"اسماء کے واسطے یا لغات کے واسطے یہ بات ہے کہ عربی میں یہ کہتے ہیں اور فارسی میں یہ اور ہندی میں ہے۔ طرزِ گفتار ہندی کی فارسی یا فارسی کی ہندی کبھی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً "چوری کا گُڑ میٹھا" اس کی فارسی نہ پوچھیے گا، مگر نادان۔ "سہی" اور "تو سہی" کی فارسی کیونکر بنے؟ یہ روزمرّہ کی اُردو ہے۔

گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

اس مطلب کے مطابق فارسی عبارت یوں ہو سکتی ہے: "وصل اگر نیست، حسرت نیز عالمے دارد۔"

شعر کا مطلب یہ ہے کہ اے اسدؔ! محبوب سے چھیڑ کا سلسلہ برابر قائم رہنا چاہیے۔ اگر وصل میسّر نہیں آتا تو مضائقہ نہیں، وصل کی حسرت کا اظہار ہی کرتے رہنا چاہیے۔

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے
ڈھونڈے ہے اس مغنیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

۱۔ **لغات**۔ آرمیدگی: آرام پانا، راحت طلبی۔
نکوہش: ملامت، سرزنش
شرح: میں صحرا گردی اور دشت نوردی چھوڑ کر راحت کی غرض سے

گھر آبیٹھا تو بیشک میں ملامت و سرزنش کا سزاوار ہوں۔ میرے گھر یعنی وطن کی صبح میرے لیے دنداں نما خندہ بنی ہوئی ہے تو یہ ہرگز بےجا نہیں بلکہ بالکل بجا ہے۔

مقصود یہ ہے کہ عشق میں راحت و آرام کا شائبہ بھی کسی کے لیے زیبا نہیں۔ اگر کوئی راحت طلبی پر مائل ہو تو ماحول کی ہر چیز اس کے لیے پیغامِ ملامت بن جائے گی۔

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدّعا مجھے

کرتا ہے بس کہ باغ میں تو بےحجابیاں
آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

۲۔ **لغات**۔ مغنّی: گانے والا۔
آتش نفس: جس کا دم آگ اُگلے، جس کی آواز سوز و گداز سے بھری ہوئی ہو۔

شرح: دل ایسے گانے والے کا طلبگار ہے، جس کی آواز سوز و گداز سے اس طرح لبریز ہو کہ میرے لیے فنا کی بجلی کا جلوہ بن جائے، یعنی میں ایسے سماع کا خواہاں ہوں، جو مجھے جلا کر فنا کر دے۔

۳۔ **لغات**۔ **بازگشت**: واپسی، مراجعت، لوٹنا۔

شرح: میں خیال کی وادی مستی و بیخودی کے عالم میں طے کرتا ہوں تاکہ لوٹنے سے مجھے کوئی غرض نہ رہے۔

انسان جو راستہ ہوشمندی کے عالم میں چوکس رہ کر طے کرے، اس کے نشیب و فراز، موڑوں اور مختلف منزلوں کے خاص نشانوں کی یاد دل میں باقی رہ جاتی ہے، لیکن جو راستہ بیخودی اور مدہوشی میں طے ہو، اس کے متعلق کچھ

خیال نہیں رہ سکتا۔ مرزا بھی خیال کی وادی اسی انداز میں طے کرتے ہیں کہ واپس نہ آئیں۔ مطلب یہ کہ ہر وقت خیال میں غرق رہتے ہیں۔

۴۔ شرح : تو نے باغ میں ایسی بے حجابیاں شروع کر دی ہیں کہ مجھے پھولوں کی خوشبو سے شرم آنے لگی ہے۔

شرم کی وجہ یہ کہ میرے نزدیک تو نکہتِ گُل ہی بے حجاب تھی کہ ذرا ہَوا کی لہر اٹھی اور وہ پھول کا پردہ چاک کر کے بے اختیار نکل پڑی، لیکن اے محبوب! تیری بے حجابیاں اس پیمانے پر پہنچ گئی ہیں کہ میں جو پھول کی خوشبو کو بے حجابی کے طعنے دیا کرتا تھا، اب شرم کے مارے اس کے آگے آنکھ نہیں اٹھا سکتا۔

۵۔ شرح : میرے دل کی حقیقی کیفیت کسی پر ٹھیک ٹھیک آشکارا نہیں ہو سکتی تھی۔ مصیبت یہ پیش آئی کہ میں نے اپنے مطلب کے شعر چُن چُن کر جو مجموعہ تیار کیا، اس نے میرا راز فاش کر دیا۔

شاعر کا مقصود یہ ہے کہ انسان کے دل کی جو حالت ہو، اسی کی مناسبت سے وہ اشعار کا انتخاب کرتا ہے۔ یہی انتخاب دوسروں کے لیے اس کی اصل کیفیت معلوم کر لینے کی کلید بن جاتا ہے۔ اگر اپنے مطلب کے شعر نہ چنے ہوتے تو رسوائی کی نوبت نہ آتی

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

شرح : جب ہماری زندگی انتہائی بری حالت میں گزری تو ہم کیا یاد کریں گے کہ ہمارا بھی کوئی خدا تھا۔

دوسرا مصرع پورے کا پورا ایک کہاوت ہے، جو حسن و خوبی سے نظم کر دی

گئی ہے۔ فارسی میں یہی مضمون یوں باندھا ہے :

گفتنی نیست کہ برغالب ناکام چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

مرزا تفتہ کو ۱۸۔ جولائی ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں فرماتے ہیں کہ اپنے کہے ہوئے تمام اشعار بھول گیا، صرف ڈیڑھ شعر یاد رہ گیا، ایک مقطع یعنی :

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ!
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

دس پانچ بار یہ پڑھ لیتا ہوں، پھر جب سخت گھبراتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں کہ :

اے مرگِ ناگہاں! تجھے کیا انتظار ہے؟

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہُوا کیے

۱۔ شرح : محبوب کی بزم میں غیرت اور حیاداری سے کام لیا جائے تو گزارہ نہیں ہو سکتا اور بے حیا بنے بغیر چارہ نہیں۔ چنانچہ میں اس کی محفل میں گیا، اگرچہ لوگ اشارے کرتے اور آوازے کستے رہے، لیکن میں ان سے بے پروا ہو کر بیٹھا رہا۔ پروا کرتا تو اٹھنا پڑتا اور یہ گوارا نہیں ہو سکتا تھا۔

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے
مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ او لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے
کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو؟
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے؟
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خُو
دینے لگا ہے بوسے بغیر التجا کیے؛
ضد کی ہے اور بات مگر خُو بُری نہیں
بھُولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے
غالب تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا؛
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

۲۔ لغات:
سیاستِ دربان: چوکیدار کی طرف سے بازپرس، دار و گیر اور ڈانٹ ڈپٹ۔
شرح: دل ہی تو ہے، جو دربان کی دار و گیر اور پکڑ دھکڑ سے ڈر گیا، ورنہ کیا یہ ممکن تھا کہ میں آپ کے دروازے پر پہنچوں اور صدا لگائے بغیر وہاں سے گزر جاؤں؟
"دل ہی تو ہے" کے دو پہلو ہیں، اوّل یہ کہ وہ حساس ہے، اچھی چیز کی طرف لپکتا ہے، ضرر رساں چیز سے دور بھاگتا ہے۔ وہ چوکیدار کی تعزیر سے ڈر گیا۔ دوم یہ کہ دل میرے قابو سے باہر ہے۔ مجھے اس پر کوئی اختیار نہیں۔ لہذا دل کی وجہ سے مجھے چپ چاپ نکل جانا پڑا۔

۳۔ لغات۔ خرقہ: گدڑی، جو فقراء کا خاص لباس سمجھی جاتی ہے۔
سجّادہ: جس پر سجدہ کیا جائے۔ جائے نماز۔
آب و ہوا: یہاں اس سے مراد فصلِ بہار ہے۔
شرح: میں اب خرقہ اور مُصلّا شراب خریدنے کی غرض سے گرو رکھنے کے لیے کوشاں ہوں، کیونکہ مدّت گزر گئی۔ میں نے فصل بہار کی دعوت

کا اہتمام نہیں کیا۔

فصل بہار کی دعوت کا مطلب یہ ہے کہ اس خوشگوار موسم میں ناو نوش کا لطف نہیں اٹھایا۔ خرقہ وسجادہ دونوں کو شراب کے لیے گرو رکھنے کی ضرورت غالباً اس لیے پیش آئی کہ خاصی مقدار بہم پہنچ سکے تاکہ جی بھر کر پی سکیں۔ اگرچہ میرزا غالب کے نزدیک ان سے بڑی چیزیں بھی کوئی زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں، کیونکہ فرماتے ہیں:

از فرنگ آمدہ در شہر فراواں شدہ است
جرعہ را دیں عوض آریدئے ارزاں شدہ است

۴۔ لغات۔ بے صرفہ: بے فائدہ، بے سود، بے نتیجہ۔

شرح: عمر کتنی ہی لمبی ہو جائے، آخر بے سود اور بے فائدہ ہی گزر جاتی ہے۔ دنیا داری کے جنجال اتنا موقع ہی نہیں دیتے کہ عام انسان کوئی شایاں کام انجام دے سکیں۔ مثلاً حضرت خضرؑ ہی کی مثال لے لیجیے جن کی عمر عام روایت کے مطابق نہایت لمبی ہوئی، بلکہ اب تک زندہ ہیں۔ وہ بھی کل یعنی قیامت کے دن کیا فرمائیں گے کہ ہم کیا کچھ کرتے رہے۔

مقصود خدانخواستہ یہ نہیں کہ حضرت خضرؑ کو ہدفِ طعن بنایا جائے بلکہ طویل عمر کی ایک مثال پیش نظر رکھ لی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں بے شمار ایسے انسان ہیں، جنھیں زندگی کی خاصی مہلت ملتی ہے، مگر ان سے اپنی ذات کے لیے تگ ودَو کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور وہ شاذ ہی کوئی ایسا کام انجام دیتے ہیں، جو خلقِ خدا کے نقطۂ نگاہ سے مفید و شایاں ہو۔

۵۔ لغات۔ لئیم: کنجوس۔ بخیل۔

شرح: اگر ممکن ہو اور میں دسترس پاؤں تو زمین سے پوچھوں کہ اے نامراد کنجوس! جو بیش بہا خزانے تیرے حوالے ہوئے تھے اور تیری تہ میں پہنچ گئے، وہ کہاں گئے اور ان کا کیا بنا؟

مطلب یہ ہے کہ بے شمار گراں قدر ہستیاں یہاں رونما ہوئیں۔ انھوں نے قابل قدر کارنامے انجام دیے اور مرکر تجھ میں دفن ہوگئیں اور اب ان کا کوئی پتا نہیں چلتا۔ زمین سے پوچھتے ہیں کہ تُو نے ان سے کیا برتاؤ کیا؟

۶۔ **شرح:** کون سے دن رقیبوں اور مخالفوں نے ہم پر تہمتیں نہ تراشیں اور کون سے دن ہمارے سر پر آرے نہ چلے، یعنی ہمیں انتہائی دکھ نہ دیے گئے؟

"تراشنے" اور "آرے چلنے" کی مناسبت واضح ہے۔

۷۔ **شرح:** محبوب نے وصل میں خاص التفات سے کام لیا۔ تو عاشق کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوگیا کہ پہلے تو یہ حالت نہ تھی اور بدگمانی کی بنا پر سمجھ لیا کہ کہیں رقیب کی صحبت میں یہ عادت نہ پڑ گئی ہو۔

مشہور ہے:

عشق است و ہزار بدگمانی

عاشق بے التفاتی پر فریاد و فغاں کرتا ہے، لیکن محبوب کی طرف سے التفات ہو تو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ عادت غیر سے اختلاط کے باعث نہ پیدا ہوگئی ہو۔

۸۔ **شرح:** میرے محبوب کی عادت یقیناً بری نہیں، البتہ کبھی ضد پر آجائے تو جو کچھ کرنا چاہیے، نہیں کرتا۔ چنانچہ جب کبھی وہ ضد بھول گیا تو ایک دو نہیں، اس نے سیکڑوں وعدے پورے کردیے۔

احتیاط دیکھیے کہ خوے محبوب کے بارے میں اثبات نہیں، نفی کا پہلو اختیار کیا، یعنی یہ نہیں کہا کہ خُو اچھی ہے، یہی کہا کہ بُری نہیں۔ مرزا کے کلام کی یہی باریکیاں اور نزاکتیں ہیں، جو کسی دوسری جگہ عموماً نظر نہیں آئیں۔

۹۔ **شرح:** اے غالب! تم جو اپنا حال سنانے اور اظہارِ عشق کرنے کی غرض سے محبوب کے پاس جاتے ہو، خود ہی بتاؤ کہ تمھاری داستان

سرائی کا جواب کیا ملے گی؟ ہم کہتے ہیں کہ اچھا، تم نے سب کچھ کہہ دیا اور محبوب نے سُن لیا، لیکن اس سے نتیجہ کیا نکلے گا؟

یہ سب کچھ ایک ہمدرد ناصح مرزا کو سمجھا رہا ہے، گویا اظہارِ عشق کا قصد دیکھ کر سمجھ گیا ہے کہ غالبؔ دیوانہ ہو رہا ہے۔ وہ اُس کے سامنے اظہارِ عشق کرنے چلا ہے، جہاں اس کے پہنچنے کا بھی کوئی امکان نہیں۔ پھر پوری بات سُن لینے اور اسے مان لینے کا کون سا امکان ہے؟

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار سے
بالِ تذرو جلوۂ موجِ شراب ہے

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

جادادِ بادہ نوشیٔ رنداں ہے شش جہت
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حُسن کا
جوشِ بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے

۱۔ شرح: عمر کی رفتار پر نظر ڈالی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم حالتِ اضطراب میں کٹنے والے راستے پر جا رہے ہیں۔ سال کے حساب کی صورت یہ ہے کہ آفتاب بارہ منزلیں طے کرے تو سمجھتے ہیں کہ ایک سال ہو گیا اور معلوم ہے کہ شمسی سال تین سو پینسٹھ دن پانچ گھنٹے، اٹھائیس منٹ اور ساڑھے سینتالیس سکنڈ کا ہوتا ہے۔ گھنٹوں ہی کی گنتی پوری کرنے کے لیے چوتھے سال فروری کے مہینے میں ایک دن بڑھا دیتے ہیں، جسے لوند

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے
گزرا اسدؔ مسرتِ پیغام یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

کا دن کہتے ہیں۔ مرزا فرماتے ہیں کہ جس طرح سال کا حساب سورج کی بنا پر کیا جاتا ہے اسی طرح عمر کا حساب مطلوب ہر تو برق کی بنا پر کیا جاتا ہے۔

مقصود یہ کہ عمر بجلی کی طرح تیز رفتار ہے اور زندگی کی منزل طے کرنے کی وہی صورت ہے، جیسے کوئی مسافت حالتِ اضطراب میں طے کی جائے۔
"تیزی"، "رفتار"، "اضطراب" اور "برق" کی مناسبت محتاجِ تشریح نہیں۔

۲۔ **لغات۔ تَذَرْو** : ایک خوش رنگ اور خوش رفتار پرندہ، جو استر آباد کے جنگل میں بہ کثرت ہوتا ہے۔ محققین کے نزدیک ذال ہی سے صحیح ہے۔ فاختہ اور قمری کی طرح شعرا تذرو کو بھی سرو کا عاشق قرار دیتے ہیں۔

شرح : شراب کی صراحی بہار کی شادمانی کے جوش میں سرو کی شکل اختیار کر گئی ہے یا یوں سمجھیے کہ بہار نے ہر شے پر عیش و نشاط کی ایسی کیفیت طاری کر دی ہے کہ شراب کی صراحی سرو بن گئی ہے۔ اسی طرح تذرو کے بال و پر موجِ شراب کا جلوہ معلوم ہوتے ہیں۔
شعر میں بہار کا نقشہ دلکش انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۳۔ **لغات۔ پاشنہ** : ایڑی۔
گوں : طاقت، ہمت۔
اقامت : قائم رہنا، برجا رہنا، ٹھہرنا۔

شرح : اپنی جگہ کھڑا رہنے سے پاؤں کی ایڑی ہی زخمی ہو گئی اب نہ بھاگنے کی ہمت و قوت ہے، نہ ٹھہرے رہنے کی طاقت ہے کیونکہ

قیام و فرار کا انحصار ایڑیوں ہی کی سلامتی پر ہے۔

میدانِ جنگ میں دو ہی صورتیں پیش آ سکتی ہیں۔ یا انسان ہمت و جرأت سے کام لے کر ثابت قدمی دکھائے یا نامرد بن کر بھاگ جائے، لیکن جس شخص کے پائے ثبات کی ایڑی زخمی ہو جائے، وہ دونوں میں سے کوئی بھی کام انجام نہیں دے سکتا اور گر جاتا ہے۔ اسی حالت اضطرار کا نقشہ مرزا نے اس شعر میں کھینچا ہے۔

مرزا نے اس سے ملتا جلتا ایک اور بھی شعر کہا ہے:

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے، نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

۴۔ **لغات** ۔ جادا د: جائداد، ملکیت

شش جہت: چھ طرفین، یعنی دنیا یا کائنات۔

شرح: یہ پوری کائنات رندوں کی شراب نوشی کے لیے جاگیر ہے۔ جسے حقیقت کا کوئی احساس نہیں، وہ سمجھ بیٹھا ہے کہ یہ جہان بالکل ویران و تباہ حال ہے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں:

"بادہ سے عرفان اور رند سے عارف مراد ہے اور عالم کے خراب و ویران ہونے سے مطلب یہ ہے کہ جو شخص جلوۂ حقیقت سے غافل ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اس کا کوئی صانع اور مدبّر نہیں۔"

یعنی ساری کائنات عارفوں کے نزدیک معرفت کی ایک جلوہ گاہ ہے اس کی ہر شے سے حقیقت شناس دل یہ سبق لیتے ہیں کہ اس کے پس پردہ ایک عظیم القدر صانع کی تدبیر و کارفرمائی جاری ہے۔ جو لوگ عرفان کا ذوق نہیں رکھتے، وہ سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا ابتر، بے ترتیب اور بے سر و پا

سی ہے، جس کی کوئی کل سیدھی نہیں۔

متصوفانہ نقطۂ نگاہ کے علاوہ بھی شعر بدیہی حقیقتوں کا حامل ہے۔ مرزا یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اس کائنات میں کوئی بھی شے ایسی نہیں، جو کوئی نہ کوئی مقصد پورا نہ کر رہی ہو۔ حقیقت شناس لوگ ہر شے سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں اور رفتہ رفتہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتے کرتے انسان زمین سے ستاروں کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے، لیکن جن لوگوں کو حقائق کا کوئی احساس نہ ہو سکا اور غافل رہے، وہ اتنے ہی پر قانع رہے کہ دنیا کو بے حقیقت اور ناقابلِ توجہ قرار دے کر اس سے دُور بھاگنے کی تلقین فرماتے رہے۔

۵۔ **شرح** : نظارہ اس برقِ حسن کے جلوے کا کیونکر متحمل ہو سکتا ہے، جس کے لیے فصلِ بہار کا جوش پردے کا کام دے رہا ہے۔

مولانا طباطبائی جوشِ بہار کو عالمِ اجسام کے ظہور سے تعبیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں، 'یہ ظہور حسن شاہدِ حقیقی کے لیے حفاظت کا باعث ہے' اسے نظر کیونکر دیکھ سکتی ہے؟ نظر جب پڑے گی، نقاب ہی پر پڑے گی، یعنی آنکھ جب دیکھے گی، اجسام ہی کو دیکھے گی۔

مرزا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جوشِ بہار کی گلکاریوں اور طراوت افزائیوں کا نظارہ آسان نہیں، حالاں کہ جوشِ بہار حسنِ حقیقی کا ایک نقاب ہے۔ اس صورت میں کوئی اصل حسن کی تاب کیا لا سکتا ہے۔

۶۔ **شرح** : میں نے مانا کہ نگاہیں تیرے رخِ انور پر پڑ رہی ہیں لیکن اس نامراد دل کو کیونکر تسلی دوں؟ وہ محض دیدار سے مطمئن نہیں ہو سکتا، اس کے لیے کچھ اور چاہیے، جس کی تعبیر مولانا طباطبائی نے "سینہ بہ سینہ" ہونے سے کی ہے۔

۷۔ **شرح** : اسد یعنی غالب نے محبوب کے پیغام کی خوشی قربان کر دی اور یہ رشک برداشت نہ کر سکا کہ قاصد اس کے پاس جائے، بات چیت کرے

پھر پیغام لائے۔

محبوب کا پیغام عاشق کے لیے ہمیشہ انتہائی مسرت کا باعث ہوتا ہے، لیکن مرزا کو یہ منظور نہ ہُوا کہ قاصد پیغام لینے کے لیے جائے اور محبوب سے ہم کلام ہو۔ اس رشک کے باعث پیغام وصول کرنے کی خوشی سے دست برداری اختیار کر لی۔

۱۔ شرح: مرزا نے رشک کے عجیب و غریب پہلو پیدا کیے ہیں، ان میں سے ایک وہ بھی ہے، جو اس شعر میں پیش کیا گیا ہے فرماتے ہیں: بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ مجھے خود اپنے آپ پر رشک آنے لگا۔ محبوب کی زیارت کرنا چاہتا

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

غیر کو یا رب! وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے
گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جایئے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

دُور چشمِ بد تری بزمِ طرب سے واہ وا!
نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

اس کی بزمِ آرائیاں سن کر دلِ رنجور یاں
مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں!
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسدؔ
پاس مجھ کو آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

ہوں، مگر رشک یہ موقع ہی نہیں دیتا کہ اسے دیکھ سکوں۔ مولانا طباطبائی نے خوب فرمایا "انتہائے رشک یہ کہتا ہے کہ اپنے تئیں بھی محروم رکھتا، جیسے انتہائے بخل میں بخیل اپنے تئیں بھی محروم رکھتا ہے"۔ اس قسم کے مزید اشعار میں سے ایک دو ملاحظہ فرمایئے:

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں، مگر ان کی تمنّا نہیں کرتے

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی، لیکن
وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

۶۔ لغات۔ آبگینہ: شیشہ، شیشے کی صراحی

شرح: اگر فکر و اندیشہ کی گرمی کا یہی حال ہے تو دل سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے بغیر چارہ نہیں، کیونکہ شراب اتنی تیز و تند ہے۔ جو شیشے کو پگھلائے

جا رہی ہے۔

فکر و اندیشہ کی گرمی کو شرابِ تند سے اور دل کو آبگینے سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دل کا آبگینہ پگھل کر ختم ہو جائے گا۔

غالب نے دوسرے مصرع کا مضمون ایک فارسی شعر میں بھی باندھا ہے اگرچہ باقی مضمون کچھ اَور ہے، یعنی:

مینائے مے از تندی این مے بگدازد
پیغامِ محبت در خورِ تحویلِ صبا نیست

۲۔ شرح: خواجہ حالی فرماتے ہیں:

"یہ شعر معاملے کا ہے، جو طالب و مطلوب کے درمیان اکثر گزرتا ہے اور شاعرانہ نزاکت دوسرے مصرع میں پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ حیا آنی اور شرمانا دراصل ایک ہی چیز ہے۔ پھر اس کے کیا معنی کہ حیا بھی آتی ہے تو شرما جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس مقام پر حیا آنے کا متعلق اور ہے اور شرما جانے کا متعلق اَور۔ "گر حیا بھی اس کو آتی ہے" یعنی "غیر کی گستاخی پر خواہشِ بیجا سے تو شرما جاتے ہے" یعنی غیر سے یا اس کے ساتھ تکرار کرنے سے۔"

شعر کا مطلب واضح ہوگیا، صرف اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ حیادار شخص طبعاً خود زیادہ سے زیادہ تکلیف اٹھا لیتے ہیں اور دوسرے سے تکرار نہیں کرتے یا کوئی ایسی بات نہیں کہتے، جو اس کی دلآزاری کا باعث ہو۔ یقیناً غیر کی گستاخی دیکھ کر محبوب کو حیا آتی ہے۔ وہ غیر کو منع کرنا چاہتا ہے، لیکن انتہائے دلداری میں جو حیاداری کا طبعی خاصہ ہے، منع کر نہیں سکتا، یہی بات مرزا غالب نے شعر کے پہلے مصرع میں واضح کی ہے۔

۴۔ لغات۔ لت: لپکا، خو۔ یہ لفظ لپکا کی طرح بری عادت کے لیے بھی مستعمل ہے۔

شرح : شوق کو تو لپکا پڑ گیا ہے کہ ہر دم فریاد و فغاں ہی کرتا رہے۔ لیکن دل کی حالت ضعف کے باعث ایسی ہے کہ سانس لیتے ہوئے بھی گھبراتا ہے۔ شوق اور دل کی اس کشمکش کے باعث جان عذاب میں ہے۔

۵۔ شرح : تُو نے عیش و نشاط کی جو محفل آراستہ کر رکھی ہے، خدا اسے بُری نظروں سے بچائے۔ واہ وا! سبحان اللہ! اُس بزم کی یہ کیفیت ہے کہ میں نالہ بھی کرتا ہوں تو وہاں پہنچتے پہنچتے وہ نغمہ ہو جاتا ہے۔ گویا بزم طرب کی فضا میں ایسی تاثیر ہے، جو نالے کو نغمہ بنا دیتی ہے، جیسا کہ دوسری جگہ کہا ہے :

ہمنشیں! مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست
واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

۔ شرح : اگرچہ ہم نے ایسا انداز اختیار کر رکھا ہے کہ عشق کا بھید محبوب پر کھلنے نہ پائے اور ہمارے لیے اس کے پاس جانے میں روک ٹوک کی نوبت نہ آئے، لیکن جب ہم اسے دیکھتے ہیں تو اس طرح کھوئے جاتے ہیں اور ازخود رفتگی کا ایسا عالم ہم پر طاری ہو جاتا ہے کہ محبوب عشق کا راز ایک حد تک پا جاتا ہے۔ یعنی اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کھویا جانا خالی از علت نہیں

۷۔ لغات ۔ دل بیٹھا جانا : دل پر حد درجہ ضعف طاری ہونا، یعنی غش کی ابتدائی حالت۔

رنجور : بیمار۔ افسردہ۔

نقش بیٹھنا : نقش قائم ہو جانا، کسی کے دل میں جگہ لے لینا۔

شرح : محبوب کے ہاں عیش و نشاط کی محفلیں آراستہ ہو رہی ہیں۔ میں ان کا ذکر سنتا ہوں تو بیمار و افسردہ دل پر حد درجہ ضعف کے باعث غشی طاری ہونے لگتی ہے۔ غیر کے مطلب و مقصود کا نقش قائم ہوتا جاتا ہے اور وہ محبوب کے دل میں گھر کرتا جا رہا ہے۔

بیٹھنے کا تعلق عاشق کے دل سے ہے اور رقیب کے مدعا سے ۔ ایک سے مراد انتہائی ضعف ہے ، دوسرے سے مراد پوری کامیابی و کامرانی ۔

۸ ۔ **لغات** ۔ رنگ کھُلنا : رنگ کا نمایاں اور زیبا ہونا یا سفید ہونا ۔

شرح : میرا پری جیسے چہرے والا محبوب کسی پر عاشق ہو گیا عشق کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ اس کا رنگ اڑنے لگے ۔ چنانچہ اس وجہ سے وہ اور بھی نازک بن گیا اور ظاہر ہے کہ رنگ جتنا اڑے گا ، اتنا ہی کھلے گا ۔ ہر فرد پر واضح ہے کہ کسی چیز پر کوئی رنگ ہو ، وہ جتنا اڑتا جائے گا ، چیز اتنی ہی سفید ہوتی جائے گی ۔

۹ ۔ **لغات** ۔ کھنچتا جائے ہے : (۱) تصویر بنتی جا رہی ہے (۲) محبوب پیچھے ہٹتا جا رہا ہے ، یعنی پہلے کھنچنا کی ضد ۔

شرح : اس کی تصویر مصور سے بھی کیا کیا ناز کر رہی ہے ۔ وہ جتنی کوشش پوری کر دینے کے لیے کرتا ہے ، اتنا ہی محبوب دور ہٹتا یعنی کشیدہ ہوتا جاتا ہے ۔

مطلب یہ کہ محبوب کے ناز و انداز اور عشوہ و ادا کے باعث مصور کو تصویر پوری کر دینے کا موقع نہیں ملتا ۔

۱۰ ۔ **لغات** ۔ آتش بجان : جس کی جان میں آگ بھڑک رہی ہو ۔ جو سراپا آگ ہے ۔

شرح : اے اللہ ! میرا سایہ اسی طرح مجھ سے دور بھاگتا ہے ، جس طرح آگ سے دھواں نکل کر الگ ہو جاتا ہے ۔ سچ ہے ، میرے دل و جان میں آگ بھڑک رہی ہے اور میں سراپا آتش ہوں ۔ بھلا میرے پاس ٹھہرنے کی تاب کیسے ہو سکتی ہے ؟

گرم فریاد رکھا شکل نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاریٔ وہم
کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

ہوسِ گُل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

۱۔ لغات۔ نہالی: توشک، لحاف، رضائی، یہاں بظاہر لحاف مراد ہے۔ لحافوں اور توشکوں پر آرائش کی غرض سے خوش وضع شکلیں بنانے کا عام دستور تھا، جس طرح قالینوں پر اب تک قسم قسم کے نقشے اور شکلیں بنائی جاتی ہیں۔ بُرد: سردی، ٹھنڈ۔

لیالی: لیل کی جمع، راتیں۔

شرح: لحاف پر جو شکل بنی ہوئی تھی، اسے دیکھتے ہی محبوب یاد آگیا اور میں نے فراق میں فریاد و فغاں شروع کر دی۔ یہ سلسلہ رات بھر جاری رہا۔ اسی کی بدولت راتوں کی سردی سے مجھے پناہ ملی، یعنی سردی مجھ پر کوئی اثر نہ کر سکی، کیونکہ میں گرمِ فریاد تھا۔

۲۔ لغات۔ نسیہ: عام معنی ادھار، مقصود وہ چیز ہے، جو ابھی ہاتھ نہیں آئی اور آنے کی امید ہے۔ یعنی آخرت کی زندگی، بہشت۔

نقد: وہ چیز، جو میسر ہے، یعنی دنیا اور اس کی زندگی۔

شرح: مجھے دنیا اور عقبیٰ کی حقیقت معلوم ہے۔ میری بلند ہمتی نے ان کے عوض بکنا گوارا نہ کیا۔ دونوں کو ٹھکرا دیا اور دونوں سے بے نیازی برتی۔

مطلب یہ کہ انسان اپنی حقیقت پر غور کرے تو نہ دنیا کی کوئی چیز اسے لبھا کر دام میں الجھا سکتی ہے اور نہ عقبیٰ کی کوئی نعمت اس کے لیے ترغیب کا سامان بن سکتی ہے۔ وہ ذاتِ باری تعالیٰ کی رضا کے سوا ہر شے سے بے پروا رہے گا۔ یہی دعوت مرزا غالبؔ کا اصل مقصود ہے۔

۳۔ **لغات۔** اصنام: صنم کی جمع، بُت

شرح: وجودِ حقیقی صرف ایک ہے۔ جو لوگ ہزاروں لاکھوں وجودوں کو کسی نہ کسی شکل میں مانتے ہیں اور وحدت میں کثرت آرائی کے قائل ہیں، وہ حقیقت میں وہم کی پوجا کر رہے ہیں۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ایک وجود کے سوا کسی کو نہ مانا جائے۔ توحید کے معنی یہی ہیں۔ آہ! لوگوں نے وہم کی پرستش میں جو خیالی بُت قائم رکھے ہیں، انھوں نے مجھے ایمان کے راستے سے ہٹا کر کافر بنا دیا ہے۔

جب ایمان توحید پر ہو تو کثرت کو تسلیم کرنا یقیناً توحید کے منافی ہے اس لیے اسے ایمان کے بجائے کُفر کہنا چاہیے۔

۴۔ **شرح:** جب تک میرے بال و پر موجود تھے، دل میں پھولوں کی آرزو تھی، لیکن جب بال و پر کٹ گئے اور میں پرواز کے ہر سامان سے محروم ہو گیا تو ساتھ ہی پھولوں کی آرزو بھی افسردہ ہو کر رہ گئی، یہاں تک کہ اس آرزو کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا، گویا اس معاملے میں خلجان کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔

ہر مقصد و نصب العین کے محرّکات و عوامل ہوتے ہیں، جن کی بدولت مقصد کے لیے سعی و کوشش کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے اور آرزو اسی وقت تک زندہ سمجھی جاتی ہے، جب تک اس کے لیے تحریک کے موجبات موجود ہوں۔ پھولوں کی آرزو کے لیے بلبل کے سامنے بال و پر واحد محرّک تھے، وہ جب چاہتی، اُڑ کر ان کے پاس پہنچ سکتی تھی۔ جب بال و پر ہی نہ

۔ ہے تو اڑنے اور جدو جہد کرنے کا سوال ہی نہ تھا۔ اس طرح آرزوے گل افسردہ و بے جان ہو گئی۔ جب محرک کا خاتمہ ہو گیا تو کامل آرام نصیب ہوا۔

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت، خونِ گرمِ دہقاں ہے
غنچہ تا شگفتن ہا، برگِ عافیت معلوم!
باوجودِ دلجمعی، خوابِ گل، پریشاں ہے
ہم سے رنجِ بے تابی کس طرح اٹھایا جائے
داغِ پشتِ دستِ عجز، شعلہ خس بہ دنداں ہے

۱۔ لغات۔

کارگاہِ ہستی: دنیا کا کارخانہ یعنی دنیا۔

شرح: خود مرزا غالب نے ان تینوں کی شرح اپنے شاگرد مولوی محمد عبدالرزاق شاکر کو لکھی تھی، وہی یہاں درج کی جاتی ہے۔

" داغ ساماں مثل انجم انجمن، وہ شخص کہ داغ جس کا سرمایہ و سامان ہو، موجودیت لالے کی منحصر نمائشِ داغ پر ہے، ورنہ رنگ تو اور پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے۔ بعد اس کے یہ سمجھ لیجیے کہ پھول درخت یا غلّہ جو کچھ بویا جاتا ہے، دہقان کو جوتنے، بونے، پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور ریاضت میں لہو گرم ہو جاتا ہے مقصود شاعر کا یہ ہے کہ وجود محض رنج و عنا ہے۔ مزارع کا وہ لہو، جو کشت و کار میں گرم ہوا ہے، وہی لالے کی راحت کے خرمن کے لیے برق ہے۔ حاصل موجودیت داغ، داغ مخالفِ راحت اور صورتِ رنج "

مطلب یہ ہے کہ دنیا میں لالے کا سرمایہ و سامان داغ ہے، یعنی ہستی

باعثِ رنج ہے۔ دہقان کا جو خون محنت و مشقت میں گرم ہوتا ہے، وہی کاشت کردہ شے کے انبار پر راحت کے لیے بجلی بن جاتا ہے۔

۲۔ **شرح** : مرزا فرماتے ہیں:

"کلی جب نئی نکلے، بہ صورتِ قلبِ صنوبری نظر آئے اور جب تک پھول بنے، "برگِ عافیت" معلوم۔ یہاں معلوم بہ معنی معدوم ہے اور برگِ عافیت بہ معنی مایۂ آرام۔ برگ اور سرو برگ بہ معنی ساز و سامان ہے۔ خوابِ گُل بہ اعتبارِ خاموشی و برجاماندگی۔ پریشانی ظاہر ہے۔ یعنی شگفتگی، وہی پھول کی پنکھڑیوں کا بکھرا ہوا ہونا۔ غنچہ بہ صورتِ دل جمع ہے۔ باوصفِ جمعیتِ دل گُل کو خوابِ پریشاں نصیب ہے۔"

کلی جب تک کھلے، اُسے آرام کا کوئی لمحہ نصیب نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اسے جمعیتِ دل نصیب ہے، لیکن حقیقت پر نظر رکھی جائے تو اس کا خواب یعنی خاموش رہنا خوابِ پریشاں ہے، کیونکہ وہ کھلے گی اور کھلتے ہی ایک ایک پنکھڑی الگ الگ ہو جائے گی۔

کلی کی حالت میں دلجمعی اور پھول کی حالت میں پریشانی عام مشاہدے کی چیز ہے۔ مقصودِ شاعر کا یہ ہے کہ بظاہر اس دنیا میں، جو آزمائش کا مقام ہے، کسی بھی وجود کے لیے آرام کے اسباب مہیا نہیں۔

۳۔ **لغات**۔ **پُشتِ دست** : اصل میں پُشتِ دست بر زمین نہادن ہے، یعنی کسی کی تعظیم کرنا اور اس کے سامنے عجز و انکسار سے پیش آنا۔

خس بدنداں گرفتن : دانتوں میں تنکا لینا۔ زمانۂ قدیم کے ہندوؤں میں یہ طریقہ رائج تھا کہ جب کوئی گروہ کسی سے مغلوب ہو جاتا تھا تو مغلوب گھاس کا تنکا منہ میں لے کر غالب گروہ کے روبرو پہنچتا تھا۔ مقصود یہ ہوتا تھا کہ مغلوب نے گائے کی صورت پیدا کر لی، جو گھاس کھاتی تھی۔ ہندوؤں کے نزدیک گائے کو مارنے

سے بڑھ کر کوئی گناہ نہ تھا۔ اس بنا پر اُس گروہ کو، جو گائے کی صورت میں سامنے آتا تھا، معاف کر دیا جاتا تھا۔ یوں خس بدنداں گرفتن یا کاہ بدنداں گرفتن سے مراد عاجزی اور مغلوبیت کا اظہار ہُوا۔

شرح : مرزا فرماتے ہیں:

"پشتِ دست صورتِ عجز اور خس بدنداں وکاہ بدنداں گرفتن بھی اظہارِ عجز ہے۔ پس جس عالم میں کہ داغ نے پشتِ دست زمین پر رکھ دی ہو اور شعلے نے تنکا دانتوں میں لیا ہو، ہم سے رنجِ دلفگار کا تحمّل کس طرح ہو؟"

مطلب یہ کہ جب داغ بیتابی کا رنج برداشت نہ کر سکا اور اس نے عاجزی سے پشتِ دست زمین پر رکھ دی۔ اسی طرح شعلے نے تنکا دانتوں میں لے لیا، گویا اظہارِ عجز کر دیا۔ جس رنج کی متحمل یہ سراپا درد چیزیں نہ ہو سکیں، اسے ہم کیونکر اٹھائیں؟

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

شرح : اے غالب! گھر کے در و دیوار پر سبزہ اُگ رہا ہے، کیونکہ وہ بے آباد ہے اور اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں۔ ہم دشت و بیاباں کی خاک چھان رہے ہیں اور گھر میں فصلِ بہار طراوت و شادابی کا سماں پیدا کر رہی ہے۔

اس شعر کی خوبیاں خاص توجّہ کی محتاج ہیں، مثلاً :

۱۔ گھر کو چھوڑے ہوئے مدت گزر گئی۔ اس اثناء میں کسی نے اس کی دیکھ بھال نہ کی، یہاں تک کہ وہاں جنگل کا سامان نمودار ہو گیا۔

۲۔ در و دیوار پر سبزہ اُگ آنا بے رونقی اور ویرانی کی علامت ہے۔ شاعر

نے اسے بہار کا سماں بتایا۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس صحرا کی وہ خاک چھانتا رہا، وہاں روئیدگی سرے سے ناپید تھی۔ اور جہاں معمولی سی روئیدگی معلوم ہوئی، اسے حقیقی حالت سے بے پروا ہو کر بہار قرار دے دیا۔

۳۔ ظاہر ہے کہ جب گھر میں ویرانی کمال پہ پہنچ گئی تو شاعر کہتا ہے کہ اس حالت میں صحرا گردی کی کیا ضرورت باقی رہی؟

۴۔ اس شعر کا طنز کسی تصریح کا محتاج نہیں۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں: "اس شعر میں بیان و بدیع کی کوئی خوبی نہیں، لیکن صاف صاف لفظوں میں حالتِ دیوانگی کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ جواب نہیں۔

سادگی پر اس کی مرجانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

رنجِ رہ کیوں کھینچیے؟ واماندگی سے عشق ہے
اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

شرح:

یہ حسرت برابر رہی اور اب تک ہے کہ ہم اس کی سادگی پر جان دے دیں اور گلا کاٹ کر مر جائیں۔ مصیبت یہ ہے کہ جب کبھی ہم نے ایسا ارادہ کیا اس نے خنجر اٹھا لیا، یعنی سادگی ختم ہو گئی اور ہماری حسرت دل ہی میں رہی۔ اب خیال تھا

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی !
فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گل میں ہے؟
ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر، کہ کس مشکل میں ہے

کہ یہ نکل جائے گی، اربان پورا ہوجائیگا لیکن اس ظالم نے پھر خنجر سنبھال لیا ہے اور ہم بے بس رہ گئے ہیں۔

۲۔ **شرح** : خواجہ حالی اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"کسی کے حسنِ بیان کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی کہ جو بات قائل کے مُنہ سے نکلے، وہ سامع کے دل میں اس طرح اُتر جائے کہ اسے شبہ ہو: یہ بات پہلے ہی سے میرے دل میں تھی"۔

بیشتر حقائق انسان کے دل میں طبعاً پیوست ہوتے ہیں۔ لیکن جب تک ان کی طرف اشارہ نہ کیا جائے، اکثر کو ان کا شعور و احساس نہیں ہوتا۔ جب اشارہ کر دیا جائے تو یہ خیال نہیں ہوتا کہ کوئی نئی بات سننے میں آئی۔ یہی سمجھا جاتا ہے کہ جو بات پہلے سے دل میں موجود تھی، وہ تازہ کر دی گئی۔ تقریر کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ انسان کے دل کی باتیں تازہ ہو جائیں۔ ایسی ہی تقریر دل پذیر و پُر تاثیر ہوتی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف مرزا غالب نے اشارہ کیا ہے مرزا کی دقیقہ سنجی کا کمال ملاحظہ ہو کہ یہ نہیں کہا، وہ بات پہلے سے دل میں موجود تھی، یہ کہا، میں نے جانا، گویا یہ بھی میرے دل میں تھی۔

۳۔ **شرح** : اگرچہ محبوب کی محفل میں میرا ذکر انتہائی برائی سے ہو رہا ہے، لیکن یہ ذکر مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں پہنچ گیا ہے، آہ! میں نہیں پہنچ سکتا۔

عاشق کو محبوب برائی سے بھی یاد کرے یا محفل نشینوں کی بدگوئی گوارا کرے اور ذکر نہ روکے تو عاشق کے لیے یہ بھی ایک دل پسند شے ہے اور

مرزا غالب کا تو فلسفہ ہی یہ ہے کہ دشمنی بھی بہرحال تعلق ہی کا ثبوت ہے۔ وہ نفسِ ذکر پر خوش ہے، اس کے لیے اچھے بُرے کا سوال پہلے نہیں، بعد میں آتا ہے۔

۴۔ **شرح** : اے ناامیدی کے بے پناہ سیل! ذرا تھم جا۔ امید کا جو برائے نام تسمہ لگا ہُوا ہے، وہ بھی کٹ نہ جائے۔ اُسی کی بنا پر ہم رات دن سعی و کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اگرچہ اس سے حاصل کچھ نہیں ہوتا، لیکن ہماری دل لگی کا ایک ذریعہ ضرور ہے۔ اگر یہ سہارا بھی باقی نہ رہا اور امید کے پورے خانے پر اندھیرا چھا گیا تو اس کوشش میں دل لگی اور دلچسپی کا جو سامان ہے، وہ بھی ختم ہو جائے گا۔

انسان حصولِ مقصد کے لیے جو کوششیں کرتا ہے، وہ امید پر مبنی ہوتی ہیں، اگرچہ اس کی حیثیت کچھ ہی ہو۔ کوششیں کامیاب نہ بھی ہوں تو جب تک امید کا تھوڑا بہت سہارا باقی ہے، وہ جاری رہیں گی اور ان میں مصروفیت کے باعث انسان اک گونہ لذّت محسوس کرے گا۔ اگر ناامیدی ایک طوفان کی طرح ہجوم کر کے آ جائے تو ظاہر ہے کہ رہا سہا سہارا بھی ختم ہو جائے گا اور نتیجہ کامل مایوسی، نیز سعی و کوشش کے تعطل کے سوا کچھ نہ ہو گا۔

۵۔ **شرح** : ہم چلنے کی زحمت کیوں برداشت کریں۔ درماندگی اور بیچارگی کو ہمارے قدموں سے اس درجہ عشق ہو گیا ہے کہ جو بھی قدم رکھتے ہیں، وہ اُٹھ نہیں سکتا۔

مطلب یہ کہ ہمارے لیے درماندگی کے باعث چلنا غیر ممکن ہے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ "منزل کے ساتھ" میں "استعمال ہو تو اس سے مراد "راستہ" ہوتا ہے، "پر" استعمال ہو تو منزلِ مقصود سمجھنا چاہیے۔

۶۔ **شرح** : محبوب عاشق سے کہتا ہے کہ تمھارا دل تو جہنّم کی آگ بھڑکنے کا جلوہ دکھا رہا ہے۔ عاشق جواب دیتا ہے کہ جو کچھ آپ نے فرمایا،

بجا سہی، لیکن یہ بھی تو بتائیے کہ شورِ قیامت کے فتنے سے کس کی سرشت لبریز ہے؟

ظاہر ہے کہ عاشق کے دل میں ہمیشہ عشق کی آگ مشتعل رہتی ہے اور آتشِ دوزخ سے اس کی مناسبت محتاجِ بیان نہیں، مگر محبوب بھی تو اپنے نازو انداز اور عشوہ و ادا کی بدولت قیامت کے فتنے سے کم نہیں ہوتے۔

۷۔ **شرح:** غالبؔ کا دلِ دیوانہ پیچ و تاب کا ایک طلسم ہے جس میں ہر لحظہ بیتابی و بیقراری موجزن رہتی ہے۔ اے محبوب! اسی دل میں تیری تمنا اور آرزو جاگزیں ہے۔

مجھ پر نہ سہی، اپنی تمنا پر تو رحم کر اور دیکھ کہ کن مشکلات میں پڑی ہوئی ہے؟ تُو ہی اسے ان مشکلات سے چھڑا سکتا ہے۔

شاعروں نے حسنِ طلب کے عجیب و غریب پہلو پیدا کیے ہیں، ان میں سے ایک غالبؔ کا یہ شعر بھی ہے۔ امیرؔ مینائی نے کہا ہے۔

دل آپ کا کہ دل میں جو کچھ ہے، سب آپ کا
دل لیجیے، مگر مرے ارماں نکال کے

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی

شق ہو گیا ہے سینہ، خوشا لذتِ فراغ
تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی!

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

۱۔ **شرح:** دل اور جگر دونوں تیرے تیرِ نگاہ سے زخمی ہونے کے آرزو مند تھے، چنانچہ وہ تیر دل کو چیرتا ہُوا جگر میں اُتر گیا۔ اس ادا سے دونوں خوش ہو گئے۔ دونوں کی آرزو پوری ہو گئی اور حسرت باقی نہ رہی۔

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا! ہوسِ بال و پر گئی

دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی؟

۶۔ لغات :
شق ہونا : پھٹ جانا
فراغ : بے فکری
فراغت۔

شرح : خدا کا شکر ہے کہ میرا سینہ پھٹ گیا اور اس کا بند بند کھل گیا۔ پیشتر جگر کے زخم کو پوشیدہ رکھنے میں زحمت اٹھانی پڑتی تھی، اب اس زحمت کی کوئی ضرورت نہ رہی، بڑا ہی اچھا ہوا کہ بے فکری کی لذت میسر آگئی۔ زخمِ جگر کی پردہ داری اسی وقت تک کارآمد سمجھی جاسکتی تھی کہ سینہ محفوظ رہتا جب سینہ پھٹ جانے سے خود جگر منظرِ عام پر آگیا، تو پردہ داری کی کیا گنجائش باقی رہی؟

شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ چھوٹی مصیبت میں ضبط و تحمل کا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ جب اس سے بڑی مصیبت پیش آجائے۔ تو پیشتر کا ضبط و تحمل بالکل بے سود رہ جاتا ہے اور بڑی مصیبت میں چھوٹی مصیبت فی الحقیقت یاد بھی نہیں رہتی۔

۳۔ **لغات** ۔ بادۂ شبانہ : رات کے وقت شراب پینا۔

شرح : اس شعر میں دراصل عیش و نشاط کی ایک خاص کیفیت پیش کی گئی ہے۔ رندوں کا عام دستور یہ تھا کہ رات رات بھر محفل جما کر شراب پیتے رہتے، راگ رنگ ہوتے رہتے، صبح کو سو جاتے اور نیند کے مزے لیتے۔

میرزا کہتے ہیں، رات کو شراب پینے کی بدمستیاں اب کہاں ؟ وہ تو ختم ہو گئیں۔ جب وہی نہ رہیں تو خواب سحر کی لذت بھی رخصت ہو گئی، کیونکہ وہ لذت تو رات بھر شراب پی کر سیاہ مست ہو جانے پر موقوف تھی۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ شعر کے الفاظ معنی حقیقی پر محمول کریں تو کچھ لطف نہیں، چنانچہ ان کے نزدیک میرزا کو استعارہ مقصود ہے۔ یعنی بادۂ شبانہ سے نشۂ شباب اور سحر سے پیری کا استعارہ اور اٹھیے کا خطاب نفس غافل کی طرف ہے۔

بظاہر مولانا رندانہ مشغلوں کا ٹھیک اندازہ نہ فرما سکے۔ اٹھیے کے خطاب سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ بادۂ شبانہ کی سرمستیوں سے خواب سحر کی لذت اٹھانے والا کوئی نواب یا رئیس ہے، جو ایسی سرمستیوں میں انہماک کا عادی چلا آتا ہے۔ تاہم اگر مولانا کے فرمائے ہوئے استعارے پیش نظر رکھے جائیں۔ تو مقصود یہ ہوگا کہ شباب کی منزل گزر گئی اور بڑھاپا آ گیا۔ اب خواب سحر میں وہ لذت باقی نہ رہی، کیونکہ وہ تو شراب نوشی کی فراوانی پر موقوف تھی؛ جو شراب کے ساتھ ہی ختم ہو گئی، لہذا اب کچھ عبادت کر لینی چاہیے۔

۴۔ **شرح** : میری خاک محبوب کے کوچے میں اڑتی پھرتی ہے۔ یہی میرا مقصود تھا، یہی آرزو تھی۔ اے ہُما ! اب مجھے بال و پر کی کیا ضرورت رہ گئی ؟ وہ بھی تو اسی لیے درکار تھے کہ میں کوچۂ محبوب کی فضا میں اڑ سکوں۔ جب میری خاک کو یہ شرف حاصل ہو چکا ہے تو اب بال و پر سے بے نیازی میسر آ گئی۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ ہُوا سے خطاب بظاہر بے مزہ ہے لیکن ہوَس کی مناسبت سے مصنّف نے صبا کو چھوڑ کر ہُوا کو باندھا۔ میرے نزدیک لفظ ہوا محض ہوَس کی رعایت ہی سے اختیار نہ کیا گیا، خاک کو اڑانے کے لیے صبا سے کہیں زیادہ ہُوا کی ضرورت تھی۔ صبا خوشبو لے جاسکتی ہے خاک نہیں اُڑا سکتی۔

۵۔ لغات۔ گُل کترنا : کاغذ وغیرہ کے پھول بنانا، گلکاری کرنا عجیب وغریب اور اچنبھے کا کام انجام دینا۔ کسی کا کوئی ایسی بات کرنا، جس سے فساد برپا ہو اور وہ الگ رہے۔

شرح : محبوب چلتا ہے تو زمین پر پاؤں رکھنے کے رنگ ڈھنگ حد درجہ دلفریب اور قابلِ دید ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خرامِ محبوب کی لہر گل کرتی ہوئی جارہی ہے۔

گُل کترنے سے یہ مفہوم بھی ثابت ہے کہ محبوب چل نہیں رہا، بلکہ گلکاریاں کررہا ہے۔ یہ مفہوم بھی واضح ہے کہ اس چال سے عشاق میں ایک ہنگامۂ فساد بپا ہورہا ہے اور خود محبوب کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔

۶۔ لغات۔ بوالہوس : ہوس پرست، جھوٹا عاشق۔

اہلِ نظر : معنویت پر نظر رکھنے والے سچے عاشق۔

شرح : زمانے کے طور طریقے بدل گئے۔ ہر ہوَس پرست اور جھوٹے عاشق نے حُسن پرستی کو اپنا مشغلہ بنالیا ہے۔ گویا یہ رسم عام ہوگئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اب سچے عاشقوں کے طور طریقے کی عزّت و آبرو جاتی رہی۔

شعر کی آفاقیت محتاجِ تشریح نہیں۔ زندگی کے ہر دائرے میں اس کا یکساں اطلاق ہوسکتا ہے۔ جب سچے جھوٹے میں امتیاز کا کوئی نشانِ خاص باقی نہ رہے تو سچوں کی آبرو کیا باقی رہ سکتی ہے؟

۷۔ شرح : محبوب کا نظارہ بجائے خود ایک نقاب کی صورت اختیار

کر گیا، کیونکہ جو نگاہ اس کے رخ افروز پر پڑی، وہ مست اور از خود رفتہ ہو کر ہر طرف بکھر گئی۔ ہر نگاہ کی حیثیت ایک تار کی تھی۔ بہت سے تاروں نے اس کے چہرے پر بکھر بکھر کر ایک پردہ تیار کر دیا۔ یعنی نظارہ بذات خود حسن سے لطف اندوز ہونے کے بجائے محرومی کا باعث بن گیا۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ مصنف نے "ہر" کا لفظ یہاں پورا نقاب بنانے کے لیے صرف کیا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے، تیرا رخ دیکھ کر ایسی از خود رفتگی ہوئی کہ سب دیدار سے محروم رہے۔

۸۔ لغات۔ فردا : آیندہ کل۔

دی : گزشتہ کل۔

شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"تمہارے جاتے ہی بہ سبب خود رفتگی و خود فراموشی کے یہ حالت ہو گئی کہ آج اور کل کی مطلق تمیز نہیں رہی اور ایسا ہی قیامت کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہاں ماضی و مستقبل دونوں مبدل بہ زمانۂ حال ہو جائیں گے۔ پس تم کیا گئے، گویا ہم پر قیامت گزر گئی۔ قیامت گزر جانے کے دونوں معنی ہیں، نہایت سختی کا زمانہ گزرنا اور خود قیامت کا آجانا۔"

خطاب محبوب سے ہے۔ فرماتے ہیں: کل تم ہمارے پاس سے رخصت ہوئے، حشر ٹوٹ پڑا۔ آیندہ کل اور گزشتہ کل میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔ اس سے بڑھ کر قیامت کا نشان کیا ہوگا؟ یوں گزشتہ کل فردائے قیامت بن گئی۔

۹۔ شرح : اے اسد اللہ خاں! تمہیں زمانے نے تباہ کر ڈالا۔ وہ جوانی، جس پر تم نازاں تھے، کہاں گئی! وہ ہنگامہ خیز ولولے کیا ہوئے؟ مطلب یہ کہ جوانی کے ساتھ ولولے بھی گئے اور پیری آگئی۔ یہ انحطاط زمانے کے باعث رونما ہوا۔

میرزا کا پورا نام اسد اللہ خاں تھا۔ ابتدا میں اسدؔ تخلص کرتے تھے۔ مولانا طباطبائی نے فرمایا ہے کہ تخلص کے ساتھ پورا نام آجانے سے خوبی پیدا ہوئی۔ اور "خان" سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ کسی زمانے میں قوت و سطوت کے مالک تھے، جسے پیری نے مٹا دیا۔ یعنی عظمتِ رفتہ کی یاد بجا ہے، بیجا نہیں۔

تسکیں کو ہم نہ روئیں، جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت، مگر، ملے

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

ساقی گری کی شرم کرو آج، ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں، لیکن اے ندیم!
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار! دیکھنا
تم کو کہیں جو غالبؔ آشفتہ سر ملے

۱۔ شرح:

اگر نظر کے لیے لذت کا سامان فراہم ہو جائے تو ہم دل کی تسکین کا غم کیوں کریں؟ بہشت کی حوریں کتنی ہی پاکیزہ کیوں نہ ہوں، لیکن اے محبوب! ان میں تیری صورت ملنی چاہیے کیوں؟ اس لیے کہ نہ تیری صورت کے سوا نظر کسی حالت میں حقیقی لذت پا سکتی ہے اور نہ دل کی تسکین کا سامان فراہم ہو سکتا ہے۔

شعر میں مرزا غالب نے بہشت کے متعلق اپنا نقطۂ نگاہ پوری طرح

واضح کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ بلا شبہ بہشت میں حوریں ملیں گی، لیکن ہم ان میں اپنا ذوق نظر کہاں پا سکتے ہیں اور ہمیں تسکین کیونکر ہو سکتی ہے؟ اے محبوب حقیقی! وہاں تیرا جلوہ میسر آنا چاہیے۔ وہی ذوق نظر کا سرمایہ اور وہی تسکین خاطر کا واحد ذریعہ ہے۔

۲۔ **شرح** : اے محبوب! تُو میرے قتل کے بعد مجھے اپنے کوچے میں دفن نہ کر، کیونکہ لوگ میری قبر کا نشان پاکر تیرے گھر کے دروازے پر پہنچنے لگیں گے اور میرا جذبۂ رشک اس کا روادار نہیں ہو سکتا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ عاشق کو اپنی عظمت و شہرت کا پورا یقین ہے۔ وہ دفن ہوگا تو لوگوں کو عظمت و شہرت کی بنا پر قبر تک آنے کا بہانہ ملتا رہے گا۔ اس طرح انھیں تیرے گھر کا نشان مل جائے گا۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ لوگوں میں مشہور ہو جائے گا، دیکھو فلاں نے فلاں کو قتل کر دیا اور اپنے کوچے ہی میں اس کی قبر بنا دی۔ اس طرح قتل کا بھید کُھل جائے گا۔ در ممکن ہے، لوگ تجھ سے مواخذے کا سوال اٹھا لیں۔

۳۔ **شرح** : آج تم نے ساقی کا منصب اختیار کر لیا اور شراب پلا رہے ہو۔ خدا کے لیے اپنے اس منصب ہی کا پاس و لحاظ کرو اور جتنی پلا سکتے ہو، پلا دو، ورنہ ہر رات ہمیں جتنی ملتی ہے، پی لیتے ہیں اور مطمئن ہیں تمھاری ساقی گری کے لیے تو تھوڑی پلانا کچھ باعثِ عزت نہیں۔

۴۔ **شرح** : خود مرزا غالب اس شعر کا مفہوم قاضی عبدالجلیل جنوںؔ کو لکھتے ہوئے یوں واضح کرتے ہیں۔

> "یہ مضمون کچھ آغاز چاہتا ہے۔ یعنی شاعر کو ایک قاصد کی ضرورت ہوئی، مگر کھٹکا یہ ہے کہ قاصد کہیں محبوب پر عاشق نہ ہو جائے ایک دوست اس عاشق کا، ایک شخص کو لایا اور اس نے عاشق سے کہا کہ یہ آدمی وضعدار اور معتمد علیہ ہے۔ میں ضامن ہوں کہ

یہ ایسی حرکت نہ کرے گا۔ خیر اس کے ہاتھ خط بھیجا گیا۔ قضا را عاشق کا گمان سچ ہوا۔ قاصد معشوق کو دیکھ کر والہ و شیفتہ ہو گیا۔ کیسا خط، کیسا جواب؟ دیوانہ بن، کپڑے پھاڑ جنگل کو چل دیا۔ اب عاشق اس وقوعے کے بعد ندیم سے کہتا ہے کہ غیب دان تو خدا ہے، کسی کے باطن کی کسی کو کیا خبر؟ اے ندیم! تجھ سے تو کچھ کلام نہیں۔ لیکن اگر نامہ بر کہیں مل جائے تو اس کو میرا سلام کہو کہ کیوں صاحب! تم کیا کیا دعوے عاشق نہ ہونے کے کر گئے تھے اور انجام کار کیا ہوا"؟

"کہیو سلام" دراصل ایک نہایت لطیف تعریض ہے۔

۵۔ **شرح** : اگر ہمیں چھپے ہوئے غم کی کھینچ تان سے نجات مل جائے تو اے محبوب! ہم تمھیں بھی بتا دیں کہ مجنوں نے کیا کیا تھا۔

"چھپے ہوئے غم" سے مراد بظاہر یہ ہے کہ اگر مجنوں کی طرح کپڑے پھاڑ کر صحرا میں نکل جائیں تو راز عاشق فاش ہو جائے اور اس میں محبوب کی رسوائی کا احتمال ہے۔ ہمارے لیے وہ سب کچھ کر دکھانا بہت سہل ہے، جو مجنوں نے کیا تھا، لیکن گوناگوں مصلحتیں ہمارے راستے میں حائل ہو رہی ہیں۔

۶۔ **شرح** : حضرت خضرؑ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ زندہ ہیں اور بھولے بھٹکے مسافروں کی رہنمائی فرماتے ہیں کم از کم یہ ادبی مسلمات میں سے ضرور ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ ہمارے لیے حضرت خضرؑ کی پیروی لازم نہیں البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ راہِ سلوک میں ہمیں ایک بزرگ مل گئے، جو ہمارے ہم سفر تھے اور ان کا نام خضرؑ تھا۔

مطلب یہ کہ سلوک میں ہمارا مرتبہ خضرؑ سے کچھ کم نہیں کہ انھیں رہنما مان لینا ہمارے لیے لازم ہو۔

۷۔ **شرح** : اے محبوب کے کوچے میں بسنے والو! اگر کہیں تمھیں

غالبؔ دیوانہ مل جائے تو دیکھنا اس کا کیا حال ہے، ذرا اس کا خیال رکھنا۔

کوئی دن گر زندگانی اَور ہے — اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اَور ہے

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں — سوزِ غمہائے نہانی اَور ہے

بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں — پر کچھ اب کے سرگرانی اَور ہے

دے کے خط، منہ دیکھتا ہے نامہ بر — کچھ تو پیغامِ زبانی اَور ہے

قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم — وہ بلائے آسمانی اَور ہے

ہو چکیں غالبؔ! بلائیں سب تمام — ایک مرگِ ناگہانی اَور ہے

۱۔ **شرح** : قاضی عبدالجمیل جنوںؔ نے اس شعر کی شرح خود مرزا غالبؔ سے پوچھی تھی۔ جواب میں فرماتے ہیں :

"اس میں کوئی اشکال نہیں، جو لفظ ہیں، وہی معنی ہیں۔ شاعر اپنا قصد کیوں بتائے کہ میں کیا کروں گا؟ مبہم کہتا ہے، کچھ کروں گا خدا جانے شہر میں یا نواحِ شہر میں تکیہ بنا کر فقیر ہو کر بیٹھ رہے یا دیس چھوڑ کر پردیس چلا جائے۔"

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں : " بندش کی خوبی اور محاورے کے لطف نے اس شعر کو سنبھال لیا، ورنہ غالبؔ سا شخص اس بات سے بے خبر نہیں ہے کہ جی کی بات جی میں رکھنا المعنی فی بطن الشاعر کہلاتا ہے۔ اس شعر سے یہ سبق لینا چاہیے کہ بندش کے حسن اور زبان کے مزے کے آگے اساتذہ ضعفِ معنی کو بھی گوارا کر لیتے ہیں۔"

میرے اندازے کے مطابق مولانا نے کسی قدر زیادتی فرمائی کسی امر کو شعر میں قدرے مبہم رکھنے کا مطلب لازماً المعنی فی بطن الشاعر نہیں۔ بعض مقامات پر ابہام خوانندے کے لیے بدرجہا زیادہ لطف کا باعث ہوتا ہے کیونکہ ہر فرد اپنے خاص حالات کے اعتبار سے شعر کو خاص معنی پر ڈھال لیتا ہے۔ اس طرح ایک شعر مختلف حالتوں پر حاوی ہو جانے سے زیادہ عمومیت و آفاقیت پیدا کر لیتا ہے، جیسا کہ میرزا نے خود فرمایا۔ شاعر نے اس وجہ سے اپنا قصد معین نہیں کیا کہ وہ چاہے فقیر بن جائے، چاہے پردیس چلا جائے چاہے کچھ اور کر گزرے۔

جو کچھ وہ کرنا چاہتا ہے، اس کے لیے فوری اقدام نہ کرنے کا قرینہ پہلے مصرع میں موجود ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر زندگی کے کچھ دن باقی ہیں تو ہم نے جی میں کچھ اور ٹھان رکھی ہے۔ اس سلسلے میں شارحین نے مختلف احتمالات پیدا کیے، مثلاً مر جائیں گے، کسی اور سے محبت کر لیں گے یا محبت سے دست بردار ہو جائیں گے، لیکن مرزا نے ان احتمالات کی طرف خفیف سا بھی اشارہ نہیں کیا، کیونکہ ان میں سے کوئی بھی آدابِ محبت کے شایاں نہیں۔

۲۔ شرح : دوزخ کی آگ میں اس قدر گرمی کہاں ہو سکتی ہے؟ چھپے ہوئے غموں کی جلن بالکل جداگانہ حیثیت رکھتی ہیں، یعنی دوزخ کی آگ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کہاں " استفہام انکاری ہے۔ گویا سوال کیا، مگر مقصود نفی ہے۔

۳۔ لغات۔ سرگرانی : سر کا بھاری ہونا، مراد ہے رنجش، خفگی۔

شرح : ہم ان کی رنجشیں بارہا دیکھ چکے ہیں اور معاملاتِ عشق میں محبوب کی رنجشوں سے سابقہ پڑتا ہی رہتا ہے، مگر اس مرتبہ ان کی خفگی کا درجہ زیادہ بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔

حقیقۃً زیادہ خفگی ہے یا نہیں، لیکن عاشق کو وفورِ محبت میں اتفاقی

بے اعتنائی پر بھی اس قسم کے وہم پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

۴۔ **شرح :** میں نے محبوب کو ایک خط نامہ بر کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اس نے جواب لا کر دے دیا، لیکن میرا منہ تک رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ زبانی بھی کوئی پیغام دیا ہے۔

"ہم نے اپنے جی میں ٹھانی اور ہے" کی طرح یہاں بھی مرزا نے زبانی پیغام کو مقدر یا مبہم چھوڑ دیا، کیونکہ اسے معلوم کر لینے کے قوی قرینے شعر میں موجود ہیں۔ مثلاً وہ ایسا پیغام ہے، جو معرضِ تحریر میں لانا مناسب نہ سمجھا گیا۔ ظاہر ہے کہ نامہ بر کو بھی ڈانٹا گیا ہوگا اور خط بھیجنے والے کی بھی خوب خبر لی گئی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ نامہ بر اسے دہرانے میں تامل کر رہا ہے۔

۵۔ **لغات۔ قاطع :** قطع کرنے والا، کاٹنے والا۔

اعمار : عمر کی جمع۔

شرح : اکثر ستارے عمروں کا رشتہ کاٹ دینے والے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ زمانہ ستاروں کی گردش کا نام ہے اور زمانے ہی کے گزرنے سے عمروں کا سلسلہ ختم ہو رہا ہے۔ اس طرح ستارے قاطعِ اعمار بن گئے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ درست ہے، لیکن وہ بلائے آسمانی (محبوب) ان سب سے بڑھی ہوئی ہے۔ ستاروں کی گردش کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ عمروں کے دن ختم ہو رہے ہیں آخر اسی طرح سب مر جائیں گے۔ مگر میرے محبوب نے ظلم و ستم سے زندگی بالکل ناقابلِ برداشت اور موت سے بدتر بنا رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ستاروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بیداد گر ہے۔

۶۔ **شرح :** اے غالب! ہمارے لیے جتنی بلائیں اور مصیبتیں قضا و قدر کی طرف سے مقدر تھیں، وہ پوری ہو چکیں، لہٰذا اب کوئی باقی نہیں البتہ موت باقی ہے، جو بہرحال ناگہاں اور اچانک آئے گی کیونکہ وہ کبھی کسی کو بتا کر نہیں آتی۔

کوئی اُمّید بر نہیں آتی　　　کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دِن معیّن ہے　　　نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی　　　اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد　　　پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں　　　ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں　　　میری آواز گر نہیں آتی

داغِ دل گر نظر نہیں آتا　　　بُو بھی، اے چارہ گر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی　　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　　موت آتی ہے، پر نہیں آتی

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ　　　شرم تم کو مگر نہیں آتی

۱۔ **لغات** ۔ بر آنا : پورا ہونا۔

شرح : میری کوئی اُمّید پوری نہیں ہوتی اور کسی کے پُورا ہونے کی صورت بھی نظر نہیں آتی۔ یعنی مایوسی اور نااُمیدی کی آخری منزل ہے۔ نہ کوئی آرزو بر آتی ہے ، نہ کوئی تدبیر بن پڑتی ہے ، نہ کوئی ایسی صورت پیشِ نظر ہے کہ کبھی کوئی مدّعا پورا ہو جائے گا۔

۲۔ **شرح** : موت کا دن اور وقت مقرّر ہے، اس میں ردّو بدل اور پس و پیش ممکن نہیں ، لیکن سوال یہ ہے کہ رات خدا نے سونے کے لیے بنائی ہے ؛

ذجعلنا نومکم سُباتاً

پھر کیا وجہ ہے کہ رات بھر نیند نہیں آتی اور ذرا دیر کے لیے بھی آنکھ نہیں جھپکتی ؟ کیا نیند بھی موت بن گئی ہے کہ معین وقت ہی پہ آئے گی ؟

۳ - شرح : پہلے یہ صورت تھی کہ دل کا حال دیکھ کر ہنسی آجاتی تھی۔ یعنی یہ کس طرح سکون و اطمینان سے بیٹھا ہُوا عشق کے چکروں میں پڑا اور کس نوبت کو پہنچ گیا۔ اب افسردگی و پژمردگی کا یہ عالم ہے کہ ہنسی بالکل ناپید ہو گئی۔ کسی بات پر شگفتگی کا احساس ہی باقی نہ رہا۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :

یہ وہ شعر ہے کہ میرؔ کو بھی جس پر رشک کرنا چاہیے۔ افسردگی خاطر کو کس عنوان سے بیان کر دیا اور کیا خوب شرح کی "۔

۴ - لغات ۔ طاعت : عبادت

شرح : میں عبادت اور پرہیزگاری کے ثواب سے واقف ہوں، لیکن کیا کروں، میری طبیعت اس طرف مائل نہیں ہوتی۔

مطلب یہ کہ بندگی اور پرہیزگاری کا ثواب جان لینا کافی نہیں، جب تک خدا کی رحمت سے دل میں ان کے مطابق عمل کا جذبہ پیدا نہ ہو۔

۵ - شرح : اس شعر کے پہلے مصرع میں پھر ابہام ہے۔ کہتے ہیں کوئی ایسی ہی بات پیش آگئی ہے کہ میں چپ بیٹھا ہوں اور لب بند کر رکھے ہیں ورنہ کیا یہ سمجھتے ہو کہ میں بات کر نہیں سکتا ؟

پہلے مصرع میں چپ رہنے کی مختلف مصلحتیں ہو سکتی ہیں اور ہر خواندہ اسے اپنی حالت پر ڈھال سکتا ہے، مثلاً :

۱ - میرے چپ رہنے میں خاص مصلحت ہے، جو ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔

۲ - مجھے یہ خوف دامنگیر ہے کہ کچھ کہوں گا تو رازِ عشق فاش ہو جائے گا اور میرے محبوب کی رسوائی ہو گی۔

۳ ۔ دل شکووں سے لبریز ہے۔ منہ کھلے گا تو زبان پر شکایتیں آئیں گی اور ممکن ہے، شکایتوں پر محبوب خفا ہو جائے ۔

۴ ۔ اگر شکایتیں بھی کیں تو ان سے محبوب کے دل پر کیا اثر ہو گا۔ لہٰذا پاسِ وضع کا تقاضا یہی ہے کہ چُپ رہے ۔

۵ ۔ ممکن ہے ، میرے گلے شکوے غیروں کے لیے خوشی کا سامان بن جائیں اور مجھے یہ منظور نہیں۔

غرض مختلف وجوہ ہو سکتے ہیں۔ مرزا نے اسے مبہم چھوڑ دیا اور شعر پڑھنے والے کے تخیل کے لیے پرواز کی گنجائش قائم رکھی ۔

۶ ۔ **شرح** : میں نالہ و فریاد کیوں نہ کروں ؟ اگر رُکتا اور چُپ ہوتا ہوں تو محبوب کہتا ہے : کیا سبب ہے ، اس کی آواز کان میں نہیں آتی ؟ کیا وہ مر گیا یا دیس چھوڑ کر پردیس چلا گیا ؟ میری فریاد اسے بھلی معلوم ہوتی ہے لہٰذا میں برابر چیختا رہتا ہوں ۔

۷ ۔ **شرح** : چارہ گر کے عقل و فہم پر حیران ہیں۔ فرماتے ہیں، کہ میں نے مانا ، تجھے دل کا داغ نظر نہیں آیا۔ لیکن اس کی بُو تو سونگھی جا سکتی ہے۔ داغ کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ گوشت جلے اور اس کی بُو آ جائے۔ افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر داغ اتنا نمایاں نہیں ، جسے بیک نظر دیکھا جا سکے تو کم از کم اس کی بُو سے تو پتا لگایا جا سکتا ہے ، لیکن یہ چارہ گر کیسا ہے ؟ نہ داغ دیکھ سکتا ہے نہ بُو سونگھ سکتا ہے ۔

۸ ۔ **شرح** : ہم عشق میں از خود رفتگی کے اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ ہمیں اپنے حال کی بھی کچھ خبر نہیں ملتی۔

یقیناً بیخودی میں ایک مقام ایسا بھی آ جاتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو بھی بالکل بھول جائے ۔ اس کا تجربہ ان لوگوں کو بارہا ہُوا ہو گا ، جو معاملات پر گہرے غور و فکر کے عادی ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کچھ سوچتا ہُوا

باہر نکل جاتا ہے اور خاصا فاصلہ اس عالم میں طے کر جاتا ہے کہ اسے اپنی ذات یا گردوپیش کا کچھ بھی خیال نہیں رہتا۔ ایسی ہی بیخودی مرزا پر طاری ہوئی جس میں وہ اپنے آپ کو کالاً فراموش کر بیٹھے۔

۹۔ **شرح** : پہلا "مرنا" مجاز ہے یعنی مرنے کا انتہائی شوق ہے، دوسرا "مرنا" حقیقت ہے، یعنی موت کی آرزو انتہائی حد پر پہنچی ہوئی ہے عشق میں ہمارا جو حال ہو چکا ہے، اس کے پیش نظر ایک لمحے کے لیے بھی جینا گوارا نہیں، لیکن مصیبت یہ ہے کہ موت کے شوق میں مرے جانے کے باوجود موت نہیں آتی۔ اس وجہ سے سخت کشمکش میں مبتلا ہیں۔ ایسی زندگی کو نہ زندگی کہہ سکتے ہیں، نہ اپنے شوق کے مطابق مر سکتے ہیں۔

۱۰۔ **شرح** : اے غالب! تم نے ساری عمر برائیوں اور گناہوں میں گزاری ہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی تم سے کوئی نیکی نہ ہوئی۔ اب کعبے جانے کے آرزومند ہو، لیکن وہاں کیا منہ لے کر جاؤ گے؟ کیا تمھیں اس حالت پر شرم نہیں آتی؟

غالباً ۱۸۵۱ء یا ۱۸۵۲ء میں بہادر شاہ ظفرؔ نے حج کا ارادہ کیا تھا اور اسی سلسلے میں میرزا غالبؔ نے یہ آرزو ظاہر کی تھی:

غالبؔ! اگر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

ویسے بھی انھیں حرمین شریفین اور نجفِ اشرف جانے کی بڑی آرزو تھی۔ وہ خود لکھنؤ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

ساتھ ہی اس خیال نے پریشان کیا کہ پوری زندگی گناہوں میں گزارنے کے بعد خانۂ خدا میں جاتے ہوئے یقیناً شرم آئے گی۔

دلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے؟ آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

ہم ہیں مشتاق اور وُہ بیزار یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے؟

جب کہ تجھ بِن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہیں؟ نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟

سبزہ و گُل کہاں سے آئے ہیں؟ اَبر کیا چیز ہے؟ ہَوا کیا ہے؟

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید جو نہیں جانتے، وفا کیا ہے؟

ہاں بھلا کر، تِرا بھلا ہو گا اَور درویش کی صدا کیا ہے؟

جان تم پر نثار کرتا ہوں میں نہیں جانتا، دُعا کیا ہے؟

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ! مُفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے؟

۱۔ شرح : پہلے مصرع میں سوال کا مدّعا استفسار نہیں، بلکہ اک گونہ ملامت ہے، یعنی اے دل! جو سوچ سمجھ سے بالکل عاری ہو چکا ہے، تو نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے؟ عشق کے جس درد میں تُو مبتلا ہے، بتا، اس کی کوئی دوا بھی ہو سکتی ہے؟ عشق تو ہمیشہ سے لادوا مانا گیا ہے۔

اس استفہام سے مختلف پہلو پیدا کرنا شعر کو بےمعنی بنا دینے کے مترادف ہے۔ مثلاً یہ مفہوم پیش کرنا کہ تجھے ہُوا ہی کیا ہے، جس کا علاج کیا جائے؟

یا یہ کہنا کہ اے دل! تُو مرض کو چھپا کیوں رہا ہے، صاف صاف بتا دے
کہ میں تیرے علاج کا انتظام کروں۔

۲۔ شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"گویا ابھی عشق کے کوچے میں قدم رکھا اور معشوق و عاشق
میں جو ناز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں، ان سے ناواقف ہے،
اس لیے باوجود اپنے مشتاق ہونے کے (محبوب کے) بیزار
ہونے پر تعجب کرتا ہے۔"

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ مرزا نے دوسرا مصرع جس محاورے میں
کہا ہے، جو شخص اس کے محلِ استعمال کو نہ جانتا ہوگا، اس کی نظر میں شعر
سُست اور مصرعے بے ربط ہوں گے۔

"محلِ استعمال اس کا یہ ہے کہ جب کسی کے پھیکے غمزوں پر
استہزاء یا تشنیع یا اظہارِ نفرت مقصود ہوتا ہے، جب اس طرح
کہتے ہیں اور اس مناسبت سے مصنّف نے مصرع لگایا اور
معشوق پر استہزاء کیا ہے۔"

بظاہر صحیح مفہوم وہی ہے، جو خواجہ حالی نے پیش کیا۔ یعنی ابتدائے عشق
ہے اور ابھی یہ معلوم نہیں کہ محبوب عموماً اظہارِ نیاز پر از روئے ناز الیسا طریقہ
اختیار کر لیتے ہیں، جس سے عاشق بیزاری کا اثر قبول کرے۔ کبھی معمولی
بات پر روٹھ جاتے ہیں۔ مقصود یہ ہوتا ہے کہ جانچیں اور پرکھیں، عاشق کے
دل میں کتنی لگن ہے، لہٰذا ناتجربہ کاری کے باعث عاشق کو تعجب ہوتا
ہے کہ ہم تو محبوب پر جان دیتے ہیں اور ہمارے شوق کی حد و نہایت ہی
نہیں، لیکن محبوب کی روش ایسی ہے، جیسے ہم سے بالکل بیزار ہو۔ خدا
جانے، یہ کیا معاملہ ہے! اس پر اظہارِ استعجاب کیا ہے۔

۳۔ شرح : "بھی" سے ظاہر ہوتا ہے کہ محبوب غیروں سے حال

پوچھ رہا ہے اور مرزا کی طرف متوجہ نہیں۔ فرماتے ہیں۔ میں بے زبان نہیں کہ آپ مجھ سے کچھ پوچھنا نہیں چاہتے۔ غیروں کی طرح میرے بھی منہ میں زبان ہے۔ میرا دل بھی تمناؤں اور ارمانوں سے لبریز ہے۔ کاش! مجھ سے بھی پوچھیے کہ تو کیا چاہتا ہے۔

۴-۷۔ شرح: اے خدا! جب تیرے سوا حقیقۃً کوئی موجود نہیں تو اردگرد جو ہنگامہ بپا نظر آتا ہے، آخر یہ کیا ہے؟

کہیں حسین اور دل لبھا لینے والے محبوب موجود ہیں۔ پھر ان کے غمزے ناز، عشوے اور ادائیں ایسی ہیں، جنھیں دیکھ کر انسان بے اختیار فریفتہ ہو جاتا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟

پھر محبوبوں کی سیاہ اور عنبر بھری زلفیں اور ان کی سرمئی آنکھوں کی نظریں ان سب کو کیا سمجھیں اور ان کی دلربائی و دلفریبی سے کیونکر بچیں؟

یہ سبزہ و گل، بہار کے یہ پرلطف منظر، بادلوں کا چھا جانا، نہایت خوشگوار ہواؤں کا چلنا، یہ سب کچھ کیا ہے؟

دنیا میں یہ گوناگوں ہنگامے اتنے دلکش ہیں کہ انسان ان میں الجھنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ بیشک اے خدا! حقیقی وجود صرف تیرا ہے اور ہمیں تیرے سوا کسی سے وابستگی نہ ہونی چاہیے۔ صرف تیری ہی لگن ہمارے دل میں ہونی چاہیے۔ تاہم تُو نے ہی دنیا میں ایسی بے شمار چیزیں پیدا کر دی ہیں، جو دلوں کو بے اختیار اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں کہ بقول مولانا طباطبائی سراب کی محویت میں دریا کی طلب سے ہاتھ دھوئے بیٹھے ہیں۔

۸۔ شرح: ہماری سادہ لوحی اور نادانی ملاحظہ فرمائیے کہ ان محبوبوں سے وفا کی امید لگائے بیٹھے ہیں، جو جانتے ہی نہیں کہ وفا کیا چیز ہوتی ہے۔

۹۔ شرح: درویشوں کی صدا اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ ہاں

بھلا کر، تیرا بھلا ہوگا۔

کتنا سادہ، سلیس اور مؤثر شعر ہے اور حقیقت بیان کی گئی ہے، یہ بھی عالم انسانیت کی بہت بڑی سچائیوں میں سے ایک سچائی ہے۔ جو لوگ اسے تغزّل کی بنا پر محبوبوں کی طرف لے جاتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ وہ خواہ مخواہ نامناسبت کے مرتکب ہوتے ہیں۔

۱۰۔ **شرح** : مجھے معلوم نہیں کہ دعا کسے کہتے ہیں، البتہ اے محبوب! تم پر جان قربان کر دینے کے لیے ہمہ تن اور ہر لحظہ آمادہ ہوں۔

دعا کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ کہ جس کے لیے دعا کی جائے کہ وہ بہتر سے بہتر حالت میں رہے۔ جو شخص دوسرے پر جان دے دینے کے لیے آمادہ ہو، کون سی دعا ہے، جو اس میں شامل نہ ہوگی؟ کوئی دعا جان نثاری سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی۔ یہی حقیقت مرزا غالب نے اس شعر میں پیش کی ہے۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ دعا خوشگوار الفاظ کا ایک مجموعہ ہوتی ہے جس میں زیادہ سے زیادہ نیک اور خیر طلب آرزوؤں کا اظہار کیا جاتا ہے۔ تاہم وہ صرف الفاظ ہوتے ہیں اور مرزا محبوب کے لیے جان دے دینے پر آمادہ ہیں۔ محض اچھے الفاظ کہ دینے پر وہ قناعت کے لیے تیار نہیں۔

۱۱۔ **شرح** : میں تسلیم کیے لیتا ہوں کہ غالب کی حیثیت کچھ نہیں، تاہم اے محبوب! ایک غلام مفت آپ کو مل رہا ہے، پھر اسے لے لینے میں مضائقہ کیوں ہو؟

لطف کا پہلو یہ ہے کہ بظاہر اپنے آپ کو مفت محبوب کے حوالے کر رہے ہیں، لیکن عاشق کے لیے اس قبول سے بلند تر مقام اور کیا ہو سکتا ہے؟

کہتے تو ہو تم سب کہ بُتِ غالیہ مو آئے
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ "وہ آئے"

۱۔ **لغات** ۔ غالیہ: ایک مرکب خوشبو، جو مشک

ہوں کشمکشِ نزع میں، ہاں جذبِ محبت
کچھ کہہ نہ سکوں، پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں، گو آئے

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

جلاد سے ڈرتے ہیں، نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے، جس بھیس میں جو آئے

ہاں، اہلِ طلب! کون سنے طعنۂ نا یافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اُس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے

کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اس سے، مگر مجھ کو ڈبو آئے

اس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے، غالب!
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

عنبر وغیرہ خوشبوئیں ملا کر تیار کرتے ہیں غالیہ مُو سے مراد ہے ایسا محبوب، جس کی زلفیں اس مرکب خوشبو میں بسی ہوئی ہوں۔

شرح:
اس غزل کے دوسرے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری وقت ہے۔ نزع کی حالت طاری ہے۔ عاشق کو محبوب کا انتظار ہے۔ اسے تسلی دینے کے لیے دوست احباب کہہ رہے ہیں کہ وہ آئے، وہ آئے، لیکن عاشق نے ان کے چہروں سے اندازہ کر لیا کہ محبوب کی آمد کوئی معمولی چیز نہیں۔ بادشاہوں

سے بھی بڑھ کر رعب داب اور ہیبت کی چیز ہے۔ اگر واقعی وہ آ رہا ہو تو دیکھنے والوں کے چہروں پر گھبراہٹ نہ طاری ہو جائے؟ اسی لیے کہتے ہیں کہ "وہ آتے" "وہ آئے" کہنے سے کیا تسلی ہو سکتی ہے؟ گھبرا کے کہو کہ وہ آئے یعنی محبوب کی واقعی آمد کی خبر وہ ہو سکتی ہے، جب سب پر گھبراہٹ طاری ہو۔

۲۔ **شرح**: میں جان کنی کی کشمکش میں ہوں۔ اے محبّت کی کشش! محبوب کو کھینچ۔ جانتا ہوں کہ میں بول نہ سکوں گا مجھ سے کچھ کہا نہ جائے گا۔ مگر اتنا تو ہو کہ وہ میرا حال پوچھ لے۔

۳۔ **لغات**۔ **صاعقہ**: گرنے والی بجلی۔

شرح: اِس شعر میں آنے کی دو مختلف تعبیریں ہو سکتی ہیں۔ اوّل دنیا میں انسان کی آمد، دوم محبوب کی آمد۔ قرینہ دوسری تعبیر کا مؤیّد ہے، لیکن پہلی تعبیر بھی بے تکلّف درست مانی جا سکتی ہے۔

پہلی تعبیر کے مطابق مطلب یہ ہُوا کہ انسان اس دنیا میں آتا ہے تو اس کی زندگی گرنے والی بجلی یا شعلے کی تپش اور پارے کی تڑپ کی طرح ہوتی ہے، یعنی یکایک آتا ہے، جتنی مدت یہاں گزارتا ہے، اسے قرار نصیب نہیں ہوتا اور رخصت ہو جاتا ہے۔ ہم نے مانا کہ ہم یہاں دنیا میں آئے، لیکن یہ آنا ہی سمجھ میں نہیں آتا کہ اکثر اتنی تھوڑی سی مدت کے لیے کیوں آئے اور جتنی بھی مدت تھی، وہ کس لیے بیتابی و بیقراری میں صرف ہوئی؟

دوسری تعبیر کے مطابق مفہوم یہ ہُوا کہ محبوب نے نوازش تو فرمائی یعنی آ تو گیا، مگر کس رنگ میں جیسے بجلی گری، شعلہ چمکا، پارا تڑپا اور وہ چلا گیا۔ لمحہ بھر کے لیے بھی نہ ٹھہرا۔ میں نے تسلیم کر لیا کہ محبوب آیا، مگر سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کیا آیا، کیوں آیا، اس آنے سے کیا حاصل تھا؟ ایسے لطف و کرم سے عاشق کے لیے تسکین کا کیا سامان بہم پہنچ سکتا تھا؟

۴۔ **لغات**۔ **نکیرین**: وہ دو فرشتے، جو مردے سے قبر میں عقائد وغیرہ

کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک کو منکر اور دوسرے کو نکیر کہتے ہیں۔
بادۂ دوشینہ : گزشتہ شب کی پی ہوئی شراب۔
شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"بادۂ دوشینہ یعنی رات کی پی ہوئی شراب، جو مرنے سے پہلے پی تھی محض ازراہِ شوخی کے کہتا ہے کہ نکیرین کے سوال وجواب سے بچنے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں کہ شراب پی کر مرے تاکہ نکیرین اس کی بُو کی کراہت سے بغیر سوال جواب کیے چلے جائیں۔"

مرزا کو شراب کی بُو سے منکر نکیر کے گھبرا کر بھاگ جانے کا اتنا یقین ہے کہ ایک مسلّم حقیقت کی بنا پر پوچھتے ہیں، ظاہر ہے کہ نکیرین گھبرا کے نہ بھاگیں گے؟ البتہ شرط یہ ہے کہ شب گزشتہ کی پی ہوئی شراب کی بُو مُنہ سے آئے۔

دیکھیے، نکیرین کے سوال وجواب کا معاملہ ماورائے محسوسات ہے اور انسانی عقل وفہم محسوسات پر مبنی ہے۔ یہ معاملہ محسوسات کا نہیں، لیکن مرزا پورے معاملے کو محسوسات کے عالم میں لے آئے ہیں۔ جس طرح عام شراب نہ پینے والوں کو اس کی بُو سے کراہت ہوتی ہے، اسی طرح مرزا فرض کیے بیٹھے ہیں کہ فرشتوں کو تقدس و پاکیزگی کی بنا پہ بہت زیادہ کراہت ہوگی۔ اگر شراب پی کر مرے تو سانس کی آمدورفت ختم ہو جانے کے باوجود منہ سے ضرور بو آئے گی اور فرشتے سراپا روح ہونے کے باعث اُس بُو کی تاب نہ لا سکیں گے۔ یوں سوال وجواب کی منزل بخیر وعافیت گزر جائے گی۔

۵۔ شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ رنج اور تکلیف سب خدا کی طرف سے ہے۔
مطلب یہ، ہم جسے بھی دیکھتے ہیں، اے محبوب حقیقی! یہی جانتے ہیں کہ تو ہے۔ جلاد قتل کے لیے آتا ہے، ہم اس سے بالکل نہیں ڈرتے۔ کیونکہ اس کے پسِ پردہ تُو کارفرما ہے۔ جو کچھ ہے تیری رضا اور تیرے حکم سے ہو رہا ہے" اس

سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے ؟ وہ تو عین ہمارا مقصود ہے ۔ اسی طرح واعظ کچھ بھی کہے، ہم اس سے جھگڑنے کے روادار نہیں اور کیوں جھگڑیں ؟ اس کے وعظ و نصیحت کا سرچشمہ بھی تو ہے، گویا تو ہی اس کے اندر سے بول رہا ہے پھر ہمارے لیے جھگڑنے کا کون سا مقام ہے ؟

سادہ لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ ایک وجودِ حقیقی کو مان لینے سے تمام ظاہری امتیازات مٹ گئے اور کوئی وجود کوئی بھیس بدل کر آئے، ہمارے نزدیک تیرے سوا کوئی نہیں۔

۶ ۔ **لغات** ۔ نایافت : نہ پانا، حاصل نہ کر سکنا۔

شرح : اے حقیقت کے طلبگارو ! ہم میں اتنی تاب کہاں کہ دوسروں کا طعنہ سنیں، اس نے حقیقت کو ڈھونڈا اور نہ پایا۔ جب ہم پر واضح ہو گیا کہ حقیقت ہمیں نہیں ملتی تو تلاش میں اپنے آپ ہی کو فنا دیا۔

مطلب یہ کہ ہمارے سامنے صرف دو صورتیں ہیں، مطلوب کو پا لینا یا اپنے آپ کو فنا کر دینا، تیسری صورت ہمارے نزدیک کوئی وجود نہیں رکھتی۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ مطلوب کو ڈھونڈیں، نہ پائیں، زندہ رہیں اور لوگوں کے طعنے سنیں کہ دیکھو، اس نے بہت تلاش کی لیکن مطلوب تک نہ پہنچ سکا۔

۷ ۔ **شرح** : ہمارا یہ دستور نہیں کہ کہیں آرام سے بیٹھ جائیں۔ ہم محبوبِ حقیقی کے دروازے پر پہنچے۔ جب دیکھا، وہاں بار نہیں ملتا تو کعبے چلے گئے کہ محبوب کی بارگاہ میں حاضری کا موقع نہیں تو چلو اسی مقدس مقام کی زیارت کر آئیں جسے محبوب کا گھر سمجھا جاتا ہے، یعنی بیت اللہ۔

اس سلسلے میں دو باتیں قابلِ غور ہیں، اوّل اس حقیقت کا اعلان کہ بیت اللہ دراصل عبادت باری تعالیٰ کا ایک ظاہری نشان ہے۔ اس کا تقدس ذاتِ باری تعالیٰ سے نسبت اور نشانِ عبادت کی حیثیت میں ہے۔

دوم اپنی تگ و دو اس دائرے سے باہر نہیں ہونے دی، جو مقرر کر دیا گیا، یعنی اصل آرزو محبوب حقیقی کے حضور میں باریاب ہونے کی ہے۔ اسی کے لیے تڑپ رہے ہیں، لیکن جب تک وہ نصیب نہ ہو، کعبے کی زیارت میں بھی تامل نہیں، کیونکہ کعبہ ذاتِ باری تعالیٰ سے خاص نسبت رکھتا ہے۔

۸۔ **شرح**: دوستوں اور ہم نشینوں نے میری آہ وزاری کے بارے میں محبوب کے پاس نہایت پرتاثیر تقریر کی۔ بہت کہا کہ عاشق درماندہ کو اس حالت میں رکھنا مناسب نہیں۔ ہر وقت روتا ہے، ہر لحظہ فریاد کرتا ہے۔ اس پر رحم کیجیے لیکن محبوب پر کچھ اثر نہ ہوا اور یوں میری جو رہی سہی حیثیت تھی، وہ بھی ختم ہو گئی۔ "مگر مجھ کو ڈبو آئے" کی دو تعبیریں ہو سکتی ہیں اوّل وہی جو پیش کی جا چکی یعنی محبوب پہ کچھ اثر نہ ہوا، دوم یہ کہ اب تک میں خودداری پر قائم تھا اور کبھی محبوب پر کوئی بات ظاہر نہ ہونے دی۔ دوستوں نے جو تقریر فرمائی، اس کے نتیجہ کیا نکلا؟ اثر تو ہو ہی نہیں سکتا تھا مگر میری خودداری کا بیڑا بھی غرق کر دیا۔

۹۔ **شرح**: دوست کہتے ہیں: "اے غالب! محبوب کی بزمِ ناز کی صحیح کیفیت کون پیش کر سکتا ہے؟ وہ ایسی بزم ہے، جس کا پورا نقشہ بیان میں آ ہی نہیں سکتا۔ ہم بھی گئے تھے اور تیری تقدیر کو رو کر لوٹ آئے۔"

تقدیر کو رونے کے دو مفہوم ہیں، اوّل یہ کہ اس بزمِ ناز میں تجھے بار میسر نہیں اور حق یہ ہے کہ جسے بار میسر نہ ہو، سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی قسمت پھوٹ گئی اور ایسی سیاہ نصیبی پر بے اختیار رونا آتا ہے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے بزمِ ناز سے تیری دُوری کا حال محبوب سے کہ دیا۔ گویا تیری کم نصیبی کا ذکر نہایت دردناک الفاظ میں کر دیا۔ تقدیر کو رونے کا مفہوم ہی یہ ہے کہ کسی کی کم نصیبی کی شکایت کی جائے۔

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے — سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

پھر جگر کھودنے لگا ناخن — آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز — پھر وہی پردۂ عماری ہے

چشم، دلّالِ جنسِ رسوائی — دل، خریدارِ ذوقِ خواری ہے

وہی صد رنگ نالہ فرسائی — وُہی صد گونہ اشکباری ہے

دل، ہوائے خرامِ ناز سے پھر — محشرستانِ بیقراری ہے

جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے — روزِ بازارِ جاں سپاری ہے

پھر اُسی بیوفا پہ مرتے ہیں — پھر وہی زندگی ہماری ہے

پھر کھُلا ہے درِ عدالتِ ناز — گرم بازارِ فوجداری ہے

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر — زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال — ایک فریاد و آہ و زاری ہے

پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب — اشک باری کا حکم جاری ہے

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا — آج پھر اُس کی روبکاری ہے

بے خودی بے سبب نہیں، غالب! — کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

۱۔ شرح: پھر دل جلوۂ حُسن کے لیے بیقرار ہو رہا ہے اور سینے کو پھر کاری زخم کھانے کی تڑپ ہے۔ گویا ہیں پھر کسی کی نگاہِ ناز کا بدف

بننے کے لیے مضطرب ہوں۔

۲۔ **شرح** : پھر بہار کی آمد آمد ہے۔ لالہ کاری کا سروسامان ہو رہا ہے۔ میرے ناخن بھی جگر کرید کرید کر زخم تازہ کر رہے ہیں، گویا لالہ کاری کا جواب مہیا کیا جا رہا ہے۔

۳۔ **لغات**۔ عماری : ہاتھی کے ہودے کو بھی کہتے ہیں اور اونٹ کے محمل کو بھی، جس میں سواریاں بیٹھتی ہیں۔ خصوصاً عورتیں۔ یہاں آخری معنی مراد ہیں۔

شرح : پھر وہی محمل میری نگاہ و نیاز کا اصل مقصد بن گیا ہے، جس میں محبوب پردہ نشیں ہے۔

یہاں قبلہ کا لفظ اس بنا پر استعمال کیا کہ عماری کے پردے کو پردۂ کعبہ قرار دے لیا۔

۴، ۵۔ **شرح** : پھر ہماری آنکھ نے جنسِ رسوائی کی دلالی شروع کر دی ہے۔ پھر ہمارا دل ذلت و خواری کی لذت کا خریدار ہے۔ چنانچہ دل سیکڑوں طریقوں پر فریاد و فغاں کر رہا ہے، جیسے پہلے کرتا تھا اور آنکھ بھی پہلے کی مانند سو سو طرح آنسو بہا رہی ہے۔

آنکھ کے آنسو بہانے اور دل کے فریاد و فغاں کرنے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ رازِ عشق کھُل جائے اور میرے لیے ذلت و رسوائی کا سامان بہم پہنچے۔

۶۔ **شرح** : پھر دل کو محبوب کے خرامِ ناز کی آرزو ہے اور اس کے لیے وہ بیقراری کا محشرستان بنا ہوا ہے۔ اتنا بیقرار ہے، گویا سیکڑوں قیامتیں بہ یک وقت بپا ہو رہی ہیں۔

محبوب کی چال کو عموماً قیامت بپا ہونے سے تعبیر کرتے ہیں۔ مرزا نے بھی اس شعر میں یہی حقیقت پیشِ نظر رکھی ہے۔

۷۔ **لغات** ۔ روزِ بازار: جس زمانے میں مرکزی مقامات سے ضرورت کی چیزیں لانے لے جانے کی سہولتیں نہ تھیں، مختلف مقامات پر ہفتے میں ایک یا دو مرتبہ بازار لگ جاتے تھے اور آس پاس کے لوگ اشیائے ضرورت وہاں سے خرید لیتے تھے۔ ان بازاروں کے لیے پہلے سے دن مقرر ہوتے تھے۔ یہی مقرر دن روزِ بازار کہلاتے تھے۔ اس سے مراد ہے گرمیٔ بازار یعنی خرید و فروخت کی کثرت۔

شرح: حسن نے پھر عشوہ و ناز کی نمائش شروع کر دی ہے۔ گویا سمجھ لینا چاہیے، جانیں نچھاور کر دینے کا خاص موسم آ گیا اور اس کی گرمیٔ بازار شروع ہو گئی۔

مطلب یہ کہ محبوب کے عشوہ و ناز کی خریداری کے لیے سب جانیں دے دینے پر آمادہ ہیں۔

۸۔ **شرح**: ہم پھر اسی محبوب پر جان دے رہے ہیں، جس نے ہم سے کبھی وفا نہ کی۔ دوسرے مصرع کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم نے زندگی کے وہی طریقے اختیار کر لیے ہیں، جو پہلے تھے۔ دوسرا یہ کہ وہی محبوب پھر ہماری زندگی کا سہارا بن گیا ہے، یعنی اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں۔

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں، جس کافر پہ دم نکلے

۹-۱۲۔ **شرح** پھر ناز کی عدالت کا دروازہ کھل گیا اور فوجداری کے مقدمے بہ کثرت ہونے لگے۔ دنیا میں اندھیر شروع ہو گیا اور زلفِ محبوب نے پھر سررشتے داری کا منصب سنبھال لیا۔

زلف کے ساتھ اندھیر، سر اور رشتہ کی مناسبت محتاجِ بیان نہیں۔

جگر کے ٹکڑے نے پھر نالش دائر کر دی۔ آہ و زاری اور فریاد کا ہنگامہ بپا ہے۔

دوسرے مصرع میں لفظ "ایک" نہ عدد کے لیے ہے، نہ تنکیر کے لیے، بلکہ محل استعمال کے اعتبار سے کثرت کے معنی دیتا ہے۔

عشق کے گواہ پھر طلب کیے گئے ہیں تاکہ ان سے بیان لیے جائیں۔ ہر طرف آنسو بہ رہے ہیں، حتیٰ کہ گواہ بھی مستثنیٰ نہیں۔

عاشق کے دل اور محبوب کی پلکوں کے درمیان جو مقدمہ چل رہا تھا، آج پھر اس کی پیشی ہے۔ گویا یہ سارا ہنگامہ اس پیشی کے سلسلے میں بپا ہوا۔

۱۴۔ شرح: اے غالب! تم کسی سبب کے بغیر بیخود نہیں ہو۔ ہم نے سمجھ لیا کہ کچھ نہ کچھ چھپانے اور راز میں رکھنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ گویا تم بیخود بن کر عشق کا بھید چھپانا چاہتے ہو۔

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو، گر شادمانی کی
نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذت زندگانی کی

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیر، موجِ آب کو فرصت روانی کی

پسِ مردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گلفشانی کی

۱۔ لغات:

تہمت کش: تہمت کھینچنے والا، یعنی وہ جس پر تہمت لگائی جائے۔

نمک پاش: نمک چھڑکنے والا۔

خراش: زخم

شرح: اگر مجھے تھوڑی دیر کے لیے خوشی کرتا ہوا پاؤ تو اس سے جنوں پر آرام و سکون کی تہمت نہ لگنی چاہیے۔ میں جو عارضی خوشی کرتا ہوں، اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آنے والی تکلیف زیادہ سے زیادہ محسوس ہو، کیونکہ خوشی کے بعد رنج و غم طبعاً زیادہ تکلیف دہ ہو جاتا

ہے۔ گویا زندگی میں تھوڑی سی لذت محسوس کرنا زخمِ دل پر نمک چھڑکنا ہے تاکہ درد اور بڑھ جائے۔ یہ آرام و سکون کی کوشش نہیں، بلکہ احساسِ رنج کو بڑھانے کی کوشش ہے۔

مولانا طباطبائی کے قول کے مطابق دوسرے مصرع کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان تمام مصیبتوں، پریشانیوں اور تکلیفوں میں ہمارا زندہ رہنا ہی زخمِ دل پر نمک چھڑکنے کے لیے کافی ہے۔

۲۔ لغات۔ کشاکش: کھینچ تان، کشمکش۔

شرح: زندگی کی کھینچ تان اور کش مکش سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کیونکر کامیاب ہو سکتی ہے؟ دیکھیے، آپ کے سامنے لہر کی مثال ہے، اسے رواں ہونے کا جو موقع ملا، وہی اس کے لیے ایک زنجیر بن گیا۔ یعنی اس نے زندگی کی کشمکش سے نکل جانے کی کوشش کی، لیکن وہ کوشش اسے مزید جکڑ لینے کا موجب بن گئی۔

دریا یا سمندر میں لہروں کو دیکھا جائے تو ان کی شکل زنجیر سے بالکل ملتی جلتی نظر آئے گی۔ وہ رواں تو اس لیے ہوئیں کہ زندگی کی الجھنوں سے نجات پا لیں، مگر وہی روانی ان کے لیے زنجیر بن گئی۔

۳۔ شرح: دیوانہ مر چکا، تیرا بی دفن ہو چکا، بلکہ قبر پختہ بھی کر دی گئی، لیکن لڑکے اب تک وہاں پہنچ رہے ہیں اور اسی طرح اینٹ پتھر برسا رہے ہیں جس طرح دیوانے کی زندگی میں برسا رہے تھے۔ پتھر پختہ قبر پر لگتے ہیں تو رگڑ سے شرارے پیدا ہوتے ہیں۔ دیوانہ یہ سمجھتا ہے کہ یوں اس کی قبر پر پھول چڑھائے جا رہے ہیں۔ اسی اعتبار سے قبر کو زیارت گاہ قرار دیا، نشانہ نہیں بنایا۔

نکوہش ہے سزا، فریادیِ بیدادِ دلبر کی
مبادا، خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی
رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے
اگر بووے بجائے دانہ دہقاں، نوکِ نشتر کی
پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی
کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض، کیا قدرت
کہ طاقت اُڑ گئی اُڑنے سے پہلے میرے شہپر کی
کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے، قیامت ہے
مری قسمت میں یا رب! کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

۱۔ **لغات :**
نکوہش : ملامت سرزنش۔
خندۂ دنداں نما : وہ ہنسی جس میں دانت نمایاں ہو جائیں یہ ہنسی طنز و تضحیک کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

شرح : جو عاشق محبوب کے ظلم و ستم کی فریاد کرے، وہ یقیناً سرزنش و ملامت کا سزاوار ہے۔ کچھ دور نہیں کہ حشر کے دن کی صبح اس کے لیے خندۂ دنداں نما بن جائے، یعنی اس کی ہنسی اڑائے۔ حالانکہ حشر کا دن حق و انصاف کا دن ہے۔ اگر اُس جھوٹے عاشق نے محبوب کے ظلم و جَور برداشت کر لیے ہوتے اور فریاد نہ کرتا تو اُسے اجر ملتا۔

۲۔ **لغات۔** ریشگی : ریشے کی خاصیت، یعنی اُگنا، بڑھنا، پھولنا، پھلنا۔

شرح : اگر کسان اُس صحرا میں، جہاں مجنوں نے زندگی گزاری اور وہیں مر مٹ کر خاک ہو گیا، دانے کی جگہ نشتر کی نوک بودے تو اس صحرا کی خاک نوکِ نشتر سے لیلیٰ کی رگ اُگائے اور اسے پھولنے پھلنے کی قوت دے دے۔

اس شعر میں بظاہر عشق و حسن اور عاشق و محبوب کا اتحاد ثابت کیا ہے اور اشارہ اس قصّے کی طرف ہے کہ ایک مرتبہ لیلیٰ کی فصد لی گئی تھی، تو دستِ مجنوں کی رگ سے خون جاری ہو گیا تھا۔ اسی پر کسی نے کہا تھا:

لوائی فصد لیلیٰ نے رگِ مجنوں سے خون آیا
محبت کے لیے لازم ہے اظہارِ اثر ہونا

۳۔ شرح: مجلس گرم ہوئی، جس کے لیے شمع کا جلنا لازم تھا۔ شمع جلی تو پروانے آ گئے۔ جامِ شراب کا دَور شروع ہو گیا۔ کشتیِ مے چلنے لگی۔ شاید پروانے کا پَر اُس کشتی کے لیے بادبان بن گیا۔

شعر کا مفہوم یہی ہے۔ باقی مرزا نے لفظوں کا ایک عجیب و غریب طلسم باندھنے کی کوشش کی ہے، جس میں کوئی حسن نظر نہیں آتا۔ شراب کی کشتی وہ ہوتی ہے، جس میں شراب کی بوتلیں رکھ کر حوض کے اندر چلا دیتے ہیں تاکہ اِرد گرد بیٹھے ہوئے تمام میکشوں تک شراب پہنچ جائے۔ کشتی کے لیے بادبان کا ہونا ضروری ہے اور مرزا نے کشتیِ مے کے لیے پروانے کا پر تلاش کیا۔ مجلس کی گرمی کا ایک لازمی جزو شمع ہے۔ شمع پر پروانوں کا آنا لازم ہے اس طرح مختلف چیزیں جوڑ کر ایک منظر پیدا کر دیا ہے۔

۴۔ لغات۔ پَرفشانی: پَر پھڑپھڑانا۔ اس کے معنی پَروں کا گر جانا بھی ہیں۔

شرح: پَر پھڑپھڑانے کا جو ذوق و شوق ہے، اس کا ظلم و جور بیان کرنے کی قدرت مجھ میں کہاں ہے؛ کیونکہ اڑنے سے پہلے ہی میرے شہپر کی قوت رخصت ہو گئی، یعنی میں ایک معمولی جنبش بھی نہیں کر سکتا۔ دل میں اڑنے کا ذوق یقیناً بے حد ہے، لیکن وہ ذوق ساتھ نہیں دیتا اور میں بے بس ہوں۔ یہی اس کا ظلم ہے۔

کسی شے کا ذوق و شوق ہو، مگر طاقت و استطاعت ساتھ نہ دے تو،

صاحبِ ذوق کی تکلیف و مصیبت محتاجِ بیان نہیں رہتی۔

۵۔ شرح : میں خیمۂ محبوب کے پچھواڑے میں کب تک روتا رہوں؛ اے خدا! کیا میری قسمت میں پتھر کی دیوار نہ تھی کہ اس سے سر پھوڑ لیتا اور جھگڑا ختم ہو جاتا۔ اب خیمے سے کیونکر سر پھوڑوں؟ وہ تو کپڑے کا ہے۔

مصیبت یہ ہے کہ خیمے کے پیچھے کھڑے رو رہے ہیں۔ سامنے ہوتے تو کم از کم محبوب کے دیدار سے ضرور فیض یاب ہو جاتے۔

بے اعتدالیوں سے سُبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے، اُتنے ہی کم ہوئے

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی؟ کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

۱۔ لغات:

سبک : ہلکا، بے وقعت۔

شرح: ہم مختلف معاملات میں حد سے تجاوز کرتے رہے۔ اعتدال کا کوئی خیال نہ تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سب میں بے وقعت ہو گئے اور ہمارا وقار کھو گیا۔ دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ جتنے آگے بڑھے تھے، یعنی بے اعتدالی کے باعث

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اللہ رے تیری تندیِ خو جس کے بیم سے
اجزائے نالہ دل میں مرے، رزقِ ہم ہوئے

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق
جو پاؤں اُٹھ گئے، وہی اُن کے عَلَم ہوئے

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے، سو وہ یاں آ کے دم ہوئے

چھوڑی اسدؔ! نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

حد سے نکل گئے تھے، اتنا ہی ہمیں کم ہونا اور پیچھے ہٹنا پڑا۔
بے اعتدالی کے مقابلے میں زیادہ ہونا اور سبک ہونے کے مقابلے میں کم ہونا ہے۔

۲۔ شرح۔
خواجہ حالیؔ فرماتے ہیں۔
"جو مطلب اس طریقے سے ادا کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم کو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی مصائب و شدائد نے گھیر لیا تھا۔"

کہتے ہیں کہ ہمارے آشیانے کے بالکل پاس جال لگا ہوا تھا، جو ہماری نظروں سے پوشیدہ تھا۔ ابھی ہم پر ہی تول رہے تھے، اُڑے نہ تھے کہ اُس جال میں پھنس گئے۔

شکاری عموماً جال ایسے طریقے پر لگاتے ہیں کہ وہ شکار کی نگاہوں سے چھپا رہے تاکہ آسانی سے پھنس جائے۔ "اُڑنے نہ پائے تھے" سے بظاہر اد یہ ہے کہ ابھی آشیانے سے جست کی تھی اور فضا میں بازو پھیلا کر توازن

قائم نہ کر سکے تھے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جال آشیانے سے اتنا قریب تھا، گویا کہہ سکتے ہیں، بالکل ملا ہُوا تھا، جیسا کہ "سخت قریب" سے ظاہر ہے۔

۳۔ **شرح** : خود مرزا غالب میر مہدی مجروح کو اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"پہلے یہ سمجھو، قسم کیا چیز ہے ؟ قد اس کا کتنا لمبا ہے ؟ ہاتھ پاؤں کیسے ہیں ؟ رنگ کیسا ہے ؟ جب یہ نہ بتا سکو گے تو جانو گے کہ قسم جسم و جسمانیت میں سے نہیں، ایک اعتبارِ محض ہے، وجود اس امر کا صرف تعقل میں ہے۔ سیمرغ کا سا اس کا وجود ہے، یعنی کہنے کو ہے، دیکھنے کو نہیں۔ پس شاعر کہتا ہے کہ جب ہم آپ اپنی قسم ہو گئے تو گویا اس صورت میں ہمارا ہونا ہمارے فنا ہونے کی دلیل ہے۔"

محاورہ یہ ہے کہ فلاں شے ہمارے پاس قسم کھانے کو بھی نہیں، یعنی نام کو بھی نہیں، کیونکہ اگر اس کا وجود کچھ ہوتا تو قسم کھانے کا ثبوت بن سکتا تھا۔ یہی محاورہ مرزا نے اس شعر میں استعمال کیا ہے۔ فرماتے ہیں: "ہمارا ہونا، ہمارے فنا ہونے کی ایک دلیل ہے۔ ہم مٹتے مٹتے اس حد پر پہنچ گئے گویا اپنی قسم بن گئے ہیں۔ یعنی نام کو بھی ہمارا وجود باقی نہ رہا۔

۴ ۔ **شرح** : جن لوگوں نے عشق کی سختیاں جھیلیں، ان کے بارے میں کیا پوچھتے ہو ؟ وہ لوگ رفتہ رفتہ گھلتے گھلتے سراپا رنج و غم رہ گئے۔ جس طرح خارج میں رنج و غم کا کوئی وجود نہیں، اسی طرح عاشقوں کا وجود بھی عشق کی کڑیاں برداشت کرتے کرتے تحلیل ہو گیا۔

۵۔ **شرح** : اے محبوب! زمانے میں محض تیری ہی طرف سے ہم پر ظلم و ستم نہیں ہوئے، تیرے علاوہ بھی ہمیں گوناگوں جفاکاریوں سے سابقہ پڑتا رہا۔ اگر تو وفاداری کا پابند ہو جاتے تو تیرے ظلموں کی تلافی

تو ہو جائے گی، لیکن تیرے علاوہ جو ظلم ہوئے، ان کی تلافی کیونکر ہو گی؟

اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں اول یہ کہ مجھے جو جفائیں جھیلنی پڑیں، وہ صرف عشق کے باعث نہ تھیں۔ عشق کے علاوہ بھی مجھے بے شمار رنج و غم پہنچے۔ دوم یہ کہ اپنی پریشاں حالی کو بڑھا چڑھا کر محبوب کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ترس کھا کر فوراً تلافی پر متوجہ ہو جائے۔

۶۔ **شرح**: ہم جنون و دیوانگی کی داستانیں قلم بند کرتے رہے، جو اتنی دردناک تھیں، گویا ان کے لفظ لفظ سے خون ٹپکتا تھا۔ اگرچہ اس مشغلے میں ہمارے ہاتھ کٹ گئے، لیکن ہم نے داستاں طرازی نہ چھوڑی۔

مطلب یہ ہے کہ ہماری دُھن پکّی اور ہمارا عزم اٹل تھا۔ ہم عشق و شیفتگی کی داستانیں مرتب کرتے رہے۔ وہ اتنی درد انگیز تھیں کہ کار فرماؤں نے اس جرم میں ہمارے ہاتھ کٹوا دیے، مگر ہم نے اُس حالت میں بھی پوری عزیمت کے ساتھ اپنا کام جاری رکھیں۔

یہ شعر اُن مجاہدینِ حق کی عزیمت آشکارا کر رہا ہے، جو بلند مقاصد کے لیے، جدوجہد شروع کرتے ہیں اور کوئی ظلم و جبر انھیں اس راستے سے اِدھر اُدھر نہیں کر سکتا۔

۷۔ **لغات**۔ رزقِ ہم: ایک دوسرے کا رزق۔

شرح: اے محبوب! تیری شعلہ مزاجی اور تیز طبعی کے بارے میں کیا کہا جائے؟ اس کے خوف سے میری فریاد و فغاں کے اجزاء گھُل کر اور تحلیل ہو کر اندر ہی اندر ایک دوسرے کو کھا گئے۔ یعنی فریاد اس لیے نہ کر سکا کہ تیری تندخوئی کا ڈر تھا۔ نالہ دل سے اٹھتا تھا، پھر جزو جزو ہو کر اندر ہی اندر تحلیل ہو جاتا تھا اور اس کے مختلف اجزاء ایک دوسرے کو کھا جاتے تھے۔

۸۔ **لغات**۔ اہلِ ہوس: جھوٹے عاشق، جو عشق سے نا آشنا ہوں اور صرف ہوس پوری کرنا چاہتے ہیں۔

نبرد : جنگ ، لڑائی ۔

شرح : جھوٹے عاشقوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ عشق کی جنگ سے الگ ہو جائیں ۔ وہ اس راستے کی سختیاں برداشت نہیں کر سکتے ۔ امتحانوں میں سرخرو نہیں ہو سکتے ۔ ان کے لیے کامیابی کی کوئی صورت نہیں ، صرف اس جنگ کے میدان سے باہر نکل جانا ہی ان کے لیے بہتر ہے ۔ اسی کو انھیں اپنی فتح سمجھنا چاہیے ۔ فتح کا نشان یہ ہوتا ہے کہ جھنڈے بلند کیے جاتے ہیں اور پرچم لہرائے جاتے ہیں ۔ اہلِ ہوس کا میدانِ عشق سے الگ ہو جانا اور پاؤں اٹھا کر چل پڑنا ہی ان کے لیے فتح کا پرچم لہرانا ہے ۔

کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ اہلِ ہوس کے لیے میدانِ عشق سے باہر نکل جانا ہی مناسب ہے ۔ اس کے لیے طریقہ ذرا تکلف کا اختیار کیا ۔

۹ ۔ **شرح :** قدرت نے روزِ اوّل ہی سے چند نالے ہمارے سپرد کر دیے تھے ۔ جب تک ہم اس دنیا میں نہ آئے ، نالہ کشی میں مشغول رہے ، جب یہاں آ گئے تو انھیں نالوں نے سانسوں کی شکل اختیار کر لی ۔

شعر سے صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ جب سے ہماری ہستی کی بنیاد استوار ہوئی ، فریاد و فغاں کے سوا ہمارا کوئی کام نہیں ، یہاں تک کہ اس دنیا میں آ کر ہم نے جو سانس لیے ، وہ بھی دراصل نالے ہی تھے ، جو یہاں آنے سے پیشتر کھینچے نہیں گئے تھے ۔

بعض اصحاب نے اس شعر کا ماخذ عرفی کا مندرجۂ ذیل شعر قرار دیا ہے :

نالۂ می کشم از دردِ تو گاہے ، لیکن
تا بہ لب می رسد از ضعف نفس می گردد

یعنی اے محبوب ! مجھے تیرا دردِ عشق ستاتا ہے تو نالہ سر کرتا ہوں ، لیکن ضعف کا یہ عالم ہے کہ وہ لب تک پہنچتے پہنچتے سانس بن جاتا ہے ۔

نالے کا سانس کی شکل میں تبدیل ہو جانا بجا ، مگر عرفی اور غالب کے مضمون

بالکل الگ ہیں۔ عرفی صرف ضعف کی کیفیت بیان کر رہا ہے، جس کی وجہ سے نالے سانس بن گئے۔ میرزا غالب اپنی فطری و ازلی دردمندی کا اظہار کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ازل ہی سے ہم دردمند ہیں نالہ سر کرنا ہمارا فطری وظیفہ قرار دے دیا گیا ہے۔ جو نالے ہم عدم میں سر نہ کر سکے، وہی اس حیاتِ مستعار میں آکر ہمارے سانس بن گئے۔

۱۰۔ **شرح** : اے اسدؔ! ہم نے گدائی اختیار کی تو دل لگی اور عشق و محبت کا مشغلہ اس حالت میں بھی نہ چھوڑا۔ ہم سائل تو بن گئے، لیکن اہل کرم کے عاشق ہو گئے۔

مطلب یہ کہ عشق ہماری گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ وہ ہم سے چھوٹ نہیں سکتا، یہاں تک کہ کوئی دوسرا پیشہ بھی اختیار کریں تو عشق کے طور طریقے سے ادھر اُدھر نہ ہوں گے۔

جو نہ نقدِ داغِ دل کی، کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہے، بہ کمینِ بے زبانی
مجھے اُس سے کیا توقع، بہ زمانۂ جوانی
کبھی کودکی میں جس نے، نہ سُنی مری کہانی
یونہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب، ورنہ کہتا
کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

۱۔ **لغات** :
نقد : نقدی، اشرفی، روپیہ۔
کمین : گھات۔ اگر محبت کا شعلہ داغِ دل کی نقدی، یعنی اشرفی کی نگہبانی نہ کرے یعنی اسے ہر وقت گرم نہ رکھے تو بے زبانی یعنی خاموشی کی گھات میں افسردہ دلی چھپی بیٹھی ہے، وہ اس داغ کو افسردہ کر دے گی، یعنی یہ داغ اپنی

تپش کھو کر مٹ جائے گا۔

مطلب یہ ہے کہ شعلۂ محبت، ہر لحظہ داغِ دل کو گرم رکھتا ہے، ورنہ محبوب سے دُوری کے باعث جو افسردگی و پژمردگی چھائی ہوئی ہے اور جس کے باعث میں خاموش بیٹھا ہوں، داغِ دل کو افسردہ کر ڈالے گی۔

۲۔ شرح: جس محبوب نے لڑکپن میں میری دردبھری کہانی نہ سنی، حالانکہ اس عمر میں کہانیاں سننے کا خاص شوق ہوتا ہے، اس سے جوانی کے زمانے میں کیا اُمید رکھ سکتا ہوں؟

۳۔ شرح: کسی کو خواہ مخواہ دکھ دینا اور مصیبت میں ڈالنا اچھا نہیں، ورنہ مَیں دعا مانگتا کہ یارب! میری زندگی میرے دشمن کو عطا کر دے۔ یعنی میری زندگی اتنی المناک اور درد انگیز ہے کہ دشمن کے لیے بھی ایسی زندگی کی آرزو نہیں کر سکتا۔

واضح رہے کہ یہ بھی اپنی زندگی غم ناک و رنج افزا ہونے کا ایک اندازِ بیان ہے۔ واقعی مقصود یہ نہیں کہ دشمن کے لیے ایسی دعا مانگی جائے۔

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے

نے مژدۂ وصال، نہ نظارۂ جمال
مدّت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

مَے نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق! یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے

۱۔ شرح: میرزا خود اس شعر کی شرح کرتے ہوئے عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہیں:

"اک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے" یہ خبر ہے۔ پہلا مصرع "ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے" یہ مبتدا ہے یہ

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست
بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمھیں ہوسِ نا و نوش ہے

دیکھو مجھے، جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو، جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بہ جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنّتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و سُور، نہ جوش و خروش ہے

"شبِ غم کا جوش" یعنی اندھیرا ہی اندھیرا۔ ظلمتِ غلیظ، سحر ناپید، گویا خلق ہی نہیں ہوئی۔ ہاں، ایک دلیلِ صبح کی بود پر ہے، یعنی بجھی ہوئی شمع۔ اس راہ سے کہ شمع و چراغ صبح کو بجھا دیا کرتے ہیں۔ لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیلِ صبح ٹھرایا ہے، وہ خود ایک سبب ہے منجملہ اسبابِ تاریکی کے۔ پس دیکھا چاہیے جس گھر میں علامتِ صبح مؤیدِ ظلمت ہو گی، وہ گھر کتنا تاریک ہو گا! اس شرح پر شاگرد کے ایک دوست نے اعتراض کیا۔ شاگرد نے یہ اعتراض مرزا کو لکھ بھیجا۔ جواب میں فرماتے ہیں:

"مولوی نظام الدین گنجوی علیہ الرحمۃ کا ایک شعر طالب علموں کے ہاتھ پڑا۔ انھوں نے از روئے قواعدِ نحو

اس میں کلام کرنا شروع کیا ... مولوی کے پاس جب وہ کلمات پہنچے تو فرمایا: "کر یاراں! شعر مرا بہ مدرسہ کہ بُردہ؟"

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

"جو صاحب یہ فرماتے ہیں کہ مجموع پہلا مصرع مبتدا نہیں ہو سکتا۔ ان سے پوچھا چاہیے کہ کیا آپ اس پہلے مصرع میں سے "ظلمت کدے میں میرے" اس کو مبتدا اور "شبِ غم کا جوش ہے"، اس کو خبر ٹھہراتے ہیں؟ پس اگر یوں ہے تو بھی مدعا حاصل ہے۔ دوسرا مصرع دوسری خبر ہے۔ آخر یہ بھی تو مسلّمات فنِ نحو میں سے ہے کہ ایک مبتدا کی دو بلکہ زیادہ خبریں ہو سکتی ہیں۔

"ہاں ایک قاعدہ اور ہے۔ یعنی جملۂ فعلیہ کے ماقبل جو عبارت ہوتی ہے، اس کو مبتدا نہیں کہتے۔ اس مطلع کا مصرع ثانی جملۂ اسمیہ ہے۔ اپنے ماقبل مبتدا کو قبول کرتا ہے۔ اگر ہم نے نظر اس دستور پر مصرع اوّل کو مبتدا کہا تو بھی قباحت لازم نہیں آتی بہرحال جو وہ صاحب اس پہلے مصرع کو قرار دیں، وہ مجھے قبول ہے۔ مگر شعر میرا مہمل نہیں۔ زیادہ اس سے کیا لکھوں"؟

میرے اندھیرے گھر میں شبِ غم کے جوش و شدّت کا یہ عالم ہے کہ صبح کی علامتیں ناپید ہیں، صرف ایک نشان رہ گیا ہے اور وہ بجھی ہوئی شمع ہے اندھیرے کی شدّت واضح کرنے کے لیے جس شے کو صبح کی دلیل ٹھہرایا یعنی شمع کو، وہ خود بجھی ہوئی ہے، یعنی اندھیرے کے تصوّر میں اضافہ کرتی ہے۔

۲ - لغات - آشتی : صلح۔

شرح : اب نہ محبوب کی طرف سے وصال کی خوشخبری آتی ہے، نہ اس کے حسن و جمال کے نظارے کا کوئی موقع ہے۔ انھیں دو باتوں پر چشم و گوش میں کشمکش رہتی تھی۔ دیدار نصیب ہوتا تو کانوں کو شکایت پیدا ہوتی۔ وصال کی نوید ملتی تو آنکھیں گلہ کرتیں۔ دونوں باتیں نہ ہونے سے آنکھوں اور کانوں کے درمیان صلح کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ نہ ایک کو شکوے کا موقع باقی، نہ دوسرے کو گلے کا۔

۳۔ شرح : شراب کے نشے نے اُس محبوب کو شرم و حجاب سے بے نیاز کر دیا ہے، جسے ہر لحظہ آرائش کا خیال رہتا ہے۔ اے شوق! اس حالت میں ہوش و حواس گم کر دینا اور ضبط و قرار کے بند ٹوٹ جانا بالکل جائز ہے اور اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

۴۔ لغات۔ عقد : ہار

شرح : گوہر بیچنے والے نے موتیوں سے جو ہار تیار کیا، وہ حسینوں کی گردن میں پڑا تو قابلِ رشک نندہ پیدا ہو گیا۔ دیکھیے، گوہر بیچنے والے کا ستارہ کتنی بلندی پر ہے!

بلندی اس لیے کہا کہ ہار حسینوں کی گردن میں پہنچ گیا جو بہر حال ایک بلند مقام ہے۔ رشک کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ گوہر فروش نے جو ہار تیار کیا، وہ خود حسینوں کو پہنایا، گویا اس کے ہاتھ ان کی گردنوں میں حائل ہوئے اور عاشق اس کے لیے ہمیشہ ترستے رہتے ہیں۔

۵۔ شرح : محبوب کے تصور کی محفل بھی ایک شراب خانہ ہے، مگر ایسا، جس میں کوئی ہنگامہ اور کوئی ہاؤ ہو نہیں۔ اس شراب خانے میں دیدار کی شراب ملتی ہے، حوصلہ ساقی گری کا کام انجام دیتا ہے اور نگاہیں مست رہتی ہیں۔

مطلب یہ کہ تصور میں بھی محبوب کا دیدار نصیب ہوتا ہے، جتنا کسی

کا حوصلہ ہو، اس کے مطابق شراب مل جاتی ہے اور نگاہیں مست رہتی ہیں۔
یہاں تصور سے مراد مراقبہ بھی ہو سکتا ہے اور شعر محبوبِ مجازی کے بجائے
محبوبِ حقیقی سے متعلق سمجھ سکتے ہیں۔

۶ - ۱۲ - **لغات** : تازہ وارد : نیا نیا آنے والا۔

بساط : بزم کا فرش، یعنی بزم۔

ہوائے دل : دل کی خواہش۔

زنہار : کلمۂ تاکید، جو نفی اور اثبات دونوں کے لیے آتا ہے، یہاں
اثبات کی تاکید مراد ہے۔

نا و نوش : نغمہ اور شراب۔

دیدۂ عبرت نگاہ : عبرت کی نظر رکھنے والی آنکھ، وہ آنکھ جو عبرت
حاصل کرے۔ عبرت سے مراد ہے خاص حالت میں طبیعت کا غفلت سے آگاہی
کی طرف آنا، یعنی نصیحت حاصل کرنا۔

گوشِ نصیحت نیوش : نصیحت سننے والا کان۔

چنگ : ایک ساز، سارنگی۔

سُور : خوشی، شادمانی

شرح : اے وہ لوگو! جو دل کی خواہشوں اور آرزوؤں کی محفل میں
نئے نئے آئے ہو اور نغمہ و شراب کی طلب میں اندھے ہوئے جا رہے ہو،
خبردار!

اگر تمھارے پاس ایسی آنکھ ہے، جو عبرت حاصل کر سکے تو مجھے دیکھو،
مجھ پر نظر ڈالو۔ اگر تمھارے پاس نصیحت سننے والے کان ہیں تو میری بات
سنو۔ میں نا و نوش کا تجربہ کر چکا ہوں اور میری باتیں گھر کے بھیدی کی حیثیت
رکھتی ہیں۔

ساقی جلوہ دکھا کر اور شراب پلا کر عقل و ایمان کو تباہ کر دیتا ہے۔ گانے والا

گا کر اور نغمہ سُنا کر ہوش اور وقار و تمکنت کو غارت کر ڈالتا ہے۔ یعنی حسین و جمیل ساقی کے ہاتھ سے شراب پی جائے تو نہ ایمان باقی رہتا ہے، نہ عقل اور گانے والے کے فنوں کی لت پڑ جائے تو عزت و وقار بھی ضائع ہو جاتے ہیں اور ہوش و حواس بھی۔

پھر اس عیش و نشاط کی حالت کیا ہے؟ رات کو مجلس آراستہ تھی، تو فرش کا ہر گوشہ باغبان کے دامن اور پھول بیچنے والے کے ہاتھ کی طرح پھولوں سے بھرا ہوا نظر آتا تھا۔

ساقی کی خوش خرامی ایسا پُر لطف نظارہ پیش کرتی تھی، گویا نگاہ کے لیے جنت کا منظر پیدا ہو گیا تھا اور سارنگی کی سُریلی آواز میں اتنی لذت تھی، گویا کانوں کے لیے فردوس آراستہ ہو گیا تھا۔

یہ تو رات کی کیفیت تھی، لیکن صبح کو دیکھتے ہیں تو محفل میں نہ وہ سرور و شادمانی نظر آتی تھی، نہ وہ جوش و خروش سنائی دیتا تھا۔

مجلس درہم برہم ہو چکی تھی، اس کی بساط الٹ گئی تھی۔ جو شمع رات بھر جلتی رہی تھی، وہ گل ہو چکی تھی، گویا رات کی ہنگامہ آرائی سے محرومی کا ایک داغ بن کر رہ گئی تھی۔

پورے قطعے میں دو منظر پیش کیے گئے ہیں۔ پہلا اس وقت کا، جب مجلس کی رونق عروج پر تھی، دوسرا اس وقت کا، جب ساری رونق اور چہل پہل ختم ہو چکی تھی، سناٹے اور ہُو کا عالم باقی رہ گیا تھا۔ مولانا طباطبائی نے بالکل درست لکھا ہے، آخر کے دو شعر اس سبب سے زیادہ بلیغ ہیں کہ ان کا اثر گرفتگیِ خاطر ہے اور جو گرفتگی و اشد کے بعد ہو، اثر قوی رکھتی ہے۔

۱۳۔ **لغات** - صریرِ خامہ: وہ آواز جو لکھتے وقت قلم سے پیدا ہوتی ہے۔ قلم سے مراد کلک ہے، جس سے غالب کے زمانے میں لکھا جاتا تھا۔ انگریزی قلم یا انڈی پنڈنٹ نہیں۔

نوائے سروش : فرشتے کی صدا۔

شرح : اے غالبؔ ! تیرے خیال میں غیب سے مضمون آتے ہیں یعنی یہ تمام مطالب غیب سے تجھ پر القا ہوتے ہیں۔ گویا تیرے قلم کی آواز فرشتے کی صدا ہے۔

آ، کہ مری جان کو قرار نہیں ہے — طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

دیتے ہیں جنّت حیاتِ دہر کے بدلے — نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو — ہائے! کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر — خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے

دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی — غیرِ گُل آئینۂ بہار نہیں ہے

قتل کا مرے کیا ہے عہد تو بارے — وائے! اگر عہد استوار نہیں ہے

تُو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالبؔ! — تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

۱- **شرح :** اے محبوب ! آ اور جلد آ، کیونکہ میری جان کو صبر و قرار نہیں وہ حد درجہ بیتاب و مضطرب ہے۔ تیرا انتظار ایک بہت بڑی مصیبت ہے۔ اس مصیبت کی سختیاں اور پریشانیاں برداشت کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں۔

۲- **شرح :** اس دنیا میں جو غم و رنج اور اندوہ و قلق کا ایک طوفانی سمندر ہے، زندگی گزار چکنے کے بعد جنّت صلے میں ملے گی، لیکن جنّت ان غموں اور مصیبتوں کی تلافی کر سکے گی، جو ہم نے روئے زمین پر برداشت کیں، جنّت کا نقشہ ایسا نہیں، جو دنیوی زندگی کے خمار یعنی نشہ اُترنے کی تکلیفوں اور اذیتوں کے زخموں کا مرہم بن سکے۔

صرف نشے کا عادی ہی صحیح اندازہ کر سکتا ہے کہ جب نشہ ٹوٹتا ہے تو جسمانی اور ذہنی اعتبار سے اس پر کیا قیامت گزرتی ہے، جتنا سخت خمار ہو۔

اگر اُسی کے مطابق شراب نہ ملے تو تکلیفیں دُور نہ ہو سکیں گی۔ یہی حقیقت اس شعر میں پیش کی گئی ہے۔ در اصل کہنا یہ چاہتے ہیں کہ تنہا بہشت دنیوی زندگی کی مصیبتوں کا پورا بدلا نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ محبوب حقیقی کی جلوہ فرمائی بھی ہونی چاہیے۔ نری جنّت ہمارے خمار کی تلافی نہ کر سکے گی۔

فارسی میں بھی یہ خیال پیش کیا ہے:

جنّت نہ کند چارۂ افسردگیٔ دل
تعمیر بہ اندازۂ ویرانیٔ ما نیست

یہاں ہمیں رنج و کدورت اور دل گرفتگی کے جن اسباب سے سابقہ پڑا رہا۔ ان کی تلافی جنّت نہیں کر سکتی۔ ہم یہاں جتنی بربادی سے دوچار ہوئے ہیں، تعمیر نو کا انتظام اس کے مطابق نظر نہیں آتا، یعنی جنّت کی آبادی اس دنیا کی ویرانی کا بدل نہیں بن سکتی۔

۳۔ شرح: اے محبوب! میں تیری محفل میں پہنچتا ہوں تو تیرے تغافل اور بے اعتنائی پر بے اختیار آنسو بہ نکلتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مجھے جبراً نکال دیا جاتا ہے۔ ضبط و صبر پر مجھے اختیار ہوتا تو نہ روتا۔ افسوس کہ اختیار نہیں ہے۔

رونے پر محفل سے نکالے جانے کی کوئی وجہ مرزا نے بیان نہیں کی، اسے مبہم چھوڑ دیا، کیونکہ ہر فرد کے رونے کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ عیش و نشاط کی بزم میں کسی کا رونا بالکل بے محل ہوتا ہے، دوسرا یہ کہ رونے سے محبوب کی رسوائی ہوتی ہے۔ تیسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ محبوب رقیبوں پر مہربان ہے اور عاشق صادق سے بے اعتنائی برتتا ہے۔

۴۔ شرح: اے محبوب! ہمارے متعلق یہ گمان بالکل بیجا ہے، کہ ہمارا دل آپ سے مکدر ہو جائے گا، کیونکہ ہم تو سچے عاشق ہیں اور سچے عاشقوں کی مٹی گرد و غبار سے بالکل پاک ہوتی ہے۔ پھر ہمارا دل مکدر

ہونے کا کون سا امکان ہے؟

دوسرا پہلو یہ ہو سکتا ہے کہ خاطر سے مراد خاطرِ محبوب لی جائے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے: ہمارے متعلق یہ گمان صحیح نہیں کہ ہماری کسی بات سے آپ کے دل میں تکدر پیدا ہو گا، کیونکہ ہماری خاک میں تو غبار ہے ہی نہیں۔ اگر ہوتا تو آپ کا دل میلا ہو جانے کا بھی احتمال باقی رہتا۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ یہاں لفظ "خاک" طینت کی جگہ لایا گیا ہے لیکن خلافِ محاورہ ہے۔ موجودہ صورت میں شعر کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم مٹ کر خاک بھی ہو جائیں گے تو اس سے غبار نہ بنے گا، جو آپ کا دل مکدر ہونے کا باعث ہو۔

۵۔ **شرح** ۔ اے مخاطب! تیرے پاس دل ہے تو ہماری معنی آرائیوں کے جلووں سے لطف اٹھا۔ ان جلووں کی حیثیت فصلِ بہار کی سی ہے اور بہار کا آئینہ پھول کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جس طرح بہار کی حقیقی کیفیت پھول میں نظر آتی ہے، اسی طرح دل ہمارے کہے ہوئے حقائق سے ٹھیک ٹھیک استفادہ کر سکتا ہے۔

۶۔ **شرح** : محبوب نے میرے قتل کا پختہ وعدہ تو کر لیا ہے۔ افسوس، اگر یہ وعدہ عمل میں پختہ ثابت نہ ہوا۔ اس طرح محبوب کے ہاتھوں قتل ہونے کا ارمان دل ہی میں رہ جائے گا، کیونکہ اس ارمان کا پورا کرنا عہد کی استواری پر موقوف ہے۔

۷۔ **شرح** : قسم کھانا، حلف اٹھانا، کسی چیز کی قسم کھانا، کسی چیز کو چھوڑ دینے کا عہد کرنا۔

صاف مطلب یہ ہے کہ اے غالب! تو نے شراب چھوڑ دینے کی قسم کھائی ہے، لیکن تیری قسم کا اعتبار کیا ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ کب شراب چھوڑے اور کب پھر پینا شروع کر دے۔

شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اے غالب! تو نے میکشی کا حلف اٹھایا ہے، پینے یا چھوڑ دینے کا بالتصریح کوئی ذکر نہیں۔ جب تیری قسم مختلف

بلکہ متضاد پہلو لیے ہوئے ہے تو اس پر اعتبار کیسے ہو سکتا ہے ؟

ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے
رفوئے زخم سے مطلب ہے لذّت زخمِ سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے
وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب
چٹکنا غنچۂ گل کا صدائے خندۂ دل ہے

۱۔ شرح : غم خیل در خیل اور فوج در فوج آ رہے ہیں اور معلوم ہے کہ غم کی حالت میں انسان کا سر بے اختیار جھک جاتا ہے۔ مرزا کا سر ہجومِ غم کے باعث اتنا جھکا کہ دامن کے سرے پر پہنچ گیا۔ گویا دامن سے نکلے ہوئے تار اور تارِ نگاہ میں فرق کرنا مشکل ہو گیا۔

۲۔ شرح : میں اپنے زخموں کو ٹانکے لگوا رہا ہوں۔ میرا مدعا یہ نہیں کہ زخم بھر جائیں، بلکہ ٹانکے لگانے میں سوئی سے جو زخم ہوں گے ان کی لذت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مجھ دیوانے کو درد کے مزے کا کوئی خیال نہیں رہا اور اس سے غافل ہو گیا ہوں۔

یہ مضمون مرزا پہلے بھی باندھ چکے ہیں، مثلاً :

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

۳۔ شرح : اے غالب ! میرا محبوب جس باغ میں جلوہ فرما ہو، وہاں کلیوں کے چٹکنے کو دل کے ہنسنے اور باغ باغ ہونے کی آواز سمجھنا چاہیے۔

پا بہ دامن ہو رہا ہوں بس کہ میں صحرا نورد
خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے

دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے بعد
ہے نگاہِ آشنا تیرا سرِ ہر مُو مجھے

ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تُو مجھے

۱۔ شرح: میں صحرا کے چکر کاٹ رہا تھا۔ پاؤں میں اتنے کانٹے چبھے کہ بے بس ہو کر بیٹھ گیا اور کانٹے نکالنے کے لیے پاؤں زانو پر رکھ لیا، جہاں دامن پہنچا ہوا تھا۔ اگر زانو کو آئینہ سمجھ لیا جائے تو میرے پاؤں کے کانٹے اس آئینے میں جوہر معلوم ہوتے ہیں۔

اس شعر کے سلسلے میں دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ اوّل صوفیہ کے نزدیک سر زانو پر مراقبے میں رکھا جاتا ہے۔ چونکہ مراقبے میں عالم علوی سے فیض حاصل ہوتا اور دل جلا پاتا ہے اور اس لیے زانو کو اصطلاح صوفیہ میں آئینہ کہنے لگے دوم کانٹے نکالتے وقت پاؤں زانو پر رکھا جاتا ہے تاکہ تمام کانٹوں کا پتا چل جائے اور انھیں نکالنے میں سہولت ہوتی ہے۔ مرزا نے صوفیہ کی اصطلاح کے مطابق زانو کو آئینے سے تشبیہ دی، پھر کانٹوں کو اس آئینے کے جوہر بنا دیا۔ جیسا کہ پہلے بارہا عرض کیا جا چکا ہے، آئینے سے مراد بلوری آئینہ نہیں، بلکہ فولادی آئینہ ہے۔

۲۔ شرح: محبوب سے ہم بغل ہونے کے بعد میرے دل کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ محبوب کے جسم کا بال بال مجھے ایسی نگاہ معلوم ہوتا ہے، جو میری دلی کیفیتوں سے آگاہ ہو۔

ہم آغوشی نصیب ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ محبوب کے جسم کا بال بال نگاہِ آشنا بن جائے۔

۳۔ **شرح** : میں ایسا ساز ہوں جس میں گلوں اور شکووں کے راگ بھرے ہوئے ہیں۔ اے محبوب! میرے بارے میں کچھ نہ پوچھ۔ بہتر یہی ہے کہ جب لوگ جمع ہوں تو تُو مجھے نہ چھیڑے۔ چھیڑے گا تو ساز بجنے لگے گا۔ گلوں اور شکووں کا ایک سَیل امنڈ آئے گا۔

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں کالبدِ صُورتِ دیوار میں آوے

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

تب نازِ گراں مائگی اشک بجا ہے
جب لختِ جگر دیدۂ خونبار میں آوے

دے مُجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر
کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے

اس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ
طوطی کی طرح آئنہ گفتار میں آوے

۱۔ **لغات**۔ کالبد: قلب، ڈھانچا
صورتِ دیوار: دیوار پر بنی ہوئی تصویر۔
شرح : اے محبوب! تو جس محفل میں ناز و ادا سے بولنے لگے، وہاں تیری جاں بخشیوں کے اعجاز سے ان تصویروں کے قالب میں جان پڑ جائے، جو دیوار پر بنی ہوئی ہوں۔
یہاں گفتارِ محبوب کی جاں بخشی کا اظہار مقصود

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یا رب
اک آبلہ پا وادیٔ پُر خار میں آوے

مر جاؤں نہ کیوں رشک سے، جب وہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زنّار میں آوے

غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گُل باغ سے بازار میں آوے

تب چاکِ گریباں کا مزا ہے دلِ ناداں
جب اک نفس اُلجھا ہُوا ہر تار میں آوے

آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے
اے وائے! اگر معرضِ اظہار میں آوے

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

ہے اور ناز سے گفتار میں آنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ جب محبوب ناز و انداز سے گفتگو کرے گا تو ایسا ہوگا۔ مقصود یہ ہے کہ محبوب جب بھی بولتا ہے، ناز ہی سے بولتا ہے گویا یہ اس کی ایک مستقل صفت ہے۔ اس کی کوئی بات ناز سے خالی ہو ہی نہیں سکتی۔ اس مستقل صفت کے پیشِ نظر "ناز" کا لفظ شاعر کو ضروری معلوم ہُوا۔

۲۔ شرح:
اے محبوب! تو دلکش دلآویز قامت کے ساتھ باغ میں آجائے تو سرو و صنوبر، جنھیں اپنی بلند قامتی پر ناز ہے، سائے کی طرح ساتھ ساتھ پھرنے لگیں۔

واضح رہے کہ شاعر نے محبوب کے لیے قدِ دلکش کا لفظ استعمال کیا۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ محض بلندیِ قامت کوئی خوبی نہیں، قد اتنا ہی بلند ہونا چاہیے، جتنا کہ موزونیت کے باعث دل کو لبھائے۔ نری بلند قامتی سے

اوقات نازیبا بن جاتی ہے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ دوسرے مصرع میں "سے" کا لفظ عجب لطف رکھتا ہے اور بڑے محاورے کا لفظ ہے اور مصنف پہلے شخص ہیں جس نے اس مقام پر "سے" استعمال کیا، دوسرے شاعر اس طرح استعمال کیا کرتے ہیں:

اس قد کو اگر دیکھے تو گلزار میں آوے

۳۔ لغات۔ گراں مایگی: بیش بہا ہونا۔

شرح: آنسو کے لیے بیش بہا ہونے کا فخر اسی صورت میں بجا سمجھا جا سکتا ہے، جب جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر لہو رونے والی آنکھ سے بہنے لگے، یعنی وہ آنسو کس کام کا، جس میں جگر کا لہو نہ ہو۔

مرزا نے ایک اور جگہ بھی کہا ہے:

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

۴۔ شرح: اے ظالم محبوب! مجھے گلے شکوے کی اجازت دے دے تاکہ تجھے میرے ستانے میں کچھ مزہ بھی آئے۔

مطلب یہ کہ میں شکایت کروں گا۔ تجھے یہ پتا چلے گا کہ تیرے ہاتھوں دکھ اٹھانے کا معاملہ کہاں تک پہنچ گیا ہے یا گلہ شکوہ سُن کر تجھے غصّہ آئے گا اور غُصّے میں مجھ پر سختی کرے گا۔ یہ قاعدہ ہے کہ ظلم و ستم کا معاملہ اسی وقت پُرلطف بنتا ہے، جب ایک طرف شکایت ہو اور دوسری طرف سختیاں کی جائیں۔ اگر سختیوں کو چُپ چاپ صبر سے برداشت کر لیا جائے تو کچھ لطف نہ ہوگا۔ اس معاملے میں گرمی اور ہنگامہ خیزی صرف گلے شکوے ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ اس زمین کا حاصل اس شعر میں آگیا۔

۵۔ شرح : اگر محبوب کی جادو بھری آنکھ کا اشارہ پائے تو آئینہ طوطی کی طرح بولنے لگے۔

طوطی آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر بولنے لگتا ہے۔ محبوبوں کی آنکھیں اشاروں میں باتیں کرتی ہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ میرے محبوب کی آنکھ کے اشارے سے آئینہ طوطی بن جائے۔

یہاں چشمِ فسوں گر یعنی جادو بھری آنکھ اس لیے کہا کہ طوطی کی طرح آئینے کا بول اٹھنا خلافِ عادت واقعہ ہے اور یہ جادو کے بغیر ممکن نہیں۔

۶۔ لغات ۔ آبلہ پا : وہ شخص، جس کے تلوے چھالوں سے بھرے ہوں۔

شرح : اے اللہ! کانٹوں بھری وادی میں ایک ایک کانٹے کی زبان پیاس کے مارے خشک ہو گئی ہے۔ کسی ایسے شخص کو بھیج، جس کے تلوے آبلوں سے لبریز ہوں تاکہ وہ اس میں پھر نکلے اور آبلوں کے پانی سے کانٹوں کی پیاس بجھ سکے۔

اس شعر کی خوبیاں خاص توجہ کی محتاج ہیں، مثلاً :

"کانٹوں کی زبان سوکھ گئی" کہہ کر اُن کی وضع و ہیئت کا نقشہ بہترین انداز میں پیش کر دیا ہے۔ ان کی نوکیں دیکھ کر یہی معلوم ہوتا ہے کہ زبانیں خشک ہو کر نکیلی ہو گئیں۔

۲۔ عام نباتات کو سیراب کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جڑوں میں پانی چھوڑ دیتے ہیں، لیکن کانٹوں کو اس طرح پانی نہیں دیا جا سکتا ہے۔

۳۔ ان کے لیے سیرابی کا انتظام ایسا ہونا چاہیے کہ سُوکھی ہوئی زبانیں تر ہو سکیں اور اس کا بہترین طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ جس کے تلووں میں چھالے ہوں، وہ ان کانٹوں پر پھر نکلے۔

۷۔ شرح : محبوب کا نازک جسم زنار کی آغوش میں دیکھا تو فرمایا کہ

میں رشک سے کیوں نہ مر جاؤں ؛ وہ جسم میری آغوش میں آنا چاہیے تھا، نہ کہ اُس دھاگے کی آغوش میں، جو گبر یا برہمن باندھتے ہیں اور اسے مذہب کا ایک خاص نشان سمجھتے ہیں۔

"خمِ حلقۂ زنّار" کا مطلب ہے زنّار کے حلقے کا خم۔ زنّار باندھتے ہیں تو کندھے پر اسے خم دیا جاتا ہے، اسی کو خمِ حلقہ قرار دیا۔

۸ - **لغات** ۔ زر : یہاں اس کے دو معنی ہیں، اوّل وہ زرد سا زیرہ جو پھول کے اندر ہوتا ہے، دوم مال، دولت اور قیمت۔

شرح : اگر مال و دولت کی حرص عزّت و ناموس کی بربادی کا باعث نہ ہوتی تو پھول کا محبوب باغ چھوڑ کر بازار میں کیوں آتا۔

مطلب یہ کہ پھول کے لیے اوّل زر کی ہوس یوں ظاہر ہوتی ہے کہ جب وہ کھلتا ہے تو اندر سے زیرہ نکل آتا ہے۔ گویا اس نے ہاتھ میں زر رکھ لیا ہے۔ دوم وہ بکنے کے لیے باغ سے بازار میں جاتا ہے۔ یہ بھی مالِ زر کی ہوس ہے، جو اس کی رسوائی کا باعث بنتی ہے۔ اگر وہ غنچے کی طرح بند کا بند رہتا تو نہ اس کے اندر کا زیرہ نمایاں ہوتا، نہ بازار میں بکنے کی نوبت آتی۔ اس سے یہ سبق حاصل ہوا کہ زر کی ہوس انسان کے لیے رسوائی کا باعث ہوتی ہے اور اس کی عزّت و ناموس برباد کر دیتی ہے۔

۹ - **شرح** : اے بے خبر اور حقیقت ناشناس دل ! گریبان تار تار کرنے کا مزہ اُس وقت آ سکتا ہے، جب ہر تار میں ایک سانس الجھا ہُوا ہو، یعنی ہر تار کے ساتھ سانس کھنچا ہُوا آئے اور دم نکل جائے۔

تارِ گریباں اور تارِ نفس کی مناسبت محتاجِ بیان نہیں۔

۱۰ - **لغات** ۔ معرض : جائے عرض یعنی وہ جگہ، جہاں کوئی چیز پیش ہو۔ معرضِ اظہار سے مراد ہے کہ کسی چیز کا اظہار میں آنا، یعنی ظاہر ہونا۔

شرح : میرے سینے میں ایک ایسا چھپا ہوا بھید ہے، جس کی گرمی

سے سینہ آتش کدہ بن گیا ہے، یعنی اس میں سراسر آگ دہک رہی ہے۔ اگر یہ راز ظاہر ہو جائے تو خدا جانے کہاں کہاں آگ لگے اور کیا قیامت برپا ہو!

۱۱۔ **شرح :** اے غالب! میرے شعروں میں جو بھی لفظ آتا ہے، اسے معنی کے خزانے کا ایک طلسم سمجھنا چاہیے۔ یعنی لفظ لفظ میں معنی کے خزانے طلسم کے ذریعے سے بھر دیے گئے ہیں۔ جب تک کوئی شخص وہ طلسم توڑ کر اصل خزانے تک نہ پہنچے، میرے اشعار کی حقیقت اس پر واضح نہیں ہو سکتی۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :

"گنجینہ اس سبب سے ہے کہ معانی کثیر اس میں ہیں اور طلسم اس سبب سے ہے کہ پہلو بھی اس میں کئی نکلتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ طلسم مشکل سے کھلتا ہے اور حیرت انگیز ہوتا ہے۔ اسی طرح کلام میرا مشکل سے حل ہوتا ہے اور معانی سے اس کے حیرت پیدا ہوتی ہے۔ غرض لفظ کی تشبیہ طلسم سے نہایت بدیع ہے۔"

حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے
اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

۱۔ **شرح :**
خواجہ حالی فرماتے ہیں: "دوسرے مصرع میں دعویٰ متضمن دلیل ہے۔ معشوق کو مہ خورشید جمال اس لیے کہا تاکہ اس کو ماہ کامل پر ترجیح دینے کی وجہ پیدا ہو جائے۔"

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پہ رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھا ہے

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

اگرچہ چاند ماہِ کامل یعنی بدر بن جائے تو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے، لیکن میرا چاند جس کا حسن و جمال سورج کا سا ہے، بدر سے بہتر ہے۔

خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ اپنے محبوب کو مہرِ خورشید جمال اس لیے کہا کہ ماہِ کامل پر اس کی فوقیت واضح ہو جائے۔ جس طرح چاند پر سورج کی فوقیت واضح ہے۔

۲۔ شرح :

شعراء عموماً بوسے کو دل کی قیمت قرار دیتے ہیں مرزا فرماتے ہیں کہ میرے محبوب کی نظر میرے دل پر جمی ہوئی ہے۔ اسے اڑا لینا چاہتا ہے، لیکن اس کی قیمت ادا کرنے، یعنی بوسہ دینے کے لیے تیار نہیں۔ بظاہر اس نے دل میں یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ اگر مفت مل جائے، یعنی بوسہ دیے بغیر دل ہاتھ آ جائے تو اچھا مال ہے اور ضرور

لے لینا چاہیے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ دل کا بوسے پر بکنا مبتذل مضمون ہے لیکن بیاں محاورے کی خوبی اور بندش کی ادا نے اس مضمون کو تازہ کر دیا۔

۲۔ لغات۔ ساغرِ جم : جمشید کا پیالہ۔ جمشید ایران کا مشہور بادشاہ تھا کہتے ہیں، شراب اسی نے ایجاد کی۔ اس کے ساغر کی ایک خوبی یہ بتائی جاتی ہے کہ اس سے زمانے کی خبریں مل جاتی تھیں۔

جامِ سفال : مٹی کا پیالہ۔

شرح : شعر کی شرح سے پیشتر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ شاعر کے سامنے چند بدیہی حقائق تھے جو کسی ثبوت کے محتاج نہ تھے، مثلاً :

۱۔ اسے معلوم تھا کہ مٹی کا پیالہ نہایت بے حقیقت چیز ہے۔

۲۔ معلوم تھا کہ ساغرِ جم بہت بیش قیمت اور نایاب تھا۔ دنیا میں وہ ایک ہی پیالہ تھا، عام اوصاف کے علاوہ اس اعتبار سے بھی اس کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ معلوم تھا کہ مٹی کے دس ہزار پیالے بھی جمع کر لیے جائیں تو وہ ساغرِ جم کی برابری نہیں کر سکتے۔

بر ایں ہمہ مرزا نے مٹی کے پیالے کی برتری کا ایک ایسا پہلو پیدا کر لیا، جس سے عقلِ سلیم کو ایک لمحے کے لیے بھی اختلاف نہیں ہو سکتا اور غالباً مرزا کی اس حقیقت بیانی سے پیشتر کسی کو برتری کے اس پہلو کا کوئی احساس بھی نہ تھا۔ مرزا نے صرف یہ سوچا کہ پیالے سے شراب پی جاتی ہے اور شراب نوشی کے لیے ساغرِ جم اور ساغرِ سفال دونوں یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ جامِ سفال ٹوٹ جائے تو فوراً ہر شخص بازار سے لا سکتا ہے، ساغرِ جم ٹوٹ جائے تو اس کا بدل ہی نہیں مل سکتا۔ لہٰذا "جامِ سفال" ساغرِ جم سے بدرجہا بہتر ہے۔

پھر مرزا کے نزدیک اصل شے شراب نوشی ہے، پیالہ خواہ کیسا ہی ہو۔

وہ خود فارسی کی ایک غزل میں فرماتے ہیں :

نشاطِ جم طلب از آسماں، نہ شوکتِ جم

قدح مباش ز یاقوت بادہ گر عنبی ست

یعنی آسمان سے جمشید کی شان و شوکت نہیں، صرف اس کے عیش و نشاط کی آرزو کرنی چاہیے اگر پیالہ یاقوت کا نہیں تو کیا پروا ہے، شراب خالص انگوری ہونی چاہیے۔

بلکہ وہ تو پیالے کے بھی محتاج نہیں اور کہتے ہیں۔

پلا دے اوک سے ساقی! جو ہم سے نفرت ہے

پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے

۴۔ شرح : جس فقیر کو سوال کی عادت نہ ہو وہی اچھا ہوتا ہے، کیونکہ مانگے بغیر مل جانے تو اس میں مزہ زیادہ آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی ہی ہے کہ ہر شخص کو بے طلب دیتا ہے۔

سوال کی عادت پڑ جائے تو انسان ذاتی شرف کے احساس سے محروم ہو جاتا ہے اور اس کائنات میں انسان کی اصل متاع وہی شرف ہے، جو ہر چیز پر مقدم رہنا چاہیے۔

۵۔ شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"اسی کے قریب قریب سعدی کا بھی ایک شعر ہے :

گفتہ بودم چو بیائی، غمِ دل با تو بگویم

چہ بگویم کہ غم از دل برود، چوں تو بیائی

دونوں (سعدی اور غالب) کے شعروں کا ماحصل یہ ہے کہ کسی طرح اپنی تکلیف یا رنج معشوق پر ظاہر نہیں کر سکتے، مگر سعدی کے بیان میں یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ شاید معشوق عاشق کی ظاہری بدحالی دیکھ کر سمجھ جائے کہ اس کا دل مغموم ہے، کیونکہ سعدی کے

بیان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ معشوق کے آنے سے غم جاتا
رہتا ہے ، نہ یہ کہ ظاہری حالت بھی بدل جاتی ہے ، مگر مرزا کے
بیان میں یہ احتمال باقی نہیں رہتا ؟

محبوب کے آنے سے دل کو ایسی خوشی اور بشاشت ہوتی ہے کہ رنج و غم کا کوئی اثر چہرے پر باقی نہیں رہتا ۔ اس کے برعکس رونق و تازگی آجاتی ہے ۔ یہ حالت دیکھ کر محبوب سمجھ لیتا ہے کہ میرے بیمارِ عشق کا حال اچھا ہے ۔

اس سلسلے میں سعدی کا شعر پیش کرنا غالباً مناسب نہیں ۔ خواجہ حالی نے اس میں جو احتمال بتایا ہے ، اس سے مرزا کا شعر پاک ہے ۔ اگر کسی مضمون کو کوئی استاد پہلے پیش کر چکا ہے اور اس میں کوئی پہلو تشنہ رہ گیا ہے ، بعد کا شاعر اس تشنگی کو بوجہ احسن دُور کر دیتا ہے تو ہمیں الفضل للمتقدم کہہ کر اس کی حیثیت کم نہ کرنی چاہیے ۔ متقدمین نے بہت سے مضمون باندھے ، لیکن ایسے مضامین بھی ہیں ، جو ان کے ہاں ٹھیک نہ بندھ سکے ۔ متاخرین نے ان مضامین کے حسن میں بھی اضافہ کیا اور ان کی بندش بھی بہتر سے بہتر بنا دی ۔ ایسے موقع پر عرفی ہی کا قول صحیح ہے ۔

اوّل رہ و ریں نظم خود ایشاں بسپردند
پس باز نمودیم ہم منزل ہم را

یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر متاخر محض تاخّرِ زمانی کی بنا پر ہر متقدم سے گوے سبقت نہیں لے جا سکتا ۔

۶ ۔ **شرح** : خواجہ حالی فرماتے ہیں ۔

" گویا معشوق کی تمنا میں ایسا مستغرق ہے کہ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں
یہاں تک کہ پنڈت نے جو سال کو اچھا بتاتا ہے تو اس کے لیے
یہی معنی سمجھتا ہے کہ شاید اس سال معشوق عاشقوں پر مہربان
ہو جائیں ، نہ یہ کہ اس سال قحط نہیں پڑنے کا یا وبا نہیں آنے کی
یا لڑائیاں نہیں ہوں گی وغیرہ "

عشق کے نزدیک زمانے کی اچھائی اور خوشگواری کا معیار صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ عاشقوں کی کون کون سی مرادیں پوری ہوں گی۔

۷۔ **شرح**: فرہاد کو سنگ تراشی کے سوا اور کیا آتا تھا؟ اسی سنگ تراشی کی بدولت اسے شیریں سے بات چیت کا موقع ملا۔ سنگ تراش کا نشان تیشہ تھا۔ گویا تیشہ فرہاد و شیریں کے درمیان بات چیت کا ذریعہ بنا۔ اس بنا پر یہ اصول وضع کر لیا کہ کمال کسی بھی فن میں حاصل کیا جائے، وہ بہرحال اچھا ہی ہوتا ہے۔

۸۔ **لغات**: **مآل**: انجام، نتیجہ۔

شرح: جس کام کا انجام اچھا ہو، وہ بہرحال اچھا ہوتا ہے کیونکہ کام سے مقصود محض کام نہیں، بلکہ خاص نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کی مثال یوں پیش کی کہ قطرہ دریا میں مل جائے تو خود دریا بن جاتا ہے۔ دریا میں مل کر دریا بن جانا، نتیجہ ہے اور ایک قطرے کا دریا بن جانا نتیجے اور انجام کی اچھائی کا بدیہی ثبوت ہے۔

جن اصحاب نے شعر کے پہلے مصرع کو اصل مقصد قرار دے کر دوسرے مصرع کو اس کی دلیل بنایا، میرے نزدیک وہ غلطی میں مبتلا ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مصرع کے ہم مضمون اشعار دیوانِ غالب میں دیکھ کر ان کی توجہ راہِ راست سے ہٹ گئی۔ پہلا مصرع صرف مثال ہے۔ مقصودِ شعر دوسرا مصرع ہے۔

۹۔ **لغات**۔ **خضر سلطان**: بہادر شاہ ظفر کا ایک بیٹا، جسے ظالم ہاڈسن نے ۱۸۵۷ء میں شہزادہ مرزا مغل اور شہزادہ مرزا ابوبکر کے ساتھ دہلی دروازے کے باہر گولی سے شہید کر دیا "خمخانہ جاوید" اور مالک رام صاحب کا بیان ہے کہ شہادت کے وقت چھبیس سال کی عمر تھی۔ گویا خضر سلطان ۱۸۳۱ء کے آس پاس

پیدا ہوا۔

فخرو مرزا کی طرح خضر سلطان بھی مرزا غالب کا شاگرد تھا۔ اچھے شعر کہتا تھا۔ مجموعۂ کلام ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں تلف ہو گیا صرف چند شعر تذکروں میں رہ گئے۔

تازہ نہال : نیا پودا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ غزل خضر سلطان کی پیدائش پر لکھی گئی تھی۔ چونکہ پہلے مصرع میں خالقِ اکبر سے بظاہر اکبر شاہ ثانی کی طرف بھی اشارہ ہے، جو اس وقت بادشاہ تھا، اس لیے خیال ہوتا ہے کہ یہ شعر واقعی خضر سلطان کی پیدائش پر لکھا گیا تھا اور یہ غزل ۱۸۳۱ء یا آس پاس کی ہونی چاہیے۔

اس صورت میں ایک بحث یہ بھی آئے گی کہ آیا شاہ سے مقصود بہادر شاہ ظفر ہیں، جو اس زمانے میں ولی عہد تھے اور ان کی ولیعہدی خاصی متزلزل چلی آ رہی تھی یا شاہ سے مقصود اکبر شاہ ثانی ہیں؟

شرح : شعر دعائیہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ جو سب سے بڑا ہے، شہزادہ خضر سلطان کو سرسبز رکھے! بادشاہ کے باغ میں یہ نیا پودا بہت اچھا ہے۔

خضر، سرسبز، باغ، تازہ اور نہال کی مناسبتیں محتاجِ تشریح نہیں۔

۱۰۔ شرح : اے غالب! جنّت کا جو عام تصوّر ہے، یعنی باغ، نہریں حوریں وغیرہ، اس کی حقیقت ہمیں معلوم ہے، البتہ اس قسم کے خیالات دل خوش رکھنے کے لیے بڑے اچھے ہیں۔

شعر میں مرزا نے جنّت کے متعلق صرف عام افکار کا ذکر کرتے ہوئے انھیں دل خوش رکھنے کا ذریعہ قرار دیا۔

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

خار خارِ الم حسرتِ دیدار تو ہے
شوق گلچینِ گلستانِ تسلّی نہ سہی

مے پرستاں خمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا
گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالب! اگر عمرِ طبیعی، نہ سہی

۱. شرح: اے محبوب! اگر میرے مرنے سے تیری تسلی نہیں ہوئی، اس امتحان میں سے سرخرو نکلنا تیرے لیے تسکین کا سامان نہیں بن سکا اور مزید کوئی امتحان باقی رہ گیا ہے تو اس کا انتظام بھی کرلے تاکہ تیرے اطمینان میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ جان دے دینے کے بعد مزید امتحان کیا ہو سکتا تھا؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ لاش کو بازاروں میں گھسیٹا جاتا یا جلا کر خاکستر اڑا دی جاتی۔ شاعر کا مقصود یہ ہے کہ موت اس دنیا میں سب سے بڑا امتحان ہے جو کسی فرد کو پیش آسکتا ہے لیکن

اگر محبوب کے نزدیک اس کے بعد بھی کوئی امتحان باقی رہ گیا ہو تو بیچے عاشق کو اس میں ایک لمحے کے لیے بھی تامل نہ ہوگا۔

پھر یہ محض خیال نہیں، بلکہ حق پرستی اور انسانیت دوستی کی تاریخ میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ جانبازوں نے جانیں دیں، اس کے بعد ان کی لاشوں سے نہایت نازیبا سلوک روا رکھا گیا۔ یہ شعر ایسے ہی حقائق کا آئینہ ہے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں: اس شعر پر اگر غالب خدائے سخن ہونے کا دعویٰ کریں تو خدا گواہ ہے کہ زیبا ہے۔ پھر دیکھیے تو نہ فنِ معانی کی کوئی خوبی ہے، نہ فنِ بیان کا کچھ حسن ہے، نہ فنِ بدیع کے تکلفات ہیں۔

۲۔ شرح: اگر میرا شوق تسلی کے باغ سے پھول نہیں چن سکا تو نہ سہی۔ محبوب کے دیدار کی حسرت کا جو غم ہے، اس کا خار راز تو موجود ہے۔ سادہ لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر شوق کی تسکین کا سامان بہم نہیں پہنچا تو بیچے عاشقوں کے لیے حسرتِ دیدار کا غم تو موجود ہے۔

۳۔ شرح: شراب پینے والے دوستو! اگر ایک دن محفل میں ساقی نہیں آیا، جو باری باری جام بھر بھر کر دیتا اور ہم شراب پیتے تو کچھ پروا نہیں۔ کیوں نہ ہم شراب کے مٹکے ہی کو منہ سے لگا لیں، اس کے بغیر چارہ ہی کیا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ شراب نوشوں کا گزارہ شراب پیے بغیر ہو ہی نہیں سکتا ساقی موجود ہو تو وہ ترتیب سے ایک ایک کو خاص پیمانے کے مطابق پلائے گا، لیکن اگر ساقی موجود نہیں تو تقسیم کا معاملہ خارج از بحث ہے۔ اس کے سوا چارہ نہیں کہ مٹکے ہی کو منہ لگا لیا جائے، یعنی جتنی شراب کوئی پینا چاہتا ہے، پی لے۔

اس شعر میں خاص پہلو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر محفل اور ہر دائرے کی تنظیم و ترتیب مرکزی شخصیت پر موقوف ہوتی ہے۔ شراب کی محفل میں ساقی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ تمام شراب نوش اسی کے لطف و کرم پر نظر رکھیں گے۔ اگر مرکزی

شخصیت موجود نہ ہو تو ترتیب و تنظیم ختم ہو جائے گی۔ ہر فرد بے ترتیبی سے جو چاہے گا، کرے گا، مثلاً شراب کی محفل میں پیمانے کے مطابق پینے کا سلسلہ ختم ہو جائے گا، ہر شخص مٹکے کو منہ لگانے کے لیے مضطرب رہے گا۔

۴۔ لغات۔ سیاہ خانۂ لیلیٰ : لیلیٰ کا سیاہ گھر، یہ اس لیے کہا کہ عام روایت کے مطابق لیلیٰ کا خیمہ سیاہ رنگ کا تھا اور خود لیلیٰ نام بھی لیل سے ماخوذ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا رنگ کا بھی سانولا تھا۔ مولانا رومؒ نے مثنوی میں ایک جگہ لکھا ہے کہ خلیفہ نے لیلیٰ کو بلا کر دیکھا تو وہ چنداں خوب صورت نہ نکلی۔ پوچھا: کیا تُو ہی وہ لیلیٰ ہے جس کے لیے مجنوںؔ سرگرداں پھر رہا ہے؟

از ہمہ خوباں تو افزوں نیستی
گفت، خامش شو تو مجنوںؔ نیستی

(تُو تمام حسینوں سے بڑھی ہوئی نہیں۔ لیلیٰ نے کہا: چپ رہ، تو مجنوں نہیں)

شرح : مجنوںؔ کا وجود صحرا کے لیے چشم و چراغ ہے، یعنی صحرا جیسے بے رونق مقام میں پوری رونق صرف مجنوںؔ کے دم سے ہے۔ اگر لیلیٰ کے سیاہ خیمے میں اسے شمع کی حیثیت حاصل نہ ہوئی تو نہ سہی۔

مطلب یہ کہ مجنوںؔ کو لیلیٰ کی بزم ناز میں مستقل بار نہ ملا تو کچھ پروا نہیں۔ اس کے دم سے بیابان میں رونق کا ہنگامہ گرم ہے۔

۵۔ شرح : گھر کی رونق صرف ایک ہنگامے پر موقوف ہے۔ اگر مسرت و شادمانی کا نغمہ نصیب نہیں تو کیا مضائقہ ہے؟ غم کا نوحہ ہی سہی۔

کوئی شبہ نہیں کہ اس عارضی اور ناپائدار زندگی میں انسانوں کو مختلف حالات پیش آتے ہیں۔ بعض کو یکے بعد دیگرے شادی و غم دونوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ بعض پوری زندگی عیش و نشاط میں گزار دیتے ہیں، بعض کو رنج و غم سے ایک لمحہ کے لیے بھی فراغ نصیب نہیں ہوتا۔ حقیقت پر نظر رکھنے والے عارف ایسی چیزوں سے بالکل بے نیاز ہوتے ہیں۔ وہ شادی و غم دونوں کو ہیچ جانتے

ہیں۔ اس زندگی میں دل لگی کے لیے کسی ایک کا وجود ضروری ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ اگر ہمیں خوشی نصیب نہیں ہو سکتی تو غم ہی سہی۔

یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ گھر میں رونق کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا مسرت کا ہنگامہ بپا ہو یا غم کا۔ مسرت و شادمانی پر بھی لوگ جمع ہوں گے۔ غم و الم اور رنج و ماتم کے موقع پر بھی ہمدرد ہجوم کر کے آئیں گے۔ اس طرح رونق کا انتظام ہو جائے گا۔ اگر دونوں چیزیں نہ ہوں تو کسی کے لیے آنے کا سبب کیا ہو سکتا ہے اور رونق کا انتظام کیونکر ہو گا؟

۶۔ **شرح** : اگر میرے شعر نافہموں کے نزدیک معنی سے خالی ہیں تو ہوں۔ نہ یہ آرزو ہے کہ کوئی میری تعریف کرے، نہ یہ خیال ہے کہ کہیں سے صلہ ملے۔

اگر کوئی فرد اپنی کسی چیز کے لیے ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز ہو جائے تو اس امر کی کیا ضرورت باقی رہ سکتی ہے کہ دنیا اس کی چیز کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے؟

مولانا شبلی نے بھی اس سلسلے میں ایک نہایت پر معاملہ شعر کہا ہے، یعنی:

از ردّ و از قبول تو فارغ نشستہ ایم
اے آنکہ خوب ما نہ شناسی ز زشتِ ما

جو شخص کسی فرد کی اچھائیوں اور برائیوں میں امتیاز نہ کر سکے، اس کے رد یا قبول کی پروا کیوں ہو؟

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے "آبِ حیات" میں بعض تنگ بار لوگوں کی داستانیں لکھی ہیں، جن سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ لوگ مرزا کے کلام کو بے معنی سمجھتے تھے۔ خود بھی ستائش ایسے انداز سے کی ہے، جس میں تعریض کا پہلو صاف نمایاں ہے۔ ساتھ ہی لکھا ہے کہ کلام پر ایسے اعتراضات ہوئے، تو اس ملکِ بے نیازی کے بادشاہ نے کہ اقلیمِ سخن کا بھی بادشاہ تھا،

اپنی غزل کے ایک شعر سے سب کو جواب دے دیا :

نہ ستائش کی تمنا ، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی ، نہ سہی

۷۔ **لغات** ۔ **عمرِ طبیعی** : عمر کا عام پیمانہ ، جو پہلے ایک سو بیس سال سمجھا جاتا تھا اب پچھتر اور اسی کے درمیان مانا جاتا ہے ۔

شرح : اے غالب ! اگر ہمیں دنیا میں عام پیمانے کے مطابق زندگی بسر کرنے کی فرصت نہ مل سکی تو کچھ مضایقہ نہیں ۔ اسی کو غنیمت سمجھنا چاہیے کہ ہمیں حسینوں کی صحبت میں دن گزارنے کی شادمانی نصیب ہوئی ۔

مطلب یہ کہ عمرِ طبیعی کی آرزو نہیں ، اصل آرزو یہ ہے کہ حسینوں کی صحبت میسر رہے ۔

عجب نشاط سے جلّاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ الفت
فقط "خراب" لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذّتِ الم آگے

خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

۱۔ **شرح** : ہم اس خوشی سے جلّاد کے آگے آگے جا رہے ہیں کہ سر کا سایہ پاؤں سے دو قدم آگے ہے ۔ خوشی قتل ہونے کی ہے ۔ اور آفتاب چلنے والے کی پشت پر ہو

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اُٹھائی ہیں ہم نے
تمہارے آئیو اے طرّہ ہائے خم بہ خم آگے

دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اسکو دم آگے

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالبؔ
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

تو اس کا سایہ پاؤں سے آگے رہتا ہے۔ شعر میں خوبی کا ایک پہلو یہ ہے کہ قتل میں سر کٹتا ہے اور سر ہی کو پاؤں سے دو قدم آگے بتایا ہے۔ بجنوری مرحوم فرماتے ہیں:

"جب آفتاب رہرو کی پشت کی جانب ہوتا ہے تو سایہ سامنے پڑتا ہے۔ مرزا دوپہر کے قریب مقتل میں جانے کے متعلق اپنا شوق یوں بیان کرتے ہیں کہ میرا سر پاؤں سے دو قدم آگے آگے ہے۔ اس کیفیت کو ہر شخص نصف النہار کے بعد خود دیکھ سکتا ہے۔"

۲۔ **شرح** : قضا و قدر کی مرضی یہ تھی کہ مجھے شراب بادۂ الفت (شراب محبت میں بدمست) رکھے۔ صرف "خراب" کا لفظ قلم سے نکلا تھا، آگے کچھ لکھا نہ گیا۔ یقیناً اس لیے نہ لکھا گیا کہ "خراب" لکھنے کے ساتھ ہی قضا و قدر کے قلم پر بدمستی طاری ہو گئی۔ گویا مرزا غالبؔ خراب بادۂ الفت ہونے کے بجائے صرف خراب، تباہ حال اور بدمست ہو کر رہ گئے۔

۳۔ **شرح** : زمانے نے ہمیں جو رنج و الم پہنچائے، ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ نشاطِ عشق کا نشہ ہی ہیران ہو گیا اور ہم عشق سے جو لطف اٹھاتے تھے، وہی باقی نہ رہا۔ جب تک دنیوی مصیبتیں ہم پر نازل نہیں ہوئی تھیں، ہم محبت کے غم سے خوب مزے لیتے تھے۔

اس شعر میں "آگے" بہ معنی "پیشتر" استعمال ہوا ہے۔

۴۔ **شرح** : عشق کی دیوانگی نے ہمارا جو حال کر رکھا ہے، خدا کے لیے اس کی داد دیجیے۔ یہ کتنا عجیب معاملہ ہے کہ محبوب کو خط لکھ کر قاصد کے حوالے کر دیتے ہیں، لیکن بیتابی و اضطراب میں قاصد سے پہلے محبوب کے دروازے پر پہنچ جاتے ہیں۔

یہ کرشمہ محبت کی دیوانگی کا ہے۔ دیوانگی کا تقاضا ہی یہ ہے کہ جو حرکت ہو وہ عقل و فہم سے عاری ہو۔ اب ظاہر ہے کہ خط لکھ کر نامہ بر کے ہاتھ بھیج دیا تو خود محبوب کے پاس دوڑے جانے کی کیا ضرورت ہے؟ اسے نہ بھولیے: یہ جنونِ شوق ہے اور حق یہ ہے کہ جنون کے جو مظاہر بیان ہوئے، وہ مرزا غالب ہی بیان کر سکتے تھے۔

۵۔ **لغات**۔ طرّہ ہائے خم بہ خم : پیچ در پیچ زلفیں، تابدار گیسو۔ "تمھارے آگے آئے" بددعا ہے، مثلاً عموماً کہتے ہیں: "جو کچھ تم نے کیا ہے، وہ تمھارے آگے آئے۔"

شرح : اے محبوب کی پیچ در پیچ زلفو! ہم نے تمھارے لیے عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں، خدا کرے، وہ سب تمھارے آگے آئیں، یعنی تم ہمیشہ پریشان رہو۔

دیکھیے۔ بظاہر بددعا دی، لیکن زلفِ محبوب کے لیے اس سے بہتر دعا کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ہمیشہ پریشان رہے، کیونکہ پریشانی زلف کی سب سے بڑی خوبی اور سب سے بڑا حسن ہے۔

۶۔ **لغات**۔ زُعم : گمان۔

شرح : دل اور جگر میں خون کی ایک لہر تڑپ رہی ہے، جسے ہم پیشتر اپنے گمان میں سانس سمجھے ہوئے تھے۔

مطلب یہ کہ ہمارے سینے میں سانس نہیں، بلکہ خون کی ایک لہر ہے جو اسی طرح پھڑک رہی ہے، جس طرح پرندہ پھڑپھڑاتا ہے۔

مولانا طباطبائی نے فرمایا ہے کہ دل کا تعلق تو سانس سے ہے، مگر جگر میں سانس کہاں ؟ سانس پھیپھڑے میں ہوتا ہے، لیکن پھیپھڑا یا اُس کا فارسی "شُش" یا عربی "ریَہ" تینوں غیر فصیح تھے، لہذا شاعر نے ان کی جگہ "جگر" رکھ لیا کہ مطلق اندرونِ شے کو بھی جگر کہتے ہیں۔

۷۔ **شرح :** اے غالب! جن لوگوں کو پیشتر مجھ سے اتنی محبت تھی کہ میری جان کی قسم کھاتے تھے، وہ میرے جنازے پر نہ آنے کی قسم کھاتے ہیں، یعنی آنے سے انکار کر رہے ہیں۔

مطلب یہ کہ بیشتر افراد زندگی میں انسان سے انتہائی محبت کے باوجود مرنے کے بعد اس سے یکایک بیزار ہو جاتے ہیں۔ یہ عام تجربہ ہے، خصوصاً ہمارے دَور میں، کیونکہ یہ دور سراسر مادّہ پرست اور نفع باز ہے چونکہ مرنے کے بعد انسان سے بظاہر کوئی مادّی فائدہ اٹھانا ممکن نہیں رہتا، اس لیے بے تعلقی اختیار کر لیتے ہیں۔ مرزا کے زمانے میں بھی عام حالت ایسی ہی تھی۔

○

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ "جو کہیے تو گلا ہوتا ہے"

پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

گو سمجھتا نہیں پر حُسنِ تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے

۱۔ **شرح :** میرا بے مہر محبوب شکوے کے نام سے خفا ہوتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے ظلم و جور، بے التفاتی اور تغافل کے بارے میں کچھ زبان پر لایا جائے۔ اتنی بات بھی مجھے زبان پر

عشق کی راہ میں ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال
سُست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیرِ خطا ہوتا ہے

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے، جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

خامہ میرا کہ وہ ہے باربدِ بزمِ سخن
شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

اے شہنشاہِ کواکب سپہ و مہر علم!
تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے
تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال
آستانہ پہ ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

نہ لانی چاہیے، کیونکہ یہ بھی گلے ہی کی ایک صورت ہے۔

۲۔ میں گلے شکوے سے اس طرح بھرا ہوا ہوں جیسے باجا راگ سے بھرا ہوتا ہے۔ اُسے چھیڑتے ہی نغمے نکلنے لگتے ہیں۔ مجھے بھی ذرا چھیڑ کر تماشا دیکھیے، گلے شکوے کیونکر شروع ہو جاتے ہیں اور شروع ہو جائیں گے تو اُن کا سلسلہ ختم ہی نہ ہوگا۔

یہ مضمون مرزا نے ایک اور شعر میں بھی باندھا ہے:

ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے
رکھیو غالبؔ! مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

۴ ـ لغات : حسنِ تلافی : بمدہ طریق پر بدلا دینا۔ کسی کام کے سرانجام میں کوئی کمی یا خامی رہ جائے تو اُسے بہتر طریق پر پورا کر دینا۔

شرح : اگرچہ میرا محبوب کمسنی یا سادگی کے باعث میرے شکووں اور گلوں کا مقصد نہیں سمجھتا، لیکن حسنِ تلافی ملاحظہ کیجیے کہ میں جب کبھی اس کے ظلم و ستم کی شکایت کرتا ہوں تو وہ پہلے سے زیادہ ظلم و ستم شروع کر دیتا ہے۔

حسنِ تلافی سے ظاہر ہے کہ عاشق کا مدعا مزید ظلم و جور کے سوا کچھ نہیں۔ محبوب اس حقیقت کو نہیں سمجھتا، تاہم جب کبھی شکایتیں سنتا ہے تو مدعا سمجھے بغیر مزید جور شروع کر دیتا ہے۔

یہ مضمون بھی مرزا غالبؔ نے ایک اور جگہ باندھا ہے :

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد! نہیں
ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں

۴ ـ لغات ـ مکوکب : تاروں بھرا۔

شرح : عشق کے راستے میں ستاروں بھرے آسمان کی چال ایسی ہے، جیسے وہ شخص آہستہ آہستہ چلتا ہے، جس کے پاؤں چھالوں سے بھرے ہوئے ہوں۔

آسمان کو تاروں بھرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تارے آبلوں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ گویا آسمان کے تارے بھی در اصل تارے نہیں، بلکہ اس کے پاؤں کے چھالے ہیں۔

۵ ـ لغات ـ ہدف : نشانہ

ناوک : تیر

شرح : ہم ظلم کے تیر کا نشانہ کیوں نہ بنیں ؟ اگر کوئی تیر نشانے پر نہیں بیٹھتا اور خطا ہو جاتا ہے تو ہم خود اسے اٹھا لاتے ہیں اور ناوک انداز کے حوالے کر دیتے ہیں۔ یوں وہ سمجھ جاتا ہے کہ ہمیں اس کا نشانہ بننے کی انتہائی آرزو ہے۔

۶۔ شرح : ہماری قسمت کے ستارے کی نحوست کا یہ حال ہے کہ ہم بھلا کرنے کے خواہاں رہتے ہیں اور اس سلسلے میں انتہائی کوشش کرتے ہیں، لیکن نتیجہ ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔ گویا ہم جو چاہتے ہیں وہ نہیں ہوتا، بلکہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر کیا اچھا ہوتا کہ ہم شروع ہی سے اپنے بدخواہ بن جاتے۔ چونکہ ہر چیز ہماری خواہش کے خلاف ہوتی ہے، اس بنا پر اپنی بدخواہی یقیناً بھلائی کا سبب بن جاتی۔

۷۔ شرح : پہلے میری فریاد و فغاں میں اتنا زور تھا کہ وہ عرش سے بھی آگے نکل جاتی تھی۔ اب یہ کیفیت ہے کہ کبھی فریاد میں زیادہ سے زیادہ رسائی کی قوت ہو تو وہ لب تک آتی ہے، ورنہ اکثر آہیں سینے ہی میں رہ جاتی ہیں۔

۸۔ ۱۲۔ لغات : باربد : خسرو پرویز شہنشاہ ایران کا مشہور درباری گویا، جو شیراز کی سمت کا رہنے والا تھا۔

کواکب سپہ : جس کی فوج ستارے ہوں یا شمار میں ستاروں کے برابر فوج والا۔

مِہر عَلَم : سورج کے جھنڈے والا یا وہ جس کا جھنڈا یا پرچم سورج جیسا ہو۔

اِکرام : عزت، توقیر، بخشش، عطا۔

نعل بہا : فارسی محاورے میں وہ رقم، جو کسی حملہ آور کو ملک سے واپس کرنے کے لیے ادا کی جائے۔ اسے بدیں وجہ نعل بہا کہتے ہیں کہ وہ حملہ آور کے

گھوڑوں کے نعلوں کی قیمت ہوتی ہے۔ نعل بندی کی رقم کو بھی کہ سکتے ہیں۔
ناصیہ سا۔ پیشانی گھسنے والا۔

شرح: میرے قلم کو شعر کی محفل میں خسرو پرویز کے مغنی کی حیثیت حاصل ہے، جس کا نام باربد تھا۔ اب میرا قلم غزل کو چھوڑ کر بادشاہ کی مدح میں یوں نغمہ زن ہوتا ہے۔

اے شہنشاہ! جس کی فوج ستارے اور جس کا علم سورج ہے یا جس کی فوج ستاروں کے برابر اور جھنڈا سورج جیسا ہے، تو نے جس جس کو عزت و توقیر بخشی اس کا حق کون ادا کر سکتا ہے؟

اگر سات ولایتوں یعنی پوری دنیا کی آمدنی اکٹھی کر لی جائے تو وہ رقم تیرے لشکر کے گھوڑوں کی نعل بندی کی اجرت ہو گی۔

ہر مہینے پورا چاند ہلال بنتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ تیری دہلیز پر پیشانی گھستا رہتا ہے یعنی پیشانی گھستے گھستے چاند کی گولائی رفتہ رفتہ ختم ہوتی رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ صرف ہلال رہ جاتا ہے۔

میں نے غزل کہتے کہتے مدح شروع کر دی، گویا غزل کے دستور کی پابندی نہ کرتے ہوئے گستاخی سرزد ہوئی۔ یہ بھی تیرے ہی لطف و کرم کا کرشمہ ہے، جو مجھ میں مدح کا ذوق حد درجہ بڑھاتا رہتا ہے۔

۱۳۔ لغات۔ تلخ نوائی۔ وہ باتیں کہنا جو تلخ ہوں۔ درد بھرے نغمے الاپنا۔

شرح: اے غالب! میں درد بھرے نغمے الاپ رہا ہوں۔ لیکن معافی کا خواستگار ہوں۔ انھیں سن کر بے مزہ نہ ہونا۔ کیونکہ مجبور ہوں۔ آج میرا دل بہت دکھی ہے۔

○

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے"
تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

۱۔ شرح: اے محبوب! میں جو بھی بات زبان پر لاتا

ہوں، اگر دیتے ہو، تو کون ہے؟
تیری کیا حقیقت ہے؟ خود ہی
فرماؤ کہ آخر بات چیت کا یہ کونسا
طریقہ ہے؟

چاہیے یہ کہ بات اطمینان
سے سُنی جائے۔ اس پر غور
کیا جائے۔ اگر اس میں واقعی
کوئی خامی ہو تو کہہ دیا جائے کہ
یوں نہ ہو، لیکن یہ کیا طریقہ
ہے کہ سنتے ہی بول اٹھے، تیری
کیا ہستی ہے؟

۲۔ شرح جیب

میں چاہتا ہوں کہ محبوب کو شعلہ
سمجھ لوں تو سوچتا ہوں کہ شعلے
میں تو وہ کرشمے نہیں ہو سکتے
جو اس شوخ میں ہیں۔ پھر چاہتا
ہوں کہ اسے بجلی قرار دے لوں،
مگر بجلی میں اس کے سے عشوے
اور ادائیں کہاں پائی جاتی ہیں؟
اگر وہ شوخ تند خو شعلہ نہیں،
بجلی نہیں تو خدا کے لیے بتاؤ
وہ ہے کیا؟

۳۔ لغات۔

نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے؟

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بدآموزیٔ عدو کیا ہے؟

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے؟

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ، جستجو کیا ہے؟

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے؟

وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام و مشکبو کیا ہے؟

پیوں شراب اگر خُم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے؟

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس اُمید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے؟

ہُوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اِتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے؟

بد آموزی : بری باتیں سکھانا، غلط راستے پر ڈالنا۔

شرح : اے محبوب! تم رقیب سے باتیں کرتے ہو۔ اس بات کا تو کوئی فکر نہیں کہ وہ تمھیں بُری باتیں سکھا دے گا یا غلط راستے پر ڈال دے گا، کیونکہ تم کسی کے جلکے میں آ ہی نہیں سکتے، البتہ یہ رشک مارے جا رہا ہے کہ اُسے تم سے بات چیت کرنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔

۴۔ شرح : ہمارا پیراہن لہو کی بدولت بدن پر چپک گیا۔ اب ہمارے گریبان کا چاک رفو کرنے کی کوئی ضرورت نہ رہی۔

جسم سے خون نکل آئے اور اس میں کپڑا تر ہو جائے تو وہ خشک ہو کر اس طرح جسم سے چپک جاتا ہے کہ اسے بمشکل الگ کرتے ہیں۔ اکثر دیکھا ہوگا کہ زخموں پر پٹی باندھتے ہیں تو ابتدا میں وہ بھی لہو کی نمی کے باعث زخم سے چپٹ جاتی ہے۔

میرزا نے یہ مضمون فارسی کے ایک شعر میں بھی باندھا ہے:

بر تن چسپید بازم از نمِ خونناب پیراہن
خراشِ سینہ سطرِ بخیہ شد چاکِ گریباں را

۵۔ شرح : سوزِ عشق نے جہاں جسم کو جلا دیا، وہاں دل بھی جل گیا ہوگا۔ اے محبوب! اب راکھ کُریدنے سے تمھارا مقصد کیا ہے؟ اگر دل کی تلاش ہے تو بالکل فضول ہے، کیونکہ وہ جسم کے جل جانے کی حالت میں محفوظ کیونکر رہ سکتا تھا؟

۶۔ شرح : ہم اس لہو کے قائل نہیں، جو رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے ہمارے نزدیک تو جو لہو آنکھ سے نہ ٹپکے وہ لہو کیا ہوا؟

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں:

"شعرا اپنے خم دوست ہونے کا مضمون بہت کہا کرتے ہیں۔ مصنف نے اسے نئے پہلو سے کہا اور حسنِ بندش و بے تکلفیِ ادا نے اور بھی تکلف معانی کا بڑھا دیا ہے۔"

۷۔ **شرح** : جنت میں ہمیں بہت سی نعمتیں ملیں گی۔ ہر قسم کے میوں اور دوسری نعمتوں کے علاوہ چار قسم کی نہروں کا ذکر تو خود قرآن مجید میں ہے۔ مثلاً پانی کی نہریں، جو بگڑتا نہیں، دودھ کی نہریں، جس کا مزہ نہیں بدلتا، صاف کیے ہوئے شہد کی نہریں اور شراب کی نہریں، جو پینے والوں کے لیے لذّت کا باعث ہوں گی۔ مرزا فرماتے ہیں کہ بہشت کی عام نعمتوں میں سے جس نعمت کی بدولت ہمیں یہ عزیز ہے، وہ شراب کے سوا کیا ہے، جو پھول کی طرح سرخ ہو اور اس سے مشک کی لپٹیں آئیں، "لذۃ للشاربین"۔

۸۔ **شرح** : میں شراب کے دو چار مٹکے دیکھ لوں تو پینا شروع کروں۔ یہ صراحی، پیالہ، کوزہ اور سبو کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ اتنی تھوڑی شراب دیکھ کر میرے دل میں پینے کا شوق جوش زن ہو سکتا ہے؟

۹۔ **شرح** : اوّل تو ہم ضعف سے اس حالت کو پہنچ گئے کہ بات کرنے کی تاب و تواں ہی نہ رہی اگر کچھ کہہ بھی سکتے ہوں تو کس اُمید پر کہیں کہ ہماری آرزو کیا ہے؟

گویا محبوب نے عمر بھر تو بات نہ پوچھی، یہاں تک کہ ہماری زندگی کا آخری وقت آ گیا اور بولنا بھی مشکل ہو گیا۔ اب بھی حرفِ مطلب زبان پر لائیں تو اُمید کیا ہے کہ وہ توجہ سے سنا جائے گا؟

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں:

"اُف رے ضبط کہ آرزو میں کام تمام ہو گیا، طاقتِ گفتار تک باقی نہ رہی، مگر کبھی زبان سے حرفِ شوق نہ نکلا۔ ہائے نا اُمیدی! جس نے عرضِ مطلب کا خون کر کے دل کی دل ہی میں رہنے دی۔"

۱۰۔ **شرح** : غالب کو بادشاہ کا مصاحب بنا لیا گیا ہے اور اس عزت پر وہ اتراتا پھرتا ہے، ورنہ شہر میں اسے کون پوچھتا ہے؟

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں: "شاعروں کے لیے ذرّے کو آفتاب، قطرے کو

دریا اور ادنیٰ کو اعلیٰ بنا دینا ایک متبذل مضمون ہے جسے جملۂ خبریہ میں لوگ کہا کرتے ہیں۔ مصنّف کی انشا پردازی کا نمود دیکھیے کہ اس پرانے مضمون کو جملۂ انشائیہ میں ادا کیا ہے۔

میں انھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں — چل نکلتے جو مے پیے ہوتے

قہر ہو یا بلا ہو، جو کچھ ہو — کاش کے تم مرے لیے ہوتے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا — دل بھی یا رب کئی دیے ہوتے

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ — کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

۱۔ لغات ۔ چل نکلنا : حد سے بڑھ جانا، تیز ہو جانا۔

شرح : تعجب کی بات ہے کہ میں انھیں چھیڑوں اور وہ کچھ نہ کہیں۔ اگر وہ نشے کی حالت میں ہوتے تو ضرور مجھ پر برس پڑتے اور ایک ہنگامہ بپا ہو جاتا۔

مطلب یہ ہے کہ محبوب شراب کے نشے میں آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اگر نشے کی حالت نہ ہو تو چھیڑ چھاڑ کی بھی چنداں پروا نہیں کرتا۔

۲۔ شرح : میں نے مانا کہ تم قہر ہو یا بلا ہو، آفت ہو یا قیامت ہو۔ جو کچھ بھی ہو، کاش میرے لیے اور صرف میرے لیے ہوتے۔

شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ عاشق نے محبوب سے بات کی اور اپنی دلی آرزو کا اظہار کیا۔ محبوب نے بے پروائی کے انداز میں کہہ دیا کہ مجھ سے عشق و محبت تو کرتے ہو، لیکن یہ بھی جانتے ہو کہ میں کیا ہوں؟ میں قہر ہوں، بلا ہوں۔ عاشق کہتا ہے کہ جو کچھ بھی ہو مجھے منظور ہے۔ مگر صرف میرے بنے رہو۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی ایک اسلوب بیان ہے جس میں ایک طرف محبوب کی تند خوئی، ہنگامہ آرائی اور بے پروائی کی تصویر کھینچی گئی ہے، دوسری طرف اپنے

انتہائی شوق و حسرت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

۳۔ شرح : شعر کا صاف مطلب یہ ہے کہ غم و الم کی مقدار اتنی بڑھ گئی ہے جسے سنبھالنے کے لیے ایک دل کافی نہ تھا، بلکہ بہت سے دل ہونے چاہییں تھے۔ ایسے موقع پر تشریح اعضا کے سوالات پیدا کرنا بالکل بے محل ہے۔ شاعر اپنا تاثر پیش کر رہا ہے اور اس کے لیے طریقہ ایسا اختیار کیا ہے جو بالکل طبعی اور فطری ہے۔ غموں کا تحمل دل کا کام ہے۔ شاعر کہتا ہے : میرے غموں کی فراوانی کا معاملہ حد سے بڑھ گیا ہے۔ اگر قضا و قدر نے غم کی اتنی بڑی مقدار میرے لیے مقدر کر دی تھی تو کاش مجھے دل بھی زیادہ دے دیے ہوتے تاکہ میں اس مقدار کو مختلف دلوں میں بانٹ دیتا اور ان کی برداشت ممکن ہو جاتی۔ یہ اسلوب ہماری زبان میں بالکل نیا ہے حق یہ ہے کہ اتنا بدیع اور دل آویز ہے، جس کا لطف بیانی نہیں، صرف وجدانی ہے۔ مرزا نے اسی طرح آنکھوں کے لیے بھی ایک جگہ ناکافی ہونے کا اظہار کیا ہے۔

ہے خونِ جگر جوش میں، دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خوننابہ فشاں اور

۴۔ شرح : اے غالبؔ ! اگر ہماری زندگی کچھ دن اور ساتھ دیتی اور محبوب کی طلب میں بدستور سرگرم رہتے تو وہ ضرور ہمارا کہنا مان لیتا۔

بظاہر اس شعر میں دو پہلو پیش کیے گئے ہیں اور دونوں متضاد ہیں۔ اوّل یہ کہ عام زندگی محبوب کو راہ پر لانے کے لیے کافی ثابت نہ ہوئی۔ اس باب میں مزید سعی و کوشش کی ضرورت تھی، جو کچھ مدت۔۔۔ ور جینے ہی کی بنا پر کی جا سکتی تھی۔ دوم یہ کہ مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ محبوب ایسا نہیں کہ کہنا بالکل نہ مانے، البتہ منت سماجت کے لیے وقت زیادہ صرف کرنا پڑتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاعر نے معاملہ امید و بیم کے درمیان معلق رکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محبوب کی روش ایسی نہیں، جو بالکل مایوسی پیدا کر دے، اگرچہ ہماری زندگی میں وہ ہم پر مہربان نہ ہوا۔

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے   ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ   ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو   ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم   دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر   یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

شاہ کی ہے غسلِ صحت کی خبر   دیکھیے کب دن پھریں حمام کے

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا   ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

۱۔ **شرح**: محفل سے مراد محبوب کی محفل ہے اور پیغام سے اشارہ پیغامِ طلب کی طرف ہے۔ یعنی اے محبوب! غیر تو تیری محفل میں لبِ ساغر کے بوسے لے رہے ہیں، گویا جام بھر بھر کر شراب پی رہے ہیں اور ہم پیغامِ طلب کے لیے بھی تشنہ لب ہیں، یعنی بلاوے کو بھی ترس رہے ہیں۔

۲۔ **لغات**۔ خستگی: تباہ حالی، خستہ دلی، بربادی۔

شرح: ہم اپنی بربادی و تباہ حالی کا گلہ تم سے کیا کریں؟ یہ تو نیلے رنگ کے آسمان کی حیلہ بازیاں، عیاریاں اور مکاریاں ہیں۔ یعنی ہم پر جو مصیبتیں آئیں، وہ ہماری تقدیر میں تھیں۔ اے محبوب! تم سے ان کا گلہ کیا ہو سکتا ہے؟

۳۔ **شرح**: ہم برابر تمھیں خط لکھتے رہیں گے۔ اگر کہنے کے لیے کوئی نئی بات نہ ہو، کیونکہ جو کچھ کہنا تھا، وہ بہت پہلے کہہ چکے ہیں۔ ہمیں خط کے مضمون سے کوئی غرض نہیں، صرف یہ چاہتے ہیں کہ تمھارا نام بار بار لکھیں، کیونکہ ہم اسی کے عاشق ہیں۔

۴۔ **لغات** ۔ **زمزم** : کعبۂ مکرمہ کا مشہور کنواں، جو کعبے سے صرف چند گز کے فاصلے پر مسجد الحرام کے اندر واقع ہے۔ اس کا پانی پینا مسنون ہے۔ علاوہ بریں صحت کے لیے بے حد مفید ہے۔ لوگ پیپے، ڈبے اور ڈبیاں بھر بھر کر بہ طور تبرک اطراف عالم میں لے جاتے ہیں۔

جامۂ احرام : احرام کے معنی ہیں اپنے اوپر حرام کر لینا۔ حج اور عمرہ کے موقع پر حرم پاک جانے کے لیے ایک خاص لباس پہنا جاتا ہے، جسے جامۂ احرام یا محض احرام بھی کہتے ہیں۔ یہ صرف دو چادریں ہوتی ہیں، ایک کمر میں باندھنے کے لیے، دوسری اوڑھنے کے لیے۔ ان میں سلائی بالکل نہیں ہوتی، سر ننگا رکھا جاتا ہے۔ مختلف اطراف کے آدمی حج و عمرہ کے لیے جائیں تو ہر طرف خاص مقامات مقرر ہیں، جہاں سے غسل کے بعد یہ لباس پہن لینا چاہیے ساتھ ہی ادائے حج و عمرہ کے بعد جامۂ احرام اتارنے تک صاحبِ احرام پر خاص پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں اور اس سلسلے میں بعض جائز امور بھی معین وقت کے لیے ترک کر دیے جاتے ہیں۔

شرح : رات بھر ہم زمزم پر بیٹھے شراب پیتے رہے۔ صبح ہوئی تو اسی کے پانی سے جامۂ احرام کے دھبے دھو کر زائرین حرم پاک میں شامل ہو گئے۔ بظاہر اس سے مقصود رندی نہیں، بلکہ یہ بتانا چاہتے ہیں، ہم نے ہر حال میں بے شمار گناہ کیے، لیکن حج کر کے ان گناہوں سے پاک ہو گئے، کیونکہ حج تمام پچھلے گناہ دھو ڈالتا ہے۔

۵ ۔ **لغات** ۔ **کیا** : کیسا، کس طرح، کیونکر۔

شرح : دیکھیے، میری آنکھوں نے کس طرح میرے دل کو تمھارے عشق کے جال میں پھنسا دیا۔ شاید میری آنکھیں بھی تمھارے جال کے حلقے ہیں۔

مطلب یہ کہ نہ میری آنکھیں تمھیں دیکھتیں، نہ دل تمھاری محبت کے پھندے میں پھنستا۔ آنکھوں کو تمھارے جال کے حلقے اس لیے کہتا ہوں کہ انھوں نے وہی کام انجام دیا، جو تمھارا حلقۂ گیسو انجام دیتا۔

۶۔ **شرح** : افواہ ہے کہ بادشاہ نے بیماری سے شفا پائی اور غسل صحت کرنے والے ہیں۔ دیکھیے، حمام کے دن کب پھریں، اس کی قسمت کب سازگار ہو اور اس کی تقدیر کو کب چار چاند لگیں!

بہادر شاہ جولائی ۱۸۵۳ء میں سخت بیمار ہو گئے تھے۔ بیماری نے طول کھینچا اور خاصی مدت تک ان کی صحت کے بارے میں پریشانی رہی۔ شفا ہوئی تو غسلِ صحت کا انتظام کیا، مگر ضعف کے باعث غسل ۲۱۔ صفر ۱۲۷۰ھ (۲۳ نومبر ۱۸۵۳ء) تک ملتوی رہا۔ بظاہر یہ غزل اگست یا ستمبر ۱۸۵۳ء کی ہے۔ یعنی شفا اور غسل کی درمیانی مدت کی۔

۷۔ **شرح** : اے غالب! عشق نے ہمیں کسی کام کا نہ رکھا، ورنہ ہم چنداں گئے گزرے نہ تھے۔ خود مرزا نے ہرگوپال تفتہ کو ایک خط میں یہ شعر لکھتے وقت تھوڑا سا تصرف کر دیا تھا، یعنی:

ضعف نے غالب نکما کر دیا

ریاض الدین امجد نے "سیر دہلی" میں لکھا ہے کہ میں نے یہ شعر مرزا کے سامنے پڑھا تو فرمایا: "بھئی! چپ رہو، یوں کہو کہ:

ضعف نے غالب نکما کر دیا

یا

دہر نے غالب نکما کر دیا

عشق کیسا، عاشقی کا وہ زمانہ نہ رہا۔

(احوال غالب صفحہ ۵۸)

پھر اس انداز سے بہار آئی | کہ ہوئے مہر و ماہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ پاک! | اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر | روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی | بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہ و گل کے دیکھنے کیلیے | چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر | بادہ نوشی ہے باد پیمائی
کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالبؔ | شاہ دیندار نے شفا پائی

۱۔ شرح: یہ ایک مستقل نظم ہے جس کے تمام شعر مسلسل چلے جا رہے ہیں۔ پھر بہار ایسے دلکش اور دلاویز انداز میں آئی کہ آسمان پر چاند اور سورج اس کے تماشائی بن گئے۔ یعنی اس سے لطف اٹھانے لگے۔

۲۔ شرح: اے خطۂ خاک یعنی زمین کے بسنے والو! دنیا کی آرائش و زیبائش اسے کہتے ہیں۔ یعنی بہار نے آکر دنیا کے گوشے گوشے کو آراستہ کر دیا۔

۳۔ لغات۔ رُوکش: شرمندہ کرنے والا۔

چرخِ مینائی: نیلے رنگ کا آسمان۔

شرح: زمین ایک سرے سے دوسرے سرے تک سبز ہو گئی اور نیلگوں آسمان کی سطح بھی اس کے سامنے شرمسار ہونے لگی۔

۴۔ شرح: سبزے کی کثرت کا یہ عالم ہوا کہ جب اس کے لیے زمین پر کوئی جگہ باقی نہ رہی تو وہ پانی کی سطح پر کائی بن گیا۔

۵۔ شرح: سبزے اور پھولوں کو دیکھنے کے لیے عام آنکھیں تو تقیں بہ

جوشِ بہار نے نرگس کی آنکھ میں بھی بینائی پیدا کر دی۔

۶۔ **لغات** ۔ **بادپیمائی** : ہوا پھانکنا ، محاورے میں فضول اور عبث کام کرنا۔

شرح : بہار کے باعث ہوا میں شراب کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے اور شراب نوشی اب ایک فضول کام ہے یا ہوا میں چلیں پھریں تو شراب نوشی کا سرور حاصل ہوتا ہے۔

"بادپیمائی" کے دونوں معنی لیے جا سکتے ہیں۔ اوّل بہار کی ہوا اس درجہ نشاط انگیز ہے کہ بادہ نوشی کی ضرورت نہیں رہی ، کیونکہ ہوا میں شراب کی تاثیر موجود ہے۔ دوم یہ کہ ہوا کھانے کو نکلیں تو یہ بجائے خود بادہ نوشی ہے ، گویا ہوا کھانا بھی شراب پینا ہے۔

۷۔ **شرح** : اے غالبؔ ! دنیا کو کیوں خوشی نہ ہو ؟ ہمارے دیندار بادشاہ کو اللہ نے اپنی رحمت سے شفا بخشی۔

۱۔ **لغات** :

تغافل دوست : بے توجہی اور بے التفاتی کو پسند کرنے والا۔

پہلو تہی کرنا : کنارہ کشی اور علیحدگی اختیار کرنا ، پرہیز کرنا۔

تغافل دوست ہوں میرا دماغِ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے ، تو جا میری بھی خالی ہے

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

شرح : میں توجہ کو نہیں ، بے توجہی کو ، تواضع کو نہیں ، بے رخی کو پسند کرتا ہوں اور میرے عجز کا دماغ بہت بلند ہے۔ یعنی میری عاجزی اور کسرِ نفسی کا پایہ بہت اونچا ہے۔ اگر آپ مجھ سے محفل میں کنارہ کشی کریں ، اور بے التفاتی

برتیں تو میری جگہ بھی آپ کے لیے خالی ہو گی۔

محفل میں جگہ خالی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تعظیم کے طور پر کسی کے لیے بیٹھی جگہ خالی کر دی جائے، یعنی آپ بے التفاتی برتیں تو میں بھی جگہ چھوڑ دوں گا۔ شعر کا پورا مضمون "پہلو تہی" اور "جا خالی" کرنے پر مبنی ہے۔ مراد یہ ہے کہ میں بے التفاتی کو اپنے لیے تعظیم و تکریم کا باعث سمجھتا ہوں۔

یہ مضمون فارسی میں بھی ایک جگہ کہا ہے!

در آغوش تغافل عرض یکرنگی تواں دیدن
تہی تا می کنی پہلو، بہ ما بنمودہ جا را

۲۔ شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"یہ خیال شاید کسی اور کے دل میں بھی گزرا ہو، مگر تمثیل نے اس کو بالکل ایک اچھوتا مضمون بنا دیا ہے اور شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں اگر اہل ہمت کا وجود ہوتا، جو دنیا کو محض ناچیز سمجھ کر اس کی طرف التفات نہ کرتے تو دنیا ویران ہو جاتی، پس جاننا چاہئیے کہ عالم اسی سبب سے آباد نظر آتا ہے کہ اہل ہمت مفقود ہیں۔ یعنی جس طرح میخانے میں جام و سبو کا شراب سے بھرا رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ میخانے میں کوئی میخوار نہیں ہے، اسی طرح عالم کا آباد ہونا دلالت کرتا ہے کہ اس میں اہل ہمت مفقود ہیں۔"

اہل ہمت سے مقصود ہے دنیا کو ٹھکرانے اور اس سے بے نیاز رہنے والے لوگ! اگر ایسے لوگ موجود ہوں تو دنیا ویران ہو جاتی۔ چونکہ وہ آباد ہے، اس لیے سمجھنا چاہیے کہ اہل ہمت ناپید ہیں۔ مثال اس کی یہ ہے کہ اگر شراب خانے میں پیالے اور مٹکے شراب سے بھرے ہوئے موجود ہوں تو سمجھ لینا چاہیے کہ شراب خانہ میخواروں سے خالی ہو گیا، کیونکہ اگر وہ موجود ہوتے تو جام و سبو

شراب سے بھرے کیونکر رہتے ؟

کب وُہ سنتا ہے کہانی میری؟ ‏ اور پھر وہ بھی زبانی میری

خلشِ غمزۂ خونریز نہ پُوچھ ! ‏ دیکھ خوں نابہ فشانی میری

کیا بیاں کرکے مرا روئیں گے یار؟ ‏ مگر آشفتہ بیانی میری

ہُوں ز خود رفتۂ بیدائے خیال ‏ بھول جانا ہے نشانی میری

متقابل ہے مقابل میرا ‏ رُک گیا دیکھ روانی میری

قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں ‏ سخت ارزاں ہے گرانی میری

گرد بادِ رہِ بے تابی ہوں ‏ صرصرِ شوق ہے بانی میری

دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا ‏ کُھل گئی ہیچ مدانی میری

کر دیا ضُعف نے عاجز غالب ‏ ننگِ پیری ہے جوانی میری

۱۔ شرح : محبوب میرے عشق کی دردناک داستان سننے کا روادار کیا ہو سکتا ہے ؟ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ داستان میری زبان سے سُنے۔ جب اس داستان کا کسی کی زبان سے بھی سننا ممکن نظر نہیں آتا تو خود میری زبان سے سُننے کی امّید کیا ہو سکتی ہے ؟

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں، مرزا غالب نے اس شعر میں سننے کے دو رتبے پیدا کیے، اوّل عشق کی کہانی سننا، دوم عاشق کی زبانی سننا :

" یہی امر خوبیِ شعر کا باعث ہُوا ہے اور معانی میں ایسی نازک تقسیم

ہمیشہ لطف دیتی ہے۔ دوم سارے شعر کے الفاظ ایسے دست و گریباں ہیں کہ معلوم ہوتا ہے، پہلے ہی فکر میں دونوں مصرعے نکل آئے۔"

۲۔ شرح : جب میری آنکھوں سے خون بہنے کا سلسلہ جاری ہے تو یہ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے کہ غمزۂ خونریز کی کشاکش کی کیا کیفیت ہے۔ جب اس کیفیت کی گواہی سامنے موجود ہے تو پوچھنے کا کیا مطلب؟ یہ سب کچھ تو میری خونفشانی دیکھ کر معلوم کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ شرح : دوست احباب میرے مرجانے کے بعد کون سی خصوصیت یاد کر کے مجھے روئیں گے؟ اور تو مجھ میں کوئی خصوصیت ہے نہیں، صرف ایک چیز ہے اور وہ یہ کہ دیوانگی اور پریشاں حالی میں وقتاً فوقتاً اُلٹی سیدھی باتیں کرتا تھا، جن میں نہ کوئی ترتیب تھی اور نہ ان کا کوئی ٹھکانا تھا۔

عام قاعدہ ہے کہ جب کوئی مرجائے تو عزیز اور دوست مرنے والے کے نمایاں وصف یاد کر کے روتے ہیں اور تعزیت کی مجلس میں انھیں اوصاف کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ شاعر نے یہاں اپنی سب سے بڑی خصوصیت آشفتہ بیانی قرار دی۔

۴۔ لغات۔ بَیدا : صحرا، جنگل، بیابان۔

شرح : میں خیال کے بیابان میں از خود رفتہ ہو چکا ہوں، یعنی اپنے آپ کو گم کر بیٹھا ہوں۔ میرا پتا نشان صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ احباب مجھے بھول جائیں۔

۵۔ لغات۔ مُتقابِل : متضاد، بالمقابل، باہم مقابلہ کرنے والا۔

شرح : مقابل سے یہاں مراد محبوب ہے، رُک جانے سے مراد ہے چُپ ہو جانا، خفا ہو جانا۔ روانی، لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی۔

خود مرزا غالب نے عبدالرزاق شاکر کو اس شعر کی شرح یوں لکھی ہے:
"تقابل و تضاد کو کون نہ جانے گا؟ نور و ظلمت، شادی و غم، راحت و رنج

وجود و عدم - مقابل اس مصرع میں بہ معنی مرجع ہے، جیسے حریف
کہ بہ معنی دوست کے بھی مستعمل ہے۔ مفہوم شعر یہ کہ ہم اور دوست
از روئے خود عادت ضدِ ہم دیگر ہیں۔ وہ میری طبع کی روانی
دیکھ کر رُک گیا۔

مطلب یہ ہے کہ میں اور محبوب ضد ہم دیگر ہیں۔ میری طبیعت زوروں پر
پر تھی۔ پے در پے لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی سے کام لے رہا تھا۔ محبوب نے یہ
کیفیت دیکھی تو چُپ ہو گیا، یعنی بات چیت ترک کر دی۔ سمجھنا چاہیے کہ
اسے میری طبیعت کی روانی ناپسندیدہ معلوم ہوئی اور ناراض ہو گیا۔

۶ - لغات - گرانی : وزن میں بھاری ہونا، قدر و قیمت میں
بلند پایہ ہونا۔

ارزاں : وزن میں ہلکا، قدر و قیمت میں بے حقیقت۔
شعر میں دونوں لفظوں کے دونوں معنی شاعر کے پیش نظر ہیں۔

شرح : خواجہ حالی اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :
"میری قدر اُس پتھر کی ہے، جو راستے کے سرے پر پڑا ہو اور
ہر شخص اس پر آتے جاتے پاؤں رکھ کر گزرے، یعنی ہوں تو
گراں قدر، مگر اُس پتھر کی طرح بے قدر ہوں۔ پس میری گرانی
کس قدر ارزاں ہے۔"

جو پتھر راستے میں پڑا ہُوا ہو، بھاری ہونے کے باوجود سخت بے قدر
ہوتا ہے، کیونکہ آنے جانے والے سب اسے پامال کرتے ہیں۔ وہی کیفیت
مرزا غالب کی ہے کہ قدر و قیمت میں بڑھا ہُوا ہونے کے باوصف بالکل
بے حیثیت سمجھے جاتے ہیں۔

مرزا نے یہ مضمون ایک فارسی شعر میں بھی باندھا ہے :

ناکس ز تنومندی ظاہر نہ شود کس
چوں سنگ سرِ رہ کہ گراں است و گراں نیست

۷۔ **لغات**۔ گِرد باد : بگولا۔

صَرصَر : آندھی۔

شرح : میں بے تابی کے راستے میں پیچ و تاب کھانے والا بگولا ہوں۔ شوق کی آندھی مجھے وجود میں لانے کا موجب بنی۔

مطلب یہ کہ میں بگولے کی طرح بیقرار ہوں، مجھے کسی پہلو بھی سکون نصیب نہیں ہو سکتا۔ چونکہ آندھی بگولا اٹھانے کا موجب بنی اور آندھی کے زور و قوت کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا، لہذا میں بھی جب تک موجود ہوں، برابر بیقرار رہوں گا اور مجھے سکون نصیب نہیں ہوگا۔

۸۔ **لغات**۔ ہیچدانی : کچھ نہ جاننا۔

شرح : شاعر عموماً محبوب کے مُنہ اور کمر کو تنگی اور باریکی میں کمال پر پہنچاتے پہنچاتے بالکل بے وجود بنا گئے، یعنی ہیچ اور بے حقیقت۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں نے محبوب کے دہن کا سراغ لگانا چاہا لیکن بالکل ناکام رہا۔ اب دنیا پر آشکارا ہو گیا کہ میں کچھ بھی نہیں جانتا۔

اس شعر کا پورا مضمون لفظ "ہیچ" پر مبنی ہے۔ چونکہ دہن "ہیچ" ہے اور میں اس کا سراغ نہ لگا سکا، اس لیے ہیچداں بن گیا، یعنی "ہیچ نہ جاننے والا"۔

۹۔ **شرح** : اے غالب! ضعف نے مجھ پر اس درجہ غلبہ پالیا اور مجھے اتنا عاجز کر دیا کہ میری جوانی بڑھاپے کے لیے باعثِ ننگ ہو گئی، یعنی جوان ہونے کے باوجود اس درجہ ضعیف اور کمزور ہوں کہ بوڑھے بھی اس ضعف کو اپنے لیے باعثِ ننگ جانیں۔

گلشن کو تری صحبت ازبس کہ پسند آئی ہے
ہر غنچے کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

واں کنگرِ استغنا ہر دم ہے بلندی پر
یاں نالے کو اور الٹا دعوائے رسائی ہے

ازبس کہ سکھاتا ہے غم ضبط کے انداز ے
جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے

۱۔ لغات۔ آغوش کشائی: کسی سے ہم بغل ہونے کے لیے دونوں ہاتھ پھیلانا۔

شرح: اے محبوب! تیرے باغ میں پہنچنے پر کلیاں خوشی سے پھول نہیں غنچے کھلتے ہیں تو سمجھنا چاہیے کہ تجھ سے ہم بغل ہونے کے شوق میں وہ بے تاب ہیں۔

۲۔ لغات۔ کنگُر: وہ کٹے ہوئے طاقچے، جو خوبصورتی کی غرض سے قلعوں، فصیلوں اور دیواروں پر بنا دیتے ہیں اور جو انتہائی بلندی پر ہوتے ہیں۔
اِستغنا: بے نیازی، بے پروائی۔

شرح: اُدھر محبوب کی بے نیازی کے بام کا کنگرہ زیادہ سے زیادہ بلند ہوتا جا رہا ہے، یعنی اس کی بے نیازی برابر بڑھتی جا رہی ہے، اِدھر میری فریاد و فغاں کو یہ دعویٰ ہے کہ میں ہر بلندی پر پہنچ سکتی ہوں۔
مطلب یہ کہ محبوب تو زیادہ سے زیادہ بے پروا ہوتا جا رہا ہے اور نالے کو دعوے ہے کہ میں تاثیر پیدا کر رہا ہوں۔
شعر میں لفظ "اُلٹا" عجب انداز سے استعمال ہوا ہے۔

۳۔ لغات۔ چشم نمائی: آنکھیں دکھانا، گھورنا، غصّے سے دیکھنا تنبیہ۔

شرح: غم عاشق کو صبر و ضبط کی تعلیم دے رہا ہے۔ جو نیا داغ دل پر پڑتا ہے، سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اس استاد کی طرف سے گھورنے اور تنبیہ کرنے کا نشان ہے۔

"داغ" کی تشبیہ "آنکھ" سے محتاج تشریح نہیں۔

نقشِ نازِ بتِ طنّاز بہ آغوشِ رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

تو وہ بدخُو کہ تحیّر کو تماشا جانے
غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

وہ تپِ عشق تمنّا ہے کہ پھر صُورتِ شمع
شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

۱۔ لغات۔

نقش: تصویر۔

طنّاز: رمز و کنایہ میں بات کہنے والا، ناز سے چلنے والا، شوخ، بیباک۔

مانی: ایک مشہور مصوّر، جو بابل کا باشندہ تھا۔ کمالِ علم و فن کی بنا پر اس نے نبوّت کا دعویٰ کیا۔ ملک سے نکالا گیا اور ترکستان و چین میں عمر کا بڑا حصّہ گزار کر شاپور کے زمانے میں ایران آیا۔ ایک روایت کے مطابق ۲۱۶ء میں پیدا ہوا اور ۲۷۶ء میں وفات پائی۔

شرح: اگر میرا شوخ اور بیباک محبوب رقیب سے ہم بغل ہو کر ناز و انداز کرنے لگے اور اس حالت میں اس کی تصویر کھینچی جائے تو مصوّر کے لیے لازم ہوگا کہ مور کے پاؤں کو مو قلم بنائے۔

مطلب یہ کہ محبوب کتنا ہی حسین و جمیل کیوں نہ ہو، لیکن جب رقیب کی آغوش میں پہنچتا ہے تو اس کا حسن و جمال اس قابل رہ جاتا ہے کہ مور کے پاؤں سے، جو حد درجہ مکروہ و ناز یبا ہوتا ہے، اس کی تصویر بنائی جائے۔

مور کے پاؤں کو مُو قلم بنانے کی غرض یہ ہے کہ مور بال و پر اور کلغی کے اعتبار سے نہایت خوبصورت جانور ہے، لیکن اس کے پاؤں بے حد بدصورت ہوتے ہیں، بلکہ مشہور ہے، مور خود پاؤں کو اپنے لیے باعثِ ننگ جانتا ہے۔

۲ - **لغات** - **تحیّر** : حیرانی کی حالت جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان چُپ ہو جاتا ہے اور اس میں بات کرنے کی سکت نہیں رہتی۔

شرح : اے محبوب! تیری بدخوئی کا یہ عالم ہے کہ میں سراپا حیرت بن کر خاموش ہو جاتا ہوں تو تُو اسے ایک دلچسپ تماشا سمجھتا ہے اور اس سے لطف اٹھاتا ہے۔ اگر میں عالم حیرت سے نکل کر اپنے غم کی کہانی تیرے سامنے پیش کروں تو میری پریشاں گوئی کے باعث تُو بے مزہ ہو جاتا ہے۔ گویا میرا چُپ رہنا تیرے لیے دلچسپ اور میرا غم دل کہنا تیرے لیے باعثِ رنجش و کدورت ہے

۳ - **لغات** - **ریشہ دوانی** : ریشہ دوڑانا - جب کوئی دانہ یا بیج زمین سے اُگتا ہے تو اس کے ریشے ارد گرد پھیل جاتے ہیں۔ انھیں ریشوں کی بدولت زمین سے اس روئیدگی کو غذا ملتی ہے۔

شرح : مجھے اُس تپ عشق کی آرزو ہے کہ پھر شمع کی لَو کی طرح آگ کا شعلہ جگر کی رگ تک اپنا ریشہ دوڑا دے۔

مطلب یہ کہ جس طرح شمع کی لَو دھاگے کے ذریعے سے اس کے اندر تک حرارت پہنچا دیتی ہے اور پوری طرح یکسر گرم ہو جاتی ہے، اسی طرح میں بھی عشق کی اس حرارت کا آرزومند ہوں جو میرے جگر تک آگ کے شعلے دوڑا دے۔

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی!
لکھ دیجیو یارب! اسے قسمت میں عدو کی
اچھا ہے سر انگشتِ حنائی کا تصوّر
دل میں نظر آتی تو ہے اک بُوند لہُو کی

۱ - **شرح** : جس زخم کے لیے رفو کی تدبیر ممکن ہو لے میرے خدا! اُسے دشمن کی قسمت میں لکھ دیجیے۔ یعنی میں تو اس زخمِ دل کا آرزومند ہوں

جو رفو ہو ہی نہ سکے۔

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے
یاں تو کوئی سُنتا نہیں فریاد کسو کی
دشنے نے کبھی مُنہ نہ لگایا ہو جگر کو
خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی
صد حیف! وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب
حسرت میں رہے ایک بُتِ عربدہ جُو کی

۲۔ لغات۔
سرِ انگشت حنائی: مہندی لگی انگلی کا سرا۔

شرح: خواجہ حالی فرماتے ہیں:

" لفظ "تو" نے جو دوسرے مصرع میں ہے، یہ معنی پیدا کر دیے ہیں کہ آنکھ سے لہو روتے روتے دل میں خون کا ایک قطرہ باقی نہیں رہا، اس لیے دوست کے سرِ انگشت حنائی کے تصور کو غنیمت سمجھتا ہے کہ اس کی وجہ سے دل میں لہو کی ایک بُوند تو نظر آتی ہے۔"

اس شعر کی شرح کے مختلف پہلو مولانا طباطبائی نے نہایت اچھے انداز میں پیش کیے ہیں۔ میں ان کا بیان خلاصۃً ذیل میں پیش کرتا ہوں:

۱۔ سرِ انگشت کا مہندی سے لال ہو کر لہو کی بوند ہو جانا نہایت اچھی تشبیہ ہے تشبیہ سے مشبّہ کی اکثر تزئین و تحسین مقصود ہوتی ہے۔ شاعر نے سرِ انگشت کی خوب صورتی آنکھ سے دکھا دی۔

۲۔ جس انگلی کی پور لہو کی بوند برابر ہو، وہ انگلی کس قدر نازک ہو گی۔ کنایہ ہمیشہ تصریح سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔

۳۔ اس شعر میں وجہِ شبہ مرکب ہے، یعنی بوند کی سرخی اور بوند کی شکل دونوں سے وجہِ شبہ کی ترکیب حاصل ہوئی ہے اور مرکب تشبیہ زیادہ بدیع ہوتی ہے۔

۴۔ یہ نئی تشبیہ ہے، پہلے کسی نے نظم نہیں کی۔

۵۔ اسی تشبیہ سے یہ بات نکالی کہ دل میں ایک بوند تو لہو کی دکھائی دی۔ پھر

کجا تصور، کجا لہو کی بوند، دونوں میں کیسا بونِ بعید ہے اور تباینِ طرفین سے تشبیہ میں حسن اور غرابت زیادہ ہو جاتی ہے۔

۶۔ لفظ "تو" نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ شعر اس شخص کی زبانی ہے جس کا لہو سب خشک ہو چکا ہے۔ وہ اپنے دل کو ایک خیالی چیز سے تسکین دے رہا ہے۔

۷۔ بوند کے معنی میں ٹپک پڑنا داخل ہے۔ یہی حال تصوّر کا خیال سے اُتر جانے میں ہے، یعنی حرکت وجہِ شبہ میں داخل ہے، گو طرفینِ تشبیہ متحرک نہیں۔

۸۔ غرض یہ نہایت غریب و بدیع و تازہ تشبیہ ہے۔

۳۔ شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"بے حوصلگی یعنی کم ظرفی۔ "یاں" سے مراد دنیا ہے۔ معشوق سے کہتا ہے، تُو اس بات سے کیوں ڈرتا ہے کہ ہم عاشق تیرے جور و ظلم سے تنگ آ کر حاکم سے یا خدا سے فریاد کریں گے؟ کیونکہ اگر ہم ایسا کریں بھی تو کوئی کسی کی فریاد ہی نہیں سنتا۔"

اوّل سچے عاشق اتنے کم ظرف نہیں کہ محبوب کے ظلم و جور صبر سے برداشت نہ کریں، لیکن اگر اے محبوب! تیرے دل میں یہ وسوسہ موجود ہے کہ شاید عشاق کے گروہ میں سے کوئی بے ہمت نکل آئے اور فریاد و فغاں شروع کر دے تو ظاہر ہے کہ اس دنیا میں تو کوئی کسی کی فریاد سننے پر آمادہ نہیں، پھر تو کیوں پریشان ہے؟

۴۔ ۵۔ لغات۔ عربدہ جُو : جنگجو۔ لڑاکا۔

شرح : اے غالب! اس ناکام فرد کے لیے سو مرتبہ افسوس، جو عمر بھر ایک جنگجو محبوب کی حسرت میں رہا۔ اس محبوب کی کٹار نے کبھی آرزومند عاشق کے جگر کو مُنہ نہ لگایا اور محبوب کے خنجر نے کبھی اس کے گلے کی بات نہ پوچھی۔

جنگجو محبوب کی آرزو اس لیے تھی کہ جگر کو کٹار سے چھیدے اور گلا خنجر سے کاٹے، لیکن عاشق کی عمر حسرت میں گزر گئی اور یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔

سیماب پشت گرمیٔ آئینہ دے ہے ہم
حیراں کیے ہوئے ہیں دلِ بے قرار کے

آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب! چل کہ چلے دن بہار کے

۱۔ لغات: پشت گرمی: امداد، اعانت، پشتیبانی۔

شرح: پارا شیشے پر چڑھا دیا جائے تو وہ آئینہ بن جاتا ہے، گویا پارا آئینے کے لیے پشتیبانی کا کام دیتا ہے۔ لیکن ہمارا بیتاب و بیقرار دل، جو مثال میں پارے کی حیثیت رکھتا ہے اور جس سے ہمیں پیشِ نظر اصول کی بنا پر امداد کی توقع ہونی چاہیے تھی، وہ ہماری حیرانی کا باعث بنا ہوا ہے اور اس نے ہمیں سخت خبط میں ڈال رکھا ہے۔

۲۔ لغات۔ وداع: رخصت۔

شرح: پھول کھلا نہیں، بلکہ اس نے رخصت کے لیے اپنی آغوش کھول دی ہے۔ اے بلبل! تو بھی چل، کیونکہ بہار کے دن ختم ہو رہے ہیں۔
عام قاعدہ ہے کہ جب لوگ ایک دوسرے سے کچھ مدت کے لیے الگ ہوتے ہیں تو ہم بغل ہو کر رخصتی ملاقات کرتے ہیں۔ گویا آغوش کھولنے کا مطلب رخصت ہونا ہے۔ اسی طرح پھول نے رخصت کے لیے آغوش کھولی، کیونکہ بہار جا رہی ہے اور بلبل کو بھی رخصت ہونا چاہیے، بلکہ خطاب سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر بھی جا رہا ہے اور بلبل کو ساتھ لے جا رہا ہے۔

ہے وصل ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں
معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے

۱۔ لغات: تمکین: وقار سے بیٹھنا، کوئی ایسی حرکت نہ کرنا، جس کا رنگ

جذباتی ہو۔ کیونکہ جذباتی حرکتیں عموماً اعتدال سے باہر ہوتی ہیں۔

اس لب سے مل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو ہاں
شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے

شرح : اگر محبوب وصل کی حالت میں وقار و تمکنت سے بیٹھا رہے اور عاشق ضبط و صبر سے کام لے تو اس وصل کو وصل نہیں، ہجر سمجھنا چاہیے وصل کی حالت کا تو تقاضا ہی یہ ہے کہ محبوب کی طرف سے پے در پے شوخیاں سرزد ہوں اور عاشق پر اک گونہ دیوانگی کی کیفیت طاری رہے۔

مرزا نے اس شعر میں وصل و ہجر کے ماحول کی کیفیت دو دو لفظوں میں انتہائی جامعیت کے ساتھ پیش کر دی۔

۲۔ **شرح** : محبوب کے لبوں سے بوسہ ضرور مل جائے گا، خواہ کتنی ہی دیر لگے، البتہ یہ ضروری ہے کہ شوق کا جوش و خروش جاری رہے۔ اس میں کوئی کمی نہ آنے پائے۔ ساتھ ہی رندوں کی سی جرأت ہو، یعنی ایسی جرأت، جو کسی سے نہ دبے بالکل بیباک ہو۔

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر
جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے

چاک مت کر جیب بے ایامِ گُل
کچھ اِدھر کا بھی اشارہ چاہیے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
مُنہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے

اپنی رُسوائی میں کیا چلتی ہے سعی — یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید — نا اُمیدی اس کی دیکھا چاہیے

غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے — چاہنے والا بھی اچّھا چاہیے

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ — آپ کی صُورت تو دیکھا چاہیے

۱۔ **شرح** : دنیا میں صرف حسین اس امر کے حقدار ہیں کہ انھیں چاہا جائے۔ اتنا چاہا جائے، جو چاہنے کی آخری حد ہے۔ اگر خوش نصیبی سے وہ بھی چاہنے لگیں تو اس سے بڑی نعمت کوئی نہیں ہو سکتی۔

۲۔ **لغات**۔ کھینچنا : پیچھے ہٹنا۔ پرہیز کرنا۔ بچنا۔ مے کے ساتھ کھینچنا، میکشی کا ترجمہ ہے، جس کا مطلب شراب پینا ہے۔ یہاں مرزا نے کھینچنا شراب کے ساتھ استعمال کیا، لیکن پہلے مصرع سے واضح ہے کہ ان کا مقصود احتراز ہے۔

شرح : رندوں اور شراب نوشوں کی صحبت سے دُور ہی رہنا واجب ہے۔ وہاں جا کر شراب پینے کے بجائے شراب سے پرہیز کرنا چاہیے۔

۳۔ **لغات**۔ سمجھنا : (پہلے مصرع میں) جاننا۔ خیال کرنا۔

سمجھنا : (دوسرے مصرع میں) سزا دینا، مزہ چکھانا، بدلہ لینا۔

شرح : اے محبوب! دل تیری چاہت کو ایک معمولی بات سمجھا تھا، یعنی اس کا خیال یہ تھا کہ یہ کوئی ایسا امر نہیں، جو مشکلات کا باعث بنے۔ لیکن ایک کارِ اہم کو معمولی بات سمجھ کر اس نے سنبھال لیا تھا، اب لازم ہے کہ اسے اس حماقت کا مزہ چکھایا جائے۔

۴۔ **شرح** : خواجہ حالیؔ فرماتے ہیں:

"پھول کے کھلنے کو چاکِ گریباں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ کہتا ہے کہ

ہر ایک کام نیچر کی ہدایت سے کرنا چاہیے۔ پس جب تک پھول اپنا گریبان چاک نہ کرے، تو بھی گریبان چاک مت کر۔ اس میں لطف یہ ہے کہ مجنوں کو ہمیشہ بہار میں زیادہ جوشِ جنوں ہوتا ہے۔"

عام قاعدہ یہ ہے کہ بہار آتی ہے تو درختوں میں شگوفے پھوٹتے ہیں، کونپلیں نکلتی ہیں، پھول کھلتے ہیں تو بھی موسمِ بہار کے بغیر اپنا گریبان چاک نہ کر۔ اس کے لیے قدرت کا بھی کوئی اشارہ اور ایما ہونا چاہیے۔ یعنی جس طرح فطرت کی دوسری چیزوں کے دامن آمدِ بہار پر چاک ہوتے ہیں، اسی طرح تیرا دامن بھی بہار کی آمد کے بغیر تار تار نہ ہونا چاہیے۔

۵۔ **شرح** : اے محبوب! آپ منہ چھپا کر ہم سے بیگانہ بنتے ہیں، حالانکہ یہ پردہ داری تو دوستی کا راز فاش کرنے کی دلیل ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم سے بیگانہ بنے رہیں تو منہ چھپانا چھوڑ دیجیے۔ اگر آپ ہم سے پردہ داری کرتے رہیں گے تو لوگ ضرور سمجھیں گے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ گویا اس ذریعے سے مرزا حصولِ مطلب کی تدبیر کر رہے ہیں۔

۶۔ **شرح** : غیر برابر میرے خلاف لگائی بجھائی میں سرگرم رہا یہاں تک کہ محبوب کا دل بھی اس سے اُکتا گیا اور جو وقار و اعتماد اسے محبوب کے ہاں حاصل ہوا تھا، وہ خاک میں مل گیا۔ گویا میری دشمنی میں اس سیاہ بخت نے اپنا بھی بیڑا غرق کر لیا۔ دیکھیے، اس کی دشمنی کا درجہ کہاں پہنچا ہوا ہے۔

جب انسان کسی کے ساتھ دشمنی میں اپنے نقصان کی بھی پروا نہیں کرتا تو یہ دشمنی کی آخری حد ہوتی ہے، کیونکہ دشمنی میں اپنی ذات کو بھی بھول جاتا ہے۔ یہی حقیقت مرزا نے اس شعر میں پیش کی ہے۔

۷۔ **شرح** : عاشق خود اپنی رسوائی کے لیے کیا کوشش کر سکتا ہے؟ یہ معاملہ تو محبوب کی ہنگامہ آرائی پر موقوف ہے۔ وہ جب چاہے، کسی کو بے صبر اور بیتاب بنا کر رسوائی کے راستے پر لگا دے اور اس کی عزت و حرمت برباد

کرڈالے۔

۸۔ شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"ناامیدی کی غایت اس سے بڑھ کر اور ایسی خوبی کے ساتھ شاید ہی کسی نے بیان کی ہو۔"

جس کی امید کا بر آنا مرنے پر موقوف ہو، اس کی ناامیدی دیکھنے کے قابل ہے۔ یعنی زندگی میں اس کی کسی امید کا پورا ہونا بالکل ناممکن ہو گیا اور مرنے پر امید پوری بھی ہوئی تو اس سے کیا حاصل؟ گزری ہوئی عمر تو واپس نہیں آسکتی۔

۹۔ ۱۰۔ شرح : اے اسد! تم حسینوں کو چاہتے ہو؟ واہ! ذرا اپنی صورت تو دیکھو، یہ اس قابل ہے بھی کہ حسینوں کو چاہے۔

اے غافل! ان چاند جیسے چہروں والے دلرباؤں کو چاہنے کے لیے بھی آدمی کو خوش وضع اور خوبرو ہونا چاہیے۔

ہر قدم دورئ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

درسِ عنوانِ تماشا بہ تغافل خوشتر
ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں
صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے

۱۔ شرح : میری منزل مجھ سے ہر قدم پر دور ہوتی جا رہی ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ جہاں پہنچنا ہے، پہنچ جاؤں لیکن مقامِ مقصود اُتنا ہی بعید ہوتا جا رہا ہے، جتنا میں اس کے نزدیک پہنچنے کی

غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں
کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں
صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

بے خودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو
پُر ہے سائے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے
ہو نگہ مثلِ گلِ شمع، پریشاں مجھ سے

بے کسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہے ہے!
سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئینہ داریٔ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے، اسد
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

کوشش کر رہا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ بیابان اسی رفتار کے مطابق مجھ سے بھاگ رہا ہے جس رفتار سے میں اس کے قریب پہنچنا چاہتا ہوں۔

اس شعر میں مرزا نے نظر کے التباس و اشتباہ کا وہ معاملہ پیش کیا ہے، جس کا تجربہ اکثر اشخاص کو ہوتا ہے، لیکن عموماً اس کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ فرض کیجیے کہ آپ ریل یا کسی دوسری سواری میں بیٹھے ہیں۔ وہ جتنی تیز چلے گی، یہی احساس ہوگا کہ سواری ٹھہری ہوئی ہے اور ارد گرد کی زمین تیزی سے پیچھے کی طرف دوڑی جا رہی ہے۔ تیز دوڑنے والے شخص کو اسی قسم کا التباس ہوتا ہے۔ چنانچہ مرزا فرماتے ہیں کہ میں

جتنا منزل کی طرف دوڑتا ہوں، عام التباس و اشتباہ کی بنا پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منزل مجھ سے دوڑی جا رہی ہے، لہٰذا میری تیز رفتاری سے منزل کی دوری کا معاملہ واضح ہے۔

۲۔ لغات۔ تماشا: جلوہ، دیدار، مجازاً اس سے تماشائے دنیا بھی مراد لی جا سکتی ہے، جو یہاں زیادہ موزوں ہے اور تماشائے محبوب بھی۔

شرح: دنیا کی کتاب کا پڑھنا تو ممکن ہی نہیں، صرف اس کے عنوانوں کا سرسری تماشا بھی تغافل اور بے توجہی ہی سے کرنا چاہیے۔ صرف اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر ضروری نتیجہ نکال لینا کافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری نظر آنکھوں سے باہر نہیں نکلتی، اندر ہی اندر رہتی ہے، گویا وہ میری پلکوں کی بندش کے لیے شیرازہ بن گئی ہے۔

مرزا کہنا یہ چاہتے ہیں کہ دنیا کی چیزوں کو بہ غور دیکھنا شروع کریں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ نگاہیں ان میں الجھ جائیں گی اور حیاتِ انسانی کا جو مقصود ہے۔ یعنی محبوبِ حقیقی سے لَو لگانا، اس کے ممکنات کم ہو جائیں گے۔ تغافل و بے پروائی ہی کا طریقہ اچھا ہے۔

اگر "تماشا" سے تماشائے محبوب مراد لیں تو مطلب یہ ہوگا، محبوب کو اس حالت میں دیکھنا چاہیے، جس میں خود اسے پتا نہ لگے کہ دیکھ رہے ہیں۔ یہی طریقہ میں نے اختیار کیا اور اس وجہ سے میری نگاہیں آنکھوں کے اندر ہی اندر رہتی ہے، لیکن اعتراف کر لینا چاہیے کہ اس تعبیر کی صورت میں پہلے مصرع کا مفہوم واضح کرنے کے لیے تکلف سے کام لینا پڑے گا۔ صحیح مفہوم وہی معلوم ہوتا ہے، جو ابتدا میں پیش کیا گیا۔

۳۔ شرح: محبوب سے جدائی کی رات ہے۔ دل میں آتشِ شوق بری طرح بھڑک رہی ہے، اس سے وحشت زدہ ہو کر میرا سایہ دھوئیں کی طرح مجھ سے بھاگ رہا ہے۔

شعر میں خوبی یہ ہے کہ آگ جتنی بھڑکے گی، دھواں اس سے دُور ہی جائے گا۔ یہ مضمون مرزا ایک اَور جگہ بھی باندھ چکے ہیں۔

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دُود بھاگے ہے اسدؔ
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

۴۔ **شرح** : خدا نہ کرے کہ محبوب عاشقوں کے غم میں بناؤ سنگار چھوڑ کر سادگی اختیار کرے۔ میں مر گیا اور میرے غم میں محبوب نے بناؤ سنگار چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آئینہ دیکھنے کی ضرورت نہ رہی ہے، کیونکہ اس کی ضرورت بہر حال بناؤ سنگار ہی کے لیے ہوتی ہے۔ گویا خانۂ آئینہ ویران ہو گیا اور اس کا سبب میں بنا۔ اے خدا! اتنی مہربانی کر کہ عاشقوں کا غم محبوبوں کو اس درجہ پریشان نہ کرے۔

۵۔ **شرح** : میرے پاؤں چھالوں سے بھرے ہوئے تھے اور میں نے صحرائے جنوں میں چلنا شروع کر دیا۔ اس کی پگ ڈنڈی میرے چھالوں کے لیے دھاگا بن گئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ چھالے موتی ہیں اور پگ ڈنڈی کے دھاگے نے انھیں موتیوں کی لڑی بنا دیا ہے۔ پھر موتیوں کے برعکس چھالوں میں تپش اور حرارت ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چراغاں کی طرح جل اٹھے۔ گویا چھالوں نے صحرائے جنوں کے راستے کی بدولت رشتۂ گوہر کی صورت بھی اختیار کی اور چراغاں کی بھی۔

۶۔ **لغات** ۔ ہُوجو : ہوجیو، ہو جائے۔

شرح : خدا کرے، بیخودی میرے لیے فراغت اور راحت و سکون کی تمہید کا بستر بنی رہے۔ میرا شبستان سایے کی طرح مجھ سے بھرا ہُوا ہے۔

مطلب یہ کہ میں بیخودی کی بدولت اپنی آرام گاہ میں بے حس و حرکت پڑا ہوں، خدا کرے، میری یہ بیخودی اسی طرح میرے لیے راحت و آسائش کا سامان بنی رہے! اگر بیخودی نہ ہو تو نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ میں جگہ جگہ

بھاگا دوڑا پھروں اور سرگردانی میں عمر گزاروں۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں:

"تمہید کے لغوی معنی بچھانے کے ہیں اور یہ بستر کے مناسبات میں سے ہے۔ اصطلاح میں تمہید اسے کہتے ہیں کہ کسی کام سے پہلے کچھ ایسی باتیں کی جائیں، جن پر وہ کام موقوف ہے اور یہی معنی مصنّف کو مقصود ہیں . . . فراغت کے لغوی معنی خالی ہونے کے ہیں اور یہ پُر ہونے کے مناسبات میں سے ہے اور اصطلاح میں راحت کے معنی پر ہے اور یہی معنی یہاں مقصود ہیں۔"

۷۔ **لغات۔ گُلِ شمع**: شمع کا گل، چراغ کی بتّی کا سرا، شعلے کی لَو۔ یہاں دونوں معنی درست ہیں۔ شمع کا گل اس لیے کترا جاتا ہے کہ روشنی ٹھیک رہے، مدھم نہ ہونے پائے۔ گل کترتے وقت اس میں سے دھؤاں نکل کر ارد گرد پھیلتا ہے اور اس کے بعد شعلہ زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔ گویا اس کی روشنی زیادہ پھیل جاتی ہے۔

شرح: اے محبوب! اگر تُو میری گردن بہ حالتِ شوقِ دیدار کاٹ دے، یعنی مجھے قتل کر ڈالے تو میری نظر شمع کے گُل یا شعلے کی لَو کی طرح ہر طرف پھیل جائے گی۔

۸۔ **شرح**: آہ! محبوب سے جدائی کی رات، بیکسی کا عالم، کوئی ساتھی نہیں، کوئی رفیق نہیں، کوئی غمخوار نہیں۔ حد یہ ہے کہ میرا سایہ بھی بھاگ کر آفتابِ حشر کے دامن میں چھُپ گیا ہے۔

سایہ طبعاً آفتاب سے گریزاں رہتا ہے، لیکن عاشق کی شبِ فراق اور اس کی بیکسی کے خوف سے اتنا ڈرا، اتنا ڈرا کہ اسے آفتابِ حشر کے سوا کہیں پناہ نہ مل سکی۔

۹۔ **شرح :** اے محبوب! سیکڑوں رنگین جلووں کا جام تیری بدولت محفل میں گردش کر رہا ہے اور میں ایک حیرت زدہ آنکھ کا آئینہ دار بنا بیٹھا ہوں۔
مطلب یہ کہ تیری محفل ہر قسم کی رونق، چہل پہل اور جشن و شادمانی سے معمور ہے۔ میں سراپا حیرت بنا بیٹھا ہوں کہ یہ کیا ہو رہا ہے! تو کس طرح اپنے سچے عاشق سے بے پروا ہو کر عیش و نشاط میں مست ہے۔

۱۰۔ **لغات۔** اِک : ایک کا مخفف، یہ لفظ بعض اوقات بڑا، نہایت اور بہت کے معنی بھی دیتا ہے، مثلاً جانؔ صاحب :

اس کو پروا نہیں کوئی مر جائے
ایک بیدرد یہ ہوا ہے عشق

نیز امیرؔ مینائی :

اللہ رے گرمیاں مرے معشوق کی امیرؔ!
آیا خیال دل میں تو اک آگ لگ گئی

شرح : اے اسدؔ! میری نگاہِ گرم سے بے پناہ آگ ٹپک رہی ہے۔ میں باغ میں پہنچا تو نگاہ پڑتے ہی خس و خاشاک جل اٹھے اور چراغاں کا منظر پیدا ہو گیا۔

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

۱۔ **لغات :**
سنائے نہ بنے : سنانے کی کوئی صورت نہیں بنتی۔
بات کا بننا : کامیاب ہونا، تدبیر بن پڑنا، مراد حاصل ہونا۔

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے، بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

اس نزاکت کا بُرا ہو، وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آویں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وُہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

بات بنانا: بات کو پھیر پھار کر اپنا مطلب نکالنا، سخن سازی کرنا۔

شرح: میرا محبوب حد درجہ نکتہ چین ہے اسے غمِ دل سنانے کی کوئی تدبیر بن نہیں پڑتی۔ جہاں ہیر پھیر اور سخن سازی سے مطلب نکالنا ممکن نہ ہو، وہاں مراد حاصل کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔

اس شعر میں نہایت اہم لفظ "نکتہ چیں" ہے۔ اگر کوئی فرد نہایت ضروری معاملہ بیان کر رہا ہو، خصوصاً غم و اندوہ کا معاملہ اور سننے والا بات بات پر نکتہ چینی اور اعتراض شروع کر دے تو وہ معاملہ وہ اثر کبھی پیدا نہ کر سکے گا، جو اس سے طبعاً پیدا ہونا چاہیے

یہی حقیقت اس شعر کی بنیاد ہے۔ عاشق جب اپنے عشق کی غم انگیز داستان سنانا چاہتا ہے تو محبوب بات بات پر ٹوکتا جاتا ہے۔ کہیں اعتراض کر دیا، کہیں کہہ دیا، یہ غلط ہے۔ کوئی بات کاٹ دی، کسی میں سقم نکال دیا۔ اس طرح تاثیر کی وہ فضا بھی قائم نہیں رہتی، جو ایک دردبھری داستان کے لیے حددرجہ ضروری ہے۔ نیز غم انگیز بیان کے لیے تسلسل لازم ہے، یعنی اس میں مداخلت نہ ہونی چاہیے۔ محبوب کی نکتہ چینی قدم قدم پر مداخلت کا سامان پیدا کرتی ہے، لہذا غریب عاشق مجبور ہو کر کہتا ہے۔ میں کیا کروں، نکتہ چینی کے باعث اسے غم دل سنا نہیں سکتا۔ جہاں بات بنانے کی کوئی صورت نہیں وہاں بات بنے تو کیونکر؟

۲۔ لغات۔ بن جانا: مصیبت میں مبتلا ہو جانا، آفت آنا، مجبور ہو جانا۔

شرح: میں محبوب کو بلاتا تو ہوں، لیکن اس کے آنے کی امید نہیں، البتہ اے جذبۂ دل! تو کوئی ایسا اثر دکھا کہ وہ بالکل مجبور ہو جائے اور میرے پاس آئے بغیر اس کے لیے چارہ نہ رہے۔

پہلے مصرع میں لفظ "تو" سے صاف ظاہر ہے کہ محبوب کو بلا تو رہے ہیں، مگر اس کے آنے کی امید کوئی نہیں۔

۳۔ شرح: میرے محبوب کے نزدیک عشق و محبت کا معاملہ ایک کھیل ہے کہ جب چاہا، کھیل لیا اور جب چاہا چھوڑ دیا۔ اسے وہ کوئی ایسا سنجیدہ مشغلہ نہیں جانتا، جس کے ساتھ دلی تعلق ہو، لہذا عاشق کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ محبوب اس کھیل کو اسی طرح چھوڑ نہ دے، بھول نہ جائے، جس طرح بچے کھیلوں کے متعلق عموماً روش اختیار کر لیتے ہیں۔ اس لیے عاشق آرزو کر رہا ہے کہ کاش، ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ محبوب کو مجھے ستائے بغیر چین نہ آئے۔ یعنی عشق و محبت کے معاملے کو وہ خاص اپنا مشغلہ بنائے رکھے کھیل

نہ سمجھے۔

۴۔ **شرح :** اے محبوب! تُو نے رقیب کو جو نامۂ شوق لکھ دیا، وہ اسے یوں لیے پھرتا ہے کہ اگر کوئی پوچھ بیٹھے، یہ کیا ہے تو اسے چھپائے رکھنا ممکن نہ رہے۔

ظاہر ہے کہ جب لوگوں میں چرچا ہو گا، وہ نامۂ شوق آپ کی طرف سے ہے تو آپ کی رسوائی ہو گی۔

۵۔ **شرح :** بیشک وہ حسین ہیں، اور ان کا حسن بڑا دلاویز ہے، مگر دیکھیے، کتنے نازک ہیں کہ اوّل تو کسی کے ہاتھ نہیں لگتے اور اگر لگ جائیں تو انھیں چھوُا نہیں جا سکتا۔ حسن میں کلام نہیں، لیکن نزاکت نے عاشقوں کے لیے کیسی مصیبت پیدا کر رکھی ہے۔

۶۔ **شرح :** کون کہہ سکتا ہے کہ کائنات میں کون جلوہ افروز ہے؟ کس نے اپنے وجود کی شان آشکارا کر رکھی ہے؟ پوری کائنات پر اسباب کا ایسا پردہ ڈال دیا گیا ہے کہ کسی کو اٹھانے کی تاب نہیں یا اٹھانے کی کوئی تدبیر خیال میں نہیں آ سکتی۔

جب پردہ اٹھانا ممکن نہیں تو کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب جلوے کس کے ہیں؟

۷۔ **شرح :** اس شعر کا مطلب منشی نبی بخش حقیر کو سمجھاتے ہوئے خود مرزا فرماتے ہیں:

> "بھائی! مجھ کو تم سے بڑا تعجب ہے کہ اس بیت کے معنی میں تم کو تامل رہا۔ اس میں دو استفہام آ پڑے ہیں کہ وہ بہ طریق طعن و تعریض معشوق سے کیے گئے ہیں: "موت کی راہ نہ دیکھوں"؟ کیوں نہ دیکھوں؟ میں تو دیکھوں ہی گا کہ "بن آئے نہ رہے" کیونکہ موت کی شان میں سے یہ بات ہے کہ ایک دن آئے ہی گی، انتظار

ضائع نہ جائے گا۔" "تم کو چاہوں ؟" کیا خوب! کیوں چاہوں؟
کہ "نہ آؤ تو بلائے نہ بنے"۔ یعنی اگر تم آپ سے آئے تو آئے
اور اگر نہ آئے تو پھر کیا مجال کہ کوئی تم کو بُلا سکے۔

گویا یہ عاجز معشوق سے کہتا ہے کہ اگر میں تم کو چھوڑ کر اپنی
موت کا عاشق ہُوا ہوں۔ اس میں یہ خوبی ہے کہ بن بلائے بغیر
آئے نہیں رہتی۔ تم کو کیوں چاہوں؟ کہ اگر نہ آؤ تو تم کو بلا نہ
سکوں۔

بات یہ ہے کہ پڑھنے میں "تم کو چاہوں کہ نہ آؤ" یہ جملہ ملا
ہُوا سمجھ میں آتا ہے تو آدمی حیران ہوتا ہے۔ "تم کو چاہوں"
الگ ہے، "کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے"، یہ جملہ الگ ہے۔ تم نے
غور نہ کیا، ورنہ خود بخود کیفیت اس تعریف اور استفہام کی حاصل
ہوجاتی"۔

اس توضیح کے بعد کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں رہتی۔

۸۔ **شرح** : میں نے محبت کا بوجھ بے تکلف سر پر اٹھا
لیا، لیکن وہ اتنا بھاری تھا کہ سنبھال نہ سکا اور سر سے گر پڑا، اب
اٹھائے اٹھتا نہیں۔ میں عاجز اور بے بس ہوں۔ کام ہی ایسا آپڑا ہے کہ
اسے درست کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں:

"ایک تو مضمون نہایت اچھا ہے، دوسرے دونوں مصرعوں
کی ترکیب کو متشابہ کرکے شعر کو اور بھی برجستہ کردیا"۔

۹۔ **شرح** : عشق پر کس کا زور ہے؟ اے غالب! یہ تو ایسی آگ
ہے کہ نہ لگائے لگتی ہے، نہ اسے بجھانے کی کوئی تدبیر بن پڑتی ہے۔
ایک مفہوم یہ ہے کہ عشق کی آگ کسی دل میں بھڑک اٹھے تو اسے بجھانا

انسان کے بس میں نہیں۔ دوسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ یہ آگ لگا نا ممکن ہوتا تو ہر عاشق اپنے محبوب کے دل میں لگا لیتا۔ بجھانا ممکن ہوتا تو اپنے دل کی لگی بجھا کر اطمینان سے بیٹھ جاتا۔

چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عُریانی کرے
صبح کی مانند، زخمِ دل گریبانی کرے

جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجے خیال
دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے

ہے شکستن سے بھی دل نومید، یارب! کب تلک
آبگینہ کوہ پر عرضِ گرانجانی کرے

میکدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پاوے شکست
موئے شیشہ، دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

خطِ عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد
یک قلم منظور ہے، جو کچھ پریشانی کرے

۱۔ شرح: اگر برہنگی کی حالت میں جنوں کو یہ خواہش ہو کہ گریبان چاک کرے تو صبح کی طرح میرے دل کا زخم گریباں بن کر تار تار ہونے کے لیے تیار ہو جائے۔ مطلب یہ ہے، چاکِ گریباں میں ایسی لذت ہے کہ دل کا گھاؤ، جو پہلے ہی ایک چاک کی حیثیت رکھتا ہے، دوبارہ چاک ہونے کے لیے گریبان بن سکتا ہے۔ زخم، چاک، وحشت، عریانی، گریبان اور صبح، ان سب کی مناسبت محتاجِ تشریح نہیں۔ یعنی چودہ لفظوں میں سے چھ ایسے ہیں، جو باہم دست و گریباں ہیں۔

۲۔ شرح: اے محبوب! تیرے جلوے کی کیفیت کیونکر بیان کروں؛ اگر

اس کا تصور بھی کر لیا جائے تو اس سے دل کی آنکھ حیرت کی زیارت گاہ بن جائے۔
مطلب یہ کہ تیرے جلوے کے تصور ہی سے دل پر سراپا حیرت طاری ہو جاتی ہے۔

۳۔ **شرح:** اگرچہ معاملہ ایک سنگدل محبوب سے آپڑا تھا، لیکن میرا دل ٹوٹنے سے بھی ناامید ہو گیا۔ اے خدا! تو ہی بتا کہ شیشہ کب تک پہاڑ پر اپنی سخت جانی کا اظہار کرتا رہے؟

اس شعر میں محبوب کو سنگ دلی کی بنا پر کوہ اور اپنے دل کو آبگینہ قرار دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ پہاڑ کا ایک معمولی سا ٹکڑا بھی ایک آن میں شیشے کو چکنا چور کر دیتا ہے، مگر محبوب کی سنگ دلی عاشق کا دل توڑ نہ سکی، یہاں تک کہ وہ ناامید ہو گیا۔ بظاہر شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کی سختیاں برداشت کیں، مگر عاشق محبوب سے دل توڑنے اور الگ ہونے پر آمادہ نہ ہوا۔

۴۔ **لغات۔ موئے شیشہ:** شیشے کے بال یعنی شیشہ تڑخ جانے سے جا بجا لکیریں پڑ جانا۔

شرح: اگر شراب خانہ محبوب کی مستِ ناز آنکھ سے شکست کھا جائے تو اس طرح صراحی میں جو بال پڑیں گے، وہ ساغر کی آنکھ کے لیے پلکیں بن جائیں گے۔
شاعر محبوب کی آنکھ کو ہمیشہ مست باندھتے ہیں۔ اس مستی کی بنا پر شاعر کے دماغ میں میکدہ آیا۔ محبوب کی آنکھ اتنی مست تھی کہ پورا شراب خانہ اس کے مقابلے میں ہیچ رہ گیا۔ محبوب کے نازو انداز نے شراب بھری صراحیوں میں بال ڈال دیے۔ وہ بال ساغر کی آنکھ پر مژگاں بن گئے۔

۵۔ **شرح:** محبوب کے رخسار پر خط نہیں نکلا، بلکہ الفت نے اس طرح زلف کو ایک عہد نامہ لکھ دیا ہے اور اس میں یہ مرقوم ہے کہ پریشانی جو کچھ بھی کرے، وہ یک قلم از اوّل تا آخر منظور ہے۔
اس شعر میں بھی خط، عارض، زلف، یک قلم، پریشانی وغیرہ الفاظ کی مناسبت

محتاجِ تشریح نہیں۔ قلم کو اوّل لکھنے سے مناسبت ہے، دوسرا خطِ عارض کی بھی تلمیں ہوتی ہیں۔

وہ آ کے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

دِکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

پلا دے اوک سے، ساقی! جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے

اسدؔ! خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

۱۔ لغات:
پہلے معنی میں خواب کے معنی سپنا اور دوسرے مصرع میں نیند ہیں۔
مجال: دوڑنے کی جگہ، جولان گاہ، قدرت، طاقت، فرصت، اجازت، موقع۔

شرح:
محبوب کے خود آنے کی تو کوئی اُمید نہ رکھنی چاہیے، البتہ یہ امکان ہے کہ میں سو جاؤں، وہ خواب میں آئے اور میری پریشانی کے لیے تسکین کا سامان بہم پہنچا دے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ میرے دل کی تڑپ اس درجہ بے پناہ ہے، جس کے ہوتے ہوئے نیند ہی نہیں آتی۔ نیند آ جائے تو یہ اُمید پیدا ہو کہ شاید وہ خواب میں آئے اور میرا دل تسلی پا جائے۔

جناب آسی نے اس سلسلے میں فارسی کا ایک شعر نقل کیا ہے :

گفتی کہ بہ خواب اندر تسکین دہمت امشب
اما تو کجا آئی ، چوں خواب نمی آید

(اے محبوب ! تو نے کہا کہ میں آج رات سپنے میں آکر تجھے تسکین دوں گا ، لیکن نیند ہی نہیں آتی تو تیرے آنے کی اُمید کیا ہو سکتی ہے)

بلاشبہ یہ شعر ایک حد تک مرزا کے شعر سے ملتا جلتا ہے ، لیکن دونوں شعروں میں جو فرق ہے ، وہ طویل تشریح کا محتاج نہیں ۔ فارسی کے شعر میں اوّل محبوب کی زبان سے کہا گیا ہے کہ وہ خواب میں آکر تسکین دے گا ، مگر یہ بالکل غیر طبعی ہے ۔ محبوب اتنا مہربان کبھی نہیں ہو سکتا ۔ دوم نیند نہ آنے کی کوئی واضح یا غیر واضح وجہ بیان نہیں کی گئی ۔ اس کے برعکس مرزا کا شعر بالکل طبعی ہے ۔ یعنی محبوب سے خواب میں آنے کی مہربانی کا امکان یا اُمید تو ہو سکتی ہے ، لیکن دل کا اضطراب سونے ہی نہیں دیتا ۔

اصل مضمون کسی کا بھی ہو ، اسے پیش کرنے کی صحیح صورت وہی تھی ، جو مرزا نے اختیار کی ۔ یہی غالب مرحوم کی دقیقہ سنجی کا کمال اور قادر الکلامی کا رتبۂ بلند ہے ۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :

" پہلے مصرع میں لفظ " تو " امکان کے معنی دیتا ہے ، یعنی اس کا خواب میں آنا ممکن ہے ۔ دوسرے مصرع میں خواب کو مہتم بالشان کرنے کے لیے " تو " استعمال کیا گیا ۔ یعنی خواب ہی کا آنا بڑی چیز ہے ۔ "

۲ ۔ **لغات ۔ آب** : اس کے دو معنی ہیں ، اوّل پانی جس کا اظہار ردیف میں ہوا ، دوم تلوار کی جلا ، آب و تاب اور باڑھ ۔

شرح : اے محبوب ! چھیڑ چھاڑ اور شکوہ آمیز طریق پر اظہار آرزو میں تیرا ردِ دینا مجھے مارے ڈالتا ہے ۔ دنیا میں جتنے حسین ہیں ، وہ اور کرشموں میں کتنا ہی کمال پیدا کر لیں ، لیکن تیری طرح نگاہ کی تلوار کو جلا اور آب و تاب دینا

کوئی نہیں جاتا۔

یہ کوئی قیاسی بات نہیں، بلکہ ایسا معاملہ ہے، جو اکثر عشاق کو پیش آسکتا ہے۔ یعنی کسی وقت محبوب سے محبّت کی باتیں کرتے کرتے چھیڑ چھاڑ کے طور پر کچھ گلا شکوہ بھی کر دیا۔ محبوب کو کوئی جواب نہ سوجھا تو رونے لگا۔ کوئی سچّا عاشق محبوب کے اس رو دینے پر جان دے دینے میں دریغ نہیں کر سکتا۔ گویا محبوب کے آنسوؤں کے پانی سے اس کی نگاہ کی تلوار پر باڑھ چڑھ گئی۔

۳۔ شعر کے دوسرے مصرع میں لفظ "تو" دو مرتبہ آیا ہے۔ مولانا طباطبائی کے نزدیک پہلا "تو" شرط و جزا میں ربط کے لیے اور دوسرا جواب میں اہتمام پیدا کرنے کے لیے ہے۔ "کہیں" سے مراد کوئی نہ کوئی ہے۔

شرح: تجھ سے بوسے کی اُمید تو ہو ہی نہیں سکتی۔ خیر اگر بوسہ دینا منظور نہیں تو لب ہلا کر صاف صاف انکار ہی کر دے تاکہ ہمارا کام تمام ہو جائے۔ بہر حال تیری طرف سے کوئی نہ کوئی جواب تو ہونا چاہیئے۔

۴۔ **لغات۔ اوک:** جب پینے کے لیے برتن موجود نہ ہو یا پلانے والا برتن دینا نہ چاہے تو پانی پینے والا دونوں ہاتھ ملا کر گہرائی سی پیدا کر لیتا ہے۔ پلانے والا اس میں پانی ڈالتا جاتا ہے تاکہ پینے والے کی پیاس بجھ جائے۔ بعض اوقات ایک ہاتھ بھی لبوں سے لگا کر اسی طرح پانی پیا جاتا ہے۔ اسے اوک کہتے ہیں۔ یہ سلسلہ عموماً چھوت چھات سے پیدا ہُوا۔

شرح: اے ساقی! اگر تجھے ہم سے اتنی نفرت ہے کہ پیالے میں شراب نہیں دینا چاہتا تو مضایقہ نہیں۔ ہم ساغر ہو یا جام، ہر چیز سے بے نیاز ہیں، اوک میں پینے کے لیے تیار ہیں، مگر شراب دینے میں دریغ نہ کر، اس نعمت سے محروم نہ رکھ۔

۵۔ **لغات۔ ہاتھ پاؤں پھُولنا۔** ہاتھ پاؤں کا سُوج جانا، ہاتھ پاؤں کا

کا کام نہ دینا، ہکا بکا، حیران اور حواس باختہ رہ جانا۔ جب اچانک
انتہائی خوشی کی بات انسان سُن لے تو اعصاب پر ایسا اثر پڑتا ہے
کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے کام کاج سے رہ جاتے ہیں۔

شرح: اے اسد! جب محبوب نے کہا کہ ذرا میرے پاؤں تو دبا دے،
اس ناگہانی خوشخبری سے مجھ پر خوشی کی ایسی حالت طاری ہو گئی کہ میرے ہاتھ پاؤں
کام سے رہ گئے۔

تپش سے میری، وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالیں ہے، مرا تن بارِ بستر ہے

سرشکِ سر بہ صحرا دادہ، نور العینِ دامن ہے
دلِ بے دست و پا افتادہ، برخوردارِ بستر ہے

خوشا اقبالِ رنجوری! عیادت کو تم آئے ہو
فروغِ شمعِ بالیں، طالعِ بیدارِ بستر ہے

بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر، تارِ بستر ہے

ابھی آتی ہے بُو بالش سے اس کی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو خوابِ زلیخا، عارِ بستر ہے

۱۔ لغات:
بالیں: تکیہ، چارپائی کا سرہانا۔

شرح: میں محبوب سے جدائی کی حالت میں بستر پر پڑا ہوا تڑپ رہا ہوں اس وجہ سے بستر کا تار تار کشمکش کی مصیبت میں مبتلا ہے۔ میرا سر تکیے کے لیے ایذا کا باعث ہے اور میرا جسم بستر کے لیے بار بنا ہوا ہے، جو آفت سے کم نہیں۔

۲۔ لغات:

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں، غالبؔ!
کہ بیتابی سے ہر اِک تارِ بستر، خارِ بستر ہے

سر بہ صحرا دادہ : آوارہ، دیوانہ

آنسو کا خانہ آنکھ ہے جب وہ اس گھر سے نکلے گا تو اسے آوارہ، دیوانہ اور سر بہ صحرا دادہ کہا جائے گا۔ اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ آنسو نکل کر صحرا میں پہنچے اور وہاں سیلاب آگیا۔

نُورُ العین : آنکھ کا نور، آنکھ کا تارا، محبوب، عزیز۔

بے دست و پا افتادہ : ہاتھ پاؤں معطل ہو جانے کے باعث پڑا ہوا۔

برخوردار : پھل کھانے والا، زندگی سے پھل پانے والا، اقبال مند، عموماً انتہائی پیارے بیٹے، بیٹی یا قریبی خردوں کو کہتے ہیں۔

شرح : آنسو آنکھ سے نکل کر دامن کی آنکھ کا تارا بنا ہوا ہے۔ دل کی وہی حالت ہے، جیسے کسی کے ہاتھ پاؤں معطل ہوں اور اس پر بیچارگی کی کیفیت طاری ہو۔ وہ بستر کا برخوردار بنا ہوا ہے۔ یعنی آنکھوں سے آنسو بہ بہ کر دامن تر ہو رہا ہے اور دل کو بے دست و پائی کی حالت میں بستر سے خاص اُنس پیدا ہو گیا ہے۔

۳۔ لغات ۔ اقبال : خوش نصیبی۔

رنجوری : بیماری، مرض۔

شرح : میری بیماری کس درجہ خوش قسمت ہے کہ اے محبوب! تم بیمار پرسی کے لیے آئے ہو! اس کی بدولت میرے سرہانے جو شمع جل رہی ہے اس کی روشنی بستر کا جاگتا ہوا نصیبا بن گئی ہے۔

مطلب یہ کہ میں بیمار ہو کر بستر پر پڑا ہوں۔ محبوب مزاج پرسی کے لیے آگیا محض اپنا ہی نصیبا نہ جاگا، بلکہ سرہانے جلنے والی روشنی بستر کی خوش نصیبی میں مبدل ہو گئی۔

۴۔ **شرح** : محبوب سے جدائی کی شام آئی تو بیقراری کے جوش نے ایک طوفان کی صورت اختیار کر لی اور ایسی حالت پیدا ہوئی کہ میرے بستر کا تار تار صبحِ قیامت کے سورج کی کرن بن گیا۔ جو بستر آفتابِ حشر کی کرنوں سے بُنا گیا ہو، اس کے جوشِ اضطراب کا اندازہ کیا کیا جا سکتا ہے ؟

۵۔ **لغات** ۔ بالش : تکیہ، سرہانا۔

شرح : زلیخا کی طرح محبوب کو خواب میں دیکھنا اور اس کے دیدار سے لذّت اندوز ہونا ہمارے بستر کے لیے باعثِ ننگ ہے۔ یعنی ہم کبھی گوارا نہیں کرتے کہ بستر پر لیٹیں، نیند آئے، پھر خواب میں محبوب جلوہ دکھائے، جس طرح عام روایت کے مطابق زلیخا نے حضرت یوسفؑ کا جلوہ خواب میں دیکھا تھا ہمارا محبوب تو خود ہمارے پاس آتا ہی رہتا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ وہ ہمارے پاس تھا۔ اس کی مشک بار زُلف کی خوشبو ہمارے تکیے سے سونگھی جا سکتی ہے۔

عرفیؔ نے بھی ایسا ہی ایک شعر کہا، اگرچہ اس کا موضوع دوسرا ہے :

قانع بہ بوے دوست نہ گردید شوقِ ما
ایں جنس را بہ مفلسِ کنعاں فروختیم

(ہمارا شوق محبوب کی خوشبو پا لینے پر قناعت نہ کر سکا۔ محض خوشبو پر خوش ہو جانے کا معاملہ ہم نے حضرت یعقوبؑ کے حوالے کر دیا، جو بیچارے بالکل تہی دست تھے)

۶۔ **شرح** : اے غالب! میں کیا بتاؤں کہ محبوب کے فراق میں دل کی حالت کیا ہے ؟ بیقراری کا سرسری اندازہ کرنا چاہو تو یہ سمجھ لو کہ میرے بستر کا ہر تار کانٹے کی حیثیت رکھتا ہے، جو اس میں چھپا ہوا ہے۔

خطر ہے رشتۂ الفت رگِ گردن نہ ہو جائے
غرورِ دوستی آفت ہے، تُو دشمن نہ ہو جاوے
سمجھ اُس فصل میں کوتاہیِ نشو و نما غالبؔ
اگر گُل سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جاوے

۱۔ شرح: خطرہ یہ ہے کہ الفت کا رشتہ میری گردن کی رگ نہ بن جائے اور اس وجہ سے گردن اکڑ نہ جائے۔ محبوب کی دوستی اور محبت پر مغرور ہو جانا ایک آفت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اے محبوب! آج تُو دوستی پر مائل ہے تو کل دشمن بن جائے۔

۲۔ شرح: اگر فصلِ بہار میں پھول بڑھ بڑھ کر اور نمو پا پا کر سرو کے جسم پر لباس نہ بن جائیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ بہار نشو و نما کا کمال نہ دکھا سکی، بلکہ اس کا دعوائے کمال ادھورا رہ گیا۔

مطلب یہ ہے، فصلِ بہار میں نشو و نما کا جوش اس درجہ ہونا چاہیے کہ پھولوں کے پودے بڑھ بڑھ کر بلند ہوتے جائیں، یہاں تک کہ معلوم ہو، سرو نے پھولوں کا لباس پہن لیا ہے اور اس کا کوئی حصہ اس لباس سے خالی نہیں۔

○

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے   نالہ پابندِ نَے نہیں ہے
کیوں بوتے ہیں باغبان تونبے   گر باغ گدائے مے نہیں ہے
ہر چند ہر ایک شے میں تُو ہے   پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے
ہاں، کھائیو مت فریبِ ہستی   ہر چند کہیں کہ "ہے" نہیں ہے
شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے   اُردی جو نہ ہو تو دَے نہیں ہے

کیوں ردِّ قدح کرے ہے زاہد! مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

ہستی ہے، نہ کچھ عدم ہے، غالب! آخر تُو کیا ہے، اَے "نہیں ہے"!

۱۔ لغات۔ نَے : سُر، دھُن۔

شرح : سُر اور دھُنیں راگوں اور گیتوں کے لیے ہیں۔ فریاد و فغاں کے لیے نہ کوئی سُر درکار ہے، نہ دھُن۔ نالہ کسی بھی حالت میں بانسری سے کام لینے کا پابند نہیں، کیونکہ بانسری بجاتے وقت سُروں کا دھیان رکھا جاتا ہے اور آہ و زاری کو سُروں سے کوئی مناسبت نہیں۔

سُر تال، تصنّع، بناوٹ اور کاریگری نے پیدا کیے۔ فریاد کے وقت ایسی کسی چیز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ دل سے نکلتی ہے تو طبعی غم انگیزی سے وہ تاثیر پیدا کر دیتی ہے، جو تال سُر کی محتاج نہیں۔

حق یہ ہے کہ اوّل مضمون نہایت نادر ہے، پھر اسے پیش کرنے کے لیے جو انداز اختیار کیا گیا ہے، وہ بے مثال ہے۔

۲۔ لغات۔ تُونبا : ایک قسم کا تلخ کدو، جسے اندر سے خالی کر کے درویش کشکول یا چھاگل بناتے ہیں۔ جب مٹی کے برتن کم تھے تو تونبے ہی شراب یا دوسرے سیالات کے لیے استعمال کیے جاتے تھے ان میں یہ خوبی بھی تھی کہ وزن میں ہلکے ہوتے تھے، گرنے سے ٹوٹتے نہیں تھے اور انھیں بہ آسانی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ صدیوں تک شراب فروشی کے لیے تونبے ہی استعمال ہوتے رہے۔ چنانچہ خود مرزا غالب فرماتے ہیں :

گر مَے بہ کدو ریزد، بر کف نِہ و راہی شو

(اگر شراب فروش کدو یعنی تونبے میں شراب دے دے تو اسے ہاتھ پر رکھ کر چل دے)

شرح : اگر باغ کو شراب کی بھیک مانگنا مقصود نہیں تو باغبان

تونبے کس لیے کاشت کرتے ہیں؟

چونکہ تونبے درویشوں کے کشکول بھی بنتے ہیں، اس لیے کہا کہ باغبان شراب کی بھیک مانگنے کے لیے تونبے بوتے ہیں۔

شعر سے یہ بھی ظاہر ہے کہ باغ اور شراب باہم لازم وملزوم ہیں۔

۳۔ شرح : اے محبوبِ حقیقی! بے شک وشبہ کائنات کی ہر شے میں تیرا جلوہ نظر آتا ہے۔ گویا تو ہر وجود میں چھپا ہُوا ہے، لیکن ساتھ ہی ظاہر ہے کہ تجھ ایسی کوئی چیز نہیں۔ یہ لیس کمثلہٖ شیئاً کا ترجمہ ہے۔ نیز تمام اشیا کہ اجسام ہیں اور وہ ذاتِ پاک جسمانیات سے بالکل منزّہ ہے۔

۴۔ شرح : خبردار! ہستی کا دھوکا نہ کھانا۔ کوئی کتنا ہی کہے کہ خدا کے سوا کسی کا وجود ہے، ہرگز نہ ماننا۔ اس کے سوا وجود کوئی نہیں۔

۵۔ لغات : **اُردی** : مراد ہے اُردی بہشت، جو ایران میں شمسی سال کا دوسرا مہینا ہے۔ بہار کا بھی یہ دوسرا ہی مہینا ہے، جس میں سبزہ وگل کی بہتات کمال پر پہنچ جاتی ہے۔

دَے : شمسی سال کا دسواں مہینا، جو بھرپور خزاں کا مہینا ہے۔

شرح : مرزا غالبؔ کے اس شعر کا بنیادی مضمون ہے۔ تعرف الاشیاء باضداد ہا یعنی چیزیں ایک دوسرے کی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔ خوشی کا احساس غم کے احساس پر مبنی ہے اور خزاں کا احساس بہار کے احساس پر موقوف ہے۔

کہتے ہیں، دل سے مسرت وشادمانی کا احساس محو کر ڈال تاکہ غم کے احساس سے محفوظ ہو جائے۔ اگر تو بہار کی آمد سے خوش نہ ہوگا تو خزاں کی آمد تیرے لیے رنج وغم کا پیغام نہ بن سکے گی۔ جو شخص نشاطِ بہار کا خوگر نہ ہو، اسے خزاں کی افسردگی چھو بھی نہیں سکتی۔

۶۔ لغات : **قدح** : شراب کا پیالہ۔

مگس کی قے : شہد۔ شہد کی مکھیاں پھولوں، پھلوں سے رس چوستی ہیں اور شہد بنا کر منہ کے راستے چھتے میں اُگل دیتی ہیں۔ شہد کو زیادہ سے زیادہ مکروہ ظاہر کرنے کے لیے مگس کی قے قرار دیا۔

شرح : اے زاہد تو شراب کا پیالہ کیوں ٹھکراتا ہے ؟ اسے پی لینے سے انکار کیوں کرتا ہے ؟ یہ شراب ہے مکھی کی قے نہیں جس سے تجھے کراہت آئے۔

۷۔ لغات۔ نہیں ہے : کلمہ نفی لیکن اس شعر میں یہ طور اسم علم استعمال ہوا ہے اس لیے اسے "اے نہیں ہے" کہہ کر خطاب کیا۔

شرح : اے غالب! نہ تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ تو حقیقۃً موجود ہے اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تو خالصۃً بے وجود ہے۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اے وہ شخص جو بار بار "نہیں ہے"، "نہیں ہے" کہہ رہا ہے اور تجھے "نہیں ہے" موسوم کر لینا زیبا ہے، یہ تو بتا کہ آخر تو ہے کیا؟ جس پر نہ خالص ہستی کا اطلاق ہو سکتا ہے، نہ خالص نیستی کا۔

○

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا — کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی — وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

۱۔ لغات : الماس : ہیرا، جو مرہم میں ڈال دیا جائے تو زخم کو بڑھاتا ہے، جس طرح نمک اور مشک زخم کی تکلیف میں اضافہ کرتے ہیں۔

شرح : زخمِ دل کے لیے جو مرہم موجود ہے، اس کے اجزاء کی تفصیل نہ پوچھ، بس اتنا جان لے کہ ہیرے کا ٹکڑا اس کا سب سے بڑا جزو ہے۔

۲۔ شرح : اے محبوب! تو نے مدت تک میری طرف سے تغافل اور بے پروائی اختیار کیے رکھی۔ اس کے بعد ایسی نگاہ پیدا کی، جو حقیقۃً نگاہ سے کم ہے۔ یعنی تو نے دیکھنا بھی شروع کیا تو کنکھیوں سے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کبھی کبھی گوشۂ چشم سے مجھ پر نگاہ ڈال لیتا ہے۔

مولانا طباطبائی لکھتے ہیں :

"بڑا حسن اس شعر کا یہ ہے کہ محبوب کے تغافل کی تصویر دکھا دی ہے۔ دوسرا لطف یہ ہے کہ ایک نگاہ میں ایسی تفصیل کہ نگاہ ہے اور نگاہ سے کم ہے۔ اس کے علاوہ ایک لطیفہ یہ بھی ہے کہ "نگہ" یقیناً "نگاہ" سے کم ہے کہ "نگاہ" میں الف ہے اور "نگہ" میں نہیں۔"

○

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے	مرتے ہیں، ولے ان کی تمنّا نہیں کرتے
در پردہ انھیں غیر سے ہے ربطِ نہانی	ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے
یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہے	غالبؔ کو بُرا کہتے ہو؟ اچھا نہیں کرتے

۱۔ **شرح**: رشک کے باعث ہمیں یہ بھی منظور نہیں کہ محبوب کی تمنّا کریں اور اس سے وصال کے طلبگار رہیں۔ ہمیں جان دے دینا منظور ہے، لیکن رشک اپنا بھی گوارا نہیں۔

یہ ویسا ہی مضمون، جیسا مرزا نے دوسری جگہ کہا ہے:

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

مولانا طباطبائی نے خوب فرمایا: جس طرح انتہائے بخل کا رتبہ یہ ہے کہ بخیل خود بھی اپنی دولت سے محروم رہتا ہے، وہی حال انتہائے رشک کا ہے کہ تمنائے وصل کرتے ہوئے اپنے اوپر آپ رشک آتا ہے۔

۲۔ **شرح**: محبوب نے پردے پردے میں غیر یعنی رقیب سے پوشیدہ تعلق قائم کر رکھا ہے۔ مجھ پر یہ ظاہر کیا کہ ہم جو غیر سے بے تکلف

ملتے ہیں اور پردہ نہیں کرتے تو وجہ یہ ہے کہ ہم اسے اجنبی سمجھتے ہیں۔ نیز ہم نہیں چاہتے کہ پردہ کرنے سے لوگ ہمارے تعلق کے بارے میں چہ میگوئیاں کرنے لگیں۔

۲۔ شرح: اے محبوب! تم غالب جیسے سچے عاشق کو بُرا کہتے ہو، یہ شیوہ اچھا نہیں، کیونکہ جب سچے عشق کی یہ گت بن رہی ہے تو جو لوگ ہوس کے پجاری ہیں یعنی غیر اور رقیب، وہ تو بالکل ناامید اور مایوس ہو جائیں گے۔

○

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے

کبھی تو اِس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے
کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے

بجا ہے، گر نہ سُنے نالہ ہائے بُلبلِ زار
کہ گوشِ گُل، نمِ شبنم سے، پنبہ آگیں ہے

اسدؔ ہے نزع میں، چل بے وفا، برائے خدا
مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

۱۔ لغات
کسب: حاصل کرنا۔

شرح: اے محبوب! شراب تیرے لبِ لعلیں سے فروغ کا رنگ حاصل کر رہی ہے، یعنی تیرے لب کی بدولت اس میں وہ تمام ظاہری و معنوی خوبیاں پیدا ہو رہی ہیں، جو شراب کے لیے خاص مانی جاتی ہیں۔ اور پیالے میں پیمائش کے لیے جو خط لگا ہوا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابتدا سے انتہا تک پھول چُننے والے کی نگاہ بن گیا ہے۔

مطلب یہ کہ پیالہ تیرے لبوں سے چھوتے ہی شراب نے اتنا رنگ حاصل کر لیا، معلوم ہو رہا تھا، پیالے کے اندر پھلواڑی مہیا ہو گئی ہے اور خطِ پیالہ نے پھول چُننے شروع کر دیے۔

۲۔ شرح : میرا دیوانہ دل ایک مدت سے اس حسرت میں مبتلا چلا آتا ہے کہ اے محبوب! تیرا سر میرے تکیے پر ہو۔ آخر کبھی تو یہ امید پوری کر دیجیے۔ کب تک اسی حسرت میں عمر گزرتی جائے گی؟

۳۔ لغات۔ پنبہ آگیں : روئی سے بھرا ہُوا۔

شرح : اگر پھول بیچاری بُلبُل کی فریاد و فغاں نہ سُنے تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے، کیونکہ اس کی نمی نے اس کے کانوں میں روئی ٹھونس رکھی ہے۔

اوس کے قطروں کو سفیدی کے باعث روئی سے تشبیہ دی اور کان میں پانی جمع ہو جائے تو سماعت میں فرق آ جاتا ہے۔ نمِ شبنم سے یقیناً پھول میں تری جمع ہوئی اور سورج کی روشنی میں شبنم سفید دکھائی دیتی ہے۔ اس طرح گوشِ گل شبنم سے پنبہ آگیں ہو گیا۔

۴۔ شرح : اسدؔ جانکنی کی حالت میں ہے۔ اے بے وفا محبوب! خدا کے لیے چل اور اس کا حال پوچھ۔ یہ وقت ایسا ہے کہ شرم و حجاب چھوڑ دینا چاہیے اور وقار و وقعت کو رخصت کر دینا چاہیے۔

○

کیوں نہ ہو چشمِ بُتاں محوِ تغافل، کیوں نہ ہو؟
یعنی اس بیمار کو نظّارے سے پرہیز ہے
مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی
وائے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

۱۔ شرح : محبوبوں کی آنکھ تغافل سے کیوں کام نہ لے؟ وہ ضرور کام لے گی، کیونکہ یہ ایسا بیمار ہے جسے

نظارے سے پرہیز کی تاکید کی گئی ہے۔

عارضِ گُل دیکھ، روے یار یاد آیا، اسدؔ!
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

محبوبوں کی آنکھ کی ایک صفت بیمار بھی ہے، چشمِ بیمار: نشیلی آنکھ۔ لفظ "بیمار" سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہ دیا کہ بیماروں کو عموماً کسی نہ کسی چیز سے پرہیز کی تاکید کی جاتی ہے اور چشمِ بیمار کے لیے دوسروں کی طرف دیکھنا ممنوع قرار دیا گیا ہے، لہذا ان کے لیے تغافل کے بغیر چارہ نہیں۔

۲۔ شرح: اگر خنجر کُند ہوتا تو گلا کٹنے میں کچھ نہ کچھ دیر ضرور لگتی اور ہمیں محبوب کو دیکھنے کا موقع مل جاتا۔ اب اس نے خنجر خوب تیز کر رکھا ہے، گویا ایک لمحے میں گلا کٹ جائے گا اور مرتے مرتے اسے دیکھ لینے کی آرزو جی میں رہ جائے گی۔

۳۔ لغات: اشتیاق انگیز: شوق کو تیز کرنے والا۔

شرح: اے اسدؔ! پھول کا چہرہ دیکھ کر محبوب کا چہرہ یاد آتا ہے۔ ہر طرف فصلِ بہار کا جوش ہے اور اس جوش کے باعث دل میں شوق کی آگ تیز ہو رہی ہے، کیونکہ ہر جانب پھول کھلے ہوئے ہیں اور ہر پھول روے یار کی یاد تازہ کر رہا ہے۔

○

۱۔ شرح: عاشق نے محبوب کو خط پہنچانے کے لیے نامہ بر تلاش کیا

دیا ہے دل اگر اس کو، بشر ہے، کیا کہیے
ہُوا رقیب تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کہیے
یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بِن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے، کیا کہیے!

رہے ہے یوں گہ و بے گہ کہ کوئے دوست کو اب
اگر نہ کہیے کہ "دشمن کا گھر ہے" کیا کہیے؟

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے، کیا کہیے؟

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ "سرِ رہگزر ہے"، کیا کہیے؟

تمھیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے، مگر ہے کیا؟ کہیے؟

اُنھیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے، کیوں لڑیے؟
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے، کیا کہیے؟

حسد سزائے کمالِ سخن ہے، کیا کیجے؟
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے، کیا کہیے؟

کہا ہے کس نے، کہ غالب بُرا نہیں، لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے، کیا کہیے

وہ خط لے کر محبوب کے پاس پہنچا تو دیکھتے ہی دل دے بیٹھا اور عاشق کا رقیب بن گیا فرماتے ہیں کہ اگر نامہ بر نے محبوب کو دل دے دیا اور اس پہ عاشق ہو کر میرا رقیب بن گیا تو اسے کیونکر الزام دوں؟ آخر وہ انسان ہے اور کوئی سلیم الحواس انسان میرے محبوب جیسے حسین کو دل دیے بغیر رہ نہیں سکتا، پھر اسے قصوروار کیوں ٹھہرایا جائے؟ میں نے تو اسے نامہ بر بنا کر بھیجا تھا۔ اگر وہ میرا رقیب بن گیا تو اسے کیا کہہ سکتے ہیں؟

پورے شعر کا حاصل یہ ہے کہ کوئی انسان میرے محبوب کو دل دیے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔

۲۔ **شرح** : موت بہرحال آئے گی، لیکن ہم آج اس کے آرزومند ہیں اور اسے ضد ہے کہ آج نہیں، بلکہ مقررہ وقت پر آئے گی۔ آہ! ہم کیا کہیں کہ موت سے ہمیں کس قدر شکایتیں ہیں۔ جب اُسے آنا ہی ہے اور آئے بغیر رہ نہیں سکتی تو آج کیوں نہیں آجاتی؟

۳۔ **شرح** : رقیب کو جب دیکھو، وقت بے وقت محبوب کے کوچے میں موجود رہتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کوچے کو رقیب کا گھر نہ کہیں تو کیا کہیں گھر وہی مقام ہے، جہاں انسان عموماً رہتا ہے اور خاص مشاغل کے بغیر وہاں سے باہر نہیں جاتا۔ جب رقیب نے کوئے یار میں رہنے کی ویسی ہی صورت پیدا کر لی ہے تو وہی اس کا گھر بن گیا۔

۴۔ **شرح** : یہ معشوقانہ ناز و انداز تو دیکھیے کہ جب ہم دل کی بات کہنے کا ارادہ کرتے ہیں تو یہ فریب دے دیا جاتا ہے کہ ہمیں کہے بغیر ہی سب کچھ معلوم ہے اور تمھیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس طرح وہ دل کی بات بھی نہیں سنتے۔

۵۔ **شرح** : جب کبھی بازار میں ملاقات ہو جاتی ہے تو خوب سوچ سمجھ کر وہیں حال پوچھنے لگتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ عاشق بازار میں دل کھول کر بات نہیں کر سکے گا۔ وہ پرسش کا فرض ادا کر دیں گے اور جو کچھ انھیں سنانا چاہیے، اس کی نوبت نہ آئے گی۔

شعر کا ایک پہلو یہ ہے کہ شرفا، خاص باتیں بازار میں کرنا اور کہنا آدابِ مجلس کے خلاف سمجھتے تھے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ محبوب حد درجہ شوخ و عیار ہے جو گرد و پیش دیکھ کر حال پوچھتا ہے تاکہ تفصیل کی نوبت نہ آئے۔

۶۔ **شرح** : اے محبوب! تمھیں تغافل کے باعث سر رشتۂ وفا کا

ذرا خیال نہیں۔ یہ دیکھو، ہماری مٹھی میں کچھ ہے، اگر کیا ہے ؟ ذرا بتائیے تو ؟

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :

"اس شعر کا اندازِ بندش بھی نیا ہے اور مضمون بھی تازہ ہے۔ تازگی مضمون تو یہ ہے کہ سر رشتۂ وفا کو ایک محسوس شے فرض کر لیا ہے کہ معشوق سے پوچھتے ہیں، بتاؤ، ہماری مٹھی میں کیا ہے ؟ بندش کی جدت یہ ہے کہ پوچھتے بھی ہیں، مٹھی میں کیا ہے ؟ پھر جو چیز مٹھی میں ہے اس کا نام بھی لے دیا۔"

۷۔ **شرح** : محبوب سے سوال کیا جاتے تو فرماتے ہیں: معلوم ہوتا ہے کہ تم پاگل ہو گئے ہو۔ ہم نے اس ارشاد کا جواب نہ دینے کا فیصلہ کر رکھا ہے، پھر کہیں تو کیا کہیں ؟

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں : مضمون خوبی شعر کا سبب نہیں، بلکہ دونوں مصرعوں کی بندش میں ترکیب کے متشابہ ہونے سے شعر میں حسن پیدا کیا۔

۸۔ **شرح** : اگر کوئی شخص سخنوری میں کمال پیدا کرے تو اسے سزا یہ ملتی ہے کہ لوگ اس سے حسد کرنے لگتے ہیں، یعنی کوئی بلند پایہ سخنور ایسا نہیں، جو حسد کا تختۂ مشق نہ بنا ہو۔ اسی طرح جس شخص کے پاس ہنرمندی کی بیش بہا متاع موجود ہے، اسے قیمت یہ ملتی ہے کہ اس پر ظلم توڑے جاتے ہیں۔ گویا اس شعر میں مرزا نے زمانے کی تنگ نظری، خیرہ ذوقی اور قدر ناشناسی کی تصویر کھینچ دی ہے۔

۹۔ **شرح** : یہ کس نے کہا کہ غالب بُرا نہیں ؟ نہیں، ضرور کہیے کہ وہ بُرا ہے، بہت بُرا ہے، لیکن یہ تو سوچیے کہ آخر دیوانے کے سوا اسے کیا کہا جا سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ دیوانے پر اچھائی برائی کا حکم لگانا اہلِ عقل و دانش کا کام نہیں۔

دیکھیے، کس خوبی اور نکتہ نوازی کے ساتھ اپنی برائیوں سے برأت حاصل کرلی۔

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے
کر گئی وابستۂ تن، میری عُریانی مجھے

بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں
مرحبا میں! کیا مبارک ہے گرانجانی مجھے

کیوں نہ ہو بے التفاتی اس کی خاطر جمع ہے
جانتا ہے محوِ پرسشہائے پنہانی مجھے

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

بدگماں ہوتا ہے وہ کافر، نہ ہوتا کاشکے!
اِس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے

وائے! واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

۱۔ لغات:

دامن افشانی: پلّہ جھاڑنا، دنیا چھوڑ دینا۔

شرح:

جب میری برہنگی نے دیکھا کہ میں خفیہ خفیہ پلّہ جھاڑ کر دُنیا کو چھوڑ دینے میں سرگرم ہوں تو مجھے جسم کے ساتھ وابستہ کر دیا۔

مطلب یہ کہ دنیا سے بے تعلق ہو جانا آسان نہیں جب تک انسان بدن کے ساتھ وابستہ ہے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دنیا سے

وعدہ آنے کا وفا کیجے ، یہ کیا انداز ہے ؟
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے ؟

ہاں ، نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری ، واہ واہ
پھر ہُوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

دی مرے بھائی کو حق نے ، از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے ، غالبؔ ! یوسفِ ثانی مجھے

[illegible]
[illegible]
[illegible]

ا۔ عریانی استعارہ ہے تجرد سے اور دامن افشانی تنفس سے یعنی میں مجرد تھا ، جسمانیات سے کوئی علاقہ نہ تھا ۔ جب مجھے سرگرم تنفس دیکھا تو تجرد مجھے وابستۂ جسم کرکے رخصت ہو گیا ۔

۲ ۔ مطلب یہ کہ عالمِ اجسام کی نفس شماری میں مجھے سرگرم دیکھ کر تجرد نے زندانِ بدن میں مجھے چھوڑ دیا اور آپ رخصت ہو گیا ، یعنی جسے دامن افشانی کا شوق ہو اُسے تجرد و عریانی سے کیا واسطہ ؟

۳ ۔ "در پردہ" کے لفظ میں یہ رعایت رکھی ہے کہ تنفس بھی حجابِ صدر سے تعلق رکھتا ہے ۔"

۲ ۔ **لغات** ۔ **سنگِ فساں** : وہ پتھر ، جس پر تلوار ، چھری ، خنجر وغیرہ تیز کیے جاتے ہیں ۔ سان ۔

گرانجانی : سخت جانی ، یعنی جان کا بہ مشکل نکلنا ۔

شرح : میری سخت جانی مبارک باد کے قابل ہے ، دیکھو ، اس کی بدولت میں محبوب کی تیغِ نگاہ کے لیے سان کا پتھر بن گیا ۔

اس میں مرزا کے پیشِ نظر یہ حقیقت ہے کہ میں سخت جان ہوں ۔ [illegible] مجھے قتل کرنا آسان نہیں ، بلکہ سخت مشکل ہے ۔ محبوب کی نگاہ کے وار بار

بار ہوتے ہیں، لیکن میری جان نہیں نکلتی اور ہر وار میں محبوب کی تیغِ نگاہ میری سخت جانی پر رگڑ کھانے سے تیز تر ہوتی جاتی ہے۔

۳۔ **شرح** : وہ کیوں نہ مجھ سے بے رُخی برتے ؛ وہ جانتا ہے کہ کبھی کبھار خواب میں آکر میرا حال پوچھ لیتا ہے اور میں اتنی ہی توجہ پر خوش ہوں۔ اس سے اسے اطمینان ہے اور بے التفاتی میں کوئی تامل نہیں ہوتا۔

۴۔ **شرح** : جب قسمت لکھنے والے نے میرے سیاہ خانے کی قسمت لکھی تو ویرانی کے دوسرے اسباب کے ساتھ مجھے بھی شامل کر دیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ میں ویرانی کا تختۂ مشق بنا ہُوا ہوں اور میری قسمت یہی ہے۔

۵۔ **شرح** : میرے محبوب کے مزاج میں اتنی بدگمانی ہے کہ جب مجھے بلبل کے نغمے سنتے ہوئے دیکھتا ہے تو کچھ اور شبہ کرنے لگتا ہے۔ کاش! مجھے بلبلوں کے نغمے سُننے کا اتنا ذوق نہ ہوتا تاکہ اسے بدگمانی کا بہانہ نہ ملتا۔

اس سے ملتا جلتا مضمون پہلے بھی گزُر چکے ہیں۔

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

۶۔ **لغات**۔ تن آسانی : آرام طلبی۔

شرح : مجھے آرام طلبی کا ذوق قبر میں لے گیا تھا، لیکن افسوس وہاں بھی قیامت کے شور نے دم نہ لینے دیا اور اٹھا لیا۔

تن آسانی کا تقاضا یہ تھا کہ نیند میں خلل کی کوئی صورت پیدا نہ ہوتی۔ شورِ محشر نے آکر جگا دیا اور تن آسانی کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ یہ شعر اس زمین میں بیت الغزل ہے۔ خوبی اس میں یہ ہے کہ قبر میں جانے کی توجیہ بہت تازہ ہے۔ ذوقِ تن پرستی اس شعر کی جان ہے، جس نے مضمونِ مردہ کو زندہ کر دیا اور مصنف کی

معجز بیانی پر ایک شاہد ہاتھ آیا - تن پرستی اور آسائش طلبی کی برائی کیا اچھی طرح بیان کی ہے !

۷ - **شرح** : محبوب سے خطاب ہے کہ میرے پاس آنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن آئے نہیں اور میں بیٹھا انتظار کر رہا ہوں - گھر سے اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتا، گویا اپنے گھر میں دربان بنا ہُوا ہوں - یہ کیا انداز ہے ؛

۸ - **شرح** : واہ وا ! فصلِ بہار آئی اور اس سے عیش و شادمانی میں ایسی تازگی پیدا ہوئی کہ غزل سرائی کے جس جنون کو فراموش کیے بیٹھا تھا، وہ عود کر آیا -

۹ - **شرح** : خدا نے میرے بھائی میرزا یوسف کو بیماری سے شفا بخشی اور نئے سرے سے زندگی مل گئی - اے غالب ! میرا بھائی میرے لیے یوسفِ ثانی ہے

میرزا یوسف مرزا غالب سے دو برس چھوٹے تھے ، انھیں جوانی ہی میں جنون کا عارضہ ہو گیا تھا، جس سے عارضی طور پر شفا پائی - غالباً اسی موقع پر یہ غزل کہی گئی تھی - میرزا یوسف پھر بیمار ہو گئے اور ۱۸۵۷ء میں جب انگریزوں نے دہلی کا محاصرہ کر رکھا تھا - ان کا انتقال ہُوا اور پاس کی ایک مسجد کے احاطے میں انھیں سپرد خاک کیا گیا۔

یاد ہے شادی میں بھی، ہنگامۂ "یارب" مجھے
سُبحۂ زاہد ہُوا ہے، خندہ زیرِ لب مجھے
ہے کُشادِ خاطرِ وابستہ، در رہنِ سخن
تھا طلسمِ قفلِ ابجد، خانۂ مکتب مجھے

۱ - **لغات** :
یارب : اے پروردگار! ایرانیوں نے اسے دعا اور

یارب اِس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے؟
رشکِ آسائش پہ ہے زندانیوں کی، اب مجھے

طبع ہے مشتاقِ لذتہائے حسرت، کیا کروں؟
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

دل لگا کر آپ بھی غالبؔ! مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع، میرزا صاحب مجھے

دہائی دو دونوں معنی میں استعمال کیا۔
سُبحۂ زاہد: زاہد کی تسبیح یہاں مراد ہے کسی عبادت گزار کا تسبیح کرنا جو عام طور پر آہستہ آہستہ کی جاتی ہے اور اصطلاح میں اسے ذکرِ خفی کہتے ہیں۔ اس کی ضد ذکرِ جہر ہے۔ یعنی بلند آواز سے ذکر کرنا۔

خندہ زیرِ لب: لبوں میں ہنسنا یعنی کھل کر نہ ہنسنا، مسکراہٹ، تبسم
شرح: مجھے عیش و نشاط میں بھی خدا نہیں بھولا حالانکہ انسان عموماً ایسے اوقات میں خدا کو بھول جاتے ہیں۔ پس اس حالت میں بھی بدستور یارب! اے پروردگار! اے اللہ! پکارتا رہتا ہوں، یہاں تک کہ لبوں میں میری ہنسی یعنی مسکراہٹ بھی ایک پرہیزگار آدمی کا تسبیح کرنا ہے۔

۲۔ **لغات**: گُشاد: کُھلنا، کشائش۔

خاطرِ وابستہ: بندھا ہُوا دل، یعنی ملول اور رنجیدہ دل۔
درر ہنِ سخن: بات کے پاس گرو، اس سے مراد ہے بات پر موقوف ہونا۔
قفلِ ابجد: اس کی تشریح پہلے ہو چکی ہے، یعنی ایسا قفل جو مختلف حروف کو ملا کر ایک لفظ بنا لینے سے کُھلتا ہے۔

شرح: میرے ملول اور رنجیدہ دل کا کھلنا اور شادماں ہونا، بات پر موقوف ہے، یعنی دل اُسی وقت خوش ہوتا ہے، جب وہ سخن گوئی

یں مصروف ہو۔ میرے لیے درسگاہ بھی قفلِ ابجد کا طلسم، یعنی جب تک مختلف حروف ملا کر صحیح بات نہیں بنتی تھی، قفل نہیں کھلتا تھا، ٹھیک اسی طرح بات بننے یا بنانے پر میرے دل کی فرحت و کشادگی موقوف ہے۔

۳۔ **لغات**۔ زندانی : قیدی۔

شرح : اے خدا! اس دیوانگی کی داد کس سے چاہیں کہ جب میں قید میں تھا تو یہ آرزو تھی کہ صحرانوردی اور دشت پیمائی کا موقع ملے۔ اب وہ آرزو پوری ہوئی تو اس امر پر رشک ہو رہا ہے کہ قیدی کتنے آرام میں ہیں۔

دیوانگی یہ کہ نہ پہلی حالت پر اطمینان تھا، نہ دوسری حالت میں سکون کی کوئی صورت پیدا ہوئی، کبھی جنگلوں میں پھرنے کا شوق تھا، اب معلوم ہوا کہ جو لوگ جنگلوں میں پھرتے ہیں، ان کے مقابلے میں وہ لوگ زیادہ آرام سے ہیں، جو جیل خانے میں بند ہیں۔ اتنے زیادہ آرام میں ہیں کہ ان کی حالت پر رشک آتا ہے۔

۴۔ **لغات**۔ **شکستِ آرزو** : آرزو کا ٹوٹنا یعنی پورا نہ ہونا۔

مطلب : اس شعر میں یہ معنی مطلوب استعمال ہوا ہے۔

شرح : میں کیا کروں، میری فطرت ہی حسرت و نامرادی کی رسیا ہے۔ اگر کسی چیز کی آرزو پیدا ہوتی ہے تو میرا مدعا یہ نہیں ہوتا کہ وہ آرزو پوری ہو جائے، بلکہ اس کے پورا نہ ہونے کا طلب گار رہتا ہوں۔

حسرت و نامرادی کی لذت طبیعت کو اس درجہ پسند ہے کہ میں کسی آرزو کے پورا ہونے کا خواہاں ہی نہیں۔

۵۔ **لغات** : آپ بھی : خود بھی۔

میرزا صاحب : غالب، یہاں صاحب کی ح مفتوح رکھی گئی ہے۔ حالانکہ حقیقتاً مکسور ہے۔ دراصل مرزا نے لغت کے بجائے عام بول چال کو

ترجیح دی۔ بول چال میں اسے مفتوح ہی بولتے ہیں۔

شرح : دیکھیے، غالبؔ دل لگا کر خود بھی مجھ ایسے ہی ہو گئے، حالانکہ حضرت میرزا صاحب پہلے بڑے کرّ و فر کے ساتھ مجھے عشق سے روکتے رہتے تھے۔ جب خود ان کے دل پر بنی تو ساری پند و نصیحت بھول گئے۔

۱۔ شرح : شعر سے ظاہر ہے کہ یہ غزل جس مشاعرے میں پڑھی گئی تھی، وہاں بہادر شاہ ظفرؔ بہ نفسِ نفیس موجود تھے۔ اغلب ہے یہ مطلع بادشاہ کے موجود ہونے کی وجہ سے موقع پر کہہ لیا گیا ہو۔

آج بادشاہ سلامت کے حضور سخنوروں کی آزمائش ہے۔ گویا یہ بزم مشاعرہ ایک باغ

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوشنوایانِ چمن کی آزمائش ہے

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اُس خستہ کے نیروے تن کی آزمائش ہے

نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی
اُسے یوسف کی بوے پیرہن کی آزمائش ہے

وہ آیا بزم میں، دیکھو، نہ کہیو پھر کہ "غافل تھے"
شکیب و صبر اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

رہے گر دل میں تیر، اچھا، جگر کے پار ہو، بہتر!
غرض شستِ بُتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے۔

نہیں کچھ سُبحہ و زنّار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

پڑا رہ، اے دلِ وابستہ، بیتابی سے کیا حاصل
مگر پھر تابِ زلفِ پُر شکن کی آزمائش ہے

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم، تب دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

وہ آئیں گے مرے گھر، وعدہ کیسا، دیکھنا غالبؔ!
نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

ہے اور اس میں باغ کے خوش نواؤں کی آزمائش ہوگی۔ دیکھا جائے گا کہ کون کون کس کس رنگ کے نغمے سناتا ہے۔

۲۔ لغات:

دار و رسن: سولی اور رسا، جس سے موت کی سزا دی جاتی ہے۔

شرح: مجنوںؔ اور فرہادؔ کا معاملہ لیلیٰؔ اور شیریںؔ کے قد اور زلف تک محدود تھا، لیکن جس مقام پر ہم ہیں، وہاں آزمائش کے لیے سولی اور رسا موجود ہے۔

شعر میں قد کو دار سے اور گیسو کو رسن سے جو تشبیہ دی گئی ہے، وہ محتاجِ تشریح نہیں۔ اصل نکتہ یہ ہے کہ اپنا مرتبہ قیسؔ اور کوہکنؔ سے درجہا بلند تر ثابت کیا یعنی ان کی آزمائش صرف ان کے محبوبوں کے قد و گیسو میں تھی ہماری آزمائش دار و رسن میں ہے اور دار و رسن کی منزل قد و گیسو کے مقابلے میں ہزار درجہ سخت ہے۔

۳۔ لغات: نیرو: قوت، طاقت

شرح: فرہاد کے حوصلے کا امتحان تو آگے چل کر ہوگا، ابھی تو اُس غریب کی قوتِ بدن آزمائی جا رہی ہے۔

اس شعر میں فرہاد کے قصّے کی طرف تلمیح ہے، یعنی اسے پہاڑ کاٹنے کا کام دے دینے کا مطلب صرف اتنا تھا کہ اس کے بدن کی قوت آزمائی جائے دیکھا جائے کہ اس کی جسمانی طاقت کتنے پانی میں ہے۔ وہ پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر لا سکتا ہے یا نہیں۔ اس آزمائش میں وہ پورا اُترا۔ پہاڑ کٹ گیا اور جوئے شیر بہ نکلی۔ اس کے بعد اس غریب کے حوصلے کا امتحان یوں کیا گیا کہ ایک بڑھیا کو بھیج کر شیریں کے مرجانے کی خبر پہنچا دی گئی۔ یہ خبر سنتے ہی فرہاد کا حوصلہ جواب دے گیا اور اس نے آہ بھر کر تیشہ سر پر مارا اور وہ ختم ہوگیا، گویا اس آخری امتحان میں پورا نہ اُترا۔

۴۔ **لغات۔ پیرِ کنعاں** : کنعان کا بوڑھا، یعنی حضرت یعقوبؑ۔
ہوا خواہی : خیر خواہی۔

شرح : اس شعر میں حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کے واقعے کی طرف اشارہ ہے، جس کا ذکر قرآن مجید میں یوں آیا ہے: جب حضرت یوسفؑ مصر میں بھائیوں پر ظاہر ہوگئے تو انھوں نے فرمایا:

> "اب تم یوں کرو کہ میرا یہ کُرتا (بہ طور علامت کے) اپنے ساتھ لے جاؤ اور میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو کہ اس کی آنکھیں روشن ہو جائیں۔ پھر اپنے گھرانے کے تمام آدمیوں کو لے کر میرے پاس آجاؤ اور جب (کُرتا لے کر) قافلے نے مصر کی سرزمین چھوڑی تو (اُدھر کنعان میں) ان کا باپ بولا: اگر تم لوگ یہ نہ کہنے لگو کہ بڑھاپے سے اس کی عقل ماری گئی تو میں کہوں گا! مجھے یوسفؑ کی مہک آرہی ہے۔" (سورۂ یوسفؑ)

مصر سے آنے والی نسیم کو حضرت یعقوبؑ کی خیر خواہی کا کوئی خیال نہیں، اسے تو حضرت یوسفؑ کے کرتے کی مہک آزمانی ہے، یعنی یہ دیکھنا ہے کہ کُرتے کی مہک مصر سے کنعان پہنچتی ہے یا نہیں۔

۵۔ **شرح** : دیکھو، خبردار ہو جاؤ، وہ غارت گرِ صبر بزم میں آرہا ہے۔ پھر نہ کہنا کہ آگاہ نہ کیا گیا اور غافل رہے۔ بزم میں جتنے لوگ بیٹھے ہیں، ان کے صبر وضبط کا امتحان درپیش ہے۔ ابھی معلوم ہو جائے گا کہ کون اس کی غارت گری سے بچتا ہے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :

"جیسا مصرع مصنّف نے یہاں لگایا، ادیب کی نظر میں مردے کو زندہ کر دینے سے کم نہیں۔ مضمون مردہ ہے، فقط مصرع لگا کر اس میں جان ڈال دی۔ یہ وہی مضمون ہے، جو کروڑ دفعہ باندھا گیا کہ معشوق کے دیکھنے سے صبر وشکیب نہیں باقی رہتا۔ مصرع جو تھا، اس کے تین ٹکڑے کرو (وہ آیا بزم میں) جیسے کہتے ہیں وہ چاند ہوا (دیکھو) ہشیار ہو جاؤ، دل کو سنبھال لو، (نہ کہیو پھر کہ غافل تھے) یہ جملہ بھی وہی معنی رکھتا ہے، جو "دیکھو" کے ہیں، لیکن یہ پہلے جملے کی تاکید ہے اور شعر میں حسن اسی تاکید سے بہت پیدا ہو گیا ہے اور "وہ" کے اشارے سے۔"

۶۔ **لغات**۔ **شست** : نشانہ۔

ناوک فگن : تیرانداز۔

شرح : محبوب کا تیر دل میں رہ جائے تو وہ بھی اچھا، جگر کے پار ہو جائے تو اس سے بہتر، بس یہی دو ہدف ہیں اور اس کی تیر اندازی کی آزمائش درپیش ہے۔

۷۔ **لغات**۔ **گیرائی** : گرفت، پکڑ۔

شرح : تسبیح اور زنّار کے پھندے میں کون سی پکڑ ہے؟ یہ دھاگے کسی کو کیونکر گرفت میں رکھ سکتے ہیں؟ اصل چیز تو یہ ہے کہ آزمایا جائے، شیخ اور برہمن کی وفاداری کا کیا حال ہے، یعنی وہ کب تک اپنے اپنے مسلک پر کچے

رہ سکتے ہیں اور اسے تباہ تک پہنچا سکتے ہیں۔

۸۔ **شرح :** اے قیدی دل، جو زلف کے پھندے میں بری طرح جکڑا ہوا ہے، آرام و اطمینان سے بیٹھا رہ۔ بیتابی اور بیقراری سے کیا ہاتھ آئے گا تو اس پھندے سے آزادی کی کوشش کئی مرتبہ کر چکا ہے، لیکن تجھے رہائی نہیں ملی۔ کیا پھر اس خم بہ خم زلف کی قوتِ گرفت آزمانا چاہتا ہے، جو بار ہا آزما کر ناکام رہ چکا ہے؟

۹۔ **شرح :** بجنوری مرحوم نے لکھا ہے :

"قدرت نے قریب قریب جملہ مہلک سمیات کو تلخ بنایا ہے۔ ہندوستان میں جو زہر زیادہ تر خود کشی کے لیے مستعمل ہیں، وہ تیلیا، سنکھیا، دھتورا، افیون اور کچلا ہیں۔ یہ سب تلخ ہیں۔ اس لیے سب سے پہلی مشکل ان کا منہ تک لے جانا ہے۔ زہر کا فعل معدے کے فعل پر منحصر ہے اور دیر طلب ہے۔ چنانچہ دورانِ سر، بردِ اطراف، امتلا، نسیان، جریان خون، پیاس، ضیق النفس اور انقباض و تشنج، جو موت کی علامتیں ہیں، اس وقت تک شروع نہیں ہوتیں کہ زہر سرایت نہ کر جائے۔ مرزا نے غم اور رنج کے اثر کا مقابلہ زہر سے خوب کیا۔ آغاز میں غم صرف تلخ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن انجام کار رفتہ رفتہ گھلا کر مار دیتا ہے۔"

زہر غم رگوں اور شریانوں میں اترے گا تو دیکھنا چاہیے کہ اس کا اثر کیا ہو گا۔ ابھی تو صرف منہ اور حلق کی کڑواہٹ کا معاملہ درپیش ہے۔ ابھی تو یہ دیکھا جا رہا ہے کہ اس تلخ چیز کو کون کون کھانے کی ہمت رکھتا ہے۔

۱۰۔ چرخِ کہن کی آزمائش سے مراد چرخِ کہن کی طرف سے آزمائش ہے۔

شرح : کیا وہ میرے گھر آئیں گے؟ بھلا یہ ممکن بھی ہے؟ مانا کہ انھوں نے وعدہ کر لیا، مگر اسے پورا کرنے کا خیال کب رکھا؟ اے غالب!

دیکھنا کہ اب یہ بوڑھا آسمان ہمیں کس کس نئے فتنے میں مبتلا کرتا ہے اور ہم پر کیا کیا مصیبتیں لاتا ہے۔

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کرکے اپنی یاد، شرما جائے ہے مجھ سے

خدایا! جذبۂ دِل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

وُہ بدخو اور میری داستانِ عشق طُولانی
عبارت مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

اُدھر وہ بد گمانی ہے، اِدھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اس سے، نہ بولا جائے ہے مجھ سے

سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی! کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھُوٹا جائے ہے مجھ سے

تکلّف برطرف، نظّارگی میں بھی سہی، لیکن
وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

۱۔ شرح: اگر میرے بارے میں محبوب کا دل کبھی پسیجتا بھی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ مجھ پر احسان کرے تو مصیبت یہ پیش آتی ہے کہ وہ اپنے پہلے ظلم وجور یاد کرکے شرماتا ہے اور ہمیں منہ نہیں دکھاتا۔ یہ مضمون بھی ایک شعر میں باندھ چکے ہیں:

ظلم سے باز آتے، پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں، ہم تجھ کو مُنہ دِکھلائیں کیا

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے، نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے، نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

قیامت ہے کہ ہووے، مدّعی کا ہم سفر غالبؔ!
وہ کافر، جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

۲۔ شرح اے اللہ! شاید میرے دل کی کشش کا اثر الٹا ہوتا ہے۔ میں جتنا اسے اپنی طرف کھینچتا ہوں، وہ اور بھی زیادہ آزردہ و خفا ہوتا اور مجھ سے دُور بھاگتا ہے۔

۳۔ **لغات**۔ وُہ : مراد ہے محبوب۔

شرح : محبوب بدمزاج اور زود رنج ہے۔ وہ معمولی بات بھی تحمّل سے نہیں سن سکتا اور میرے عشق کی داستان بڑی لمبی ہے۔ حالت تو یہ ہے کہ میں یہ داستان قاصد کے سامنے دہراتا ہوں تو وہ بھی گھبرا اٹھتا ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ میرا زود رنج محبوب اسے اوّل سے آخر تک بہ اطمینان سن لے گا؟

۴۔ **شرح** : محبوب کے دل میں تو بدگمانی بیٹھی ہوئی ہے اور وہ میرے دعوائے محبت کو جھوٹا سمجھتا ہے۔ میں حددرجہ ناتوان و کمزور ہو گیا ہوں۔ محبوب کچھ پوچھنے کے لیے تیار نہیں اور میں ضعف کے باعث بول نہیں سکتا۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں: "اس شعر میں ترکیب کے تشابہ اور الفاظ کے تقابل سے بہت حُسن پیدا ہو گیا ہے۔"

۵۔ **شرح** : اے ناامیدی! خدا کے لیے رحم کر، یہ کیا قیامت برپا کردی ہے؟ مجھے سنبھلنے اور دم لینے دے، پیہم یورشیں نہ کیے جا۔ تو نے یہاں تک نوبت پہنچا دی کہ میرے ہاتھ سے خیالِ یار کا دامن چھوٹا جا رہا ہے۔ یہ چھوٹ گیا تو باقی کیا رہا؟

عموماً سمجھا جاتا ہے کہ کسی حالت کا نقشہ الفاظ کے بجائے رنگ روغن کے ذریعے سے بدرجہا بہتر کھینچا جا سکتا ہے، لیکن مرزا نے اس شعر میں لفظوں کے ذریعے سے جو نقشہ پیش کر دیا ہے، اسے غالباً کوئی مصوّر رنگ روغن کے ذریعے سے پردے پر منتقل نہیں کر سکتا، کیونکہ "چھوٹا جائے ہے" کی تدریجی حرکت تصویر میں نہیں دکھائی جا سکتی ہے۔

۶۔ **لغات**: **تکلّف برطرف**: صاف صاف کہنا، لگی پٹی رکھے بغیر کہہ دینا۔

نظارگی: دیکھنے والا۔

شرح: مانا کہ مَیں بھی اسے دیکھنے والوں میں ہوں، لیکن صاف صاف اور لگی پٹی رکھے بغیر کہہ دیتا ہوں کہ کیا میں یہ ظلم دیکھ سکتا ہوں، اس پیارے محبوب کو دیکھا جائے؟ مجھے خود دیکھنا منظور نہیں، مگر یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ دوسرے اسے دیکھیں:

یہ مضمون دوسری جگہ یوں باندھا ہے:

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

۷۔ **شرح**: خواجہ حالی فرماتے ہیں:

"اس شعر میں وجدانی کیفیات کی تمثیل محسوسات کے ساتھ دی گئی ہے مطلب یہ ہے کہ وہ قویٰ، جن سے عشق کے ترک کرنے یا اس کے شدائد پر تحمل کرنے کی قدرت تھی، ابتدائے عشق ہی میں انھیں کو صدمہ پہنچا ہے، پس اب نہ عشق ترک ہو سکتا ہے، نہ اس پر صبر و تحمل کیا جا سکتا ہے۔"

بجنوری مرحوم اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"جنگ میں اس سے زیادہ مجبوری کا عالم کوئی نہیں، جب تک گولی

دل یا دماغ میں نہ لگے ، انسان کو لڑنے سے فوراً معطل نہیں کرسکتی ۔ بسا اوقات جدید باریک کلاہ کی گولیاں فمِ معدہ میں ایک جانب سے دوسری جانب بلا تکلف شکم سے پشت کی طرف نکل جاتی ہیں اور سوائے خارجی خفیف زخموں کے کوئی اثر نہیں ہوتا۔ غشائے معدہ کے سوراخ فوراً خود بخود مندمل ہو جاتے ہیں ۔ پھیپھڑوں میں ، جگر میں گولیاں بعض مرتبہ محسوس بھی نہیں ہوتی اور قریب قریب جزوِ بدن ہو جاتی ہیں ، لیکن پاؤں پر گولی کا لگنا غضب ہے ۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن ۔" مرزا غالب نے میدانِ عشق میں بے بس ہو جانے کی کیا مثال دی ہے!
ہم عشق کے میدانِ جنگ میں پہنچے اور مردانگی سے لڑنے کا فیصلہ کر لیا ۔ مصیبت یہ پیش آئی کہ سب سے پہلے پاؤں زخمی ہو گئے ۔ اب نہ بھاگنے کی طاقت ہے کہ میدان سے نکل جائیں اور نہ جم کر لڑنے کی قوت ہے ۔ ظاہر ہے پاؤں کے زخموں نے اتنا بے بس کر دیا کہ شاید سر اور سینے کے زخموں کا بھی یہ اثر نہ ہوتا ۔

یہ مضمون بھی ایک اور شعر میں باندھا ہے !

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں ، نہ اقامت کی تاب ہے

۸ ۔ لغات : مدّعی : رقیب ، غیر ، جو عاشق کے مقابلے پر محبت کا دعویدار ہوتا ہے ۔

شرح : اسے غالب ! قیامت ہے کہ ہمارا محبوب ، جسے ہم ، خدا ناترس ہونے کی بنا پر کافر کہتے ہیں ، غیر کا ہم سفر ہو جائے ، حالانکہ ہمیں یہ بھی منظور نہیں ، اسے رخصت کرتے وقت "خدا کے حوالے" کہیں ۔

زبسکہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے — کشاد و بستِ مژہ سیلیِ ندامت ہے

نہ جانوں کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بدعہدی — تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے

بہ پیچ و تابِ ہوس سلکِ عافیت مت توڑ — نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے

وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد — جنونِ ساختہ و فصلِ گُل قیامت ہے

۱۔ لغات۔ زبسکہ: چونکہ۔

کشاد و بست: کھولنا اور بند کرنا۔

سیلی: تھپڑ۔ طمانچہ

شرح: چونکہ دنیا کو دیکھنا اور عبرت نہیں، بلکہ رغبت کی نظر سے دیکھنا دیوانگی کا نشان ہے، اس لیے پلکوں کا کھولنا اور بند کرنا حقیقت میں پشیمانی کا طمانچہ ہے۔

مطلب یہ کہ جو شخص دنیا کو عبرت کی نظر سے دیکھتا ہے، اسے یہاں کی چیزوں سے کوئی دلبستگی نہیں ہو سکتی۔ وہ سمجھ لے گا کہ سب کچھ عارضی اور فانی ہے اور قدم قدم پر اس کی شہادتیں سامنے آ رہی ہیں اگر اس کے باوجود کوئی شخص دنیا سے رغبت پیدا کرے اور اسے بہ نظرِ رغبت دیکھے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ پاگل ہے اور پاگل کا علاج یہی ہے کہ اسے طمانچے پڑیں۔ وہ جو دیکھنے کی حالت میں آنکھیں جھپکتا ہے، وہی اس کے لیے ندامت کا طمانچہ ہے۔

اس سلسلے میں مرزا بیدلؔ کا ایک شعر غالبؔ کے اس شعر کا ماخذ بتایا جاتا ہے۔

دیدۂ را کہ بہ نظارۂ دل محرم نیست\
مژہ برہم زدن از دستِ تاسف کم نیست

(جو آنکھ دل کے نظارے سے محرم نہ ہوئی، اس کا پلکیں جھپکنا دراصل افسوس کے ہاتھ مَلنا ہے)

ظاہر ہے کہ اس مضمون کو مرزا غالب کے مضمون سے کوئی نسبت نہیں۔

۲۔ لغات۔ ورطہ: بھنور، گرداب، ہلاکت کا مقام۔

شرح: خدا ہی جانے کہ تو نے جو عہد توڑا، اس پر ملنے کا دھبا کیونکر دُھلے گا؟ تُو جو بننے سنورنے کے لیے آئینہ دیکھتا ہے، تیرے لیے تو وہ بھی ملامت کا گرداب ہے۔

مطلب یہ کہ محبوب آئینہ بناؤ سنگار کے لیے دیکھتا ہے اور بناؤ سنگار کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں پر اپنے حُسن کے کرشمے آشکارا کیے جائیں۔ سچے عاشق کے نقطۂ نگاہ سے یہ بجائے خود بدعہدی ہے۔ پھر محبوب کے دامن سے بدعہدی کا داغ کیونکر دُور ہو سکتا ہے؟

۳۔ لغات۔ سلکِ عافیت: آرام و راحت کا رشتہ۔

شرح: ہَوس کے چکروں میں پڑ کر راحت و آرام کا رشتہ ٹکڑے ٹکڑے نہ کر، کیونکہ جو شخص ہَوس میں مبتلا ہوا، اس کے لیے آرام سے بیٹھنا غیر ممکن ہو جاتا ہے۔ گوناگوں آرزوئیں اُسے ہر طرف دوڑائے لیے پھریں گی اور عافیت ختم ہو جائے گی۔ عاجزی کی نگاہ ہی سلامتی کی ڈور ہے جو شخص عجز اختیار کرے گا، وہ ہَوس سے بالکل پاک ہو گا، لہٰذا اس کی سلامتی میں کوئی خلل نہ آئے گا۔

۴۔ شرح: محبوب تو وفا پر آمادہ ہو، لیکن عشق کا دعویٰ جھوٹا ہو جائے تو اس کی مثال ایسی ہے کہ موسم بہار آ جائے اور دیوانگی جو اس موسم میں طبعی ہوتی ہے، بیادی رہ جائے — یہ منظر قیامت سے کم نہیں۔

لاغر اتنا ہوں کہ گر تُو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

کیا تعجب ہے کہ اُس کو دیکھ کر آ جائے رحم
واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

منہ نہ دکھلاوے، نہ دکھلا، پر بہ اندازِ عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زُلف گر بن جاؤں تو شانے میں اُلجھا دے مجھے

۱۔ شرح: میں اتنا دُبلا اور کمزور ہو گیا ہوں کہ اے محبوب! اگر تُو اپنی محفل میں جگہ دے دے تو میں اس بات کا ذمہ اٹھاتا ہوں کہ کوئی مجھے دیکھ کر بتا نہ سکے گا، میں ہوں۔ شعر میں صرف اپنے ضعف اور لاغری کی کیفیت بیان کی ہے، یعنی کسی کی آنکھیں مجھے دیکھ ہی نہیں سکتیں۔ میں کسی کو نظر ہی نہیں آسکتا۔ ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محبوب کی بزم میں بار مل جانے پر رقیب چہ میگوئیاں کرتے تھے اس وجہ سے بزم میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ مرزا کہتے ہیں کہ مجھے تو کمزوریوں کے باعث کوئی دیکھ ہی نہیں سکتا، پھر چہ میگوئیوں کا کونسا موقع ہے؟

۲۔ شرح: میری حالت اس درجہ غیر ہو چکی ہے کہ ہر دیکھنے والے کو مجھ پر رحم آجاتا ہے۔ اگر کوئی حقیقی ہمدرد ہے تو مجھے کسی بہانے سے محبوب کے پاس پہنچا دے۔ کچھ عجب نہیں کہ اسے بھی میری حالت دیکھ کر رحم آجائے۔

۳۔ لغات: آنکھیں دکھلانا: غصے ہونا۔ بے مروّتی دکھانا۔
شرح: اے محبوب! اگر تُو چہرہ نہیں دکھاتا، نہ دکھا، لیکن غصے

کے انداز میں پردہ اٹھاتے ہوئے گھور ہی کر دیکھ لے۔

شعر میں لطف یہ ہے کہ آنکھیں دکھانے کی وجہ سے پورا چہرہ نہیں تو اس کا ایک حصّہ ضرور نظر آ جائے گا، کیونکہ خفگی صرف آنکھیں دکھانے سے ظاہر نہیں ہو سکتی، ضروری ہے کہ چہرے کے آس پاس کا حصّہ بھی نمایاں ہو۔

۴۔ **شرح :** مجھے مصیبت میں مبتلا رکھنے پر محبوب اتنا خوش ہوتا ہے کہ اگر میں اس کی زلف بھی بن جاؤں تو مجھے وہ کنگھی میں الجھا دے گا۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا، مرے آگے

جز نام، نہیں صورتِ عالم، مجھے منظور
جز وہم، نہیں ہستیِ اشیا، مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

سچ کہتے ہو، خود بین و خود آرا ہوں، نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہے بُتِ آئنہ سیما مرے آگے

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

نفرت کا گماں گزرے ہے، میں رشک سے گزرا
کیوں کر کہوں "لو نام نہ ان کا مرے آگے"

ایماں مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

خوش ہوتے ہیں، پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے — آئی شبِ ہجراں کی تمنا، مرے آگے

ہے موج زن اک قلزمِ خوں، کاش یہی ہو — آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا، مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا — غالبؔ کو بُرا کیوں کہو، اچھا مرے آگے

۱۔ **شرح** : میری نگاہوں میں دنیا بچوں کا ایک کھیل ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ رات دن ایک تماشا میرے سامنے ہو رہا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جو واقعات و حادثات یہاں رات دن پیش آ رہے ہیں، میرے دل پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور بچے جو کھیل کھیلتے ہیں، کسی سلیم العقل انسان پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

۲۔ **لغات** ۔ **اورنگِ سلیمانؑ** : حضرت سلیمانؑ کا تخت، جس پر سوار ہو کر وہ ہوا میں پرواز کرتے تھے۔

اعجازِ مسیحا : حضرت عیسیٰؑ کا معجزہ جو قُم بِاذنِ اللہ (اٹھ اللہ کے حکم سے) کہہ کر مردے کو زندہ کر دیتے تھے۔

شرح : حضرت سلیمانؑ کا تخت، جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہوا میں اڑتا تھا، میرے نزدیک محض ایک کھیل ہے اور حضرت عیسیٰؑ کے معجزے کو میں محض ایک بات سمجھتا ہوں۔

دوسرے مصرع میں خوبی یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ محض ایک کلمہ یعنی بات کہہ کر مردے کو زندہ کر دیتے تھے۔

۳۔ **شرح** : میں دنیا کے وجود کو حقیقتہً کچھ نہیں سمجھتا، محض ایک نام ہے، جو اس کے لیے رکھ دیا گیا، مسمّیٰ کچھ نہیں اسی طرح اشیا کا وجود بھی میرے لیے وہم سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ تصوف کے نزدیک اجسام بالذات محسوس نہیں۔ ذات باری تعالیٰ کے سوا کسی شے کو موجود سمجھیں تو یہ موجودات یا مجردات ہوں گے، جیسے نفوس، ملائک وغیرہ یا ہمارے تصور کردہ اجسام ہوں گے۔ ہم نفوس و اجسام کے صرف اعراض دیکھتے ہیں، مثلاً نفس کا علم و ارادہ، جسم کا رنگ اور شکل۔ مجردات کا نامحسوس ہونا تو ظاہر ہے، رہے اجسام تو ان کے محض اعراض محسوس ہوتے ہیں۔ مثلاً پہاڑ میں جس شے کو ہم جسم کوہ یا ذاتِ کوہ کہتے ہیں، وہ تو دکھائی نہیں دیتی، صرف پہاڑ کا رنگ، اس کی لمبائی چوڑائی اور پھیلاؤ نظر آتا ہے۔ یہ سب اعراض ہیں۔ رنگ کے متعلق بھی فلاسفۂ یورپ نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ دراصل روشنی کی ایک نوع ہے اور اس نوع کا خاص تموّج و ارتعاش ہمیں نظر آتا ہے۔ اسی طرح آواز بھی ہوا کا ایک ارتعاش ہے۔ غرض اجسام کا حقیقی وجود کوئی نہیں اور اعراض ہمارے اوہام کی تخلیق ہیں، لہٰذا ثابت ہوا کہ جس شے کو ہم عالم کہتے ہیں، وہ محض ایک نام ہے اور اشیاء کی ہستی محض ایک وہم ہے۔

بجنوری مرحوم نے لکھا ہے کہ ہندو اپنشدوں کی قدیم تعلیم کا مفہوم غلط سمجھتے ہوئے عالم کو ایک فریب نگاہ اور دشت سراب سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایک خواب ہے، جو چشم کور عالم رویا میں دیکھتی ہے۔ مرزا غالب کی عقل اس مغالطے سے آزاد ہے وہ ہستی کو ہمیشہ مادے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، لیکن وہ مادے کے منکر ہیں۔ اگرچہ عالم اجسام خارجی سے لبریز نظر آتا ہے اور نہایت لطیف گیسوں سے نہایت بھاری دھاتوں تک ہر شے اس میں موجود ہے، لیکن مادے کا وجود خود محض بالنسبت ہے۔ بالذات نہیں، زندگی کی جیتی جاگتی، چلتی پھرتی تصویریں، حرکات اصوات، الوان، کوئی وجود نہیں رکھتیں، جب تک ذہن ان کا ادراک نہ کرے۔ تمام مادہ، جس میں خود میرا جسم اور بنی نوع کے اجسام شامل ہیں، بیجان اور بیکار ہے، وہ روح،

وہ رواں، وہ خیال، جو ان پر نازل ہے، حقیقت ہے۔ غالب کا فلسفہ سپنوزا نوزا، ہیگل، برکلے اور نشطے سے ملتا ہے۔ حکمت کے رو سے مرزا کا خیال صحیح ہے۔ مادہ سالمات سے مرکب ہے۔ اگر پانی کے ایک قطرے کو کرۂ ارض کے برابر خیال کریں۔ تو اس کے سالمات چوگان کے گیند سے بڑے ہوں گے یہ خود اجزاء سے مرکب ہیں، جو اب لا یتجزیٰ خیال نہیں کیے جاتے، بلکہ جواہر برق سے مرکب مانے جاتے ہیں۔ ہر جزو کو اگر ایک کلیسا سے مشابہ خیال کریں تو بقول سر آلیور لاج یہ جواہر کلیسا میں اڑتی ہوئی مکھیوں کی مثال ہیں۔ اگر ان کی تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایتھر کے حلقوں کی ساخت ہیں۔ اگر ان حلقوں کی گرہ کھل جائے تو محض خیال باقی رہ جائے۔ یوں مرزا غالب کا یہ شعر از روئے فلسفہ و حکمت بھی درست ثابت ہوگا۔

۴۔ شرح : میں بیابان میں سیر و گردش کرتا ہوں تو اتنی خاک اڑاتا ہوں کہ پورا بیابان گرد و غبار میں چھپ جاتا ہے اور دریا کو میرا اتنا احترام منظور ہے کہ وہ میرے آگے اپنی پیشانی زمین پر گھستا ہے۔

یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ میری اشکباری کے مقابلے میں دریا عجز کے اظہار پر مجبور ہو جاتا ہے۔

۵۔ شرح : اے محبوب! یہ نہ پوچھ کہ تیرے عشق میں میرا کیا حال ہوا، یہ دیکھ کہ میرے سامنے تیرا کیا رنگ ہے۔

مطلب یہ کہ عاشق کے روبرو محبوب کی جو کیفیت ہوگی، اسی سے عاشق کی حالت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر محبوب کی نظر التفات عاشق پر ہے اور وہ وفاداری سے عشق و محبت کے تقاضے پورے کر رہا ہے تو ظاہر ہے کہ عاشق کی حالت بڑے اطمینان کی ہوگی۔ اگر اس کے برعکس محبوب کو عاشق کے حال پر کوئی توجہ نہیں، وہ اس سے مسلسل تغافل برتتا ہے تو ظاہر ہے کہ عاشق کی حالت زیادہ سے زیادہ خستہ ہوگی۔

غرض اس شعر کے ذریعے سے مرزا غالب نے عاشق کی حالت معلوم کرنے کا ایک پیمانہ مہیا کر دیا، یعنی عاشق کے سامنے محبوب کا رنگ۔

۶۔ لغات ۔ خود بین : اپنے آپ پر نظر رکھنے والا، مغرور، خود پسند۔

خود آرا : اپنے آپ کو بنانے اور سنوارنے والا۔ خود بین و خود آرا در حقیقت محبوب کی صفتیں ہیں کہ اس کی نظر ہر لحظہ اپنے آپ پر رہتی ہے اور وہ اپنے بناؤ سنگار کا خاص خیال رکھتا ہے۔

آئینہ سیما : آئینے جیسی پیشانی والا۔

شرح : محبوب طعناً مرزا کو کہتا ہے کہ تم تو بڑے خود بین و خود آرا ہو۔ مرزا جواب دیتے ہیں کہ کیوں نہ ہوں؟ آئینے جیسی پیشانی والا محبوب میرے سامنے موجود ہے۔

اوّل بناؤ سنگار اس لیے موزوں و مناسب ٹھہرا کہ محبوب کے چہرے کا آئینہ سامنے ہے۔ دوم خود بینی و خود آرائی کی نوبت اس لیے آئی کہ محبوب پاس موجود ہے اور عاشق کے لیے خوشی کی سرشاری کا اس سے بڑا موقع کوئی نہیں ہو سکتا۔ اسی سرشاری کو محبوب نے خود بینی اور خود آرائی قرار دے لیا اور کوئی بھی عاشق کو اس حالت میں دیکھتا تو یہی کہتا۔

۷۔ شرح : کوئی شخص میرے سامنے شراب کا پیالہ رکھ دے۔ پھر دیکھیے، کیونکر گفتگو سے پھول برستے ہیں، یعنی شراب کا پیالہ دیکھ کر طبیعت پر مستی کی خاص کیفیت طاری ہو جائے گی اور گفتگو کا انداز حد درجہ رنگین و دلآویز ہو جائے گا۔ اسی رنگینی و دلآویزی کو گفتگو کی گل افشانی سے تعبیر کیا۔

۸۔ شرح : محبوب کے سلسلے میں میرے رشک کا یہ حال ہو گیا کہ اس کا نام بھی کسی کی زبان پر آجاتا تو میں کہہ دیتا کہ بس یہ نام نہ لو۔ میری تو

یہ کیفیت رشک کے باعث تھی، محبوب کے دل میں گمان پیدا ہوا کہ مجھے اس سے نفرت ہو گئی ہے۔ اور لوگوں کو بھی یہی شبہ ہونے لگا۔ فرماتے ہیں کہ بھائی! میں رشک سے دست بردار ہوا۔ آئندہ نہ کہوں گا کہ محبوب کا نام میرے سامنے نہ لو، یعنی رشک اپنی جگہ بجا، لیکن یہ صورت نہ ہونی چاہیے کہ سب کو محبوب سے نفرت کا گمان ہونے لگے۔

۹۔ **شرح** : ایمان مجھے روک رہا ہے کہ ٹھہر جاؤ، کفر کی طرف نہ جاؤ۔ اُدھر کفر مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ عجیب کشمکش میں مبتلا ہوں۔ کعبہ میرے پیچھے ہے اور کلیسا میرے آگے ہے گویا ایمان کو چھوڑ کر کفر کی طرف چل پڑے ہیں، ورنہ کلیسا آگے کیوں ہوتا؟

۱۰۔ **شرح** : بلاشبہ میں عاشق ہوں، لیکن ایسا عاشق جو دلآویز کارناموں سے معشوقوں کو لبھا لیتا ہوں۔ میرے اس کمال کا یہ عالم ہے کہ لیلیٰ میرے سامنے ہو تو مجنوں کی بُرائی شروع کر دیتی ہے۔

مطلب یہ کہ میں عشق میں ایثار، جانبازی اور فداکاری کے ایسے کرشمے دکھاتا ہوں، جو مجنوں، فرہاد اور دوسرے بڑے بڑے عاشقوں کو نصیب نہ ہوئے۔ چنانچہ ان کے محبوب میرے کارنامے دیکھتے ہی تو میری طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے عاشقوں کی قدر و قیمت ان کی نظروں میں گھٹ جاتی ہے۔

۱۱۔ **شرح** : بیشک وصل ایسی خوش نصیبی کی تقریب ہے، جس پر ہر سچے عاشق کو نہایت مسرت و شادمانی ہوتی ہے، لیکن شادیٔ مرگ کی نوبت نہیں آتی۔ یہ طریقہ نہیں کہ خوشی اس حد پر پہنچ جائے، جو جان لیوا ثابت ہو مجھے یہی صورت پیش آئی۔ آہ! معلوم ہوتا ہے کہ میں جدائی کی رات جو آرزو کر رہا تھا، وہ وصل کی شب پوری ہو گئی۔ یعنی زمانۂ ہجر کی تمنا نے ہنگامِ وصل عملی لباس پہن لیا۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :

"یہ شعر اس زمین میں بیت الغزل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شب ہجراں
میں جو میں نے مرنے کی تمنا کی تھی، آج وہ بڑا بول میرے آگے آیا
کہ وصل کی خوشی میں مر گیا۔ وصل کی خوشی میں مر جانا اور لوگ بھی
باندھا کرتے ہیں، مگر یہ بات ہی اور ہے اور ساری کرامات محاورے
اور زبان کی ہے، جس نے مرنے کے مضمون کو زندہ کر دیا۔ فکرِ غالب
کے کارناموں میں یہ شعر بھی شمار کرنا چاہیئے۔"

۱۲۔ **شرح** : میری آنکھوں سے خون کا دریا بہہ نکلا، جو سامنے لہریں لے
رہا ہے۔ کاش! اسی پر معاملہ ختم ہو جاتا، مگر بظاہر ایسا کرنے کی اُمید نہیں۔ دیکھیے
عشق کی راہ میں ابھی کیا کچھ میرے سامنے آنے والا ہے!

۱۳۔ **شرح** : اگرچہ نزع کی حالت ہے اور ہاتھ حرکت کرنے سے رہ
گئے ہیں۔ اتنی سکت باقی نہیں کہ صراحی سے شراب پیالے میں انڈیل لوں اور
پی جاؤں، لیکن آنکھوں میں تو دم ابھی باقی ہے۔ اس لیے ابھی پیالہ اور صراحی
اٹھاؤ نہیں، بدستور میرے سامنے رہنے دو۔

اس سے مقصود وہی ایک گونہ بیخودی ہے، جس کے آرزومند مرزا غالب
ہمیشہ رہے!

ابو نواس کا ایک شعر ہے کہ اے ساقی! مجھے شراب پلا اور زبان سے بھی
کہہ کہ یہ شراب ہے۔ خود ابو نواس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک مکتب
کے سامنے سے گزرا۔ استاد نے ایک طالب علم سے پوچھا کہ ابو نواس نے یہ
کیوں کہا، زبان سے بھی کہہ کہ یہ شراب ہے؟ طالب علم نے جواب دیا کہ شراب
کا پیالہ ہاتھ میں لے کر قوتِ لامسہ اس سے مستفید ہوگی، شراب دیکھ کر باصرہ
لذت حاصل کرے گی، شراب پینے سے ذائقہ شاد کام ہوگا، شراب پیتے وقت
شامہ اس کی خوشبو سے مستی حاصل کرے گی، صرف ایک سامعہ باقی رہ گئی تھی۔
جب ساقی زبان سے کہے گا کہ یہ شراب ہے تو اسے بھی ایک خاص راحت ملے گی،

گویا تمام حواس اِس خورد و نوش میں شریک ہوں گے اور لذت انتہا پر پہنچ جائے گی۔

مرزا غالب زندگی کی اس منزل پر پہنچ گئے، جب بامرہ کے سوا کوئی حس کار آمد نہیں رہی۔ وہ چاہتے ہیں کہ جب تک بامرہ باقی ہے۔ شراب کو دیکھنے سے جتنی لذت حاصل ہو سکتی ہے، وہ ہوتی رہے اور اس کیفیت کا صحیح اندازہ عرق نوش ہی کر سکتے ہیں۔

۱۴۔ لغات۔ ہم پیشہ: دو یا دو سے زیادہ آدمی، جن کا پیشہ ایک ہو۔ ایک پیشہ اور ایک ہی کام کرنے والے۔

ہم مشرب: دو یا دو سے زیادہ آدمی، جن کا مسلک، مذہب اور طور طریقہ ایک ہو، نیز جو مل کر شراب پئیں۔

شرح: غالب تو میرا ہم پیشہ، ہم مشرب اور ہمراز ہے، وہی کام کرتا ہے، جو میں کرتا ہوں۔ وہ میرا ہم مسلک ہے اور ہم اکٹھے کھاتے پیتے ہیں۔ میرے رازوں میں بھی وہ شریک ہے، اُسے کیوں بُرا کہتے ہو؟ اچھا اگر تمھیں کہنے پر اصرار ہی ہے تو کم از کم میرے سامنے تو نہ کہو۔

کہوں جو حال تو کہتے ہو، "مدعا کہیے"
تمھیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے؟

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ "ہم ستم گر ہیں"
مجھے تو خُو ہے کہ جو کچھ کہو، "بجا" کہیے"

۱۔ شرح:
اے محبوب! اگر میں اپنا حالِ زار آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں تو آپ کہ دیتے ہیں یہ طولانی داستان

وہ نیشتر سہی، پر دل میں جب اتر جاوے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

نہیں ذریعۂ راحت، جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے، جس کو کہ دلکشا کہیے

جو مدّعی بنے، اس کے نہ مدّعی بنیے
جو نا سزا کہے، اس کو نہ نا سزا کہیے

کہیں حقیقتِ جانکاہیِ مرض لکھیے
کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیے

کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے
کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

رہے نہ جان تو قاتل کو خونبہا دیجے
کٹے زبان، تو خنجر کو مرحبا کہیے

نہیں نگار کو الفت، نہ ہو، نگار تو ہے
روانیِ روش و مستیِ ادا کہیے

نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے

سننے کے لیے ہمارے
پاس وقت نہیں،
مطلب کی بات کہو
اور بتاؤ کیا چاہتے
ہو؟ بیچارہ عاشق
اس صورت حال
پر حیران ہو کر عرض
کرتا ہے، آپ ہی
فرمائیں کہ آپ کے
اس ارشاد کے بعد
کیا کہوں اور کیا کہہ
سکتا ہوں؟

مطلب یہ کہ
عاشق اپنی حالت
محبوب کے سامنے
اس لیے پیش کرتا
ہے کہ اسے رحم
آجائے اور عاشق
کا مدعا جو محبوب پر
پوری طرح واضح
ہوتا ہے، پورا ہو
جائے، لیکن محبوب
وہ کیفیت ہی سنتا

سفینہ جب کہ کنارے پر آ لگا، غالبؔ!
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے!

گوارا نہیں کرتا۔ جو اس کے دل میں رحم، ملائمت اور نرمی پیدا کرنے کا موجب سمجھی جا سکتی ہے۔ نیز حال سننے سے بیزاری یا بے پروائی کا مطلب ہی یہ ہے کہ محبوب کو عاشق کا کچھ خیال نہیں۔ اب وہ بیچارہ محبوب ہی سے پوچھتا ہے کہ آپ کی اس روش کے بعد میں کہوں تو کیا کہوں؟

۲۔ **شرح**: اے محبوب! میں آپ کی سنگدلی اور بیدردی کی شکایت کرتا ہوں تو آپ کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا۔ جاؤ، ہم واقعی ظالم اور ستمگر ہیں۔ آپ کو از روئے طعن بھی یہ نہ کہنا چاہیے۔ کیونکہ میری تو عادت ہی یہ ہے کہ آپ جو کچھ فرمائیں، میں بجا اور درست کہتا جاؤں۔ گویا اس طرح بلا ارادہ میری زبان سے آپ کی ستم گری کی تصدیق ہو جائے گی۔

۳۔ **شرح**: بلاشبہ محبوب کی نگاہِ ناز ایک نشتر ہے، لیکن جب وہ نشتر دل میں اُتر جائے تو اسے کیوں جانی پہچانی چیز نہ سمجھیں؟

مطلب یہ ہے کہ دل میں وہی چیز اترتی ہے، جو محبوب ہو۔ یقیناً محبوب کی نگاہ نشتر ہے۔ مگر دلنشین ہوتے ہی وہ آشنا بن جاتی ہے۔

۴۔ اس شعر کی شرح ہم پہلے "خطوطِ غالب" سے نقل کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو شرح:

زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پَر افشاں نکلا

مطلب یہ کہ نوکِ تیر کا زخم دلی راحت کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ کیوں کہ نوکِ تیر سے جو زخم لگے گا وہ نہایت معمولی اور چھوٹا سا ہوگا۔ جس زخم کو دلکشا یعنی دل کھول دینے والا کہہ سکتے ہیں، وہ تلوار کا زخم ہے۔

شعر میں لفظ "دلکشا" کے دو معنی ہیں، اوّل راحت افزا، دل شگفتہ کر دینے،

فرحت انگیز، دوم دل کو کھول دینے والا یعنی فراخ اور وسیع۔ یہاں دونوں معنی بالکل ٹھیک اُترتے ہیں، یعنی زخم تیغ فرحت افزا بھی ہے، فراخ اور وسیع بھی۔

۵-۱۰۱- **لغات** : مدّعی : دعوے کرنے والا ، نالش کرنے والا حریف، دشمن۔

جانکاہی : جان گھُلانا ، تکلیف کی شدت۔

گراں نشیں : جم کر بیٹھ جانے والا، جسے دُور کرنا مشکل ہو، بھاری۔

گریز پا : بھاگنے والا۔ ناپائدار ، نااستوار

خونبہا : خون کی قیمت ، جو رقم خون کے بدلے میں مقتول کے وارث کو دی جائے۔

روانیٔ روش : خوش رفتاری ، خوش خرامی۔

شرح : اگر کوئی حریف اور دشمن بنے تو اس سے دشمنی کا قصد نہ کرنا چاہیے۔ جو شخص ہمارے متعلق نازیبا باتیں کہے اس کے جواب میں ایسی ہی باتیں نہ کہنی چاہییں۔

کہیں بیماری کے جان گھُلا دینے کی حقیقت قلم بند کیجیے ، کہیں یہ مصیبت بیان کیجیے کہ دوا موافق نہیں۔

کبھی ایسے رنج کی شکایت کیجیے ، جو دل میں اس طرح بیٹھ جائے کہ اُسے دُور کرنا ممکن نہ ہو۔ کبھی اُس صبر کی داستان سنائیے جو بالکل ناپائدار ہے اور ہمیشہ بھاگنے کے درپے رہتا ہے۔

اگر جان جاتی رہے تو قاتل کی خدمت میں خونبہا پیش کرنا چاہیے۔ اگر زبان کٹ جائے تو خنجر کو مرحبا و آفریں کہنی چاہیے۔

اگر محبوب کو عاشق سے محبت نہیں اور اس کا جوہر خمیر الفت سے خالی ہے

تو کچھ پروا نہیں، محبوب تو ہے۔ اس کی رفتار کی دلآویزی اور ناز و انداز کی مستی کا ذکر کرنا چاہیے۔

مطلب یہ کہ اگر محبوب میں الفت نہیں تو نہ اس کی محبوبی زائل ہوتی ہے؛ نہ اس کی خوش خرامی اور ناز و انداز میں کوئی فرق آتا ہے۔ گویا محبوبیت بدستور باقی رہتی ہے۔

اگر بہار تھوڑی دیر کے لیے آتی ہے اور جلد رخصت ہو جاتی ہے۔ تو مضائقہ نہیں، بہار تو ہے۔ اس کی وجہ سے باغ میں ہر طرف طراوت و شادابی پیدا ہو جاتی ہے اور ہوا میں ایک خاص دلکشی آجاتی ہے۔ یعنی بہار کی کم فرصتی کے باعث اس کے یہ بدیہی جوہر تو ختم نہیں ہو جاتے۔

۱۱۔ لغات۔ سفینہ: کشتی۔ ناؤ۔

ناخدا: ملّاح۔

شرح: اے غالب! جب ناؤ کنارے پر آ لگی تو ملّاح نے دورانِ سفر میں ہم پر جو ظلم و ستم کیے، خدا سے ان کی فریاد کیا کریں؟

مطلب یہ کہ جب اصل وقت گزر گیا تو کسی کی برائی یاد نہ رکھنی چاہیے، بھلا دینی چاہیے؛ کیونکہ جو کچھ پیش آچکا ہے، وہ کسی بھی صورت میں کالعدم نہیں ہو سکتا۔ پھر اسے یاد رکھنے سے کیا فائدہ؟

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ لقمان نے چار باتوں میں حکمتِ اخلاق کو منحصر کر دیا ہے، ان میں سے دو یاد رکھنے کی ہیں یعنی موت کا آنا اور خدا کا حاضر و ناظر ہونا اور دو بھول جانے کی ہیں، یعنی کسی پر کچھ احسان کیا ہو یا کسی نے کچھ برائی کی ہو۔

مرزا غالب نے اس شعر میں بھول جانے کی ایک بات کا ذکر نہایت پُرتاثیر انداز میں کر دیا۔

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ میکشی
تھے یہ ہی دو حساب، سو یوں پاک ہو گئے

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

کہتا ہے کون نالۂ بُلبُل کو بے اثر؟
پردے میں گُل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا؟
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گِلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

اِس رنگ سے کل اس نے اٹھائی، اسدؔ کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غم ناک ہو گئے

۱۔ شرح: خواجہ حالی فرماتے ہیں:

"دھویا جانا" بے شرم و بیباک ہونا

پاک، آزاد یا شہدا

مطلب یہ ہے کہ جب تک آنکھ سے آنسو نہیں نکلے تھے تو اس بات کا پاس لحاظ تھا کہ عشق کا راز کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے مگر جب رونا ضبط نہ ہو سکا اور ہر وقت آنسو جاری رہنے لگے تو اخفاءِ رازِ عشق کا خیال جاتا رہا اور ایسے بے شرم و بےحجاب ہو گئے کہ آزادوں اور شہدوں کی طرح کھل کھیلے۔ اس مطلب کو ان لفظوں میں ادا کرنا کہ رونے سے ایسے دھوئے گئے کہ بالکل پاک ہو گئے، بلاغت اور حسنِ بیان کی انتہا ہے۔

جب تک اشکباری جاری نہیں ہوئی تھی، یہ خیال تھا کہ عشق کا بھید کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے۔ جب ضبط کے تمام بند ٹوٹ گئے اور گریہ و زاری شروع ہوگئی تو راز چھپائے رکھنے کا معاملہ ہی ختم ہوگیا۔ کیونکہ اشکباری سے ہر شخص بھانپ گیا، ہم مرضِ عشق میں مبتلا ہیں۔ عام قاعدہ ہے کہ جب تک بھید آشکارا نہ ہو، انسان بڑی احتیاط کرتا ہے، لیکن جب حقیقت بے اختیار واضح ہوجائے تو ضبط کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی اور رفتہ رفتہ رسوائی کا احساس کُند ہوتے ہوتے ختم ہوجاتا ہے۔ یہی صورت مرزا غالب کو پیش آئی۔ رونے سے ایسے دھوئے گئے کہ پاس دل نہ کا کوئی تسمہ لگا نہ رہا۔ بالکل پاک ہوگئے۔ یعنی ضبط و احتیاط سے کامل بے پروائی اختیار کر لی۔

۲۔ لغات۔ بہا: قیمت۔

آلاتِ میکشی: شراب نوشی کا سر و سامان۔

شرح: ہمارے لیے دو ہی تقاضے تھے، ایک یہ کہ شراب پئیں، دوسرا یہ کہ شراب کے سر و سامان سے فارغ ہوجائیں۔ چنانچہ ہم نے شراب نوشی کا پورا سر و سامان شراب کی قیمت میں دے دیا۔ اس طرح ہمارے دونوں حساب صاف ہوگئے۔ نہ شراب کی قیمت ہمارے ذمے رہی، نہ سر و سامان ساتھ ساتھ اٹھائے پھرنے کی مصیبت سے دوچار ہوتے۔

۳۔ شرح: اگرچہ تم (حسین)، آوارگی کے باعث دنیا بھر میں رسوا ہو گئے، لیکن اتنا تو ہوا کہ تمھاری طبیعتوں میں چالاکی آگئی۔ سادگی اور سادہ لوحی باقی نہ رہی۔ اب کوئی تمھیں فریب نہیں دے سکتا۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ طبیعتوں کا چالاک ہونا محاورہ ہے۔ اس مقام پر جمع اور مفرد دونوں طرح بولتے ہیں، لیکن مصنّف پہلے شخص ہیں، جنھوں نے جمع کے ساتھ نظم کیا۔ تازگی لفظ اسی کو کہتے ہیں۔

۴۔ شرح: کون کہتا ہے کہ بلبل کی فریاد و فغاں بے اثر ہی رہی چو

پھول کھلتے ہیں، کیا معلوم نہیں کہ ان کے پردے میں لاکھ جگر چاک ہوتے ہیں؟ یہ بلبل کی فریاد ہی کا اثر ہے۔ جو فریاد پھول کے پردے میں لاکھوں جگر چیر کر رکھ دیتی ہے، اسے بے اثر قرار دینے کی کون سی وجہ ہے؟

۵۔ شرح ۔ اہلِ شوق کی بقا و فنا کے بارے میں کیا پوچھتے ہو؟ یہ کوئی بیان کرنے کی چیز ہے؟ وہ لوگ تو اپنے عشق کی آگ میں خس و خاشاک کی طرح جل بجھے۔

کمال یہ ہے کہ اہلِ شوق اپنی آگ میں خس و خاشاک کی طرح جلتے ہیں، یعنی اُن سوکھے ہوئے تنکوں اور پتوں کی طرح، جنھیں صاف کرکے باغ سے باہر پھینک دیتے ہیں۔ یقیناً عشق کی آگ سب کو اسی طرح جلاتی ہے۔ اس کے نزدیک کسی کی بقا کوئی خاص وزن نہیں رکھتی۔ جو کچھ ذاتِ باری تعالیٰ کے سوا ہے، وہ کوڑا کرکٹ ہے اور اس کے لیے یہی زیبا ہے کہ آگ کی نذر ہو جائے۔ عشق کی آگ یہی کام انجام دیتی ہے۔ اب رہا معاملہ بقا و فنا کا تو انھوں نے عارضی بقا سے نجات پائی اور حقیقی بقا میں گم ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا نے شعر میں بقا و فنا کا معاملہ واضح نہیں کیا۔

۶۔ شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں:

> "ہم نے اس کے تغافل سے تنگ آکر شکایت کی تھی اور اس کی توجہ کے خواستگار ہوئے تھے۔ جب اس نے توجہ کی تو ایک ہی نگاہ میں ہمیں فنا کر دیا۔"

مطلب یہ کہ محبوب کے جلوے کی تاب کوئی نہیں لاسکتا۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہم سے تغافل برتا جا رہا ہے۔ یہ شکایت ہے کہ محبوب کے پاس پہنچے اس نے ایک نگاہ ہم پر ڈالی، نتیجہ یہ ہُوا کہ ہم خاک ہو کر رہ گئے۔

محبوبِ حقیقی کے جلوے کی آرزو ہر دل میں موجزن ہے، لیکن اس کے التفات کو سنبھالنے کی ہمت کسی میں نہیں۔

۷۔ شرح : کل اس نے اسدؔ کی نعش ایسے انداز سے اٹھائی کہ دشمن بھی اسے دیکھ کر رنج و غم کے پیکر بن گئے۔

شاید کسی صاحب کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہو کہ نعش اٹھانے کی کیفیت معین طریق پر بیان نہیں کی گئی تو یہ وسوسہ بیجا ہوگا۔ دوسرا مصرع صاف بتا رہا ہے کہ نعش اٹھانے کا طریقہ اتنا بڑا تھا، جسے دیکھ کر دشمنوں کے دل بھی دہل گئے اور وہ بھی رنج و غم میں مبتلا ہو گئے۔

نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مستِ طرب
شیشۂ مے سروِ سبز جوئبارِ نغمہ ہے
ہم نشیں مت کہہ کہ "برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست"
واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

۱۔ لغات
شاداب: سیراب، حد درجہ تر و تازہ۔
جوئبار: ندی۔ نہر۔

شرح : نشے نہایت رنگین اور پُر لطف ہیں۔ ساز خوشی میں مست نظر آتے ہیں۔ شراب کی صراحی نغمے کی نہرِ رواں کے کنارے سبز سرو کی بہار دکھا رہی ہے۔

ظاہر ہے کہ پورا منظر فصلِ بہار کا ہے، جب شراب پینے، مست و مدہوش رہنے، راگ رنگ سننے کا خاص لطف آتا ہے۔ ایسے ہی وقت میں دل پر یہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ اگر گیتوں کو ایک نہر فرض کر لیا جائے تو اس نہر کے کنارے شراب کی صراحی کے سوا سرو کا کام کوئی نہیں دے سکتا۔ غرض شراب اور راگ رنگ کی نہایت موزوں بزم کا نقشہ پیش کر دیا ہے۔

۲۔ شرح : اے ہمدم! تو مجھے یہ کیوں سمجھاتا ہے کہ فریاد و فغاں

بند کر اور محبوب کی بزمِ عیش درہم برہم نہ کر ؟ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اس بزم میں تو میری فریاد وفغاں کو بھی نغمے کی حیثیت حاصل ہے، پھر اس سے اس کی محفلِ عیش کیونکر مکدّر ہو گی ؟

دوسرے مصرع کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، اوّل یہ کہ محبوب میری فریاد وفغاں سے بیحد خوش ہوتا ہے، گویا میرا نالہ بھی نغمے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب نالہ نغمہ بن گیا تو محفلِ عیش میں خلل کیونکر پیدا ہو گا ؟ دوم میرے محبوب کا ماحول اس درجہ مسرّت خیز و نشاط افزا ہے کہ باہر سے فریاد وفغاں بھی وہاں پہنچے تو نغمے کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ دونوں صورتوں میں محبوب کی بزمِ عیش کے درہم برہم ہونے کا کوئی موقع نہیں۔

عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے
دعویِ جمعیتِ احباب، جائے خندہ ہے

ہے عدم میں غنچہ، محوِ عبرتِ انجامِ گل
یک جہاں زانو تأمل، در قفائے خندہ ہے

کلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام
ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر، ورنہ یاں
دلِ محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

۱۔ شرح: ہنسنے کے لیے لازم ہے کہ دانتوں کی شوخی کا کرشمہ نمایاں کیا جائے دوستوں کی جمعیت کا دعویٰ ہنسی کا مقام ہے۔

مطلب یہ کہ ہنستے وقت

دانت نمایاں ہوتے ہیں۔ اکٹھے ہونے کے باوجود تمام دانت الگ الگ ہیں اور کبھی یکساں نہیں رہ سکتے۔ یہی کیفیت دوستوں کے مجمع کی ہے۔ جس طرح دانت طبعاً یکے بعد دیگرے نکل جاتے ہیں، اسی طرح احباب کا مجمع بھی رفتہ رفتہ بکھر جائے گا، لہذا ان کے اکٹھے رہنے کا جو دعویٰ کیا جاتا ہے، اس پر تعریفاً ہنس دینا بالکل بجا ہے۔

۲- لغات۔ یک جہاں زانو تاٴمل : حد درجہ فکر و تاٴمل۔ زانو کا لفظ اس لیے لائے کہ غور و فکر کے وقت انسان عموماً سر زانو پر رکھ لیتا ہے۔

قفا : پیچھے۔

شرح : کلی کا منہ بند ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عدم میں بیٹھی ہوئی ہے اور پھول کے انجام سے عبرت حاصل کرنے میں مصروف ہے۔ ہنسی کے بعد بحد غور و فکر کا مقام ہے۔

مطلب یہ کہ کلی کھلے گی جسے پھول کا ہنسنا قرار دیا۔ خوشبو بکھرے گی پھر پھول کی پنکھڑیاں ایک ایک کر کے گر جائیں گی اور وہ ناپید ہو جائے گا گویا ہنسنے کا انجام عبرت کا مقام ہے اور کلی جب تک بند ہے، اسی سے کسب عبرت کر رہی ہے۔

۳- لغات۔ کلفت : تکلیف، کدورت۔

دنداں در دل افشردن : دانت دل میں گڑو دینا۔ فارسی محاورہ جو تکلیف دہ حالات کو صبر سے برداشت کر لینے کے لیے بولا جاتا ہے۔

شرح : میں افسردہ، پژمردہ اور دل تنگ ہوں۔ اس حالت کی تکلیف کے لیے اضطراب و بیقراری کا عیش حرام ہے۔

مطلب یہ ہے کہ افسردگی کا تقاضا ہی انقباض اور دل گرفتگی ہے۔ اسے بے تابی اور بے چینی کی فارغ البالی کیونکر نصیب ہو سکتی ہے؟ بے چینی اور بے تابی حرکت و جنبش کی متقاضی ہے۔ ظاہر ہے کہ افسردگی

اور دل گرفتگی کے مقابلے میں بیتابی عیش کی حالت ہے اور افسردگی کو عیش نصیب نہیں ہو سکتا، ورنہ دانت دل میں گاڑ دینا یعنی ہر قسم کے مکروہات صبر سے برداشت کر لینا ہی ہنسی کی بنیاد ہے۔

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اس زندگی میں ہزاروں تکلیف دہ صورتیں پیش آتی ہیں۔ بر ایں ہمہ لوگ مسرت و شادمانی میں بھی مصروف پائے جاتے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ وہ مکروہات صبر سے برداشت کر لیتے ہیں، یوں ان کے لیے ہنسی کا موقع پیدا ہو جاتا ہے، لیکن افسردگی کے لیے بے تابی کا عیش ممکن نہیں۔

۴۔ **لغات۔ محیط** : احاطہ کرنے والا، فارسی والے اسے بحر بیکراں کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، کیونکہ پانی نے زمین کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔

شرح : میرے دوست اور ہمدم اندرونی شورش کے قائل نہیں، ورنہ ان پر واضح ہو جائے کہ میرا دل گریے کا ایک بیکراں سمندر ہے اور لب بڑی بے تکلفی سے خندہ زنی میں مشغول ہیں۔ یعنی میرے اندرونی حالات ظاہر پر اثر انداز نہیں ہوتے اور ظاہری آثار کو میرے اندرونی حالات کا نقشہ نہ سمجھنا چاہیے۔ میں اندر ہی اندر جل رہا ہوں، لیکن کسی پر یہ راز ظاہر نہیں ہونے دیتا، کیونکہ برابر ہنستا رہتا ہوں اور دل کی کیفیت کسی پر آشکارا نہیں ہوتی۔

۱۔ لغات

حسنِ بے پروا، خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
آئنہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

تاکجا اے آگہی! رنگِ تماشا باختن
چشمِ واگردیدہ، آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

چونکہ غور و فکر کے وقت انسان عموماً گھٹنے پر سر رکھ لیتا ہے۔ اس لیے فارسی والے زانو کو آئینہ بھی کہتے ہیں۔

اختراع : ایجاد

شرح : بلاشبہ حسن بالکل بے پروا اور بے نیاز ہے۔ بہ ایں ہمہ اسے جلوہ آرائی کا خاص شوق ہے۔ گویا وہ برابر جلوے کی متاع کا خریدار چلا جاتا ہے۔ وہ زانو پر آئینہ رکھ کر بناؤ سنگار کرتا ہے تو مقصد یہ ہوتا ہے کہ جلوہ آرائی کے نئے نئے طریقے سوچے۔

۲۔ **لغات۔ رنگ باختن** : رنگ شکستن یعنی رنگ کا بدلنا اور متغیر ہونا۔

شرح : اے علم و شعور! تم کب تک عالمِ امکان کے دیکھنے کا رنگ بدلتے رہو گے؟ یعنی کب تک مختلف صورتوں میں اس دنیا کی چیزوں پر نظریں جمائے رکھو گے؟ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ آنکھ ایک مرتبہ کھلتی ہے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ جلوے نے رخصت کے لیے آغوش کھول دی ہے؟ گویا وہ اس درجہ آنی و فانی ہے کہ ہر پلک جھپکنے میں رخصت ہوتا چلا جا رہا ہے۔

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

۱۔ **شرح** : اے محبوبِ حقیقی! تجھ سے گفتگو کا راستہ اس وقت تک کھلنا مشکل ہے۔ جب

افسردگی نہیں، طرب انشائے التفات
ہاں، درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی
رونے سے اے ندیم! ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی
چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی
کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی
لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل
تا چند باغبانیٔ صحرا کرے کوئی
ناکامیٔ نگاہ ہے، برقِ نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہر شکست
نقصاں نہیں، جنوں سے جو سودا کرے کوئی
سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنّا کرے کوئی
ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز
یہ درد وہ نہیں ہے کہ پیدا کرے کوئی۔

تنگ دل
پر زخم
کا منہ نہ
پیدا کر بنا
جائے۔
گویا جیب
تک تیرے
ساتھ عشق
کی حقیقی
تڑپ
پیدا نہ
ہو، وہ
ربط ضبط
قائم کر
لینا غیر
ممکن ہے،
جیسے اصطلاح
میں مسارت
و محادثت
کہتے ہیں۔
بہر حال ہم
اس دنیا میں
بات چیت
میں مستر

بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دُور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

سے کرتے ہیں وہ تیرے ساتھ بات چیت کے لیے کام نہیں دے سکتا۔ اس کے لیے دل پر عشق کا ایسا چرکا لگنا چاہیے، جو مُنہ کا کام دے سکے۔

۲۔ شرح: دنیا پوری کی پوری مجنوں کی وحشت کے باعث گردوغبار بن گئی۔ گویا زمین سے آسمان تک یہی گردوغبار پوری فضا پر حاوی ہو گیا۔ اب سوچنا چاہیے کہ لیلیٰ کے طرّے کو اس سے کیونکر بچایا جائے مطلب یہ کہ عشق نے یہاں ایسا ہنگامہ بپا کر رکھا ہے کہ اس میں حُسن کے لیے اپنی آرائش و زیبائش محفوظ رکھنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ لغات۔ طرب انشا: شادمانی پیدا کرنے والا۔
شرح: میں جس افسردگی اور دل گرفتگی میں مبتلا ہوں، اس میں محبوب کے التفات سے نشاط و شادمانی پیدا نہیں ہو سکتی۔ یعنی محض اس کی توجہ سے میری افسردگی کا ختم ہونا محال ہے، البتہ محبوب دردِ دین کر دل کے اندر جا بیٹھے تو میں سمجھوں کہ حالت بدلنے کی کوئی صورت پیدا ہوئی۔

۴۔ شرح: اے ہمدم! میں روتا ہوں تو تو مجھے ملامت کیوں کرنے لگا؟ آخر تو ہی بتا کہ دل کی گرہ کا نہ کھلنا کوئی کب تک گوارا کرے؟ کچھ نہ کچھ تو انتظام ہونا چاہیے۔ کبھی تو اس گرہ کا کھلنا بھی مناسب مان لینا چاہیے۔

۵۔ شرح: جب ہمارے جگر چیر لینے پر بھی محبوب ہمارے حال پوچھنے پر متوجہ نہ ہوا تو خدا کے لیے بتاؤ کہ اب گریبان کو رسوا کرنے کا

کیا فائدہ ہے ؛ یعنی چاکِ جگر جیسا عظیم القدر کارنامہ انجام دے چکنے کے بعد بھی مدعا حاصل نہ ہُوا تو کرتا پھاڑ لینے سے کیا بنے گا، جو چاکِ جگر کے مقابلے میں بالکل بے حقیقت ہے ؛

اس شعر میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ جو مقصد بڑی بڑی قربانیوں سے حاصل نہ ہو، اس کے لیے کمتر قربانیوں سے کام لینا یقیناً بے سود ہے ۔

۶ ۔ لغات ۔ لختِ جگر ؛ جگر کے ٹکڑے ۔

شرح ؛ مَیں صحرا میں چکر لگا رہا ہوں ۔ وہاں کا ہر کانٹا میرے جگر کے ٹکڑوں سے پھول کی شاخ بن گیا ہے ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کب تک صحرا میں باغبانی کا فرض انجام دیا جائے ؛ یعنی کب تک اس کے کانٹوں کو شاخہائے گل اور اس کی وسعت کو خیاباں بنانے کی کوشش کی جائے ۔

یہ خیال فارسی میں بھی ایک جگہ بڑی خوبی سے نظم کیا ہے ؛

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بہ خونِ دل
قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم

(ہم نے ہر کانٹے کو دل کے لہو سے لت پت کر دیا ہے، یوں ہم نے قانون بنا دیا ہے کہ صحرا میں باغبانی کیونکر کی جائے)

۷ ۔ شرح ؛ اے حُسنِ حقیقی ! تجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ دیکھنے والوں کی نگاہیں ناکام پلٹتی ہیں اور یہی ناکامی ان کے لیے ایسی بجلی بن جاتی ہے، جو تابِ نگاہ کا مال و متاع جلا کر خاک کر دیتی ہے ۔

۸ ۔ شرح ؛ جنون کی حالت میں سودا کر لینا نقصان کا باعث نہیں ہو سکتا، کیونکہ لڑکے مجنون پر جو اینٹ پتھر پھینکیں گے، ان میں سے ہر ایک ایسی سیپی بن جائے گا، جس کے اندر سے شکست کا موتی نکلے ۔

اس شعر کا پہلا مصرع صرف الفاظ کا ہیر پھیر ہے۔ شکست سے مراد ہے سر کا ٹوٹنا۔ اس ٹوٹنے کو موتی قرار دیا اور ہر سنگ وخشت کو صدف بنا لیا۔ بظاہر اینٹ پتھر کے بجائے موتی ملے۔ نقصان کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا، لیکن وہ موتی نہیں، جو بادشاہوں کے تاج اور حسینوں کے ہاروں کی زینت ہوتے ہیں، بلکہ سر اور ہاتھ پاؤں ٹوٹنے کے موتی، جو یقیناً نقصان ہے، مگر اس لیے نقصان نہیں سمجھا جا سکتا کہ دیوانے کو اینٹ پتھر ہی مطلوب ہوتے ہیں۔

۹۔ شرح : اے محبوب! تیرا وعدہ اس درجہ صبر آزما تھا کہ عمر اس کے پورا ہونے کا ساتھ نہ دے سکی۔ ظاہر ہے کہ تیری تمنا زندگی ہی میں کی جا سکتی تھی، اب زندگی گزر جانے کے بعد تمنا کی صورت کیا ہے؟ بہرحال یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ہماری عارضی عمر تیری آرزو کے لیے کافی نہیں۔

۱۰۔ شرح : جدت اور اپج کی فطرت ہی وحشت ہے۔ مطلب یہ کہ جو لوگ فطرۃً جدت اور اپج کا جوہر لے کر دنیا میں آتے ہیں، وہ مسلّمہ قواعد کی پابندی سے ضرور کم وبیش گریز کریں گے۔ اور وحشت کا خاصہ ہی یہ ہے کہ کسی ایک ضابطے کی پابندی نہ کی جائے۔ اگر ایسا کیا جائے تو نئی چیز کیونکر پیدا ہو؟ پھر دنیا نئی چیز بہ آسانی قبول نہیں کرتی، اس سے اک گونہ مایوسی پیدا ہوتی ہے، لیکن جن لوگوں کی فطرت میں اعلیٰ جوہر موجود ہوتے ہیں، وہ دنیا کے قبول وعدم قبول سے بے پروا ہو کر ضرور نئی چیزیں پیدا کرتے ہیں اور ان سے باز نہیں رہ سکتے۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جدت ایک درد ہے، جس سے کوئی عالی دماغ انسان باز نہیں رہ سکتا۔ یہ صورت بھی نکلتی ہے کہ نئی چیز پیدا کر کے اپنے آپ کو مایوسی کا تختۂ مشق بنانا ایک درد اور ایک دکھ ہے، لیکن جو

لوگ خاص جوہر لے کر آتے ہیں، وہ اس قسم کے درد پیدا کرنے میں متامل نہیں ہوتے۔

۱۱۔ **شرح** : جنون یا صاحب جنون کے لیے اصل شغل یہ ہے کہ لباس تار تار کرے، گھر بار چھوڑے، اعزّہ و احباب سے منہ موڑے اور صحرا میں نکل جائے۔ وہاں کوئی کام نہ ہو تو سر پیٹنے کے سوا کیا شغل باقی رہ جاتا ہے؟ تاہم سر پیٹنے کے لیے ہاتھ سلامت ہونے چاہئیں۔ یہ بتاؤ کہ جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو کوئی کیا کرے؟

ظاہر ہے کہ سر پیٹنا کوئی اچھا شغل نہیں، جس سے مفید نتیجہ برآمد ہو سکے، لیکن بیچارگی کا ایسا دور بھی آ سکتا ہے کہ عبث مشغلہ جاری رکھنے کی صورت ہی ناپید ہو جائے۔

۱۲۔ **شرح** : اے اسدؔ! شعر گوئی اور سخن وری کی شمع میں دلآویز روشنی پیدا کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کے لیے طویل فرصت درکار ہے، نیز لازم ہے کہ جو شخص ایسی روشنی کا خواہاں ہو، وہ پہلے پگھلا ہُوا دل پیدا کرے۔

ظاہر ہے کہ جب تک دل میں رقّت نہ ہو گی، شعر میں سوز و گداز آ ہی نہیں سکتا۔ پھر لمبی مدّت تک ریاضت کے بغیر کام نہیں بنتا۔

ابنِ مریم ہُوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

شرع و آئین پر مدار سہی — ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

چال جیسے کڑی کمان کا تیر — دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہے — وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ — کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی — نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند — کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے؟ — اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ — کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

۱۔ شرح : ابنِ مریمؑ یعنی حضرت عیسیٰؑ ہیں تو ہُوا کریں۔ بلاشبہ ان کے اعجاز سے بیمار شفا پاتے تھے اور مردے زندہ ہوتے تھے لیکن میرے لیے تو اصل شے اپنا دُکھ ہے۔ اس کی کوئی دوا تجویز کر دے تو میں جانوں اور مانوں۔

۲۔ شرح : میں نے مانا کہ مقدمے کا فیصلہ شریعت اور قانون کے مطابق ہوگا، کیونکہ مدار و انحصار انھیں دو چیزوں پر ہے۔ اسلامی حکومت میں شریعت کی بنا پر فیصلہ کیا جائے گا اور غیر اسلامی حکومت میں قانون پیشِ نظر رہے گا، تاہم دونوں میں گواہ لیے جائیں گے آلاتِ قتل پیش ہوں گے۔ دیکھا جائے گا کہ مقتول کو کس کس آلے سے کتنی ضربیں لگیں، لیکن میرا قاتل تو کسی مادی ہتھیار سے کام ہی نہیں لیتا بتاؤ، اس سے کیونکر باز پرس کی جائے گی۔

۳۔ لغات ۔ کڑی کمان : وہ کمان، جو سخت ہونے کے باعث

بہت زور لگا کر کھینچی جاتی ہے اور اس کا تیر نہایت تیزی سے بہت دور پہنچ جاتا ہے۔

شرح: میرے محبوب کی چال ایسی ہے، جیسے کڑی کمان کا تیر ہو۔ ایسے محبوب کے دل میں جگہ پیدا کرنا کارے دارد۔ اس میں کوئی کامیاب ہو تو دیکھنا چاہیے۔

۴۔ لغات: بات پر زبان کٹنا: بات منہ سے نکلتے ہی سامع کا غصے سے سر ہو جانا۔ اور خاموشی کے سوا چارہ نہ رہنا۔

شرح: وہاں یہ حالت ہے کہ بات بات پر غصے سے سر ہو جاتے ہیں۔ لب کھولتے ہی جان نکلتی ہے۔ عافیت اسی میں نظر آتی ہے کہ جو کچھ وہ کہیں، چپ چاپ سنتے جائیں، یہاں تک کہ گالیاں بھی دیں تو کچھ نہ بولیں۔

۵۔ شرح: کچھ نہیں کہہ سکتا کہ جنون کی حالت میں منہ سے کیا کچھ نکل رہا ہے؛ سلیقے کے ساتھ مناسب حال بات کہنا میرے لیے ممکن نہیں یہی دعا کر سکتا ہوں کہ خدا کرے، کوئی کچھ نہ سمجھے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ "کچھ نہ سمجھے" میں دو پہلو نکلتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ غرض یہی ہے کوئی سمجھے اور التفات کرے، مگر اپنے بکنے پر آپ ہی تشنیع کی ہے اور غالباً یہی معنی مقصود ہیں۔ دوسرے یہ کہ کوئی کچھ نہ سمجھے تاکہ راز فاش نہ ہو۔

۶-۹۔ لغات: خضر و سکندر: مشہور ہے (اگرچہ کوئی مستند تاریخی واقعہ نہیں) کہ سکندر نے خضرؑ کو آبِ حیواں کے لیے رہنما بنایا تاکہ دونوں پانی پی لیں اور آبِ حیواں کے متعلق عام روایت کے مطابق ہمیشہ کی زندگی پائیں، لیکن خضرؑ نے خود تو آبِ حیواں نوش کر لیا اور سکندر محروم رہ گیا۔ اسی

لیے خواجہ حافظؔ نے کہا ہے :

تہیدستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل
کہ خضرؑ از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

شرح : اگر کوئی بُرا کہے تو اس پر کان دھرنے کی ضرورت نہیں۔ کان دھرو گے تو دل مکدر ہوگا اور جواب دینے کی آزمائش میں مبتلا ہو جاؤ گے اگر کسی سے کوئی برائی سرزد ہو تو اسے جتاؤ نہیں، جتانے سے اس کا دل بُرا ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ضد میں آکر وہ اس بُرائی کے لیے اور جری ہو جائے۔

اگر کوئی شخص غلط راستے پر چلے تو اسے روک لو۔ اگر کسی شخص سے غلطی ہو جائے تو معاف کر دو۔

مولانا طباطبائی چھٹے اور ساتویں شعر کے متعلق فرماتے ہیں کہ تشابہ ترکیب سے بندش میں حسن پیدا ہُوا ہے اور پہلے شعر میں کہنے کی تکرار بھی لطف سے خالی نہیں۔

کون ہے، جسے کوئی نہ کوئی حاجت نہ ہو؟ اگر تم کسی کے پاس کوئی ضرورت لے جاؤ اور وہ پوری نہ ہو تو شکایت نہ کرو۔ یہ سمجھو کہ ضرورت مند بہت زیادہ ہیں اور کوئی بھی شخص ان سب کی ضرورت پوری نہیں کرسکتا۔

سکندر نے خضرؑ کو رہنما بنایا تھا، مگر نتیجہ کیا نکلا؟ وہ خود آبِ حیات پی کر ہمیشہ کی زندگی پا گئے اور سکندر کو ایک گھونٹ بھی نہ پلایا، چنانچہ وہ بتیس سال ہی کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ یہ مثال سب کے سامنے ہے اب کوئی کسی کو کس بھروسے پر رہنما بنائے؟

۱۰۔ **شرح :** اے غالبؔ! جب امید ہی باقی نہ رہی تو کسی کا گلہ شکوہ کرنے سے کیا فائدہ ہے اور کیوں کیا جائے؟ گلہ شکوہ ہمیشہ اس سے کیا جاتا ہے، جس سے کچھ امید ہو۔ جب بنیاد ہی موجود نہ ہو تو عمارت بنانے

سے کیا مطلب ؟

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :

اس کی تعریف کیا کرے کوئی

نہایت عالی مضمون ہے، جس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ مطلب یہ ہے کہ جس شخص سے امید منقطع ہو گئی ہو، پھر اس کا گلہ کیوں کریں ؟ فائدہ تو کچھ ہو گا نہیں، اور نفرت و دشمنی پیدا ہو گی۔

بہت سہی غم گیتی، شراب کم کیا ہے
غلام ساقیٔ کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے

تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے
رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

۱۔ شرح : زمانے کا غم کتنا ہی زیادہ ہو، میں پوچھتا ہوں، کیا شراب کم ہے ؟ اگر غموں نے ستایا تو شراب پی کر انھیں بھلانا ممکن ہو گا۔ میں ساقیٔ کوثر کا غلام ہوں۔ دنیا میں جتنے بھی غم پیش آئے، آقا کی طرف سے مجھے شراب کوثر ملے گی اور سب غم دُھل جائیں گے، پھر میں غم کیوں کروں ؟

۲۔ شرح : اے محبوب ! ہم تمھارا طور طریقہ خوب جانتے ہیں۔ کہتے ہو کہ مجھ پر ظلم نہیں ہوا، لیکن کیا یہ صحیح نہیں کہ تم نے رقیب پر مہربانیاں شروع کر دی ہیں ؟ پھر بتاؤ ظلم کیا ہوتا ہے ؟

۲۔ شرح : غالب کے قلم سے شعروسخن کے جو شعلے برسے ہیں۔ ان کا تو ہمیں بھی اعتراف ہے اور یقین کیے بیٹھے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اب اس بے مثال شاعر میں دم کہاں ہے ؟

باغ، پاکر خفقانی، یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گُل افعی نظر آتا ہے مجھے

جوہرِ تیغ بہ سرچشمۂ دیگر معلوم
ہوں میں وہ سبزہ کہ زہرآب اُگاتا ہے مجھے

مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے
آئنہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے

نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک
آسماں بیضۂ قُمری نظر آتا ہے مجھے

زندگی میں تو وُہ محفل سے اٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مرگئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

۱۔ لغات : خفقانی : خفقان کا مریض۔ خفقان ایک بیماری ہے، جس میں دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی ہے، بیمار پر گھبراہٹ طاری رہتی ہے۔ خواہ مخواہ اس کے دل میں وحشت انگیز توہمات پیدا ہوتے ہیں۔ معمولی چیزیں بھی اس کی نظر میں خوفناک بن جاتی ہیں اور وہ ڈرتا بہت ہے۔

شرح : باغ نے جب دیکھا کہ میں خفقان کے مرض میں مبتلا ہوں اور وہم و وسواس کی بنا پر معمولی چیزیں بھی مجھے خوفناک نظر آتی ہیں تو ڈرانا شروع

کردیا، یہاں تک کہ پھول کی شاخ کا سایہ بھی مجھے کالا زہریلا سانپ دکھائی دیتا ہے۔

بجنوری مرحوم اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ہندوستان میں مغلوں کے زمانے کے بہت سے باغ ویران اور غیر آباد پڑے ہیں۔ سنگ مرمر اور سنگ رخام کی بارہ دریاں شکستہ و افتادہ ہیں۔ جہاں شہزادے اور بیگمات رہتی تھیں، وہاں اب جنّات اور پریوں کا مسکن ہے۔ جن روشوں پر کافوری شمعیں روشن تھیں، وہاں اب جگنو اڑتے ہیں۔ نباتات نے دست انسانی کی قطع و بُرید سے آزادی پاکر ایک عجیب آوارگی اختیار کرلی ہے۔ پانی کے پاس درختوں کے سائے میں جو پودے ہوتے ہیں، وہ اکثر طویل اور نازک تن ہوتے ہیں، جن کی شاخیں پتلی ہونے کے باعث پھول کے وزن سے بھی جھک جاتی ہیں، اور ہوا کے ذرا سے جھونکے میں اِدھر سے اُدھر لہرانے لگتی ہیں۔ شام کے وقت ان شاخوں کا عکس سبزے پر بعینہٖ سانپ کی طرح نظر آتا ہے۔ اگر طبیعت پر مانیا، وحشت اور وہم کا اثر ہو تو اس افعی سے ڈرنا کوئی عجب نہیں"۔

۲۔ لغات۔ زہراب: وزہریلا پانی۔

شرح: جس طرح تلوار کو زہر میں بجھانے سے اس کے جوہروں پر سبزی مائل رنگ آجاتا ہے، اسی طرح میں وہ سبزہ ہوں، جسے زہر بھرا پانی اُگاتا ہے۔

۳۔ شرح: میرا دل ٹوٹ گیا۔ ایک آئینے کے بے شمار ٹکڑے ہوگئے۔ اب میرے مقصد کا عکس ایک ایک ٹکڑے میں نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مجھے آئینہ خانے میں لیے جا رہا ہے۔

۴۔ شرح : دنیا کا سرمایہ فریاد و فغاں ہے اور دنیا خاک کی ایک مٹی ہے۔ آسمان مجھے قمری کا انڈا نظر آتا ہے۔

آسمان کو قمری کا انڈا اس لیے کہا کہ قمری کا رنگ خاکستری ہوتا ہے۔ چونکہ دنیا مشتِ خاک بن گئی، اس لیے آسمان اپنی ظاہری گولائی کے باعث قمری کا انڈا نظر آنے لگا۔

۵۔ شرح : جب میں جیتا تھا تو محبوب مجھے اپنی محفل سے نکلوا دیتا تھا۔ اب دیکھنا چاہیے کہ مرنے پر مجھے کون اٹھاتا ہے۔

"اٹھاتا ہے" کے دو معنی ہیں، اوّل، محفل سے اٹھانا، دوم جنازہ اٹھانا۔ اسی ایہام سے مرزا نے یہاں فائدہ اٹھایا ہے۔

روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی
اترائے کیوں نہ خاک سرِ رہگذار کی

جب اُسکے دیکھنے کے لیے آئیں بادشاہ
لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی

بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم ولے
کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

۱۔ لغات۔ کوکبہ: شاہی جلوس۔

شرح : راستے کی خاک خوش نصیبی پر کیوں نہ اترائے ؟ اس پر سے تو بادشاہ کی سواری یہ صورت جلوس گزری ہے۔

۲۔ لغات : نمود: نمائش، شہرت، ناموری۔

شرح : جب بادشاہ سلامت بہ نفس نفیس لالہ زار دیکھنے کے لیے آئیں تو وہ کیوں لوگوں میں نمود و نمائش پر آمادہ نہ ہو اور شہرت و ناموری حاصل

نہ کرے۔

۲۔ شرح: ہم باغ کی سیر کے بھوکے نہیں، لیکن بہار کی ہَوا ہے، جس کی خوشگواری میں کلام کی گنجائش نہیں، پھر کیوں نہ کھائیں؟

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل؟ کیا رہے گا اس کی گردن پر؟
وہ خوں جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے

نکلنا خُلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھُل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی اس دَور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے

۱۔ شرح
خواجہ حالی فرماتے ہیں: "خواہش پر دم نکلنا مطلب ہے اس کے پورا ہونے کے لیے جلدی کرنا، چنانچہ کہتے ہیں، کیوں دم نکلا جاتا ہے یا کیوں مرے جاتے ہو، یعنی جلدی کرتے ہو؟ پہلے مصرع میں بہ مقتضائے مقام یہ الفاظ کہ

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ تیغ ستم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

ذرا کر زور سینے پر کہ تیر پر ستم نکلے
جو وہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ سے اٹھا ظالم
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

کہاں مے خانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

"دل میں باقی ہیں" "مقدر ماننے چاہئیں۔" دل میں ہزاروں خواہشیں ایسی باقی ہیں، جن میں سے ہر خواہش کو پورا کرنے کے لیے دم نکلا جا رہا ہے۔ میں نے مانا کہ میرے بہت سے ارمان نکل گئے، لیکن حقیقت حال کے اعتبار سے یہی کہا جا سکتا ہے کہ کم نکلے، کیونکہ جتنے نکلے، ان سے زیادہ پیدا ہوتے گئے۔

۲۔ **شرح** : میرا قاتل تلوار چلانے میں ڈر کیوں رہا ہے؟ اگر میں قتل ہو گیا تو اس کی گردن پر کیا رہ جائے گا؟ وہ خون جو میری آنکھوں سے لگاتار بہتا رہا۔

مقتول کا خون یقیناً قاتل کی گردن پر رہتا ہے۔ مرزا قتل کے اس پہلو کو بے حقیقت ثابت کرنے کے لیے فرماتے ہیں کہ اے قاتل! اگر میرا خون تیری گردن پر رہ گیا تو اس کی حقیقت کیا ہے؟ عمر بھر تو یہ آنکھوں سے

بتا رہا۔

۳۔ شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"دوسرے مصرع میں "بہت" کے لفظ پر زور دینا چاہیے تاکہ
آدمؑ کی نسبت زیادہ بے آبروئی کے ساتھ نکلنا ثابت ہو۔"

اس شعر میں متعدد خوبیاں ہیں، مثلاً :

۱۔ کوچۂ محبوب کو بالواسطہ خلد قرار دے دیا۔

۲۔ حضرت آدمؑ کا بہشت سے نکالا جانا تو سب کو معلوم ہے لیکن بے آبروئی کا پہلو اس شعر سے پیشتر ابھرا نہیں تھا۔

۳۔ شعر کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ حضرت آدمؑ کا بہشت سے نکلنا بھی بے آبروئی کا باعث تو ضرور تھا، مگر وہ بے آبروئی ایسی نہ تھی، جیسی ہمیں پیش آئی، کیونکہ صاف معلوم ہوتا ہے، مرزا کو نکلنے یا نکالے جانے میں جو حالت پیش آئی، اس کے سامنے حضرت آدمؑ کی بے آبروئی بھی معمولی چیز رہ گئی۔

۴۔ لغات۔ بھرم : اعتبار، ساکھ، عزت، راز۔

شرح : اے ستم گر! تو اپنے قد کی درازی پر بہت ناز کر رہا ہے لیکن اگر تیری پرپیچ و خم زلف کے پیچ و خم نکل جائیں تو ابھی درازیٔ قد کی ساکھ جاتی رہے اور اعتبار اٹھ جائے۔

مطلب یہ کہ قد اسی وقت تک کشیدہ نظر آ رہا ہے، جب تک زلف کے پیچ و خم نہیں کھلے۔ اس سلسلے میں ایک خاص نکتہ قابلِ غور ہے۔ اگر زلف کے پیچ و خم قائم رہیں تو وہ زیادہ سے زیادہ کمر تک پہنچے گی۔ اور درازیٔ قد پر بہت موزوں نظر آئے گی، لیکن اگر زلف کے تمام پیچ و خم کھول دیے جائیں تو وہ کمر سے بھی بہت نیچے آ جائے گی اور قامتِ محبوب کی درازی اس میں گم ہو جائے گی۔ یہ نظارے کا معاملہ ہے جس کا تجربہ ہر وقت کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ **شرح** : مرزا کو معلوم ہے کہ جس بستی میں ان کا محبوب رہتا ہے، اس کے اکثر باشندوں سے محبوب کا نامہ و پیام ہے۔ یہ حال دیکھ کر مرزا کو خیال ہوا کہ دیکھنا چاہیے، مختلف لوگ اسے کیا کچھ لکھواتے ہیں چنانچہ محرری اور منشی گری کی خدمت بہ طور خود اپنے ذمّے لے لی۔ اب طریقہ یہ اختیار کر لیا کہ صبح ہوتے ہی قلم کان پر رکھ کر نکل پڑے اور ہر ایک سے پوچھتے جاتے کہ جسے محبوب کو خط لکھوانا ہو، وہ ہم سے لکھوا لے۔

جب تعلیم عام نہ تھی تو ہر بستی میں صرف چند آدمی ہوتے تھے، جن سے لوگ خط لکھواتے تھے۔ اُن دنوں آج کل کی طرح انڈی پنڈنٹ نہ تھے۔ منشی لوگ قلم بنا کر کان پر رکھ لیتے تھے، جو بندش دستار کے باعث وہاں بالکل محفوظ رہتی تھی۔ جہاں کسی کو لکھوانے کی ضرورت پڑتی، بیٹھ جاتے اور قلم کان سے کھینچ کر لکھ دیتے، پھر وہیں ٹھونس لیتے۔ اس میں فائدہ یہ تھا کہ قلم کی سیاہی سے کپڑے خراب نہیں ہوتے تھے۔

۶۔ **لغات**۔ **بادہ آشامی** : شراب نوشی۔

جامِ جم : مشہور ہے کہ شراب جمشید نے ایجاد کی تھی، اس لیے شراب کا پیالہ اسی سے منسوب ہوا، اگرچہ یہ محض افسانہ۔

شرح : موجودہ دور میں شراب نوشی کی نسبت مجھ سے کی گئی، گویا مدت دراز کے بعد پھر ایسا زمانہ آیا، جس میں جمشید کے پیالے کا ظہور ہو۔ مرزا کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جو نسبت شراب کو جمشید سے تھی، وہی نسبت اسے آج مجھ سے ہے۔ زمانہ گزر گیا، لیکن ایسا دور کبھی نہ آیا۔ لہٰذا میں ہی ہوں، جس کی بدولت جامِ جمشید کا دور از سرِ نو تازہ ہو گا۔

۷۔ **شرح** : ہم جن لوگوں سے اُمید رکھتے تھے کہ وہ ہمارے دل کے زخم دیکھیں گے اور ان کے لیے مرہم کا انتظام کریں گے۔ جب ان کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ تو ہم سے بھی بڑھ کر تیغِ ستم کے زخمی ہیں۔

مطلب یہ کہ جو لوگ اپنے آپ کو روزگار کے چرکوں سے بچا نہ سکے اور زخم تک چکنے کے بعد ان سے مداوا بن نہ آیا، ان سے ہمارے زخموں کی دوا کیونکر ملے گی؟

۸۔ **شرح** : عشق و محبّت میں مرنا جینا ایک حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی کھلی ہوئی مثال یہ ہے کہ جس کافر پر ہم مرتے ہیں، یعنی اس سے انتہائی محبت کرتے ہیں، اسی کا دیدار ہمارے لیے زندگی کا سامان ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اس مقام پر مرنے جینے میں کوئی فرق نہیں۔

۹۔ **شرح** : اے غالب! کہاں شراب خانے کا دروازہ اور کہاں واعظ؟ ان دونوں میں کیا مناسبت ہے؟ کیا یہ امید ہو سکتی ہے کہ واعظ شراب خانے کے دروازے پر ملے گا؟ ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ کل ہم پی کر نکلے تو حضرت واعظ بھی اندر داخل ہو رہے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بھیڑ چھٹی دیکھی تو میدان خالی پا کر اندر چلے گئے۔ بیشک شراب ایسی ہی شے ہے، جسے کوئی چھوڑ نہیں سکتا۔ کھلم کھلا نہیں پئے گا تو چھپ چھپا کر ضرور نوش کرے گا۔

کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے
بے تکلف اے شرارِ جستہ کیا ہو جائیے

بیضہ آسا ننگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس
از سرِ نو زندگی ہو، گر رہا ہو جائیے

۱۔ **لغات**:

شرارِ جستہ: بھڑکی ہوئی چنگاری۔

شرح: بھڑکی ہوئی

چنگاری کو از خود رفتگی کے عالم میں دیکھا تو اسی سے پوچھتے ہیں، اگر ہم آواز کی طرح نہایت سبک اور لطیف شے بن جائیں تو پہاڑ جیسا پر وقار وجود ہمیں بار خاطر سمجھ کر لوٹا دیتا ہے۔ پھر اے بھڑکی ہوئی چنگاری! تو ہی بتا کہ ہم کیا بن جائیں؟

پہاڑ کے لیے آواز کا بار خاطر بننا اور لوٹا دینا مشاہدے کا معاملہ ہے۔ جب پہاڑ میں بلند آواز سے بولیں گے تو آواز ٹیلوں سے ٹکرا کر گونجتی ہوئی گم ہو جائے گی۔ اس سے مرزا نے یہ مضمون نکالا کہ صدا جیسی ہلکی چیز بھی پہاڑ جیسے عظیم القدر وجود کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ وہ اسے دل کے لیے بوجھ سمجھتا ہے، اسی وجہ سے واپس کر دیتا ہے۔ اب حیران ہیں کہ کیا بن کر زندگی گزاریں!

۲۔ **لغات**۔ بیضہ آسا: انڈے کی طرح

شرح: پنجرے کا گوشہ انڈے کی طرح بال و پر گوارا نہیں کرتا، یعنی بال و پر کو باعث ننگ سمجھتا ہے۔ معلوم ہے کہ جو بچے انڈے سے نکلتے ہیں، ان کے بھی بال و پر نہیں ہوتے۔ اگر مجھے پنجرے سے رہائی مل جائے تو یقیناً نئے سرے سے زندگی پاؤں۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں:

> "مصنف نے ثابت کیا کہ طائر کی نئی زندگی بیضے سے نکلنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کنج قفس سے یعنی بیضۂ فلک سے رہا ہونے کے بعد نئی زندگی عالم ارواح میں شروع ہو گی۔"

مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے
موجِ شراب یک مژہ ٔ خواب ناک ہے

جز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو
جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد
صحرا ہماری آنکھ میں یک مُشتِ خاک ہے

۱۔ شرح: ساقی کی ادائے تغافل نے مستی کو بھی ہلاک کر رکھا ہے۔ شراب کی لہر پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسی پلک ہے، جس پر نیند کا غلبہ ہے، یعنی اونگھ رہی ہے۔

۲۔ شرح: اب دل میں تیغِ ناز کا زخم کھانے کے سوا کوئی تمنا نہیں حال یہ ہے کہ میرے خیال کا گریبان بھی تیرے ہاتھوں سے تار تار ہو گیا ہے۔

۳۔ شرح: اے اسد! جنون نے ایسا جوش مارا کہ ہمیں کچھ نظر نہیں آتا۔ گویا صحرا خاک کی ایک مٹھی تھی، جو ہماری آنکھ میں جھونک دی گئی۔ اس طرح بصیرت زائل ہو گئی۔

لبِ عیسٰی کی جُنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگین ہے

لغات:
گہوارہ جنبانی: پنگورا ہلانا۔
لعلِ بُتاں: محبوبوں کے لب۔
سنگین خواب: حد درجہ گہری نیند۔

شرح: قاعدہ ہے کہ بچّے کو سلانے کے لیے پنگورا آہستہ

آہستہ ہلاتے رہتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ مُردوں کو زندہ کرتے تھے تو قم باذن اللہ کہتے تھے۔ اس طرح ان کے لب ہلتے تھے۔

فرماتے ہیں کہ جو لوگ محبوبوں کے لب کے مارے ہوئے ہیں، وہ ایسی گہری نیند سو گئے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ انہیں قُم باذن اللہ کہتے ہیں تو اس جنبشِ لب سے ان کا پنگورا ہلنے لگتا ہے، گویا سونے والوں کی نیند اور گہری ہو جاتی ہے۔

آمدِ سیلاب طوفانِ صدائے آب ہے !
نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

بزمِ مے وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا
شیشے میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

۱۔ لغات:
جادہ: پگ ڈنڈی

شرح: سیلاب آ رہا ہے اور پانی کے زور شور نے طوفان کی صورت اختیار کر لی ہے۔ کیفیت یہ ہے کہ پاؤں کے نشان نے بھی پگ ڈنڈی کو انگلی سمجھ کر کان میں رکھ لیا ہے۔

کان میں انگلی رکھ لی جائے تو باہر کی آواز کم ہو جاتی ہے۔ پاؤں کا نشان کان سے مشابہ ہوتا ہے۔ اب مرزا صاحب کا کمال دیکھیے کہ سیل آ رہا ہے۔ اس کی آواز سے دشت و جبل گونج رہے ہیں۔ سب پر دہشت طاری ہے۔ یہاں تک کہ نقشِ پا بھی اس سے فارغ نہیں۔ اسے اور کچھ نہ ملا تو پگ ڈنڈی کو انگلی سمجھ کر کان میں رکھ لیا۔

۲۔ شرح: کس محبوب کی مست آنکھوں نے شراب کی مجلس کو وحشت کا گھر بنا دیا اور صراحی میں شراب کی لہر نبضِ پری بن کر چھپ گئی۔

اب اس شعر کی مناسبتوں پر غور فرمایئے ، بزمِ مے ، چشمِ مست ، شیشہ ، موجِ بادہ ، پھر وحشت کدہ ، پری ، شیشہ ، کیونکہ پریاں شیشے ہی میں اتارتے ہیں ۔ نبض ، پنہاں ، موج بادہ ۔

شرح :

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنّا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آئے

میں بھی تمنّا کی نیرنگی کا تماشائی ہوں ، یعنی دیکھ رہا ہوں کہ تمنّا کیا کیا رنگ دکھاتی ہے ۔ میرا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ جو مدعا جی میں ہے ، وہ ضرور پورا ہو جائے ۔

شرح :

سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

جس طرح کوئی چیز لکھتے وقت کاغذ پر سیاہی گر جاتی ہے ، اُسی طرح میری تقدیر میں فراق کی راتوں کی تصویر بن گئی ۔

مطلب یہ کہ شبہائے فراق کا معاملہ تحریر سے کوئی تعلق نہیں رکھتا ، یعنی یہ نہیں لکھا کہ کتنی دیر تک اور کس کس طرح میں دُکھ اٹھاؤں گا اور کڑیاں جھیلوں گا ۔ ان کی جگہ سیاہی گرا دی اور اسی میں سب کچھ آگیا ۔

ہجوم نالہ حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے
خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

تکلف برطرف، ہے جاں ستاں تر لطفِ بدخوباں
نگاہِ بے حجابِ نازِ تیغِ تیزِ عریاں ہے

ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی
کہ صبحِ عید مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے

دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دست گرداں ہے

غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

۱۔ لغات: خس بدنداں: پہلے لکھ چکے ہیں کہ جب دو لشکروں میں سے کوئی ایک مغلوب ہو جاتا تو وہ اظہارِ عجز کے لیے تنکے دانتوں میں دبا لیتا۔ اس سے سمجھا جاتا کہ لڑائی ختم کرنے اور شکست مان لینے کا اعلان ہو گیا۔

شرح: فریاد و فغاں کا ہجوم ہے، لیکن حیرانی ایک آہ کرنے سے بھی عاجز ہے۔ حیرانی کا خاصہ خاموشی ہے۔ یعنی اس نے سیکڑوں نیستانوں کا ریشہ گھاس کے تنکے کی جگہ دانتوں میں دبا لیا ہے۔ ریشۂ نیستاں اس لیے لائے کہ فریاد و فغاں نے ہی کے ذریعے سے ہوتی ہے، گویا وہ فریاد کی جڑ ہے۔ چونکہ نالوں کا ہجوم تھا، اس لیے جو ریشہ دانتوں میں لیا وہ ایک نیستاں کا نہیں، بلکہ سیکڑوں نیستانوں کا تھا۔

۲۔ لغات۔ جاں ستاں تر: جان لینے میں زیادہ تیز و بیباک۔
بدخُوباں: بری خُو والے، یعنی محبوب۔

شرح : سچی بات یہ ہے کہ محبوبوں کی مہربانی ان کے تغافل سے بھی زیادہ جان لیوا ہے۔ جب وہ بے حجاب ہو کر نگاہِ ناز ڈالتے ہیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ تلوار میدان سے نکل آئی اور چلنے لگی۔

۳۔ **شرح** : غم کی اتنی کثرت تھی کہ خوشی کی پوری کیفیت برباد ہو گئی، یہاں تک کہ عید کی صبح بھی میرے لیے گریبان تار تار ہونے سے بدتر ہے۔

۴۔ **لغات۔ دست گرداں** : وہ چیز جو ایک ہاتھ سے قیمت دے کر دوسرے ہاتھ سے لی جائے، یعنی نقد بکنے والی چیز۔

شرح : اگر تُو ساقی سے شراب کا سودا کرنا چاہتا ہے تو دل اور دین لے آ۔ انھیں حوالے کر دے اور شراب لے لے۔ دنیا کے بازار میں شراب کا پیالہ ہی ایسی چیز ہے، جو نقد قیمت دے کر خریدا جاتا ہے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں: "شاعر کو متاعِ دست گرداں کہنا ایسا لطف رکھتا ہے کہ دل و دیں نیازِ مصنف کرنا چاہیے۔"

۵۔ **لغات۔ قلزمِ صرصر** : آندھی کا سمندر۔

مرجان : مونگا۔ سرخ رنگ کی ایک جمادات نما نباتات، جو سمندر میں شاخ در شاخ دُور دُور تک پھیل جاتی ہے۔

شرح : غمِ عاشق کی پرورش بلا کی گود میں کرتا ہے۔ یعنی ہر طرف سے بلاؤں کے طوفان اُٹھتے ہیں اور ان میں عاشق کی پرورش ہوتی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھنی چاہیے کہ اگر آندھی کا سمندر فرض کر لیا جائے تو اس سمندر میں ہمارا روشن دیا مونگے کی حیثیت رکھتا ہے۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ آندھی کا کتنا ہی زور ہو، وہ ہمارا چراغ بجھا نہیں سکتی۔ ہماری تو فطرت ہی یہ ہے کہ بلاؤں میں پرورش پاتے ہیں۔

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے
نگاہ دل سے تری سُرمہ سا نکلتی ہے
فشارِ تنگیٔ خلوت سے بنتی ہے شبنم
صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے
نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ
کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

۱۔ شرح : خاموشیوں میں ایسی ادائیں نکلتی ہیں، جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ تیری نگاہ دل سے نکلتی ہے تو سرمے سے بھری ہوتی آتی ہے۔
یہاں شاعر نے خاموشی اور سرمے کی مناسبت پیشِ نظر رکھی۔ مشہور ہے کہ کوئی شخص سرمہ کھا لے تو اس کا گلا بیٹھ جاتا ہے۔

۲۔ لغات۔ فشار : بھینچنا۔

شرح : صبا کبھی پھرتی پھراتی کلی کے اندر جا پہنچتی ہے تو جگہ کی تنگی سے بھینچ کر اوس بن جاتی ہے۔ گویا شبنم کوئی الگ شے نہیں، یہی صبا تھی، جو غنچے کی تنگی میں پہنچی تو چاروں طرف سے بھینچی گئی اور اسے پسینہ آگیا۔ انہیں قطروں کو ہم شبنم کہتے ہیں۔

۳۔ شرح : اُس تیغ نگاہ کی آب و تاب عاشق کے سینے سے کیا پوچھتے ہو؟ یہ وہی تیغ ہے، جس نے دروازے کے روزن میں زخم ڈال دیے اور ان سے ہوا نکلنے لگی۔

مطلب یہ کہ محبوب جس دروازے سے جھانکتا ہے، اس میں روزن حقیقۃً زخم ہیں اور زخم بھی ایسے گہرے کہ ان سے ہوا آتی ہے۔ پھر خود ہی اندازہ کر لیجیے کہ اس تیغ نگاہ نے سینۂ عاشق سے کیا سلوک کیا ہوگا
بجنوری مرحوم فرماتے ہیں :

"بھلا اطبا کے سوا کون اس بات سے واقف ہے کہ زخم خراب ہو جانے کی علامت یہ ہے، اس کے اندر ہوا نفوذ کرنے لگے۔ جو زخم سانس دینے لگتا ہے، وہ ضرور مہلک ثابت ہوتا ہے۔"

جس جا نسیمِ شانہ کشِ زلفِ یار ہے
نافہ دماغِ آہوئے دشتِ تتار ہے

کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو، اے خدا!
آئینہ فرشِ شش جہتِ انتظار ہے

ہے ذرہ ذرہ تنگیٔ جا سے غبارِ شوق
گر دام یہ ہے، وسعتِ صحرا شکار ہے

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ
نظارے کا مقدمہ پھر روبکار ہے

چھڑکے ہے شبنم آئنۂ برگِ گل پر آب
اے عندلیب! وقتِ وداعِ بہار ہے

پچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

۱۔ شرح:
جس جگہ نسیم گیسوے محبوب میں کنگھی کر رہی ہے اور اس کی درستی و آراستگی میں مصروف ہے، وہاں صحراے تاتار کے آہو کا دماغ نافہ بن گیا ہے۔

نافہ اس منجمد خون کو کہتے ہیں جو آہوئے ختن کے شکار کے بعد اس کی ناف میں جم جاتا ہے۔ عام دستور یہی ہے کہ شکاری تیے ہی ہرن کی ناف پکڑ

بے پردہ سوئے وادئ مجنوں گزر نہ کر
ہر ذرّے کے نقاب میں دلِ بیقرار ہے

اے عندلیب یک کفِ خس بہر آشیاں
طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی
اے بے دماغ آئنہ تمثال دار ہے

غفلت کفیل عمر و اسد ضامن نشاط
اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

کر اس پر ڈور باندھ دیتے ہیں تاکہ خون وہاں سے پھیلنے نہ پائے اور یک جا ہو کر بستہ ہو جائے لیکن جب نسیم نے زلفِ محبوب میں شانہ کشی شروع کی تو وہی خوشبو لے کر آ ہوئے دشتِ تتار تک بھی پہنچ گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی نافے کے بجائے دماغ نافہ بن گیا۔

۲۔ شرح: حیرت کس کے جلوے کا کھوج لگا رہی ہے کہ صورت یہ پیدا ہو گئی ہے، اگر انتظار کو ایک ایسا عام فرض کریں جس کی طرفیں عالم امکان کی طرح چھ ہوں یعنی پورب، پچھم، اُتر، دکھن، اوپر نیچے تو اس کے فرش پر آئینہ ہی آئینہ بچھا ہوا ہے، گویا وہ فرش سراسر آئینہ ہے۔

آئینہ ایک طرف حیرت کا مظہر ہے اور دوسری طرف انتظار کا۔

مولانا بجنوری فرماتے ہیں کہ عالم کو دیکھنے ہی سے معلوم ہوتا ہے ابھی کسی چیز کی کمی ہے۔ شش جہت آراستہ ہو رہے ہیں اور منتظر ہیں۔

بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس طرح انسانیت کی تکمیل باقی ہے، اسی طرح عالم کی تکمیل کا بھی انتظار ہے۔ اس کی کیفیت لحظہ بہ لحظہ بدل رہی

ہے، جیساکہ مرزا غالب کہتے ہیں:

در ہر مژہ بر ہم زدن ایں خلق جدید است
نظارہ سگالد کہ ہماں است، ہماں نیست

کل یوم ہو فی شان بھی اسی کی شہادت دے رہا ہے۔

۳۔ **شرح**: میرے دل میں خاک اڑانے کا جو شوق و ولولہ افزوں ہے، صحرا کی تنگی کے باعث پوری طرح ظاہر نہیں ہو سکا اور پتے پتے ذرہ ذرہ ہو گیا ہے۔ اگر میرے شوق کی یہ کیفیت باقی رہی تو ظاہر ہے کہ صحرا کی وسعت تو اس جال میں آ ہی جائے گی، لیکن میرے شوق کی تسکین کا سامان کیا ہوگا؟

ذرہ ذرہ ہو جانے کو مرزا نے حلقہ ہائے دام سے تعبیر کیا۔

۴۔ **لغات**۔ روبکار: پیشی۔ مرزا پہلے بھی کہہ چکے ہیں:

دل و دیدہ کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اس کی روبکاری ہے

شرح: دل مدعی بن گیا اور آنکھوں کو مدعا علیہ بنا دیا، یعنی دل نے آنکھوں کے خلاف جو دعوے دائر کر رکھا تھا، اس کی بنا پر نظارے کا مقدمہ بنا۔ اس مقدمے کی آج پھر پیشی ہے۔

۵۔ **لغات**۔ آئینے پر پانی چھڑکنا: ایران میں ایک رسم ہے کہ جب مسافر سفر پر روانہ ہوتا ہے تو اس کی بہ خیر و سلامت واپسی کے لیے آئینے پر پانی چھڑکتے ہیں۔

شرح: پھول کی پنکھڑی کے آئینے پر شبنم پانی چھڑک رہی ہے اے بلبل! یہ کیفیت دیکھ اور سمجھ لے کہ بہار کے رخصت ہونے کا وقت آ گیا۔

بہار کی رخصت اور خزاں کی آمد عموماً اس وقت شروع ہوتی ہے جب

ذرا موسم میں خنکی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اسی وقت شبنم زیادہ مقدار میں گرنے لگتی ہے۔ لیکن ہے۔ پہلے مصرع کے مضمون میں مرزا کے پیشِ نظر یہ کیفیت بھی ہے۔

۶۔ **لغات**۔ پیچ آپڑنا۔ اپنی بات نباہنا اور اس کا پاس کرنا۔

شرح: میرے لیے تو یہ مجبوری پیش آگئی ہے کہ محبوب نے آنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ میں تو بہر حال اس وعدے کا پاس کروں گا۔ وہ اسے پورا کرے نہ کرے، آئے یا نہ آئے، مجھے تو انتظار کے سوا چارہ نہیں۔ اگر میں اس کی عام بد عہدی کے پیشِ نظر انتظار نہ کروں، اِدھر اُدھر ہو جاؤں اور وہ واقعی آجائے تو مجھ پر یہی الزام عائد کرے گا کہ وعدے کے مطابق تُو نے انتظار نہ کیا۔ غرض میں انتظار کے لیے مجبور رہوں۔

۷۔ **شرح**: جس وادی میں مجنوں رہتا تھا، اس کے ہر ذرّے کے پردے میں ایک بیتاب و بیقرار دل موجود ہے، لہٰذا اے محبوب اِدہاں تجھے بے پردہ نہ جانا چاہیے، ورنہ تمام دل تڑپ اٹھیں گے اور وادی میں قیامت کا منظر رونما ہو جائے گا۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں:

"ذرّے کے جگمگانے کو دل کے تلملانے سے تشبیہ تام ہے، غرض یہ ہے کہ وادیِ مجنوں میں جو ذرّہ ہے، بیتابیِ مجنوں کا آئینہ دار ہے۔"

۸۔ **شرح**: اے بلبل! کہیں سے گھاس کے تنکوں کی ایک مٹھی جمع کر لے تاکہ آشیانہ بنا لے، ورنہ فصلِ بہار طوفان کی شکل میں چلی آرہی ہے۔ تمام سوکھے تنکے ہرے ہو جائیں گے۔ ہر جگہ پھول کھِل جائیں گے اور تجھے تیلی تک ڈھونڈے سے نہ مل سکے گی۔

۹۔ **لغات**۔ **خبر**: یہاں آگہی اور معرفت کے لیے آیا ہے۔

سَیر : اس سے مراد گردش و تفریح بھی مراد ہو سکتی ہے اور وہ سیَر بھی سمجھی جا سکتی ہے، جو اہلِ سلوک کو روحانی منزلوں میں پیش آتی ہے۔

تمثال دار : تصویروں کا مرقع۔

شرح : اے عقل و شعور سے کام نہ لینے والے! دل ضائع نہ کر۔ اگر اس کے ذریعے سے تجھے معرفت کا نور حاصل نہیں ہو سکتا تو مضایقہ نہیں، اس مرقع میں ایسی تصویریں تو موجود ہیں، جو تیرے لیے سیر و تفریح کا باعث ہو سکتی ہیں۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :

"جس دل میں دنیا بھر کی حسرتیں اور آرزوئیں بھری ہوں، وہ آئینۂ تصویر ہے اگرچہ اس میں ایسی صفائی نہیں کہ جلوۂ معرفت حاصل ہو سکے، لیکن سَیر کیا کم ہے؟"

گویا مولانا طباطبائی کے نزدیک تمثال دار آئینے سے مقصود ایسا دل ہے، جس میں دنیا کی حسرتیں اور آرزوئیں بھری ہوں اور ہر ایک کا عکس اس میں صاف نظر آئے۔

ان معنی کے پیشِ نظر یہی خیال ہوتا ہے کہ مرزا دل کو ایک قیمتی چیز سمجھتے ہیں اور اس کے دو پہلو ہیں، ایک صوری، دوسرا معنوی فرماتے ہیں کہ اگر معنویت اور حقیقت تک پہنچنا ممکن نہیں تو اس کا ظاہر بھی خالی از منفعت نہیں سمجھا جا سکتا۔

۱۰۔ لغات ۔ کفیل : کفالت کرنے والا، ذمّہ اٹھانے والا۔

ضامن : ضمانت دینے والا۔

شرح : غفلت اور بے خبری نے یہ ذمّہ اٹھا لیا کہ عمر کا دَور کبھی ختم نہ ہو گا۔ اسدؔ عیش و نشاط کا ضامن بن گیا۔ گویا اس نے یہ مسلک

اختیار کر لیا کہ کھاؤ پیو اور مزے اڑاؤ، کیونکہ زندگی کا حاصل یہی ہے جب کیفیت یہ ہے تو اے اچانک آنے والی موت! تو کس انتظار میں ہے؟

مطلب یہ ہے، انتظار کی بڑی سے بڑی وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ غفلت ختم ہو جائے گی اور اسد جان لے گا کہ مرنا لازم ہے، لہٰذا عمل کی کچھ متاع آئندہ زندگی کے لیے بھی جمع کر لینی چاہیے۔ اسد سے یہ امید ہو سکتی تھی کہ وہ اندازہ کر لے گا، عیش و نشاط ہمیشہ کے لیے نہیں ہو سکتے۔ ایسے اسباب جمع ہی کر لینا غیر ممکن ہے، جو دائمی عشرت و نشاط کے ضامن بن سکیں۔ جب اس حالت میں کوئی فرق نہیں آ سکتا تو نتیجہ سوا اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ اچانک موت آئے اور عمر کے ساتھ، عیش و نشاط کا بھی خاتمہ ہو جائے۔

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں
گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے
پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار، تمنا کہیں جسے

۱۔ شرح:
اے محبوب! میں ایسا حسین کہاں سے لاؤں، کہ تو بھی قائل ہو جائے، واقعی یہ مجھ ایسا ہے۔ روئے زمین پر تو ایسا حسین ملتا نہیں۔ اب میرے لیے اس کے سوا چارہ نہیں،

سر پہ ہجوم دردِ غریبی سے ڈالیے
وہ ایک مُشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں
شوقِ عناں گسیختہ، دریا کہیں جسے

درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو
صبحِ بہار، پنبۂ مینا کہیں جسے

غالبؔ بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی ہے کوئی کہ سب اچھا کہیں جسے

تیرے ہاتھ میں آئینہ دے دوں تاکہ تو اپنے جیسے کا عکس دیکھ کر حیران رہ جائے اور یہ حیرانی دیکھنے والوں کے لیے ایک تماشا بن جائے۔

شعر سے مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ محبوب کا ثانی ہے ہی نہیں، ہے تو صرف اسی کا عکس ہے، جو آئینے میں نظر آئے۔

۲۔ محبوب کی بزمِ خیال سے مراد عاشق کا دل ہے، کیونکہ محبوب ہمیشہ اس میں جلوہ گر رہتا ہے۔

شرح: حسرت نے تری بزمِ خیال میں نگاہوں کا ایک گلدستہ فراہم کر رکھا ہے۔ اسی گلدستے کو لوگ سویدا سمجھتے ہیں، یعنی وہ داغ جو دل پر نقش ہوتا ہے۔

سویدا کو گلدستۂ نگاہ اس لیے کہا کہ اس میں اک گونہ سیاہی ہوتی ہے اور سیاہی شادمانی سے محرومی کی دلیل ہے، یعنی نگاہیں محبوب کی زیارت سے شرف حاصل کرنے کے لیے پیدا ہوتی رہیں، مگر زیارت نہ ہو سکی اور وہ حسرت بنتی گئیں۔ اس طرح حسرت زدہ نگاہوں کا ایک مجموعہ تیار ہو گیا چونکہ اسے بزم میں رکھنا مقصود تھا اور بزم میں گلدستہ رکھا

جاتا ہے، لہٰذا نگاہوں کے مجموعے کو گلدستہ قرار دے دیا۔

۳۔ شرح : اے خدا! محبت کے کان میں انتظار کا وہ منتر کس نے پھونک رکھا ہے، جسے تمنّا کہا جاتا ہے؟

تمنّا کو افسونِ انتظار کہنا، ایک ایسا ادبی معجزہ ہے، جو صرف مرزا غالب سے ممکن تھا۔ تمنّا کا مطلب ہی یہ ہے کہ انسان آرزو پوری ہونے کے انتظار میں الجھا رہے، لہٰذا اسے افسونِ انتظار کہا، یعنی ایسا منتر، جو انسان کو انتظار پر ہمہ تن آمادہ کر دیتا ہے اور اس منتر کا اثر اس وقت تک باقی رہتا ہے، جب تک تمنّا پوری نہ ہو جائے۔

حقیقی محبت وہ ہے، جو ہر تمنّا اور ہر آرزو سے پاک ہو۔ مرزا فرماتے ہیں کہ محبت کے کان میں تمنّا کا منتر کس نے پھونکا؛ جہاں "تمنّا آئی" اپنی غرض آئی، حقیقی محبت ناپید ہو گئی۔

۴۔ شرح : غریب الوطنی کے درد نے اس درجہ پریشان کر رکھا ہے کہ صحرا کو، جو بہر حال ایک مشتِ خاک ہے، سر پہ ڈال لوں تاکہ نہ صحرا باقی رہے، نہ غریب الوطنی، دونوں دُکھ ختم ہو جائیں۔

۵۔ لغات۔ عنان گسیختہ : بگ ٹٹ۔ سرپٹ، بے قابو

شرح : محبوب کے دیدار کی حسرت دل میں موجود ہے۔ آنکھوں سے آنسو بہ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہے کہ ان آنکھوں میں شوق کا ایک بگ ٹٹ اور بے قابو طوفان اُمنڈ آیا ہے، جسے سمندر کہنا چاہیے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں : "عنان گسیختہ" اس شعر میں لفظ نہیں، الماس جڑ دیا ہے۔ جب دوسری زبان پر ایسی قدرت ہو، جب کہیں اپنی زبان میں اس کے الفاظ لانا حسن رکھتا ہے اور شوقِ عنان گسیختہ سے مجازاً جوشِ اشک مقصود ہے، کیونکہ یہاں مسبّب کے محل پر سبب کو مجازاً استعمال کیا ہے۔

۶۔ شرح : عیش کے پھول کھلنے پر آمادہ ہیں اور عام پھولوں کی طرح

ان کے کھلنے کے لیے بھی ایک صبح درکار ہے۔ وہ کیا ہو سکتی ہے؟ صبح بہار جسے شراب کی صراحی کی ڈاٹ کہنا چاہیئے۔

مطلب یہ کہ عام پھول موسم بہار میں صبح کے وقت کھلتے ہیں، لیکن عیش و نشاط کے پھول کھلنے کے لیے وہ صبح بہار درکار ہے، جسے شراب کی صراحی کہتے ہیں۔ شراب کی صراحی کو بند رکھنے کے لیے گزشتہ زمانے میں روئی استعمال کرتے تھے۔ روئی کو بہ لحاظ سفیدی صبح سے تشبیہ دی اور صبح بہار اس لیے لائے کہ شرب پینے کا اصل مزہ موسم بہار ہی میں ہے۔ بہار باغ و راغ میں پھول کھلائے گی، شرب عیش و نشاط کی کلیوں کو پھول بنائے گی۔

۷۔ **شرح**: اے غالب! اگر واعظ تیری برائی کرتا ہے تو اس پر بُرا نہ مان۔ دنیا میں کون ہے جسے سب اچھا کہیں؟ اگر تیری رندی و شراب نوشی کو واعظ نے بُرائی کی دستاویز بنا لیا ہے تو صرف اس حقیقت پر نظر رکھ کہ دنیا بھر نے آج تک کسی کو یکساں اچھا نہیں سمجھا۔

لوگ کسی کی طرف سے اختلافِ رائے کا معمولی اظہار سن کر بگڑ بیٹھتے ہیں اور رد و کد کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اگر اُس حقیقت پر یقین کر لیا جائے جو مرزا غالب نے اس شعر میں پیش کر دی ہے تو کشمکش کا خاصا بڑا سلسلہ ختم ہو جائے۔ ہے تو یہ بالکل معمولی چیز اور سچائی ہمیشہ معمولی اور پیش پا افتادہ چیز ہوتی ہے یعنی کوئی ایسا آدمی نکالیے، جسے ساری دنیا نے اچھا سمجھا ہو۔ جب حقیقت یہ ہے تو ایک دو، پانچ دس یا بیس تیس افراد کے بُرا کہنے کو کیوں بُرا مانا جائے؟

شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے
داغِ دلِ بے درد، نظر گاہِ حیا ہے

دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار
آئینہ بہ دستِ بتِ بدمستِ حنا ہے

شعلے سے نہ ہوتی، ہوسِ شعلہ نے جو کی
جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق
آئینہ بہ اندازِ گل آغوش کشا ہے

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

خُو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو
معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

مجبوری و دعوائے گرفتاریِ الفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

معلوم ہُوا حالِ شہیدانِ گزشتہ
تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے

۱۔ لغات:
نظرگاہ: وہ مقام جس پر نظر پڑے۔ اس سے قابلِ اعتراض مقام بھی مراد ہے۔
شرح: لالے کی پنکھڑیوں پر اوس کے قطرے پڑے ہوئے ہیں اور ان کا وہاں ہونا خالی از علت نہیں۔ یہ ایک خاص مطلب ادا کر رہے ہیں۔ ان کے ذریعے سے ایک خاص مقصد پورا ہو رہا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جس دل میں داغ ہو اور درد نہ ہو اس پر شرم و حیا کی نظر پڑتی ہے، یعنی وہ باعثِ شرم ہے۔
لالے میں داغ ہوتا ہے، مگر سوز نہیں ہوتا، یعنی وہ عاشقوں

لے پرتوِ خورشید جہاں تاب ادھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

بیگانگیٔ خلق سے بے دل نہ ہو غالبؔ
کوئی نہیں تیرا تو مری جان، خدا ہے

میں تو شامل ہو گیا، لیکن دردِ عشق سے خالی رہا۔ یہ جو اس پر شبنم نظر آتی ہے حقیقت میں شبنم نہیں بلکہ بے سوز داغ کی بنا پر عرقِ شرم کے قطرے ہیں۔ گویا وہ اپنی درد ناآشنائی پر شرمساری کا اظہار کر رہا ہے۔

۲۔ **شرح** : ایک طرف میرا دل ہے، جو حسرتِ دیدار کی کھینچ تان میں سراپا خون ہو گیا۔ دوسری طرف وہ محبوب ہے، جس نے مہندی لگائی آئینہ ہاتھ میں لے لیا اور بدمستیاں کرنے لگا۔ یعنی میں تو اپنی آرزوؤں کا خون کیے بیٹھا ہوں، وہ مہندی لگا کر آئینہ ہاتھ میں لیے عشوہ و انداز دکھا رہا ہے۔

اب اس شعر کی مناسبتوں پر غور فرمایئے: دل، آئینہ، خوں شدہ، بدستِ حنا، کشمکشِ حسرتِ دیدار، آئینہ بدست۔

۳۔ **لغات**۔ شعلہ: یہاں اس سے مراد ہے۔ سوزِ عشق۔

ہوسِ شعلہ: تمنائے سوز۔

شرح : تمنائے سوز نے جو کام انجام دیا، وہ غالباً سوزِ عشق بھی انجام نہ دے سکتا۔ مجھے برابر یہی آرزو رہی کہ جل مروں، لیکن دل کی افسردگی اس حد پر پہنچی ہوئی تھی کہ میری آرزو کا ساتھ نہ دے سکی۔ اس حالت کی ناگواری نے مجھے اتنا غصہ دلایا کہ اس پر جلتا رہا اور یہ جلن یہاں تک پہنچ گئی کہ خود بھی ختم ہو گیا۔

۴۔ شرح : تیری تصویر میں وہ شوخی ہے کہ جب تُو نے اس پر شیشہ لگانا چاہا تو اس شیشے نے انتہائی ذوق و شوق سے پھول کی طرح آغوش کھول دی کہ آ جا۔

اگر تمثال سے عکس مراد ہیں اور آئینے سے آئینہ دیدنی تو معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کہا جائے گا کہ تیرے عکس کے لیے آئینہ پھول کی طرح بصد ذوق آغوش کھول دیتا ہے۔

۵۔ شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

"میں نے خود اس کے معنی مرزا سے پوچھتے تھے۔ فرمایا اے کی جگہ جُز پڑھو، معنی خود بخود سمجھ میں آ جائیں گے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ قمری جو ایک کفِ خاکستر سے زیادہ اور بلبل جو ایک قفسِ رنگ سے زیادہ نہیں، ان کے جگر سوختہ یعنی عاشق ہونے کا ثبوت صرف ان کے چہکنے اور بولنے سے ہوتا ہے۔

"یہاں جن معنی میں مرزا نے "اے" کا لفظ استعمال کیا ہے ظاہر ہے، یہ انھیں کا اختراع ہے۔ ایک شخص نے یہ معنی سن کر کہا کہ اگر وہ "اے" کی جگہ "جُز" رکھ دیتے یا دوسرا مصرع اس طرح کہتے:

اے نالہ! نشاں تیرے سوا عشق کا کیا ہے

اس شخص کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے، مگر مرزا معمولی اسلوبوں سے تا بہ مقدور بچتے تھے اور شارعِ عام پر نہیں چلنا چاہتے تھے"۔

علامہ اقبال نے بھی فلکِ مشتری میں مرزا غالب سے ملاقات کی تھی اور دوسرے امور کے علاوہ اس شعر کے معنی بھی مرزا سے پوچھے تھے کہا حقیقت میں یہ حضرت علامہ اقبال کی تشریح ہے، جسے غالب کی زبان سے پیش کیا گیا یہاں اقبال کے شعروں کا ترجمہ دیا جا رہا ہے، جسے اصل دیکھنا ہو وہ "جاوید نامہ" صفحہ ۱۴۵ دیکھ لے)

"جو نالہ سوزِ جگر سے اٹھتا ہے، میں نے اس کی تاثیر ہر جگہ جدا جدا دیکھی۔ قمری اس نالے کے اثر سے جل کر خاکستر بن گئی۔ بلبل نے اس سے رنگ جمع کر لیے۔ اس کے اندر زندگی کی آغوش میں ایک موت ہے۔ یہاں ایک نفس زندگی ہے اور وہاں موت۔ ایسا رنگ کہ ارژنگی (رنگوں کی گوناگونی) اسی سے ہے۔ ایسا رنگ کہ بے رنگی اسی سے ہے۔ تو نہیں جانتا۔ یہ رنگ و بو کا مقام ہے اور ہر دل کو اس کی ہاو ہو کے مطابق حصہ ملتا ہے۔ یا تو رنگ اختیار کرے یا بے رنگی کو مسلک بنالے تاکہ تو سوزِ جگر سے ایک نشان پالے"۔

۶۔ **شرح** : اے محبوب! تیری عادت نے دل کا سارا جوش وخروش افسردہ کر ڈالا۔ تو حسین ہے، محبوب ہے، لیکن کتنے تعجب کا مقام ہے کہ طبیعت حد درجہ ٹھنڈی پائی ہے۔ نہ ناز، نہ انداز، نہ غمزہ، نہ عشوہ، نہ چھیڑ چھاڑ، نہ جور و ستم، غرض محبت کا ہر معاملہ ختم کر دیا۔ اب تو ہی بتا کہ اس عادت میں میرا جوش وخروش کیونکر باقی رہ سکتا تھا؟ آرزوؤں کے سب چراغ گل ہو گئے۔ محبت کے عام ولولے ٹھنڈے پڑ گئے۔ میرے لیے کتنی بڑی مصیبت ہے۔

۷۔ **لغات**۔ دستِ تہِ سنگ آمدہ : بھاری پتھر کے نیچے آیا ہوا ہاتھ۔

شرح : ہم محبت کے پھندے میں گرفتار ہیں اور مجبوری سے وفا کا پیمان نباہتے چلے جا رہے ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ہمارا ہاتھ ایک بھاری پتھر کے نیچے آ گیا ہے۔ کھینچیں تو نجات نہیں پا سکتے۔ پتھر کو اٹھانا چاہیں تو اٹھا نہیں سکتے۔ بہر حال اس پیمان کو آخر تک پہنچائیں گے۔

۸۔ **شرح** : محبوب کی تیغِ ستم ایک ایسا آئینہ ہے، جس میں ماضی کی

تصویریں نظر آتی ہیں۔ گویا اس کی حیثیت سینما کے پردے کی ہے، چنانچہ پہلے شہیدوں پر جو کچھ گزری، وہ سب اس میں صاف نظر آ رہی ہے۔

۹۔ **شرح** : اے زمانے کو روشن کرنے والے آفتاب کے جلوے! اِدھر بھی توجّہ فرما۔ ہم پر سائے کی طرح عجب وقت آ پڑا ہے۔

لطف یہ کہ وقت سائے کی طرح آ پڑا ہے اور خورشید جہانتاب کے جلوے سے لطف و رحم کے طلب گار ہیں، جس کے بغیر سایہ دور نہیں ہو سکتا۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں: "وقت پڑنے کا محاورہ جس محل پر مصنّف نے صرف کیا ہے، اس کی خوبی بیان نہیں ہو سکتی۔"

۱۰۔ **لغات** ۔ **ناکردہ گناہ** : جو گناہ ابھی نہیں کیے۔
کردہ گناہ : جو گناہ کیے جا چکے۔

شرح : اس شعر کی مفصّل شرح :

مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

میں ہو چکی ہے۔ مختصر یہ کہ اے خدا! اگر کیے ہوئے گناہوں کی سزا لازم ہے تو جو گناہ نہ ہو سکے اور حسرت دل میں رہ گئی، ان کا صلہ بھی تو ملنا چاہیے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں: "اس شعر کی داد کون دے سکتا ہے؟ میر تقی کو بھی حسرت ہوتی ہو گی کہ یہ مضمون مرزا نوشہ کے لیے بچ رہا۔"

۱۱۔ **شرح** : اے غالب! اگر خلقِ خدا نے تجھ سے مُنہ موڑ لیا ہے اور اتنا تعلق توڑ لیا ہے کہ بیگانہ سی بن گئی ہے تو اس پر حوصلہ ہارنے اور بیدل ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ میری جان! اگر مخلوق میں سے کوئی تیرا نہیں بنتا تو تیرا خدا تو سر پر موجود ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی کی کیا ضرورت ہے؟

فارسی میں بھی ایک مقام پر فرمایا ہے:

جہانیاں ز تو برگشتہ اند گر غالب
ترا چہ باک خدائے کہ داشتی دار ی

منظور تھی یہ شکل، تجلی کو نور کی!
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا
گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی

آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج
اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

گرمی سہی کلام میں، لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

۱۔ شرح:
تجلی کو یہ منظور تھا کہ ایک نورانی شکل وجود میں آجائے۔ اے رسول اللہ (صلعم) کی ذات پاک! آپ کے مبارک چہرے اور مبارک قامت سے ظہور کی قسمت کھل گئی۔ اگر آپ کا وجودِ مقدس ظہور میں نہ آتا تو تجلی جس نورانی شکل کی آرزو مند تھی، وہ دنیا کے سامنے نہ آتی۔

۲۔ شرح:
تیرے شہیدوں کے پاس ایک کفن کے سوا ہے کیا، جس میں سے لہو ٹپک رہا ہے۔ بہ ایں ہمہ اس کفن میں ایسا

غالب اگر سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

حسن اور ایسے بناؤ ہیں کہ بہشت کی حوریں انہیں انتہائی شوق و محبت سے دیکھ رہی ہیں۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں: "یہ شعر بھی ایسا کہا کہ کروڑوں میں ایک آدھ ایسا نکلتا ہے۔"

۳۔ شرح: اے واعظ! تمھاری شراب طہور کی کیا بات ہے! نہ اسے خود پی سکتے ہو، نہ کسی کو پلا سکتے ہو۔ ہماری شراب میں یہ خوبی تو ہے کہ خود بھی پیتے ہیں اور دوسروں کو بھی پلا سکتے ہیں۔

"کیا بات ہے"! عظمت و تحسین کے لیے آتا ہے، لیکن مرزا غالب نے اسے ایسے طریقے پر استعمال کیا ہے، جس سے استہزا بالکل واضح ہے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں: "ایک شخص سے خطاب کرکے فوراً جمع کی طرف ملتفت ہو جانا نئی صورت التفات کی ہے اور نہایت لطف دیتی ہے۔"

۴۔ لغات۔ صوُر: نرسنگا، جو قیامت کے دن پھونکا جائے گا اور اس سے مردے جی اٹھیں گے۔

شرح: میرا محبوب حشر میں مجھ سے لڑ رہا ہے کہ تُو کیوں جی اٹھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بے نیازی، بے پروائی اور تغافل کے باعث صور اسرافیلؑ کی آواز اس کے کان تک پہنچی ہی نہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کے کشتے کو صرف اس کی آواز پر اٹھنا چاہیے۔

۵۔ لغات۔ طیُور: طائر کی جمع، پرندے، یہاں مراد ہے بلبل۔

شرح: بلبلوں نے نغمے گانے شروع کر دیے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہار آ رہی ہے، ابھی آئی نہیں۔ ہم بھی کوئی یقینی اطلاع نہیں دے سکتے! البتہ پرندوں یعنی بلبلوں کی زبانی ایک اڑتی سی خبر سن کر پیش کر دی۔

مولانا طباطبائی کے نزدیک تشبیہ نہایت بدیع ہے اور انصاف یہ ہے کہ نئی ہے۔

۶۔ پہلے مصرع میں دونوں جگہ "واں" سے مراد کعبہ ہے۔

شرح : اگرچہ بُت اب کعبے میں نہیں، لیکن اس سے تو کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ کبھی وہاں تھے اور نکالے گئے۔ گویا انہیں کعبے سے ایک نسبت ضرور پیدا ہو گئی، اگرچہ وہ دُور کی ہے۔

معلوم ہے کہ قریش نے دینِ حق سے گمراہی اختیار کی تو رفتہ رفتہ بت پرستی شروع کر دی تھی، بلکہ بہت سے بُت کعبے کے اندر لے گئے، جن کی تعداد فتح مکّہ کے وقت تین سو ساٹھ تک پہنچی ہوئی تھی۔ مرزا غالب نے کعبے سے بتوں کی نسبت کے متعلق جو استدلال کیا ہے، ظاہر ہے کہ وہ منطقی نہیں، شاعرانہ ہے اور اسے منطق کی ترازو میں نہ تولنا چاہیے، البتہ شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے جو نسبت پیدا کی، وہ ہر شخص کے دل کو پسند آتی ہے۔

۷۔ **شرح** : بلاشبہ حضرت موسیٰؑ نے ربّ ارنی (اے پروردگار تو مجھے اپنا جمال دکھا) کہا، جواب ملا، لن ترانی (تو مجھے قطعاً نہ دیکھ سکے گا)

مرزا فرماتے ہیں، کیا یہ لازم ہے کہ سب کو ایک سا جواب ملے۔ اگر حضرت موسیٰؑ کو جلوہ نہ دکھایا گیا تو ضروری نہیں کہ ہمیں بھی جواب صاف ملے۔ اچھا، کم ازکم تجربہ تو کر لینا چاہیے۔ آیئے، ذرا کوہِ طور کی سیر کر آئیں اور دیکھیں کہ واقعی وہی جواب ملتا ہے۔

شعر میں خوبی کا ایک پہلو یہ ہے کہ جلوے کی طلب تو ہے اور یہ بھی کہ حضرت موسیٰؑ کو جواب صاف مل جانے کے باوجود نچلے بیٹھنے کے لیے تیار نہیں۔ پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر خدا نخواستہ جواب ملا تو کم از کم کوہِ طور کی سیر تو ہو جائیگی اُس تجلی گاہ کو تو دیکھ آئیں گے، جہاں ایک مرتبہ حضرت موسیٰؑ کے لیے ہمارے محبوب نے ایک جھلک کا تماشا دکھایا تھا۔

۸۔ شرح : میرا محبوب نہایت تلخ کلام اور تیز مزاج ہے۔ وہ گالی طنز، ہنسی مذاق اور نکتہ چینی کے بغیر بات نہیں کرتا۔ بیشک کلام میں کچھ نہ کچھ تیزی آ ہی جاتی ہے، مگر ایسی بھی کیا تیزی کہ جس شخص سے بات کی، اسے شکایت ضرور کرنی پڑی۔ ظاہر ہے کہ پھبتیاں سن کر کون شکایت نہ کرے گا؟

۹۔ شرح : اے غالب! اگر بادشاہ حج کے سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں تو میں یقین دلاتا ہوں کہ حج کا ثواب حضور ہی کی نذر کروں گا۔

خواجہ حالی فرماتے ہیں، یہ غزل اس زمانے میں کہی گئی تھی، جب بہادر شاہ مرحوم نے حج کے لیے جانے کا ارادہ کیا تھا، لیکن تعجب ہے کہ خواجہ مرحوم جیسے بالغ نظر اور حقیقت فہم انسان نے فرمایا: "ادھر سفرِ حج کا وہ اشتیاق اور ادھر حج کے ثواب کی یہ بے قدری"۔

حالانکہ میرزا نے صرف انتہائے اشتیاق حج کا اظہار کیا ہے۔ جو شخص حج کرے گا، وہ ادائے فرض کا ثواب بہرحال پائے گا، لیکن جس شخص کی وجہ سے اسے یہ سعادت نصیب ہو گی، وہ اپنی جگہ ثواب کا حقدار ہو گا۔ کیونکہ اس نے ایک نیک کام میں امداد کی۔ میرزا شاعرانہ طریق پر صرف یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ انہیں ان پاک مقامات کے دیکھنے کی کتنی آرزو ہے، جنھیں ہم حرمین شریفین کہتے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے دل اور روح میں جو بالیدگی پیدا ہو گی، اس کی خاطر وہ حج کا ثواب بھی چھوڑنے کے لیے تیار ہیں۔ مطلب یہ نہیں کہ ان کے چھوڑنے سے ثواب واقعی چھن جائے گا، مطلب صرف یہ ہے کہ اس مقدس سفر کا جو اصل ثواب ہے، وہ بھی کوئی لے لے، لیکن ان کی زیارت کرا دے، اسلام کے اس بنیادی فریضے کو ادا کرنے کا موقع بہم پہنچا دے۔ حرمین شریفین کی زیارت کا انتہائی اشتیاق معاذ اللہ ثواب حج کی ناقدری کا موجب نہیں بن سکتا۔ یہ شاعری ہے۔ اس میں منطق سے کام نہ لینا چاہیے، ہر استدلال کو بھی شاعری ہی کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام، بہت ہے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہ جام بہت ہے

نے تیر کماں میں ہے، نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

زمزم ہی پہ چھوڑو، مجھے کیا طوفِ حرم سے؟
آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

ہے قہر کہ اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو
انکار نہیں اور مجھے اِبرام بہت ہے

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں، اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

۱۔ لغات:
بودا: کمزور، ضعیف کم ہمت۔

شرح:
میرا دل غم کھانے میں بہت کمزور ہے۔ شراب کے ذریعے سے اس کمزوری کی تلافی ایک حد تک ہو سکتی ہے، لیکن مصیبت یہ آ پڑی ہے کہ شراب بھی کم ہے۔ گویا غم کھانے کے لیے جو متاع ضروری تھی وہ بھی بہ قدرِ طلب میسر نہیں۔

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بد نام بہت ہے

دوسرے مصرع میں تعقید ہے۔ "رنج" کا تعلق "بہت" سے ہے۔ درمیان "کہ کم ہے مے گلفام" خاصا لمبا جملۂ معترضہ آ پڑا ہے۔ لیکن مطلع تھا، دونوں مصرعوں میں قافیے اور ردیف کی پابندی ناگزیر تھی اور "بہت ہے" کا ثبوت الگ الگ درکار تھا۔ اس لیے مجبوراً یہ طریقہ کرنا پڑا۔

۲۔ لغات۔ دُرد : تلچھٹ

شرح : ساقی سے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے، ورنہ حق یہ ہے کہ مجھے شراب کی ضرورت نہیں، وہی تلچھٹ کافی ہے، جو جامِ شراب کی تہ میں فراہم ہو جاتی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ شرم کیوں آتی ہے؟ اس کے مختلف وجوہ ذہن میں آتے ہیں :

۱۔ ساقی سمجھے گا کہ یہ تو بڑا ہی کم ہمت اور بے حوصلہ شراب نوش ہے جو صرف تلچھٹ پر گزارہ کر لینا کافی سمجھتا ہے۔

۲۔ اسے خیال ہو گا کہ یہ کوئی حقیر اور ذلیل شخص ہے، جسے کسی اچھی محفل میں بیٹھنے اور پینے کا موقع بھی نہیں ملا۔

۳۔ وہ سمجھے گا کہ یہ تنگ ظرف شراب نوش ہے۔

۴۔ قناعت، جو سیر چشمی و باہمتی کی علامت ہے، موقع و محل کے اعتبار سے تحقیر کا باعث بن جائے گی۔ غور کیا جائے تو صورتِ حال کے لحاظ سے اور بھی وجہیں پیدا ہو سکتی ہیں۔

۳۔ **شرح** : جب تک میں آشیانے میں تھا، ہر لحظہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ صیاد کہیں نہ کہیں کمان میں تیر جوڑے گھات میں چھپا بیٹھا ہو گا۔ اب گرفتا

ہو کر مجھے پنجرے میں بند کر دیا گیا تو کم از کم تیر کمان یا صیاد کی کمین نشینی کا تو کوئی کھٹکا باقی نہ رہا۔ اس سے تو نجات مل گئی اور آرام کی زندگی بسر ہونے لگی۔

مرزا غالب نے اس شعر میں زندگی کے دونوں رُخ پیش کیے ہیں، ایک آزادی کی زندگی کا رخ، دوسرا قید و محکومی کی زندگی کا رخ۔ آزادی کی زندگی میں یقیناً مصیبتیں بھی ہیں، تاہم ان کے باوجود انسانی فطرت یہ ہے کہ سب عموماً اسی زندگی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ ایک طبقہ ایسا بھی ہے، جو خطرات کی دہشت برداشت نہیں کر سکتا اور یہی چاہتا ہے کہ سب خلشوں سے محفوظ ہو کر کسی گوشے میں بہ آرام بیٹھا رہے، لیکن اس سے زندگی کے عام عزائم پر جو تباہی خیز اثر پڑتا ہے، اس کا اندازہ پیش کرنا مشکل ہے۔ مرزا نے یہاں صرف رخ پیش کر دینے پر قناعت کر لی، کسی ایک رخ کی دعوت نہیں دی اور ضروری نہیں کہ ہر شعر میں کوئی نہ کوئی دعوت دی جائے۔

۴۔ **لغات**۔ زُہد : عبادت اور پرہیزگاری۔

ریائی : جس میں ریا اور نمائش شامل ہو۔

پاداشِ عمل : عمل کا بدلہ

طمعِ خام : ایسی حرص، جس کا پورا ہونا ممکن نہ ہو، نازیبا حرص، فضول حرص۔

شرح : میں خدا پرستی اور عبادت گزاری کا۔ کیونکر قائل ہو سکتا ہوں؟ مانا کہ وہ ریا و نمائش کے داغ سے پاک ہے، لیکن اس میں کیا شبہ ہے ہر زاہد اور پرہیزگار کے دل میں یہ چیز بیٹھی ہے کہ نیکی کے جو کام وہ کر رہا ہے، ان کا بدلا ملے گا اور یہ ایسی حرص ہے، جو مخلص عبادت گزار کے لیے زیبا نہیں۔ عبادت اس لیے کرنی چاہیے کہ بندے کے لیے پروردگار کی بندگی ہی زیبا ہے اس کا بدلہ لینے کی آرزو ایسے بندے کو بالکل فضول معلوم ہو گی، جو صرف اپنی

بندگی کا حق ادا کر رہا ہو۔

۵۔ لغات۔ اہلِ خرد : عقل و دانش والے لوگ۔

پابستگی : پابندی۔

شرح : جن لوگوں کو عقل و دانش کا دعویٰ ہے، آخر وہ کس خاص روش پر نازاں ہیں ؟ کون سا خاص مسلک ہے، جسے وہ بطور امتیاز اپنا مسلک قرار دے سکتے ہیں۔ جس طرف نگاہ ڈالیے، سب عام راہ و رسم ہی کی پابندی میں مصروف نظر آتے ہیں۔

مرزا یہ حقیقت واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اہلِ عقل و دانش کے لیے عقلمندی کا ثبوت کیا ہے ؟ کیا انہوں نے عام لوگوں سے الگ ہو کر کوئی طریقہ اختیار کیا ؟ آیا انھوں نے عام راہ و رسم کی پابندی چھوڑی ؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو وہ فخر کس بات پر کر سکتے ہیں ؟ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی باتوں سے پرہیز کیا جائے جو نامعقول ہیں۔ عوام سینکڑوں ایسی باتیں اختیار کیے بیٹھے ہیں۔ اگر ان سے گریز نہیں، بے تعلقی نہیں تو صاحبِ عقل و دانش ہونا عملاً بیکار ہے۔

۶۔ شرح : بجنوری مرحوم فرماتے ہیں :

> "یہ سرمستی اور مدہوشی کم مایگی نہیں، بلکہ خمخانۂ جاوید میں داخل ہو کر شراب بے اندازہ پی گئے۔ یہ کیف سرمدی ہے۔ عشقِ الٰہی کے نشے میں غرق ہیں۔ کون ایسا ہے، جو اس کیف میں سرشار ہو کر ہوشمند رہ سکتا ہے ؟"

مجھے چاہ زمزم ہی پر چھوڑ دو۔ میں حرم پاک کے گرد طواف کرنے کے قابل نہیں، کیونکہ میں نے احرام کا جو لباس پہن رکھا ہے، وہ شراب سے بہت آلودہ ہو چکا ہے۔

یہاں زمزم پر رہنے اور حرم کے طواف سے احتراز کرنے کا مقصد خود واضح کر دیا، یعنی جامۂ احرام کا ناپاک ہونا۔ زمزم پر رہیں گے تو اس کے مقدس

پانی سے احرام کو پاک کرنے کی کوشش کریں گے اور جب تک لباسِ احرام پاک نہ ہو جائے، کعبے کی عظمت کا اتنا احساس ہے کہ اس کا طواف بھی اپنے لیے مناسب نہیں سمجھتے۔

۷۔ **لغات۔ اِبرام** : اصرار۔ تقاضا۔

شرح : محبوب کو وصل سے انکار نہیں اور میں اس کے لیے حد درجہ تقاضے کر رہا ہوں۔ غضب اور ظلم ہے کہ اب بھی بات نہ بنے اور میری مراد پوری نہ ہو۔

شعر میں یہ حقیقت ظاہر کی گئی ہے کہ جب عاشق کو وصل پر اصرار ہو اور محبوب کو اس سے انکار نہ ہو تو اس کی صورت نہ بننا سراسر ناقابلِ تصوّر ہے۔

۸۔ **شرح** : اے موت! ابھی تک تو میرا کلیجا لہو ہو کر آنکھ سے نہیں ٹپکا، لہٰذا میرے ذمّے بہت کام باقی ہے اور بہتر یہی ہے کہ مجھے چند دن اور یہاں رہنے دے تاکہ یہ کام پورا کر لوں۔

شعر میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب ہم پہ پے در پے نئی مصیبتیں نازل ہو رہی تھیں، طلب کے باوجود تُو نہ آئی۔ اب جگر خون ہو رہا ہے اور خون ہو کر آنکھ سے نہیں ٹپکا۔ جب تک یہ کام پورا نہ ہو جائے، میرے عشق کی تکمیل کیونکر ہو گی؟ اب ذرا اور مہلت دے دے کہ اسے تو پورا کر لوں۔

۹۔ **شرح** : ایسا کون ہو گا، جو غالب کو نہیں جانتا۔ وہ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ انصاف یہ ہے کہ شاعر بھی بہت اچھا ہے، البتہ بدنام زیادہ ہو گیا ہے۔

مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہُوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاکِ گریباں کیے ہوئے

پھر گرمِ نالہ ہائے شرربار ہے نفس
مُدّت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمک داں کیے ہوئے

پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بہ خونِ دل
سازِ چمن طرازیٔ داماں کیے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارۂ خیال کا ساماں کیے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

۱. شرح
محبوب کو مہماں بنائے ہوئے مدّت ہو گئی۔ جب وہ پچھلی مرتبہ آیا تھا اور میرے ہاں ٹھہرا تھا تو شراب کے پیالوں میں اتنا جوش پیدا ہو گیا تھا کہ پوری بزم نے چراغاں کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔
پیالوں میں شراب بذاتِ خود تیز تھی۔ محبوب کی آمد سے مجلس کی گرمی بڑھ گئی اور شراب شرابِ آتشیں

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے
دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے
پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دل فریبیٔ عنواں کیے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے
اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے
پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بارِ منتِ درباں کیے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

بن گئی۔ اسے مرزا غالب آتشِ سیال کہتے تھے، یعنی بطور مبالغہ بہتی ہوئی آگ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں شراب بھرے پیالوں کو چراغاں سے تشبیہ دینا عین مناسب حال ہے۔

۲۔ شرح میں نے پہلی مرتبہ محبوب کی دعوت کی تھی تو اس کی پلکوں کے لیے جگر کو پارہ پارہ کر ڈالا تھا۔

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

اب پھر ان بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جگہ جگہ سے اٹھا اٹھا کر جمع کر رہا ہوں تاکہ نئی دعوت ہیں وہ پلکیں پھر ان ٹکڑوں کو چھیدیں اور اپنے لیے آرائش کا سامان بہم پہنچائیں۔

۳۔ **شرح** : پھر ضبط و احتیاط کے باعث میرا دم الجھنے لگا ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو، سالہا سال گزر گئے، جیب گریباں تار تار کیا تھا۔ پھر ایسی نوبت کبھی نہ آئی اور گریبان تار تار کیے بغیر ضبط و احتیاط کو کیونکر ختم کیا جا سکتا ہے؟ جب تک یہ ختم نہ ہو، سانس کا رکن کیونکر زائل ہو سکتا ہے؟

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہم لوگ ازل سے دیوانے چلے آتے ہیں۔ اہل عقل و دانش کی طرح ضبط و احتیاط کی زندگی ہمیں راس نہیں آسکتی۔ ہمارا کام ہی یہ ہے کہ گریبان پھاڑا، لباس تار تار کیا اور جدھر جی چاہا، نکل گئے۔

اگر آپ نے تجربہ کیا ہے یا نہیں کیا تو اب کر لیجیے کہ جو خود پابندی کی زندگی کا عادی نہ ہو، اسے ایسی زندگی میں ڈال دیا جائے تو قدم قدم پر پریشان ہو گا۔ اس کے فطری جوہروں کی نمود و نمائش ہی ماند پڑ جائے گی۔ یہی حقیقت مرزا شعر میں بیان کر رہے ہیں۔

۴۔ **لغات**۔ نالہ ہائے شرر بار : شعلے برسانے والے نالے۔

شرح : میرے سانس نے پھر انتہائی سرگرمی سے شعلے برسانے والے نالے کھینچنے شروع کر دیے ہیں مجھے سیرِ چراغاں مطلوب تھی۔ مدت سے یہ سیر دیکھی نہیں تھی، سانس نے بڑی خوبی سے اس کا انتظام کر دیا۔

۵۔ **شرح** : عشق پھر زخمِ دل کا حال پوچھنے کے لیے چلا ہے اور اپنے ساتھ لاکھوں نمکدانوں کا سامان کر لیا ہے۔

مطلب یہ کہ یہ تمام نمکدان زخمِ دل پر انڈیل دے گا تاکہ اس کی تڑپ

بڑھتے بڑھتے لامتناہی ہو جائے۔

۶۔ **شرح** : میں پھر اپنی پلکوں کا قلم دل کے لہو میں ڈبو رہا ہوں۔ مقصد یہ ہے کہ اپنے دامن پر بیل بوٹوں کے گلزار بناؤں اور یہی اس سامان کا اصل مطلب ہے۔

۷۔ **شرح** : میرے دل اور میری آنکھوں کے درمیان پھر کشمکش شروع ہو گئی ہے۔ آنکھیں چاہتی ہیں کہ محبوب کے دیدار کی لذت نصیب ہو۔ دل کی آرزو یہ ہے کہ اس کے خیال ہی میں مگن رہے، یعنی دونوں نے اپنی اپنی ضرورت اور طبیعت کے مطابق سامان تیار کر لیا ہے۔

۸۔ **لغات** : پندار : خیال، غرور، تکبر

شرح : میرا دل پھر ملامت کے کوچے ہیں سیر و گردش کے لیے جا رہا ہے اور غرور و تکبر کے جس بتکدے کا وہ پجاری تھا، اسے ویران کر چکا ہے۔

مطلب یہ کہ میرے دل کو اپنے حال پر بڑا غرور و تکبر تھا اور وہ کوئی ایسا قدم اٹھانے کے لیے تیار نہ تھا، جو نازیبا سمجھا جائے، لیکن آخر وہ دَور آگیا کہ اسے غرور و تکبر سے دست کش ہو کر طعن و ملامت کے کوچے میں جانا پڑا

۹۔ **شرح** : شوق یعنی عشق پھر کسی خریدار کی تلاش میں ہے۔ عقل، دل اور جان کا سرمایہ پیش کر رہا ہے، جو چاہے، خرید لے۔

ظاہر ہے کہ عقل، دل اور جان صرف محبوب خرید سکتا ہے اور مقصود یہی ہے کہ عشق پھر ہمیں اپنا سب کچھ نذرِ محبوب کرنے پر آمادہ کر رہا ہے :

۱۰۔ گُل و لالہ سے مراد حسین و جمیل لوگ ہیں۔

شرح : خیال پھر حسینوں کی طرف دوڑ رہا ہے اور نگاہ نے سیکڑوں گلستانوں کا سامان کر لیا ہے گویا جب تک نگاہ سیکڑوں باغوں کا سامان نہ کر لے، اس وقت تک حسینوں پر خیال دوڑانا مناسب ہی نہیں۔

۱۱۔ شرح : میں پھر محبوب کا خط کھولنا چاہتا ہوں، ساتھ ہی آرزو ہے کہ جان نامے کی دلفریبی پہ قربان کردوں۔

۱۲۔ شرح : ہوس کو پھر یہ طلب ہے کہ کوئی حسین لبِ بام جلوہ گر ہو اور سیاہ زلفیں اس نے چہرے پر بکھیر رکھی ہوں۔

۱۳۔ شرح : پھر آرزو چاہتی ہے کہ سامنے کوئی نگار ہو، جس نے پلکوں کے خنجر سرمے سے تیز کر رکھے ہوں۔

۱۴۔ شرح : پھر نگاہ کسی نوبہارِ ناز کو ڈھونڈ رہی ہے، جس نے چہرہ شراب کے نشے سے گلستان کی طرح سرخ و رنگین بنا رکھا ہو۔

۱۵۔ شرح : پھر دل میں یہ امنگ ہے کہ کسی کے دروازے پر پڑے رہیں، لیکن ظاہر ہے کہ دربان کے احسان کے نیچے سر دیے بغیر واں جگہ نہیں مل سکتی، لہذا یہ احسان بھی قبول کر لیں۔

۱۶۔ شرح : جی پھر وہی فرصت چاہتا ہے کہ دن ہو یا رات، محبوب کا تصور کیے بیٹھے رہیں۔

۱۷۔ شرح : اے غالب! ہمیں نہ چھیڑ کہ آنسوؤں کے جوش کا یہ عالم ہے، گویا ہم طوفان بپا کر دینے کی تیاری کیے بیٹھے ہیں۔

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لیے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے
بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی ہی مژگانِ خوں فشاں کے لیے

۱۔ لغات : نوید : خوشخبری۔
شرح : محبوب کے ظلم و جور نے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر!
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لیے

فلک نہ دُور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
درازدستیِ قاتل کے امتحاں کے لیے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

بہ قدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لیے

دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

زباں پہ بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا؟
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لیے

جان کے لیے اس کی خوشخبری مہیا کر دی، کیونکہ ستم انگیزی کے جتنے طور طریقے تھے، وہ سب کے سب محبوب نے برت لیے اور آسمان کے لیے کوئی طریقہ باقی نہ چھوڑا۔ مطلب یہ کہ ظلم کے جتنے طریقے ہو سکتے تھے، وہ تو عمل میں آ گئے۔ اب آسمان کوئی فتنہ اٹھانا چاہے گا تو انھیں طور طریقوں میں سے کوئی ہوگا جن کے ہم محبوب

نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملّت و مُلک
بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لیے
زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے
وَرق تمام ہُوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے
ادائے خاص سے غالبؔ ہُوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

کے ہاتھوں عادی ہو چکے ہیں، یوں ان کی خوشخبری مہیا ہو گئی، گویا آسمان کوئی ظلم نہ کر سکے گا۔

۲۔ شرح: اگر محبوب کی پلکیں خون کی پیاسی ہیں تو ہوں، آخر اپنی خون برسانے والی پلکوں کے لیے بھی کچھ نہ کچھ رکھنا ضروری ہے۔ سب کچھ اسی کی نذر کیوں کر دوں؟

۳۔ شرح: عام روایت کے مطابق حضرت خضرؑ زندہ ہیں، لیکن خاص خوش نصیبوں کے سوا کسی کو نظر نہیں آتے۔ مرزا غالب نے اس سے یہ پہلو پیدا کر لیا کہ زندگی سے مراد ہے خلقِ خدا سے روشناسی، میل جول، خلا ملا۔ اگر یہ چیزیں نہ ہوں تو زندگی کس کام کی؟ اصل میں دنیوی زندگی کی تعبیر ہے ہی یہی، اس کے سوا کوئی نہیں۔

فرماتے ہیں کہ اے خضرؑ! اصل زندگی تو ہماری ہے کہ دنیا ہمیں دیکھتی ہے اور ہم دنیا کو دیکھتے ہیں۔ ہم لوگوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں، لوگ ہماری مدد کرتے ہیں۔ تمھاری کیا زندگی ہے کہ ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے لوگوں کی نگاہوں سے چھپ گئے، گویا چور بن گئے، جو کبھی ظاہر نہیں ہوتا، روپوش ہی رہتا ہے اور

وہ بھی اس غرض سے کہ ہمیشہ زندہ رہو۔

۴۔ شرح : مجھ پر بلائیں نازل ہوتی رہیں۔ اس حال میں بھی رشک کے عذاب سے میرا چھٹکارا نہ ہوا۔ سبب یہ تھا کہ تیری ادا سارے جہان کے لیے بلائے جان ہے، حالانکہ اسے صرف میرے لیے بلائے جاں ہونا چاہیے تھا۔

رشک کا مضمون میرزا غالب نے اس کثرت سے باندھا ہے کہ شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے ہاں اتنی فراوانی ساتھ ہی اتنی بوقلمونی مل سکے، مثلاً اسی سے ملتا جلتا مرزا کا نہایت مشہور شعر ہے:

قہر ہو یا بلا ہو، جو کچھ ہو
کاش کہ تم مرے لیے ہوتے

۵۔ شرح : اے آسمان! مجھے قاتل سے دور نہ رکھ۔ کیا اس کی درازدستی کے امتحان کے لیے صرف میں ہی رہ گیا ہوں؟ مطلب یہ ہے کہ مجھے قتل ہونے اور جان دے دینے میں ایک لمحے کے لیے بھی تامل نہیں لیکن ایسا کیوں ہو کہ میں محبوب کے فراق میں دور بیٹھا ہوا گھُل گھُل کر جان دوں؟ یہ کیوں نہ ہو کہ میں اس کے پاس پہنچ جاؤں اور وہ مجھے اپنے ہاتھ سے قتل کر ڈالے؟ فراق کی حالت میں دور بیٹھ کر موت کا انتظار کرنا اور غم میں گھل گھل کر مرنا غالب کے نزدیک درازدستی کا امتحان ہے۔ یعنی مقصود یہ ہے کہ محبوب مختلف ذریعوں اور وسیلوں سے کہاں کہاں پہنچ کر بیچارے عاشقوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا موجب بنتا ہے۔

۶۔ شرح : میری کوشش کی حقیقت سمجھنا چاہو تو یہ مثال سامنے رکھ لو کہ ایک پرندہ پنجرے میں بند ہے اور وہ آشیانے کے لیے تنکے جمع کر رہا ہے۔

یہ صرف مثال ہے، یہ مراد نہیں کہ قفس میں کوئی پرندہ بند ہو تو وہاں لے

تنکے جمع کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ابھی رہائی کی کوئی صورت نہیں۔ گرفتاری کی مصیبت نے پیچھا نہیں چھوڑا اور پنجرے میں بیٹھے بیٹھے گھونسلے کے لیے تنکے یوں جمع کرنے لگا، گویا سب کچھ طے ہو چکا ہے۔ مثال سے ظاہر ہے کہ اصل کوشش بے سود اور بے نتیجہ بھی ہے اور ہر دیکھنے والے کے دل میں انتہائی رحم بھی پیدا ہوتا ہے۔

۷۔ **شرح** : خواجہ حالی نے اس شعر پر "یادگارِ غالب" میں بھی بحث کی ہے اور "مقدمۂ شعر و شاعری" میں بھی۔ دونوں جگہ اس کی خوبیوں کے جداگانہ پہلو پیش کیے ہیں۔ "مقدمہ" میں فرماتے ہیں: مضمون یہ ہے:

"میں جو معشوق کے مکان پر پہنچا۔ اوّل خاموش کھڑا رہا۔ پاسبان نے سائل سمجھ کر کچھ نہ کہا۔ جب محبوب کے دیکھنے کا حد سے زیادہ شوق ہوا اور صبر کی طاقت نہ رہی تو پاسبان کے قدموں پر گر پڑا۔ اب اس نے جانا کہ اس کا مطلب کچھ اور ہے۔ اس نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا کہ ناگفتہ بہ ہے۔"

فرماتے ہیں کہ اتنے بڑے مضمون کو مرزا نے صرف دو مصرعوں میں بیان کر دیا ہے۔

"یادگارِ غالب" میں لکھتے ہیں: اردو غزل میں ایسے بلیغ اشعار شاید دو ہی چار اور نکلیں گے۔ مولانا آزاد جو مرزا کی طبع کو نام رکھتے تھے، وہ بھی اس شعر کے اندازِ بیان پر پروانہ تھے ..... جو واقعہ مرزا نے اس شعر میں بیان کیا ہے، اس میں دو باتوں کی تصریح کرنی ضروری تھی، ایک یہ کہ پاسبان نے قائل کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ دوسرے یہ کہ قائل پاسبان سے کیا چاہتا تھا؟ سو یہ دونوں باتیں بہ صراحت بیان نہیں کی گئیں، صرف کنائے میں ادا کی گئی ہیں، مگر صراحت سے زیادہ وضوح کے ساتھ فوراً سمجھ آ جاتی

ہیں۔ پہلی بات پر لفظ "شامت" اور دوسری پر "قدم لینا" صاف دلالت کرتا ہے۔ اس کے سوا روزمرہ کی نشست اور الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دو مصرعوں میں ایسی خوبی سے ادا کرنا کہ نثر میں بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہے۔ یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ہیں۔

خواجہ حالی شعر کے تمام پہلو واضح کر چکے ہیں۔ تاہم نفسِ مطلب کی پوری توضیح کے لیے پھر ایک مرتبہ شعر کو موزوں نثر میں پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مرزا محبوب کے دروازے پر پہنچے۔ وضع قطع سے بالکل فقیر اور درویش معلوم ہوتے تھے۔ دروازے کے پاسبان نے دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ کوئی فقیر ہے، جو مانگنے کے لیے آ گیا ہے اور فقیر آتے ہی رہتے ہیں۔ چند لمحے ٹھہرے گا اور رخصت ہو جائے گا۔ اس سے کچھ نہ کہا اور بالکل مزاحم نہ ہوا۔ مرزا اپنے ذہن میں سمجھے کہ پہلا مرحلہ تو بہ خیر و خوبی طے ہو گیا۔ پاسبان مہربان معلوم ہوتا ہے۔ کیوں نہ اس کی منت سماجت کر کے باریابی کی کوشش کروں۔ چنانچہ کھڑے کھڑے آگے بڑھے اور بیتابانہ پاسبان کے پاؤں پر گر پڑے۔ اب اسے ہوش آیا اور سمجھا کہ بھیک مانگنے کا یہ تو کوئی طریقہ نہیں۔ یقیناً یہ بھکاری نہیں، بلکہ دوسری غرض سے آیا ہے اور اسے معلوم تھا کہ اس غرض سے اکثر لوگ آتے ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے وہی سلوک کیا، جو ایسے تمام لوگوں سے کرتا رہا تھا۔ یعنی گردن میں ہاتھ دیا، دو چار تھپیڑ رسید کیے، دو چار جوتے لگائے اور دھکیلتا ہوا دُور تک لے گیا۔

کمال یہ ہے کہ اس لمبی داستان کو صرف چند الفاظ میں کنایۃً ایسے طریق پر پیش کر دیا ہے کہ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ پورے شعر کا مضمون صرف چار پانچ لفظوں پر مبنی ہے یعنی "گدا" "چُپ" "شامت" "پاسبان" اور "قدم لینا"

مولانا طباطبائی تک کو اعتراف کرنا پڑا: اس شعر نے ایسی بندش پائی

ہے کہ جواب نہیں ۔

۸ - لغات ۔ تنگنائے : تنگ جگہ ، تنگ کوچہ ۔

شرح : میں جو مضامین اس زمین میں لانا چاہتا ہوں، انھیں اپنے شوق اور خواہش کے مطابق غزل میں نہیں لا سکتا۔ مطالب کا تقاضا یہ ہے کہ میرے بیان میں کسی قدر وسعت پیدا ہو جائے ۔

۹ - لغات ۔ تجمل حسین خاں : فرخ آباد کے بنگش خاندان کا مشہور امیر، جس نے ۱۰، ذی قعدہ ۱۲۶۳ھ (۹ - ۱۸۴۶ء) کو وفات پائی ۔ نصیر الدولہ، معین الملک، ظفر جنگ اس کے خطابات تھے، جن کا ذکر آگے آتا ہے۔ اور نوابوں سے علاقہ حکومت انگریزی نے واپس لے لیا تھا اور ایک لاکھ آٹھ ہزار روپے سالانہ نقد مقرر کر دیا، لیکن نوابوں کا ٹھاٹھ ایسا تھا کہ بڑے بڑے والیانِ ریاست ان کے مقابلے میں کمتر نظر آتے تھے، تجمل حسین خاں کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا تفضل حسین خاں نواب بنا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں اس نے انگریزوں کی جانیں بچانے کے لیے کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا، لیکن دوسرے لوگوں کا غلبہ اس قدر بڑھا کہ تفضل حسین خاں خود بھی ساتھ دینے پر مجبور ہو گیا۔ ہنگامے کے خاتمے پر اس کے لیے پھانسی کی سزا تجویز ہوئی پھر یہ قرار پایا کہ ملک چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلا جائے ۔ تفضل حسین خاں نے مکہ مکرمہ میں قیام کا فیصلہ کیا، چنانچہ اسے وہیں بھیج دیا گیا۔ کچھ مدت تنگی میں گذری، پھر نواب شاہجہان بیگم والیۂ بھوپال نے اس کے لیے معقول رقم کا انتظام کر دیا جو رباط بھوپال کی رقم کے ساتھ سال بہ سال نواب کو مل جاتی تھی۔ ۔ ۔یں ۱۸۸۲ء میں تفضل حسین خاں نے وفات پائی ۔

شرح : عیش و تجمل کا ساز و سامان خلق کو اس لیے دیا گیا ہے کہ تجمل حسین خاں کو نظر نہ لگے، ورنہ حقیقت میں یہ ساز و سامان صرف تجمل حسین خاں کے لیے ہے ۔ ۔ ۔

جب کسی کے پاس کوئی ایسی چیز ہو، جس سے دوسرے محروم ہوں تو اندیشہ رہتا ہے کہ اسے کسی کی نظر لگ جائے گی۔ مثلاً خوب صورت بچوں کو نظر سے محفوظ رکھنے کے لیے سیاہ رنگ کا کوئی منکا گلے میں ڈال دیتے ہیں، جسے نظر بٹو کہا جاتا ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ دوسروں کو عیش کا جو سامان دیا گیا ہے، اس کی غرض صرف یہ ہے کہ تجمل حسین نظرِ بد کا شکار نہ ہو جائے۔

۱۰۔ لغات۔ بارِ خدایا: خدائے بزرگوار

نطق: گویائی۔

شرح: اے خدائے بزرگوار! زبان پر کس کا نام آیا کہ میری گویائی نے میری زبان کو چوم چوم لیا۔

مرزا غالبؔ نے فارسی میں بھی دوسرے مصرع کا مضمون باندھا ہے:

تا نامِ مے و ساقیِ کوثر بہ زباں رفت

صد رہ لبم از بہر بوسیدہ زباں را

آسی نے لکھا ہے کہ زباں چومنے کا مضمون سب سے پہلے خاقانی نے باندھا تھا۔ اگر حقیقت یہی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ایسے ایک مضمون کے سلسلے میں توارد تسلیم کر لینا زیادہ اچھا ہے۔

۱۱۔ شرح: جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، نصیر الدولہ، معین الملک تجمل حسین خاں کے خطابی اجزا تھے۔ ان کے استعمال کا عام طریقہ یہ تھا: نصیر الدولہ والدین اور معین الملت والملک۔ اسی کو مرزا غالبؔ نے پہلے مصرع میں لے لیا۔ یعنی تجمل حسین خاں، جو دین اور مملکت کا یاور اور ملت و ملک کا مددگار ہے، بلند آسمان اسی کے آستان کے لیے بنا ہے۔

۱۲۔ شرح: زمانہ اس کے عہد میں زینت و آرائش کے درپے ہے۔ زمین کی سجاوٹ اوجِ کمال پر پہنچ رہی ہے۔ یقین ہے کہ آسمان کے تارے بھی

توڑ کر اسی آرائش میں صرف ہوں گے اور آسمان کے لیے اور ستاروں کی ضرورت پیش آئے گی۔

بعض شارحین نے فرمایا ہے کہ تجمل حسین خاں کے عہد میں آسمان و زمین کی آرائش ہو رہی ہے۔ چونکہ آسمان کی آرائش ابھی نہیں ہوتی، اس لیے پہلے ستاروں میں اور ستارے بڑھا دیے جائیں گے۔

اس پر اعتراض کی ضرورت نہیں، لیکن تکمیلِ آرائش کو صرف آسمان تک محدود رکھنا کیونکر مناسب ہے؟ اولین شے تو زمین کی آرائش ہے۔ بظاہر یہی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس آرائش میں ستارے بھی کھپ جائیں گے اور آسمان کی آرائش بحال رکھنے کے لیے اور ستارے درکار ہوں گے۔

۱۳۔ **شرح** : کاغذ ختم ہو گیا اور ممدوح کی مدح ابھی باقی ہے۔ اس بے کنارہ سمندر کے لیے سفینہ درکار ہے۔ "سفینہ" یہاں دو معنی میں استعمال ہوا "اول" دفتر"، دوم "کشتی" یا جہاز"۔ "کشتی" یا "جہاز" کو "بحر بیکراں" سے مناسبت ہے۔ "دفتر" کو "کاغذ" سے۔

۱۴۔ **شرح** : آج غالب نے خاص ادا سے نکتہ سرائی کی ہے، یعنی خاص رنگ میں شعر کہے ہیں۔ میرے جو دوست اور ہم پیشہ نکتہ داں ہیں، یعنی شعر کی باریکیاں سمجھتے ہیں، انھیں عام دعوت دیتا ہوں کہ اس کی پیروی کریں۔

خواجہ حالی فرماتے ہیں :

> "غزل کے اخیر میں چند شعر نواب فرخ آباد کی مدح میں لکھے ہیں۔ جنھوں نے مرزا کو نہایت اشتیاق کے ساتھ فرخ آباد میں بلایا تھا، مگر غالباً مرزا کا وہاں جانا نہیں ہوا۔"

قصائد

(۱)

امیرالمومنین حضرت علیؑ کی منقبت میں :

سازِ یک ذرّہ نہیں فیضِ چمن سے بے کار
سایۂ لالۂ بے داغ سُویدائے بہار

مستیٔ بادِ صبا سے ہے بعرضِ سبزہ
ریزۂ شیشۂ مے جوہرِ تیغِ کہسار

سبز ہے جامِ زمرّد کی طرح داغِ پلنگ
تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

مستیٔ ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت
کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

کوہ و صحرا ہمہ معمورئ شوقِ بلبل
راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

سونپے ہے فیض ہوا صورتِ مژگانِ یتیم
سرنوشتِ دو جہاں ابر بہ یک سطرِ غبار

۱۔شرح: باغ میں فیض کا یہ عالم ہے کہ کسی بھی ذرّے کا وجود بیکار نہیں رہا، یہاں تک کہ بے داغ لالے کا سایہ بہار کے دل کا نقطۂ سیاہ بن گیا ہے۔ لالہ داغدار ہوتا ہے۔ یہاں اسے بے داغ اس لیے کہا کہ بہار کے فیضِ نمو

کاٹ کر پھینکیے ناخن تو بہ اندازِ ہلال
قوّتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار
کفِ ہر خاک بہ گردوں شدہ تری پرواز
دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار
مے کدے میں ہو اگر آرزوئے گل چینی
بھول جا یک قدحِ بادہ بہ طاقِ گلزار
موجِ گل ڈھونڈ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ
گم کرے گوشۂ مے خانہ میں گر تو دستار
کھینچے گر مانیِ اندیشہ چمن کی تصویر
سبز مثلِ خطِ نوخیز ہو خطِ پرکار
لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ
طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار
وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیرِ سرا
چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار
فلک العرش ہجومِ خمِ دوشِ مزدور
رشتۂ فیضِ ازل سازِ طنابِ معمار

نے اس کا داغ بالکل مٹا دیا۔ اب اس کا صرف سایہ باقی رہ گیا اور وہ بہار کا سویدا بن گیا۔

۲۔ لغات

تیغِ کہسار: پہاڑ کی چوٹی

شرح: شاعر نے پہاڑ کی چوٹی پر سبزہ دیکھا تو اسے خیال ہوا کہ یہ سبزہ نہیں، بلکہ مینائے شراب کی کرچیں ہیں جو تیغِ کوہ کے جوہر بن گئی ہیں اور یہ

سبزۂ نہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام
رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار
واں کے خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرِ کاہ
وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار
خاکِ صحرائے نجف، جوہرِ سیرِ عرفا
چشمِ نقشِ قدم، آئینۂ بختِ بیدار
ذرّہ اس گرد کا، خورشید کو آئینۂ ناز
گرد اس دشت کی امید کو احرامِ بہار
آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستیٔ ناز
عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ بہار

بادِ صبا کی مستی کا کرشمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سبزۂ سر کوہسار ہمیں بتا رہا ہے بادِ صبا نے مستی کے عالم میں مینائے مے توڑ ڈالا اور اس کے سبز سبز ریزے پہاڑ کی چوٹی پر بکھر گئے، وہی تیغِ کوہسار کے جوہر بن گئے۔ واضح رہے کہ مینائے مے کی

مطلعِ ثانی

فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار
دلِ پروانہ چراغاں، پرِ بلبل گلزار
شکلِ طاؤس کرے آئنہ خانہ پرواز
ذوق میں جلوے کے تیرے بہ ہوائے دیدار

کرچوں کا سبز ہونا بہار کا فیضان ہے۔ تیغِ کوہسار اصلاً پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں، لیکن یہاں شاعر نے

تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردوں
سلکِ اختر میں مہِ نو، مژہ گوہر بار

ہم عبادت کو ترا نقشِ قدم، مہرِ نماز
ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار

مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعتِ نبی
جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار

جوہرِ دستِ دعا آئنہ یعنی تاثیر
یک طرف نازشِ مژگان و دگر سُو غم خوار

مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبال نگاہ
خاکِ در کی ترے جو چشم نہ ہو آئنہ دار

دشمنِ آلِ نبی کو بہ طرب خانۂ دہر
عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو طاقِ دیوار

دیدہ تا دل اسدؔ آئینۂ یک پرتوِ شوق
فیض معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

دوبارہ تیغ کو حقیقی معنی میں لے لیا ـ جوہروں سے مراد اس کی آب داری ہے۔

۳۔ لغات

پلنگ: چیتا، جس کے زرد جسم پر سیاہ چتیاں ہوتی ہیں۔

شرح: بہار کے جوش اور فیض کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ چیتے کے داغ یعنی چتیاں زمرد کے پیالے کی طرح سبز ہو گئی ہیں اور چنگاریوں میں ویسی ہی تازگی آ گئی ہے، جیسی تازگی کے ریشے میں ہوتی ہے۔

۴۔ لغات ۔ فشار : دباؤ

شرح : فضائے عالم میں گھنگھور گھٹائیں چھارہی ہیں۔ حسرت ان سے عیش ونشاط کے پھول چن رہی ہے۔ گھٹاؤں کی شدت کا یہ عالم ہے کہ دونوں جہان ان کی آغوش میں بھینچے جا سکتے ہیں۔

شعر کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ بادل اتنے زور سے گھر کر آئے ہیں گویا دونوں جہان کی فضا ان کے لیے تنگ معلوم ہوتی ہے اور شاعر جیسا حسرت زدہ آدمی بھی ان سے خوشی کے پھول چن رہا ہے۔

۵۔ لغات۔ معموری : آبادی

راہِ خوابیدہ : لفظی معنی سویا ہوا راستہ، اصطلاحی معنی وہ راستہ جس پر چلنا پھرنا بہت کم ہو۔

شرح : بہار کے فیض سے ہر جگہ پھول پیدا ہو گئے۔ ان کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ جو راستے ویران پڑے تھے، وہ بھی پھولوں سے بھر گئے۔ گویا سوئے ہوئے راستے پھولوں کے ہنسنے یعنی کھلنے کی آواز سے بیدار ہو گئے۔ کوہ وصحرا میں ہر طرف پھول ہی پھول نظر آتے ہیں، اس لیے تمام مقامات بلبلوں کے عشق سے آباد ہو گئے ہیں۔

۶۔ لغات۔ سرنوشت : تقدیر۔

مژگانِ یتیم : اس کی دو خصوصیتیں ہیں، اوّل خاک آلود ہونا، دوم مسلسل رونے کے باعث نم آلود رہنا۔

دو جہاں ابر : بادلوں کی انتہائی کثرت۔

غبار : ایک قسم کا خط، جو دو کاغذوں پر لکھا جاتا ہے اور دونوں کو ملا کر پڑھا جاتا ہے، ورنہ غبار سا معلوم ہوتا ہے۔

شرح : فصلِ بہار کی تری اور سیرابی کا یہ عالم ہے کہ مژگانِ یتیم کی طرح خطِ غبار کی ایک سطر میں دو جہاں ابر کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔

شعر کا صاف مطلب یہ ہے کہ بہار کی رطوبت اور شادابی کی برکت سے گرد و غبار کی معمولی سی مقدار میں اتنا پانی ہے، گویا بے شمار بادل برسنے لگے ہیں۔

مژگانِ تیم کی دونوں خصوصیتیں شعر کے سلسلے میں پیشِ نظر رہنی چاہئیں۔

۷۔ **لغات۔** قوتِ نامیہ، بڑھنے اور نشو و نما پانے کی قوت۔

شرح: اگر ناخن کاٹ کر پھینک دیں تو بڑھنے اور نشو و نما پانے کی قوت اسے بھی بیکار نہ چھوڑے گی، بلکہ نمو دے کر اس ہلال کو بدر بنا کر رہے گی۔

۸۔ **شرح:** خاک کی ہر مٹھی، جو آسمان کی طرف بلند ہو رہی ہے اس میں بہار کے جوشِ نمو نے جان ڈال دی ہے، اور وہ قمری کی طرح اڑ رہی ہے۔ اور جس کاغذ کو آگ لگ گئی ہو، وہ ایک جال ہے، جس سے مور پکڑے جاتے ہیں۔

قمری کا رنگ خاکی ہوتا ہے۔ میرزا غالب پہلے بھی اسے خاک اور خاکستر سے تشبیہ دے چکے ہیں۔ یہاں صرف یہ ہوا کہ ہوائے بہار نے بے جان خاک میں روح پھونک دی اور وہ قمری بن کر اڑنے لگی۔ آتش زدہ کاغذ کی تشریح پہلے تفصیل سے کی جا چکی ہے۔ اس کاغذ میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے شعلے سے پیدا ہو جاتے ہیں، جو چند لمحے باقی رہتے ہیں۔ ان کی صورت بالکل ایسی ہوتی ہے، جیسے جال کا کوئی ٹکڑا ہو۔ وہ کاغذ مور کے پروں سے بھی اک گونہ مشابہت رکھتا ہے، اس لیے اُس جال کو طاؤس شکار کہا گیا۔

۹۔ **شرح:** اگر تجھے یہ تمنا ہو، شراب خانے میں بیٹھ کر پھول چننے تو اس کی سہل ترکیب یہ ہے کہ شراب کا ایک پیالہ باغ کے کسی طاقچے میں رکھ کر بھول جا۔ نشو و نما کی قوت اس ایک پیالے کو اسی طرح بے شمار پیالے

بنا دے گی، جس طرح ایک چھوٹے سے بیج سے کئی پھول پیدا ہو جاتے ہیں یوں چمن میں میکدہ پیدا ہو جائے گا اور میکدے میں چمن۔ شراب بھی پی اور پھول بھی چنُ۔

۱۰۔ شرح : اگر شراب خانے کے گوشے میں تیری پگڑی گم ہو جائے تو باغ میں چلا جا اور غنچے کی خلوت گاہ میں موج گل ڈھونڈ لے۔ گویا جو پگڑی میکدے میں گم ہو گی، وہ لطیف ہوا سے خوشبو بن کر غنچے کی خلوت گاہ میں جا بیٹھے گی۔

۱۱۔ لغات۔ مانی : ایک مشہور مصوّر جس کا وطن بابل تھا مفصل حالات پہلے لکھے جا چکے ہیں۔

شرح : اگر فکر و خیال کا مانی باغ کی تصویر کھینچے تو طراوت ہوا کے باعث پرکار کا خط حسینوں کے نئے نئے اُگے ہوئے سبزۂ خط کی طرح سبز ہو جائے۔

۱۲۔ لغات : منقار : چونچ۔

شرح : سبزۂ کوہسار کے طوطی نے حضرت علیؑ کی مدح کا زمزمہ گانے کے لیے لعل کی چونچ پیدا کی ہے۔

میرزا کا مقصود یہ ہے کہ پہاڑ پر سبزہ بھی اُگتا ہے اور اس میں لعل بھی ہوتے ہیں۔ دونوں نے مل کر ایک ایسے پرندے کی شکل پیدا کی جس کا رنگ سبز اور چونچ سرخ ہے۔ غرض یہ ہے کہ حضرت علیؑ کی مدح کریں۔ گویا یہ شعر گریز کا ہے، اس سے مدح شروع ہو جاتی ہے۔

۱۳۔ شرح : حضرت علیؑ وہ شہنشاہ ہیں، جن کے محل سرائے کی تعمیر کے لیے اینٹوں کی ضرورت پڑی تو حضرت جبریلؑ نے اپنی آنکھ قالب بنانے کی غرض سے پیش کی تاکہ اس میں ڈھال ڈھال کر اینٹیں تھاپ لی جائیں۔

۱۴۔ لغات۔ فلک العرش : وہ آسمان یا بلندی جس پر عرش ہے۔
ہجومِ خم : جھکاؤ کی کثرت۔
طنابِ معمار : وہ رسّی، جس کے ساتھ ایک وزن لٹکا رہتا ہے اور راج معمار اُس سے تعمیر کردہ دیوار کی سیدھ اور ٹیڑھ دیکھتے ہیں۔ جہاں ٹیڑھ ہو، اسے ٹھونک کر درست کر دیتے ہیں۔

شرح : عرش والا آسمان مزدور کے کندھے کی طرح حد درجہ جُھک گیا ہے۔ یعنی وہ حضرت علیؑ کی محل سرائے کی تعمیر میں مزدوری، تعظیم و احترام کی بنا پر کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ازلی فیض کا رشتہ اس محل سرائے کے معمار کی وہ رسّی ہے، جس سے دیوار کی سیدھ ٹیڑھ دیکھی جاتی ہے۔

۱۵۔ لغات۔ نُہ چمن : نو آسمان
خطِ پُشتِ لبِ بام : مکان کی منڈیر پہ جو رنگین خط آرائش کی غرض سے لگایا جاتا ہے۔
اوجِ حصار : محل سرائے کی فصیل کی بلندی، جس نے چاروں طرف سے عمارت کو گھیر رکھا ہے۔

شرح : نَو آسمانوں کا سبزہ اس محل سرائے کے لبِ بام کی منڈیر کے رنگ میں صرف ہو گیا۔ سیکڑوں خدا شناس لوگوں کی بلند ہمتی اس محل سرائے کی بیرونی دیوار کی بلندی کے برابر ہے۔

عارفوں کی بلند ہمتی اس اعتبار سے کہ ان کی فکر و نظر مقام معرفت حاصل کرنے کی غرض سے بہت اونچی جاتی ہے۔

۱۶۔ لغات۔ خاشاک : گھاس پھوس۔
پرِ کاہ : گھاس کا تنکا۔

مروَحَہ : پنکھا ، بادزن

شرح : اُس محل سرائے کے باغ کی گھاس پھوس سے ایک تنکا بھی کسی کو مل جائے تو وہ پری کے بال و پر کے پنکھے سے بھی بیزار رہے۔

پری کے بال و پر کا پنکھا ایسی چیز ہے ، جو بالکل نایاب ہے ، لیکن اس کی آرزو ہر شخص کو ہوگی تاکہ گرمی میں راحت پہنچے اور مکھیوں سے بچاؤ ہوسکے لیکن میرزا کہتے ہیں کہ جس شخص کو حضرت علیؓ کے باغ سے گھاس کا ایک تنکا مل جائے ، وہ پری کے پنکھے سے ہمیشہ بیزار رہے اور اسے پرِ کاہ کی بھی وقعت نہ دے گا۔

۱۷۔ لغات۔ نجف : کوفہ سے تین چار میل پر مغربی جانب ایک شہر ، جہاں حضرت علیؓ کا مزار ہے۔

سَیر : روحانی سلوک کے مراتب طے کرنا

عُرفا : عارف کی جمع ، خداشناس لوگ ، اصحابِ معرفت۔

شرح : نجفِ اشرف کے صحرا کی خاک خداشناس لوگوں کے عرفانُ سلوک کا جوہر یعنی روح رواں ہے اور اس صحرا کی خاک پر نقشِ پا کی آنکھ جاگتے ہوئے نصیبے کا آئینہ ہے۔

مطلب یہ کہ نجف کے صحرا میں پھرنا عرفان حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور وہاں جس کا نقشِ قدم پڑ جائے ، اسے سمجھنا چاہیے کہ نصیبا جاگ اٹھا۔

۱۸۔ شرح : اس صحرا کی گرد کا ذرہ سورج کے لیے فخر و ناز کا آئینہ ہے اس صحرا کی گرد امید کے لیے بہار کا جامۂ احرام ہے۔

مطلب یہ ہے کہ صحرائے نجف کا ذرہ ذرہ سورج کے لیے مایۂ ناز ہے اور وہاں کی گرد اُمید کے لیے بہار کا سامان ہے۔

۱۹۔ شرح : آفرینش : پیدائش ، تخلیق ، کائنات۔

خمیازہ : انگڑائی۔

شرح : تخلیق و پیدائش کو اس صحرائے مستیِ ناز کی طلب ہے۔ یعنی پوری کائنات سراپا طلب بنی ہوئی ہے کہ نجف کی خاکِ پاک سے اسے مستیِ ناز حاصل ہو اور صحرائے نجف سے غبار کی جو لہر اٹھ رہی ہے، وہ پیدائش کی انگڑائی پیش کر رہی ہے۔

مطلب یہ کہ جب نشہ اترتا ہے اور پینے والے پر خمار طاری ہوتا ہے تو جسم ٹوٹتا ہے اور انگڑائیاں آتی ہیں۔ کائنات ہمیشہ مستیِ ناز صحرائے نجف کی خاک سے طلب کرتی رہی۔ یہ طلب اب بھی باقی ہے اور اس کا نشہ اُتر جانے کی انگڑائیاں موجِ غبار کی شکل میں پیش ہو رہی ہیں۔

مطلعِ ثانی

۲۰۔ لغات۔ شبستان : رات بسر کرنے کی جگہ۔

شرح : اے حضرت! آپ ہی بہار کے شبستان کی شمع ہیں اور آپ ہی کے فیض سے پروانے کا دل چراغاں اور بلبل کے بال و پر گلزار ہو رہے ہیں۔

پروانہ شمع کا عاشق و طالب ہوتا ہے، اس کا دل چراغاں بن گیا، گویا جو کچھ مطلوب تھا، اسے مل گیا۔ بلبل کو پھول کی آرزو رہتی ہے، اس کے بال و پر چمن زار بن گئے، گویا وہ بھی مراد کو پہنچ گئی۔ شاعر کا مقصد یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کا مطلوب حضرت علیؑ کے طفیل حاصل ہوتا ہے۔

۲۱۔ **شرح :** اے حضرت! آپ کے جلوے کے ذوق اور آپ کے دیدار کے شوق میں آئینہ خانہ بھی مور کی طرح اڑنے لگے۔

آئینہ خانے کی پرواز کو مور سے تشبیہ اس لیے دی کہ اس کے پروں کے نقش و نگار آئینے کی طرح ہوتے ہیں۔ جب وہ اڑتا ہے تو دیکھنے والے کو معلوم ہوتا ہے، بہت سے آئینے اُڑے جا رہے ہیں۔ گویا آئینہ خانے کے پرواز

کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

۲۲۔ **شرح** : اے حضرت! آپ کی اولاد کے غم میں آسمان پر ہلال ستاروں کی لڑی میں پرویا ہوا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسی مژہ ہے، جس سے موتی برس رہے ہیں۔ ماہِ نو کو مژۂ گوہر بار اس لیے کہا کہ وہ روتا ہے۔ چونکہ حضرت علیؑ کی اولاد کے غم میں روتا ہے، اس لیے آنسو موتی بنتے جاتے ہیں اور انہیں موتیوں سے ستاروں کی لڑیاں پروئی گئیں۔

۲۳۔ **لغات۔ مُہرِ نماز** : وہ چیز جو سجدے کے مقام پر رکھ لی جاتی ہے اور عموماً خاکِ کربلا کی ٹکیا ہوتی ہے۔

ہم : دونوں مصرعوں میں اس کے معنی ہیں نیز، بھی۔

ریاضت : زہد، پرہیزگاری، روحانی منزلیں طے کرنے کے لیے ذکر و فکر میں انہماک۔ عام معنی ورزش اور کسرت بھی ہیں۔

استظہار : پشتیبانی، پشت پناہی، امداد۔

شرح : اے حضرت! آپ کا نقشِ قدم عبادت میں مُہرِ نماز ہے یعنی اسی پر سجدہ کیا جاتا ہے اور ریاضت کی پشتیبانی بھی آپ کی حوصلہ افزائی سے ہوتی ہے۔

آپ کی ذات بابرکات کو دیکھ کر یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ ریاضت کی جائے۔

۲۴۔ **شرح** : اے حضرت! آپ کی مدح میں رسول اللہ (صلعم) کی نعت کا ترانہ چھپا ہوا ہے اور آپ ہی کے جامِ فیض سے پوشیدہ بھیدوں کی شراب اُبلتی ہے۔

مطلب یہ کہ آپ کی منقبت بجائے خود رسول اللہ (صلعم) کی نعت ہے، کیونکہ آپ حضورؐ کے وصی اور محبوب ہیں اور آپ کے فیض کا پیالہ اُس شراب سے بھرا ہوا ہے، جو روحانیت کے پوشیدہ بھید آشکارا کرتی ہے۔

۲۵۔ شرح : پہلے مصرع میں "جوہر دستِ دعا آئنہ" دراصل "جوہر آئنہ دستِ دعا" تھا، جسے مصرع میں لانے کی غرض سے یہ تدبیر اختیار کی گئی کہ "آئنہ" درمیان سے اٹھا کر آخر میں ڈال دیا گیا۔

شرح : دستِ دعا کے آئینے کا جوہر تاثیر ہے، یعنی جو دعا کی جاتی ہے، وہ قبول ہوتی ہے، کیونکہ اثر رکھتی ہے۔ دعا خلوص سے کی جائے تو انسان بے اختیار رونے لگتا ہے، لیکن یہ رونا مژگان کے لیے باعث ناز ہوتا ہے۔ اس لیے کہ بارگاہِ باری تعالیٰ میں شرفِ قبول حاصل کرتا ہے۔ پھر یہی اثر ہے، جو حسرت و پریشانی کے کانٹوں کا غم دل سے نکال دیتا ہے۔ کیونکہ دعا کا شرفِ قبول پانا ہی حسرت و پریشانی کو زائل کر دیتا ہے۔

۲۶۔ لغات۔ عزا خانہ : ماتم کرنے کی جگہ۔

شرح : اے حضرت! جو آنکھ آپ کی خاکِ در کو آئینہ بنا کر سامنے نہ رکھے، اس کی نگاہ آنکھ کی پتلی سے اقبال کا ماتم کدہ بن جائے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ نگاہ سعادت و اقبال سے محروم ہو جائے۔ آنکھ کی پتلی سیاہ ہوتی ہے، اس لیے اسے ماتم کا گھر بنا دیا۔ آئینہ دار کے معنی خادم کے بھی ہوتے ہیں، یعنی وہ خادم، جو آقا کے سامنے آئینہ رکھتا ہے۔ یہ مطلب بھی یہاں درست ہے، لیکن آئینہ بنا کر سامنے رکھنا زیادہ موزوں ہے۔

۲۷۔ شرح : جو شخص اہلِ بیت کا دشمن ہو، خدا کرے، اس دنیا کے عشرت کدے میں اس کے لیے دیوار کا ہر طاق سیلاب کی انگڑائی کی تصویر بن جائے۔

مطلب یہ کہ ہر طاقِ دیوار سے سیلاب اٹھے اور اس کے عشرت کدے کی اینٹ سے اینٹ بجا دے۔

۲۸۔ لغات۔ راقم : لکھنے والا۔ یعنی اسد یا غالب

سرشار : لبریز۔ جب کوئی پیالہ وغیرہ اتنا بھر جائے کہ کناروں سے

پینے لگے تو اسے سرشار کہتے ہیں۔

شرح : اسدؔ یعنی غالبؔ آنکھ سے دل تک پرتوِ شوق کا ایک آئینہ بنا ہوا ہے، یعنی دیدہ و دل دونوں اظہارِ شوق میں بیتاب ہیں اور حقیقت کی شراب سے میرا پیالہ آخری خط تک لبا لب بھرا ہوا ہے۔

(۲)

امیرُ المُومنین حضرت علیؑ کی منقبت میں !

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم
لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں !

نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت
سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں

۱۔ شرح : کائنات میں کے سوا کیا ہے کہ محبوب حقیقی کی یکتائی و یگانگی کا ایک پرتو ہے؟ اگر اُس کے حسن میں خود بینی کی آرزو نہ ہوتی تو ہم کیونکر وجود پاتے؟ یعنی محبوب

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے، چہ دنیا و چہ دیں

مثلِ مضمونِ وفا باد بہ دستِ تسلیم
صورتِ نقشِ قدم خاک بہ فرقِ تمکیں

عشقِ بے ربطیٔ شیرازۂ اجزائے حواس
وصل، زنگارِ رُخِ آئنۂ حُسنِ یقیں

کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بے ستوں آئنۂ خوابِ گرانِ شیریں

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز؟
کس نے پایا اثرِ نالۂ دل ہائے حزیں؟

سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں لیکن
نہ سر و برگِ ستائش نہ دماغِ نفریں

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ
یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں

نقشِ لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر
یا علیؑ عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں؟

حقیقی نے اپنے کمالِ حُسن کی نمائش کے لیے یہ کائنات پیدا کی اور یہ آئینہ ہے، جس میں اس کا عکس پڑ رہا ہے۔ ایک مشہور قول ہے، جو بطور حدیث پیش کیا جاتا ہے: کُنتُ کنزاً مخفیاً فاحببت عن اعرف فخلقت الخلق لکی اعرف (میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا، میں نے پسند کیا کہ اس کی معرفت و شناسائی ہو یعنی اسے پہچانا جائے چنانچہ میں نے مخلوق پیدا کی، یہاں تک کہ

مظہرِ فیضِ خدا جان و دلِ ختم رسل
قبلۂ آلِ نبی کعبۂ ایجادِ یقین

ہو وہ سرمایۂ ایجاد جہاں گرمِ خرام
ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں

جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اس کا جس جا
وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں

نسبتِ نام سے اس کی ہے یہ رتبہ کہ رہے
ابداً پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں

فیضِ خلق اس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا
بوئے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں

بُرشِ تیغ کا اس کی ہے جہاں میں چرچا
قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں

کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بت خانۂ چیں

جاں پناہا! دل و جاں فیض رسانا! شاہا!
وصیِ ختم رسل تو ہے بہ فتوائے یقین

میں پہچانا گیا) شعر میں یہی مضمون باندھا گیا ہے۔
مولانا طباطبائی فرماتے ہیں: تصوف کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ حقائقِ ممکنات کو ذاتِ واجب الوجود سے وہی تعلق ہے، جو آفتاب کو اجسام سے ہے۔ ہر جسم میں جیسی قابلیت ہوتی ہے، اسی کے مطابق آفتاب کا نور اس میں پہنچتا اور منعکس ہوتا ہے۔ مثلاً سیاہ پتھر میں نور کا فیضان بہت کم پہنچتا ہے اور آئینے میں پورا آفتاب اتر آتا ہے۔ اسی طرح

جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر
نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں
کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب
شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں
آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ
رقمِ بندگیٔ حضرتِ جبریلِ امیں
تیرے در کے لیے اسبابِ نثار آمادہ
خاکیوں کو جو خدا نے دیئے جان و دل و دیں
تیری مدحت کے لیے ہیں دل و جان کام و زباں
تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں
کس سے ہو سکتی ہے مداحیٔ ممدوحِ خدا!
کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں!
جنسِ بازارِ معاصی اسد اللہ اسد
کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں
شوخیٔ عرضِ مطالب میں ہے گستاخ طلب
ہے ترے حوصلۂ فضل پر از بس کہ یقیں

ممکنات میں بھی وجودِ واجب کا جلوہ پہنچ رہا ہے اور پوری کائنات اسی وجود کا پرتو ہے اگر اس وجود کو اپنا پرتو دیکھنا نہ ہوتا تو ہماری تخلیق کیوں ہوتی سمجھنا یہ چاہیئے کہ دنیا کی ہر شے قدرت باری تعالیٰ کا مظہر ہے اور یوں پوری کائنات کو اس کی خود بینی کا آئینہ قرار دیا جا سکتا ہے۔"

۲- شرح

ہم نے کائنات کا نظارہ انتہائی بیدلی سے کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ اس نظارے سے

دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسنِ قبول
کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمین

غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز
کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں

طبع کو الفتِ دُلدُل میں یہ سرگرمیٔ شوق
کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبیں

دلِ الفت نسب و سینۂ توحید فضا
نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں

صرفِ اعدا اثرِ شعلۂ دُودِ دوزخ
وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوسِ بریں

کوئی سبق حاصل کیا نہ کوئی نصیحت پائی اور نہ کچھ لطف اٹھایا۔ اسی طرح ہماری تمنا بھی حد درجہ بیکس اور لاچار رہی کہ نہ اس نے دنیا حاصل کی، نہ دین کا نفع اٹھایا، اگر عبرت حاصل کرتے تو دیندار بن جاتے۔ اگر لطف اٹھاتے تو دنیا مل جاتی، لیکن ہم دونوں سے محروم رہے۔

شاعر کا مقصد یہ ہے کہ اگر انسان کائنات پر نصیحت حاصل کرنے کی غرض سے نظر ڈالے تو اس نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ آنی اور فانی ہے۔ اس میں کوئی ثبات و استقلال نہیں۔ اس میں ہر لحظہ تغیر جاری ہے اور تغیر بے ثباتی کی دلیل ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ کائنات کے بجائے معبودِ حقیقی سے لو لگائے۔ یہی دینِ حق ہے۔ اگر کائنات کو محض لطف و لذت حاصل کرنے کی غرض سے دیکھا جائے تو یہاں اس کے لیے بھی ہر طرف سامان پھیلے ہوئے ہیں۔ انسان جتنا لطف چاہے، اٹھائے، گر وہ اپنے مقصد سے غافل ہو جائے گا اور انسانی شرف کھو بیٹھے گا۔ بہر حال جس نظارے میں نہ عبرت ہو، نہ ذوق، وہ بیدلی کی دلیل

ہے۔ جس تمنا میں نہ دنیا ہاتھ آئے، نہ دین، اس کے بے سروپا ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے؟

۳۔ **لغات** : **ہرزہ** : فضول، بیکار، بے سود

زیروبم : نیچا اور اونچا سُر۔

تمکین : جماؤ، ٹھہراؤ، ہوشیاری۔

شرح : وجودِ باری تعالیٰ کے سوا کسی اور کی ہستی یا نیستی کے اونچے سُر نکالنا بالکل بے سود اور بیکار ہے۔ ذکرِ باری تعالیٰ کے سوا دیوانگی اور ہوشیاری میں فرق و امتیاز کا آئینہ دکھانا سراسر لغو ہے۔ یعنی کائنات کی ہستی اور نیستی کا معاملہ اس لائق ہی نہیں کہ کوئی اس میں وقت صرف کرے، کیونکہ امرِ حقیقی ذات باری تعالیٰ ہے اور بس۔

مطلب یہ کہ باری تعالیٰ کا ذکر نہ ہو تو یہاں جو کچھ ہے، اس کی دیوانگی اور ہوشیاری میں امتیاز کی کون سی وجہ ہے؟ جو ذکر سے غافل ہے، وہ سراسر دیوانہ ہے اور جو ذکر سے غافل نہیں، صرف اسے ہوشیار سمجھا جا سکتا ہے۔ گویا اس بارے میں امتیاز کا پیمانہ صرف ذکر ہے۔

۴۔ **لغات** : **خمیازہ** : انگڑائی۔

شرح : جو لوگ معنی شناسی کے مدعی ہیں، وہ صرف ظاہرداری میں الجھے ہوئے ہیں گویا ان کی معنی شناسی سراسر ظاہری نمائش کی ایک انگڑائی ہے۔ اس طرح جو لوگ حق گو ہیں، انھیں بھی تحسین و آفرین کا ذوق ہے، یعنی وہ بھی یک قلم اسی ذوق کا پیمانہ بنے ہوتے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ اچھی باتیں وہی سمجھی جا سکتی ہیں، جو تحریر و تقریر میں نمود شہرت کے لوث سے پاک ہوں۔ حقیقی معنی شناسی وہی ہے، جس میں ظاہرداری کا کوئی لگاؤ نہ ہو اور حق گوئی وہی ہو سکتی ہے، جس کے لیے کسی سے مدح وستائش کی تمنا نہ رکھی جائے اور دل ایسی تمنا سے بالکل خالی ہو۔

۵۔ لغات : دُرد : تلچھٹ

شرح : جو بھی دنیا کے معاملات میں عقل و دانش کا دعویٰ کرتا ہے، اسے سراسر غلط سمجھنا چاہیے اور جو بھی عبادت سے فائدے کی امید رکھتا ہے، وہ بھی ہیچ ہے۔ دنیا ہو یا دین، ہم نے دونوں کو غفلت کے پیالے کی تلچھٹ بنا دیا ہے۔

تلچھٹ کوئی نہیں پیتا، بلکہ وہ پھینک دی جاتی ہے۔ گویا ہماری دنیا ہو یا دین، دونوں ہمارے ہاتھوں خراب ہیں، کیونکہ نہ ہمیں حقیقۃً معاملاتِ دنیا کا صحیح شعور ہے اور نہ ہماری عبادت کا وہ رنگ ہے، جو پیدا کرنا لازم ہے۔

۶۔ لغات۔ باد بدست : خالی ہاتھ

تسلیم : رضا۔ بندگی۔

شرح : جس طرح وفاداری سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، اسی طرح رسمی رضا و بندگی بھی انسان کو خالی ہاتھ رکھتی ہے۔ نقشِ قدم کو پائدار و استوار مانا جاتا ہے، لیکن اس کی حیثیت اس کے سوا کیا ہے کہ پامال ہوتا ہے، ذلت اٹھاتا ہے اور اس کی پائداری کے سر پر خاک پڑتی ہے۔

۷۔ شرح : ہمارے زمانے میں اہلِ ہوش و خرد کے نزدیک عشق اس کا نام ہے کہ اجزائے حواس کا شیرازہ درہم برہم ہو جائے یعنی انسان ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ محبوب کا وصل حسنِ یقین کے آئینے پر زنگار کی حیثیت رکھتا ہے۔

دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہے، دل میں حسنِ یقین موجود ہو تو اپنے آئینے میں ایسی چمک دمک پیدا کر لیتا ہے کہ محبوب کا جلوہ بے تکلف نظر آئے۔ اگر وصل حاصل ہو جائے تو وہ اس آئینے کے لیے زنگ بن جاتا ہے اور اس کی آب و تاب زائل ہو جاتی ہے۔

۸۔ لغات : گرسنہ : بھوکا۔

بے ستون : ایران کا وہ پہاڑ، جس کے متعلق مشہور ہے کہ فرہاد نے باغ شیریں کے لیے دودھ کی نہر لانے کی غرض سے کاٹا تھا۔

شرح : ہم فرہاد کے دعوائے عشق کے قائل نہیں۔ وہ تو ایک مزدور تھا، جو روزی کی خاطر اپنے رقیب یعنی خسرو پرویز کی عشرت گاہ کے لیے محنت مشقت کرتا رہا اور اس کی محبوبہ شیریں کی غفلت و بے پروائی کا یہ عالم کہ بے ستون پہاڑ گویا اس کی گہری نیند کا ایک آئینہ تھا۔

پورا شعر اس مشہور قصّے پر مبنی ہے کہ فرہاد خسرو پرویز شہنشاہ ایران کی محبوب قفقازی بیوی شیریں پر عاشق ہو گیا تھا۔ اسے دوسری طرف مائل کرنے کی غرض سے یہ منصوبہ تیار کیا گیا کہ فرہاد سے کہا جائے، اگر وہ پہاڑ کاٹ کر شیریں کے باغ کے لیے نہر لے آئے تو شیریں اسے مل جائے گی۔ یہ باغ خسرو پرویز کا تھا۔ عام روایت کے مطابق فرہاد نے پہاڑ کاٹ کر نہر باغ تک پہنچا دی۔ گویا اس کی طرف سے شرط پوری ہو گئی۔ اب اس سے نجات حاصل کرنے کی تدبیر یہ سوچی گئی کہ ایک بڑھیا کی زبانی کہلا بھیجا: شیریں مر گئی یہ سنتے ہی فرہاد بھی سر پر تیشہ مار کر ختم ہو گیا۔

مرزا کہتے ہیں، بھلا یہ عشق کی کون سی صورت ہے کہ رقیب کی عشرت گاہ کے لیے مزدوری کی جائے اور اس طرح بھوک مٹائی جائے؟ دوسری طرف شیریں کی غفلت کا یہ عالم کہ اسے کچھ خبر ہی نہیں۔ گویا گہری نیند میں سوئی پڑی ہے اور نیند بھی ایسی، جو بے ستون پہاڑ کی طرح ٹوٹنے نہ پائے۔

۹۔ شرح : خوب چھان بین کرو اور دیکھو کہ اہلِ وفا میں سے کوئی شخص ایسا ہے، جس کے سانس یا آہ سے آگ بھڑکتی ہو؟ کیا کسی نے غمگین دلوں کی فریاد و فغاں میں اثر پایا ہے؟

گویا اہلِ وفا آہیں بھرتے ہیں اور ان سے کسی کے دل میں آگ نہیں لگتی۔ غم کے مارے ہوئے فریاد کرتے ہیں اور اس کا اثر کسی پر نہیں ہوتا۔

۱۰۔ **لغات۔** سامع : سننے والا۔

شرح : میں دنیاداروں کے زمزمے سنتا ہوں، لیکن نہ کسی کے لیے میرے پاس مدح وستائش کا سامان ہے، نہ کسی کے خلاف اظہارِ نفرت کی زحمت اٹھاسکتا ہوں۔

۱۱۔ **لغات۔** ہرزہ سرا : بیہودہ گو، بے سروپا باتیں کہنے والا۔

عیاذاً باللہ : خدا کی پناہ۔

یہ شعر گریز کا ہے۔

شرح : پناہ بخدا، میں کس قدر بے سروپا باتیں کر رہا ہوں، جو عزت وتمکنت کے آداب سے بالکل خارج ہیں! لہٰذا اب اُس امر کی طرف پلٹنا چاہیے، جو حقیقۃً ذکر کے لائق ہے۔

۱۲۔ **لغات** : نقش : تعویذ۔

ہذیاں تحریر : بے جوڑ باتیں لکھنے والا۔

وسواس قریں : جو وسوسوں کے نزدیک ہو۔

شرح : اے بے جوڑ باتیں تحریر کرنے والے قلم! لاحول کا تعویذ لکھ اور اے فطرت، جو وسوسوں کے دائرے میں پہنچی ہوئی ہے! یا علی کہہ۔

لاحول کا خاصہ ہی یہ ہے کہ شیطانی وسوسوں کو زائل کر دے اور یہی خاصہ غالب کے نزدیک "یا علی" کا ہے۔

۱۳۔ **شرح** : وہ علیؑ، جو فیضِ خدا کے مظہر ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کا فیض ان کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جو رسولوں کے خاتم رسول اللہ (صلعم) کے جان ودل یعنی عزیز ہیں۔ وہ علیؑ جو آلِ رسولؐ کا قبلہ ہیں، یعنی گیارہ امام انہیں کی نسل سے ہیں۔ وہ علیؑ، جو یقین کی ایجاد کا کعبہ ہیں یعنی کعبۂ یقین ہیں۔

کعبۂ یقین میں غالباً یہ روایت پیشِ نظر رکھی : لو کشف الغطاء لما ازددت یقیناً (اگر حجاب میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹا دیے جائیں تو ذاتِ باری تعالیٰ پر میرے یقین میں ذرہ بھر اضافہ نہ ہوگا، یعنی میرا یقین اب بھی ایسا ہی ہے جیسا پردے اٹھ جانے اور براہِ راست ذاتِ باری تعالیٰ

دیدار سے مشرف ہونے پر ہو سکتا ہے۔

۱۴۔ لغات۔ ایجاد : تخلیقِ کائنات، جہان کا پیدا کرنا۔

گردہ : خاکہ، جو مصوّر تیار کر لیتے ہیں، پھر اس میں رنگ بھر کر تصویر بنا لیتے ہیں۔

شرح : حضرت علیؑ کا مقدس وجود اس جہان کا سرمایہ ہے۔ وہ جہاں بھی گرمِ خرام ہو، وہاں خاک کی ہر مٹھی ایک نئی زمین کی تصویر کا خاکہ بنتی جائے گی۔

۱۵۔ شرح : حضرت علیؑ کا نقشِ قدم جس جگہ جلوہ دکھائے، خاک کی وہ مٹھی دونوں جہانوں کی عزّت کی امین بن جائے۔

۱۶۔ لغات : ابداً : ہمیشہ کے لیے۔

شرح : حضرت علیؑ کے نام کی نسبت سے زمین کو یہ رتبہ ملا کہ اس کے ناز اٹھانے کی غرض سے آسمان ہمیشہ کے لیے جھک گیا۔ گویا آسمان کے جھکاؤ کا مقصد یہ ہے کہ زمین کے ناز اٹھائے، کیونکہ اس نے حضرت علیؑ کے نام سے نسبت پائی۔

یہ اشارہ حضرت علیؑ کی مشہور کنیت "ابوتراب" کی طرف ہے، ابو: باپ اور تراب: خاک۔

مطلب یہ کہ حضرت علیؑ کی کنیت "ابوتراب" ہوئی تو زمین کا رتبہ اتنا بلند ہو گیا کہ آسمان اس کے ناز اٹھانے کی خاطر ہمیشہ کے لیے جھک گیا۔

۱۷۔ لغات : عطر آگیں : عطر سے بھرا ہوا۔ معطّر۔

شرح : حضرت علیؑ ہی کے فیضِ خلق کا یہ اثر ہے کہ صبح کی ہوا پھولوں کی خوشبو سے معطّر ہوتی ہے۔

۱۸۔ لغات۔ بُرِش : کاٹ۔

شرح :۔ دنیا میں حضرت علیؑ کی تلوار یعنی ذوالفقار کی کاٹ کا چرچا

عام ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس دنیا کا سررشتۂ حیات ہی کٹ جائے۔

۱۹۔ شرح : حضرت علیؓ کا جلوہ اس طرح کفر کو جلا کر رکھ دیتا ہے کہ اگر اس کا پرتو چین کے بُت خانے پر پڑے تو اس کی رونق اور چہل پہل عاشق کے رنگ کی طرح زائل ہو جائے۔

معلوم ہے کہ عاشقوں کا رنگ ہمیشہ اڑا رہتا ہے۔ اسی طرح چین کے بُت خانے کی رونق بھی اڑ جائے گی۔

۲۰۔ لغات۔ وصی : حضرت علیؓ کا مشہور لقب، جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے لیے رسول اللہ (صلعم) نے خاص وصیت فرمائی۔

شرح : اے جان کی پناہ گاہ! اے دل و جان کو فیض پہنچانے والے! اے شاہ! بیشک آپ یقین کے فتوے کی بنا پر خاتم الانبیا یعنی رسول اللہ (صلعم) کے وصی ہیں۔

۲۱۔ شعر میں اس روایت کی طرف اشارہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ (صلعم) خانۂ کعبہ میں تشریف لائے تو حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ جو بُت اونچے رکھے ہوئے ہیں، وہ میرے کندھوں پر چڑھ کر توڑ ڈالو۔

شرح : اے حضرت! آپ کے پاک جسم کے لیے رسول اللہ (صلعم) کا دوش مبارک منبر بنا اور آپ کے نام نامی کے لیے عرش کی پیشانی نگیں بن گئی۔ یعنی عرش کی پیشانی پر یہ نام کندہ ہے۔

۲۲۔ لغات۔ واجب : باری تعالیٰ۔

آئین باندھنا : آئین بستن کا ترجمہ ہے، جس کے معنی ہیں زیب و زینت دینا۔

شرح : اے حضرت! آپ کی مدح صرف باری تعالیٰ ہی سے ممکن ہے۔ سچ ہے، شمع کا شعلہ ہی شمع کے لیے زیب و زینت اور فروغ کا باعث ہوتا ہے۔

شعلے سے مراد ذات باری تعالیٰ ہے اور شمع حضرت علیؓ۔ شمع شعلے کے

بغیر روشن نہیں ہو سکتی۔ باری تعالیٰ کے شعلے نے اسے روشن کیا اور وہی شعلہ شمع کے لیے زیب و زینت کا باعث ہے۔

پہلے مصرع میں "ممکن" کی رعایت سے "واجب" لایا گیا، ورنہ اس کی اور صورتیں بھی ہو سکتی تھیں۔

۲۳۔ شرح : اے حضرت! آپ کی چوکھٹ پر جو پتھر لگا ہوا ہے اسے آئینہ فرض کر لیا جائے تو اس کے جوہر حضرت جبریل امین کی فرمانبرداری کی تحریریں ہیں۔

ہر آئینے میں جوہر ہوتے ہیں۔ حضرت علیؑ کے سنگ آستان کا جو آئینہ ہے، اس میں جوہروں کے بجائے یہ تحریریں درج ہیں کہ حضرت جبریلؑ حضرتِ علیؑ کے فرمانبردار اور اطاعت گزار ہیں۔

۲۴۔ شرح : اے حضرت! روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کو خدا نے جو جان و دل و دین عطا کیے، وہ ہر لحظہ آپ کے دروازے پر نچھاور ہونے کے لیے آمادہ ہیں۔

۲۵۔ شرح : اے حضرت! دل، جان، منہ اور زبان صرف آپ کی مدح سرائی کے لیے ہیں۔ تختی اور قلم، ہاتھ اور پیشانی کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو سلام کرتے رہیں۔

دوسرے مصرع کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ لوح و قلم آپ کے سلام کے لیے ہاتھ اور پیشانی بن گئے ہیں۔ اس صورت میں قلم کو ہاتھ اور لوح کو پیشانی قرار دیا۔ گویا یہ لف و نشر غیر مرتب ہے۔

آخری مفہوم کے مطابق لوح سے مراد لوحِ محفوظ اور قلم سے مراد قلمِ قدرت ہے یعنی قضا و قدر۔

۲۶۔ شرح : جس کی ستائش خدا نے کی ہو، اس کی ستائش کس سے ہو سکتی ہے؟ کیا فردوس بریں کی آرائش بھی کوئی کر سکتا ہے؟

مطلب یہ کہ فردوسِ بریں آرائش اور زیبائش کی آخری منزل ہے۔ پھر اس میں کوئی نئی آرائش کیا کرے گا؟ اسی طرح ممدوحِ خدا کی مدح میں کوئی کیا کر سکتا ہے؟

۲۷۔ لغات۔ معاصی: معصیت کی جمع، گناہ۔

شرح: اسد اللہ اسدؔ گناہوں کے بازار کی جنس ہے۔ اے حضرت! وہ اس درجہ ناچیز ہے کہ آپ کے سوا اس کا کوئی گاہک اور کوئی پوچھنے والا نہیں یعنی آپ ہی کے وسیلے سے اس کے گناہ معاف ہو سکتے ہیں۔

۲۸۔ شرح: اے حضرت! میں (اسدؔ) اپنے مطالب شوخی کے ساتھ پیش کرتا ہوا طلب میں جسارت سے کام لے رہا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ مجھے آپ کے لطف و کرم کی وسعت پر پورا بھروسا ہے۔

۲۹۔ لغات۔ اجابت: قبول

شرح: اے حضرت! میری دعا کو حسنِ قبول کا وہ مرتبہ عطا فرمایئے کہ اس کے ہر حرف پر خود قبول سو مرتبہ آمین کہے۔

۳۰۔ شرح: حضرت امام حسینؓ کا غم میرے سینے میں اس قدر بھرا رہے کہ خونِ جگر سے میری آنکھیں ہمیشہ رنگین رہیں۔

۳۱۔ لغات۔ دُلدُل: ایک خچر کا نام تھا، جو سکندریہ کے حاکم نے رسول اللہ (صلعم) کو بطور ہدیہ بھیجا تھا اور آپ نے حضرت علیؓ کو عطا فرما دیا۔

شرح: میری طبیعت پر دلدل کی محبت میں شوق کی سرگرمی کی یہ کیفیت طاری رہے کہ جہاں تک وہ چلا جائے، اس کا قدم ہو اور میری پیشانی یعنی اس کا ہر قدم میری پیشانی پر پڑے۔

۳۲۔ لغات۔ دلِ الفت نسب: وہ دل، جسے الفت سے نسبت ہو۔

سینۂ توحید فضا: وہ سینہ جس کی فضا توحید ہو، یعنی توحید سے لبریز ہو۔

صدق گزیں۔ سچائی اختیار کرنے والا۔

شرح: دوزخ کی آگ اور اس کا دھواں دشمنوں پر صرف ہو۔ فردوس بریں کے پھول اور سنبل دوستوں کے حصے میں آئیں۔

اس شعر میں صنعت، تقابل کمال پر پہنچا دی ہے۔ دیکھیے، صرف کے مقابلے میں وقف، اعدا کے مقابلے میں احباب، شعلے کے مقابلے میں گل، دود کے مقابلے میں سنبل، دوزخ کے مقابلے میں فردوس بریں۔

(۳)

بہادر شاہ کی مدح میں

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام	جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دم صبح	یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب؟	بندہ عاجز ہے گردشِ ایام
اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا	آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا اے سرورِ خاص خواص!	حبذا اے نشاطِ عامِ عوام

عذر میں تین دن نہ آنے کے
لے کے آیا ہے عید کا پیغام

اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا
صبح جو جائے اور آئے شام

ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور ترا انجام

رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام

جانتا ہوں کہ آج دنیا میں
ایک ہی ہے امید گاہِ انام

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالب اس کا مگر نہیں ہے غلام

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تُو
تب کہا ہے بہ طرزِ استفہام

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ!
قربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام

ق

تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا
جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام

جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

ماہ بن، ماہتاب بن، میں کون؟
مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام

میرا اپنا جدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام

ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص
گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِّ فروغ | کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام؟
جب کہ چودہ منازلِ فلکی | کر چکی قطع تیری تیزیِ گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر | کوے و مشکوے و صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز | اپنی صورت کا اک بلوریں جام
پھر غزل کی روش پہ چل نکلا | توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام | تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام؟
مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں | غم سے جب ہو گئی ہے زیست حرام
بوسہ کیسا؟ یہی غنیمت ہے | کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام
کعبے میں جا بجائیں گے ناقوس | اب تو باندھا ہے دیر میں احرام
اس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد | چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ جام
بوسہ دینے میں ان کو ہے انکار | دل کے لینے میں جن کو ہے ابرام

چھیڑتا ہوں کہ ان کو غصہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالب اپنا نام

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تُو کہہ ‏ اے پری چہرہ! پیکِ تیز خرام!

کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا ‏ ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام!

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن ‏ نامِ شاہنشہِ بلند مقام

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ ‏ مظہرِ ذو الجلال والاکرام

شہسوارِ طریقۂ انصاف ‏ نوبہارِ حدیقۂ اسلام

جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز ‏ جس کا ہر قول معنیٔ الہام

بزم میں میزبانِ قیصر و جم ‏ رزم میں اوستادِ رستم و سام

اے ترا لطف زندگی افزا ‏ اے ترا عہد فرخی فرجام

چشمِ بد دور! خسروانہ شکوہ ‏ لوحش اللہ! عارفانہ کلام

جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم ‏ جُرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام

وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے ‏ ایرج و تور و خسرو و بہرام

زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے ‏ گیو و گودرز و بیژن و رُہّام

مرحبا مُوشگافیٔ ناوک ‏ آفریں آب داریٔ صمصام

تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف ‏ تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام

ق

رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند	برق کو دے رہا ہے کیا الزام
تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا	تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام

ق

فنِ صورت گری میں تیرا گرز	گر نہ رکھتا ہو دستگاہ تمام
اس کے مضروب کے سر و تن سے	کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام؟
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے	صفحہ ہائے لیالی و ایام
اور ان اوراق میں بہ کلکِ قضا	مجملاً مندرج ہوئے احکام
لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کُش	لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام
آسماں کو کہا گیا کہ کہیں	گنبدِ تیز گردِ نیلی فام
حکم ناطق لکھا گیا کہ لکھیں	خال کو دانہ اور زلف کو دام
آتش و آب و باد و خاک نے لی	وضعِ سوز و نم و رم و آرام
مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز	ماہِ تاباں کا اسم شحنۂ شام
تیری توقیعِ سلطنت کو بھی	دی بدستور صورتِ ارقام
کاتبِ حکم نے بموجب حکم	اس رقم کو دیا طرازِ دوام

ہے ازل سے روانیٔ آغاز

ہو ابد تک رسائیٔ انجام!

(۲)

بہادر شاہ کی مدح میں

۱۔ شرح : ہاں، عید کے نئے چاند! اُس کا نام بھی تو بتادے جسے تو جھک جھک کر سلام کر رہا ہے۔

نئے چاند میں خم ہوتا ہے اور کوئی جُھک کر سلام کرے تو اس کی صورت ہلال جیسی ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہا، ہلال جھک کر سلام کر رہا ہے۔

۲۔۳۔۴۔ شرح : تُو دو دن صبح کے وقت نظر آیا۔ تیرا یہی انداز تھا اور ایسا ہی نازک اور باریک تھا، لیکن دو دن کہاں غائب رہا ہے۔ ہلال جواب دیتا ہے کہ میں گردشِ ایام کی وجہ سے مجبور تھا۔ اڑ کر کہاں چلا جاتا، آسمان نے تو تاروں کا جال بچھا رکھا تھا اور میرے لیے اڑنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔

رمضان یا ہر قمری مہینے کی چھبیسویں تاریخ کو صبح کے وقت چاند دیکھتے ہیں۔ اگر نظر آجائے تو گمانِ غالب ہو جاتا ہے کہ انتیس کا چاند ہوگا۔ اگر ستائیسویں تاریخ کو بھی نظر آجائے تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ مہینا تیس کا ہے اور تیسویں کو نیا چاند طلوع ہوگا۔ گویا نئے مہینے کا چاند دو دن صبح کو بہت باریک نظر آتا ہے اور دو دن بالکل نظر نہیں آتا۔ یہی مضمون میرزا نے ان شعروں میں پیشِ نظر رکھا ہے۔ چاند نے بتا دیا کہ میں اُڑ کر تو کہیں جا نہیں سکتا تھا، کیونکہ

تاروں کا جال موجود تھا، لیکن زمانے کی گردش کا طریق یہی ہے کہ نئے مہینے کے آغاز سے دو روز پیشتر صبح کو نظر نہ آؤں اور اس سے دو دن پہلے ہلال کی شکل میں نظر آؤں۔

۸-۵ - لغات : حَبَّذا : واہ وا۔

شرح : واہ وا اے خاص لوگوں کی خاص شادمانی، واہ وا اے عام لوگوں کی عام خوشی! تین دن نظر نہ آیا اور اس غیر حاضری کے عذر میں عید کا پیغام لے کر آیا۔ بیشک جو صبح جائے اور شام آئے، اسے بھولا نہ کہنا چاہیئے۔ تنہا مجھ پر موقوف نہیں، تیرا آغاز اور انجام سب پر روشن ہو گیا۔

ساتویں شعر کے متعلق مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ کس لطف سے اس مثل کو موزوں کیا ہے کہ صبح کا بھولا شام کو آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے اور کس محل پر صرف کیا ہے۔ چھبیسویں یا ستائیسویں کی صبح کو چاند نکل کر پھر انتیسویں یا تیسویں کی شام کو دکھائی دیتا ہے۔ اس سے لطفِ کلام ظاہر ہے۔

۹ - لغات - نمّام : چغلخور۔

شرح : اے ہلال! تُو اپنے دل کا بھید مجھ سے کیوں چھپاتا ہے؟ کیا مجھے چغلخور سمجھ لیا ہے کہ تیری پیٹھ پیچھے وہ بھید ہر ایک سے کہتا پھروں گا؟

۱۰ - لغات : انام : لوگ۔

شرح : میں جانتا ہوں کہ آج دنیا میں صرف ایک وجود ہے، جس سے لوگوں کی امیدیں وابستہ ہیں۔

یہ شعر پہلے شعر کا جواب ہے، جس میں چاند سے پوچھا گیا تھا کہ تُو جس وجود کو جھک جھک کر سلام کر رہا ہے، اس کا نام کیا ہے؟ اسی کے متعلق چاند سے پوچھا تھا کہ دل کا بھید مجھے بتا دے، میں کوئی چغلخور ہوں؟ آگے

پہل کر یہ حقیقت خود واضح کر دی ہے۔

۱۱۔ شرح : میں نے مانا کہ تو نے ایک وجود کا حلقۂ نیاز کان میں ڈال رکھا ہے، لیکن کیا غالب اسی کا غلام نہیں ؟ یہاں ہلال کو حلقے سے تشبیہ دی ہے۔

۱۲۔ لغات ۔ بطرزِ استفہام : وہ سوال جو کسی بات کو سمجھنے کی غرض سے کیا جائے۔

شرح : میں جانتا ہوں، تُو اس حقیقت سے واقف ہے کہ تیرا آقا اور میرا آقا ایک ہے، جبھی میں نے تجھ سے یہ سوال کیا، لیکن یہاں استفہام کو انکاری نہ سمجھنا چاہیے، یعنی سوال سے مقصود اصل شے کا اثبات ہے، نہ کہ نفی۔

۱۳۔ لغات : بر سبیلِ دوام : ہمیشہ کے لیے۔

شرح : اے چاند ! بادشاہ کی بارگاہ میں ہمیشہ کے لیے روشن آفتاب کو بار ہو تو ہو، مجھے اور تجھے تو یہ مرتبہ حاصل نہیں۔

۱۴۔ ۱۷۔ شرح : بجلا عید الفطر کی تقریب کے سوا حضورِ پُر نور سے روشناس ہونے کا موقع کب ملتا ہے اور تجھے یہ منصب کہاں حاصل ہے ؟ میں اتنا جانتا ہوں کہ تو بادشاہ سے فیض یاب ہو کر پورا چاند یعنی بدر بن جانا چاہتا ہے۔ تُو چاند بن، چاندنی بن، میں پوچھنے والا کون ہوں؟ کیا تو جو انعام پائے گا وہ بانٹ کر مجھے دے دے گا؟ میرا اپنا معاملہ الگ ہے، کسی اَور کے لین دین سے مجھے کیا کام ہے؟

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ سارے قصیدے میں عموماً اور شعر ۱۶ میں خصوصاً میرزا نے اردو زبان اور حسنِ بیان کی عجب شان دکھائی ہے ایک مصرع میں تین جملے، جس کے مضمون سے رشک ٹپک رہا ہے۔ دوسرا مصرع طنز سے بھرا ہوا ہے۔ چاروں جملوں میں حسنِ انشاء، پھر خوبی نظم اور بے تکلفی ادا !

۱۸- شرح : اگر تجھے عام لطف و کرم کی اُمید ہے تو مجھے خاص بخشش کی تمنا ہے، یعنی ایسی بخشش جو میرے لیے خاص ہو اور اس سے تمام اُمیدیں بر آئیں۔

۱۹- لغات - فرّ : شان، شوکت، روشنی

شرح : جو مبارک وجود تجھے دنیا کو منور کردینے والی روشنی عطا کرے گا کیا وہ میرے لیے پھول کے سے رنگ کی شراب کا انتظام نہ کردے گا۔

۲۰- ۲۲- لغات : منازلِ فلک : آسمانی منزلیں۔

مشکوے : شاہی محل۔

منظر : دریچہ۔

شرح : جب تو تیز رفتاری سے کام لے کر آسمان کی چودہ منزلیں طے کر جائے، یعنی ماہ کامل بن جائے اور تیرے نور سے کوچے، شاہی محل صحن، دریچے، چھتیں جگمگانے لگیں تو دیکھنا میرے ہاتھ میں بھی شراب سے لبریز بلّوریں پیالہ ہوگا، جس کی صورت تیری صورت جیسی ہوگی۔

۲۳- شرح : دیکھیے میری طبیعت کے گھوڑے کو لگام چاہیے تھی وہ ہے نہیں، لہٰذا یہ جدھر چاہتا ہے، چل نکلتا ہے۔ اب اس نے غزل کا راستہ اختیار کرلیا ہے۔

غزل

۲۴- شرح : غم کا زہر میرے جسم میں اس پیمانے پر اثر کر چکا تھا کہ بچنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی، لیکن اے محبوب! تو مجھے اس حالت میں قتل کر کے کیوں بدنام ہوا، تجھے کس نے کہا تھا کہ یہ صفت کا الزام اپنے ذمّے لے لے۔

۲۵۔ شرح: جب غم سے زندگی حرام ہو گئی ہو تو پھر شراب ہی کیوں نہ پیے جاؤں تاکہ غم غلط ہو جائے؟

مطلب یہ ہے کہ شراب یقیناً حرام ہے، لیکن غم کے باعث زندگی بھی تو حرام ہو گئی ہے۔ کیوں نہ وہ حرام چن لوں، جو دوسرے حرام کو ملیامیٹ کر ڈالے؟

۲۶۔ شرح: بوسے کی کیا اُمید ہو سکتی ہے؟ اسی کو غنیمت سمجھنا چاہیئے کہ محبوب دشنام کی لذّت سے آگاہ نہ ہو۔

محبوب گالیاں دیتا ہے اور ہمیں مزہ آتا ہے۔ اگر اس پر واضح ہو جائے کہ اس کا گالیاں دینا ہمارے لیے لذّت حاصل کرنے کا باعث ہے تو ہماری ضد سے گالیاں دینا چھوڑ دے۔ بوسے کی تمنّا نہ رکھنی چاہیے۔ یہی کافی ہے کہ وہ گالیاں دیے جاتا ہے اور نہیں جانتا کہ ہم ان سے لطف اٹھاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جہاں بات بات پر گالیاں دی جاتی ہوں، وہاں یہ ممکن ہی نہیں کہ عاشق کے دل میں بوسے کا خیال آ سکے۔

۲۷۔ لغات: ناقوس: بہت بڑی کوڑی، سینگ، گھنٹی اور گھنٹا، جو ہندو مندروں میں، آتش پرست آتش کدوں میں اور عیسائی گرجوں میں اسی غرض سے بجاتے ہیں کہ ہم مذہبوں کو وقت عبادت کے متعلق خبردار کر دیں۔

احرام: وہ دو بے سلی چادریں، جو عمرہ اور حج ادا کرنے والے لوگ خاص مقامات سے باندھ لیتے ہیں اور حج یا عمرہ ادا ہو جائے تو اتارتے ہیں۔

شرح: ہم نے بُت خانے میں ہوتے ہوئے احرام باندھ لیا، حالانکہ یہ کعبے کی زیارت کے لیے باندھا جاتا ہے۔ جب ایک الٹا کام کیا تو دوسرا الٹا کام یہ کریں گے کہ کعبے میں ناقوس بجانے لگیں گے، حالاں کہ وہ اذان کا مقام ہے۔

۲۸۔ لغات۔ قدح: پیالہ، شراب کا پیالہ۔

نقد: روپیہ، پیسا، سرمایہ، ادھار کی ضد، یعنی فی الحال۔

وام: قرض، ادھار۔

شرح: مجھے ساغرِ معرفت کا دور فی الحال میسر ہے۔ یہ وہی شراب ہے، جس سے آسمان نے گردش قرض لی ہے، یعنی میری محفل میں اس شراب کا دور چل رہا ہے، جسے پی کر آسمان روزِ اول سے گردش کر رہا ہے اور ابد تک اسی طرح گردش میں رہے گا۔ اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ میری کیفیت کیا ہو گی۔

گردشِ آسمان کم از کم ادبیات میں مسلّم چلی آتی تھی، اس کا مطلب، گردشِ زمانہ سمجھنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ زمین کی جگہ آسمان گردش کرنے لگا۔

۲۹۔ لغات: ابرام: اصرار، ضد۔

شرح: محبوب بوسہ دینے سے انکار کر رہا ہے، حالانکہ دل لے لینے پر تُلا بیٹھا ہے۔

۳۰۔ شرح: میں ہر حال میں محبوب کو چھیڑتا رہتا ہوں تاکہ وہ خفا ہو، مجھے بے نقط سنائے اور میں لطف اٹھاؤں، یہاں تک کہ غالب نام بھی صرف چھیڑ کی غرض سے استعمال کیا۔

غالب کا مطلب ہے وہ شخص، جسے سب پر غلبہ حاصل ہو، جو سب پر فوقیت رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ محبوب یہ سُن کر بھی غصے میں آئے گا۔

غزل کے بعد پھر مدح کی طرف آتے ہیں اور ہلال سے از سرِ نو خطاب شروع ہوتا ہے۔

۳۱۔ لغات۔ پیکِ تیز خرام: تیز رفتار قاصد۔

شرح: مجھے تو جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکا، اے پری جیسے چہرے والے تیز رفتار قاصد! اب تو بول اور بتا۔

۲۲ - لغات - ناصیہ سا : پیشانی رکھنے والا، سجدہ کرنے والا۔
زہرہ : مشہور سیارہ۔
بہرام : مریخ کا فارسی نام، جلّادِ فلک۔
شرح : وہ کون ہے، جس کے دروازے پر چاند، سورج، زہرہ اور مریخ پیشانیاں گھس رہے ہیں۔ یعنی سجدہ کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے اس سے مراد بہادر شاہ ہے، جیسا کہ خود کہتے ہیں۔

۲۳ - ۲۷ لغات : **مظہر :** ظاہر ہونے کا مقام۔
ذوالجلال : صاحبِ عظمت و بزرگی۔
اِکرام : رتبۂ بلند۔
یہ دونوں نام اسماء الٰہی میں سے ہیں، مراد ہے اللہ تعالیٰ۔
حدیقہ : وہ باغ، جس کے گرد چار دیواری ہو۔
سام : رستم کا دادا، زال کا باپ۔
شرح : اے ہلال! تو نہیں جانتا تو اس بلند رتبہ شہنشاہ کا نام مجھ سے سن۔ وہ بہادر شاہ ہے، جو دل اور آنکھ کی قبلہ گاہ ہے۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور رتبۂ اعلیٰ کا مظہر ہے۔
وہ بہادر شاہ، جو انصاف کے راستے کا شہسوار ہے، وہ بہادر شاہ، جو باغِ اسلام کی نو بہار ہے۔
اس کا ہر عمل اعجاز کی مانند ہے، اس کی ہر بات گویا الہامی ہے۔
محفلِ نشاط آراستہ ہو تو اس میں قیصر اور جمشید جیسے بادشاہ مہمانوں کے طور پر شامل ہوتے ہیں۔ اگر جنگ کا معاملہ پیش آ جائے تو رستم اور سام جیسے پہلوان بہادر شاہ سے لڑائی کے فنون سیکھتے ہیں۔

۲۸ - ۴۴ - لغات - فرجام : انجام۔
لوحش اللہ : اصل میں لا اوحشہ اللہ تھا، یعنی خدا اسے وحشت نہ دے۔

مخفف کر کے لوحش اللہ بولنے لگے۔ تعظیم، تحسین اور استعجاب کے لیے بولے ہیں۔ مفہوم ہے ماشاء اللہ، سبحان اللہ۔

جرعہ خوار : جُرعہ، گھونٹ، خوار، پینے والا۔ یہاں جرعہ خوار سے مراد ہے فیض حاصل کرنے والا۔

مرشدِ جام : اس سے اشارہ بدایۃً شیخ احمد جام ژندہ پیل کی طرف ہے۔ شیخ موصوف علاقۂ جام (ولایت ہرات) کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے سنہ ۴۴۱ھ (۱۰۴۹-۵۰ء) اور پچانوے سال کی عمر پاکر سنہ ۵۳۶ھ (۱۱۴۱-۴۲ء) میں وفات پائی۔ اجل اولیا میں شمار ہوتے ہیں۔ جس مقام پر مزار ہے، اس کا نام ہی شیخ جام مشہور ہو گیا۔

ایرج و تور : فریدوں کے دو بیٹے۔

خسرو : اشارہ ہے کیخسرو کی طرف، جو کیانی خاندان کا جلیل القدر بادشاہ تھا۔

بہرام : اس سے مراد بہرام گور ہے، جو ساسانیوں میں ایک مشہور بادشاہ تھا۔

گیو : ایران کا مشہور پہلوان، جو کیخسرو کو ترکستان سے ایران لایا تھا۔

گوُدرز : گیو کا باپ۔

بیژن : گیو کا بیٹا اور رستم کا بھانجا۔ مشہور پہلوان۔ دختر افراسیاب سے بیژن کے عشق کی داستان "شاہنامہ" کا ایک اہم جزو ہے۔

رُہّام : اصل میں رہام، بہ تخفیف ہائے ہوز ہے، لیکن شعرا "ہ" کو مشدد باندھتے ہیں۔ یہ بھی پہلوان تھا اور گودرز کا بیٹا تھا۔

مُوشگافی : بال چیرنا۔ بال کی کھال نکالنا۔

صمصام : وہ تلوار، جو نہ مڑے، نہ جھکے۔

شرح : اب براہِ راست بادشاہ سے خطاب شروع ہو گیا۔ کہتے ہیں، اے بادشاہ! تیرا لطف و کرم زندگی بڑھانے والا ہے اور تیرا عہدِ حکومت ایسا ہے، جو انجام تک سراپا برکت ہے۔

تیری شان و شوکت دیکھ کر بے اختیار زبان پر کلمۂ چشم بد دُور جاری ہو جاتا ہے، یعنی خدا نظرِ بد سے بچائے اور تیرا معرفت سے بھرا ہُوا کلام سن کر انسان پکار اٹھتا ہے : سبحان اللہ، ماشاء اللہ۔

روم کا شہنشاہ تیرے جاں نثاروں میں شمار ہوتا ہے اور شیخ احمد جام "ژندہ پیل" تجھ سے فیض پانے والوں میں شامل ہیں۔

ایرج، تور، خسرو اور بہرام جیسے زبردست فرمانروا تجھی کو ملک کا حقیقی وارث جانتے ہیں۔

گیو، گودرز، بیژن اور رہام جیسے پہلوان تیرے زور بازو کا لوہا مانتے ہیں۔

تیرے تیر کی موشگافی کا کیا کہنا اور تیری تلوار کی آب و تاب باعثِ صد آفریں ہے۔

تیرے تیر نے دشمن کے تیر کو نشانہ ٹھہرا لیا ہے اور تیری تلوار نے مدِ مقابل کی تلوار کو اپنا میان سمجھ لیا ہے۔

۴۵ - ۴۶ - لغات - گراں جسد : بھاری بھرکم جسم والا۔
سبک عناں : تیز رفتار، یعنی وہ گھوڑا، جو باگ کے اشارے پر ہَوا ہو جائے۔

شرح : تیرے بھاری جسم والے ہاتھی کی چنگھاڑ سن کر رعد کا دم رُک رہا ہے۔ تیرے تیز رفتار گھوڑے کی چال بجلی کو سست رفتاری کا مجرم ٹھہرا رہی ہے۔ یعنی تیرے ہاتھی کی چنگھاڑ کو رعد پر اور گھوڑے کی رفتار کو بجلی پر فوقیت حاصل ہے۔

۴۷-۴۸۔ لغات : مضروب : جس پر ضرب لگائی جائے، مراد دشمن۔

ادغام : کسی لفظ کے دو ہم جنس حرفوں کو تشدید سے ایک کر دینا مثلاً رقاص، شداد۔

شرح : تیرے گرز کو مصوری میں قدرتِ کاملہ حاصل نہ ہوتی تو ضرب خوردہ دشمن پر پڑتے ہی اس کا سر اور بدن ایک دوسرے میں پیوست کیوں ہو جاتے؟

مطلب یہ ہے کہ تیرا گرز دشمن پر پڑا تو اس کا سر بدن میں دھنس گیا اور پہلی صورت بگڑ کر ایک نئی صورت پیدا ہو گئی۔

۴۹-۵۷۔ لغات۔ لیالی : لیل کی جمع، راتیں

دشمن کام : اپنی خواہش اور مراد کا دشمن۔ عاشقوں کی خصلت ہی یہ ہے کہ وہ مقصد تک نہیں پہنچتے، برباد و تباہ حال رہتے ہیں۔

حکم ناطق : وہ حکم، جو ٹل نہ سکے، قطعی حکم۔

شحنہ : کوتوال، یہاں مراد ہے وہ افسر، جو رات کو آبادی کی نگرانی کرے۔

توقیع : فرمان۔

صورتِ ارقام : تحریر کی صورت۔

طرازِ دوام : ہمیشگی کا نقش۔

شرح : ازل میں راتوں اور دنوں کے صفحوں پر پیش آنے والے واقعات کی تحریریں ثبت ہوئیں تو قضا و قدر کے قلم نے ان صفحوں پر اختصار سے حکم درج کر دیے۔ یعنی لکھ دیا کہ فلاں دن اور فلاں رات یہ یہ واقعات پیش آئیں گے۔

محبوبوں کے متعلق واضح کر دیا کہ وہ عاشقوں کو قتل کرتے رہیں گے۔ عاشقوں کے بارے میں لکھ دیا کہ ان کی مرادیں بر نہ آئیں گی اور وہ تباہ و خستہ حال

رہیں گے۔

آسمان کی نسبت حکم دے دیا کہ اسے ایک تیز رفتار گنبد کہیں، جس کا رنگ نیلا سا ہے۔

یہ قطعی فیصلہ بھی کر دیا گیا کہ محبوبوں کے تل کو دانہ اور زلف کو جال لکھیں۔

آگ نے جلن پائی، پانی نے نمی لے لی، ہوا نے تیز روی سنبھال لی اور خاک نے آرام و سکون اختیار کر لیا۔

روشن سورج کا نام دن کا بادشاہ قرار پایا۔ چمکیلے چاند کا نام شام کا کوتوال تجویز ہوا۔

اے بادشاہ! حسب دستور تیری سلطنت کے لیے بھی قضا و قدر نے فرمان لکھ دیا۔ حکم کے مطابق حکم لکھنے والے نے تحریر کر دیا کہ یہ سلطنت ہمیشہ کے لیے باعث زینت رہنی چاہیے۔

۵۸۔ لغات : روانی : جاری ہونا۔

شرح : تیری سلطنت کا آغاز ازل سے جاری ہے۔ خدا کرے، یہ ابد تک اسی طرح انجام کو پہنچے، یعنی کبھی ختم نہ ہو۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ میری نظر میں :

"یہ قصیدہ خصوصاً اس کی تشبیب ایک کارنامہ ہے مصنّف مرحوم کے کمال کا اور زیور ہے اردو شاعری کے لیے۔ اس زبان میں جب سے قصیدہ گوئی شروع ہوئی ہے، اس طرح کی تشبیب کم کہی گئی ہے۔"

محض یہی نہیں، یہ قصیدہ خصوصیت سے غالب کی قادر الکلامی کا ایک ایسا مرقع ہے، جس کی نظیر پوری اُردو شاعری میں نہیں مل سکتی۔ فارسی میں بھی ایسی چیزیں بہت کم ملیں گی۔ دیکھیے، چھوٹی سی بحر ہے اور کس طرح شعروں

میں سجع پہ سجع چلا جارہا ہے! کس بے تکلفی سے خیالات گوہر غلطاں کی طرح صفحۂ قرطاس پر متحرک معلوم ہوتے ہیں! پھر ہر خیال نیا، ہر اسلوب اچھوتا بعض اشعار ایسے ہیں، جن کے پہلے مصرع میں چار چیزیں بیان کیں اور دوسرے میں چاروں کی خصوصیات الگ الگ واضح کر دیں۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ ایسی تشبیب اردو میں کم کی گئی ہیں، لیکن ہمیں تو قصائد کے اس دفتر میں، جسے خواجہ حالی ناپاک قرار دیتے ہیں، ایک بھی تشبیب ایسی نظر نہیں آتی، جس میں اس قصیدے کے حسن وخوبی کا پرتو ہو۔

صبح دم دروازۂ خاور کھلا مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا

خسروِ انجم کے آیا صرف میں شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا

صبح آیا جانبِ مشرق نظر اک نگارِ آتشیں رُخ، سر کھلا

تھی نظر بندی کیا جب ردِ سحر بادۂ گل رنگ کا ساغر کھلا

لا کے ساقی نے صبوحی کے لیے رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ کعبۂ امن واماں کا در کھلا

سکے کے لیے روشناسی صادر جہ موزوں ہے، کیونکہ عموماً سکوں پر بادشاہ کے چہرے کی تصویر ہوتی ہے۔ اسی لیے روپے کو چہرہ شاہی کہتے تھے۔

۳۸۔ لغات۔ مآل : انجام۔

آئینے سے سکندر کی نسبت کا معاملہ اصلاً صرف اتنا ہے کہ اس نے سکندریہ میں جہازوں کی رہنمائی کے لیے ایک اونچا برج تعمیر کرا کے چاروں طرف آئینے لگا دیے تھے اور ان کے اندر روشنی کا انتظام کرا دیا تھا تاکہ تاریکی میں جہاز رانوں کو بندرگاہ کا پتا چل سکے۔ پھر شعر و ادب میں اس واقعے نے یہ صورت اختیار کر لی گویا آئینہ سکندر نے بنایا اور اس سے آئندہ کا حال معلوم ہو جاتا تھا، جیسے جامِ جمشید ہے۔

شرح : بادشاہ کے آگے آئینہ رکھا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ سکندر نے آئینہ سازی میں جو محنت و مشقت اٹھائی تھی، اس کی غرض و غایت کیا تھی۔ یہ تھی کہ بہادر شاہ آئینہ دیکھے۔

۳۹۔ لغات۔ طُغرل : سلجوقی سلطنت کا بانی۔ وہ خود لاولد تھا اور اپنے بھتیجے رکن الدین ابوطالب طغرل بیگ (۱۰۳۸ء۔ ۱۰۶۳ء) عضد الدین ابوشجاع، الپ ارسلان (۱۰۶۳ء۔ ۱۰۷۲ء) کو ولی عہد بنا لیا تھا۔

سنجر : مُعِزّ الدین سنجر جو الپ ارسلان کا پوتا اور جلال الدین ابوالفتح ملک شاہ کا بیٹا تھا (۱۱۱۸ء۔ ۱۱۵۷ء) یہ سلجوقی سلطنت کا آٹھواں اور آخری بادشاہ تھا)

شرح : طغرل اور سنجر فریب سے ملک کے وارث بنے رہے اب خلقِ خدا کو معلوم ہوا کہ ملک کا اصل وارث تو بہادر شاہ تھا۔

۴۰۔ اہم لغات : جہاں داور : بادشاہِ عالم، فرمانروائے جہاں۔
ستائش گر : مدّاح۔ مدح کرنے والا۔

شرح : بادشاہِ عالم کی مدح کیا ہو سکتی ہے؟ ہاں کہہ سکتے ہیں کہ اس

غزل

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھُلا — کاشکے ہوتا قفس کا در کھُلا

ہم پکاریں اور کھلے، یوں کون جائے؟ — یار کا دروازہ پائیں گر کھُلا

ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ — دوست کا ہے راز دشمن پر کھُلا

واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ — زخم لیکن داغ سے بہتر کھُلا

ہاتھ سے رکھ دی کب ابرُو نے کماں؟ — کب کمر سے غمزے کی خنجر کھُلا؟

مُفت کا کس کو بُرا ہے بدرقہ؟ — رہروی میں پردۂ رہبر کھُلا

سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک؟ — آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھُلا

نامے کے ساتھ آ گیا پیغامِ مرگ — رہ گیا خط میری چھاتی پر کھُلا

دیکھیو، غالب سے گر الجھا کوئی

ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھُلا

پھر ہُوا مدحت طرازی کا خیال — پھر مہ و خورشید کا دفتر کھُلا

خامے نے پائی طبیعت سے مدد — بادباں کے اٹھتے ہی لنگر کھُلا

مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ — یاں عرض سے رتبۂ جوہر کھُلا

مہر کانپا چرخ چکر کھا گیا — بادشہ کا رایتِ لشکر کھُلا

بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب ۔۔۔ اب علوِ پایۂ منبر کھلا
سکۂ شہ کا ہُوا ہے روشناس ۔۔۔ اب عیارِ آبروئے زر کھُلا
شاہ کے آگے دھرا ہے آئنہ ۔۔۔ اب مآلِ سعیِ اسکندر کھُلا
ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے ۔۔۔ اب فریبِ طغرل و سنجر کھُلا
ہو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہے ۔۔۔ دفترِ مدحِ جہاں داور کھُلا
فکر اچھی، پر ستائش نا تمام ۔۔۔ عجزِ اعجازِ ستائش گر کھُلا
جانتا ہوں ہے خطِ لوحِ ازل ۔۔۔ تم پہ اے خاقان، نام آور کھُلا

تم کرو صاحبقرانی جب تلک
ہے طلسمِ روز و شب کا در کھُلا

(۴)

بہادر شاہ کی مدح میں

۱۔ **لغات** ۔ خاور : مشرق ۔
منظر : دریچہ ۔ جھروکا ۔

شرح : صبح کے وقت مشرق کا دروازہ کھُل گیا گویا ساری دنیا کو روشن کر دینے والے آفتاب کا دریچہ وا ہو گیا ۔
مطلب یہ کہ صبح ہو گئی اور سورج نکلنے والا ہے اور اسے ساری دنیا

دیکھے گی۔

۲۔ **لغات**۔ خسرو انجم : ستاروں کا بادشاہ، یعنی سورج۔

شرح : رات کو موتیوں کا خزانہ بکھرا ہوا تھا، یعنی ستارے آسمان پر جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ وہ خزانہ ستاروں کے بادشاہ نے خرچ کر ڈالا۔

مراد یہ کہ سورج کے روشن ہوتے ہی ستارے غائب ہو گئے، یعنی ان کی روشنی باقی نہ رہی۔

۳۔ **لغات**۔ سیمیا : ایک علم جس سے روح کو ایک جسم سے نکال کر دوسرے میں منتقل کر دیتے تھے اور موہوم چیزیں سامنے لے آتے تھے، اصل میں ان کا کوئی وجود نہ تھا۔

شرح : رات کو چاند اور ستاروں کا جو نظارہ آنکھوں کے سامنے تھا، صبح کو اس کا بھید کھل گیا اور معلوم ہوا کہ وہ سب کچھ تو سیمیا کا کرشمہ تھا، یعنی ان کا وجود کوئی نہ تھا، لیکن ہمارے وہم نے دھوکا کھا کر انھیں حقیقت سمجھ لیا۔

۴۔ **لغات**۔ کواکب : کوکب کی جمع، ستارے۔

شرح : اب ہم پر آشکارا ہو گیا کہ ستارے اصل میں کچھ ہیں، اور نظر کچھ آتے ہیں۔ گویا یہ بازیگر اور بھان متی ہیں، جو ہمیں دھوکا دے رہے ہیں۔

شعر کی خوبی یہ ہے کہ ستارے واقعی ویسے نہیں، جیسے ہمیں نظر آتے ہیں، مثلاً اکثر بے نور ہیں اور ہمیں نورانی دکھائی دیتے ہیں۔ تمام ستارے بہت بڑے ہیں، مگر ہمیں چھوٹے چھوٹے نظر آتے ہیں۔ متحرک ہیں، لیکن ہمیں ساکن معلوم ہوتے ہیں۔

۵۔ **شرح** : رات کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ موتیوں کا کوئی زیور

تھا جس کی لڑیاں ٹوٹ گئیں اور ان کے موتی آسمان کی سطح پر بکھر گئے۔

۶-۷-۸- **لغات** : نگار : محبوب۔

آتشیں رُخ : جس کے رخسار آگ کی مانند دہک رہے ہوں، یعنی نہایت حسین۔

ردِّ سحر : جادو کا اثر زائل کر دینا۔

صبوحی : صبح کو پینے کی چیز، جس سے رات کی پی ہوئی شراب کا خمار زائل ہو جائے۔

شرح : صبح کے وقت مشرق کی جانب نظر اٹھی تو آفتاب نظر آیا۔ ایسا معلوم ہُوا کہ ایک نہایت خوب صورت محبوب ہے، جس کا سر کھُلا ہُوا ہے، یعنی اس نے کوئی چیز سر پر اوڑھ نہیں رکھی۔

لیکن یہ تو اُس وقت کی کیفیت ہے، جب نگاہوں پر سیمیا کے جادو کا اثر تھا۔ جادو کا یہ اثر زائل کیا تو معلوم ہُوا کہ یہ نگارِ آتشیں رخ نہیں بلکہ پھول کے سے رنگ کی شراب کا بھرا ہُوا پیالہ ہے۔

ساقی نے ایک سنہری پیالہ لا کر سامنے رکھ دیا ہے تاکہ صبح کے خورد و نوش کا انتظام ہو جائے۔

۹- **شرح** : شاہی محفل آراستہ ہو گئی، یعنی دربار سج گیا اور امن و امان کے کعبے کا دروازہ کھُل گیا۔

ظاہر ہے کہ اس سے پیشتر کے تمام اشعار محض تمہید کے طور پر کہے گئے۔

۱۰- **لغات**- خسروِ آفاق : زمانے کا بادشاہ یعنی بہادر شاہ ظفر۔

مُنہ پر کھُلا- زیب و زینت کا باعث ہُوا۔

شرح : زمانے کے بادشاہ نے سنہری تاج سر پر رکھا تو وہ روشن سورج سے بھی بڑھ کر زیب و زینت کا باعث ہو گیا۔

۱۱۔ ۱۵۔ لغات : تکوین : تخلیق، پیدا کرنا، وجود میں لانا۔
تاویل : شرح۔ بیان، اصلیت واضح کرنا۔
دارا : ایران کا مشہور بادشاہ دارا گشتاسپ۔
سرہنگ : فوج کا افسر، کوتوال۔
چہرہ : حلیہ۔ پہلے بھی یہ دستور تھا (اور اب بھی ہے) کہ جب کوئی شخص فوج میں ملازم رکھا جاتا ہے تو اس کا حلیہ تفصیل سے لکھتے تھے، اسے چہرہ لکھنا کہا جاتا تھا۔
قیصر : روما کا بادشاہ۔ یہ لفظ سیزر کا معرب ہے۔ سیزر ہی کا لفظ جرمنی میں کیزر (KAİSER) اور روس میں زار (ZAR) بنا اسی نے ایران میں کسریٰ کی شکل اختیار کی۔

شرح : کون بادشاہ ؟ روشن دل بہادر شاہ، جس پر زندگی کا بھید پورا پورا کھل گیا ہے۔ وہ بہادر شاہ جسے وجود میں لے آنے سے نو آسمانوں اور سات سیاروں کا مقصد واضح ہو گیا۔ وہ بہادر شاہ، جس کی تشریح اور حقیقت بیانی سے رسول اللہ (صلعم) کے حکموں میں سے جو باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں، وہ آسان و روشن ہو گئیں۔

وہ بہادر شاہ، جس کے فوجی افسروں کا دفتر دیکھا گیا تو سب سے پہلے دارا گشتاسپ کا نام نکلا۔ بعض شارحین نے اسے دارا سوم سمجھا ہے، جو کیانیوں کا آخری بادشاہ تھا اور جس نے سکندر سے شکست کھائی وہ بہت معمولی بادشاہ تھا، غالب کا اشارہ اس کی طرف نہیں ہو سکتا۔ اسی غلط مفروضے کی بنا پر بعض اصحاب نے لکھا کہ اگلے شعر میں سکندر ہونا چاہیے تھا تاکہ دارا اور سکندر کی مناسبت واضح ہو جاتی۔ ظاہر ہے کہ یہ خیال شعر کی غلط تعبیر کا نتیجہ ہے۔ دارا گشتاسپ کو سکندر سے کوئی مناسبت نہ تھی۔

جہاں اس کے روشناسوں کی فہرست درج ہے، وہاں قیصر کا حلیہ بھی تفصیل سے لکھ رکھا ہے۔

۱۶ - ۱۷ - لغات : توسن : گھوڑا۔
تھان : گھوڑا باندھنے کی جگہ۔
آزر : حضرت ابراہیمؑ کا والد یا چچا، جو مشاق بت تراش اور پکا بُت پرست تھا۔

شرح : بادشاہ کے گھوڑے کی خوبیاں کیا بیان کروں، تیز رفتاری میں آندھی کو بھی اس پر رشک آتا ہے۔ جب اسے اصطبل سے کھولا جاتا ہے تو جہاں جہاں اس کے پاؤں کا نقش پڑتا ہے، ایسی دلفریب صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ دیکھنے والا سمجھے، آزر کے بُت خانے کا دروازہ کھول دیا گیا، جہاں ہر طرف نہایت خوب صورت بُت رکھے ہوئے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ گھوڑا چلتا ہے تو جہاں جہاں اس کا پاؤں پڑتا ہے، ایسی خوب صورت شکلیں بنتی جاتی ہیں، جنھیں خوب صورت بتوں پر بھی فوقیت حاصل ہے۔

۱۸ - لغات : منصب : وظیفہ، کام
محوَر : وہ فرضی خط، جس پر زمین گردش کر رہی ہے اور ہر ستارے کے دائرۂ گردش کو محور ہی کہتے ہیں۔

شرح : بادشاہ نے تعلیم و تربیت کے فیض سے مجھ میں صلاحیت پیدا کر دی کہ میں سورج، چاند اور ستاروں کے گھومنے کے خط کی حیثیت، وظیفے اور کام سے آگاہ ہو گیا، یعنی مجھ پر ان چیزوں کے وظائف کی حقیقت کُھل گئی۔

۱۹ - ۲۰ - لغات - وُسعت : طاقت، مقدور، استطاعت، دسترس
دل وابستہ : منقبض، یعنی جس پر انقباض طاری ہو، ناخوش۔

شرح : میرے دل میں لاکھوں گرہیں پڑی ہوئی تھیں، لیکن ہر گرہ کھل گئی۔ اور اس پیمانے پر کھلی کہ میرے لیے اسے یوں کھولنا ممکن نہ تھا یہ بات میری دسترس سے باہر تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ میرا دل اس طرح منقبض، بھینچا ہوا، سکڑا ہوا اور ناخوش تھا کہ اسے ایسا قفل کہہ سکتے ہیں، جس کی کوئی کنجی نہ تھی۔ اب یہ کھل گیا۔ کس نے کھولا؟ کب کھولا؟ کیونکر کھولا؟

مقصد یہ ہے کہ بادشاہ نے حسنِ تربیت سے کھول دیا۔

یہ استفہام سوال کی غرض سے نہیں، تعجب اور خوشی کی غرض ہے۔

۲۱۔ لغات۔ کھلا : توجہ کی، التفات کیا۔

شرح : اگر سخنور بادشاہ نے مجھے توجہ سے نوازا تو میں معنی کے باغ کی بہار دکھاؤں گا۔ یعنی ایسے شعر کہوں گا کہ سننے اور پڑھنے والے کو یقین ہو جائے، باغِ معنی میں بہار آگئی۔

۲۲۔ لغات : طبلہ : ڈبّا، صندوقچہ۔

عنبر : ایک خوشبودار چیز، جو سمندر سے نکلتی ہے۔

شرح : جہاں میرا سانس غزل پڑھنے میں مشغول ہو، یعنی غزل خوانی شروع کرے، لوگ سمجھیں کہ عنبر کا ڈبا کھل گیا ہے، جس کی خوشبو سے فضا مہک اٹھی ہے۔

غزل

۲۳۔ لغات۔ کُنج : گوشہ، یہاں قفس کا گوشہ مراد ہے۔

شرح : کتنے افسوس کا مقام ہے کہ میں قفس کے گوشے میں یوں بیٹھا رہوں اور پر کھلے ہوئے ہوں۔ کاش قفس کا دریچہ کھلا ہوتا اور میں باغ کی فضا میں اڑنے کا لطف اٹھاتا۔

۲۴۔ شرح : اس شعر کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں، اگرچہ کسی قدر تکلف سے کام لینا پڑتا ہے۔

۱۔ اگر محبوب کا دروازہ کھُلا پائیں تو جا سکتے ہیں، لیکن ہم پکاریں، گویا التجا کریں، پھر دروازہ کھلے، یوں جانا ہم کیونکر گوارا کر سکتے ہیں ؟ اس مفہوم سے ملتا جلتا شعر میرزا پہلے بھی کہ چکے ہیں۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہُوا

۲۔ دوسرا مفہوم زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ کہتے ہیں، محبوب کا دروازہ کھُلا پائیں تو ہم کیونکر داخل ہو سکتے ہیں؟ یہ تو بارِ عام ہُوا، اس میں ہمارے لیے تخصیص کا کون سا پہلو ہے ؟ ہم تو اس وقت جائیں گے کہ وہاں پہنچیں، آواز دیں، پھر خاص ہمارے لیے دروازہ کھُلے۔

۲۵۔ شرح : ہم اپنی سادہ لوحی سے اس پر فخر کر رہے ہیں کہ دوست کا راز دل میں چھپا رکھا ہے اور کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ اُدھر یہ حال ہے کہ دوست کا راز دشمن پر آشکارا ہو چکا ہے، یعنی خود دوست نے سب کچھ رقیب پر ظاہر کر دیا ہے۔ پھر ہمارے لیے رازداری پر فخر کا کون سا موقع ہے؟

۲۶۔ لغات۔ کھُلا : باعثِ زینت ہُوا۔

شرح : یقیناً محبت کا داغ دل پر بہت اچھا لگتا تھا، لیکن محبت کا زخم دل کے لیے اور بھی زینت کا باعث بن گیا، یعنی زخم کو داغ پر فوقیت حاصل ہے۔

۲۷۔ شرح : میرا محبوب اس درجہ ستمگر ہے کہ اس نے ابرو کی کمان کبھی ہاتھ سے نہیں رکھی اور غمزے کی کمر سے خنجر کبھی نہیں کھولا۔ گویا اس کے ابرو اور غمزے بدستور تیر اندازی و خنجر زنی میں سرگرم ہیں۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں، "ابرو کو کمان اور غمزے کو خنجر سے تشبیہ دیا

کرتے ہیں، لیکن ابرو کو کمان دار اور غمزے کو خنجر گزار کہنا زیادہ لطف دے گیا۔"

۲۸۔ **لغات** ۔ بدرقہ : سفر میں مسافر کی حفاظت کرنے والا نگہبان، رہنما۔

شرح : جو بدرقہ ساتھ لے لیا تھا، راستہ چلنے میں اس کے علم و تجربہ کی حقیقت کھل گئی۔ پردہ فاش ہو گیا اور پتا چلا کہ جو خود راستہ نہیں جانتا، وہ کسی کی رہنمائی کیا کرے گا؟ لیکن مفت کا بدرقہ تھا، اس کی اجرت کچھ نہ تھی۔ ایسے شخص کو بہ طورِ رفیقِ سفر ساتھ رکھنے میں کیا برائی ہے؟

۲۹۔ **شرح** : آنسوؤں کی بارش دل کی جلن کا کیا علاج کر سکتی ہے حالت یہ ہے کہ اگر تھوڑی دیر کے لیے تھمتی ہے تو آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ گویا آنسو دل کی لگی بجھا نہیں سکتے۔

۳۰۔ **شرح** : محبوب کا خط آ گیا، جس کا مدت سے انتظار تھا۔ اس سے اتنی خوشی ہوئی کہ موت آ گئی۔ گویا نامۂ محبوب کی انتہائی مسرت نے شادی مرگ کا سماں پیدا کر دیا۔ نامہ کھول کر پڑھنا چاہتا تھا، پڑھ نہ سکا اور دم نکل گیا۔ یوں نامہ سینے پر کھلا کا کھلا رہ گیا۔

۳۱۔ **شرح** : دیکھو، خبردار رہو، غالب سے الجھنے کی کوشش نہ کرنا۔ وہ دیکھنے کو کافر ہے، لیکن حقیقت میں اسے ولی کا رتبہ حاصل ہے۔ اگر اس نے بد دعا کی تو ہر الجھنے والے کو خاک کر کے رکھ دے گا۔

۳۲۔ **لغات** ۔ مدحت طرازی : تعریف کرنا۔ مدح کہنا۔

شرح : غزل سے فارغ ہو کر پھر قصیدہ گوئی شروع ہو گئی۔ بادشاہ کی قصیدہ گوئی کی حیثیت وہی ہے، جیسے چاند اور سورج کے دفتر کھل جائیں۔ گویا بادشاہ کی مدح اصل میں چاند اور سورج کے دفتر کھلنے کے ہم معنی ہے۔

۳۳۔ **شرح** : قلم کو شاعر کی طبیعت سے مدد ملی، یعنی قلم اٹھایا تو

طبیعت کے سانچے سے شعر ڈھل ڈھل کر نکلنے شروع ہو گئے۔ وہی کیفیت پیدا ہوئی کہ جہاز چلنے کے لیے بادبان کھلتے ہیں تو لنگر بھی اٹھتا ہے۔

۳۴۔ لغات۔ شُکوہ : جاہ و جلال۔ رتبہ۔

عَرَض : وہ چیز جو قیام کے لیے دوسری چیز کی محتاج ہو، جیسے کپڑے کے لیے رنگ۔

جَوہر : جو بالذات قائم ہو۔ شعر میں مدح "عرض" ہے اور "جوہر" ممدوح یعنی بادشاہ۔

شرح : مدح سے بادشاہ کا جاہ و جلال نمایاں ہو گیا، یعنی عرض سے یہ کھل گیا کہ جوہر کا رتبہ کتنا بلند ہے۔

۳۵۔ لغات۔ رایت : جھنڈا۔ عَلَم۔

شرح : جب بادشاہ کے لشکر کا عَلَم اٹھا اور پرچم کھلا تو سورج کانپ اٹھا اور آسمان چکرا گیا۔

شعر میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ چرخ بہر حال چکر کھاتا ہے اور سورج صبح کو نکلتا ہے تو کانپتا ہوا معلوم ہوتا ہے، اس لیے فارسی میں صبح کے سورج کو لرزاں کہتے ہیں۔

۳۶۔ لغات۔ عُلوّ : بلندی۔

شرح : خطیب نے خطبے میں بادشاہ کا نام لیا تو ظاہر ہو گیا کہ منبر کا پایہ کیوں بلند ہے۔ اس لیے بلند ہے کہ منبر پر کھڑا ہو کر خطیب بادشاہ کا نام لیتا ہے۔

۳۷۔ لغات۔ عیار : کسوٹی، کھرا کھوٹا پن دیکھنا، پیمانہ۔

شرح : اب یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ سونے کی عزت و آبرو کا پیمانہ کیا ہے۔ یہ ہے کہ بادشاہ کے سکے سے اسے روشناسی حاصل ہوئی، یعنی بادشاہ نے اسے اپنا سکہ بنا لیا۔

تاجِ زرّیں مہرِ تاباں سے سوا | خسروِ آفاق کے منہ پر کھُلا
شاہِ روشن دل بہادر شہ کہ ہے | رازِ ہستی اس پہ سرتاسر کھُلا
وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں | مقصدِ نُہ چرخ و ہفت اختر کھُلا
وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے | عقدۂ احکامِ پیغمبر کھُلا
پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام | اس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھُلا
روشناسوں کی جہاں فہرست ہے | واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھُلا

قطعہ

توسنِ شہ میں وہ خوبی ہے کہ جب | تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھُلا
نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب | تو کہے بت خانۂ آزر کھُلا
مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے | منصبِ مہر و مہ و محور کھُلا
لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک | میری حدِّ وسع سے باہر کھُلا
تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید | کس نے کھولا؟ کب کھُلا؟ کیونکر کھُلا
باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار | مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھُلا
ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نفس | لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھُلا

کی مدح کا دفتر کھُل گیا ہے۔

مدح کے سلسلے میں جو خیالات پیش کیے گئے، وہ تو یقیناً اچھے تھے، لیکن یہ ادھوری رہی، پوری نہ ہو سکی۔ اگرچہ مدح کرنے والا نہایت معجز بیان تھا۔ لیکن اس کا عجز ظاہر ہو گیا، یعنی وہ مدح کا حق ادا نہ کر سکا۔

۴۲-۴۳-۴۴۔ **لغات** : خاقان : بڑا بادشاہ۔

خطِ لوحِ ازل : وہ تحریر، جو دنیا کے شروع ہوتے وقت تختی پر لکھ دی گئی، یعنی خطِ تقدیر۔

صاحب قرانی : صاحب قران اسے کہتے ہیں، جس کی پیدائش کے وقت دو نیک ستارے ایک برج میں ہوں۔ ایسا آدمی بڑا اقبال مند سمجھا جاتا ہے۔ صاحب قرانی کا مطلب ہُوا وہ حکومت، جس کی باگ ڈور صاحب قران کے ہاتھ میں ہو۔

شرح : اے نامور شہنشاہ! میں جانتا ہوں کہ آپ پر لوحِ ازل کی تحریر روشن ہے۔ آپ اس وقت تک صاحب قرانی کریں، جب تک رات دن کے طلسم کا دروازہ کھلا ہُوا ہے، یعنی جب تک دنیا قائم ہے۔

سہرا

تمہید : بہادر شاہ کے فرزند میرزا جواں بخت۔۔۔ جو بیگم زینت

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پر سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ!
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے تیرا لمبر سہرا
ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
سات دریا کے فراہم کیے ہونگے موتی
تب بنا ہو گا اس انداز کا گز بھر سہرا
رُخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابر گہر بار سراسر سہرا
یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا
جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا
جب کہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا
رخ روشن کی دمک گوہر غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغ مہ و اختر سہرا

کے بطن سے تھا۔ . . . . کی شادی کے موقع پر یہ سہرا خود بیگم کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔ مولانا عرشی نے دیوانِ غالب کے ساتھ جو حواشی شائع کیے ہیں، ان سے معلوم ہوا کہ یہ سہرا ۲۸ مارچ ۱۸۵۲ء کے دہلی اردو اخبار

تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائے گا تابِ گراں باریِ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں
دیکھیں۔ کہہ دے کوئی اس سہرے سے بڑھکر سہرا

میں اس تمہید کے ساتھ شائع ہوا تھا:

"منتخب الحکم حضرت سلطانی خلد اللہ ملکہٗ، جو جناب نواب نجم الدولہ اسد اللہ خاں غالبؔ اور جناب خاقانیِ ہند ملک الشعراء شیخ محمد ابراہیم خاں ذوقؔ بہ تقریب شادی میرزا جواں بخت بہادر مرشد زادۂ آفاق، کے کچھ اشعار بہ سبیل مبارک بادی سہرا اس ہفتے میں حضور سلطانی میں بہ دربار گزرانے تھے، مع چند اشعار علاوہ اس کے جو خاص نجم الدولہ بہادر نے پھر گزرانے، واسطے حظ و کیفیت اپنے ناظرین، اہل بصر و بصیرت و ماہرین و واقفین فصاحت و بلاغت کے بموجب ترتیب در پیش ہونے کے ہم بھی درج اخبار کرتے ہیں۔"

صحیح یہی ہے کہ فرمائش بادشاہ کی نہیں، بیگم کی تھی اور اس سلسلے میں واسطہ حکیم احسن اللہ خاں تھے۔ بعض نے لکھا ہے کہ یہ سہرا سنہری کشتی میں رکھ کر بڑے تکلف سے گزرانا گیا تھا۔ میرزا کے لیے تو یہ اہتمام ممکن نہ تھا۔ غالباً سہرا باندھتے وقت سنہری کشتی میں لگا کر لائے تھے۔

"سہرا" کی ردیف کے ساتھ میرزا غالبؔ سے پیشتر کبھی کوئی نظم نہیں کہی گئی تھی، گویا اس صنف کے موجد وہی ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کے تیسرے دیوان میں دو سہرے ہیں اور ان کی ردیف "سہرا" ہے۔

منشی امیر احمد صاحب علوی نے اپنی کتاب "بہادر شاہ ظفر" میں صرف ایک سہرے کا ذکر کیا ہے۔ ساتھ ہی فرمایا ہے کہ یہ سہرا شہزادہ جہانگیر یا شہزادہ سلیم، فرزندان اکبر شاہ ثانی) کی شادی کے موقع پر کہا گیا تھا۔

صحیح نہیں، دونوں سہرے میرزا جواں بخت کی شادی پر کہے گئے تھے اور اس کی ایک سے زیادہ شہادتیں خود سہروں میں موجود ہیں۔ یہ دونوں غالبؔ و ذوقؔ کے سہروں کے بعد کہے گئے۔

میرزا کے مقطع سے بادشاہ کو خیال ہوا کہ یہ ذوقؔ پر چوٹ ہے اس لیے ذوقؔ سے بھی سہرا لکھوایا گیا، جس کے بعض اشعار کی کیفیت شرح کے سلسلے میں واضح ہو گی۔ میرزا کا مقطع جیسا کہ انھوں نے معذرت کے قطعے میں بیان کیا، واقعی سخن گسترانہ تھا، یعنی شعرا جس طرح عموماً مقطع میں یکتائی کا دعویٰ کیا کرتے ہیں۔ میرزا نے ویسے ہی کہہ دیا کہ اس سے بہتر سہرا کوئی کیا کہے گا؟ ذوقؔ نے اسے چیلنج سمجھ کر جواب دیا اور مقطع میں اس کا اظہار بھی کر دیا۔ میرزا کے لیے کسی بھی حالت میں ذوقؔ کو مدِ مقابل سمجھ لینا ممکن نہ تھا، لیکن معاملہ استاد شاہ کا آپڑا تھا اور میرزا شاہی ملازم تھے، اس لیے انھیں معذرت ہی مناسب معلوم ہوئی۔

"دہلی اردو اخبار" کی تحریر سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ سہرا مارچ ۱۸۵۲ء کے آخری ہفتے میں گزرا نا تھا۔ اور ذوقؔ کے جوابی سہرے کے فوراً بعد میرزا غالبؔ نے قطعۂ معذرت پیش کر دیا۔

یہاں میرزا اور ذوق کے سہروں کا تقابل مقصود نہیں، لیکن شرح کرتے وقت سرسری طور پر جو باتیں سامنے آئیں گی، وہی بیان ہوتی رہیں گی۔

۱۔ **لغات**۔ سر سہرا ہونا: کسی کام کی درستی اور سرانجام کا کسی پر موقوف ہونا۔ کسی پر کسی کام کا انحصار ہونا یا اس کے سرانجام کی عزت پانا۔

شرح: اے نصیبے! خوش رہو کہ آج ایک اہم کام کے سرانجام کی عزت تیرے حصے میں آئی۔ اس لیے اٹھ اور شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا باندھ دے۔

۲۔ شرح : سبحان اللہ شہزادے کے چاند سے مکھڑے پر سہرا کتنا پھبتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سہرا شہزادے کے دل افروز حسن کا زیور ہے۔

شہزادہ حسین تو تھا ہی، جسے دیکھ کر لوگوں کے دل روشن ہو جاتے تھے۔ جب اس کے سہرا بندھا تو حسن کی شان کو چار چاند لگ گئے۔

ذوقؔ نے اس کے جواب میں تین شعر کہے۔ مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ غالبؔ نے بے مثل شعر کہا تھا۔ ذوقؔ نے جواب دیا اور خوب جواب دیا، لیکن زیور کا قافیہ غالبؔ ہی کے حصے میں آ گیا۔

۳۔ لغات۔ لمبر : نمبر، درجہ۔ بقول طباطبائی "لمبر" ہی کہنا ٹھیک ہے، نمبر غلط ہے۔

شرح : اے گوشۂ کلاہ! تجھے سر پر جگہ ملی اور یقیناً تیرے لیے یہ جگہ زیبا ہے۔ سہرا بھی سر پر باندھا گیا۔ لیکن اے گوشۂ کلاہ! مجھے اب یہ ڈر پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں سہرا تیری آن بان اور شان کا درجہ نہ چھین لے۔

۴۔ لغات۔ کشتی : وہ کشتی نما ظرف، جس میں کوئی چیز رکھ کر لاتے ہیں، مثلاً قیمتی زیور، پوشاک وغیرہ۔

شرح : اگر ناؤ بھر کر موتی سہرے میں نہیں پروئے گئے تو اسے کشتی میں سجا کر کیوں لاتے ہیں؟

مرزا نے اس شعر میں ناؤ اور کشتی کی رعایت پیش نظر رکھی اور دلیل یہ دی کہ سہرا کشتی میں رکھ کر لائے ہیں۔ اس سے خیال ہو سکتا ہے کہ ناؤ بھر کر موتی رکھ لیے ہوں گے اور ان سے چن چن کر سہرا بنا دیا۔

شیخ ابراہیم ذوقؔ نے اس شعر کے جواب میں فرمایا :

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک
کشتیِ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

کنایہ یہ چاہتے تھے، آج آسمان کے لیے دریا ہے کہ ستاروں کے موتی چن چن کر سہرا گوندھے۔ پھر اسے ہلال کی زریں کشتی میں سجا کر لائے۔ اس میں وہی تعقید نمایاں ہے، جو اصطلاح میں تعقید قبیح ہے۔

۵۔ شرح: سہرا گوندھنے کے خیال سے ساتوں سمندروں کے موتی اکٹھے کر لیے ہوں گے۔ پھر ان میں سے نہایت خوب صورت اور سڈول موتی چن چن کر گز بھر سہرا تیار کیا ہوگا۔

ذوق نے اس کے جواب میں فرمایا:

اک گہر بھی نہیں صدکان گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

میرزا نے ساتوں سمندروں کے موتی جمع کیے تھے، لیکن یہ خیال رکھا کہ سارے موتی سہرے میں گوندھے نہیں جا سکتے، اس لیے گز بھر کی قید لگا کر واضح کر دیا کہ ان میں سے چن چن کر بہترین موتی لے لیے، باقی چھوڑ دیے، مگر ذوق نے سات کا جواب سو سے دیا، یعنی سینکڑوں کانوں کے گوہر اکٹھے کر لیے گئے اور وہ تمام کے تمام سہرے کی نذر کر دیے۔ یہ خیال نہ رکھا کہ سہرے میں یہ تمام گوہر کیونکر سمائیں گے؟ بس مبالغے پر انحصار فرمایا، گویا تم نے "سات" کہے تھے، ہم "سو" کہتے ہیں۔

۶۔ شرح: دولہا کے چہرے پر گرمی سے پسینا آگیا اور قطرے ٹپکنے لگے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سہرا ایک قلم موتی برسانے والے بادل کی رگ بن گیا ہے۔ یعنی سہرے کے تار دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ بادل مسلسل موتی برسا رہا ہے۔

ذوق نے اس کے جواب میں دو شعر کہے:

روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تار بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

یعنی اے جواں بخت! تیرے چہرۂ فرخ پر انوار برس رہے ہیں اور ان کی برسات کے تاروں سے سہرا تیار ہو گیا۔

پہلے مصرع کی سستی بندش کے علاوہ میرزا غالب ہی کا مضمون لے کر دوسری شکل میں باندھ دیا، البتہ پسینے کی جگہ انوار برسائے۔ گویا ایک "دقوعی" چیز کو "غیر وقوعی" بنا دیا۔

۲ تابشِ حسن سے مانندِ شعاعِ خورشید
رخِ پُر نور پہ ہے تیرے منوّر سہرا

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ تیرے سر پر سہرا بندھا اور تیرے رخِ پُر نور کی تابشِ حسن سے سہرے کی لڑیاں سورج کی کرنوں کی مانند منوّر ہو گئیں۔ شعر کی بندش میں جو الجھاؤ ہے، وہ تشریح کا محتاج نہیں۔

۷۔ شرح : سہرے کا قبا سے آگے بڑھ جانا خلافِ ادب تھا اس لیے دامن کے برابر پہنچتے ہی وہ رک گیا۔

مطلب یہ کہ سہرا زیادہ لمبا نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ دامن سے آگے بڑھتا تو یہ امر بے ادبی کا باعث بنتا۔ شعر کی خوبی یہ ہے کہ میرزا نے حقیقت پیشِ نظر رکھی۔ سہرے زیادہ لمبے بنائے جائیں تو انھیں سنبھالنا مشکل ہو جائے۔ وہ خاص حد سے آگے نہیں بڑھائے جاتے۔ میرزا نے اس سے ایک پہلو پیدا کر لیا ہے کہ آگے بڑھنا خلافِ ادب تھا۔

۸۔ لغات۔ مقرّر : لازم، ضروری۔

شرح : کہیں موتی یہ سمجھ کر فخر نہ کرنے لگیں کہ ہستی ہے تو صرف ہماری ہے، کیونکہ ہمیں سے سہرا گوندھا گیا۔ لازم ہے کہ پھولوں کا بھی ایک سہرا تیار کر لیا جائے تاکہ موتیوں کے لیے اترانے کی گنجائش نہ رہے۔

شہزادے کے لیے سہرا صرف موتیوں سے تیار کیا گیا تھا، پھولوں کا سہرا تھا ہی نہیں، لہٰذا حقیقت کے پیشِ نظر میرزا نے یہ نہیں کہا کہ پھولوں

کا سہرا موجود ہے، صرف یہ کہا ہونا چاہیے تاکہ موتیوں کا اترانا ختم ہو جائے۔
اس کے جواب میں ذوق نے خلافِ واقع پھولوں کا سہرا مہیا کر دیا اور فرمایا:

پھرتی خوشبو سے ہے اتراتی ہوئی بادِ بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

پہلے مصرع میں تعقید کے علاوہ پھولوں کے سہرے کا ذکر خلافِ واقع ہے۔ عام لوگ پھولوں کا سہرا باندھتے ہیں، شہزادے نہیں۔ ان کے لیے صرف موتیوں سے سہرے تیار ہوتے ہیں۔

۹۔ **شرح**: میرزا نے اس سے پہلے شعر میں پھولوں کا سہرا ضروری بتایا تھا، چونکہ وہ موجود نہ تھا، اس لیے اس کی وجہ یہ قرار دی کہ جب پھول خوشی کے مارے اپنے آپ میں سماتے ہی نہیں تو ان کا سہرا کوئی کیونکر گوندھے؟ کتنی عمدہ توجیہ ہے۔ بتا دیا کہ کیوں پھولوں کا سہرا تیار نہیں ہوا۔ اس وجہ کو موقع اور محل سے خاص مناسبت ہے۔

۱۰۔ **لغات۔ گوہرِ غلطاں**: وہ بے مثال موتی جو وضع کے حسن اور سڈول پن کے باعث کسی ہموار سطح پر ٹھہر نہ سکیں اور لڑھکتے رہیں۔

شرح: ایک طرف شہزادے کا رخِ روشن دمک رہا ہے۔ اس پر سہرے کی لڑیاں ہیں، جن میں اعلیٰ درجے کے موتی چمک رہے ہیں۔ پھر کیوں سہرا چاند اور تاروں کی بہار نہ دکھائے؟ شہزادے کے چہرے کو چاند سے اور سہرے کے موتیوں کو تاروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔

اس کے جواب میں ذوق نے کہا:

رونمائی میں تجھے دے مہِ خورشید فلک
کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا

دوسرے مصرع میں "منہ" کی تکرار حد درجہ نامناسب ہے اور یہاں،

"منہ" کے لیے "کھول دے" کا لفظ ذوق جیسے مشّاق استاد سے تعجب انگیز ہے، جس کے بدیہی معنی دہن وا کر دینے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ بس وہی، مبالغے پر زور کہ میرزا نے مہ و اختر کہا تو ہم مہ و خورشید کہیں گے۔

۱۱۔ **شرح** : یہ ریشم کے تار نہیں، جن میں موتی پروئے گئے ہوں یہ تو ابرِ بہار کی رگ ہے، جس کا خاصہ ہی یہ ہے کہ تراوش کرتی اور موتی برساتی رہے۔ گویا مسلسل موتی برستے چلے جا رہے ہیں۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ آیا سہرا موتیوں کے اس بارِ گراں کی تاب لا سکے گا؟ یعنی موتیوں کی مسلسل بارش کا متحمل ہو سکے گا؟

۱۲۔ **شرح** : ہم شعر کی روح کو سمجھتے ہیں۔ غالب کی طرفداری نہیں کرتے۔ دیکھیے اس سہرے سے بہتر سہرا بھی کوئی کہہ سکتا ہے؟

جیسا کہ خود میرزا نے کہا، یہ محض سخن گسترانہ بات تھی، لیکن ذوق نے اسے دعوتِ مقابلہ سمجھا اور سہرا کہہ کر بڑے دعوے سے فرمایا:

جن کو دعویٰ ہو سخن کا، یہ سنا دو اُن کو
دیکھو، اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

یہاں بحث یہ نہیں کہ سخنوری کا بلند تر مقام ذوق کو حاصل ہے یا غالب کو، لیکن حقائق پیش کیے جاتے ہیں، جن کی بنا پر دونوں سہروں کے درمیان موازنے میں سہولت ہو گی:

۱۔ ذوق نے غالب کا سہرا سامنے رکھ کر سہرا کہا اور زیادہ تر مضامین انھیں کے لے کر خفیف سے تغیّر یا مبالغے میں اضافے کے ساتھ پیش کر دیے اور مبالغے میں حقیقت کو عموماً نظر انداز کیے رکھا۔

۲۔ غالب کے شعر صرف گیارہ ہیں، ان میں شاعری کے تمام محاسن موجود ہیں اور کوئی شعر خلافِ واقع نہیں۔ ذوق نے جواب میں پندرہ شعر کہے، مگر کمتر اشعار مطابقِ واقع ہیں۔

۳۔ ذوق کے اکثر شعروں یا مصرعوں کی بندش تعقید یا الجھاؤ کا ایسا نقشہ پیش کر رہی ہے جو ذوق جیسے مشاق استاد کے لئے یقیناً محل تعجب ہے۔

۴۔ تاہم وہ کور ذوقی کا دور تھا اور اکثر لوگ یا تو شعر کی حقیقت سمجھتے ہی نہیں تھے یا بہادر شاہ ظفر کی رضا جوئی میں اسی پر واہ وا کہنے لگتے تھے، جس پر خود ظفر خوش ہوتا تھا۔

۵۔ میرزا نے جو قطعہ معذرت میں کہا، اس کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا کہ ذوق کا سہرا میرزا کے سہرے سے بڑھ گیا تھا یا انہیں اپنے شاعرانہ وقار میں کمی آجانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ قطعہ صرف اس لیے کہنا پڑا کہ قلعہ معلیٰ میں وقت کی مصلحتوں کا تقاضا یہی تھا۔

۶۔ مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے فرمایا: " ارباب نشاط حضور میں ملازم تھیں

مثنوی

آموں کی تعریف میں

ہاں دلِ دردمند زمزمہ ساز — کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز

۔کا صفحہ پر رواں ہونا — شاخِ گل کا ہے گلفشاں ہونا

مجھ سے کیا پوچھتا ہے "کیا لکھیے"؟ — نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے — خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے

آم کا کون مردِ میداں ہے؟ — ثمر و شاخ گوے و چوگاں ہے

تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں — آئے یہ گوے اور یہ میداں

آم کے آگے پیش جائے خاک — پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک

نہ چلا جب کسی طرح مقدور — بادۂ ناب بن گیا انگور!

یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے — شرم سے پانی پانی ہونا ہے

مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے — آم کے آگے نیشکر کیا ہے

نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار — جب خزاں ہو تب آئے اس کی بہار

اور دوڑائیے قیاس کہاں؟ — جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں

جان میں ہوتی گر یہ شیرینی — کوہکن باوجودِ غمگینی

جان دینے میں اس کو یکتا جان ‏ ‏ پردہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر ‏ ‏ کہ دوا خانۂ ازل میں مگر

آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام ‏ ‏ شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام

یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے ‏ ‏ باغبانوں نے باغِ جنت سے

انگبیں کے بہ حکمِ ربُّ الناس ‏ ‏ بھر کے بھیجے ہیں سر بہ مُہر گلاس

یا کا خضر نے شاخِ نبات ‏ ‏ مدتوں تک دیا ہے ابِ حیات

تب ہُوا ہے ثمر فشاں یہ نخل ‏ ‏ ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل

تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس ‏ ‏ رنگ کا زرد، پر کہاں بُو باس

آم کو دیکھتا اگر اک بار ‏ ‏ پھینک دیتا طلائے دست افشار

رونقِ کارگاہِ برگ و نوا ‏ ‏ نازشِ دودمانِ آب و ہوا

رہروِ راہِ خلد کا توشہ ‏ ‏ طُوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ

صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم ‏ ‏ نازپروردۂ بہار ہے آم

خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو ‏ ‏ نوبرِ نخلِ باغِ سلطاں ہو

وہ کہ ہے والیِ ولایتِ عہد ‏ ‏ عدل سے اُسکے ہے حمایتِ عہد

فخرِ دیں عزِ شان و جاہِ جلال ‏ ‏ زینتِ طینت و جمالِ کمال

کارفرمائے دین و دولت و بخت ‏ ‏ چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت

سایہ اس کا ہما کا سایہ ہے ‏ ‏ خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے

اے مُفیضِ وجودِ سایہ و نور　　جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور
اس خداوندِ بندہ پرور کو　　وارثِ گنج و تخت و افسر کو
شاد و دل شاد و شادماں رکھیو!　　اور غالبؔ پہ مہرباں رکھیو!

آموں کی تعریف میں

تمہید:- یہ مثنوی، جیسا کہ آخر میں بتایا گیا ہے، میرزا غلام فخر الدین فتح الملک کے لیے کہی گئی تھی، جسے شہزادہ دارا بخت کی وفات کے بعد ولیعہد مانا گیا تھا۔ ۱۸۵۲ء میں اس کی ولیعہدی انگریزی حکومت نے منظور کی اور ۱۸۵۶ء میں اس نے وفات پائی۔ بہادر شاہ کا یہ دوسرا ولی عہد میرزا غالبؔ کا شاگرد تھا ظاہر ہے کہ یہ مثنوی ۱۸۵۲ء اور ۱۸۵۶ء کے درمیان کہی گئی، کیونکہ شہزادے کو "والیِ ولایتِ عہد" کہا گیا ہے۔

۱- شرح: شیروار ہو جاؤ، میرا درد مند اور زمزمے گانے والا دل کس لیے رازکے خزانے کا دروازہ نہ کھولے؛

اس شعر کے سلسلے میں یہ بحث چھیڑی گئی ہے کہ شعر خطابیہ ہے اور دوسرے مصرع سے پہلے "تو" محذوف رکھا گیا ہے۔ بہ ظاہر اسے خطابیہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں، میرزا ویسے ہی کہتے ہیں کہ میرا درد مند دل کیوں نہ خزینۂ راز کا دروازہ کھولے۔

۲- شرح: کاغذ کے صفحے پر قلم کا رواں ہونا ایسا ہی ہے، جیسے شاخِ گل سے پھول جھڑنے لگیں۔

۳- شرح: اے قلم! تو مجھ سے کیا پوچھتا ہے کہ کیا لکھنا چاہیے: میں کیا بتاؤں؛ لیکن موقع اور محل کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے نکتے لکھے جائیں، جن سے عقل و ہوش کی روشنی تیز تر ہو۔

۴۔ لغات۔ رطب فشاں : خرمے ٹپکانے والا۔

شرح : غرض آموں کی کچھ کیفیت بیان ہو جانی چاہیے اور انداز بیان ایسا ہو کہ لوگ سمجھیں، قلم خرمے کا درخت ہے اور خرمے ٹپکا رہا ہے۔

۵۔ لغات۔ گوے وچوگاں : گیند، بَلّا۔ اصل کھیل کا نام بھی چوگان ہی ہے اور یہ گھوڑے پر سوار ہو کر کھیلتے ہیں۔ بَلّا بہت لمبا ہوتا ہے اور سوار اس سے گیند آگے بڑھاتا ہے اور انگریزی میں اسی کو پولو کہتے ہیں۔

شرح : آم کے میدان کا مرد کون ہو سکتا ہے؟ آم کے درخت کی شاخ بَلّا اور اس کا پھل گیند ہے۔ گویا چوگان کے اس کھیل میں کوئی دوسرا پھل آم سے بازی نہیں لے جا سکتا۔

میدان اور مرد گوے وچوگان کی مناسبت سے لائے ہیں۔ آم کو گوے سے اور شاخ کو چوگان سے تشبیہ دی ہے۔

۶۔ لغات۔ تاک : انگور کی بیل، انگور۔

شرح : انگور کے دل میں مقابلے کا ارمان ہے تو آئے اور ارمان نکال لے۔ یہ گیند ہے اور یہ میدان۔

گیند سے پھر یہاں مراد آم ہے اور میدان سے میدان مقابلہ مقصود ہے۔ یعنی آم سامنے پڑا ہے۔ میدان مقابلہ آراستہ ہے۔ انگور کو حوصلہ ہے تو آئے اور قوت آزمائی کرے۔

۷۔ لغات۔ جلے پھپھولے پھوڑنا۔ شکایت بھری باتوں سے دل کا غبار نکالنا۔ یہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے، جب کسی کے سامنے کچھ پیش نہ جا سکے۔

شرح : انگور آم کا مقابلہ خاک کر سکتا ہے؟ بس یہ سمجھ لیجے کہ جلے پھپھولے پھوڑتا ہے اور خواہ مخواہ دشمنی کا اظہار کرتا ہے، جس سے کچھ حاصل نہیں۔

۸ - ۹ - شرح : جب آم کے مقابلے میں انگور کچھ نہ کر سکا تو اس نے خالص شراب کی شکل اختیار کر لی - مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا ؟ اپنی ہستی ختم کر دی، وجود مٹا دیا اور شرم سے پانی پانی ہوگیا۔

شراب اُسی صورت میں بنتی ہے کہ انگور بالکل کُچلا جائے اور اس کی ہستی مٹ جائے اسی کے لیے جی کا کھونا اور شرم سے پانی پانی ہونا کہا گیا اور وہ بھی ناچار ہو کر، یعنی مجبوری سے، کیونکہ اصل حالت میں آم کا مقابلہ نہ کر سکا۔ ہیئت بدل لی اور دوسری شکل اختیار کر لی۔

۱۰ - ۱۱ - شرح : آپ کو کیا خبر ہے ؟ مجھ سے پوچھیے کہ آم کے سامنے گنّا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ دیکھیے، نہ آم کی طرح گنّے میں پھول آتا ہے نہ اس کی شاخیں ہوتی ہیں، نہ آم جیسے پتّے ہوتے ہیں، نہ ویسا پھل۔ پھر لطف یہ کہ جب خزاں کا موسم آتا ہے تو اس کی بہار شروع ہوتی ہے۔

آخری مصرع کا مطلب یہ ہے کہ گنّا اکتوبر میں پکتا ہے اور اس وقت خزاں کا موسم شروع ہو جاتا ہے۔ معلوم ہے کہ سردیوں ہی میں اسے پیل کر رس نکالتے ہیں اور گڑ، شکر، چینی وغیرہ بناتے ہیں۔ اسی موسم میں یہ چوسا جاتا ہے یا اس کی گنڈیریاں کھاتے ہیں یا رس پیتے ہیں۔

۱۲ - ۱۳ - ۱۴ - شرح : اور کہاں قیاس دوڑائیں ؟ جان کو سب لوگ شیریں کہتے ہیں، لیکن اس میں ایسی مٹھاس کہاں، جیسی عام میں ہوتی ہے۔ اگر جان میں آم کے برابر شیرینی ہوتی تو کوہکن ایسی آسانی سے کیونکر جان دے دیتا مانا کہ اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا اور جان دے دینے میں اسے یکتائی حاصل تھی، پھر بھی وہ آم جیسی میٹھی جان دے دینے پر بے تکلّف آمادہ نہ ہو جاتا۔

۱۵ - ۲۰ - لغات - قوام : شیرہ - چاشنی -

رافت : مہربانی -

انگبین : شہد -

ربُّ النّاس : انسانوں کا پروردگار

شرح : مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ازل کے دواخانے میں پھولوں کی آگ پر کھانڈ کا شیرہ تیار کیا گیا۔ اس شیرے کے تار کا نام ریشہ رکھا۔

مطلب یہ کہ یہ آم نہیں، بلکہ کھانڈ کو پھولوں کی آگ پر پکا کر چاشنی تیار کی گئی، وہی آم ہے اور اس چاشنی کے تار کو ریشہ سمجھ لو۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ آم اور اس کے تار کی اصل ایک ہے اور وہ کھانڈ کا شیرہ ہے، لیکن آم شیرہ نہیں، بلکہ وہ جو پھولوں کی آگ پر تیار کیا گیا، یعنی نہایت لطیف و دلآویز۔

یا ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ بہشت کے باغبانوں نے انتہائی مہربانی سے پروردگار کے حکم کے مطابق گلاس شہد سے بھرے اور ان پر مہریں لگا کر دنیا میں بھیج دیے۔

چونکہ آم کو شہد بھرے گلاس سے تشبیہ دی اور گلاس کا منہ کھلا ہوتا ہے، اس لیے تشبیہ کو تام بنانے کی غرض سے اسے سربہ مہر گلاس قرار دیا۔

یا سمجھنا چاہیے کہ حضرت خضرؑ نے کوزہ مصری کی ایک شاخ لگائی اور مدت تک اسے آبِ حیات سے سینچتے رہے، یہاں تک کہ وہ شاخ درخت بنی، پھر اس میں پھل لگا، ورنہ آم ہمیں کیونکر نصیب ہوتے؟

ان شعروں میں بتایا گیا ہے کہ شاخِ نبات مدت تک آبِ حیات سے سینچی جاتی رہی جب کہیں آم تیار ہوئے۔

۲۱-۲۲۔ لغات : ترنجِ زر : سونے کا لیمو۔

خسرو : اس سے مراد ہے ایران کا مشہور بادشاہ خسرو پرویز جسے خسرو دوم بھی کہتے ہیں۔ یہ خسرو اوّل یعنی نوشیروان کا پوتا تھا۔ روایت ہے کہ اس کے پاس سونا تھا، جو موم کی طرح ملائم تھا اور اسے ہاتھ سے دبا کر جو چیز چاہتے تھے، بنا لیتے تھے۔ خسرو نے اس کا لیمو بنوایا، جو اس کے دسترخوان

پر رکھا رہتا تھا۔ اسے ترنج زر اور طلائے دست افشار بھی کہتے تھے۔ طلائے دست افشار کے معنی ہیں، سونا جو ہاتھ سے بھینچا جا سکے۔

شرح: خسرو پرویز کے پاس سونے کا جو ایک میوہ تھا اور اسے ایک نادر چیز سمجھا جاتا تھا، لیکن میرے نزدیک تو اس میں کوئی خوبی نہ تھی۔ رنگ اس کا پیلا تھا اور خوشبو تھی ہی نہیں۔ اگر خسرو آم دیکھ پاتا تو یہ ہاتھ سے دب جانے والا سونا اٹھا کر پھینک دیتا۔

رنگ زرد اس لیے کہا کہ سونے کا رنگ واقعی زرد ہوتا ہے، لیکن غالبؔ کا اشارہ سونے کی طرف نہیں، بلکہ ترنج زر کی تحقیر کی طرف ہے، کیونکہ عام حالات میں رنگ کی زردی ضعف یا بیماری کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ بو باس کی نفی کر کے ترنج زر پر آم کی فوقیت ثابت کر دی، کیونکہ اس کا رنگ بھی پک جانے پر عموماً زرد ہو جاتا ہے۔ اور اس میں خوشبو بھی ہوتی ہے۔

۲۳ - لغات۔ برگ و نوا: سروسامان، لیکن یہاں بظاہر برگ سے مراد پتّے اور نوا سے مراد مرغانِ چمن کی ترانہ ریزیاں ہیں۔ گویا کارگاہِ برگ و نوا سے مراد باغ ہیں۔

دود مان: خاندان۔

شرح: آم وہ پھل ہے، جسے چمن زاروں کی رونق قرار دینا چاہیے جو درخت اور پودے پانی اور ہوا سے تربیت کے محتاج ہیں، ان کے پورے سلسلے میں آم باعثِ فخر و ناز ہے۔

۲۴ - لغات۔ طوبیٰ: بہشت کا ایک درخت۔

سدرہ: لفظی معنی بیری، لیکن اس سے مراد سدرۃ المنتہیٰ ہے، جو ایسا اونچا مقام ہے کہ رسول اللہ (صلعم) کے سوا کوئی اس سے آگے نہیں جا سکا اور حضورؐ معراج کی رات اس مقام سے آگے گئے تھے۔

جگر گوشہ: کلیجے کا ٹکڑا۔

شرح: آم بہشت کے راستے پر چلنے والے مسافر کا زادِ راہ ہے۔ طوبیٰ اور سدرہ کے کلیجے کا ٹکڑا ہے۔

پہلے مصرع کا مطلب بیخود صاحب نے یہ قرار دیا ہے کہ اگر کوئی شخص آم کھاتے کھاتے مر بھی جائے تو سیدھا جنت میں جائے گا۔

۲۵-۲۶۔ شرح: آم کا درخت خوب پھولا پھلا اور پتوں سے ہرا بھرا رہتا ہے۔ گویا بہار نے اس درخت کو خاص ناز و نعمت سے پالا ہے۔

آم میں پھل تو خاص وقت ہی پر آتا ہے لیکن بلا شبہ خزاں میں بھی یہ پتوں سے خالی نہیں ہوتا۔ پتے یقیناً جھڑتے ہیں۔ لیکن اس طرح کہ ساتھ ساتھ نئے نکلتے آتے ہیں اور شاخیں بدستور سرسبز رہتی ہیں۔

خصوصاً وہ آم، جو آسانی سے ہاتھ نہیں آسکتا اور بازار میں نہیں بکتا۔ وہ سلطان یعنی شہزادے کے باغ کا نیا پھل ہے۔ سلطان سے مراد شہزادہ ولی عہد ہے اور بادشاہِ وقت کے تمام شہزادے "سلطان" ہی کہلاتے تھے، جس طرح عام شہزادے "سلاطین" کہلاتے تھے۔

۲۷-۳۰۔ شرح: وہ جو ولایتِ عہد کا والی، یعنی سلطنت کا ولی عہد ہے اور جس کے عدل و انصاف سے زمانے کی حمایت ہو رہی ہے۔ وہ شہزادہ فخر الدین، جس سے جاہ و جلال کی عزت و شان قائم ہے۔ وہ شہزادہ، جو فطرت کی زینت، اور کمال کا حسن و جمال ہے۔

فخرِ دین سے یہاں دین کا فخر بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے، کہ یہ غالب کے ممدوح شہزادہ فخر المک عرف مرزا فخرو کا اصل نام تھا۔ یعنی محمد فخر الدین۔ اس لیے یہاں وہی مراد ہے۔

کہتے ہیں کہ مخدوم فخر الدین سے جاہ و جلال نے عزت اور شان پائی۔ ان سے طبیعت کو زینت حاصل ہوئی۔ اسی سے کمال کو نمود۔

وہی دین، سلطنت اور نصیبے کا کارفرما ہے، یعنی تینوں کے معاملات اسی

کے ذریعے سے ملے پاتے ہیں اور وہی تاج، تخت اور گدی کے لیے رونق اور آرائش کا باعث ہے۔ یعنی یہ تینوں چیزیں اس شہزادے کی وجہ سے خوب صورت اور دلآویز معلوم ہوتی ہیں۔ وہ شہزادہ، جس کا سایہ ہما کی طرح مبارک سایہ ہے۔ وہ شہزادہ، جو خدا کے بندوں پر خدا کا سایہ ہے۔

۳۱-۳۲-۳۳ - یہ تینوں شعر دعائیہ ہیں۔

لغات : مفیض : فیض پہنچانے والا، فیض رساں۔

شرح : اے سائے اور نور کے وجود کو فیض پہنچانے والے خدائے بزرگ! جب تک اس دنیا میں سائے اور نور کا وجود باقی ہے، میرے اس آقا کو، جو اپنے غلاموں کی پرورش کر رہا ہے، خزانے، تاج اور تخت کے وارث کو، یعنی جس کی ولی عہدی کا فرمان خود بادشاہ دے چکا ہے، خوش، خوش دل اور خوش خوش رکھنا اور تیری بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ غالب پر ہمیشہ مہربان رہے

اسی وقت انہیں (ذوق کا سہرا) ملا اور شہر کی گلی گلی، کوچے کوچے میں پھیل گیا۔ میرزا بڑے اداشناس تھے۔ سمجھے کہ کیا تھا کچھ 'اور' ہو گیا کچھ 'اور'۔ اسی وقت قطعہ لکھ کر حضور میں گزرانا۔ سب طرف تعریفیں ہوئیں۔" مولانا کا یہ بیان بھی ان کے اکثر بیانوں کی طرح کمتر حقیقت اور زیادہ تر سخن آرائی ہے۔

قطعات

۱- بہ حضورِ شاہ

اے شہنشاہِ فلک منظر و بے مثل و نظیر
اے جہاندارِ کرم شیوہ و بے شبہ و عدیل

پاؤں سے تیرے ملے فرقِ ارادت، اورنگ
فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل

ترا اندازِ سخن، شانۂ زلفِ الہام
تری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریلؑ

تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیمؑ
تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیلؑ

بہ سخن اوج دہِ مرتبۂ معنی و لفظ
بہ کرم، داغ نہِ ناصیۂ قلزم و نیل

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر
تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا، ثور سے جانا باہر
زہرہ نے ترک کیا، حوت سے کرنا تحویل

۱- لغات
فلک منظر: جس کا جھروکا آسمان ہو
شبہ: نظیر، مشابہ
عدیل: برابر، مثال

شرح
اے شہنشاہ! جس کے لیے آسمان جھروکا بنا ہوا ہے اور جس کا کوئی مثیل و نظیر نہیں اور اے جہان کے سلطان! جس کا طریقہ ہی یہ ہے کہ لوگوں پر نوازش کرے اور جس کا کوئی ثانی اور کوئی برابر نہیں۔

۲- لغات
فرق: سر، چوٹی۔
اورنگ: تخت
کسب:

گری بخشش، مرے انجاحِ مقاصد کی سبیل

ترا اقبالِ ترحّم، مرے جینے کی نوید

ترا اندازِ تغافل، مرے مرنے کی دلیل

بختِ ناسازنے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں

چرخِ کج بازنے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل

پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ

پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم

کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل

دُرِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی داڑھی

غمِ گیتی سے مرا سینہ عمرو کی زنبیل

فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر

کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل

مرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدّق توضیح

مرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

تخت اپنے سر کی چوٹی

تیرے پائے مبارک سے

مل رہا ہے اور تیرے سر کی

چوٹی سے تاج سعادت و

نیک بختی حاصل کر رہا ہے۔

شعر کی خوبی محتاجِ

تشریح نہیں۔ تخت پر بیٹھنے

والے کے پاؤں بہرحال

تخت کے سر پر ہوں گے،

اور تاج تاجدار کے سر ہی پر

رہے گا۔ تخت بادشاہ کی

اطاعت و فرمانبرداری کا

اظہار عاجزانہ کر رہا ہے اور

تاج بادشاہ کی زینت کے

لیے سر پر نہیں آیا، بلکہ اپنے

لیے حصولِ سعادت کا موقع

سمجھ کر سر پر آیا ہے۔

۳۔ لغات :

بالِ جبریلؑ :

حضرت جبریلؑ کے بال و پر

شرح :۔

کنگھی ہوتی جاتی ہے، یعنی
اسے سنوارا جاتا ہے اور تیرے
قلم کی رفتار ایسی ہے جیسے
جبریلؑ کے بال و پر ہلا رہے ہوں

...ادی کری کا سر نو بہ کرتا جیل

...قبلۂ کون و مکاں! خستہ نوازی میں یہ دیر؟

...کعبۂ امن و اماں! عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل؟

۴ - لغات۔ رابطہ: تعلق
قربِ کلیمؑ: حضرت موسیٰؑ کا قرب
مائدہ: دسترخوان
بذل: سخاوت و نوازش
خلیل: حضرت ابراہیمؑ، جنہیں خلیل اللہ کہتے ہیں۔

شرح۔ حضرت ابراہیمؑ کی ایک بڑی خصوصیت مہمانداری تھی اور حضرت موسیٰؑ کی ایک بڑی خصوصیت اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونا، جس کی وجہ سے کلیم اللہ خطاب پایا۔ تیرے دم سے اس زمانے میں دنیا پر یہ آشکار ہوا کہ حضرت کلیم اللہؑ کو ذاتِ باری سے کتنا قرب تھا۔ تیرے ہی دم سے روئے زمین پر حضرت ابراہیم کا دسترخوانِ نعمت بچھا۔

مطلب یہ کہ حضرت کلیم اللہؑ کا قرب اور حضرت ابراہیمؑ کا بذل، دونوں جوہروں کا پرتو، تیرے اندر موجود ہے۔

۵ - لغات۔ سخن: گفتگو، شعر و سخن۔
اوج دِہ: بلندی دینے والا۔
ناصیہ: پیشانی

شرح۔ بادشاہ گفتگو اور شعر و سخن کے ذریعے سے معنی و لفظ کے درجے کو بلندی دینے والا ہے اور اس کا شیوۂ کرم ایسا ہے، جو نیل جیسے دریا اور قلزم جیسے سمندر کی پیشانی پر بھی داغ لگا دیتا ہے۔

اکلیل : تاج

شرح

تخت اپنے سر کی چوٹی تیرے پاے مبارک سے مل رہا ہے اور تیرے سر کی چوٹی سے تاج سعادت و نیک بختی حاصل کر رہا ہے۔

شعر کی خوبی محتاج تشریح نہیں۔ تخت پر بیٹھنے والے کے پاؤں بہرحال تخت کے سر پر ہوں گے، اور تاج تاجدار کے سر ہی پر رہے گا۔ تخت بادشاہ کی اطاعت و فرمانبرداری کا اظہار عاجزانہ کر رہا ہے اور تاج بادشاہ کی زینت کے لیے سر پر نہیں آیا، بلکہ اپنے لیے حصولِ سعادت کا موقع سمجھ کر سر پر آیا ہے۔

۲- لغات :

بالِ جبریلؑ : حضرت جبریلؑ کے بال و پر

شرح :-

تری دانش، مری اصلاحِ مفاسد کی رہین
تری بخشش، مرے انجاحِ مقاصد کی کفیل

ترا اقبالِ ترحم، مرے جینے کی نوید
ترا اندازِ تغافل، مرے مرنے کی دلیل

بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں
چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل

پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم
کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل

دُرِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی داڑھی
غمِ گیتی سے مرا سینہ عمرو کی زنبیل

فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل

مرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
مرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

نیک ہوتی مری حالت، تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر، تو نہ کرتا تعجیل
قبلۂ کون و مکاں! خستہ نوازی میں یہ دیر؟
کعبۂ امن و اماں! عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل؟

تیرا اندازِ گفتار ایسا ہے، جس سے الہام کی زلف میں کنگھی ہوتی جاتی ہے، یعنی اسے سنوارا جاتا ہے اور تیرے قلم کی رفتار ایسی ہے، جیسے جبریل کے بال و پر ہلتے ہوں۔

۴ ۔ لغات ۔ رابطہ : تعلق
قربِ کلیم : حضرت موسیٰ کا قرب
مائدہ : دسترخوان
بذل : سخاوت و نوازش
خلیل : حضرت ابراہیم، جنہیں خلیل اللہ کہتے ہیں۔

شرح ۔ حضرت ابراہیم کی ایک بڑی خصوصیت مہانداری تھی اور حضرت موسیٰ کی ایک بڑی خصوصیت اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونا، جس کی وجہ سے کلیم اللہ خطاب پایا۔ تیرے دم سے اس زمانے میں دنیا پر یہ آشکار ہوا کہ حضرت کلیم اللہ کو ذاتِ باری سے کتنا قرب تھا۔ تیرے ہی دم سے روئے زمین پر حضرت ابراہیم کا دسترخوانِ نعمت بچھا۔

مطلب یہ کہ حضرت کلیم اللہ کا قرب اور حضرت ابراہیم کا بذل، دونوں جوہروں کا پرتو، تیرے اندر موجود ہے۔

۵ ۔ لغات ۔ سخن : گفتگو، شعر و سخن۔
اوج دِہ : بلندی دینے والا۔
ناصیہ : پیشانی

شرح ۔ بادشاہ گفتگو اور شعر و سخن کے ذریعے سے معنی و الفاظ کے درجے کو بلندی دینے والا ہے اور اس کا شیوۂ کرم ایسا ہے، جو نیل جیسے دریا اور قلزم جیسے سمندر کی پیشانی پر بھی داغ لگا دیتا ہے۔

۶-۷۔ لغات۔ توفیر: زیادتی، افزائش۔

تقلیل: کم کرنا، کمی، قلت۔

ثور: مراد ہے برج ثور، جس کی شکل بیل سی تجویز کی گئی ہے۔

حوت: مراد ہے برجِ حوت، جس کی شکل مچھلی کی سی تجویز کی گئی ہے۔

تحویل: پھرنا، حوالے کرنا۔

ہیئت دانوں کے نزدیک چاند برج ثور میں ہو تو عیش و طرب کی دلیل ہے اور زہرہ برج حوت میں ہو تو رنج و غم میں کمی آجاتی ہے

شرح۔ چاند نے برجِ ثور سے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ زہرہ نے برجِ حوت میں پہنچ کر پھرنا ترک کر دیا۔ یہ اس سبب کیا کہ اے شہنشاہ! تیرے وقت میں عیش و طرب بہت زیادہ ہو جائے اور تیرے عہد کے اندر رنج و غم میں کمی آ جائے۔

۸۔ لغات۔ مفاسد: مفسدہ کی جمع، خرابیاں اور غلطیاں۔

رہین: گروی، ممنون۔

انجاح: پورا ہونا۔

کفیل: ذمہ داری اٹھانے والا۔

شرح۔ اے بادشاہ! تیری عقل و دانش میری خرابیوں اور کوتاہیوں کو درست کرنے کی ضامن ہے اور تیری بخشش میرے مقاصد پورے کرنے کی ذمہ دار بنی ہوئی ہے

۹۔ لغات۔ اقبال: توجہ، رخ، التفات۔

شرح۔ تیرے رحم و کرم کی بدولت مجھے جینے کی خوشخبری مل رہی ہے، اگر تو تغافل اختیار کرے تو وہ میرے مرجانے کی دلیل بن جائے گا، یعنی تیرے رحم و کرم پر زندہ ہوں اور تو بے پروائی اختیار کرے تو مر جاؤں گا۔

۱۰-۱۱۔ شرح۔ جس نصیبے کو مجھ سے موافقت نہیں، اس کی خواہش تھی کہ مجھے امن و امان حاصل نہ ہو۔ ٹیڑھی چال چلنے والے آسمان نے مجھے ذلیل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

پہلے میرے ناخنِ تدبیر کی جڑ میں کیل ٹھونک دی، پھر اوقات کے دھاگے میں گانٹھ ڈال دی

مطلب یہ کہ اوقات کے دھاگے کی گانٹھ تدبیر کے ناخن ہی سے کھولی جا سکتی تھی، لیکن جب ناخنِ تدبیر کو بیکار کر دیا گیا تو اُس گانٹھ کے کھولنے کی کون سی صورت باقی رہی؟

۱۲۔ لغات۔ جرِّ ثقیل : لغوی معنی، بھاری چیزوں کو کھینچنا۔ وہ علم یا آلہ جس کے ذریعے سے بھاری چیزیں بہ آسانی اوپر کھینچی جاتی ہیں۔ آج کل ریلوں اور بسوں کے لیے اس قسم کے آلے بکثرت استعمال ہوتے ہیں

شرح۔ دل میں جو تپش و اضطراب ہے وہ ایک بڑے خوف سے بے تعلق نہیں، یعنی اس خوف ہی کا نتیجہ ہے۔ میرے لیے سانس لینا یا کھینچنا علم جرِّ ثقیل کے قاعدے سے کام لیے بغیر ممکن نہیں گویا میرے لیے سانس لینا بیحد مشکل ہے۔

۱۳۔ لغات۔ لقا : داستان امیر حمزہؓ کے ایک مشہور کردار جس کی ڈاڑھی میں موتی، پروئے رہتے تھے۔

عَمَر : مولانا طباطبائی نے یہ نام "اُمَر" لکھا ہے اور فرماتے ہیں کہ مرزا غالب نے یونہی لکھا تھا تاکہ حضرت عُمَرؓ سے التباس نہ ہو۔ عرشی صاحب نے اپنے دیوان میں عُمرا (بفتح العین الفتوح) لکھا ہے۔ داستانِ امیر حمزہؓ سرتاپا افسانہ ہے، لیکن اس کے بعض کرداروں کے نام ایسے رکھے گئے ہیں، جو حقیقۃً موجود تھے۔ مثلاً عَمَر بن امیہ زمری، جسے داستان گویوں نے عَمَر عیار بنا دیا۔

زنبیل : چری جھولی کہا جاتا ہے کہ عَمَر کی زنبیل ایسی تھی جس میں سب کچھ بھرا ہوا تھا۔

شرح۔ معانی کے موتیوں سے میرے کاغذ کا صفحہ لقا کی ڈاڑھی معلوم ہوتا ہے، یعنی جس طرح لقا کی ڈاڑھی میں موتی پروئے رہتے تھے، اسی طرح میں جو شعر کہتا ہوں، وہ موتیوں کی لڑیاں ہوتی ہیں۔

زمانے کے رنج و الم سے میرا سینہ عَمَر کی چری جھولی بنا ہوا ہے۔ مطلب یہ کہ ساری دنیا کے غم میرے سینے میں جمع ہیں

۱۴۔ لغات۔ گہر اندوز : موتی جمع کرنے والا، موتی رولنے والا۔

شرح ۔ میری فکر بہت سے اشاروں کے موتی رولتی ہے اور میرا قلم مختصر، عبارتیں لکھنا سکھاتا ہے

مراد یہ ہے کہ میں سوچتا ہوں تو کثیر اشارے موتیوں کی شکل میں میرے سامنے آجاتے ہیں، لیکن لکھتا ہوں تو کم الفاظ میں مطلب پیش کر دیتا ہوں۔ کثیر اشاروں سے آپ پوری، کیفیت سمجھ سکتے ہیں

۱۵۔ لغات ۔ ابہام : اس طرح بیان کرنا کہ وضاحت نہ ہو مختصر الفاظ میں، غیر واضح طریق پر بات کہنا۔

اجمال : اختصار ۔

تراوش ٹپکاؤ، ٹپکنا۔

شرح ۔ میں گول مول طریق پر بھی بات ایسے انداز میں کرتا ہوں، جس پر وضاحت قربان ہوتی ہے میرے اختصار سے تفصیل خود بخود ٹپکتی ہے ۔ یعنی میں سرسری طور پر بھی کچھ کہہ دوں تو وضاحت سے اس میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا ۔ میں اختصار سے بھی بات کروں، تو جتنی تفصیل حقیقۃً، مطلوب ہے وہ اس میں آجاتی ہے ۔

۱۶۔ لغات ۔ تعجیل : جلدی، جلدی کرنا ۔

شرح ۔ اگر میری حالت اچھی ہوتی تو حضور کو تکلیف دینا گوارا نہ کرتا ۔ اگر میری خاطر جمع ہوتی تو جلدی نہ کرتا۔

حقیقت یہ ہے کہ حالت نہایت خراب ہے اور تکلیف دینا ناگزیر ہو گیا ۔ سخت پریشان ہوں، اس لیے جلدی کرنی پڑی ۔

۱۷۔ لغات ۔ خستہ نوازی : بدحال پر نوازش ۔

شرح ۔ اے کون و مکان کی قبلہ گاہ ! خستہ و بدحال پر لطف و نوازش میں اتنی دیر؟ یہ تو مناسب نہیں ۔

اے امن و امان کے کعبے ! مشکل آسان کرنے میں اتنی ڈھیل ؟

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں، عقدہ کشائی سے ڈھیل دینے کو اس قدر مناسبت ہے کہ

تعریف نہیں ہوسکتی۔ یہ سچ ہے کہ بے ڈھیل دیے گرہ نہیں کھل سکتی لیکن اس قدر ڈھیل کوئی دیتا ہے ؟

۲۔ بہ حضورِ شاہ

اے شہنشاہ آسماں اورنگ
اے جہاندارِ آفتاب آثار!

تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشین
تھا میں اک دردمند سینہ فگار

تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی
ہوئی میری وہ گرمیِ بازار

کہ ہوا مجھ سا ذرّہ ناچیز
روشناسِ ثوابت و سیار

گرچہ از روئے ننگِ بے ہنری
ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار

کہ اگر اپنے کو کہوں خاکی
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں
بادشہ کا غلامِ کار گزار

خانہ زاد اور مرید اور مدّاح
تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے نوکر بھی ہوگیا، صد شکر
نسبتیں ہوگئیں مشخّص چار

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں
مدعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد! اگرچہ مجھ کو نہیں
ذوقِ آرائشِ سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر　　　تا نہ دے بادِ زمہریر آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش؟　　　جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار

کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال　　　کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ　　　بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

آگ تاپے کہاں تلک انسان　　　دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار

دھوپ کی تابش، آگ کی گرمی

وقنا ربنا عذاب النار

مری تنخواہ جو مقرر ہے　　　اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے مُردے کی چھ ماہی ایک　　　خَلق کا ہے اِسی چلن پہ مدار

مجھ کو دیکھو تو ہوں بہ قیدِ حیات　　　اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض　　　اور رہتی ہے سود کی تکرار

مری تنخواہ میں تہائی کا

ہوگیا ہے شریک ساہوکار

آج مجھ سا نہیں زمانے میں　　　شاعرِ نغز گوے خوش گفتار

رزم کی داستان گر سنیے　　　ہے زباں میری، تیغِ جوہردار

بزم کا التزام گر کیجے ہے قلم میری، ابرِ گوہر بار

ظلم ہے، گر نہ دو سخن کی داد

قہر ہے، گر کرو نہ مجھ کو پیار

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا؟ آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار؟

میری تنخواہ کیجے ماہ بہ ماہ تا نہ ہو مجھ کو زندگی دُشوار

ختم کرتا ہوں اب دُعا پہ کلام شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

تمہید۔ قطعے سے مرزا کا سلسلۂ ملازمت ۱۸۵۰ء کے وسط میں شروع ہوا تھا اور تاریخ نگاری کی خدمت سپرد ہوئی تھی۔ ملازمینِ قلعہ کو چھ چھ مہینے کی تنخواہیں اکٹھی ملتی تھیں مرزا، اپنے ایک خط (مرقومہ ۲۔ جنوری ۱۸۵۱ء) میں منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں

اب چھ مہینے پورے ہو چکے، ۲۔ جولائی سے دسمبر ۱۸۵۰ء تک، اب میں دیکھوں کہ ششماہہ مجھے کب ملتا ہے۔ بعد اس کے ملنے کے اگر آیندہ ماہ بہ ماہ کر دیں گے تو میں لکھوں گا، ورنہ اس خدمت کو میرا سلام ہے۔ ابھی بابر کا حال حضور میں نہیں بھیجا، کل مسودہ تمام ہوا ہے صاف ہو رہا ہے۔ اب صاف کر کر دے دوں گا اور ماہ بہ ماہ

کی استدعا کروں گا۔ چھ ماہی آخر ہونے کو تھی
اس واسطے متوجہ ہو کر میں نے اس کو تمام کیا

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۱ء کے اوائل میں یہ قطعہ بابر کے حالات کے ساتھ یا چند روز آگے پیچھے پیش ہوا ہوگا اور یقین ہے کہ بادشاہ نے مرزا کی درخواست منظور کرتے ہوئے تنخواہ ماہ بہ ماہ ادا ہونے کا حکم دے دیا۔ اسی لیے مرزا نے تاریخ نگاری کا کام جاری رکھا اور مزید شکایت کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

۱۔ **لغات۔** اورنگ : تخت۔

شرح۔ اے بادشاہ! جس کے تخت کو آسمان کی سی بلندی حاصل ہے۔ اور اے جہان کا انتظام کرنے والے، جو آفتاب کے سے نشان رکھنے والا ہے!

۲۔۳۔۴۔ **لغات۔** روشناس : صورت پہچاننے والا، واقف۔

ثوابت وسیّار : پرانے ہیئت دانوں نے ستاروں کی دو قسمیں کی تھی، ایک ثابت، یعنی ٹھہرے ہوئے، دوسرے سیار، یعنی چلنے اور سیر و گردش کرنے والے

شرح۔ میں ایک بے سر و ساماں گوشہ نشین تھا۔ ایسا دردمند تھا جس کا سینہ زخمی تھا۔ آپ نے میری آبرو بڑھائی اس سے میری زندگی میں ایسی رونق ہوئی اور میں نے وہ عزت و شہرت پائی کہ مجھ ایسے ناچیز ذرے کی آسمان کے ٹھہرے ہوئے اور گردش کرنے والے ستاروں سے بھی جان پہچان ہوگئی

۵۔۱۰۔ **لغات۔** مشخّص : تشخیص کیا گیا، مُعیّن، مُسلّم

شرح۔ اگرچہ میں بالکل بے ہنر ہوں اور اس ننگ کے باعث خود اپنی نظروں میں اتنا ذلیل و خوار ہوں کہ اگر میں اپنے آپ کو خاکی کہوں تو جانتا ہوں کہ خاک اس نسبت کو اپنے لیے باعثِ ننگ سمجھے۔ تاہم دل میں خوش ہوں کہ مجھے بادشاہ کا کارگزار غلام ہونے کا فخر حاصل ہے۔ درخواست گزار یعنی میں ہمیشہ سے خانہ زاد غلام، مرید اور مدّاح چلا آتا تھا۔ اب شکر کا مقام ہے کہ نوکر بھی ہوگیا۔ اس طرح چار نسبتیں مسلّم ہوگئیں۔ یعنی خانہ زاد، مرید، مدّاح اور نوکر۔ اب آپ فرمائیں کہ جس مقصد کا اظہار ضروری ہو، وہ آپ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں؟

۱۱-۱۷ لغات۔ بادِ زمہریر : نہایت سرد ہوا۔

وقنا ربنا عذاب النار : اے ہمارے پروردگار! ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔

شرح۔ پیرو مرشد! اگرچہ مجھے سر پر دستار سجانے کا کوئی ذوق نہیں، یعنی میں آرائش نہیں چاہتا، لیکن جاڑے کا موسم ہے، آخر کوئی نہ کوئی چیز تو ہونی چاہیئے! جو مجھے سرد ہوا کے دُکھ پہنچانے سے بچا سکے۔ اگرچہ میرا جسم بہت دُبلا اور نحیف ہے۔ لیکن غور فرمایئے کہ کیا اسے لباس درکار نہیں! اس سال کچھ نہیں خریدا اور اب کے کوئی کپڑا نہیں بنایا۔ حالت یہ ہے کہ رات کو آگ تاپتا ہوں، دن کو دھوپ کھاتا ہوں۔ ایسے رات دن کو آگ لگے۔ خود سوچیے کہ انسان کہاں تک آگ تاپ کر گزارہ کرے اور جاندار کب تک دھوپ کھائے؟ دھوپ کی تیزی اور آگ کی گرمی دیکھ کر بے اختیار یہ کلام زبان پر جاری ہو جاتا ہے۔ اے ہمارے پروردگار! ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔

۱۸-۲۲۔ لغات۔ ہنجار : طریقہ، قاعدہ، روش، شیوہ۔

چھ ماہی : فاتحہ اور کھانا جو کسی کے مرنے کے بعد چھٹے مہینے ہوتا ہے۔

تکرار : دھرنا، بحث، جھگڑا، یہاں مراد سود در سود سے ہے یعنی سود بار بار دُگنا ہوتا رہتا ہے۔

شرح۔ میری تنخواہ، جو حضور نے مقرر فرمائی ہے، اس کے ملنے کا طریق بڑا عجیب ہے۔ چھ مہینے کے بعد مُردے کی رسم ادا کی جاتی ہے اور لوگوں نے اس رسم کو اپنا دستور بنا لیا ہے۔ اب مجھ پر نظر ڈالیے میں زندگی کی قید میں ہوں، کھانے پینے اور دوسری ضرورتوں کے لیے خرچ چاہیئے۔ چھ ماہی سال میں دو مرتبہ ہوتی ہے۔ ماہانہ خرچ کیونکر پورا ہو؟ حیات کے ساتھ "قید" کے لفظ سے واضح کر دیا کہ زندگی میری مرضی اور خوشی کے مطابق نہیں گزر رہی۔ یہ سمجھنا چاہیئے کہ میں اس کی قید میں ہوں اور چار و ناچار جیے بغیر چارہ نہیں۔

ہر مہینے مجھے قرض لے کر گزارہ کرنا پڑتا ہے اور قرض پر سود برابر بڑھتا رہتا ہے۔
کیونکہ ساہوکار ہر مہینے سود در سود پر عمل کرتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ چھ مہینے میں سود در سود
کے باعث تنخواہ کی تہائی رقم سود میں دینی پڑتی ہے گویا میری تنخواہ میں ایک تہائی کا،
حصہ دار ساہوکار بن گیا۔

۲۳-۲۵-لغات۔ نغز گو : نہایت شگفتہ و دلآویز شعر کہنے والا۔
اِلتزام : لازم بنا لینا، اہتمام۔

شرح۔ آج اس دور میں ایسا شاعر موجود نہیں، جو میری طرح شگفتہ و دلآویز
شعر کہہ سکے اور شیریں بیانی سے کام لے سکے۔ زندگی کے مشاغل کی دو بڑی قسمیں
کی گئی ہیں! رزم اور بزم، یعنی لڑائیاں اور محفل آرائی۔ آپ رزم کی داستان سنیں تو میری
زبان جوہر دار تلوار کا کام دے گی اور میدانِ جنگ کے حالات اس خوبی سے بیان کرے گی کہ اس
سے بہتر ممکن نہ ہو۔ اگر بزم کا ذکر لازم کر لیا جائے تو میرا قلم موتی برسانے والا بادل بن جائے
گا اور جشن نشاط کا سماں باندھ دے گا۔

۲۶-۲۸-شرح۔ اگر میری شعر گوئی کی داد نہ دیں تو یہ طریقِ انصاف سے بعید ہوگا
اور اگر مجھ سے پیار نہ کریں تو اسے قہر سمجھنا چاہیئے۔ میں آپ کا غلام ہو کر یوں ننگا پھروں
اور آپ کا نوکر ہو کر اُدھار کھاؤں! حکم دیجیے کہ میری تنخواہ ہر مہینے ادا ہوتی رہے تاکہ زندگی
میرے لیے دشوار نہ رہے۔

۲۹-۳۰-شرح۔ اب میں یہ قطعہ دعا پر ختم کرتا ہوں۔ اس بارے میں مجھے شعر گوئی
سے کچھ سروکار نہیں، صرف اپنا حالِ زار واضح کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ہزار برس
سلامت رہیں اور برس بھی ایسے کہ ہر ایک کے دن تین سو پینسٹھ کے بجائے
پچاس ہزار ہوں۔

۲۔ مدحِ شاہ

اے شاہِ جہانگیر جہاں بخشِ جہاں دار
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ ہو وا
تو وا کرے اس عقدے کو، سو بھی بہ اشارت

ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر
گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

آصف کو سلیماںؑ کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخرِ سلیماں جو کرے تیری وزارت

ہے نقشِ مریدی ترا، فرمانِ الٰہی
ہے داغِ غلامی ترا، توقیعِ امارت

تو آب سے گر سلب کرے، طاقتِ سیلاں
تو آگ سے گر رفع کرے، تابِ شرارت

ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی
باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت

۱۔ شرح: اے بادشاہ! جو جہان کو فتح کر لینے والا، جہان بخش دینے والا اور جہان کا انتظام کرنے والا ہے، تیرے لیے ہر لحظہ غیب سے سو سو خوشخبریاں ہیں۔

۲۔ شرح: جو مشکل گرہ کسی کی کوشش سے کھل نہ سکے، تجھے اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق عطا کی ہے کہ اس گرہ کو محض اشارے سے کھول کر رکھ دے۔

۳۔ شرح: کیا یہ ممکن ہے کہ حضرت خضرؑ سکندر سے تیرا تذکرہ کریں، جب تک لبوں کو آبِ حیات،

ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغّل
ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت
کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر
قاصر ہے ستائش میں تری، میری عبارت
نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں
نظارگیِ صنعتِ حق اہلِ بصارت
تجھ کو شرفِ مہرِ جہاں تاب مبارک
غالبؔ کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

سے دھو کر پاک نہ کریں! یعنی تیرا نام ہوں کو پاک کیے بغیر نہیں لیا جا سکتا۔

۴۔ **لغات:** آصف: حضرت سلیمانؑ کا وزیر۔

شرح: آصف کو حضرت سلیمانؑ کی وزارت سے بزرگی ملی اور اس نے رتبۂ عالی پایا۔ اے بادشاہ! جو فرد تیری طرف سے وزارت پر مامور ہو، وہ فخر سلیمانؑ بن جائے گا۔

مصرعے کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے کہ حضرت سلیمانؑ تیری وزارت کریں تو یہ ان کیلئے فخر کا باعث ہو۔ ہمارے شاعر مدح و ستائش میں عموماً حدود کا خیال نہیں رکھتے۔

۵۔ **لغات:** نقش: مہر، تحریر۔ نقشِ مریدی کا مطلب یہ ہے کہ مغل بادشاہوں نے پیری مریدی سلسلہ بھی جاری کر دیا تھا، اسی لیے بادشاہ کو پیر و مرشد بھی کہا جاتا تھا اور لوگ باقاعدہ ان کے مرید ہوتے تھے۔

توقیع: وہ کاغذ، جس پر شاہی دستخط ہوں، فرمان

شرح: جس شخص کے پاس تیری مریدی کی تحریر ہو، سمجھنا چاہیئے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے حکم مل گیا، یعنی تُو دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نائب و خلیفہ ہے کسی فرد کی پیشانی پر تیری غلامی کے داغ کو امیری اور حکمرانی کا درجہ حاصل ہے۔

۶-۷۔ **لغات:** سلب: چھیننا، کھینچ لینا، نفی کر دینا۔

سَیلان : بہنا، روانی

شرارت : شعلہ زن ہونا، بھڑکنا۔

شرح : اگر تُو پانی سے بہاؤ کی قوت چھین لے اور آگ سے بھڑکنے کی خصلت زائل کر دے تو دریا کی موجوں میں بہاؤ ڈھونڈے سے نہ ملے اور جلتی ہوئی آگ میں حرارت باقی نہ رہے۔

۸-۹۔ لغات : توَغّل : انہماک، دُھن، مشغولیت۔

قاصر : قصوروار، عاجز۔

شرح : اگرچہ نکتے بیان کرنے میں مجھے کمال انہماک ہے اور جادو بیانی میں پوری مہارت رکھتا ہوں۔ لیکن اے بادشاہ! میرا ذخیرہ الفاظ تیری تعریف کا حق ادا نہیں کر سکتا، اس لیے کیوں نہ میں مدح کو دعا پر ختم کر دوں؟

۱۰۔ لغات : نظارگی : دیکھنے والا، تماشائی۔

شرح :۔ آج نوروز ہے اور یہ ایسا دن ہے کہ آنکھوں والے خدا کی کارسازیوں کا نظارہ کر رہے ہیں۔

نوروز : یہ تقریب آفتاب کے بُرجِ حمل میں داخل ہونے پر منائی جاتی تھی اور خود مرزا نے اس بارے میں لکھا کہ موٹی بات یہ ہے، یہ واقعہ ۲۲ مارچ کو ہوتا ہے اور کبھی ۲۱ اور ۲۳ کو بھی اس سے تجاوز نہیں۔

۱۱ – لغات : عَتَبہ : آستانہ، دہلیز۔

شرح :۔ بُرجِ حمل میں آفتاب کے داخلے ہی کی بنا پر کہا کہ اے بادشاہ! تجھے دنیا کو روشن کر دینے والے سورج کی سی بلندی و برتری حاصل ہو اور خاتَب کو تیرے اونچے آستانے کی زیارت کا شرف نصیب رہے۔

۴۔ تقریب چہار شنبہ صفر

تمہید:۔ ماہ صفر ۱۲۶۸ھ کے آخری چہار شنبہ کو حضرت رسول اکرم (صلعم) بیمار ہوئے تھے۔ مسلمانوں نے یہ دن دعا و استغفار اور صدقہ و خیرات کے لیے مقرر کر دیا۔ پہلے جلسہ ہائے وعظ ہونے لگے، پھر دوسری رسمیں شروع ہو گئیں۔ لال قلعہ میں اس روز سونے چاندی کے چھلے بٹتے تھے۔

ہے چار شنبہ، آخرِ ماہِ صفر چلو
رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشکبو کی ناند

جو آئے جام بھر کے پیئے اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے، پھولوں کو جائے پھاند

غالب! یہ کیا بیاں ہے، بجز مدحِ بادشاہ
بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت و خواند

بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلے حضور میں
ہے جن کے آگے سیم و زر، مہر و ماہ ماند

یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

ٹامس مٹکاف نے بھی یہ تقریب دیکھی تھی۔ وہ اپنے روزنامچے میں اس کی کیفیت یوں بیان کرتا ہے: بادشاہ باغ حیات بخش میں گئے۔ ایک ہنڈیا میں اشرفی ڈالی اور اسے پاؤں کے دباؤ سے توڑ... پھر گھاس کو روندا۔ بعد ازاں دیوان میں دربار کا سامان ہوا۔ جواہر خانہ شاہی سے ... چھلے آئے۔ بادشاہ نے پانچ

خود پہنے، پندرہ بیگم زینت محل کو دیے، پانچ پانچ دوسری بیگمات کو، سات گورنر جنرل کو، پانچ اس کی میم کو، چھ لفٹنٹ گورنر آگرہ کو، ایجنٹ کو پانچ ایجنسی کے اور پانچ خطاب فرزندی کے، کپتان قلعہ کو چار کپتانی کے اور چار سکرٹری شپ کے، ایک سورج نرائن کو اور ایک حکیم احسن اللہ خاں کو۔

غرض یہ تقریب اسی طرح ہر سال منائی جاتی تھی۔ اسی پر کسی وقت یہ شعر کہے گئے، جن میں رسم کے بعض پہلوں کا ذکر بھی آگیا ہے۔

۱۔ لغات:۔ ناند: بہت بڑا کونڈا، مٹی کا بہت بڑا برتن۔

شرح: ماہ صفر کا آخری بدھ ہے۔ چلو، ایک بڑا برتن مشک جیسی، خوشبو والی شراب سے بھر کر باغ میں رکھ دیں۔

۲۔ شرح: تاکہ جو بھی آئے، جام بھر بھر کر پیئے اور مست ہو کر سبزے کو روندتا پھرے۔ پھولوں کو لانگ جائے، یعنی ان پر پاؤں نہ پڑنے دے۔

۳۔ شرح: اے غالبؔ! تو یہ کیا کر رہا ہے، اب تو مجھے بادشاہ کی مدح کے سوا کوئی لکھنا پڑھنا پسند ہی نہیں آتا۔

۴۔ شرح: دیکھ! بادشاہ کے حضور میں سونے چاندی کے چھلے بٹتے ہیں، جن کی چمک دمک کے سامنے سورج کی چاندی اور چاند کا سونا بھی ماند ہے۔

۵۔ شرح:۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ یہ چھلے نہیں، بلکہ لاکھوں سورج اور بے شمار چاند درمیان سے خالی کر دیے گئے ہیں۔

۵۔ مدحِ نصرت الملک

نصرت الملک بہادر! مجھے بتلا کہ مجھے
تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے

۱۔ شرح: اے نصرت الملک بہادر! مجھے یہ

گرچہ تو وُہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے
رونقِ بزمِ مہ و مہر تری ذات سے ہے

اور میں وُہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں
غیر کیا، خود مجھے نفرت مِری اوقات سے ہے

خستگی کا ہو بھلا جس کے سبب سے سرِ دست
نسبت اک گونہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے

ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عناں
یہ دعا شام و سحر قاضیِ حاجات سے ہے

تو سکندر ہے، مرا فخر ہے مِلنا تیرا
گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

اس پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار
غالبؔ خاک نشیں، اہلِ خرابات سے ہے

بتا کر تیرے ساتھ مجھے جو اس قدر ارادت ہے تو کس وجہ سے ہے؟ مطلب یہ کہ محض انعام و اکرام، سے تو ایسی دلی اور روحانی ارادت پیدا نہیں ہو سکتی، یقیناً اس کا سبب ذاتی محبت و عقیدت ہے جو سراسر اخلاص پر مبنی ہے۔ مولانا طباطبائی بالکل بجا فرماتے ہیں کہ اس مقام پر استفہام و استعجاب میں نہایت بلاغت ہے، جس سے ایسے معانی جلیل پیدا ہوئے، یعنی محض سوال ہی سے یہ واضح کر دیا گیا کہ اس ارادت کا تعلق دل اور روح ۔ سے ہے۔

۲-۳-۴۔ لغات : اوقات : دوسرے معانی کے علاوہ حیثیت، بساط استطاعت یا مقدور۔

شرح : حقیقت یہ ہے کہ اگر تُو ہنگامہ بپا کرے اور جاہ و جلال دکھائے

تو سارے جہان پر روشن ہو جائے کہ چاند سورج کی محفل یعنی پوری کائنات میں رونق صرف تیری بدولت ہے اور میں وہ ہوں کہ دل میں سوچوں تو غیر ایک طرف رہا، خود مجھے اپنی حیثیت و بساط سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔

مطلب یہ، تو اتنا عالی مقام ہے کہ چاند سورج بھی اپنی بزم کی رونق کے لیے تیرے محتاج ہیں اور میں اتنا حقیر ہوں کہ اپنی ذات سے بھی نفرت ہوتی ہے۔

۴۔ **لغات** : سرِدست : اس وقت، فی الحال۔

شرح : اگرچہ تو چاند سورج کی انجمن کے لیے رونق افزا ہے اور میں بالکل بے حقیقت ہوں، لیکن خستگی کا بھلا ہو، جس کے سبب سے میرے دل کو تیرے ہاتھ کے ساتھ ایک گونہ نسبت پیدا ہو گئی ہے۔

اس نسبت کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں، مثلاً :

۱۔ جو ہاتھ دشمنوں کا خون بہاتا ہے۔ وہی خستہ دلوں کے لیے مرہم کا سامان کر دیتا ہے۔

۲۔ خستہ دلوں پر نوازش جس ہاتھ کا کام ہے، اس سے نسبت پیدا ہو جانا کسی تشریح کا محتاج نہیں۔

۳۔ سمجھا جاتا ہے کہ ممدوح کا ایک ہاتھ زخمی تھا، اسی لیے مرزا نے، اپنے خستہ دل اور ممدوح کے خستہ ہاتھ کے درمیان نسبت پیدا کی اور اس سلسلے میں تکلف سے لفظ "سرِدست" لائے

چونکہ ممدوح کی شخصیت اس وقت تک پوری طرح واضح نہیں ہو سکی، اس لیے آخری مطلب کے متعلق یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے بعض اوقات خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ صاحب فرخ آباد کے نوابوں میں سے کوئی ہے۔

۵۔ **لغات** : **توسن** : گھوڑا

قاضیِ حاجات : ضرورتیں پوری کرنے والا یعنی خدائے قادر و توانا۔

شرح : میں صبح و شام خدائے قادر و توانا سے دعا کرتا رہتا ہوں کہ مملکت کے گھوڑے کی باگ تیرے ہاتھ میں رہے۔

۶۔ شرح : میں تجھے اپنا سکندر مانتے بیٹھا ہوں اور تجھ سے ملنے کو باعثِ فخر سمجھتا ہوں، اگرچہ مجھے خضرؑ کی ملاقات سے بھی شرف حاصل ہے۔

مطلب یہ کہ میرا علمی ذوق علم و عرفان کے پیکر حضرت خضرؑ سے بھی استفادہ کرتا رہتا ہے۔ تُو ثروت و برتری میں میرے لیے سکندر کی حیثیت رکھتا ہے۔

۷۔ لغات : ریو : مکر و فریب

ریا : دکھاوا، نمود، نمائش

اہلِ خرابات : لفظی معنی شراب خانے کے رند،

مجازی معنی وہ لوگ، جن کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا ہے، راستباز، اہلِ صلاح و تقوی۔

شرح : اگرچہ غالبؔ خاک نشیں یعنی عاجز و مسکین ہے، تاہم اس کا ظاہر و باطن ایک ہے، لہٰذا اس پر مکر و فریب یا ریاکاری کا گمان نہ ہونا چاہیے یعنی اس نے جو کچھ کہا ہے، وہ میں خلوص اور دلی ارادت پر مبنی ہے۔

۶۔ بیانِ مُصنّف

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی ۔۔۔ اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری ۔۔۔ کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رَو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل ۔۔۔ ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفرؔ کا غلام ہوں ۔۔۔ مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

استادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال ۔۔۔ یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر　　سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ، ہاں اس سے مدعا　　جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا، ز رہِ امتثالِ امر　　دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آپڑی تھی سخن گسترانہ بات　　مقصود اُس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو، تو روسیاہ　　سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

قسمت بُری سہی، پہ طبیعت بُری نہیں　　ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خُدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھُوٹ کی عادت نہیں مجھے

ذوق نے خود یا بادشاہ کے ایما پر سہرے کے معاملے میں حریفانہ انداز اختیار کر لیا تو مرزا نے یہ قطعہ بطورِ معذرت پیش کر دیا۔

اس سلسلے میں ایک ضروری گزارش اور ہے۔ بعض روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ زینت محل بیگم نے اہلِ دربار کو تاکید کر دی تھی، ذوق کا سہرا پڑھا جائے تو کسی شعر کی داد نہ دیں۔ چنانچہ چار پانچ شعر سُن کر درباری خاموش رہے۔ جب بادشاہ نے ستائش شروع کی تو درباری بھی خاموش نہ رہ سکے۔

یہ افسانہ سراسر بے بنیاد ہے۔ نہ بیگم کو ایسی تاکید کی ضرورت تھی، نہ موقع اور محل اس کا متقاضی تھا۔ اگر بیگم اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانا چاہتی تو وہ بادشاہ ہی سے کہہ سکتی تھی، جو بیگم کے زیرِ اثر تھا اور جس نے بیگم کے اصرار پر میرزا جواں بخت کی ولی عہدی کے لیے کوشش کے سلسلے میں بڑے بیٹوں کے مسلّمہ حقوق سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ایسے افسانے صرف ذوق کی پاسداری میں تیار

لیے گئے۔

خود مولانا محمد حسین آزاد مرحوم و مغفور نے ذوق کے قصیدہ ملا کے سلسلے میں فرمایا ہے کہ مرزا عالی عرض بیگی کے آدمی نے بتایا، بیگم صاحبہ کا حکم پہنچا ہے کل استاذ قصیدہ سنائیں تو دربار میں کوئی ان کے شعروں پر تعریف نہ کرے۔ ذوق نے دم گرم بھر کر فرمایا۔ اس بیگم کو کیا ہو گیا ہے خدائی کے منہ بند کرتی ہے۔ میں جب قصیدہ پڑھوں گا تو دیوان خاص کے در و دیوار واہ واہ کریں گے۔ چنانچہ دوسرے دن قصیدہ پڑھنے لگے تو تمام دربار دم بخود۔ بادشاہ نے ذوق کو پاس بلا کر گلے لگا لیا پھر کہا ہوں (یعنی پڑھو) پھر جو پڑھنے لگے تو سب کے دہن بند کھل گئے۔

(دیوان ذوق ص ۳۰۱)

۱۔ **شرح** : میں یہاں حقیقی حالات ٹھیک ٹھیک عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے حسن طبیعت کی تفصیل میں نہیں پڑنا چاہتا۔

مطلب یہ کہ یہ قطعہ صرف وہ حالات عرض کرنے کے لیے لکھا گیا ہے، جو پیش آئے، اپنی طبیعت کے محاسن بیان کرنا نہیں چاہتا۔

۲۔ **شرح** : زمانۂ قدیم سے میرے آباؤ اجداد سپاہیانہ خدمات میں معروف رہے ہیں اور شاعری میرے لیے عزت کا ذریعہ نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جو خاندان پشتہا پشت سے شمشیر زن چلا آتا ہے اور مستمر طور پر اہل سیف میں شمار ہوتا ہے، اس کے کسی فرد کے لیے اہل قلم بن جانا یا شعروں میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنا کچھ عزت کا باعث نہیں۔ میرزا نے یہاں اہل سیف کو اہل قلم پر ترجیح ہی نہیں دی، بلکہ یہ پہلو بطور خاص ابھارا ہے کہ میں ناز کروں تو، پشتہا پشت کے آبائی پیشے پر کیوں نہ کروں؟ اس پیشے میں میرے لیے کیا خاص جاذبیت ہو سکتی ہے، جو خود میں نے شروع کیا!

۳۔ **شرح** : میری روش آزاد اور میرا دل سب کے لیے کھلا ہوا ہے۔ میرا طریقہ ہی یہ ہے کہ سب سے صلح کا برتاؤ جاری رکھا جائے۔ مجھے کبھی کسی

سے ہرگز دشمنی پیدا نہیں ہوتی

مولانا طباطبائی نے کیا خوب فرمایا ہے کہ دوسرے مصرع میں عداوت کی نفی کے لیے تین تاکیدیں لائے

ا۔ لفظ "ہرگز" مطلق تاکید ہے۔

۲۔ لفظ "کبھی" میں ہر زمانہ شامل کر لیا گیا ہے۔

۳۔ لفظ "کسی" میں ہر فرد شامل ہے۔

۴۔ **شرح :** میں نے مانا کہ نہ مجھے اونچا درجہ حاصل ہے، نہ میں کسی اعلیٰ عہدے پر مامور ہوں، نہ میرے پاس دولت ہے بہ ایں ہمہ کیا میرے لیے اعزاز واکرام کا یہ پہلو کم ہے کہ میں بہادر شاہ ظفر کا غلام ہوں ؟

مطلب یہ ہے کہ بادشاہ کے دوسرے غلاموں کو جاہ و منصب بھی حاصل ہے اور دولت بھی، مجھے ان میں سے کوئی بھی چیز حاصل نہیں۔ تاہم میں اسی کو بڑی بات سمجھتا ہوں کہ غلاموں میں شامل ہوں۔

۵۔ **لغات :** پرخاش : رنج وکاوش

شرح : میں بادشاہ کے استاد سے رنج وکاوش کا خیال کروں ؟ مجھ میں نہ یہ تاب ہے، نہ مجال ہے، نہ طاقت ہے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں۔

"اس قطعے میں جس جس پہلو سے مضمونِ استعطاف
کو مصنف نے باندھا ہے، قابل اس کے
ہے کہ اہل قلم اس سے استفادہ کریں۔
ایسے پہلو شاعر کے سوا کسی کو نہیں سوجھتے۔
یہ عرش کے خزانے سے نکلتے ہیں اور اس
کی کنجی شاعروں کے سوا کسی کے پاس نہیں
لیکن نثر کی سبھی کو ضرورت ہے اور جس جس

مضمون پر شاعر کو قلم اٹھانا پڑتا ہے ، ان
مضامین کی تزئین دحسین شاعروں کی خوشہ
چینی کے بغیر نہیں ہو سکتی ۔

۶۔ لغات : جامِ جہاں نما : اسے جام جم اور جام جمشید بھی کہتے ہیں
بیان کیا جاتا ہے کہ یہ جام جمشید شاہ ایران کے لیے یونانی حکماء نے قواعد نجوم ،
پیش نظر رکھ کر بنایا تھا اور اس سے دنیا کے حالات معلوم ہو جاتے تھے

شرح : بادشاہ کا ضمیر ایسا جام ہے ، جس سے زمانے کے حالات
معلوم ہو جاتے ہیں ۔ اس بارے میں نہ مجھے قسم کھانے کی ضرورت ہے ، نہ گواہ
پیش کرنے کی اور نہ گواہ پیش کرنا ضروری ہے ۔

مطلب یہ کہ جس قلب روشن کو ہر چیز کا علم ہے ، کیونکہ اس کی حیثیت ،
جام جہاں نما کی ہے ۔ اسے سوگند اور گواہ کی حاجت ہی کیا ہے ؟

۷۔ شرح : کہاں میں اور کہاں اردو شعر گوئی ! مجھے اس سے کیا واسطہ؟
ہاں ، اگر اردو شعر کہتا ہوں تو صرف اس لیے کہ حضور کا دل خوش کرنا منظور ہے ۔ یعنی
اپنی خوشی سے اردو شعر نہیں کہتا ، صرف آپ کی خوشی کے لیے کہتا ہوں ۔

میرزا کو خاصی مدت تک یہی خیال رہا کہ ان کے شاعرانہ کمالات کا مظہر فارسی
کلیات ہے ، نہ کہ اردو دیوان ۔ چنانچہ ایک مرتبہ پہلے بھی ذوقؔ کو مخاطب کرتے
ہوئے کہا تھا :۔

اے کہ در بزم شہنشاہ سخن رس ! گفتہ
کے بہ پُر گوئی فلاں در شعر ہم سنگ من است
راست گفتی ، لیک می دانی کہ نبود جائے طعن
مکتر از بانگِ ذُہُل گر نغمۂ چنگ من است
فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

ماست می گویم من و انداست سرنتواں کشید
ہرچہ در گفتار فخر تست، آں ننگ من است

لیکن دیکھیے وہی اردو دیوان، جسے وہ "بے رنگ" قرار دے رہے تھے۔
ان کی عظمت کے لیے دستاویز بنا اور فارسی شاعری کے کمالات سے شناسائی
اب تک بہت محدود ہے۔

۸۔ لغات : زرہِ امتثالِ امر : حکم بجالانے کی غرض سے۔

شرح : میں نے سہرا لکھا تو صرف اس لیے کہ حکم بجالانے کا تقاضا
یہی تھا اور مجھ پر واضح ہو چکا تھا کہ اس حکم کو مانے بغیر چارہ نہیں
جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، یہ حکم زینت محل بیگم نے غالباً حکیم احسن اللہ
خاں کے ذریعے سے دیا تھا۔

۹۔ لغات : سخن گسترانہ : شاعرانہ۔ گستردن سے مراد ہے،
پھیلانا، سخن گستری، بات یا شعر کا پھیلاؤ، جس کے بہت سے اطراف ہوتے
ہیں۔ مطلب یہ کہ شاعر شعر گوئی کے جوش میں اپنی ستائش کے متعلق ایسی باتیں کہ
جاتا ہے، جو فی الحقیقت مقصود نہیں ہوتیں اور انھیں محض شاعری سمجھنا چاہیئے۔
سخن گستری سے مراد محض سامعین کی تفریح و خوش دلی ہوتی ہے۔

شرح : سہرے کے مقطع میں میں نے سخن گستری سے کام لیا تھا۔
اس کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا کہ کسی کو چیلنج دوں یا کسی سے محبت کا رشتہ توڑ ڈالوں

۱۰۔ شرح : اس میں یعنی مقطع میں کسی کی طرف اشارہ یا کنایہ ہو تو خدا
کرے، میرا منہ سیاہ ہو جائے۔ بھلا میں دیوانہ، سودائی اور وحشت زدہ تھا کہ
بادشاہ کے استاد کی طرف اشارہ کرتا؟

۱۱۔ شرح : مانا کہ میری قسمت بُری ہے، لیکن طبیعت بُری نہیں۔
میں اس امر کا شکر ادا کرتا ہوں کہ کسی سے شکایت کی کوئی وجہ نہیں۔
مطلب یہ کہ میری قدر ویسی نہ ہوئی، جیسی ہونی چاہیے تھی اور زندگی میں

سکون واطمینان میسر نہ ہوا، مگر میری فطرت وطینت بری نہیں۔ یا شعر گوئی کے کمالات کے لیے کسی سے اختلاف کی گنجائش نہیں۔ بہ ایں ہمہ جو کچھ ہوا، میں اس پر قانع ہوں اور شکر کا مقام ہے کہ کسی سے شکایت نہیں۔ میری قسمت ہی میں یہ لکھا تھا کہ کمالات کے باوجود زندگی اسی صورت سے گزرے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :۔

"یہ شعر مصنف کی بلاغت کی سند اور استادی کی دستاویز ہے۔ جو لوگ محض غزل میں قافیہ پیمائی کیا کرتے ہیں، ان کی فکر کو ان مضامین عالیہ کی طرف رسائی ممکن نہیں۔ جس راہ پر وہ لگے ہوئے ہیں، وہ اس میدان سے کوسوں دور ہے۔ شیخ الرئیس لکھتا ہے کہ شعر کبھی فقط حیرت و تعجب پیدا کرنے کے لیے کہتے ہیں کبھی اغراض و معاملات کے لیے شعرائے غزل گو کی شاعری پہلی قسم کی ہے کہ موسیقی و مصوری کی طرح اس کی غایت بھی محض حظِ نفس و تنزیہ روح کے سوا اور کچھ ہو نہیں سکتی، لیکن دوسری قسم البتہ اہتمام واعتناد کے قابل ہے۔ ہر ادیب و اہل قلم اس کا محتاج ہے۔

۱۲۔ **شرح** : اے غالبؔ! میں نے جو باتیں اوپر کہی ہیں، خدا گواہ ہے کہ ان میں سچا اور راستباز ہوں۔ میں سچ کہتا ہوں اور جھوٹ کی مجھے عادت نہیں یا سچ کہتا ہوں، کیوں کہ مجھے جھوٹ کی عادت نہیں۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ دوسرے مصرع میں "کہ" یا بیان کے واسطے ہے یا توجیہ و تعلیل کے واسطے۔ یا تو یہ مطلب ہے کہ جو کچھ کہہ رہا ہوں، سچ کہہ رہا ہوں جھوٹ کی مجھے عادت نہیں یا یہ بات سچ کہتا ہوں اور اس کی وجہ و علت یہ ہے کہ جھوٹ کی مجھے عادت نہیں :۔

"گو حاصل دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے۔ لیکن اتنا فرق ہے کہ پہلی صورت میں بہ التزام مطلب حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ پھیر کا راستہ

ہے یعنی جو بات کہ سچ کہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ جھوٹ کی عادت نہیں
اور جب یہ بات سچ ہوئی تو لازم آیا کہ جو کچھ کر رہے ہیں۔ جھوٹ نہیں۔
جب معلوم ہوا کہ جھوٹ نہیں تو لازم آیا کہ سچ ہے۔ دوسری صورت
میں بالمطابقت مطلب حاصل ہو جاتا ہے، یعنی جو کچھ میں کر رہا ہوں
اس کی وجہ بیان کی کہ جھوٹ کی مجھے عادت نہیں"۔

۷۔ چکنی ڈلی

تمہید :- مرزا غالب نے حاتم علی بیگ مہر کے نام ایک خط میں لکھا ہے:- وہ جو فعلاتن مفاعلن فعلاتن فعلن بحر ہے، اس میں میرا ایک قطعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتہ میں کہا تھا۔ تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین ایک میرے دوست تھے انھوں نے مجلس میں ایک چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بہ دنداں کہ اِسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے
مہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے
حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیے
مسی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے
داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے
خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے
سرِ پستانِ پری زاد سے مانا کہیے

اپنے کفِ دست پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجیے میں نے بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر ان کو دیا اور صلے میں وہ ڈلی ان سے لی۔"

چھ شعر اس قطعے سے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:
"غرض کہ بیس بائیس پھبتیاں ہیں۔ اشعار سب کب یاد آتے ہیں۔"

خواجہ حالی نے "یادگار غالب" میں لکھا ہے:۔
[illegible]ء میں جبکہ نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم کلکتے گئے ہوئے تھے۔ مولوی محمد عالم مرحوم نے، جو کلکتہ

اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے
خالِ مشکینِ رُخِ دلکشِ لیلیٰ کہیے

حجرالاسود دیوارِ حرم کیجیے فرض
نافہ، آہوے بیابانِ ختن کا کہیے

وضع میں اس کو سمجھ لیجیے قافِ تریاق
رنگ میں سبزۂ نوخیز مسیحا کہیے

صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مُہرِ نماز
میکدے میں اسے خشتِ خُمِ صہبا کہیے

کیوں اِسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے
کیوں اِسے نقطۂ پرکارِ تمنّا کہیے

کیوں اِسے گوہرِ نایاب تصوّر کیجے
کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے

کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلیٰ لکھیے
کیوں اِسے نقشِ پئے ناقۂ سلمیٰ کہیے

بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجیے فرض
اور اِس چکنی سپاری کو سُوَیدا کہیے

کے ایک دیرینہ سال فاضل تھے، نواب صاحب سے بیان کیا کہ جس، زمانے میں مرزا صاحب یہاں آئے ہوئے تھے، ایک مجلس میں جہاں مرزا بھی موجود تھے اور میں بھی حاضر تھا۔ شعراء کا ذکر ہو رہا تھا۔ اثنائے گفتگو میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی۔ مرزا نے کہا کہ، فیضی کو جیسا لوگ سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے۔ اس پہ بات بڑھی۔ اس نے کہا کہ فیضی جب پہلی ہی بار اکبر کے روبرو گیا تھا، اس نے ڈھائی سو شعر کا قصیدہ اسی وقت ارتجالاً کر کے پڑھا تھا۔ مرزا بولے، اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سو نہیں تو دو چار شعر تو ہر موقع پر بداہتہً کہہ سکتے ہیں۔ مخاطب نے جیب سے ایک چکنی ڈلی نکال کر ہتھیلی پر رکھ لی اور مرزا سے درخواست کی کہ اس ڈلی پر کچھ ارشاد ہو۔ مرزا نے گیارہ شعر کا قطعہ اُسی وقت موزوں کر کے پڑھ دیا"۔

دونوں اقتباسوں کے سلسلے میں چند امور عرض کر دینا ضروری ہے:-

۱۔ مطبوعہ قطعہ تیرہ شعر کا ہے، گیارہ شعر کا نہیں، جیسا کہ "یادگارِ غالب" میں مذکور ہے، نہ نو دس شعر کا، جیسا کہ مرزا غالب نے لکھا ہے۔

۲۔ پہلے اقتباس میں مولوی کرم حسین کا نام آیا ہے۔ یہ بلگرام کے رہنے والے تھے، ۔ دربار اودھ کی طرف سے کلکتہ میں سفارت کے منصب پر مامور تھے۔ شمس العلما سید علی بلگرامی اور نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی انھیں مولوی کرم حسین کے پوتے تھے۔

۱۔ لغات: کفِ دست: ہتھیلی۔

چکنی ڈلی: ایک قسم کی چھالیا، جو دودھ میں پکا کر خشک کر لی جاتی ہے اور نہایت نفیس و لذیذ ہوتی ہے۔

شرح: آپ کی ہتھیلی پر جو چکنی ڈلی رکھی ہے، اس کی تعریف جس

قدر بھی کی جائے، بالکل بجا و زیبا ہوگی۔

۲۔ **لغات** : **انگشت بدنداں** : دانتوں میں انگلی لیے ہوئے، نہایت حیران۔

ناطقہ : بات کرنے کی قوت، گویائی۔

سر بہ گریبان : گریبان میں سر ڈالے ہوئے یعنی غور و فکر میں ڈوبا ہوا۔

شرح : قلم حیران ہے کہ اس ڈلی کے بارے میں کیا لکھا جائے۔ گویائی غور میں ڈوبی ہوئی ہے کہ اسے کیا کہا جائے۔

۳۔ **لغات** : حرز : پناہ کی جگہ، مجازاً تعویذ۔

شگرفانِ خودآرا : بن سنور کر رہنے والے حسین۔

شرح : اسے عالی قدر عزیزوں کے خط کی مہر لکھا جائے یا بننے سنورنے والے حسینوں کے بازو کا تعویذ کہا جائے۔

۴۔ **لغات** : **سرانگشت** : انگلی کا سرا۔ پور۔ ہاتھ میں پانچ انگلیاں ہیں، اول انگوٹھا، دوم انگشتِ شہادت، سوم بیچ کی انگلی، چہارم اس کے ساتھ کی انگلی، پنجم چھنگلی یہ چھنگلی اور بیچ کی انگلی کے درمیان جو انگلی ہے اسے عورتیں مسی کی انگلی کہتی ہیں، کیونکہ اسی سے عموماً مسی لگانے کا دستور ہے۔

طرف : گوشہ

شرح : آیا اسے حسینوں کی وہ انگلی قرار دیجیے، جس کے پور کو مسی لگی ہوئی ہو یا وہ داغ کہیے، جو عاشقِ شیدا کے گوشۂ جگر میں ہوتا ہے۔

۵۔ **لغات** : خاتم : انگوٹھی، مہر۔

ماننا : مشابہ، مانند۔

شرح : اسے حضرت سلیمانؑ کے ہاتھ کی انگوٹھی سے تشبیہ دیجیے یا کہیے کہ وہ کسی پری زاد کے سرِ پستان کی مانند ہے۔

۶ - **شرح** : اسے مجنوں کی قسمت کے جلے ہوئے ستارے سے، نسبت دیجیے یا لیلیٰ کے دلاویز رخسار کا مشک جیسا تل کہیے۔

۷ - **لغات** : **حجرالاسود** : وہ مقدس سیاہ پتھر، جو کعبے کے ایک گوشے میں نصب ہے۔ اسی سے کعبے کے گرد طواف کے آغاز و انجام کا حساب کیا جاتا ہے۔

نافہ : مشک والے ہرن کی ناف، جو عام ہرنوں کی ناف سے بڑی ہوتی ہے اور اس میں خون جمع رہتا ہے۔ ہرن ذبح کرتے وقت اسے کس کر باندھ دیتے ہیں تاکہ خون لوٹنے نہ پائے۔ وہی خون کچھ عرصے میں خشک ہو کر چھوٹی چھوٹی ڈلیوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی نافے بکتے ہیں جنھیں کاٹ کر مشک نکالا جاتا ہے۔

خُتَن : چینی ترکستان کا ایک علاقہ، جو اسی نام کے دریا سے سیراب ہوتا ہے۔ یہ یارقند سے تقریباً دو سو میل جنوب میں ہے۔ زمانہ ماضی میں بحیرۂ روم سے چین تک کا بری راستہ ختن ہی سے گزرتا تھا پاکستان کی طرف سے درۂ قراقرم کے راستے وہاں جاتے ہیں۔ قالین، ریشمی کپڑے اور مشک یہاں کی خاص چیزیں تھیں۔

شرح : آیا اسے کعبے کی دیوار کا حجرالاسود فرض کر لیا جائے یا بیابانِ ختن کے ہرن کا نافہ کہا جائے؟

۸ - **شرح** : اس کی وضع قطع پر نظر ڈالیے تو اسے تریاق کا "ق" تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ رنگ دیکھیے تو یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسیحا کے چہرے پر خط نیا نیا نکلا ہے۔

۹ - **لغات** : **صومعہ** : گرجا، مطلق عبادت گاہ کے لیے بھی مستعمل ہے۔

مُہرِ نماز : سجدہ گاہ، لکڑی یا کربلائے معلیٰ کی خاک کا ٹکڑا، جسے شیعہ حضرات سجدے کی جگہ رکھ لیتے ہیں۔

خشتِ خُمِ صہبا : شراب کے مٹکے کی اینٹ۔ مٹکے میں انگور کا رس بھر کر اس پر اینٹ رکھ دیتے ہیں اور منہ بند کر دیتے ہیں تاکہ رس جوش میں آ جائے۔ پھر اسے صاف کر کے بوتلوں میں بھر لیتے ہیں۔ اس سے وہ اینٹ بھی مراد لے سکتے ہیں، جو شراب کے مٹکے کو ٹھہرائے رکھنے کے لیے سہارے کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

شرح : اگر اس چکنی ڈلی کو عبادت گاہ میں مُہرِ نماز ٹھہرالیں تو اسے شراب خانے میں مٹکے کے اوپر کی اینٹ کہنا چاہیے۔ اگر مٹکے کو سہارا دینے والی اینٹ فرض کیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ شراب کے مٹکے کی وہ اینٹ، جو رندوں کی سجدہ گاہ ہوتی ہے۔

۱۰۔ لغات : پرکار : دائرہ کھینچنے کا آلہ۔

شرح : اس چکنی ڈلی کو خزانۂ محبت کے دروازے کا قفل کیوں نہ کہا جائے؟ اسے آرزو کی پرکار کا مرکز کیوں کہا جائے۔

۱۱۔ شرح : اسے کیوں ایسا موتی تصور کریں، جو کہیں پایا نہ جاتا ہو؟ اسے کیوں چشمِ عنقا کی پتلی کہیں؟

۱۲۔ لغات : سلمٰی : عرب کی ایک مشہور محبوبہ۔

شرح : کیوں اسے لیلیٰ کے پیراہن کی گھنڈی کہیں؟ کیوں اسے سلمٰی کے ناقے کا نقشِ پا کہیں؟

۱۳۔ شرح : مناسب یہ ہے کہ حضور کی ہتھیلی کو دل فرض کریں اور اس چکنی ڈلی کو اُس دل کا سیاہ نقطہ قرار دے لیں۔

۸۔ کلکتہ

۱۔ شرح : کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں!
اے ہمدم! تُو نے اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

وُہ سبزہ زار ہائے مُطّرا کہ ہے غضب
وُہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حَف نظر
طاقت رُبا وُہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے
وُہ میوہ ہائے تازۂ شیریں کہ واہ! واہ!
وُہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو مجھ پر وہ کیفیت طاری ہوئی، جیسے ایک تیر میرے سینے میں آ لگا ہیں تڑپ اٹھا اور فریاد و فغاں شروع کر دی

۲ - لغات :
مطرّا : تر و تازہ، شاداب

شرح : کلکتہ کی یاد تازہ ہوتے ہی میری چشمِ تصوّر کے سامنے وہ ہرے بھرے، تر و تازہ اور شاداب سبزہ زار آگئے، جن سے دُور رہنا غضب اور ستم ہے۔ پھر وہ نرم و نازک محبوب، جو ہر وقت بنے ٹھنے رہتے ہیں۔ ہائے ہائے! میں کیا کہوں!

۳- لغات : صبر آزما : صبر کا امتحان لینے والا
حف نظر : چشم بد دُور، دعائیہ کلمہ ہے۔ مولانا طباطبائیؒ کے نزدیک "بھت" ہندی لفظ معلوم ہوتا ہے "فرہنگ آصفیہ" میں "حف، حاجقّی ہی سے درست قرار دیا گیا ہے۔ خواجہ حالیؔ نے اسے ہاے ہتوز سے باندھا ہے :-

ہوا عِلم دیں جس سے تاراج سارا
وہ ہے ہف نظر عِلمِ انشا ہمارا

یہ ترکیب خوبیوں کے لیے استعمال ہوتی ہے، بعض اوقات طنزاً برائیوں کے لیے بھی لے آتے ہیں، مثلاً خواجہ حالیؔ کا مندرجہ بالا شعر۔
طاقت رُبا : طاقت چھین لینے والا۔
شرح : چشم بد دُور! اُن نازنینوں کی وہ نگاہیں، جو صبر کا امتحان

لیتی ہیں اور جانچتی ہیں کہ دیکھنے والا کتنے پانی میں ہے۔ پھر ان کا ایک، ایک اشارہ ہائے ہائے میں کیا کہوں، کس طرح برداشت کی تاب وطاقت چھین لے جاتا ہے۔

۴۔ شرح: کلکتہ کے وہ تازہ، میٹھے اور مزیدار میوے کہ، دیکھتے ہی زبان واہ واہ پکار اٹھتی ہے۔ وہاں کی وہ خالص، خوشگوار اور طبیعت کے عین موافق شرابیں! ہائے ہائے! کلکتہ کے ذکر نے ان تمام چیزوں کی یاد تازہ کر دی۔

۹۔ بیسنی روٹی

نہ پوچھ اس کی حقیقت، حضور والا نے
مجھے جو بھیجی ہے، بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

تمہید:۔ خواجہ حالی نے لکھا ہے:۔

جب بادشاہ کوئی عمدہ چیز پکواتے تھے تو اکثر مصاحبین اور اہل دربار کے لیے بہ طور ادلوش کے بھیجا کرتے تھے۔ اس کے شکریے میں کبھی کبھی مرزا کوئی قطعہ یا رباعی بادشاہ کے حضور میں گزرانتے تھے۔ یہ قطعہ بھی اسی قبیل کا ہے۔

خواجہ صاحب نے ساتھ ہی ایک لطیفہ لکھا ہے:۔

جس وقت چوبدار شاہی یہ ادلوش لے کر آیا، باہر کا رہنے والا ایک طالب علم، جو مرزا سے کچھ پڑھا کرتا تھا، موجود تھا۔ چوبدار کے چلے جانے کے بعد اس نے مرزا سے متعجب ہو کر پوچھا۔ " یہ بیسنی روٹی ایسی کیا نادر چیز ہے کہ بادشاہ کی سرکار سے بہ طور ادلوش کے تقسیم ہوتی

ہے ؟ مرزا نے کہا : "اے احمق ! چناوہ چیز ہے ، اس نے ایک دفعہ جناب الٰہی میں فریاد کی تھی کہ دنیا میں مجھ پر بڑے ظلم ہوتے ہیں ۔ مجھے دلتے ہیں ، پیستے ہیں ، بھونتے ہیں ، پکاتے ہیں اور مجھ سے سیکڑوں چیزیں بنا کر کھاتے ہیں ۔ جیسا مجھ پر ظلم ہوتا ہے ، ایسا کسی پر نہیں ہوتا ۔ وہاں سے حکم ہوا کہ اے چنے ! تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جائے ، ورنہ ہمارا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ تجھ کو کھا جائیں "۔

۱۔ **شرح** : حضور والا نے مجھے بیسن کی جو روٹی بھیجی ہے اس کی حقیقت مجھ سے نہ پوچھ ۔

۲۔ **شرح** : اگر حضرت آدمؑ گیہوں نہ کھاتے اور یہ بیسنی روٹی کھا لیتے تو بہشت سے باہر نکلنے کی نوبت نہ آتی ۔

۱۰۔ غیروں کی وفاداری

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے
بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی جانے دو مل جاؤ
قسم لو ہم سے ، گر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتے تھے

شرح : وہ دن گزر گئے ، جب تم حقیقت جانے بوجھے بغیر غیروں کی وفاداری زور شور سے بیان کرتے تھے اور ہم چپ رہتے تھے ۔ اب اُن سے بگاڑ ہو گیا تو اس میں ہمارا کوئی قصور ہے ؟ اور تم اتنے کیوں شرمندہ ہوے کہ ہم سے ملنا جلنا چھوڑ دیا شرمندگی جانے دو ، ہم سے ملو اور قسم لے لو "کبھی یہ نہ کہیں گے کہ ہم حقیقت حال تم سے صاف صاف نہیں کہتے تھے ؟

محبوب کو غیروں کی وفاداری پر بڑا بھروسا تھا اور آزمائش کبھی کی نہیں تھی

تم ان کی وفاداری کے متعلق بڑی تقریریں کرتے تھے اور ہم دانستہ کچھ عرض کرنے سے باز رہتے تھے۔ پھر غیروں کی حقیقت کھُل تو ان سے تعلقات ختم ہوئے۔ محبوب کو اپنے پہلے دعووں پر اتنی شرمندگی ہوئی کہ عاشق سے بھی ملنا جُلنا چھوڑ دیا
عاشق مناتا ہے ! "یقین رکھو، میں کوئی بات تمہارے خلاف نہیں کہوں گا لیکن شرمندگی کے باعث مجھے دیدار سے محروم نہ رکھو۔

۱۱۔ شریک غالب

سیہ گلیم ہوں، لازم ہے، میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہُوا نہ غلبہ مُیسّر کبھی کسی پہ مجھے
کہ جو شریک ہو میرا، "شریک غالب" ہے

۱۔ **لغات** : سیہ گلیم : "بہارِ عجم" میں بتایا گیا ہے کہ سیاہ گلیم کے معنی سیاہ روزگار ہیں، یعنی بدنصیب، سیاہ بخت۔

شرح : میں سیاہ روزگار اور سیاہ بخت ہوں۔ دنیا میں جو کوئی فتح پانے اور مراد مند ہونے کا خواہاں ہے، اس کے لیے لازم ہے کہ میرا نام زبان پر نہ لائے۔

۲۔ **شرح** : مجھے کبھی کسی پر غلبہ نصیب نہ ہُوا۔ جو بھی میرا شریک اور ساتھی بنا، وہ شریکِ غالب بن گیا۔

"شریکِ غالب" کے دو معنی ہیں، اوّل شخصِ غالب کا شریک، دوم وہ ساتھی، جو حصہ دار بن کر غلبہ پالے اور دوسرے حصہ دار کو کچھ نہ لینے دے۔

۱۲- روزہ داری

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو
اس شخص کو ضرور ہے، روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے؛

تمہید :- اس قطعے کے سلسلے میں خود مرزا نے منشی نبی بخش حقیر کو ایک خط میں لکھا (مرقومہ ۴ رجون ۱۸۵۳ء)

"اگرچہ تاب مجھ میں روزہ رکھنے کی کہاں، مگر بدتر روزہ داروں سے ہوں۔ روزہ داروں کو کیا کہوں، کیا حال ہے۔ میرے چار خدمت گزار ہیں، چاروں روزہ دار۔ آخر روز مجھے یوں نظر آتا ہے کہ چار مردے پھر رہے ہیں۔ یہ پریشانی اور یہ بے سامانی۔ نہ خسخانہ، نہ برفاب۔ "آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں"؟ الخ "افطارِ صوم کی جسے کچھ دستگاہ ہو" الخ یہ رباعی اور یہ قطعہ کل حضور میں پڑھا تھا۔ بہت ہنسے اور خوش ہوئے"۔

اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رباعی اور قطعہ ۳ رجون ۱۸۵۳ء کو شاہی دربار میں پڑھے گئے۔ اس دن رمضان شریف کی ساتویں تاریخ تھی (۱۲۷۱ھ)۔

۱-۲- لغات : **اِفطارِ صوم** : روزہ کھولنا

دستگاہ : توفیق، سرو سامان،

شرح : جس شخص کے پاس روزہ کھولنے کے لیے کچھ سرو سامان ہو، اس کے لیے لازم ہے کہ روزہ باقاعدہ رکھے اور کوئی روزہ نہ چھوڑے لیکن

جن کے پاس روزہ کھول کر کھانے کو کچھ نہ ہو، وہ روزہ نہ کھائے، یعنی نہ رکھے تو آخر کیا کرے؟

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ اس قطعے میں "ناچار" کا لفظ مفلس و بے نوا کے معنی بھی دیتا ہے اور اس سے مجبور ہو کر روزہ نہ رکھنے کے معنی بھی نکلتے ہیں

۱۲۔ رخصت کی عرضداشت

سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آپڑی
مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے، تین دن مسہل کے بعد
تین مسہل، تین تبریدیں، یہ سب کَے دن ہوئے

۱-۲۔ لغات : مُسہل : جُلّاب

تبرید : وہ ٹھنڈائی، جو معدے سے جلاب کی گرمی دُور کرنے کے لیے پی جاتی ہے۔

شرح : جلاب لے لینا آسان تھا، لیکن سخت مشکل یہ آپڑی کہ اتنے دن دربار شاہی میں حاضر ہوئے بغیر مجھ پر کیا گزرے گی۔ پھر دنوں کی تفصیل بتادی اور گنتی مخاطب پر چھوڑ دی۔ فرماتے ہیں: تین دن تو جلاب سے پہلے ضروری ہیں تاکہ منضج پیا جا سکے، یعنی وہ دوا جو طبیب بیماروں کو جلاب سے پہلے اس لیے پلاتے ہیں کہ اندر کے فاسد مادے پک جائیں تاکہ جلاب میں بہ آسانی خارج ہو سکیں تین دن جلاب کے بعد طبیبوں کے نزدیک ایسے ہوتے ہیں کہ چنا پھرنا چاہیے تین جلاب لیے تھے اور ہر جلاب کے بعد ایک ایک دن تبرید پینی تھی۔ یہ کتنے دن ہوئے؟ تین جمع تین جمع تین جمع تین، کل بارہ دن ہو گئے۔ گویا یہ ایک درخواست

ہے، جو غیر حاضری کے عذر میں بادشاہ کے حضور پیش کی گئی۔

خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ مسہل کے ان تمام دنوں کی تفصیل، جن میں حکیم چلنے پھرنے سے منع کرتے ہیں۔ کس عمدگی سے بیان کی ہے۔

۱۴۔ درباری

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں
دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام
اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

۱-۲-لغات : سلام کے لیے کانوں پر ہاتھ دھرنا : دربار مغلیہ میں دستور تھا کہ بادشاہ کے سامنے درباری ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے تو ماتھے پر نہیں، کانوں پہ ہاتھ رکھتے تھے، ماتھے پر ہاتھ صرف بادشاہ کے لیے مخصوص تھا اور ویسا ہی سلام بادشاہ کے روبرو کسی دوسرے کو کرنا خلاف ادب تھا۔

محض کانوں پر ہاتھ دھرنے کا مطلب ہے۔ ناواقف اور ناآشنا ہونے کا ذکر کرنا۔ مرزا نے اردو کے اس محاورے اور شاہی دربار میں دستور سلام سے ایک پُر لطف مضمون پیدا کر لیا۔ فرماتے ہیں:۔

شرح : اگرچہ سب لوگ ایک بادشاہ کے گھر میں پلے ہوئے ہیں، لیکن درباری لوگ ایک دوسرے سے آشنا نہیں۔ دلیل یہ ہے کہ وہ سلام کرتے وقت کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔

خواجہ حالیؔ نے لکھا ہے :۔

"بادشاہ کے دربار کا طریقہ تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کو سلام کرتے وقت دایاں ہاتھ دائیں کان پر رکھ لیتے تھے"۔

۱۵۔ میرزا جعفر کی شادی

خجستہ انجمن طُوے میرزا جعفر
کہ جس کے دیکھنے سے سب کا ہُوا ہے جی محظوظ
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالبؔ
نہ کیوں ہو مادّۂ سالِ عیسوی محفوظ"

۱۔ لغات : خجستہ : مبارک۔
طُوے : ترکی میں شادی کو کہتے ہیں
شرح : میرزا جعفر کی شادی کی محفل ایسی مبارک ہے جسے دیکھ کر دل بہت خوش ہُوا۔

یہ شادی مبارک سال میں ہوئی ہے، پھر اسے غالبؔ ! اس کے سالِ عیسوی کا مادّہ لفظ "محظوظ" کیوں نہ ہو ؟ لفظ "محظوظ" سے ۱۸۵۴ء تاریخ نکلتی ہے۔

(۱۶)

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی
ہُوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید

کہا غالب سے! تاریخ اس کی کیا ہے
تو بولا : انشراحِ جشنِ جمشید

۱-۲- لغات : ناہید : زُہرہ ستارہ، جسے ناچ گانے کی دیوی مانا جاتا ہے۔

انشراح : لغوی معنی کھُلنا، یہاں خوشی اور انبساط مراد ہے۔

شرح : جب میرزا جعفر کی شادی ہوئی تو شادمانی کی محفل میں زہرہ نے رقص کیا۔ غالب سے اس شادی کی تاریخ پوچھی گئی تو اس نے کہا: انشراحِ جشنِ جمشید" یعنی جمشید کے جشن کی خوشی اور انبساط۔

یہ سنہ ہجری کی تاریخ ہے اور اس کے عدد ہیں ۱۲۷۰ -

رباعیات

○

بعد از اتمامِ بزمِ عیدِ اطفال
ایّامِ جوانی رہے ساغر کشِ حال
آپہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم
اے عمرِ گزشتہ! یک قدم استقبال

لغات : اتمام : پورا کرنا، انجام کو پہنچانا۔

ساغر کش : پیالہ پینے والا یعنی جامِ شراب۔

سواد : سیاہی، مجازاً نواحی زمین یا زمین بھی مراد لیتے ہیں۔ سمندر کا سفر کرتے ہوئے زمین آتی ہے تو دُور سے سیاہی کا ایک خط معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح یہ معنی ہو گئے۔ حوالی شہر، حوالیِ اقلیم۔

استقبال : آگے بڑھنا، پیشوائی، پیش روی، زمانۂ آیندہ۔

شرح : جب بچپن کی زندگی پوری ہو چکی اور ظاہر ہے کہ بچپن کی زندگی کی بہترین تعبیر یہی ہو سکتی تھی کہ اسے لڑکوں کی بزمِ عید کہا جاتا تو جوانی کا دور آگیا۔ جو حالات پیش آتے رہے، ان کے مطابق زندگی بسر کرتے چلے گئے۔

مطلب یہ کہ حال ہی میں محو رہے۔ نہ ماضی یعنی گزشتہ کا کچھ خیال آیا، نہ مستقبل یعنی آیندہ کے لیے کچھ سوچا۔ اسی طرح چلتے چلتے ملکِ عدم کے آس پاس پہنچے ہیں، یعنی بوڑھے ہو گئے ہیں اور اب اس دنیا سے کوچ کا وقت قریب آگیا ہے۔

اے گزری ہوئی عمر! ایک قدم آگے بڑھ۔

مطلب یہ کہ گزری ہوئی عمر واپس مل جائے، جو امیدِ عبث ہے تو جوانی کی زندگی کے بہار آفریں دن پھر لوٹ آئیں

○

شب، زلف و رُخِ عرق فشاں کا غم تھا
کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک
ہر قطرۂ اشک، دیدۂ پُرنم تھا

لغات : رُخِ عرق فشاں : وہ چہرہ جس سے پسینہ ٹپک رہا ہو۔
طُرفہ تر : عجیب تر۔
شرح : رات محبوب کی زلف اور پسینے سے تر چہرے کا غم کرتا رہا
میں کیا بتاؤں کہ میرا حال کس درجہ عجیب تھا۔
ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں ہزار آنکھوں سے صبح تک روتا رہا۔ اور اس طرح جو آنسو بہائے، ان میں سے ہر قطرہ بجائے خود ایک آنسو بھری آنکھ تھا۔
"رات" کی مناسبت "زلف" سے اور "رُخِ عرق فشاں" کی مناسبت رونے سے اور رونا بھی بہ طریقِ مبالغہ ظاہر ہے۔
ہزار آنکھ سے اس لیے روئے کہ رُخِ محبوب پر پسینے کے قطرے پے در پے آرہے تھے۔ چونکہ قطرے گر بھی رہے تھے، اس لیے آنسو کا ہر قطرہ اشک بھری آنکھ بن گیا۔

○

آتش بازی ہے جیسے شغلِ اطفال
ہے سوزِ جگر کا بھی اُسی طور کا حال

تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی
لڑکوں کے لیے گیا ہے کیا کھیل نکال

لغات : **مُوجِد** : ایجاد کرنے والا، نئی چیز بنانے والا۔

شرح : جیسے آتش بازی لڑکوں کا کھیل ہوتی ہے، جگر کے سوز اور جلن کی کیفیت کا بھی یہی طور معلوم ہوتا ہے۔

عشق ایجاد کرنے والا بھی قیامت کا پُتلا تھا، جو حسین و جمیل لڑکوں کے لیے ایک کھیل نکال گیا۔

مطلب یہ کہ جس طرح بچے آتش بازی چھوڑ کر خوش ہوتے ہیں اور اسے محض کھیل سمجھتے ہیں، اُسی طرح یہ حَسین و جمیل لڑکے بھی محض کھیل تماشے کی غرض سے عاشقوں کے جگر جلاتے ہیں، شعلے اٹھتے ہیں تو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔

○

دل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی
بے تابیِ رشک و حسرتِ دید سہی
ہم اور فسردن اے تجلّی! افسوس
تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

لغات : **جانِ دردِ تمہید** : وہ جان، جس کی تمہید، یعنی ابتدا ہی درد سے ہوئی ہو۔

فسردن : افسردہ ہونا۔

تکرار : بار بار آنا۔

تجدید : تازہ کرنا۔

شرح : ہمارا دل ایسا تھا، جس کی جان کا آغاز ہی درد سے ہوا تھا۔ یعنی جو زندگی کے ہر درد کو جھیل چکا تھا۔ ہمیں رشک کی بیتابی اور دیدار کی حسرت ہے تو ہوا کرے۔

لیکن اے محبوب کے جلوے! ہمارا بے کیف ہو جانا باعث صد افسوس ہے۔ ہمیں پھر پہلے سے سوز و گداز کی آرزو ہے۔ اگر تیرا دوبارہ کرشمہ دکھانا جائز نہیں تو یہ سمجھ لے اور تو اس میں پہلا سا سوز و گداز از سر نو پیدا کر رہا ہے۔

مراد یہ کہ جو چیز گزر چکی اور معدوم ہو چکی، اگر وہ دوبارہ نہیں آسکتی تو تیرا جلوہ پہلی سی کیفیت نئے سرے سے پیدا کر سکتا ہے

○

ہے خَلق حسد قماش لڑنے کے لیے
وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لیے
یعنی ہر بار صورتِ کاغذِ باد
ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لیے

لغات : حسد قماش : جن کا تانا بانا حسد سے بنا ہو، یعنی حد درجہ حسد کرنے والے۔

وحشت کدۂ تلاش : تلاش کا وحشت خانہ، یعنی دنیا، جہاں ہر شخص سراسیمہ وار تلاشِ معاش میں سرگرم ہے۔

کاغذِ باد : ہوائی کاغذ، یعنی پتنگ، کنکوا۔

بدمعاش جن کا روزی حاصل کرنے کا طریقہ برا ہو۔

شرح : مخلوق لڑنے کی غرض سے سراپا حسد بنی ہوئی ہے، گویا حسد کو اس نے بہ طور لباس پہن لیا ہے۔ تلاش کا یہ وحشت خانہ جسے دنیا کہتے ہیں پورے کا پورا لڑائی کا میدان بنا ہوا ہے۔

یعنی دو آدمی جب کہیں ملتے ہیں تو لنگوٹوں کی شکل میں ملتے ہیں، جن کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے لڑیں۔ اسی لیے کہنا پڑتا ہے کہ ان لوگوں کا طریقِ معاش بھی نہایت برا ہے، کیونکہ ملتے بھی ہیں تو لڑنے کی غرض سے۔

○

دل سخت نژند ہو گیا ہے، گویا
اُس سے گلہ مند ہو گیا ہے، گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں
غالب! مُنہ بند ہو گیا ہے، گویا

لغات : نژند : غمگین و حزیں۔

شرح : دل سخت غمگین اور افسردہ ہو گیا، گویا اسے محبوب سے، شکایتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ جب محبوب کے سامنے شکایتیں پیش نہیں کر سکتے۔ تو ان شکایتوں کا فائدہ کیا!

اے غالب! ہماری حالت تو یہ ہے گویا منہ بند ہو گیا ہے۔

○

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے، غالب
دل، رُک کر، بند ہو گیا ہے غالب

واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا، سوگند ہو گیا ہے ، غالبؔ!

لغات : سونا سوگند ہونا : نیند آنا قسم ہو جانا یعنی بالکل نہ آنا۔

شرح : اے غالب ! میرے دل کو دُکھ بہت پسندیدہ معلوم ہوتا ہے اور دُکھ کی وجہ سے دل کی حرکت رُکتے رُکتے بالکل ختم ہو گئی۔
خدا کی قسم ، رات کو نیند آتی ہی نہیں۔ یہ سمجھنا چاہیے کہ سونا میرے لیے قسم کے برابر ہو گیا ہے

○

مُشکل ہے زبس کلام میرا ، اے دل!
سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مُشکل

شرح : اے دل ! کوئی شبہ نہیں کہ میرا کلام بہت مشکل ہے۔ اسے سُن سُن کر وہ شاعر، جو کمال کے مدعی ہیں، فرمائش کرتے ہیں۔
کہ آسان کہا کرو ۔ اب میں کہوں تو مشکل ، نہ کہوں تو مشکل۔
ایک مفہوم یہ ہے کہ اگر میں آسان شعر کہنے کی کوشش کروں تو اسے میری طبیعت گوارا نہیں کرتی ۔ اگر آسان نہ کہوں تو شاعر بُرا مانتے ہیں۔ گویا کہنا بھی مشکل ہے اور نہ کہنا بھی مشکل۔
خواجہ حالی کے نزدیک اس سے دوسرے لطیف معنی بھی پیدا ہوتے ہیں یعنی

صاف صاف بات کہتا ہوں تو سخنورانِ کامل کی نافہمی اور کُند ذہنی ظاہر کرنی پڑتی ہے۔ اگر صاف صاف نہ کہوں تو خود مُجرم ٹھہرتا ہوں۔ یہ دونوں طرح مشکل ہے۔

○

بھیجی ہے جو مُجھ کو شاہِ جم جاہ نے، دال
ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال، بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

لغات : شاہِ جم جاہ : وہ بادشاہ، جسے جمشید کا جاہ و جلال حاصل ہے
دال : پہلے مصرع کے آخر میں اس کے معنی اُس دال کے ہیں، جو کھائی جاتی ہے، دوسرے مصرع کے آخر میں جو دال ہے، اس کے معنی ہیں دلالت کرنے والا، چوتھے مصرع کے آخر میں دال سے مراد حرفِ دال ہے۔

"شاہ پسند یا بادشاہ پسند" مونگ کی دال شاہی مطبخ میں ایک خاص طریق پر پکتی تھی، اس کا نام شاہ پسند یا بادشاہ پسند ٹھہر گیا تھا، کیونکہ وہ بہادر شاہ کو بھی بہت مرغوب تھی۔

یہی دال بادشاہ وقتاً فوقتاً بہ طورِ عطیہ مختلف مصاحبوں کو بھیجا کرتے تھے۔ مرزا کو بھیجی گئی تو انھوں نے شکریے میں یہ رباعی کہی۔ اور بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔

شرح : جمشید جیسے جاہ و جلال والے بادشاہ نے مجھے دال بھیجی ہے۔ یہ شہنشاہ کے لطف و کرم اور نوازش و عنایات پر دلالت کرتی ہے، یعنی اس سے پتا چل جاتا ہے کہ حضور والا مجھ پر کس قدر لطف و عنایت فرماتے ہیں

یہ شاہ پسند دال وہ حرف دال ہے، جو دولت، دین، دانش اور داد میں استعمال ہوا۔ گویا اس کے اندر مملکت و دین، عقل و خرد اور عدل و انصاف کے جوہر آگئے۔ میرا یہ دعویٰ نہ بحث کا روادار ہے، نہ جھگڑے کا، یعنی کسی کو اس سے اختلاف کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

○

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم
آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم
ہے اب کے شبِ قدر و دوالی باہم

لغات : صفاتِ ذوالجلالی : اللہ تعالیٰ کے صفات، جو جلال والا ہے۔

آثارِ جلالی و جمالی : اہلِ علم نے صفاتِ باری تعالیٰ کی دو قسمیں کی ہیں، ایک جمالی صفات، جن میں حسن و خوبی، جاذبیت و محبت، شفقت و رحمت اور ایسی تمام صفتیں شامل ہیں۔ دوسری قسم جلالی صفات کی ہے، جیسے قاہر، جبّار وغیرہ۔ کائنات کے نظم میں جلال و جمال دونوں ضروری ہیں۔ اسی طرح بادشاہ میں بھی جلالی و جمالی دونوں قسم کی صفتوں کے نشان پائے جاتے ہیں۔ اس پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، رسول اللہ (صلعم) کا ارشاد ہے :-

تخلّقو ! باخلاق اللہ اپنے اندر خدائی صفات پیدا کرو۔ انسانیت کا سب سے اعلیٰ رتبہ یہی ہے کہ انسان میں خدا کے صفات کا پرتو زیادہ سے زیادہ پیدا ہو جائے۔

سافل : ادنیٰ درجے کے لوگ، یعنی عوام۔

عالی : بلند پایہ لوگ، جیسے اونچا منصب رکھنے والے یا دولت مند یا ارباب جاہ و حشمت۔

شبِ قدر : قرآن مجید میں اس رات کو کہا گیا ہے، جس میں قرآن کا نزول شروع ہوا : انّا انزلناہ فی لیلۃ القدر (ہم نے قرآن کو شب قدر میں اتارا)۔ اس رات کے تعین میں اختلاف ہے۔ ۲۱ سے ۱۱ آخر رمضان تک ہر ایک رات کے حق میں روایتیں ملتی ہیں، لیکن عام عقیدہ ۲۷ رمضان کی رات کے متعلق ہے۔

قدر کے معنی ہیں اندازہ، نیز عزّت و منزلت۔ اس سے مراد دونوں ہی چیزیں لی جاسکتی ہیں، یعنی اندازے کی رات، جب قرآن مجید انسانوں کو دے کر اللہ تعالےٰ نے خیر و شر کا ایک آخری اندازہ مقرّر کر دیا۔ چونکہ یہ رات بہت مقدس مانی جاتی ہے، اس لیے قدر و منزلت والی رات بھی کہہ سکتے ہیں۔

دوالی اور دیوالی : ہندوؤں کا ایک تہوار، جس میں چراغ جلائے جاتے ہیں۔ مشہور رہے کہ چراغاں کا انتظام بن باس سے رام چندرجی کی واپسی پر کیا گیا تھا اب تک اس یادگار کا سلسلہ جاری ہے۔

شرح : بادشاہ میں اللہ تعالےٰ کی صفات کا پرتو موجود ہے۔ اس کی جلالی اور جمالی دونوں صفتوں کا عکس آگیا ہے۔

چھوٹے بڑے، ادنیٰ اعلیٰ کیوں یکساں خوش نہ ہوں؛ اب کے قدر کی رات اور دیوالی دونوں تقریبیں اکٹھی آئی ہیں۔ ان میں سے شبِ قدر صفاتِ جلال کی مظہر ہے اور اس کا تعلق عالمِ عُلوی سے ہے، اس لیے "عالی" کو اس کے لیے مخصوص سمجھنا چاہیے۔ دیوالی صفاتِ جمالی کی مظہر ہو سکتی ہے اور اس کا تعلق عالمِ سفلی سے ہے، یعنی دنیا سے۔

○

حق شہ کی بقا سے خَلق کو شاد کرے
تا شاہ شیوع دانش و داد کرے

یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ
ہے صفر کہ افزائش اعداد کرے

لغات : **شیوع** : شائع کرنا، پھیلانا، رواج دینا۔

شرح : ظاہر ہے کہ یہ رباعی بادشاہ کی سالگرہ کے موقع پر کہی گئی تھی۔ فرماتے ہیں، اللہ تعالٰی سے دعا ہے کہ بادشاہ سلامت رہیں، ان کی عمر لمبی ہو اور مخلوق شادمان رہے۔ مدّعا یہ ہے کہ بادشاہ کی بدولت عقل و دانش اور عدل و انصاف رواج پاتے جائیں۔ گویا بادشاہ کے لیے لمبی عمر کی ضرورت اس لیے ہے کہ دانش و داد کی اشاعت اور پھیلاؤ کی یہی ایک تدبیر ہے۔

اب بادشاہ کے رشتۂ عمر میں ایک گانٹھ اور لگائی گئی ہے۔ یہ گانٹھ نہیں، اصل میں صفر ہے اور صفر بھی ایسا، جو اعداد سے پہلے لگا دیا جائے تو ان کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً ۱ سے پہلے صفر لگائیں تو ۱۰ بن جائے گا اور ۳۰ سے پہلے صفر لگائیں تو ۳۰۰ بن جائیں گے۔

گانٹھ کی تشبیہ صفر سے کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ رشتۂ عمر میں گانٹھ سال گرہ کا اردو ترجمہ ہے۔

○

اس رشتے میں لاکھ تار ہوں، بلکہ سوا
اتنے ہی برس شمار ہوں، بلکہ سوا
ہر سیکڑے کو ایک گرہ فرض کریں
ایسی گرہیں ہزار ہوں، بلکہ سوا

شرح : یہ رباعی بھی پہلی رباعی سے متعلق ہے، فرماتے

ہیں، سال گرہ کے رشتے ہیں لاگھ تار، بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوں اور جتنے تار ہوں، اتنے ہی برس شمار کیے جائیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ۔
اگر سو سال کی مدّت کو ایک گرہ فرض کریں تو خدا کرے ایسی ہزار گرہیں لگائی جائیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ۔

ظاہر ہے کہ اس عمر کا حساب کرنا خاصے حساب داں کا کام ہے۔ مرزا غالب نے ایک قطعے کے آخر میں بادشاہ کو خطاب کرتے ہوئے لکھا ہے۔

تم سلامت رہو ہزار برس ، ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

پہلے کی طرح حساب کا یہ معاملہ بھی خاصے غور و فکر کا محتاج ہے اور فارسی کی ایک مثنوی میں تو مرزا نے حساب کا معاملہ ہی ختم کر دیا۔ کہتے ہیں:

بر دعاے شعر سخن کوتاہ باد تا خدا باشد بہادر شاہ باد

○

کہتے ہیں کہ "اب وہ مردم آزار نہیں
عشاق کی پرسش سے اسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہو گا
کیوں کر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

لغات : مردم آزار : لوگوں کو دکھ دینے والا۔
ہاتھ اٹھانا : کسی چیز سے دست بردار ہو جانا اور مارنے کے لیے بھی ہاتھ اٹھایا جاتا ہے، گویا اس کے متضاد معنی ہیں اور مرزا نے دونوں معنی سے فائدہ اٹھا کر یہ رباعی لکھی۔

شرح : کہا جاتا ہے کہ ہمارا محبوب اب لوگوں کو دکھ نہیں

دیتا، بلکہ عاشقوں کا حال دریافت کرنے میں بھی اسے عار نہیں آتی اور یہ محبوب کی مہربانی اور لطف و کرم کی سب سے بڑی شہادت ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ میں تو اس دعوے کو صحیح نہیں سمجھتا۔ جو ہاتھ ظلم سے اٹھایا ہو گا، کیونکر تسلیم کروں کہ اس میں تلوار نہیں ؟

ظاہر ہے کہ ہاتھ اٹھانے کے دونوں معنی پیش نظر رکھے ہیں۔ اگر یہ مانیں کہ ظلم کی غرض سے ہاتھ اٹھایا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ اگر یہ مانیں کہ اس نے ظلم ترک کر دیا ہے تو تلوار اس حالت میں بھی پاس ہو گی۔

○

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے
کرتے ہیں درنگ، کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے "اللہ اللہ
وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

لغات : **سلام کرنے والے** : یہ ان اہل مقدمات کا کام ہے، جو روزانہ جا کر منشیوں، متصدیوں کو سلام کر آتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح ان کا کام بن جائے گا۔

درنگ : توقف، تاخیر، دیر۔

صبح و شام کرنا : اس میں بھی ایہام ہے۔ اوّل نظم کائنات کے مختار مطلق کی حیثیت میں صبح کو شام اور شام کو صبح کرنا، دوم پس و پیش کرنا، صبح کو کوئی آئے تو شام کے وعدے پر ٹال دینا، شام کو آئے تو صبح کے وعدے پر ٹال دینا۔

شرح : ہم نے منشیوں متصدیوں اور کام پورا کر دینے کے ذمہ داروں کو سلام

کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتی، لیکن وہ لوگ کام میں دیر لیے جاتے ہیں۔

ہمیں بتلاتے ہیں کہ جاؤ، خدا سے کہو، اللہ اللہ! خدا سے کیا کہیں، وہ تو آپ صبح و شام کر نشانہ ہیں۔

اس مصرع میں جو نکتہ ہے، اس کی تشریح لغت میں کر دی گئی۔

○

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں

آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں

روزہ، مرا ایمان ہے، غالب! لیکن

خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

لغات : خس خانہ : امیر لوگ خس کی ٹٹیوں سے گھر کے اندر ایک چار دیواری سی بنا لیتے ہیں۔ ان پر برابر پانی چھڑکا جاتا ہے اور گرمی محسوس نہیں ہوتی۔ روزہ رکھ کر آرام سے اس میں سو جاتے ہیں۔

برفاب : برف والا پانی، جو روزہ افطار کرتے وقت استعمال کیا جاتا ہے۔

شرح : اے غالب! روزے پر میرا ایمان حد درجہ پختہ ہے۔ میں خدا کی طرف سے اسے ایک ایسا فرض سمجھتا ہوں، جو ہر حال میں پورا ہونا چاہیئے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ کھانے پینے اور بہ آرام سونے کا سامان کہاں سے لاؤں؟ روزے کے لیے آسائش کے جو اسباب درکار ہیں، وہ کہاں سے ہاتھ آئیں؟ مثلاً خس خانہ کہاں سے ملے، برفاب کہاں سے دستیاب ہو؟

مطلب یہ کہ روزہ وہی لوگ بہ اطمینان رکھ سکتے ہیں، جنہیں تن فراخی میسر ہے کہ رمضان آرام سے گزارنے کے سامان جمع کر لیں۔ مسکین اور غریب آدمی ہوں، کھانے پینے ہی کا گزارہ نہیں ہوتا، سامان کہاں سے لاؤں؟

خواجہ حالیؔ فرماتے ہیں کہ یہ رباعی بھی اس قطعے کے ساتھ دربار میں پیش کی گئی تھی، جو روزے کے متعلق قطعات میں درج ہو چکا ہے۔

○

اِن سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ہیں جو ارمغاں شہِ والا نے
گِن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار
فیروزے کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

لغات : **سیم** : خواجہ حالیؔ فرماتے ہیں، جو فیروزہ بیضوی شکل کا ہوتا ہے، وہ سیم کے بیج سے بہت مشابہ ہے۔ بیجوں کا سالن پکایا جاتا تھا۔ بادشاہ نے ایک مرتبہ مرزا کے لیے یہی سالن بھیجا تھا۔ جس کے شکریے میں یہ رباعی کہی گئی۔

ارمغان : تحفہ، سوغات۔

شرح : سیم کے ان بیجوں کی حقیقت کسی کو کیا معلوم ہو سکتی ہے، جو عالی قدر بادشاہ نے سوغات کے طور پر بھیجے ہیں۔

ہم ایک ایک بیج کو سَو سَو بار گِن کر دعائیں دیں گے۔ یہ سیم کے بیج نہیں فیروزے کی تسبیح کے دانے ہیں۔ چونکہ سیم کا بیج فیروزے سے مشابہ ہوتا ہے اس لیے ان بیجوں کو فیروزے کی تسبیح کہا اور تسبیح کی مناسبت محتاجِ تشریح نہیں۔

ضمیمہ اوّل

یہ ضمیمہ اُن غزلوں، قصیدوں، قطعوں یا دوسرے
اشعار پر مشتمل ہے، جو کسی وجہ سے دیوان میں
شامل نہ ہو سکے۔ مصادر کا ذکر جا بجا حواشی
میں درج ہے۔

○

قاسم و تپاں

تمہید: یہ اشعار جن کی ظاہری صورت غزل کی ہے۔ میرزا غالب نے کلکتہ میں اپنے دو عزیز دوستوں شہزادہ میرزا ابوالقاسم خاں قاسم اور میرزا احمد بیگ خاں تپاں کے لیے کہے تھے۔ انہیں ۱۸۲۸ء ۱۸۲۹ء کا کلام سمجھنا چاہیے۔ میرزا ابوالقاسم خاں قاسم تیموری خاندان کے شہزادے تھے، بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ دہلی میں اپنے خاندان کی قدر و منزلت

دیکھنے میں ہیں گرچہ دو، پر ہیں یہ دونوں یار ایک
وضع میں گو ہوئی دو سر، تیغ ہے ذوالفقار ایک

ہم سخن اور ہم زباں، حضرت قاسم و تپاں
ایک تپشؔ کا جانشیں، دردؔ کی یادگار ایک

نقد سخن کے واسطے، ایک عیارِ آگہی
شعر کے فن کے واسطے، مایۂ اعتبار ایک

ایک وفا و مہر میں تازگیِ بساطِ دہر
لطف و کرم کے باب میں، زینتِ روزگار ایک

گلکدۂ تلاش کو، ایک ہے رنگ، ایک بو
ریختے کے قماش کو، پود ہے ایک، تار ایک

مملکتِ کمال میں ایک امیرِ نامور
عرصۂ قیل و قال میں، خسروِ نامدار ایک

گلشنِ اتفاق میں، ایک بہارِ بے خزاں
میکدۂ وفاق میں، بادۂ بے خمار ایک

زندۂ شوقِ شعر کو، ایک چراغِ انجمن
کشتۂ ذوقِ شعر کو، شمعِ سرِ مزار ایک

دونوں کے دِل حق آشنا، دونوں رسولؐ پر فدا
ایک محبِ چار یار، عاشقِ ہشت و چار ایک
جانِ وفا پرست کو، ایک شمیم نوبہار
فرقِ ستیزہ مست کو، ابرِ تگرگ بار ایک
لایا ہے کرکے یہ غزل شائبۂ ریا سے دور
کرکے دل و زبان کو، غالبِ خاکسار ایک

کانڈواں دیکھ کر دل برداشتہ ہوئے اور وطن چھوڑ کر کلکتہ چلے گئے۔ وہیں گوشہ نشینی اختیار کر لی اور باقی عمر گزار دی

میرزا غالب کی چند تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض انگریز حاکموں سے قاسم کے تعلقات بہت گہرے تھے

سید مسعود حسن رضوی نے یہ اشعار پہلے پہل دسمبر ۱۹۳۲ء کے "الناظر" میں چھپوائے تھے۔ "الناظر" کے حوالے سے روزنامہ "انقلاب" نے انہیں شائع کیا۔ بعد ازآں سید موصوف نے انہیں "متفرقاتِ غالب" میں چھاپ دیا۔ ساتھ ہی میرزا کے بہت سے فارسی خطوط شائع کیے۔ جن میں سے نو میرزا تپاںؔ کے نام تھے اور بیس میرزا قاسم کے نام۔ موخر الذکر مکاتیب قیام کلکتہ کے دوران میں لکھے گئے تھے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قاسمؔ وقتاً فوقتاً کھانے کے خوان یا دوسرے تحفے میرزا غالب کے پاس بھیجتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ قاسمؔ بیمار ہوئے تو میرزا غالب نے، جو باقاعدہ طب کی تعلیم پا چکے تھے، مسہل کا نسخہ تجویز کیا جو بے حد موثر ثابت ہوا۔ چنانچہ قاسمؔ نے پانچ شعر کا ایک قطعہ میرزا غالب کے پاس بھیجا، جس میں لکھا:

می سزد گر بگویمت بقراط ۔۔۔ ور فلاطوں بخوانمت زیباست
زاں عمل دور شد مرض بالکل ۔۔۔ گر بگویم تو ئی مسیح بجاست

میرزا غالب نے اس کے جواب میں دو طویل فارسی قطعے لکھے۔ قاسم کے مزید حالات معلوم نہ ہو سکے، البتہ میرزا غالب کے خطوط اور قطعات سے اندازہ ہوتا

ہے کہ وہ مذہباً شیعہ تھے۔ ایک خط میں، جو دہلی سے لکھا گیا تھا، یہ واضح ہوتا ہے کہ قاسم کے فرزند محمد میرزا کا انتقال ہو گیا تھا اور میرزا غالب اس کی تاریخ کہنے کی فکر میں تھے

میرزا احمد بیگ تپاں نواب عطاء اللہ خاں کے فرزند اور دہلی کے باشندے تھے۔ کلکتہ جاکر صدر دیوانی میں مختار بن گئے تھے۔ اور غالباً کچھ مدت مرشد آباد میں گزری تھی۔ وہ میرزا محمد اسماعیل معروف بہ مرزا جان تپش کے شاگرد تھے۔ فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں اور نواب الٰہی بخش خاں معروف کے خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ میرزا غالب کے بعض خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ تپاں پنشن کے مقدمے میں نواب شمس الدین احمد خاں کے طرفدار تھے۔ جن کے خلاف میرزا غالب نے دعویٰ کیا تھا۔ تپاں نے ۱۸۳۴ء میں بہ مقام کلکتہ ہی میں وفات پائی، جیسا کہ نساخ کے تذکرہ "سخن شعرا" میں بتایا گیا ہے

تپاں اور ان کے استاد تپش دونوں اپنے تخلص "ط" سے لکھتے تھے۔ لیکن دونوں صحیح ت ہی سے ہیں۔

۱۔ **لغات۔ دوسر**: دو دھاری والی

شرح۔ اگرچہ یہ دونوں دوست، یعنی قاسم و تپاں دیکھنے میں دو نظر آتے ہیں، مگر ان کے درمیان محبت و یگانگی کا ایک ایسا رشتہ موجود ہے کہ حقیقتاً دونوں ایک ہیں۔ مثال یہ سمجھئے کہ اگرچہ حضرت علیؓ کی تلوار ذوالفقار کی دھاریں دو تھیں۔ لیکن تلوار ایک ہی تھی۔

۲۔ **شرح۔** جناب قاسم اور جناب تپاں دونوں ہم سخن اور ہم زبان ہیں۔ یعنی دونوں شاعر ہیں۔ ان میں سے ایک تپش کا جانشین ہے۔ یعنی احمد بیگ تپاں جو مرزا جان تپش کے شاگرد تھے۔ دوسرا خواجہ میر درد کی یادگار ہے، یعنی قاسم کا سلسلۂ تلمذ خواجہ میر درد سے ملتا ہے۔

تلاش کے باوجود پتا نہ چل سکا۔ کس ذریعے سے خواجہ میر درد کے ساتھ تلمذ قائم نہ ہوا۔ بظاہر خواجہ سے براہِ راست استفادہ مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ ناممکن نہیں۔ کیونکہ خواجہ مرحوم کا انتقال ۱۱۹۹ھ ۱۷۸۴ء میں ہوا۔ بہرحال یہ واضح ہے

کہ قاسم بلاواسطہ یا بالواسطہ خواجہ میر درد ہی سے وابستہ تھے۔

۳۔ لغات۔ عیار: کسوٹی

آگہی: علم و شعور

شرح: ان دونوں میں سے ایک نقد شعر کے لیے علم و شعور کی کسوٹی ہے اور دوسرا اس فن کے لیے عزو وقار کا سرمایہ ہے۔

۴۔ لغات۔ بساط: فرش

شرح۔ دونوں میں سے ایک محبت و وفا میں زمانے کے لیے تازگی و شادابی کا سروسامان ہے اور دوسرا لطف و کرم کے اعتبار سے روزگار کی زیب و زینت ہے۔

۵۔ لغات۔ قماش: وضع، ڈھنگ، ایک ریشمی کپڑا، یہاں آخری معنی مراد ہیں۔

پود: بانا +

تار: تانا +

تار و پود: تانا بانا +

شرح۔ اگر تلاش کو ایک باغ فرض کریں، جو پھولوں سے پٹا پڑا ہو تو اس کے لئے قاسم و شیاق میں سے ایک رنگ ہے اور دوسرا خوشبو۔ یعنی تلاش کے باغ میں جتنے بھی پھول ہیں۔ ان دونوں کے ملنے سے بنے ہیں۔ گویا انہیں مضامین کی تلاش میں کمال حاصل ہے۔ اسی طرح اردو شعر گوئی کو ریشمی کپڑا سمجھ لیں تو اس کپڑے کے لئے دونوں میں سے ایک بانا ہے، دوسرا تانا۔ مطلب یہ کہ ریختے کا انحصار انہیں پر ہے۔

۶۔ لغات۔ عرصۂ قیل و قال: گفتگو کی سرزمین۔

شرح۔ کمال کی سلطنت میں ایک کو نامور امیر کا منصب حاصل ہے۔ دوسرے کو گفتگو کی سرزمین میں نام آور بادشاہ سمجھنا چاہیئے۔

۷۔ لغات۔ وفاق: موافقت، یک جہتی، محبت، ہم آہنگی، میل جول

کر رہتا۔

شرح ۔ اتفاق کے باغ میں ایک دوست ایسی بہار ہے۔ جس پر کبھی خزاں نہیں آسکتی۔ محبت و یک جہتی کے شراب خانے میں دوسرا دوست ایسی شراب ہے، جس کا نشہ کبھی نہیں اترتا اور خمار کی کیفیت کبھی رونما نہیں ہوتی۔

۸۔ **شرح** ۔ جو شخص شعر کے شوق میں زندگی گزار رہا ہے۔ اس کے لیے دونوں دوستوں میں سے ایک کو چراغ محفل کی حیثیت حاصل ہے۔ جس شخص نے شعر کے ذوق میں جان دے دی، دوسرا دوست اس کے مزار کے لیے شمع ہے۔

مطلب یہ کہ شعر کا شوق رکھنے والے یقیناً محفل آراستہ کریں گے تاکہ ایک دوسرے کو شعر سنائیں اور محظوظ ہوں۔ ایسی محفل کے لیے دونوں دوستوں میں سے ایک چراغ ہے اسی طرح جو شخص مرجائے، اس کے مزار کی رونق اس شمع ہی سے ہوتی ہے، جو وہاں روشن کی جاتی ہے۔ ذوقِ شعر میں مرنے والے کے مزار کی رونق دوسرا دوست ہے۔

۹۔ **لغات** ۔ محبِ چاریار۔ رسول اللہ (صلعم) کے چار ممتاز صحابیوں (حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ) سے محبت رکھنے والا۔ یہ اہلِ سنت کی خصوصیت ہے۔

عاشقِ ہشت و چار: ہشت و چار، بارہ، مراد ہے بارہ آئمہ کرام (حضرت علی سے امام مہدیؑ تک) آئمہ کرام کے عاشق سے مراد ہے شیعہ۔

شرح ۔ دونوں دوستوں کے دلوں میں خدا کی محبت ہے۔ دونوں رسولؐ اللہ (صلعم) کے والہ و شیفتہ ہیں۔ ان میں سے ایک چار یار سے محبت رکھنے والا یعنی سنی ہے، دوسرا بارہ اماموں کا عاشق یعنی شیعہ ہے۔ سنی سے مراد میرزا احمد بیگ خاں تپاںؔ ہیں اور شیعہ سے مراد میرزا ابو القاسم خاں قاسم، جیسا کہ میرزا غالب کے بعض خطوط سے بھی واضح ہوتا ہے۔

۱۰۔ **لغات** ۔ فرق: سر

ستیزہ مست: لڑائی کا دلدادہ۔

تگرگ بار: اولے برسانے والا۔ ژالہ بار

شرح۔ جو جان وفا کی شیدائی ہو۔ اس کے لیے دونوں میں سے ایک دوست نوبہار کی خوشبو ہے اور جو سر لڑائی کا دلدادہ ہو، اس کے لیے دوسرا دوست اولے برسانے والا بادل کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۱۔ لغات۔ شائبہ: آمیزش، ملاوٹ۔

شرح۔ خاکسار غالب دل و زبان کو ایک کرکے یعنی خلوص سے یہ غزل کہ کرلایا ہے اور یہ ریا و نمائش کی ملاوٹ سے بالکل پاک ہے۔ یعنی جو کچھ کہا گیا ہے اس کی حیثیت دکھاوے کی نہیں، بلکہ جو کچھ دل میں موجزن تھا، وہی زبان پر جاری ہوا۔ اس طرح دل اور زبان ایک ہو گئے۔

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں

ہوں دردمند، جبر ہو یا اختیار ہو
گر نالۂ کشیدہ، گر اشکِ چکیدہ ہوں

جاں لب پہ آئی، تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
از بسکہ تلخیٔ غمِ ہجراں چشیدہ ہوں

نے سبحہ سے علاقہ، نہ ساغر سے واسطہ
میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں

۱۔ لغات

آرمیدہ:۔ آرام پایا ہوا، مطمئن۔

شرح:۔ میرے لیے بھولے سے بھی اطمینان و آرام کے ساتھ ٹھہر جانا ممکن نہیں۔ میں غم

ہوں خاکسار، پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ

نے دانۂ فتادہ ہوں، نے دامِ چیدہ ہوں

جو چاہیئے، نہیں وہ مری قدر و منزلت

میں یوسف بہ قیمتِ اوّل خریدہ ہوں

ہر گز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ

ہوں میں کلامِ نغز، ولے ناشنیدہ ہوں

اہلِ وَرَع کے حلقے میں ہر چند ہوں ذلیل

پر عاصیوں کے زُمرے میں، میں برگزیدہ ہوں

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ

ڈرتا ہوں آئنے سے کہ مردم گزیدہ ہوں!

سے کے صحرا میں وہ ہرن ہوں، جو شکاری کو دیکھ کر بدک گیا ہو۔ ہرن کی ایک خصلت یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ شکاری کو دیکھ لے تو کہیں چین نہیں پاتا۔ برابر چوکڑیاں بھرتا رہتا ہے کہ کہیں زد میں نہ آجائے۔

۲۔ **لغات** :۔ جبر :۔ ظلم، زبردستی۔ ایک عقیدہ، جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے۔ اسے کسی قسم کا اختیار حاصل نہیں۔

اختیار :۔ جبر کے برعکس، یعنی انسان اپنے افعال میں مختار و آزاد ہے۔

شرح ۔ مجھے جبر کا قائل سمجھا جائے یا اختیار کا۔ مجبور قرار دیا جائے یا مختار، لیکن میری دردمندی اور غمگینی میں قطعاً کوئی شبہ نہیں۔ اگر اختیار کا معاملہ ہو تو میری حالت اس آہ و فغاں کی سی ہے، جو درد کی حالت میں کھینچی یا کی جائے۔ اگر مجبور ہیں، تو میری حالت اس آنسو کی سی ہے، جو بے اختیار ٹپکتا رہتا ہے۔

جبر و اختیار کی کتنی عمدہ مثالیں پیش کیں اور دونوں درد و غم کی مثالیں ہیں۔ نالہ کھینچنا اختیاری فعل ہے۔ وہ بھی رنج و غم کا نشان ہے۔ آنسو کا ٹپکنا اضطراری فعل ہے وہ بھی اندوہ و قلق ہی کی دلیل ہے۔

۳۔ **شرح** ۔ جان لبوں پر آگئی۔ چونکہ وہ شیریں ہوتی ہے، اس لئے یہی ہونا چاہیئے تھا کہ منہ میں ہر طرف مٹھاس کی لذت پھیل جاتی۔ یہ نہیں ہُوا۔ وجہ یہ ہے کہ میں نے غمِ فراق میں بے حد تلخی اٹھائی ہے۔ اس تلخی نے کام و دہن میں اس قدر کڑواہٹ پیدا کر دی کہ جان کی شیرینی بھی ذائقہ نہیں بدل سکی۔

۴۔ **لغات** ۔ معرضِ مثال:۔ مثال عرض کرنے یعنی پیش ہونے کی جگہ۔ مطلب ہے بہ طور مثال۔

شرح ۔ نہ مجھے تسبیح سے کوئی علاقہ ہے کہ عبادت گزار بندہ بن جاؤں، نہ جامِ شراب سے کوئی واسطہ ہے کہ رندی کر سکوں۔ آپ میری کیفیت بطور مثال جاننا چاہیں تو سمجھ لیں کہ میرے ہاتھ کٹ چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کے ہاتھ کٹ جائیں وہ نہ تسبیح پکڑ سکتا ہے، نہ پیالہ اٹھا سکتا ہے۔

۵۔ **شرح** ۔ میں یقیناً خاک پر پڑا ہوا ہوں، لیکن خاک پر پڑی ہوئی چیزوں میں سے ایسی بھی ہیں، جو دوسروں سے دشمنی رکھتی ہیں۔ مثلاً پھیلا ہُوا جال اور اس پر ڈالا ہوا دانہ دونوں زمین پر ہوتے ہیں۔ لیکن مقصود یہ ہوتا ہے کہ پرندوں کو پکڑ لیا جائے۔ میں وہ مسکین اور خاکسار ہوں کہ مجھے کسی سے بھی دشمنی نہیں۔ نہ میں دانہ ہوں کہ پرندہ مجھے چگنے کے لیے آئے، نہ جال ہوں جس میں کسی کو پھانس لیا جائے۔

۶۔ **شرح** ۔ میں جس عزت اور قدر و منزلت کا مستحق ہوں، وہ مجھے نصیب نہیں۔ میں یوسف تو ہوں۔ مگر اس حال میں ہوں، جب وہ پہلی مرتبہ بکے تھے۔

بھائی حضرت یوسفؑ کو کنوئیں میں پھینک کر چلے گئے تو قرآن مجید کا بیان ہے کہ قافلہ آیا۔ سقے نے پانی بھرنے کے لیے ڈول لٹکایا، اس میں حضرت یوسفؑ

نکل آئے۔

"سقا پکار اٹھا: کیا خوشی کی بات ہے، یہ تو ایک لڑکا ہے، پھر قافلے والوں نے اسے سرمایۂ تجارت سمجھ کر چھپا رکھا کہ کوئی دعوے دار نہ نکل آئے) اور وہ جو کچھ کر رہے تھے، اللہ کے علم سے پوشیدہ نہ تھا اور انہوں نے یوسفؑ کو بہت کم داموں پر کر گنتی کے چند درہم تھے؛ فروخت کر دیا۔"

یہ بہ قیمتِ اوّل خریدہ کا ثبوت ہے یعنی چند درہم۔ میرزا کہتے ہیں کہ میری قدر و منزلت بہت اونچی ہے، لیکن ہوتی نہیں۔ گویا میں یوسفؑ تو ہوں مگر پہلی مرتبہ بکا ہوں۔ آگے چل کر میرے پورے جوہر کھلیں گے۔

۷۔ لغات۔ کلام نغز: نہایت عمدہ اور اعلیٰ کلام۔

شرح:۔ افسوس مجھے کسی کے بھی دل میں جگہ نصیب نہیں ہوتی۔ میں نہایت عمدہ اور اعلیٰ کلام ہوں۔ لیکن ابھی تک کسی نے مجھے نہیں سُنا۔

کلام اُسی وقت دل میں جگہ پا سکتا ہے، جب سنا یا پڑھا جائے۔ جس کلام نے کانوں تک رسائی نہ پائی، وہ دل تک کیونکر پہنچ سکتا ہے؟

۸۔ لغات۔ ورع: پرہیزگاری۔ اہلِ لغت کے نزدیک 'ر' مفتوح بھی درست ہے اور ساکن بھی، اسی لئے یہ مصرع دونوں طرح دیکھا گیا: اوّل اہلِ وَرَع کے حلقے..... الخ، دوم ہر چند اہلِ وَرْع کے حلقے..... الخ

برگزیدہ: چنا ہوا، نہایت عالی پایہ۔

شرح۔ اگرچہ میں پرہیزگاروں کے حلقے میں بہت پست و ذلیل ہوں اور میری حیثیت بہت نیچی ہے، لیکن گنہگاروں کے زمرے میں اگر دیکھیے میرا پایہ بہت بلند ہے۔

مطلب یہ کہ میں نے پرہیزگاری کا کام کوئی نہ کیا، گناہوں میں برابر سرگرم رہا۔ اس لئے جہاں اونچا رتبہ حاصل کرنا ضروری تھا۔ وہاں بہت نیچا رہا۔ اور

جہاں سب سے نیچا رہنا چاہیئے تھا، وہاں بہت اُونچا ہو گیا۔

اس سلسلے میں عرؔفی کا ایک شعر قابلِ ملاحظہ ہے یعنی:

مگو کہ نیست گنہگار تر ز من عرؔفی — کہ ایں حدیث گراں پایہ لافِ یکتائی است

یعنی اے عرؔفی یہ نہ کہہ کہ مجھ سے زیادہ گنہگار کوئی نہیں، کیونکہ ایسی بڑی بات منہ سے نکالنے کا مطلب یہ ہو گا کہ تو کسی نہ کسی دائرے میں یگانہ دیکھتا ہے۔ یہ بھی تو کوئی اچھی بات نہیں۔

۹۔ لغات: سگ گزیدہ: جسے دیوانے کتے نے کاٹ لیا ہو۔ ایسے شخص کے جسم میں دیوانے کتے کا زہر سرایت کر جائے تو وہ پانی سے بہت ڈرتا ہے، کیونکہ پانی دیکھتے ہی اس پر تشنج کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور رگ پٹھے کھنچنے لگتے ہیں۔

مردم گزیدہ: جسے آدمیوں سے حد درجہ آزار اور دُکھ پہنچا ہو۔

شرح: - اے اسدؔ! جس طرح دیوانے کتے کا کاٹا ہوا پانی سے ڈرتا ہے۔ اسی طرح میں آئینے سے دُور بھاگتا ہوں۔ کیونکہ مجھے میرے ہم جنسوں نے سخت دُکھ اور آزار پہنچایا ہے، یعنی وہ ہمیشہ مجھے کاٹ کھانے کے درپے رہے۔ آئینہ دیکھنے سے ہم جنس اور ان کی تمام ایذا رسانیاں تازہ ہو جائیں گی۔

اپنا احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں — ہے حیا مانعِ اظہار، کہوں یا نہ کہوں؟

نہیں کرنے کا میں تقریر ادب سے باہر — میں بھی ہوں واقفِ اسرار، کہوں یا نہ کہوں؟

شکوہ سمجھو اِسے یا کوئی شکایت سمجھو — اپنی ہستی سے ہوں بیزار، کہوں یا نہ کہوں؟

اپنے دل ہی سے میں احوالِ گرفتارئ دل — جب نہ پاؤں کوئی غمخوار، کہوں یا نہ کہوں؟

دل کے ہاتھوں سے کہ ہے دشمنِ جانی اپنا — ہوں اک آفت میں گرفتار، کہوں یا نہ کہوں؟

میں تو دیوانہ ہوں اور ایک جہاں ہے غماز　　گوش ہیں درپسِ دیوار، کہوں یا نہ کہوں

آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے تو اسدؔ!

حسبِ حال اپنے پھر اشعار، کہوں یا نہ کہوں؟

۱۔ شرح ۔ اے خراب و خستہ حال دل! میں اپنی کیفیت بیان کروں یا نہ کروں؟ بیان کرنے سے شرم منع کرتی ہے ۔ تو بتا کہ کچھ کہوں یا کہوں؟

۲۔ شرح ۔ اے محبوب! میں بھی آپ کے تمام بھیدوں سے واقف ہوں ۔ فرمائیے، بیان کروں یا نہ کروں؟ اتنا بتلائے دیتا ہوں کہ میری تقریر ادب کے دائرے سے باہر کبھی نہ ہوگی ۔ یعنی میں کچھ بھید زبان پر لے آؤں گا تو وہ بھی اسی طرح بیان کروں گا، جس طرح کرنے چاہئیں ۔

۳ ۔ بظاہر خطاب باری تعالیٰ ہے ۔

شرح ۔ کہتے ہیں، میں اپنی ہستی سے بیزار ہوں ۔ اب اس کا اظہار کروں یا نہ کروں؟ آپ چاہیں تو اسے شکر سمجھ لیں، چاہیں شکایت قرار دے لیں ۔

۴ ۔ شرح ۔ میں دل کے رنج و غم اور گرفتگی کا حال بیان کرنا چاہتا ہوں، لیکن غم خوار کوئی نہیں ملتا ۔ اب آپ ہی فرمائیں کہ یہ سب کچھ اپنے دل ہی سے کہہ لوں یا نہ کہوں؟

۵ ۔ شرح ۔ دل میرا جانی دشمن ہے اور اس کے ہاتھوں میں پھنس گیا ہوں ۔ سوچتا ہوں کہ یہ بات کہوں یا نہ کہوں؟

۶ ۔ لغات ۔ غماز : چغل خور

شرح ۔ میں تو دیوانہ ہوں ۔ جو کچھ جی میں آتا ہے ۔ کہے جانا میرا حصہ ہے ۔ زمانہ چغل خور ہے ۔ ہر دیوار کے ساتھ کان لگے ہوئے ہیں ۔ عجب مصیبت میں مبتلا ہوں، کچھ کہوں یا نہ کہوں؟

۷ ۔ شرح ۔ اے اسدؔ! میرا محبوب آپ سے میرا حال نہ پوچھے تو

بتائیے، اپنے حسبِ حال شعر کہوں یا نہ کہوں تاکہ کسی طرح میرا حال محبوب تک پہنچ جائے؟

یہ غزل دیوانِ معروف (نواب الٰہی بخش خاں مرحوم، جو میرزا کے خسر تھے،) میں طبع ہوئی۔ کیونکہ معروف نے اس پر خمس لکھا تھا۔ گویا یہ ۱۸۲۶ء (تاریخ وفات معروف) سے پیشتر کا کلام ہے۔

شبِ وصال میں مونس گیا ہے بن تکیہ
ہوا ہے موجبِ آرامِ جان و تن تکیہ

خراج بادشہِ چیں سے کیوں نہ مانگوں آج؟
کہ بن گیا ہے خمِ جعدِ پُرشکن تکیہ

بنا ہے تختۂ گلہائے یاسمین، بستر
ہوا ہے دستۂ نسرین و نسترن تکیہ

فروغِ حسن سے روشن ہے خواب گاہ تمام
جو رختِ خواب ہے پرویں، تو ہے پرن تکیہ

مزا ملے، کہو کیا خاک ساتھ سونے کا؟
رکھے جو بیچ میں وہ شوخِ سیم تن تکیہ

اگرچہ تھا یہ ارادہ، مگر خدا کا شکر
اٹھا سکا نہ نزاکت سے گل بدن تکیہ

۱۔ شرح

وصل کی رات تکیہ میرا غم خوار بن گیا اور وہی میرے جان و تن کے لیے آرام کا موجب ہوا۔

۲۔ لغات

جعدِ پرشکن: پیچ در پیچ زلف

شرح:۔

میرا تکیہ پیچ در پیچ زلف کا خم بن گیا ہے، اس سے میری حیثیت اتنی بلند ہو گئی

ہُوا ہے کاٹ کے چادر کو ناگہاں غالب
اگرچہ زانوے نل پر رکھے دمن تکیہ

بہ ضربِ تیشہ وُہ اس واسطے ہلاک ہُوا
کہ ضربِ تیشہ پہ رکھتا تھا کوہ کن تکیہ

یہ رات بھر کا ہے ہنگامہ صبح ہونے تک
رکھو نہ شمع پر، اے اہلِ انجمن تکیہ

اگرچہ پھینک دیا تم نے دُور سے، لیکن
اٹھائے کیونکہ یہ رنجورِ خستہ تن، تکیہ

غش آگیا جو پس از قتل، میرے قاتل کو
ہوئی ہے اُس کو مِری نعشِ بے کفن، تکیہ

شبِ فراق میں یہ حال ہے اذیت کا
کہ سانپ فرش ہے اور سانپ کا ہے مَن تکیہ

روا رکھو نہ رکھو، تھا جو لفظ "تکیہ کلام"
اب اُس کو کہتے ہیں اہلِ سخن "سخن تکیہ"

ہم اور تم فلکِ پیر جس کو کہتے ہیں
فقیرِ غالب مسکیں کا ہے کہن تکیہ

ہے کہ بادشاہ چین سے خراج وصول کرنے کو جی چاہتا ہے۔

بادشاہِ چین سے خراج مانگنے کے ظاہر دو سبب معلوم ہوتے ہیں، اوّل بدیہی سبب یہ کہ محبوب کی سیاہ، خمدار اور معنبر زلفیں مشکِ نافہ کے لیے باعثِ رشک ہوتی ہیں اور نافے کا سب سے بڑا مرکز چین ہے، کیونکہ ختا اور ختن دونوں چین کے علاقے تھے

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ "چین" کے معنی "شکن" ہوتے ہیں اور تکیہ جب پر شکن بن گیا تو گویا "چین" اس میں آ گئے، لہذا فرمایا کہ اب تو چین کے بادشاہ

سے خراج لے سکتا ہوں۔

۳۔ **شرح** : بستر چنبیلی کے پھولوں کا تختہ بن گیا ہے اور تکیے کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ نسرین و نسترن کے پھول چُن چُن کر اکٹھے کر دیے گئے اور ایک گلدستہ بنا دیا گیا۔

۴۔ **لغات** : پَروین و پَرن : ستاروں کے دو جھرمٹ۔

شرح : حسن کی جلا سے میرے سونے کا کمرہ سارے کا سارا روشن ہو گیا۔ بستر پروین بن گیا اور تکیے نے پَرن کی شکل اختیار کر لی۔

واضح رہے کہ ان چاروں شعروں میں شب وصال کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

۵۔ **شرح** : بھلا سوچیے کہ جب ہمارا شوخ و حسین محبوب درمیان تکیہ رکھ لیتا ہے تو ہم خوابی کا کیا لطف آئے؟

۶۔ **شرح** : اگرچہ پھول جیسے بدن والے محبوب کا ارادہ یہی تھا کہ تکیہ اٹھا کر ایک طرف رکھ دے، مگر خدا کا شکر ہے کہ نزاکت کے باعث وہ اُسے اٹھا نہ سکا۔

۷۔ **لغات** : نَل اور دمن : ہندوستان کے مشہور عاشق و معشوق۔ نَل راجا تھا، دمن اس کی محبوبہ تھی۔ ان کی داستان عشق فیضی نے اپنی مشہور ترین مثنوی نل دمن میں بیان کی ہے۔

شرح : اگر دمن نَل کے زانو پر تکیہ رکھنے اور سہارا لینا چاہے تو وہ چادر کو کاٹ کر اچانک غائب ہو جائے۔

۸۔ اس شعر میں "تکیہ" کے معنی "سہارا" ہیں۔

شرح : چونکہ فرہاد کا سہارا تیشے کی ضرب پر تھا۔ اس لیے وہ تیشے ہی کی ضرب سے ہلاک ہو گیا۔

مطلب یہ کہ فرہاد نے تیشے کے بل پر کوہ بے ستوں کاٹنے کا ارادہ کیا اور اسے کاٹ کر ہی رکھ دیا، لیکن اللہ پر سہارا نہ رکھا۔ اپنی قوت سے تیشے کی ضرب لگانے ہی کو حصولِ مقصد کا ذریعہ سمجھتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آخر خود ہی سر پہ تیشہ مار کر مر گیا۔

۹- یہاں بھی "تکیہ" کے معنی "سہارا" ہیں۔

شرح : اے اہل محفل! شمع پر بھروسا نہ کرو۔ یہ صبح ہونے تک بجھ جائے گی۔ گویا شمع کے سہارے بزم میں جو ہنگامہ آرائی ہے، وہ صرف رات بھر کے لیے ہے۔ صبح ہوتے ہی شمع گل ہو جائے گی۔ ساتھ ہی ہنگامے کی بساط بھی لپیٹ جائے گی۔

۱۰- **لغات** : **رنجور خستہ تن** : وہ بیمار، جس کا بدن زخموں سے چُور چُور ہو۔

شرح : میں بیمار ہوں، زخموں سے میرا بدن چُور چُور ہے۔ میں نے تکیہ مانگا۔ تم نے دُور سے پھینک دیا جو مجھ تک نہ پہنچ سکا۔ اب تمہیں سوچو کہ میں وہ تکیہ کیونکر اٹھاؤں!

۱۱- **شرح** : میرے محبوب نے مجھے قتل کر ڈالا۔ میں گر گیا تو اسے یہ کیفیت دیکھ کر غش آ گیا۔ چنانچہ وہ بھی گرا، اور اس حال میں میری بے کفن لاش اس کے لیے تکیہ بن گئی۔

۱۲- **لغات** : **من** : وہ مُہرہ، جو سانپ کے منہ میں رہتا ہے اور عام خیال یہ ہے کہ اندھیری رات میں سانپ اسے اُگل دیتا ہے تو وہ شعلے کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔

شرح : محبوب سے جدائی کی رات میں جو اذیت پہنچ رہی ہے، اس کا حال کیا بتاؤں؟ بس یہ سمجھ لیجیے کہ بستر سانپ بن گیا ہے اور تکیہ اس کا مَن ہے۔

۱۳- **شرح** : آپ جائز سمجھیں یا نہ سمجھیں، لیکن یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ پہلے جس چیز کو تکیہ کلام کہتے تھے، اب اہل سخن اسے "سخن تکیہ" کہتے ہیں۔

"تکیہ کلام" سے مراد ہے وہ لفظ یا جملہ جسے کوئی شخص دورانِ گفتگو میں بار بار دُہرائے۔ لغت کے لحاظ سے "سخن تکیہ" کے بھی وہی معنی ہیں۔ میرزا کہتے ہیں کہ بلاشبہ تکیہ کلام ایک مسلّم محاورہ بن چکا ہے، لیکن اب سخنوروں نے "تکیہ کلام" کی جگہ "سخن تکیہ"

کہنا شروع کر دیا ہے۔ آپ اسے جائز نہیں سمجھتے تو نہ سہی۔

پوری غزل خصوصیت سے آخری اشعار میں میرزا نے قادر الکلامی کے جو جوہر دکھائے ہیں، ان کی مثال مشکل سے ملے گی۔

۱۴۔ **شرح** : ہم اور آپ آسمان کو فلکِ پیر یعنی بوڑھا آسمان کہ رہے ہیں۔ وہی غالب جیسے عاجز فقیر کا پُرانا سہارا ہے۔

یہ غزل مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے نواب سعید الدین احمد خاں طالب کی بیاض سے حاصل کر کے "البلال" کلکتہ مورخہ ۲۲ جولائی ۱۹۱۳ء میں شائع کی تھی، پھر یہ "ہمدرد" دہلی میں شائع ہوئی۔

○

تمہید :۔
یہ غزل، جیسا کہ مقطع سے ظاہر ہے، نواب علاؤ الدین احمد خاں علائی نے بہ اصرار لکھوائی تھی اور میرزا غالب نے ۲۶ جولائی ۱۸۶۵ء کے مکتوب میں علائی کے پاس لوہارو بھیج دی تھی۔ یہ اس لیے دیوان میں شامل نہ ہو سکی کہ میرزا کا کوئی دیوان ۱۸۶۵ء کے بعد کی زندگی میں شائع نہ ہوا۔ بعد

میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش، اس سے سوا اور سہی

غیر کی مرگ کا غم کس لیے، اے غیرتِ ماہ
ہیں ہوس پیشہ بہت، وُہ نہ ہُوا، اور سہی

تم ہو بُت، پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے
تم خداوند ہی کہلاؤ، خدا اور سہی

حُسن میں حُور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی
آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی

تیرے کوچے کا ہے مائل دلِ مضطر میرا
کعبہ اک اور سہی، قبلہ نما اور سہی

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یا رب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں
زہر کچھ اور سہی، آبِ بقا اور سہی

مجھ سے، غالبؔ! یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیدادگرِ رنج فزا اور سہی

ازاں اسے شاملِ دیوان کرنے کا کسی کو خیال ہی نہ آیا۔

۱۔ شرح :- میں خود جفا پسند کرتا ہوں، لہٰذا اے محبوب! مجھ پر اور جفا کر لو۔ تمہیں ظلم و جبر پسند ہے تو جفا کر رہے ہو، اس سے زیادہ کر لو، میں ہرگز لبِ شکایت وا نہ کروں گا۔

۲۔ لغات : ہوس پیشہ : جو سچا عاشق نہ ہو اور محض ہوا و ہوس کا بندہ ہو۔

شرح : اے چاند کے لیے باعثِ رشک محبوب! غیر مر گیا ہے تو اس کا غم کیوں کرتے ہو؟ ایسے بندگانِ ہوا و ہوس بہت ہیں۔ جو مر گیا ہے، اس کے سوا کسی کو اپنا لیجیے۔ اگر آپ کو ہوا و ہوس کے بندے ہی مطلوب ہیں تو وہ ایسے نایاب نہیں کہ مل نہ سکیں۔

شاعر کا اصل مقصد یہ ہے کہ میرے سوا جتنے بھی لوگ محبوب کے پاس جائیں گے۔ سچے عاشق نہ ہوں گے۔ حقیقی عشق صرف میری ذات تک محدود ہے۔

۳۔ لغات : پندار : خیال، غرور، تکبر، تصور۔

شرح : تم بُت ہو (اور محبوبوں کو اکثر بُت ہی کہا جاتا ہے)، پھر تم میں خدائی کا غرور و تکبر کیوں پیدا ہو گیا، یعنی تم خدا کیوں بن رہے ہو؟ میری بات مانو۔ خدا کو الگ رہنے دو، صرف خداوند، یعنی مالک و آقا ہی کہلانا تمہارے لیے مناسب ہے۔

۴۔ شرح : اے محبوب! آپ کا طور طریق اطرز ادا کتنی ہی عجیب و غریب کیوں نہ ہو، لیکن آپ حُسن میں حور پر برتری حاصل نہیں کر سکتے۔

یہ کسی ایسے موقع کا معاملہ معلوم ہوتا ہے، جب محبوب سے باتیں ہو رہی تھیں اور وہ اپنے انداز و ادا پر غرور میں آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ بات چیت کے دوران میں عاشق نے تعریضاً وہ بات بھی کر دی، جو اس کی زبان پر نہیں آنی چاہیے تھی، ور مقصود یہی تھا کہ محبوب کو غصہ آئے اور وہ مزید ظلم و جور کرے، عاشق پہلے ہی کہ چکا ہے کہ میں مشتاق جفا ہوں۔

۵۔ شرح : میں مانتا ہوں کہ کعبہ نہایت مقدّس مقام ہے۔ قبلہ نما سے بھی مجھے انکار نہیں، لیکن میں کیا کروں، اے محبوب! میرا دل تو اضطرار کی حالت میں صرف تیرے ہی کوچے کی طرف میلان رکھتا ہے۔ کعبے اور قبلہ نما کی طرف اسے کوئی رغبت نہیں۔

بظاہر اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ میرے نزدیک کعبہ اور قبلہ نما اصل توجّہ کی چیزیں نہیں، دل کا تعلق صرف محبوب حقیقی سے ہونا چاہیئے۔

۶۔ شرح : اے واعظ! کیا دنیا میں کوئی باغ اور کوئی چمن زار نہیں؟ بہشت بھی بہر حال باغ ہی ہے، ہم نے مانا کہ اس کی آب و ہوا یہاں کے باغوں سے کسی قدر مختلف ہو گی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آپ وعظ فرماتے ہیں تو اسی کی ترغیب دیتے ہیں؟

۷۔ شرح : اے خدا! بہشت میں دوزخ کو بھی کیوں نہ ملا لیا جائے؟ اس طرح سیر و تفریح کے لیے تھوڑی سی نئی فضا پیدا ہو جائے گی۔

اس شعر میں بھی وہی مضمون پیش کیا گیا ہے، جو میرزا غالب پہلے بیان کر چکے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک بہشت ایک ایسا مقام ہے جو محبوب حقیقی کی عبادت کے لیے بطور ترغیب پیش کیا جاتا ہے۔ میرزا نہیں چاہتے کہ اس سلسلے میں کسی ترغیب سے سابقہ پڑے۔ وہ صرف خدا کے لیے خدا کی عبادت

کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جنت اور دوزخ میں کوئی تمیز قائم نہیں رکھی۔ وہ نہ اس امر کے قائل ہیں کہ عبادت کے لیے انعام کا لالچ ہو، نہ یہ پسند کرتے ہیں کہ انھیں ڈرا کر بندگی پر آمادہ کیا جائے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دونوں چیزیں خلوص کے منافی ہیں، لہٰذا دونوں کو ایک درجے میں رکھ دیا۔ مقصودِ حقیقی بہشت و دوزخ کی بحث نہیں، مقصود صرف خلوص فی العبادت ہے۔ یہ مضمون میرزا نے مختلف اشعار میں بہ انداز مختلف پیش کیا ہے۔ مثلاً:

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

محوِ مکافاتِ بہ خود و تو آویخت
مشتاقِ عطا شعلہ ز گل باز ندانست

٨۔ شرح :

مجھے وہ چیز دے دیجیے، جسے کھا کر پانی مانگنے کی بھی نوبت نہ آئے اور مر جاؤں۔ نہ مجھے زہر کی ضرورت ہے کہ کھاؤں۔ بدن تشنگی سے پھنکنے لگے، پانی مانگوں اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دوں۔ نہ میں آبِ حیات کا خواہاں ہوں کہ پیوں اور غمِ عشق کے ساتھ ہمیشہ کے لیے درد بھری زندگی بسر کروں۔

٩۔ شرح :

اے غالب! یہ غزل تجھ سے علاء الدین احمد خاں علائی نے بہ اصرار لکھوائی۔ جیسے ہی رنج بڑھانے والے ظالم خاصی تعداد میں موجود تھے، ان میں ایک و ... اضافہ قبول کرو۔

○

آپ نے مسّنی الضّر کہا ہے تو سہی
یہ بھی اے حضرتِ ایوبؑ! گلا ہے تو سہی

رنج طاقت سے سوا ہو، تو نہ پیٹوں کیوں سر
ذہن میں خوبیٔ تسلیم و رضا ہے تو سہی

تمہید :۔
مجھے اس غزل کا علم سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور کے

ہے غنیمت کہ بہ اُمید گزر جائے گی عمر
نہ ملے داد، مگر روزِ جزا ہے تو سہی

دوست ہی کوئی نہیں ہے، جو کرے چارہ گری
نہ سہی، لیک تمنّائے دوا ہے تو سہی

غیر سے دیکھیے کیا خُوب نباہی اُس نے
نہ سہی ہم سے، پر اُس بُت میں وفا ہے تو سہی

نقل کرتا ہوں اسے نامۂ اعمال میں مَیں
کچُھ نہ کچُھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

کبھی آ جائے گی، کیوں کرتے ہو جلدی غالبؔ
شہرۂ تیزیِ شمشیرِ قضا ہے تو سہی

ذریعے سے ہوا تھا اور انھوں نے اس کی نقل نواب سعید الدین احمد خاں طالبؔ کی بیاض سے حاصل کی تھی۔ مجھے اس کی نقل دہلی کے ایک قلمی دیوان سے ملی، جو نواب شجاع الدین احمد کی ملکیت تھا۔

۱۔ لغات:

مسّنی الضّر: "میں دُکھ میں ڈال دیا گیا ہوں" قرآن مجید میں یہ حضرت ایوبؑ کا قول ہے۔ اس میں کہیں ذاتِ باری تعالیٰ سے گلہ موجود نہیں۔ یہ نہیں کہا کہ اے اللہ! تُو نے مجھے دُکھ میں ڈال دیا، کیونکہ وہ تو کسی کو بھی دُکھ میں نہیں ڈالتا۔ اس نے جو کچھ بخشا ہے، سراسر سُکھ اور راحت ہی ہے۔ جو بھی حالت ہمارے لیے دُکھ بن جاتی ہے، وہ خود ہماری صورتِ حال کا نتیجہ ہوتی ہے۔

میرزا غالبؔ یقیناً اس حقیقت سے ناواقف نہ ہوں گے، تاہم اُن کے ہاں خود اپنی صورتِ حال بیان کرنا بھی گلہ ہی ہے، خواہ اسلوب کوئی ہو۔

شرح: اے حضرت ایوبؑ! آخر آپ نے اپنی کیفیت بیان کرنے کے لیے مسّنی الضّر کا کلمہ تو ارشاد فرمایا۔ یہ بھی تو ایک قسم کا گلہ شکوہ ہی ہے۔ حقیقی صبر و شکیب کا تقاضا یہ تھا کہ اپنی حالت درد و غم کسی بھی شکل میں بیان نہ کی جاتی۔ ذاتِ باری تعالیٰ

سے کون سی پھپس ہوئی تھی کہ آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت پیش آئی۔ مطلب یہ کہ روئے سخن خدا کی طرف نہ سہی، مگر اپنی دردناک حالت بیان کرنا بھی تو ایک گونہ شکوہ ہی ہے۔

۲۔ **شرح** : یقیناً میں تسلیم و رضا کی خوبیوں کا قائل ہوں اور خوب سمجھتا ہوں کہ صحیح مسلک و طریق یہی ہے۔ جو کچھ پیش آئے، اسے خدا کی طرف سے سمجھا جائے اور اس پر کوئی جزع فزع یا واویلا نہ کیا جائے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ میرے حصے میں جو رنج و غم آئے، وہ میری طاقتِ برداشت سے بہت زیادہ ہیں۔ پھر سر کیوں نہ پیٹوں؟۔

۳۔ **شرح** : غنیمت سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جزا کا دن مقرر کر رکھا ہے اور ہم اس امید پر زندگی بسر کر لیں گے کہ آخر ایک دن حساب کتاب ہوگا اور ہم نے جو مصیبتیں برداشت کیں، ان کا بھی صلہ ملے گا۔ فرض کر لو کہ اس زندگی کی طرح وہاں بھی ہم کوئی صلہ نہ پائیں، مگر روزِ جزا کی امید پر زندگی تو بسر ہو جائے گی۔

۴۔ **شرح** : کوئی ایسا دوست ہی موجود نہیں، جو ہمارے دل و جگر کے زخموں کی مرہم پٹی کرے۔ خیر، دوست نہیں تو نہ سہی، لیکن دوا دارو اور مرہم پٹی کی آرزو تو موجود ہے۔

۵۔ **شرح** : دیکھیے، ہمارے محبوب نے غیر سے کتنا اچھا نباہ کیا! اس سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ اس میں وفا کی خصلت موجود ہے، ہم سے وفا کا برتاؤ نہیں کیا تو نہ سہی، کسی سے کیا تو سہی۔

۶۔ **شرح** : اے کاتبِ تقدیر! تُو نے ازل کے روز جو کچھ میرے لیے لکھ دیا، اسے برابر اپنے نامۂ اعمال میں نقل کرتا چلا جا رہا ہوں۔

گویا یہاں جبریوں کا عقیدہ واضح کیا یعنی یہ کہ انسان مختار نہیں، مجبور ہے۔ جو کچھ اس کے مقدر میں روزِ ازل سے لکھ دیا گیا ہے، وہی کرتا رہتا ہے۔

بیان کا کمال یہ ہے کہ یہ نہیں کہا، جو کچھ لکھا گیا ہے، وہی کر رہا ہوں بلکہ کہا:

روزِ ازل کا لکھا ہوا نقل کرتا چلا جا رہا ہوں۔

۷۔ **شرح** : اے غالبؔ! شمشیرِ قضا کی تیزی تو بہت مشہور ہے۔ تم موت کے لیے اتنی جلدی کیوں کرتے ہو؟ یہ بہرحال آکر ہی رہے گی۔ جس تلوار کی تیزی شہرۂ آفاق ہے، وہ آخر تیرا رشتۂ حیات کاٹنے میں تامل نہ کرے گی۔

○

تمہید :۔ یہ غزل اُس زمانے میں کہی گئی تھی، جب میرزا غالبؔ نواب کلب علی خاں والیِ رام پور کے جشنِ مسند نشینی میں شرکت کے لیے گئے تھے ۷ر اکتوبر ۱۸۶۵ء کو دہلی سے چل کر ۱۲ کو رام پور پہنچے اور ۱۸ دسمبر تک وہاں رہے۔ رخصت ہو کر پانچ روز بوجہ علالت مرادآباد ٹھہرے اور ۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو دہلی پہنچ گئے۔ غزل کے مقطع میں نواب سے اشارہ کلب علی خاں

لطفِ نظارۂ قاتل دمِ بسمل آئے
جان جائے تو بلا سے، پہ کہیں دل آئے

اُن کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گزری
دوست جو ساتھ مِرے تا لبِ ساحل آئے

وُہ نہیں ہم کہ چلے جائیں حرم کو اے شیخ
ساتھ حجاج کے اکثر کئی منزل آئے

آئیں جس بزم میں وُہ، لوگ پکار اٹھتے ہیں
"لو، وُہ برہم زنِ ہنگامۂ محفل آئے"

دیدہ خونبار ہے مدت سے، و لے آج ندیم
دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے

سامنا حور و پری نے نہ کیا ہے، نہ کریں؛
عکس تیرا ہی مگر، تیرے مقابل آئے

اب ہے دلّی کی طرف کوچ ہمارا غالبؔ! | کی طرف ہے جو ان کا
آج ہم حضرتِ نوّاب سے بھی مِل آئے | تخلّص بھی تھا اور واضح
ہے کہ یہ غزل نوّاب

سے رخصتی ملاقات کے بعد کہی گئی تھی۔

۱۔ **شرح** : اگر کسی پر دل آجائے، یعنی کسی سے محبّت ہو جائے تو اسے دیکھنے کا لطف اُس وقت خوب آئے، جب وہ اپنے ہاتھ سے عاشق کو ذبح کرنے لگے۔ بلاشبہ اس طرح عاشق کی جان جائے گی، لیکن بلا سے، اس کی کیا پروا ہے؟ وہ لطف جان سے بدرجہا زیادہ عزیز ہے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ کسی سے عشق ہو جائے۔

۲۔ **شرح** : جو دوست، عزیز اور رفیق مجھے کشتی پر سوار کرانے کے لیے ساحل تک ساتھ آئے اور واپس چلے گئے، انھیں کیا معلوم کہ دریا میں روانگی کے بعد میری کشتی پر کیا کیا آفتیں اور مصیبتیں نازل ہوئیں۔

مطلب یہ کہ حق و صداقت کی پاسداری اور ادائے فرائض میں جن مصیبتوں سے سابقہ پڑتا ہے، ان کا صحیح اندازہ وہ لوگ نہیں کر سکتے جو الگ بیٹھے ہوئے صرف اس راستے تک چھوڑ آتے ہیں اور اصل منزل میں ساتھ نہیں دیتے۔ ہمارے ہاں گزشتہ دور میں ہزاروں واقعات پیش آئے کہ کسی شخص کو قید یا جلاوطنی کی سزا ملی۔ اس کے دوست اور رفیق نعرے لگاتے ہوئے جیل خانے کے دروازے تک ساتھ گئے، مگر انہیں اس شخص کی تکلیفوں کا صحیح اندازہ کیا ہو سکتا تھا، جس نے خود کئی کئی سال تنہائی کی قید میں گزارے۔

۳۔ **لغات** : **حُجاج** : حاج کی جمع، حاجی لوگ۔

شرح : اے شیخ! ہم حاجیوں کے قافلے کے ساتھ عموماً کئی کئی منزل چلے جاتے ہیں، لیکن حرم تک نہیں پہنچے اور یہیں، اس مقدّس مقام تک سفر میں جو مزہ مل رہا ہے، اسے وہاں پہنچ کر ختم نہیں کرنا چاہتے، لہٰذا پہنچے

سے پہلے ہی پلٹ آتے ہیں۔

بتانا یہ چاہتے ہیں کہ کسی بیش بہا اور محبوب شے کے لیے سعی و کوشش میں جو لطف ہے، وہ اس شے تک پہنچ کر باقی نہیں رہتا، کیونکہ ایک حد تک شوق کی تسکین ہو جاتی ہے۔ میرزا اس تسکین کے روادار نہیں ہو سکتے، راستے ہی میں گھومتے رہیں گے۔ اسی میں انہیں وہ مزہ مل رہا ہے، جو وہاں پہنچ کر نہیں مل سکتا۔

۴۔ **شرح** : میرا محبوب جس بزم میں آتا ہے، لوگ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ لو بھئی! وہ آگیا، جو محفل کا ہنگامہ درہم برہم کر ڈالتا ہے۔ یعنی محبوب کی آمد پر بزم کا کوئی آدمی اپنی طبعی حالت میں نہیں رہتا۔ اس پر اضطراب و بیتابی کی کوئی نہ کوئی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ جمی ہوئی محفل تہ و بالا ہو جائے۔

۵۔ **شرح** : اے دوست! ہماری آنکھیں تو مدت سے خون کے دریا بہا رہی ہیں، لیکن آج معاملہ زیادہ نازک صورت اختیار کر گیا، کیونکہ دل کے بھی کئی ٹکڑے خون کے ساتھ بہہ کر باہر نکل آئے۔

۶۔ **شرح** : اے محبوب! نہ خور تیرے سامنے آنے کی تاب لا سکتی ہے، نہ پری، حالانکہ حسن میں انھیں عالمگیر شہرت حاصل ہے۔ شاید تیرا عکس ہی تیرے مقابل آسکتا ہے۔

کوئی شخص آئینہ دیکھے گا تو عکس لازماً اس کے سامنے آئے گا۔ اس سے کسی بھی صورت مفر نہیں۔ میرزا کہتے ہیں کہ محبوب کا عکس ہی اس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس پوری کائنات میں اور کوئی نہیں، جو سامنے آنے کا حوصلہ کر سکے۔

۷۔ **شرح** : اے غالب! اب ہم دہلی کی طرف روانہ ہونے والے ہیں اور حضرت نواب یعنی کلب علی خاں سے جن کا تخلص بھی نواب تھا وداعی ملاقات بھی کر آئے۔

○

بھولے سے کاش وُہ اِدھر آئیں تو شام ہو
کیا لُطف ہو جو ابلقِ دوراں بھی رام ہو
تا گردشِ فلک سے یونہی صبح و شام ہو
ساقی کی چشمِ مست ہو اور دورِ جام ہو
بے تاب ہوں بلا سے، کن انکھیوں سے دیکھ لیں
اے خوش نصیب! کاش قضا کا پیام ہو
کیا شرم ہے؟ حریم ہے، محرم ہے راز دار
میں سر بہ کف ہوں، تیغِ ادا بے نیام ہو
میں چھیڑنے کو کاش اسے گھور لوں کہیں
پھر شوخ دیدہ بر سرِ صد انتقام ہو
وُہ دن کہاں کہ حرفِ تمنّا ہو لب شناس
ناکام بدنصیب کبھی شاد کام ہو
گھس پل کے چشمِ شوق قدم بوس ہی سہی
وُہ بزمِ غیر ہی میں ہوں، پر ازدحام ہو

تمہید: — یہ غزل مالک رام صاحب ایم اے نے رسالہ "ہمایوں" لاہور بابت اپریل ۱۹۳۹ء سے حاصل کی۔ مجھے غالبؔ سے اس کے انتساب کی حقیقت معلوم نہیں۔ صرف اس لیے درج میں شامل کر رہا ہوں کہ اہلِ ذوق کا ایک حلقہ اسے غالبؔ کی غزل قرار دے رہا ہے۔

۱۔ لغات:

ابلق: گھوڑا، خصوصاً وہ گھوڑا جو سیاہ و سپید ہو۔

دوراں: زمانہ، اسے ابلق سے تشبیہ اس لیے دی کہ دن اور رات سیاہ و سپید ہوتے ہیں اور ابلق

سے بالکل مشابہ۔ اتنی پیوں کہ حشر میں سرشار ہی اُٹھوں

شرح : مجھ پہ جو چشمِ ساقیِ بیت الحرام ہو

کاش میرا محبوب بھول کر میری طرف آجائے تو شام کا وقت ہوتا کہ رات غریب

پیرانہ سال غالبؔ میکش کرے گا کیا

بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

خانے میں مہمان رہے۔ اگر زمانے کا ابلق یوں میری مرضی کے مطابق چلے تو خوب لطف آئے۔

۲۔ **شرح :** جب تک آسمان کی گردش سے صبح و شام ہوتی رہے، آرزو یہ ہے کہ میرے سامنے ساقی کی مست آنکھیں ہوں اور شراب کا دَور چلتا رہے۔

شعر میں گردشِ فلک کو دورِ جام سے اور صبح و شام کو ساقی کی چشمِ مست سے تشبیہ دی ہے۔

۳۔ **لغات :** کن انکھیوں سے دیکھنا : گوشۂ چشم سے دیکھنا، ترچھی نگاہ سے دیکھنا۔ اس کا املا "کنکھیوں" بھی ہے، جو تلفظ کے عین مطابق ہے۔

شرح : میں نہایت پریشان ہوں۔ کاش میرا محبوب ترچھی نگاہ ہی سے دیکھ لے۔ اگر یہ دیکھنا موت کا پیغام بن جائے تو بلا سے، میں اپنے آپ کو خوش نصیب ہی سمجھوں گا۔

۴۔ **شرح :** ہم گھر کے اندر ہیں اور جو شخص موجود ہے وہ رازوں کی خوب حفاظت کرتا ہے۔ میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔ پھر اے محبوب! آپ شرم کس بات کی کر رہے ہیں۔ تیغ ادا میان سے نکالیے اور میرا خاتمہ کر دیجیے۔

۵۔ **شرح :** اگر محض چھیڑنے کی غرض سے اسے ذرا گھور دوں یعنی ٹکٹکی باندھ کر محبت کی نظر سے دیکھوں تو وہ شوخ چشم سیکڑوں بدلے لینے کے

لیے تیار ہو جائے۔

۶۔ **شرح** : وہ وقت ہی کہاں ہے کہ آرزو میرے لبوں تک پہنچے اور جو بدنصیب عمر بھر ناکام رہا، اس کے لیے کبھی خوشی کا موقع بھی آ جائے؟

۷۔ **لغات** : **گھس پل کر** : دھکا پیل سے جگہ پیدا کر کے۔

ازدحام : ہجوم، بھیڑ۔

شرح : بیشک میرا محبوب غیر ہی کی محفل میں ہو، لیکن وہاں بھیڑ ہونی چاہیئے تاکہ میری بھی چشم شوق گھس پل کر قدم بوسی کا موقع مل جائے۔

اگر بھیڑ نہ ہوگی تو قدم بوسی کی کوشش محبوب پر آشکار ہو جائے گی اور مراد بر نہ آئے گی۔ اس کی صورت یہی ہے کہ بھیڑ ہو۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ میری نگاہِ شوق قدم بوس ہو رہی ہے، یہی سمجھا جائے کہ بھیڑ کے باعث میں نگاہِ شوق اس کے قدموں پر ڈالنے کے لیے مجبور ہو گیا ہوں۔

۸۔ **لغات** : **ساقیِ بیت الحرام** : حرم کعبہ کا ساقی یعنی رسول اللہ (صلعم)۔

شرح : اگر کعبۂ مقدس کے ساقی، یعنی رسول اللہ (صلعم) کی، چشم عنایت مجھ پر ہو تو اتنی پیوں کہ حشر تک قبر میں مست پڑا رہوں اور اٹھوں تو مست ہی اٹھوں۔ اس شراب سے مقصود شراب حبّ رسول صلعم اور شراب حب باری تعالیٰ ہے۔

۹۔ **شرح** : اگر بھوپال میں بوڑھا غالب دو روز اور ٹھہرا رہے تو اس بڑھاپے میں وہ شراب کا عادی کرے گا کیا؟

مقطع سے بالکل واضح ہے کہ یہ غزل بڑھاپے میں لکھی گئی، لیکن کلام صاف بتا رہا ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے، یہ مشق کی پختگی کے دور کا ہے۔ اسی لیے غالب سے اس کا انتساب محل نظر سمجھتا ہوں، اگرچہ اس کے بعض اشعار میں غالب ہی کا رنگ ہے۔

بتائیں ہم تمہارے عارض و کاکل کو کیا سمجھے
اسے ہم سانپ سمجھے اور اسے من سانپ کا سمجھے
یہ کیا تشبیہ بیہودہ ہے، کیوں موذی سے نسبت دیں
ہما عارض کو اور کاکل کو ہم ظلِ ہما سمجھے
غلط ہی ہو گئی تشبیہ، یہ تو ایک طائر ہے
اسے برگِ سمن اور اُس کو سنبل کو جٹا سمجھے
۱- شرح: نباتاتِ زمیں سے ان کو کیا نسبت؟ معاذ اللہ
اسے برق اور اُسے ہم کالی ساون کی گھٹا سمجھے
گھٹا اور برق سے کیوں کر گھٹا کر اُن کو نسبت دیں
اسے ظلمات، اسے ہم چشمۂ آبِ بقا سمجھے
جو کہیے یہ، فقط مقصود تھا خضر و سکندر سے
۲- شرح: یدِ بیضا اسے اور اس کو موسیٰ کا عصا سمجھے
جو اس تشبیہ سے بھی داغ اُن دونوں کو آتا ہو
اسے وقتِ نمازِ صبح اور اُس کو عشا سمجھے

یہ غزلیں مولوی عبدالباری آسی کی کتاب سے منقول ہیں لیکن اہلِ نظر مجموعۂ آسی میں شائع شدہ پورے غیر مطبوعہ کلام کا انتساب صحیح نہیں سمجھتے۔

۱- شرح: اے محبوب! ہم بتائیں کہ تمہارے رخسار اور زلف کو کیا سمجھتے ہیں۔ لو سنو، ہم زلف کو سانپ اور رخساروں کو سانپ کا مَن سمجھتے ہیں۔

۲- شرح: یہ بالکل بیہودہ تشبیہ ہے۔ بھلا کیونکر مناسب ہے کہ ہم زلف کو سانپ

جو یہ نسبت پسندِ خاطرِ والا نہ ہو تو پھر
لسے قندیلِ کعبہ اس کو کعبے کی ردا سمجھے

اسدان ساری تشبیہوں کو رد کر کے یہ کہتا ہے
سویدا اس کو سمجھے اُس کو ہم نُورِ خدا سمجھے

جیسے موذی سے نسبت دیں! صحیح یہ ہے کہ ہم رخسار کو ہما اور زلف کو ہما کا سایہ سمجھتے ہیں۔ مشہور ہے کہ ہُما کا سایہ جس پر پڑ جائے، وہ نہایت خوش نصیب ہوتا ہے اور عاشق کے لیے زلفِ محبوب کے سایے سے بڑھ کر خوش نصیبی کیا ہو سکتی ہے؟

۳۔ **شرح** : یہ تشبیہ بھی غلط ہی ہو گئی، کیونکہ ہُما ایک پرندہ ہے اور پرندے سے محبوب کی کسی چیز کو تشبیہ دینا کچھ مناسب نہیں۔ صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ رخسار کو چنبیلی کے پھول کی پنکھڑی اور زلف کو سنبل کے تاروں کا مجموعہ سمجھیں۔

۴۔ **شرح** : توبہ توبہ! یہ محبوب کے عارض و زلف کو زمین سے اُگنے والی نباتات کے ساتھ کیا تشبیہ دے دی؟ مناسب یہ ہے کہ رخسار کو بجلی اور زلف کو ساون کی کالی گھٹا سمجھیں۔

۵۔ **شرح** : لیکن گھٹا اور بجلی سے زلف و رخسار کو نسبت دینا ہرگز مناسب نہیں، اس طرح ان کا رتبہ کم ہو جاتا ہے۔ کیوں نہ زلف کو ظلمات اور رخسار کو آبِ حیات کا چشمہ قرار دیں؟ معلوم ہے کہ آبِ حیات ظلمات ہی میں ہے۔

۶۔ **شرح** : اگر یہ تشبیہ قبول کر لی جائے تو ماننا پڑے گا کہ ظلمات میں سے گزرتے ہوئے آبِ حیات پر پہنچنا خضرؑ اور سکندر کا مقصود تھا تو اس طرح بھی زلف و رخسار کی قدر و منزلت کم ہو جاتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ رخسار کو یدِ بیضا اور زلف کو حضرت موسیٰؑ کا عصا قرار دیں۔

۷۔ **شرح** : اگر یہ تشبیہ بھی زلف و رخسار کے لیے مناسب معلوم نہ ہو تو چلیے، رخسار کو صبح کی نماز اور زلف کو عشا کی نماز سمجھ لیتے ہیں۔

۸۔ **شرح** : اگر یہ تشبیہ بھی آپ کے دل کو پسند نہ آئے تو رخسار کو کعبے کی قندیل اور زلف کو کعبے کا غلاف مان لیتے ہیں۔

۹۔ **شرح** : لیکن استدان تمام تشبیہوں کو رد کر کے کہتا ہے کہ زلف سویدا ہے اور رخسار اللہ تعالیٰ کا نور ہے۔

○

یہ غزل بھی مجموعۂ آسی ہی سے لی گئی ہے اور عرشی صاحب نے بھی اسے اپنے مجموعے میں شامل کر لیا ہے۔

نسیمِ صبح جب کنعاں میں بُوئے پیرہن لائی
پئے یعقوبؑ ساتھ اپنے نویدِ جان و تن لائی

وقارِ ماتمِ شب زندہ دارِ ہجر رکھنا تھا
سپیدی صبحِ غم کی دوش پر رکھ کر کفن لائی

شہیدِ شیوۂ منصور ہے اندازِ رُسوائی
مُصیبت پیشگیِ مدعا دار و رسن لائی

وفا دامن کشِ پیرایہ و ہستی ہے اے غالبؔ
کہ پھر نُزہت گہِ غربت سے تا حدِ وطن لائی

۱۔ **شرح:** صبح کی نسیم نے حضرت یوسفؑ کے پیراہن کی خوشبو کنعاں میں پہنچائی تو یہ خوشبو حضرت یعقوبؑ کے جسم و جان دونوں کے لیے خوش خبری بن کر آئی۔

۲۔ **لغات** : شب زندہ دارِ ہجر : فراق کی راتوں میں جاگنے والا۔

شرح : جس شخص نے فراق کی راتیں جاگ کر کاٹیں اور مر گیا، اس کے ماتم کی عزت دوقعت قائم رکھنا ضروری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صبحِ غم کی سفیدی اپنے کندھے پر کفن رکھ کر لائی تاکہ اسے احترام سے دفن کر دیا جائے۔

۳۔ **شرح** : ہمارے رسوا ہونے کا انداز ایسا ہے گویا ہم منصور کے طور طریقوں پر مٹے ہوئے ہیں۔ یعنی ہم رسوائی میں منصور کے طریقے پر عمل کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا مقصد یقیناً مصیبت کو پسند کرتا ہے بلکہ اس نے مصیبت کو پیشہ بنا لیا ہے وہ ہمارے لیے سُولی اور رسا لے آیا ہے۔ گویا ہم بھی منصور کی طرح سُولی پر مرنے کے آرزو مند ہیں۔

۴۔ **لغات** : **نزہت گاہ** : سیرگاہ، پُر فضا مقام۔

غربت : بے وطنی، اجنبیت۔

شرح : اے غالبؔ : وفاداری ہی ہستی کے لباس کا دامن کھینچتی ہے۔ وہی ہمیں پردیس کی سیرگاہ سے کھینچ کر وطن کی سرحد تک لے آئی۔

○

وفا جفا کی طلب گار ہوتی آئی ہے
ازل کے دن سے، اے یار ہوتی آئی ہے

۱۔ **شرح** : باوفا عاشق برابر جفا کے طلب گار رہے ہیں۔ اے دوست! روزِ ازل سے یہی طریقہ جاری ہے۔

جوابِ جنّتِ بزمِ نشاطِ جاناں ہے
مری نگاہ جو خونبار ہوتی آئی ہے

۲۔ **شرح** : میری نگاہ، جو خون

نمودِ جوشِ جنوں وحشیو! مبارک باد
بہار بدیۂ انظار ہوتی آئی ہے

دل و دماغِ وفا پیشگاں کی خیر نہیں
جگر سے آہِ شرر بار ہوتی آتی ہے

برساتی آرہی ہے، یہ دراصل میرے محبوب کی بزمِ نشاط کے فردوس کا جواب ہے، یعنی محبوب کی بزمِ نشاط کو جنت سے تشبیہ دی اور اس کا جواب چشمِ خونبار نے مہیا کیا۔ محبوب عیش و نشاط میں مشغول ہے اور غریب عاشق آنکھوں سے خون برسا رہا ہے۔

۳۔ لغات : ہدیۂ انظار : نگاہوں کے لیے تحفہ۔

شرح : اے وحشیو! جو جنوں میں مبتلا ہو، تمہیں مبارک ہو، اب جوشِ جنوں خوب ترقی کرے گا، کیونکہ بہار آگئی ہے اور نگاہوں کے لیے ایک تحفہ بن کر آئی ہے۔

۴۔ شرح : اب باوفا عاشقوں کے دل و دماغ کی خیر نہیں، کیونکہ آہ جگر سے چنگاریاں چھوڑتی ہوئی نکلی ہے۔

یہ غزل بھی آسی اور عرشی دونوں کے مجموعوں میں شامل ہے۔

○

۱۔ شرح : یونہی افزائشِ وحشت کے جو ساماں ہوں گے
دل کے سب زخم بھی ہم شکلِ گریباں ہوں گے

اگر وحشت میں ترقی کے ایسے ہی سامان جمع ہوتے رہے تو دل میں جتنے زخم ہیں وہ سب گریبان کی صورت

وجہِ مایوسیِ عاشق ہے تغافل اُن کا
نہ کبھی قتل کریں گے، نہ پشیماں ہوں گے

دل سلامت ہے تو صدموں کی کمی کیا ہم کو
بے شک اُن سے تو بہت جان کے خواہاں ہونگے

منتشر ہو کے بھی دل جمع رکھیں گے ، یعنی اختیار کریں گے۔

ہم بھی اب پیروِ گیسوے پریشاں ہوں گے

گردشِ بخت نے مایوس کیا ہے ، لیکن

اب بھی ہر گوشۂ دل میں کئی ارماں ہوں گے

ہے ابھی خوں سے فقط گرمیِ ہنگامۂ اشک

پر یہ حالت ہے، تو نالے شرر افشاں ہوں گے

باندھ کر عہدِ وفا اتنا تنفر؟ ہے ہے !!

تجھ سے بے مہر کم اے عمرِ گریزاں! ہوں گے

اس قدر بھی دلِ سوزاں کو نہ جان افسردہ

ابھی کچھ داغ تو اے شمع! فروزاں ہوں گے

عہد میں تیرے کہاں گرمیِ ہنگامۂ عیش

گُل مری قسمتِ واژونہ پہ خنداں ہوں گے

خُوگرِ عیش نہیں ہیں ترے برگشتہ نصیب

اُن کو دشوار ہیں وہ کام جو آساں ہوں گے

موت پھر زیست نہ ہو جائے، یہ ڈر ہے، غالبؔ!

وہ مری نعش پہ انگشت بہ دنداں ہوں گے

۲- شرح :
محبوب کا تغافل یعنی انجان بنے رہنا عاشق کے لیے نا امیدی کا باعث ہے۔ جب وہ انجان بنا ہوا ہے تو یہ اُمید کیونکر رکھی جا سکتی ہے کہ کبھی عاشق کو قتل بھی کرے گا؟ اگر قتل نہیں کرے گا تو اس کے لیے پشیمانی کا موقع کیونکر آئے گا۔

آخری مصرع کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نہ محبوب عاشق کو قتل کرے گا اور نہ قتل نہ کرنے پر پشیمان ہوگا۔ یہی امر عاشق کے لیے مایوسی کا باعث ہے۔

اس میں میرزا انجانے تغافل کی شکایت کر رہے ہیں اور معلوم ہے کہ ان کے نزدیک جان کر تغافل کرنے کا بھی ایک مقام ہے۔ مثلاً :-

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو — یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

۲۔ **شرح** : اگر دل سلامت ہے تو اس دنیا میں صدموں کی کمی نہیں ہو سکتی، کیونکہ ہمارے محبوب جیسے تو بہت سے لوگ ہیں، جو جان کے خواہاں ہوں گے۔

مطلب یہ کہ جب تک دل انسان کے پہلو میں ہے، وہ احساس سے محروم نہیں ہو سکتا اور احساس ہی خوشگوار واقعات پر خوشی اور ناخوشگوار واقعات پر صدمے کا باعث ہوتا ہے۔ میرزا یہی کہنا چاہتے ہیں کہ جب تک دل پہلو میں ہے، ہماری جان کے خواہاں سیکڑوں پیدا ہو جائیں گے۔

۴۔ **شرح** : ہم پریشان ہو کر بھی اپنا دل سنبھالے رہیں گے اور جمعیت خاطر کو ہاتھ سے نہ دیں گے۔ گویا ہم محبوب کی زلفِ پریشاں کے پیرو بن جائیں گے، جو پریشانی کے باوجود یکجا رہتی ہے

۵۔ **شرح** : ہمیں نصیب کی گردش نے نا امید کر رکھا ہے۔ بہ ایں ہمہ دل کے گوشے گوشے میں اب بھی بہت سے ارمان موجود ہوں گے۔

۶۔ **شرح** : ابھی تک تو جسم میں خون ہے اور اس کی وجہ سے آنسوؤں کا ہنگامہ گرم نظر آتا ہے، لیکن یہی حالت جاری رہی تو جسم کا خون آنسوؤں میں بہ بہ کر ختم ہو جائے گا۔ پھر نالے دل سے اٹھیں گے تو ہر طرف شعلے برسائیں گے، یعنی آگے چل کر ان کی وجہ سے گرمیِ ہنگامہ قائم رہے گی۔

۷۔ **لغات** : **تنفر** : نفرت۔

عمرِ گریزاں : بھاگ جانے والی عمر یعنی چند روزہ عمر۔

شرح : اے عمر، جو اب گریزاں ہے، تو نے ہم سے عہدِ وفا باندھا تھا اور اس دنیا میں لائی تھی۔ اب ہم سے اتنی نفرت ہو گئی کہ ساتھ

چھوڑے جا رہی ہے۔ اللہ اللہ، تجھ ایسے بے مروّت بھی کم ہی ہوں گے۔

۸۔ **شرح** : اے شمع! ہمارے جلتے ہوئے دل کو تو نے کیوں اس قدر افسردہ سمجھ لیا ہے، ابھی تو اس میں بہت سے داغ روشن ہوں گے۔

۹۔ **شرح** : اے محبوب! تیرے عہد میں میرے لیے ہنگامۂ عیش گرم کرنا ممکن ہی نہیں۔ میری قسمت اِس درجہ پلٹ چکی ہے کہ پھول بھی اس کی ہنسی اُڑائیں گے۔

۱۰۔ **شرح** : اے محبوب! جو لوگ تجھ پر فریفتہ ہو کر بد نصیبی کا تختۂ مشق بن چکے ہیں، ان کے لیے تو سہل سے سہل کام بھی حد درجہ دشوار ہیں۔

۱۱۔ **شرح** : اے غالبؔ! اب مجھے خوف یہ ہے کہ محبوب میری نعش پر آئے گا تو رنج و غم سے انگلی دانتوں میں دبائے گا۔ میں اس کی یہ کیفیت برداشت نہ کر سکوں گا۔ اس وقت چاہوں گا کہ میری موت پھر زندگی سے بدل جائے۔ یہی ڈر مجھے پریشان کیے ہوئے ہے۔

○

نمائش پردہ دارِ طرزِ بیدادِ تغافل ہے
تسلّی جانِ بلبل کے لیے خندیدنِ گُل ہے

نمودِ عالمِ اسباب کیا ہے؟ لفظِ بے معنی
کہ ہستی کی طرح مجھ کو عدم میں بھی تأمّل ہے

نہ رکھ پابندِ استغنا کو قیدی رسمِ عالم کا
ترا دستِ دُعا بھی رخنہ اندازِ توکّل ہے

۱۔ **شرح** : بلبل کی جان صرف یہ دیکھ کر مطمئن ہے کہ پھول ہنس رہا ہے، یعنی کھلا ہوا ہے، حالانکہ یہ ہنسی محض ایک نمائش ہے اور مقصد یہ ہے کہ پھول نے تغافل جو سنگ دلانہ

طریقہ اختیار کر رکھا ہے، اس پر پردہ پڑا رہا ہے۔ نہ چھوڑا قید میں بھی وحشیوں کو یادِ گلشن نے
یہ چاکِ پیرہن گویا جوابِ خندۂ گُل ہے

۲۔ شرح: ابھی دیوانگی کا راز کہہ سکتے ہیں ناصح سے
عالمِ اسباب یعنی دنیا کی جو نمود و نمائش ہے، ابھی کچھ وقت ہے، غالبؔ! ابھی فصلِ گل و مُل ہے
یہ سراسر ایک بے معنی لفظ ہے، اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ وجود تو رہا ایک طرف، مجھے تو عدم میں بھی کلام ہے، میں تو عدم کو بھی تسلیم نہیں کرتا۔

جب وجود و عدم دونوں کو ختم کر دیا تو قصہ پاک ہو گیا۔ کنایہ یہ چاہتے ہیں کہ عالمِ اسباب کی محض نمود ہی باطل نہیں، بلکہ اس کا عدم بھی باطل ہے۔ نہ وجود کا اطلاق جائز ہے، نہ عدم کا۔

۳۔ لغات: اِستغنا: بے نیازی، بے پروائی۔

شرح: دعا مانگنا دنیا کی عام رسم ہے، لیکن جو شخص بے نیازی اور بے پروائی پر استوار ہو، اسے کیوں رسمِ دعا کا قیدی رکھا جائے؟ اس کے لیے کیوں اس رسم کی پابندی ضروری ہو؟ بے نیازی، اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسے سے پیدا ہوتی ہے اور جسے اللہ پر پورا بھروسا ہو، اس کے لیے عام انداز سے دعا کرنا بھی توکل میں خلل کا باعث ہے۔

مطلب یہ کہ ہم تو صرف اللہ کی رضا پر قائم ہیں، دنیا کی کسی چیز سے ہمیں کوئی دلبستگی نہیں اور سب سے بے پروا ہیں۔ خوشی ہو یا رنج، جو کچھ خدا کی طرف سے آئے، وہ ہمارے لیے عین نعمت ہے۔ اسی کو ہم توکل سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب عام لوگوں کے انداز میں دعا کریں گے تو ہماری رضا میں خلل پیدا ہو گا اور یہ عمل توکل کے خلاف جائے گا۔

فارسی کے ایک شعر میں کہتے ہیں:

نمونۂ مکافاتِ بہ عملِ دستگر آدیمنت   مشتاقِ عطا شعلۂ زحلِ بازندانت

جن لوگوں کو اپنے اعمال کی جزا پر فخر ہے ، وہ بہشت اور دوزخ کے جھگڑے میں پڑے رہتے ہیں ۔ بہشت میں جانا چاہتے ہیں اور دوزخ سے بچتے ہیں ، لیکن جس شخص کو وجودِ باری تعالیٰ کی عطا کا عشق ہے ، اس کے لیے شعلے اور پھول ، بہشت اور دوزخ میں تمیز کی کوئی وجہ نہیں ۔

۴ - شرح : اگر چہ دیوانے قید کر دیئے گئے ، لیکن وہاں بھی باغ کی یاد اُن کے دماغوں سے محو نہ ہو سکی ۔ وہاں بھی انھوں نے اپنے پیرہن چاک کر ڈالے ۔ یوں پھول کے کھلنے کا جواب مہیا کر دیا ۔

کنایہ یہ چاہتے ہیں کہ دیوانوں کا گریباں پھاڑنا اور دامن چاک کرنا پھولوں کی یاد کا ثبوت ہے ، وہ بھی تو اپنے دامن چاک کرتے ہیں ۔

۵ - شرح : اے غالبؔ ! ابھی بہار کا موسم ہے ، جس میں پھول کھلتے ہیں اور شراب پی جاتی ہے ۔ اس موسم کے رخصت ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی ہے ۔ نصیحت کرنے والا چاہے تو ہم بتا سکتے ہیں کہ ہمارے دیوانہ ہونے کا اصل بھید کیا ہے ۔

مطلب یہ کہ دیوانگی کا راز فصلِ بہار ہی میں کہا جا سکتا ہے ۔ یہ فصل گزر جائے گی تو اس راز کے چہرے سے پردہ کون اٹھائے گا ۔

یہ غزل بھی آسیؔ اور عرشیؔ دونوں کے مجموعے میں شامل ہے ۔

٥

خود جان دے کے روح کو آزاد کیجیے
تا کے خیالِ خاطرِ جلّاد کیجیے

۱ - شرح : جان دے کر روح کو لوگوں کا غموں اور

بھولے ہوئے جو غم ہیں، انہیں یاد کیجیے
تب جا کے اُن سے شکوۂ بیداد کیجیے

حالانکہ اب زباں میں نہیں طاقتِ فغاں
پر دل یہ چاہتا ہے کہ فریاد کیجیے

بس ہے دلوں کے واسطے اک جنبشِ نگاہ
اُجڑے ہوئے گھروں کو پھر آباد کیجیے

کچھ دردمند منتظرِ انقلاب ہیں
جو شاد ہو چکے، انہیں ناشاد کیجیے

شاید کہ پاس باعثِ افشائے راز ہو
لطف و کرم بھی شاملِ بیداد کیجیے

بیگانۂ رسومِ جہاں ہے مذاقِ عشق
طرزِ جدیدِ ظلم کچھ ایجاد کیجیے

مصیبتوں سے نجات دلائیے۔ جلاد کے دل کا خیال کب تک کرتے رہیں گے۔

۲- شرح : جو غم دل سے محو ہو چکے ہیں یا اب یاد نہیں رہے، انھیں یاد کر لینا چاہیے۔ پھر محبوب کے سامنے جا کر ظلم کی شکایتیں کرنا مناسب ہو گا۔ جب تک تمام رنج اور تمام مصیبتیں ذہن میں تازہ نہ ہوں، محبوب سے شکایت کریں بھی تو کیا کہیں گے

۳- شرح : صورت حال یہ ہے کہ زبان میں آہ و نالہ کرنے کی طاقت ہی نہیں رہی، لیکن دل کی کیفیت عجیب ہے۔ وہ یہی چاہتا ہے کہ فریاد پر فریاد کرتے جائیں۔

۴- شرح : دلوں کے لیے صرف محبوب کی نگاہ ہے۔ یہ اُجڑے ہوئے گھر ایک نگاہ ہی سے ازسرِ نو آباد ہو جائیں گے۔

۵- شرح : کچھ دکھی اور ظلم کے مارے ہوئے حالات کی زد پڑنے

کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ اے محبوب ! جو آپ کی عنایت سے خوش اور مسرور ہو چکے ہیں، انھیں بھی ذرا رنج و غم کا مزہ چکھا دیجئے۔ دُکھی لوگوں کے لیے شادمانی کی صورت یونہی پیدا ہو سکتی ہے کہ انقلاب آئے اور جو خوشی کی بہار دیکھ چکے ہیں، وہ ذرا رنج کا دَور بھی دیکھ لیں۔

۶- **شرح** : اگر عاشقوں پر ظلم و جور ہی ہوتا رہے گا تو مایوس ہو جائیں گے اور ان کے عشق کا بھرم کھل جائے گا۔ مناسب یہ ہے کہ ظلم و جور کے ساتھ ساتھ مہربانی اور عنایت کا سلسلہ بھی جاری رہے، کہ عاشقوں کو مایوسی سے سابقہ نہ پڑے۔

۷- **شرح** : عشق کا ذوق دنیا کی رسموں سے بالکل ناآشنا ہے۔ آپ ظلم کا کوئی نیا طریقہ ایجاد کریں، پُرانا طریقہ تو کارگر معلوم نہیں ہوتا۔

○

ہم سے خوبانِ جہاں پہلو تہی کرتے رہے
ہم ہمیشہ مشقِ از خود رفتگی کرتے رہے

کثرت آرائی خیالِ ماسوا کی وہم تھی
مرگ پر غافل گمانِ زندگی کرتے رہے

داغہائے دل چراغِ خانۂ تاریک تھے
تا مغاکِ قبر پیدا روشنی کرتے رہے

شورِ نیرنگِ بہارِ گلشنِ ہستی، نہ پوچھ
ہم خوشی اکثر رہینِ ناخوشی کرتے رہے

۱- **شرح** : دنیا کے حسین ہمیشہ اس کوشش میں رہے کہ ہم سے میل جول پیدا نہ کریں اور بالکل الگ تھلگ رہیں۔ ہم برابر کھوئے کھوئے سے رہنے کی مشق کرتے رہتے۔

مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے

یعنی عشق کا مقصد　　رخصت اے تمکینِ آزارِ فراقِ ہمرہاں
مدعا ہی یہ تھا کہ اپنے
آپ کو فراموش کر دیتے　　ہو سکا جب تک غمِ واماندگی کرتے رہے

اسی خود فراموشی میں مست ونگروہ رہے۔ جیسوں نے سمجھ لیا کہ ہم دیوانے ہیں، لہٰذا ہم سے دُور بھاگتے رہے۔

۲۔ **لغات** : **کثرت آرائی** : "کثرت"، "وحدت" کی ضد ہے، جسے صوفیہ توحید کے منافی جانتے ہیں۔ کثرت آرائی سے مراد ہے ایک وجود حقیقی کے سوا بہت سے وجود تسلیم کر لینا۔

ماسوا : ہر وہ شے، جو وجود باری تعالیٰ کے سوا ہو۔

شرح : ماسوا کے خیال میں مبتلا ہو کر وجودوں کی جو کثرت پیدا ہوئی وہ دراصل ایک وہم تھی۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ حقیقت ناشناس لوگ موت پر زندگی کا گمان کرتے رہے۔

مطلب یہ کہ ماسوا کے جھگڑوں میں پڑ کر خدا کے سوا بہت سے وجود تسلیم کر لینا ایسا ہی ہے، جیسے مُردوں کو زندہ سمجھ لیا جائے یا موت کو زندگی قرار دے لیا جائے۔

۳۔ **لغات** : **مغاک** : گڑھا۔

شرح : دل میں عشق کے جو داغ تھے، وہ اصل میں میرے اندھیرے گھر کے چراغ تھے اور قبر کے گڑھے تک ان سے میرا سینہ روشن رہا۔

۴۔ **لغات** : **رہن** : گِرو۔

شرح : باغِ ہستی کی بہار میں رات دن جو تغیرات ہوتے رہتے ہیں اور یہ بہار ہمیں جو نیرنگیاں دکھاتی رہتی ہے، ان کے بارے میں کچھ نہ پوچھو۔ حالت یہ ہے کہ ہم جن چیزوں کو گونا خوشی اور مسرت کا سامان سمجھتے رہے، انھیں ہی اکثر رنج و غم کے پاس گِرو رکھنا پڑا۔ یعنی یہاں کی خوشیاں عموماً رنج و غم ہی کا

موجب بستی رہیں۔

۵- لغات : واماندگی : پیچھے رہ جانا، بچھڑ جانا۔

شرح : اے سفر کے ساتھیوں کی جدائی کے دُکھ! تُو کب تک دل پر پتھر بن . . . رہے گا، اب رخصت ہو جا۔ جب تک ہم میں پیچھے رہ جانے کا غم کرنے کی . . . تھی، کرتے رہے، اب اس سے نجات چاہتے ہیں۔

○

درد ہو دل میں تو دوا کیجے
دل ہی جب درد ہو تو کیا کیجے

ہم کو فریاد کرنی آتی ہے
آپ سنتے نہیں تو کیا کیجے

اِن بتوں کو خدا سے کیا مطلب
توبہ توبہ، خدا خدا کیجے

رنج اٹھانے سے بھی خوشی ہوگی
پہلے دل درد آشنا کیجے

عرضِ شوخی، نشاطِ عالم ہے
حُسن کو اور خود نما کیجے

۱- شرح : علاج دل کے دُکھ درد کا کیا جا سکتا ہے۔ جب خود دل ہی درد بن جائے تو کوئی کیا کرے؟ دیکھیے، چند الفاظ میں مطلب کس سادگی سے بیان کر دیا گیا ہے اور کتنی بڑی حقیقت پر مبنی ہے! بیماری کا علاج کیا جاتا ہے، جب وجود ہی بیماری بن جائے تو کوئی کیا کرے گا؟

۲- شرح : یہ نہ سمجھیے کہ ہم فریاد

دشمنی ہو چکی بہ قدر وفا
اب حقِ دوستی ادا کیجیے
موت آتی نہیں کہیں غالبؔ
کب تک افسوس زیست کا کیجیے

نہیں کر سکتے یا اس کا طریقہ ہمیں معلوم نہیں، مصیبت یہ ہے کہ آپ سنتے نہیں، پھر ہمارے فریاد کرنے سے کیا حاصل؟ آپ ہی بتائیے کہ ہم کیا کریں؟

۳۔ شرح : بھلا یہ سنگ دل حسین بھی خدا کو مانتے ہیں؟ توبہ توبہ! خدا خدا کیجیے! ان کے انداز و اطوار ہی سے ظاہر ہے کہ نہ یہ خدا کے قائل ہیں اور نہ ان سے خدا ترسی کی امید رکھنی چاہیے۔

۴۔ شرح : اگر دل کو درد کا خوگر بنا لیا جائے تو جو رنج پہنچے گا، وہ خود بخود خوشی کا باعث بن جائے گا۔ یہ وہی مضمون ہے، جو دوسری جگہ یوں کہا گیا ہے!

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یہ کوئی خیالی بات نہیں، حقیقت ہے۔ انسان کے تمام احساسات اس کی عادت پر موقوف ہیں۔ اگر وہ خوشی کا عادی ہے تو رنج پہنچنے پر رنجیدہ ہوگا۔ اگر رنج کا خوگر ہے تو اسے غم سے کوئی آزار نہ پہنچے گا، بلکہ خوشی ہوگی، جو کچھ پیش آ رہا ہے، عین عادت کے مطابق ہے۔

۵۔ شرح : اے محبوب! آپ کی طرف سے شوخی کا اظہار ہو تو پوری کائنات میں شادمانی کی لہریں دوڑ جاتی ہیں۔ شوخیِ حسن کی خود نمائی کا کرشمہ ہے۔ نشاطِ عالم کی خاطر اسے اور خود نما کیجیے۔

۶۔ شرح : ہماری وفاداری کی جتنی بساط تھی، اس کے موافق تو

آپ دشمنی کر چکے، اب دوستی کا حق بھی تو ادا ہونا چاہیے۔

مطلب یہ کہ آپ نے دشمنی سے ہماری وفاداری کا امتحان تو کر لیا اور اس امتحان کا کوئی پہلو اٹھا نہ رکھا۔ اب دوستی کا بھی تو کوئی سلسلہ ہونا چاہیے یا ساری عمر آزمائش ہی میں گزر جائے گی؟

۷۔ **شرح** : اے غالب! رنج و غم سے بھری ہوئی زندگی کا افسوس کب تک کریں! کہیں یوں بھی موت آتی ہے؟ وہ تو بہر حال وقت پر آئے گی، لہٰذا رنج و غم کا قصہ ختم کرو۔

○

سکوت و خامشی اظہارِ حالِ بے زبانی ہے
کمینِ درد میں پوشیدہ رازِ شادمانی ہے

عیاں ہیں حال و قالِ شیخ سے اندازِ دلچسپی
مگر رندِ قدح کش کا ابھی دورِ جوانی ہے

ثباتِ چند روزہ، کارفرمائے غم و حسرت
اجل سرمایہ دارِ دورِ عیش و کامرانی ہے

گدازِ داغِ دل شمعِ بساطِ خانہ ویرانی
تپش گاہِ محبت میں فروغِ جاودانی ہے

وفورِ خود نمائی رہنِ ذوقِ جلوہ آرائی
یہ وہم کامرانی جذبِ دل کی شادمانی ہے

۱۔ **شرح** : بے زبانی کا حال بیان کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ انسان خاموش رہے۔ یوں بے زبانی کا اظہار بہترین طریق پر ہو جاتا ہے۔ درد کی گھات میں خوشی کا راز چھپا ہوا ہے۔

مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم سراپا درد میں، اپنا حال بیان نہیں کر سکتے۔ اس لیے چپ ہیں کہ اسی

شرح: ہمارے دل کی کیفیت ٹھیک داغ ہو سکتی ہے،

دل حرماں لقب کی داد دے اے چرخ بے پروا!
بر غارت دادۂ رخت و متاعِ کامرانی ہے۔

لیکن اتنا جانتے ہیں کہ خوشی درد ہی کے پردے میں چھپی ہوئی ہے۔

۲۔ شرح : شیخ کی کیفیت، وضع و لباس، طور طریق اور گفتگو کا انداز بڑا دل لبھانے والا ہے۔ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ان حضرت کی نصیحت سنیں اور انھیں کا طور طریق اختیار کریں، لیکن کیا کیا جائے، ابھی شراب نوش رند کی جوانی کا عالم ہے اور اس عالم میں شیخ کی پیروی کرنا بالکل مناسب نہیں۔

۳۔ شرح : چند روزہ زندگی میں غم و حسرت کی کارفرمائی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور موت عیش و کامرانی کے دور کی سرمایہ دار ہے۔ یعنی زندگی سراسر غم ہے اور موت سراسر عیش و کامیابی۔

۴۔ شرح : داغِ دل پگھل پگھل کر گھر کی بربادی کے لیے چراغ مہیا کرتا ہے۔ حقیقتِ حال کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو محبت کی تپش گاہ میں انسان کے لیے دائمی اجالے کا سامان ہے۔

محبت ہوگی تو دل پر داغ ہوگا۔ داغ کی جس روشنی کا سامان بہم پہنچائے گی، لہٰذا محبت ہی انسان کے اندھیرے دل میں وہ ضیا پیدا کرتی ہے۔ جو کبھی ماند نہیں پڑتی۔

۵۔ شرح : ہمارے محبوب کو خود نمائی کے شوق کی فراوانی نے جلوہ آرائی پر آمادہ کر رکھا ہے۔ ہمارے دل کی کشش اس پر خوش ہے کہ اس کا مقصد حاصل ہو رہا ہے، حالانکہ یہ سراسر وہم ہے۔

مطلب یہ کہ محبوب کی تمام جلوہ آرائیاں اس کے ذوقِ خود نمائی کا نتیجہ ہیں۔ ہمارے جذبِ دل کو اس سے کوئی تعلق نہیں مگر ہم وہم میں مبتلا ہو کر اسے اپنی کامیابی سمجھ کر پھولے نہیں سماتے۔

۱۱۔ لغات : حرماں لقب : وہ، جسے محرومی و نامرادی کا لقب مل گیا ہو، یعنی سراپا محرومی و نامرادی۔

شرح : اے بے پروا آسمان! ہمارے اُس دل کی تو داد دے، جو سراپا محرومی و نامرادی بن گیا ہے اور کامرانی کا سروسامان بالکل لُٹا بیٹھا ہے۔

○

کس کی برقِ شوخیِ رفتار کا دلدادہ ہے
ذرہ ذرہ اس جہاں کا اضطراب آمادہ ہے

ہے غرورِ سرکشی صورت نمائے عجز بھی
منقلب ہو کر بسانِ نقشِ پا افتادہ ہے

خانہ ویراں سازیِ عشقِ جفا پیشہ نہ پوچھ
نامرادوں کا خطِ تقدیر تک بھی سادہ ہے

خود نشاط و سرخوشی ہے آمدِ فصلِ بہار
آج ہر سیلِ رواں عالم میں موجِ بادہ ہے

زندگانی رہبرِ راہِ فنا ہے اے اسدؔ!
ہر نفس ہستی سے تا ملکِ عدم اک جادہ ہے

۱۔ لغات : اضطراب آمادہ : آمادۂ اضطراب، بیقرار و مضطر۔

شرح : اس دنیا کا ذرہ ذرہ جو سراپا اضطراب بنا ہُوا ہے تو یہ کس کی شوخیِ رفتار کی بجلی پر فریفتہ ہے؛ مطلب یہ کہ دنیا کے ذرّے ذرّے میں جو بے پناہ تڑپ پائی جاتی ہے، وہ ضرور کسی کی شوخیِ رفتار کی بجلی کا کرشمہ ہے،

لیکن وہ کون ہے ؟ ظاہر ہے کہ یہاں اشارہ محبوبِ حقیقی کی طرف ہے۔

۲۔ **شرح** : سرکشی کا عذر درعاجزی کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے۔ جب وہ پلٹتا ہے تو نقشِ قدم کی طرح زمین پر گر جاتا ہے۔

۳۔ **لغات** : خانہ ویراں سازی : گھر برباد کر دینا۔

شرح : عشق بھی ظلم و ستم میں کسی سے کم نہیں۔ اس کی کیفیت کچھ نہ پوچھیے۔ اس نے ہزاروں گھر ویران کر ڈالے۔ حد یہ کہ نامرادوں کی قسمت کا خط بھی بالکل سادہ ہے، یعنی اس میں کوئی رنگ، کوئی دلکشی اور کوئی جاذبیت نہیں۔

۴۔ **شرح** : فصلِ بہار کا آنا بجائے خود عیش و مستی کا پیغام ہے۔ بہار کی آمد پر دنیا میں جہاں کوئی سیل بہتا نظر آئے گا، سمجھ لینا چاہیے کہ وہ شراب کی لہر ہے۔ یعنی بہار ذرّے ذرّے میں نشاط و سرخوشی پیدا کر دیتی ہے، یہاں تک کہ سیل بھی، جو بربادی کا ایک عامل ہے، شراب بن جاتا ہے۔

۵۔ **شرح** : اے اسدؔ! زندگی فنا کے راستے پر مسافر کی طرح چلی جا رہی ہے اور انسان جو سانس لیتا ہے، وہ ہستی سے عدم تک ایک راستہ ہے۔

ہر سانس کو عدم کی طرف راستہ قرار دینا اس اعتبار سے صحیح ہے کہ اسی طرح سانس لیتا ہوا انسان فنا کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ سانس ختم ہوتے ہی آخری منزل آ جاتی ہے۔

○

اس جور و جفا پر بھی، بدظن نہیں ہم تجھ سے
کیا طرفہ تمنّا ہے، امیدِ کرم تجھ سے
اُمیدِ نوازش میں، کیوں جیتے ہیں ہم آخر
سہتے ہی نہیں کوئی جب درد و الم تجھ سے

۱۔ **شرح** : ہم پر انتہائی جور و ظلم ہو رہے ہیں، لیکن تیرے متعلق دل میں کوئی بدگمانی پیدا نہیں

وارفتگیِ دل ہے، یا دستِ تصرّف ہے
ہیں اپنے تخیّل میں، دن رات ہم تجھ سے

یہ جور و جفا سہنا، پھر ترکِ وفا کرنا
اے ہرزہ پژوہی بس، عاجز ہوئے ہم تجھ سے

غالب کی وفاکیشی اور تیری ستم رانی
مشہورِ زمانہ ہے، اب کیا کہیں ہم تجھ سے

ہوا اور تجھ سے لطف و کرم کی امید بدستور وابستہ ہے۔ مقامِ حیرت ہے کہ یہ کتنی عجیب تمنّا ہے!

مطلب یہ کہ زندگی میں کبھی ایک لمحے کے لیے بھی راحت نصیب نہ ہوئی۔ برایں ہمہ یہی بکتے رہے کہ جو کچھ ہے، ہمارے اپنے اعمال کی سزا ہے۔ تیری طرف سے کبھی کوئی بدگمانی پیدا نہ ہوئی۔ اگرچہ تجھ سے لطف و کرم کی اُمید عجیب سی معلوم ہوتی ہے، لیکن بدستور قائم ہے۔

۲۔ شرح : خود ہی سوال کرتے ہیں کہ اے خدا! جب ہم تیری طرف سے کوئی رنج و غم ہی برداشت نہیں کرتے تو آخر تجھ سے لطف و کرم کی امید پر کیوں زندگی بسر کر رہے ہیں؟ لُطف کی اُمید تو اسی کو ہو سکتی، جو ظلم سہے۔

۳۔ شرح : ہم اپنے خیال میں رات دن تجھ سے ملے رہتے ہیں۔ معلوم نہیں، یہ ہمارے دل کی وارفتگی اور دیوانگی ہے یا یہ سب کچھ کسی قوت کے تصرّف کا نتیجہ ہے۔

۴۔ لغات : ہرزہ پژوہی : بیہودہ جستجو، لغو خیال۔

شرح : اتنے ظلم و جور سہ لیے، پھر وفا کے راستے سے ہٹ جانے کی فکر ہوئی۔ اے بیہودہ فکر! الگ ہو، ہم تیرے ہاتھوں عاجز آ گئے۔
مطلب یہ کہ جور و جفا برداشت کر چکنے کے بعد وفا سے دست بردار ہونا سراسر لغو خیال ہے۔

۵ - شرح : غالبؔ وفادار ہے اور تو نے ظلم و جور میں کبھی کمی نہیں کی - دونوں باتیں زمانہ بھر میں مشہور ہیں - ہمارے لیے اس باب میں کچھ کہنے کی کیا ضرورت ہے ؟

○

نالے دل کھول کے دو چار کروں یا نہ کروں
یہ بھی اے چرخ ستمگار! کروں یا نہ کروں

۱ - شرح : اے ظالم آسمان! میں دو چار نالے کروں یا نہ کروں ؛ اتنے ظلم سہے ، اتنے دُکھ اٹھائے ، اب یہ اجازت بھی ہے یا نہیں ؟

مجھ کو یہ وہم کہ انکار نہ ہو جائے کہیں
ان کو یہ فکر کہ اقرار کروں یا نہ کروں ؟

لطف جب ہو کہ کروں غیر کو بھی میں بدنام
کہیے کیا حکم ہے سرکار! کروں یا نہ کروں

۲ - شرح : میں نے محبوب سے وصل کا سوال کر دیا ، ساتھ ہی دل پہ یہ وہم سوار ہو گیا کہ کہیں انکار نہ کر دیں - وہ اس فکر میں پڑ گئے کہ اس سوال کے جواب میں اقرار کروں یا نہ کروں ؟

۳ - شرح : مجھ سے تو آپ کو راہ و رسم پسند نہیں اور غیر سے میل جول جاری ہے - مزہ اُس وقت آئے ، جب میں آپ کے ساتھ غیر کو بھی بدنام کروں - فرمائیے سرکار! کیا حکم دیتے ہیں ؛ ایسا کروں یا نہ کروں ؟

○

نہ پوچھ حال اس انداز ، اس عتاب کے ساتھ
لبوں پہ جان بھی آ جائے گی جواب کے ساتھ

۱ - شرح : اے محبوب ! تو غصہ بھرے انداز

مجھے بھی تا کہ تمنّا سے ہو نہ مایوسی
ملو رقیب سے، لیکن ذرا حجاب کے ساتھ

نہ ہو بہ ہرزہ روا دارِ سعی بیہودہ
کہ دورِ عیش ہے مانا خیال و خواب کے ساتھ

بہر نمط غمِ دل باعثِ مسرّت ہے
نموِ حیرتِ دل ہے ترے شباب کے ساتھ

. . . .

سکونِ دل کو تعلّق ہے اضطراب کے ساتھ
لگاؤ اس کا ہے باعث قیامِ ہستی کا

ہَوا کو لاگ بھی ہے کچھ مگر حباب کے ساتھ
ہزار حیف کہ اتنا نہیں کوئی غالبؔ!
کہ جاگنے کو ملا دیوے آکے خواب کے ساتھ

میں میرا حال نہ پوچھو۔ اگر جواب دوں تو اس کے ساتھ جان بھی لبوں پر آجائے گی۔

۲۔ شرح : اگر تم رقیب سے ملنے پر تُلے بیٹھے ہو تو بہتر ہے ملو، لیکن ذرا حجاب اختیار کر لو تا کہ میں بالکل ہی مایوس نہ ہو جاؤں، یہاں تک کہ تمہاری تمنا سے بھی ہاتھ دھو بیٹھوں۔

۳۔ شرح : ایک بیہودہ اور رائگاں کوشش میں بے فائدہ مصروف رہنے سے کیا حاصل! یہ حقیقت ہے کہ عیش کا زمانہ خیال یا خواب سے مشابہ ہے۔ یعنی اس دنیا میں عیش کے لیے خیال و خواب کی طرح کوئی ثبات و قیام نہیں۔

۴۔ لغات : بہ ہر نمط : ہر صورت میں، ہر طرح۔

شرح : غمِ دل کے لیے ہر حال میں باعثِ راحت ہے، کیونکہ جیسے جیسے تیرا شباب ترقی کر رہا ہے، ویسے ویسے میرے دل کی حسرت

بڑھ رہی ہے۔

۵۔ **شرح** : پہلا مصرع پڑھا نہیں گیا، دوسرے مصرع کا مطلب ہے کہ دل کے سکون کو اضطراب و پریشانی سے تعلق ہے۔

۶۔ **شرح** : ہوا کا لگاؤ ہی بُلبُلے کے لیے زندگی کا باعث ہے۔ یعنی ہوا ہی کی بدولت بُلبُلا پیدا ہوتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ لگاؤ کے ساتھ ہوا کو بُلبُلے سے لاگ بھی یعنی دشمنی بھی ہے، کیونکہ ہوا ہی اسے توڑ بھی دیتی ہے۔

۷۔ **شرح** : اے غالبؔ ! ہزار افسوس کہ اس دنیا میں کوئی ایسا وجود نظر نہ آیا، جو جاگنے کو سونے کے ساتھ ملا دے۔

مطلب یہ کہ شبِ فراق میں عاشق کو نیند نہیں آتی۔ نہ رات ختم ہوتی ہے، نہ دن کو قرار آتا ہے، نہ نیند کا جادو چلتا ہے۔ اس حالت میں پریشان ہو کر کہتا ہے: کاش کوئی ایسا دردمند حکیم ہوتا، جو میری بیداری کو نیند سے ملا دیتا، یعنی میں سو جاتا تاکہ کچھ مدت کے لیے پریشانیوں سے نجات پاتا۔

وضعِ نیرنگیِ آفاق نے مارا ہم کو
ہو گئے سب ستم و جَور گوارا ہم کو

دشتِ وحشت میں نہ پایا کسی صورت سے سراغ
گردِ جولانِ جنوں تک نے پکارا ہم کو

عجز ہی اصل میں تھا حاصلِ صد رنگ عروج
ذوقِ پستی مصیبت نے ابھارا ہم کو

۱۔ **شرح** : ہمیں دنیا کے تغیرات کی کیفیت نے مار ڈالا۔ اب ہر قسم کے ظلم و جور ہمیں گوارا ہیں اور ہم انھیں خوشی خوشی برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں جب تک یہ

ضعف مشغول ہے بیکار بہ سعی بیجا
کرچکا جوشِ جنوں اب تو اشارا ہم کو
صورِ محشر کی صدا میں ہے فسونِ امید
خواہشِ زیست ہوئی آج دوبارا ہم کو
تختۂ گور سفینے کے مماثل ہے، اسدؔ!
بحرِ غم کا نظر آتا ہے کنارا ہم کو

اندازہ نہ تھا کہ دنیا کی کسی چیز کو ثبات نہیں تو ہر تکلیف وہ ولتقعے پر پریشان ہوتے تھے۔ اب ہم پر روشن ہو چکا ہے کہ یہاں کی کسی بھی حالت کو قرار نہیں۔ زمانہ گردش میں ہے اور برابر رنگ بدلتا چلا جا رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے رنج و غم کو بھی ایک عام چیز مان لیا اور بے تکلف سب کچھ برداشت کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اقبالؔ کیا خوب کہہ گئے ہیں:

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

۲- **شرح :** ہم بیخود ہو کر بیابانِ جنون میں پہنچ گئے اور ایسے گم ہوئے کہ نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ بیخودی کے عالم میں چلتے چلتے جو گرد ہم نے اڑائی تھی، وہ بھی پکارتی رہی، مگر کوئی جواب نہ ملا اور ہمارا کچھ پتا نہ چلا۔

۳- **شرح :** ہمارا عجز و نیاز ہی اصل میں ہماری ہر قسم کی برتری کا ذریعہ اور وسیلہ تھا۔ مصیبتوں نے ہم میں پستی کا جو ذوق پیدا کر دیا تھا، وہی ہمارے ابھرنے کا سہارا بن گیا اور ترقی کرتے کرتے ہم کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔

۴- **شرح :** بیشک ہم ضعیف ہیں، لیکن جوشِ جنوں کا اشارہ پا لیے ہی صحرا گردی کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ اب ضعف ہمیں روکنے کی جو بھی کوشش کرے گا، وہ بالکل بے سود اور بے حاصل ہوگی۔

کنایہ یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا وجود ذاتی ضعف و طاقت پر موقوف نہیں، بلکہ اس کی ہر سرگرمی جوشِ جنون کا نتیجہ ہے۔ گویا ہماری ظاہری حیثیت پر نہ جانا چاہیے، معنوی قوت پر نظر رکھنی چاہیے۔

۵۔ **شرح** : قیامت کے دن صُور پھونکا گیا تو میں بھی قبر سے دوبارہ زندگی کی اُمید سے کراٹھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ صُور کی آواز میں اُمید کا کوئی جادو بھرا تھا، جس نے میری وہ مایوسی اور افسردگی بالکل ختم کر دی، جو زندگی کے مصیبت خیز حوادث و تجربات کا نتیجہ تھی۔

۶۔ **لغات** : مماثل : مانند، مشابہ۔

شرح : اے اسؔد! قبر میں جو تختے لگائے جاتے ہیں، وہ کشتی سے ملتے جلتے نظر آتے ہیں، جس میں بیٹھتے ہی غم کے دریا کا کنارہ نظر آگیا۔

مطلب یہ کہ موت ہی پر اس دُنیا میں غم ختم ہوتے ہیں، جیسے کہ دوسری جگہ کہا:

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

حسن بے پروا گرفتارِ خود آرائی نہ ہو
گر کمیں گاہِ نظر میں دِل تماشائی نہ ہو
ہیچ ہے تاثیرِ عالم گیریِ ناز و ادا
ذوقِ عاشق گر اسیرِ دامِ گیرائی نہ ہو

۱۔ **شرح** : حُسن بالکل بے نیاز ہے، پھر بھی ہر وقت آرائش میں مصروف ہے۔ یہ آرائش ہرگز نہ ہوتی، اگر نظر کے

خود گدازِ شمع، آغازِ فروغِ شمع ہے
سوزشِ غم در پئے ذوقِ شکیبائی نہ ہو

تار تارِ پیرہن ہے اِک رگِ جانِ جنوں
عقلِ غیرت پیشہ حیرت سے تماشائی نہ ہو

بزمِ کثرت، عالمِ وحدت ہے بینا کے لیے
بے نیازِ عشق، اسیرِ زورِ تنہائی نہ ہو

ہے محبت رہزنِ ناموسِ انساں اے اسدؔ!
قامتِ عاشق پہ کیوں ملبوسِ رسوائی نہ ہو

ساتھ دل گھات میں بیٹھ کر حسن کا نظارہ نہ کرتا۔

مطلب یہ کہ حسن کو زیادہ سے زیادہ آراستہ ہونے اور بننے ٹھننے کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ عشق موجود ہے، اگرچہ کھل کر سامنے نہیں آتا اور نظر کی گھات میں بیٹھ کر دیکھتا ہے۔ اس شعر میں بھی وہی مشہور قول پیش نظر رہا، جو بہ طور حدیث بیان کیا جاتا ہے کہ میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ دل چاہا کہ مجھے پہچانا جائے۔ یوں عشق پیدا ہوا کہ حسن کی معرفت کمال پر پہنچ جائے۔ یہ حسن کی خود آرائی تھی، اور کل یوم ہو فی شان سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ خود آرائی بدستور جاری ہے۔

۲۔ لغات : گیرائی : گرفت۔

شرح : حسن کے ناز و ادا نے زمانہ بھر پر اپنی قوت کا سکہ بٹھا رکھا ہے، لیکن اگر عشق کا ذوق اس جال کی گرفت میں آنے کے لیے تیار نہ ہو تو ناز و ادا کی عالمگیری بالکل ہیچ رہ جائے گی۔

مطلب یہ کہ حسن کی جاذبیت اور کشش صرف عشق کی بدولت ہے۔ اگر کوئی حسن کے دام میں پھنسنے کے لئے تیار نہ ہو تو اسے کون پوچھے گا اور اس کے ناز و ادا کی قدر و قیمت کیا رہ جائے گی؟

۳۔ لغات : شکیبائی : صبر، ضبط۔

شرح : غم کا سوز کیوں صبر و شکیب کا ذوق پیدا کرنا چاہتا ہے ؛ یعنی اسے کیوں صبر کی آرزو ہو ؟ کیا یہ حقیقت معلوم نہیں کہ شمع کا پگھلنا ہی اس کے لیے روشنی کا سروسامان ہے ؟ جب گداز کے بغیر روشنی نصیب نہیں ہو سکتی تو غم کی سوزش کیوں صبر کی طرف مائل ہو ؟ سوزش بدستور جاری رہنی چاہیے تاکہ ہمیں بھی شمع کی طرح روشنی مل جائے اور ہم بھی معرفت تک پہنچ جائیں۔

۴۔ شرح : ہمارے لباس کا ایک ایک تار جنوں کے لیے رگِ جان کی حیثیت رکھتا ہے، یعنی جنوں زندہ ہی اس طرح رہ سکتا ہے کہ لباس تار تار رہے۔ یہ منظر دیکھ کر عقل کو بڑی غیرت آتی ہو گی اور وہ اس پر سراپا حیرت ہے، لیکن یہ کام اُس سے بن نہیں آ سکتا، اس لیے حیرانی سے دیکھنے کی اسے کوئی ضرورت نہیں۔

۵۔ شرح : اگر کسی کے پاس حقیقت کو دیکھنے والی آنکھ ہو تو کثرت کی محفل یعنی کائنات بھی وحدت کی دنیا ہے، یعنی حقیقت بیں کو ہر جگہ وحدت ہی وحدت نظر آتی ہے۔ جسے عشق کی بے نیازی مل گئی ہے اسے خلوت کے گوشے میں بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ جلوت میں بھی ہر طرف وحدت ہی دیکھ رہا ہے۔

۶۔ شرح: اے اسدؔ! محبت انسان کے نام و ننگ اور عزت کے لیے قزاق کا حکم رکھتی ہے یعنی محبت ہو جائے تو ناموس و ننگ کا کوئی خیال نہیں رہتا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ عاشق کے بدن پر رسوائی کا لباس نہ ہو؟ ننگ و ناموس ختم ہوئے تو رسوائی کے سوا کیا باقی رہ جاتا ہے؟

خزینہ دارِ محبت ہوئی ہوائے چمن
بنائے خندۂ عشرت ہے ابر بنائے چمن

بہ ہرزہ سنجی گلچیں، نہ کھا فریبِ نظر
ترے خیال کی وسعت میں ہے فضائے چمن

یہ نغمہ سنجی بلبل متاعِ زحمت ہے
کہ گوشِ گل کو نہ راس آئے گی صدائے چمن

صدائے خندۂ گل تا قفس پہنچتی ہے
نسیمِ صبح سے سنتا ہوں ماجرائے چمن

گل ایک کاسۂ دریوزۂ مسرت ہے
کہ عندلیب نوا سنج ہے گدائے چمن

حریف نالۂ پردرد ہے، تو ہو، پھر بھی
ہے اک تبسم پنہاں ترا بہائے چمن

بہار راہرو جادۂ فنا ہے، اسدؔ!
گل شگفتہ ہیں گویا کہ نقش پائے چمن

۱۔ شرح :
باغ کی ہوا اپنے دامن میں محبت کا خزانہ لیے ہوئے ہے۔ عیش و عشرت کی شادمانی کی بنیاد باغ ہی کی بنیاد پر رکھی گئی ہے۔

۲۔ لغات :
ہرزہ سنجی : بیہودہ گوئی اور عبث کاری۔

شرح :
تو گلچیں کی بیہودگی کے دھوکا نہ کھا۔ تیرے خیال کی وسعت میں چمن کی فضا بسی ہوئی ہے۔

۳۔ شرح :
بلبل خواہ ترانے گا گا کر مشقت اٹھا رہی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ چمن سے جو صدائیں اٹھتی ہیں اور وہ بلبل ہی کے ترانے ہیں، پھول کے کان کو راس نہ آئیں گی۔
مطلب یہ کہ بلبل گانے میں کتنی ہی مشقتیں اٹھائے، مگر اس کا گانا پھول کو گوارا نہ ہوگا۔ عاشقوں کا حال ہر جگہ یہی ہے۔

۴۔ لغات : دریوزہ : بھیک

شرح : پھول اصل میں خوشی کی بھیک مانگنے کا ایک کاسہ ہے اور گانے والی بلبل چمن میں بھکارن بن کر آئی۔

۵۔ شرح : اے محبوب! ممکن ہے، عاشق کا درد بھرا نالہ تیری پوشیدہ مسکراہٹ کا حریف بن سکے، لیکن اس میں کیا شبہ ہے کہ اس پوشیدہ مسکراہٹ کے بدلے میں پورا باغ بہ طور قیمت نذر کیا جا سکتا ہے۔

۶۔ شرح : اے اسد! بہار فنا کے راستے پر چلی جا رہی ہے۔ یہ جو کھلے ہوئے پھول ہیں، انھیں باغ کے پاؤں کا نقش سمجھنا چاہیے۔

کرم ہی کچھ سببِ لطف و التفات نہیں
انھیں ہنسا کے رُلانا بھی کوئی بات نہیں

. . . . نیروئے آفرینشِ غم
غرض کہ دل کی کسی شے کو بھی ثبات نہیں

کہاں سے لا کے دکھائے گی عمرِ کم مایہ
سیہ نصیب کو وہ دن کہ جس میں رات نہیں

زبان حمد کی خوگر ہوئی تو کیا حاصل
کہ تیری ذات میں شامل تری صفات نہیں

خوشی، خوشی کو نہ کہ، غم کو غم نہ جان، اسد!
قرار داخلِ اجزائے کائنات نہیں

۱۔ شرح : صرف لطف و کرم ہی محبوب کے، التفات کا نشان نہیں۔ وہ نوازشوں سے عاشق کو ہنسا لیتا ہے، پھر آناً فاناً ظلم و ستم ڈھا کر رُلا بھی دیتا ہے۔

۲۔ شعر ناقص نقل ہوا ہے، لہٰذا شرح نہیں ہو سکتی۔

۳۔ شرح : عمر کا سرمایہ تو بہت

ہی کم ہے۔ مجھ بدنصیب کو وہ ایسا دن کہاں سے لا کر دکھائے گی، جس کے ساتھ رات نہ ہو؟

مطلب یہ کہ اس دنیا کی کوئی خوشی پائدار نہیں۔ جس طرح ہر دن کے ساتھ رات ہے، اُسی طرح ہر خوشی کے ساتھ غم لگا ہوا ہے۔

۴۔ **شرح** : بیشک میری زبان حمد کی عادی ہو گئی ہے۔ اے باری تعالیٰ! میں ہمیشہ تیری حمد و ثنا کرتا رہتا ہوں، لیکن ایک چیز عرض کردوں کہ صرف ذات کی حمد کرتا ہوں، صفات کو ذات میں شامل نہیں سمجھتا۔

اس شعر میں توحید کا ایک اعلیٰ تصور پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مگر خالص ذات کی حمد ہو ہی نہیں سکتی۔ حمد ہو گی تو صفات ہی کی ہو گی۔ محض الحمدللہ کہے جانے سے بات نہیں بنتی، یہ بھی کہنا ہو گا کہ وہ جہانوں کا پروردگار ہے، رحمان و رحیم ہے، یوم جزا کا مالک ہے۔ اس اعتبار سے عدالت اُس کی صفت کمال ہے۔ یہی حال باقی صفات کا ہے۔

۵۔ **شرح** : اے اسد! خوشی کو خوشی نہ کر، غم کو غم نہ جان، کیونکہ ان میں سے کسی بھی شے کو پائداری نہیں، یہ سب بدلتی چلی جا رہی ہیں۔

حق یہ ہے کہ کائنات کے اجزا میں اور کچھ بھی ہو، مگر ثبات شامل نہیں، یعنی یہاں کوئی بھی چیز قائم و باقی نہیں۔

یہ وہی حقیقت ہے، جو شیلے نے اپنی نظم "تغیر" میں بیان کی اور اقبالؒ نے اسی خیال کو یہ لباس پہنایا:

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

جوں شمع ہم اک سوختہ سامانِ وفا ہیں
اور اس کے سوا کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہیں

۱۔ **شرح** : ہم شمع کی طرح دنیا کے سوختہ سامان

اِک سرِ حدِ معدوم میں ہستی ہے ہماری
سازِ دلِ بشکستہ کی بے کار صدا ہیں
جس رُخ پہ ہوں ہم سجدہ اِسی رُخ پہ ہے واجب
گو قبلہ نہیں ہیں مگر اک قبلہ نما ہیں
مت ہو جیو اے سیلِ فنا! ان سے مقابل
جانبازِ الم نقش بہ دامانِ بقا ہیں
پائی ہے جگہ ناصیۂ بادِ صبا پر
خاکسترِ پروانۂ جانبازِ وفا ہیں
ہر حال میں ہیں مرضیِ صیاد کے تابع
ہم طائرِ پر سوختۂ رشتہ بپا ہیں
اے وہم طرازانِ مجازی و حقیقی
عشاق فریبِ حق و باطل سے جدا ہیں
ہم بے خودیِ شوق میں کر لیتے ہیں سجدے
یہ ہم سے نہ پوچھو کہ کہاں ناصیہ سا ہیں
اب منتظرِ شوقِ قیامت نہیں، غالبؔ
دنیا کے ہر اک ذرے میں سو حشر بپا ہیں

ہیں، یعنی شمع روشنی کے لیے اپنے آپ کو جلا رہی ہے اور ہم وفا کے راستے میں اپنا ہر سامان نذرِ آتش کر چکے ہیں۔ بس اس کے سوا کچھ معلوم نہیں کہ ہم کیا ہیں۔

۱

۲۔ لغات:

معدوم: گُم شدہ۔

شرح:

ہماری ہستی اگر ہے تو ایسے مقام پر ہے، جو گم ہو۔ ہم ٹوٹے ہوئے دل کے ساز کی صدا ہیں اور بالکل بیکار ہیں۔

مطلب یہ کہ ٹوٹے ہوئے ساز سے جو صدا نکلتی ہے، اس میں کوئی لے اور کوئی سُر ہو ہی

نہیں سکتا، لہٰذا اسے بالکل بیکار سمجھنا چاہیئے۔

۳۔ شرح : ہم جس طرف بھی منہ کیے بیٹھے ہوں، اسی طرف ہمارے لیے سجدہ واجب ہے۔ بیشک ہم قبلہ نہیں کہ ہماری طرف سجدہ کیا جائے، لیکن قبلہ نما ضرور ہیں۔ یعنی قبلے کا پتا ہمیں سے مل سکتا ہے، اس لیے جس طرف ہمارا رُخ ہو، اسی طرف سجدہ کرنا چاہیے۔

۴۔ شرح : اے فنا کے سیل! اُن لوگوں کے روبرو نہ آنا، جو محبوب کے غم والم میں جان کی بازی لگا چکے ہیں۔ یاد رہے کہ وہ بقا کے دامن پر نقش کی طرح قائم ہو گئے ہیں، یعنی انھیں کوئی مٹا نہیں سکتا۔ وہ ہمیشہ اپنی جگہ استوار رہیں گے اور سیل اُن کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔

۵۔ شرح : ہم پروانے کی راکھ ہیں، جس نے وفا میں جان دے دی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس راکھ کو بادِ صبا کی پیشانی پر جگہ ملی۔

پیشانی پر جگہ ملنا انتہائی عظمت کا نشان ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ہوا چلے تو سب سے پہلے راکھ ہی کو اڑا لے گی۔

۶۔ شرح : ہم لوگ بہر حال میں صیاد کی مرضی کے پابند ہیں۔ ہم ایسے پرندے ہیں، جن کے پَر جلا دیئے گئے اور پاؤں میں دھاگا باندھ دیا گیا۔ گویا نہ اُڑ سکتے ہیں، نہ اِدھر اُدھر جا سکتے ہیں۔

میرزا کے نزدیک یہ زندگی کا نقشہ ہے۔

۷۔ شرح : اے مجاز اور حقیقت کے اوہام کی آرائش کرنے والو! تم حق اور باطل کا فریب کھا سکتے ہو، عاشق اس فریب سے بالکل الگ تھلگ ہیں۔ وہ حق اور باطل، نیک اور بد کے جھگڑے میں نہیں پڑتے۔ اُن کے نزدیک مجاز اور حقیقت میں امتیاز کی کوئی وجہ نہیں۔

۸۔ شرح: ہمیں عشق نے بے خود کر رکھا ہے، اپنے آپ کی خبر نہیں۔ اسی بے خودی میں سجدے بھی کر لیتے ہیں۔ البتہ ہم سے یہ نہ پوچھنا چاہیے کہ کہاں کہاں

سجدے کرتے ہیں، کس مقام پر پیشانی گھستے ہیں۔

۹۔ شرح : اب غالب کو شورِ قیامت کا کوئی انتظار نہیں رہا۔ کیونکہ اسی دنیا کے ذرّے ذرّے میں سیکڑوں محشر بپا ہیں۔ رات دن ان محشروں کے منظر دیکھنے کے بعد قیامت کے انتظار کی کون سی صورت باقی رہ گئی؟

آفت آہنگ ہے کچھ نالۂ بلبل، ورنہ
پھول ہنس ہنس کے گلستاں میں فنا ہو جاتا

کاش! ناقدر نہ ہوتا ترا اندازِ خرام
میں غبارِ سرِ دامانِ فنا ہو جاتا

یک شبہ فرصتِ ہستی ہے اک آئینۂ غم
رنگِ گل کاش! گلستاں کی ہوا ہو جاتا

متقل مرکزِ غم پر ہی نہیں تھے، ورنہ
ہم کو اندازۂ آئینِ فنا ہو جاتا

دستِ قدرت ہے مرا خشت بہ دیوارِ فنا
گر فنا بھی نہ میں ہوتا تو فنا ہو جاتا

حیرت اندوزیِ اربابِ حقیقت مت پوچھ
جلوہ اک روز تو آئینہ نما ہو جاتا

۱۔ لغات :

آفت آہنگ : جس کی ہر صدا آفت ڈھانے کا باعث ہو۔

شرح : بلبل کی آہ و فغاں آفت ڈھا رہی ہے، اس لیے پھول کھل کر نہیں ہنس سکتا۔ اگر بلبل کی آہ و فغاں نہ ہوتی تو باغ میں پھول اتنا ہنستا، اتنا ہنستا کہ دم توڑ دیتا۔

مطلب یہ کہ زندگی کا کوئی دائرہ اور کوئی حلقہ ایسا نہیں جس میں خوشی کے ساتھ رنج اور نشاط

کے ساتھ ملال نہ ہو۔ اس کائنات کا توازن اسی طرح قائم رہتا ہے کہ نہ صرف خوشی ہو، نہ صرف رنج ہو۔ دونوں میں سے کوئی ایک چیز بھی ہوتی تو اس حد پر پہنچ جاتی کہ زندگی قائم نہ رہ سکتی۔ دن کے ساتھ رات، گرما کے ساتھ سرما توازن کے لیے ہے۔ اسی طرح خندۂ گل کے ساتھ نالۂ بلبل رکھا تاکہ توازن میں خلل پیدا نہ ہو۔

۲۔ **شرح** : اے محبوب! اگر تیری رفتارِ ناز کا طور طریق عاشق کی ناقدری نہ کرتا تو وہ اب تک کبھی کا غبار بن کر دامانِ فنا کے ساتھ لگ جاتا، یعنی فنا ہو جاتا۔ مصیبت یہ ہے کہ تیرے اندازِ خرام نے اس کی قدر پہچانی اور وہ اب تک اسی امید پر زندہ ہے کہ کبھی نہ کبھی اسے تیرے خرام کی بدولت فنا کی منزل نصیب ہو ہی جائے گی۔

۳۔ **شرح** : پھول کے لیے زندگی کی مہلت صرف رات بھر کی ہے، یعنی شام کو کھلا اور صبح کو تازگی اور شادابی کی بہار دکھا کر رفتہ رفتہ بکھر گیا۔ یہ زندگی کی مہلت نہیں، بلکہ غم کا آئینہ ہے، کیونکہ رات بھر کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟ اب دل میں یہ آرزو پیدا ہو رہی ہے، کاش پھول کا رنگ باغ کی ہوا بن جاتا، کیونکہ باغ کو پھول کی مہلتِ ہستی کے مقابلے میں زیادہ پائداری حاصل ہے۔

۴۔ **شرح** : ہم غم کے مرکز پر پوری طرح استوار ہی نہیں ہوتے، یعنی اس مرکز سے بھی اِدھر اُدھر ہٹتے رہتے ہیں۔ اگر اس پر جمے رہتے تو ہمیں یہ اندازہ تو ہو جاتا کہ وفا کا طریقہ کیا ہے۔ گویا وفاداری کا طریقہ وہی نباہ سکتا ہے، جو غم کے مرکز پر مستقلاً قائم رہ سکے۔

۵۔ **شرح** : میرا دستِ جنون دیوارِ فنا کی ایک اینٹ ہے۔ اگر میں خود فنا نہ ہوتا تو اس حالت میں بھی لازم تھا کہ رفتہ رفتہ مٹ جاتا اور فنا کے گھاٹ اُتر جاتا۔

فنا کی ایک صورت یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو مٹا دے۔ دوسری صورت

یہ ہے کہ فنا کی دیوار چنی جا رہی ہے، اس میں اینٹ بن بن کر لگتا جائے جب دیوار مکمل ہو جائے گی تو فنا کا سفر بھی اختتام کو پہنچ جائے گا۔ یہی مضمون فارسی کے ایک شعر میں کسی نے بیان کیا ہے :

جان بہ جاناں دہ وگرنہ از تو بستاند اجل ،
خود تو منصف باش اے دل! ایں نکو یا آں نکو

۶۔ شرح : حقیقت شناس لوگ حیرت پر حیرت جمع کرتے جا رہے ہیں، یعنی ان پر برابر حیرت کی کیفیت طاری ہے۔ کاش محبوب کا جلوہ کسی نہ کسی دن انھیں آئینہ دکھا دیتا۔

مطلب یہ کہ جب تک محبوب کا جلوہ نظر نہ آئے، وہ حیرت ہی میں رہیں گے۔

بدتر از ویرانہ ہے فصلِ خزاں میں صحنِ باغ
خانۂ بلبل بغیر از خندۂ گل بے چراغ

پتا پتا اب چمن کا انقلاب آلودہ ہے
نغمۂ مرغِ چمن زا ہے صدائے بوم و زاغ

ہاں بغیر از خوابِ مرگ آسودگی ممکن نہیں
رختِ ہستی باندھ تا حاصل ہو دنیائے فراغ

شورِ طوفانِ بلا ہے خندۂ بے اختیار
کیا ہے گل کی بے زبانی کیا ہے یہ لالے کا داغ

۱۔ شرح : خزاں کے موسم میں باغ کا صحن ویرانے سے بھی زیادہ بے رونق ہو گیا ہے اور بلبل کا گھر پھول کی ہنسی کے بغیر بے چراغ معلوم ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ باغ ویران ہو گا تو نہ کلیاں نمودار ہوں گی، نہ پھول کھلیں گے،

چشمِ پرنم رہ، زمانہ منقلب ہے اے اسدؔ!
اب بھی ہے بس مے شادی سے پُر ہونا ایاغ

نہ بلبل کو اطمینان کا کوئی لمحہ نصیب ہوگا۔ اس کے گھر کی رونق پھولوں سے ہے۔ پھول نہ رہے تو گھر کی رونق نہ رہی۔

۲- شرح : باغ کا پتّا پتّا انقلاب سے بھرا ہوا ہے۔ یعنی زور شور سے اس کی حالت بدل رہی ہے۔ معلوم ہے کہ خزاں میں پت جھڑ شروع ہو جاتی ہے اور سبز پتّے رفتہ رفتہ زرد ہو ہو کر زمین پر گرتے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کیفیت کے لیے "انقلاب آلودہ" کی ترکیب ایجاد کی گئی۔

جو پرندے چمن میں پیدا ہوئے اور چمن ہی کے ترانے گاتے رہے، خزاں میں ان کا گانا ویسا ہی مکروہ معلوم ہوتا ہے، جیسے اُلّو اور کوّے کی آواز ہو۔ یہ بھی انقلابِ احوال ہی کی کیفیت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عیش و طرب کی جتنی چیزیں ہیں، ان کی رونق اور دلآویزی خاص قسم کی فضا پر موقوف ہے۔ مثلاً باغ میں سبزہ ہو، پھول ہوں، درخت ہرے بھرے ہوں تو ہر پرندے کا نغمہ خوشگوار معلوم ہوگا۔ یہ سب چیزیں ختم ہو جائیں اور بے رونقی چھا جائے تو بہتر سے بہتر نغمہ بھی دلآویزی کھو بیٹھے گا اور ناگوار معلوم ہوگا۔

میرزا نے غم و رنج اور افسردگی کی حالت میں خوشگوار چیزوں کے ناگوار ہونے کا ذکر اور جگہ بھی کیا ہے، مثلاً :

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

۳- شرح : جب تک انسان موت کی نیند نہ سو جائے، اس

کے لیے راحت پانا اور آسودہ رہنا بالکل غیر ممکن ہے۔ اگر تُو دنیا کے جنجال سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے تو تجھے چاہیے کہ زندگی کا سرو سامان باندھ کر یہاں سے رخصت ہو جائے۔

یہ بھی وہی بات ہے، جو پہلے کئی مرتبہ کہی جا چکی ہے، مثلاً:

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

۴۔ **شرح** : پھول اپنی خوشی اور اختیار سے نہیں ہنستے۔ یعنی ان کا کھلنا خود ان کے اختیار میں نہیں، بلکہ وہ کسی کے حکم اور کسی کے اشارے کے تابع ہیں۔ یہ کھلنا اور یہ ہنسنا اصل میں طوفانِ بلا کا شور ہے، جس نے پھول کو پنکھڑیوں کی زبانوں کے باوجود بے زبان اور دم بخود بنا رکھا ہے اور لالے کے سینے میں داغ پڑا ہوا ہے۔

۵۔ **لغات** : منقلب : الٹ پلٹ، تہ و بالا۔
ایاغ : پیالہ، شراب کا پیالہ۔

شرح : اے اسدؔ! زمانہ تہ و بالا ہو رہا ہے، تو اپنی آنکھ پُرنم رکھ یعنی اشکبار رہ۔ آج اس دنیا میں خوشی کی شراب سے پیالہ بریز رکھنے کا مطلب یہی ہے کہ آنکھیں آنسوؤں سے بھری رہیں۔ کیوں بھری رہیں؟ اس لیے کہ زمانہ ہر لحظہ تغیر میں ہے ہر چیز انتہائی تیزی سے بدلتی جا رہی ہے:

ہر شے مسافر، ہر چیز راہی

قصائد

(۱)

میکلوڈ صاحب کی خدمت میں

کرتا ہے چرخ روز بہ صد گونہ احترام
فرماں روائے کشورِ پنجاب کو سلام

حق گو و حق پرست و حق اندیش و حق شناس
نوّاب مستطاب، امیرِ شہ احتشام

جم رتبہ میکلوڈ بہادر کہ وقتِ رزم
ترکِ فلک کے ہاتھ سے وہ چھین لیں حسام

جس بزم میں کہ ہو انھیں آئینِ میکشی
واں آسمان شیشہ بنے آفتاب جام

چاہا تھا میں نے تم کو مہِ چار دہ کہوں
دل نے کہا کہ یہ بھی ہے تیرا خیالِ خام

دو رات میں تمام ہے ہنگامہ ماہ کا
حضرت کا عزّ و جاہ رہے گا علی الدّوام

تمہید:- ۱۳ر جنوری ۱۸۶۶ء کو پنجاب کے گورنر، ڈونلڈ میکلوڈ نے ریل کے افتتاح کے لیے دہلی میں ایک دربار منعقد کیا تھا۔ میرزا بھی اس میں شریک ہوئے تھے۔ اُس وقت صحت بہت کمزور ہو چکی تھی۔ ماسٹر پیارے لال آشوب، جو آگے چل کر رائے بہادر ہوئے، چلنے میں میرزا کو سہارا دیے ہوئے تھے۔ "خمخانۂ جاوید" کا بیان ہے کہ میکلوڈ صاحب نے میرزا سے پوچھا: یہ آپ کا بیٹا ہے؟

سچ ہے، تم آفتاب ہو، جس کے فروغ سے
دریائے نور ہے فلکِ آبگینہ فام
میری سنو، کہ آج تم اس سرزمین پر
حق کے تفضّلات سے ہو مرجعِ انام
اخبار لودھیانہ میں، میری نظر پڑی
تحریر ایک، جس سے ہُوا بندہ تلخ کام
ٹکڑے ہُوا ہے دیکھ کے تحریر کو جگر
کاتب کی آستیں ہے مگر تیغِ بے نیام
وُہ فرد جس میں نام ہے میرا غلط لکھا
جب یاد آگئی ہے، کلیجا لیا ہے تھام
سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم
لمبر رہا، نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام
ستّر برس کی عمر میں یہ داغِ جاں گداز
جس نے جلا کے راکھ مجھے کر دیا تمام
تھی جنوری مہینے کی تاریخ تیرھویں
استادہ ہو گئے لبِ دریا پہ جب خیام

کہا: بیٹا نہیں، مگر بیٹے سے زیادہ ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اہل مجلس نے ان کے وقار و احترام کا پورا خیال نہ رکھا اور پہلے دستور کے مطابق نشست بھی نہ ملی۔ لدھیانہ کے ایک اخبار میں جو روداد شائع ہوئی، اس میں میرزا کا نام تک غلط لکھا گیا۔ اس پر تقریب کے بعد میرزا نے یہ قصیدہ میکلوڈ کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ بھی سب سے پہلے "الہلال" (۱۷ جون ۱۹۱۳ء) ہی میں شائع ہوا تھا۔ قصیدے میں گورنر کا نام میکلیوڈ چھپا ہے، "الہلال" میں نام منکلوڈ تھا۔ شفہ (بیاض) میں بھی درج ہو۔ میرے نزدیک شعر میں میکلیوڈ آسکتا ہے۔

اُس بزمِ پُر فروغ میں اس تیرہ بخت کو
ملبرؔ ملا نشیب میں از روئے اہتمام
سمجھا اسے گراب، ہُوا پاش پاش دل
دربار میں جو مجھ پہ چلی چشمکِ عوام
عزت پہ اہلِ نام کی ہستی کی ہے بنا
عزت جہاں گئی تو نہ ہستی رہی، نہ نام
تھا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پر
اس ناز کا فلک نے لیا مجھ سے انتقام
آیا تھا وقت ریل کے کُھلنے کا بھی قریب
تھا بارگاہِ خاص میں خلقت کا ازدحام
اس کشمکش میں آپ کا مداح دردمند
آقائے نامور سے نہ کچھ کر سکا کلام
جو واں نہ کہہ سکا تھا وہ لکھا حضور کو
دیں آپ میری داد کہ ہوں فائز المرام
ملک و سپہ نہ ہو تو نہ ہو، کچھ ضرر نہیں
سلطانِ بر و بحر کے در کا ہوں میں غلام

اغلب ہے، غالب نے یہی لکھا ہو۔ نقل میں غلطی ہو گئی۔

۱۔ شرح : ولایت پنجاب کے حکمران کو آسمان ہر روز احترام کے سیکڑوں طریقوں سے سلام کرتا ہے۔

۲۔ لغات :
مستطاب : خوش، نیک، بزرگ۔

شرح : وہ حکمران، جو سچ کہتا ہے، سچ کا پابند ہے، سچ سوچتا، سچ پہچانتا ہے۔ وہ بزرگ نواب ہے اور اگرچہ امیر ہے لیکن اسے بادشاہ جیسی شان و شوکت حاصل ہے۔

۳۔ لغات :
ترکِ فلک : مریخ۔

وکٹوریہ کا دہر میں جو مدح خوان ہو
شاہانِ مصر چاہییے لیں عزت اس سے وام
خود ہے تدارک اس کا گورنمنٹ کو ضرور
بے وجہ کیوں ذلیل ہو غالبؔ ہے جس کا نام
امر جدید کا تو نہیں ہے مجھے سوال
بارے قدیم قاعدے کا چاہییے قیام
ہے بندہ کو اعادۂ عزت کی آرزو،
چاہیں اگر حضور تو مشکل نہیں یہ کام
دستورِ فنِ شعر یہی ہے، قدیم سے
یعنی دعا پہ مدح کا کرتے ہیں، اختتام
ہے یہ دعا کہ زیرِ نگیں آپ کے رہے
اقلیمِ ہند و سند سے تا ملکِ روم و شام

حُسام : جوہردار تلوار۔

شرح : جمشید جیسے مرتبے والا میکلوڈ بہادر، جو جنگ کے وقت مشاق کے باعث مریخ کے ہاتھ سے بھی تلوار چھین لے۔

۴۔ شرح : جس محفل میں وہ شراب پینے کا سروسامان آراستہ کریں وہاں شراب کی صراحی اور میکشی کا پیالہ بن جائے۔

۵۔۶۔ لغات : علی الدوام : ہمیشہ کے لیے۔

شرح : میری آرزو تھی کہ اے گورنر! آپ کو چودھویں کا چاند کہوں، لیکن دل نے کہا: تیرا یہ خیال بالکل خام ہے۔ دیکھو، چاند کے جلال و شکوہ کا ہنگامہ دو راتوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ پھر وہ گھٹنا شروع ہو جاتا ہے، لیکن میکلیوڈ بہادر کی عزت اور بلند مرتبہ ہمیشہ قائم رہے گا۔

۷۔ لغات : آبگینہ فام : کانچ کے رنگ کا۔

شرح : اے گورنر! ہرگز شبہ نہیں کہ آپ سورج ہیں، جس کی ضیا سے کانچ کے رنگ کا آسمان مدیاسے نُور بنا ہوا ہے۔

۸۔ لغات : تفضّلات : تفضّل کی جمع، لطف وکرم۔

مرجعِ انام : لوگوں کے لیے جائے رجوع۔

شرح : میری گزارش سنیے اور آج آپ اس سرزمین پر خدا کے لطف وکرم سے عام لوگوں کے لیے جائے رجوع ہیں، یعنی سب اپنی ضرورتوں کے لیے آپ کے پاس آرہے ہیں۔

۹۔ شرح : لدھیانہ کے اخبار میں ایک ایسی تحریر میری نظر سے گزری، جس سے مجھے بہت رنج پہنچا۔

۱۰۔ شرح : وہ تحریر دیکھ کر کلیجا ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ شاید لکھنے والے کی آستین، آستین نہ تھی، بلکہ تلوار کا نیام تھی۔

مطلب یہ کہ کاتب نے آستین میں خنجر چھپا رکھا تھا، اس سے جگر پارہ پارہ ہوگیا۔

۱۱۔ شرح : وہ ورق، جس میں نام تک میرا غلط لکھا ہے، جب کبھی یاد آگیا، کلیجا تھام لیا۔

۱۲۔ شرح : تمام حالات یکایک بالکل بدل گئے۔ نہ میرا درجہ باقی رہا، نہ نذر کا سلسلہ قائم رہ سکا، نہ خلعت کا انتظام نظر آتا ہے۔

۱۳۔ شرح : ستر برس کی عمر ہوگئی اور یہ جان کو گھلا دینے والا داغ میرے سینے پر لگا، جس نے مجھے جلا کر بالکل راکھ کر دیا۔

۱۴۔ اب دربار کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں:

لغات : خیام : خیمے کی جمع۔

شرح : جنوری ۱۸۶۳ء کی تیرھویں تاریخ تھی، جب دریا کے

کنارے خیمے کھڑے ہو گئے۔

۱۵- شرح : وہاں جشن کی جو محفل آراستہ ہوئی، اس میں مجھ سیاہ بخت کو انتظام کے مطابق نشست کا درجہ نشیب میں ملا۔ یعنی میرا درجہ منصب کے مقابلے میں نیچے تھا۔

۱۶- لغات : گِراب : یہ انگریزی لفظ گریپ (Grape) کو فارسی اور اردو کا لباس پہنایا گیا ہے۔ مراد ہے توپ کا وہ گولا، جس میں چھرّے گولیاں اور روال بھر کر چلاتے ہیں۔ وہ پھٹتا ہے تو شدید نقصان نہیں کرتا، لیکن نقصان کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔

چشمکِ عوام : عام لوگوں کے طنزیہ اشارے۔

شرح : اپنے اصل درجے سے کم درجے میں نشست ملی تو میں نے سمجھا کہ مجھ پر گراب پھینکا گیا۔ دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، کیونکہ دربار میں لوگوں نے آنکھوں سے طنزیہ اشارے شروع کر دیے۔

۱۷- شرح : نامور لوگوں کی ہستی کی بنیاد عزت ہے۔ جہاں عزت گئی، وہاں نہ ہستی رہی، نہ نام رہا۔

۱۸- شرح : مجھے شاعری میں درجۂ کمال پر ایک حد تک ناز تھا۔ اب آسمان نے مجھ سے اس ناز کا بدلا لے لیا۔

۱۹- شرح : ریل کے افتتاح کا وقت بھی بہت قریب آگیا تھا اور آپ کی خاص بارگاہ میں بے شمار خلقت جمع تھی۔

۲۰- شرح : اس کھینچ تان میں آپ کا یہ دردمند مدّاح نامور آقا سے کوئی بات نہ کر سکا۔

۲۱- لغات : فائز المرام : مقصد کو پہنچنے والا، کامیاب۔

شرح : جو کچھ وہاں عرض نہ کر سکا، وہ اب حضور کو لکھ رہا ہوں۔ آپ داد رسی فرمائیں تاکہ میں مقصد پا لوں۔

۲۲- شرح : اگر میرے پاس مُلک یا فوج نہیں تو نہ سہی، اس سے کیا نقصان پہنچتا ہے! میں تو سمندروں اور خشکیوں کے فرمانروا کے دروازے کا غلام ہوں۔

۲۳- لغات : وام : قرض

شرح : کون فرمانروا! وکٹوریا، وہ وکٹوریا کہ زمانے میں اس کی مدح کرنے والا ہو، لازم ہے کہ وقت کے بادشاہ عزت اس سے اُدھار لیں۔ مطلب یہ کہ عزت اسی کے پاس ہوگی، شاہانِ عصر جو کچھ لیں گے، وہ اس سے اُدھار لیں گے۔

۲۴- لغات : تدارُک : تلافی۔

شرح : حکومت کے لیے لازم ہے کہ مجھ پر جو زیادتی ہوئی ہے، اس کی تلافی کر دے۔ جس شخص کا نام غالب ہے، آخر وہ کیوں بے وجہ ذلیل ہو۔

۲۵- شرح : میں کسی نئی بات کے لیے سوال نہیں کر رہا، لیکن پہلے سے جو قاعدہ چلا آ رہا ہے، وہ تو قائم رہنا چاہیے۔

۲۶- لغات : اِعادہ : لوٹانا، بحال کرنا۔

شرح : میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ میری عزت بحال کی جائے۔ حضور چاہیں تو یہ کام ہرگز مشکل نہیں۔

۲۷- شرح : فنِ شعر کا طریقہ پہلے سے یہی چلا آتا ہے کہ مدح کو دعا پر ختم کرتے ہیں۔

۲۸- شرح : لہٰذا میری یہ دعا ہے کہ ہند اور سندھ سے روم اور شام تک ملک آپ کے زیرِ نگیں رہیں۔

(۲)

والی الور کی سالگرہ پر

تمہید :- یہ قصیدہ مہاراؤ راجا شیودان سنگھ کی مدح میں اس کی سالگرہ کے موقع پر کہا گیا تھا۔ میرزا کے کلیات میں فارسی کا ایک قصیدہ بھی موجود ہے، سالگرہ والے قصیدے سے کچھ مدت پیشتر کہا گیا تھا۔ اس میں وہ اپنی عمر تریسٹھ سال بتاتے ہیں اور کہتے ہیں، اٹھاون سال سے میں آپ کا حلقہ بگوش چلا آتا ہوں، کیونکہ پانچ سال کی عمر میں آپ کا ملازم ہو گیا تھا:

گنی ہیں سال کے رشتے میں بیس بار گرہ
ابھی حساب میں باقی ہیں، سو ہزار گرہ

گرہ کی ہے یہی گنتی کہ تا بہ روزِ شمار
ہُوا کرے گی ہر اک سال، پیش کار گرہ

یقین جان، برس گانٹھ کا جو ہے تاگا
یہ کہکشاں ہے کہ ہیں اس میں بے شمار گرہ

گرہ سے اَور گرہ کی امید کیوں نہ پڑے
کہ ہر گرہ کی گرہ میں ہیں تین چار گرہ

دکھا کے رشتہ کسی جوتشی سے پوچھا تھا
کہ دیکھو کتنی اٹھا لائے گا یہ تار گرہ

کہا کہ چرخ پہ ہم نے گنی ہیں نو گرجیں
جو یاں گنیں گے تو پاویں گے نو ہزار گرہ

خود آسماں ہے مہاراؤ راجا پر صدقے
کرے گا سیکڑوں، اس تار پر نثار، گرہ
وہ راؤ راجا بہادر کہ حکم سے جن کے
رواں ہوں تار پہ فی الفور دانہ وار، گرہ
انھیں کی سالگرہ کے لیے ہے سال بہ سال
کہ لائے غیب سے غنچوں کی نو بہار، گرہ
انھیں کی سالگرہ کے لیے بناتا ہے
ہوا میں بوند کو، ابرِ تگرگ بار، گرہ
انھیں کی سالگرہ کی یہ شادمانی ہے
کہ ہو گئے ہیں گہر ہائے شاہوار گرہ
انھیں کی سالگرہ کے لیے ہے یہ توقیر
کہ بن گئے ہیں ثمر ہائے شاخسار، گرہ
سن، اے ندیم! برس گانٹھ کے یہ تاگے نے
مجھے بتاؤں کہ کیوں کی ہے اختیار گرہ
پئے دعائے بقائے جناب فیض مآب
لگے گی اس میں ثوابت کی، استوار گرہ

زبس کہ گشت گوہر من در بہار عجم [illegible]
زبس کہ [illegible] بہ من بہ کار زار
دریغ سال دوی شد (۱۵) [illegible] حضور
رنگینی تخن [illegible] (۱۳) دو [illegible] فواد
دار (۱۴) بہ گوش [illegible] سال
اکنوں کہ عمر [illegible] در سال [illegible] نثار
کلاہ بود [illegible]
در غالب [illegible] مزار

شیوردان سنگھ کی
بیسویں سالگرہ پر اردو
کا قصیدہ پیش کیا گیا تھا
شیوردان سنگھ کے والد
راجا بینی سنگھ ۱۸۵۷ء
میں مر گئے تھے۔ اُس
وقت شیوردان سنگھ کی
عمر تیرہ برس کی تھی۔
ستمبر ۱۸۶۳ء میں بلوغ کو
پہنچ کر با اختیار ہوئے۔
غالباً اسی تقریب پر یہ
قصیدہ پیش کیا گیا۔

ہزاردانہ کی تسبیح چاہتا ہے یہی ،
بلا مبالغہ درکار ہے ہزار گرہ
عطا کیا ہے خدا نے یہ جاذبہ اس کو
کہ چھوڑتا ہی نہیں، رشتہ، زینہار گرہ
کشادہ رُخ نہ پھرے کیوں، جب اس زمانے میں
بچے نہ از پے بندِ نقابِ یار، گرہ
متاعِ عیش کا ہے قافلہ چلا آتا
کہ جادہ رشتہ ہے اور ہے شتر قطار، گرہ
خدا نے دی ہے وُہ غالب کو، دستگاہِ سخن
کروڑ، ڈھونڈ کے لاتا ہے خاکسار، گرہ
کہاں مجالِ سخن ؟ سانس لے نہیں سکتا
پڑی ہے، دل میں مرے، غم کی پیچ دار گرہ
گرہ کا نام لیا، پر نہ کر سکا کچھ بات
زباں تک آ کے، ہوئی اور استوار گرہ
کھُلے یہ گانٹھ تو البتہ دم نکل جاوے
بری طرح سے ہوئی ہے گلے کا ہار، گرہ

۱- شرح :
سال کے رشتے میں بیس گرہیں تو گن لی گئی ہیں، لیکن ابھی حساب میں ایک لاکھ گرہیں باقی ہیں۔ گویا مہاراج نے بیسویں سال میں قدم رکھ لیا، ابھی وہ ایک لاکھ سال جییں گے۔

۲- شرح :
سالگرہ کی گنتی اسی طرح ہوتی ہے کہ قیامت تک ہر سال کے شروع میں گرہ لگا کرے گی۔

۳- شرح :
تو یقین کرے کہ سالگرہ کا جو دھاگہ ہے، وہ دھاگہ نہیں، کہکشاں ہے اور اس میں بے شمار گرہیں پڑی ہوئی ہیں۔

۴- شرح :
ایک گرہ سے دوسری گرہوں کی امید کیوں

اِدھر نہ ہوگی توجہ حضور کی جب تک
کبھی کسی سے کھلے گی نہ زینہار، گرہ
دُعا ہے یہ کہ مخالف کے دل میں اندہِ بغض
پڑی ہے، یہ جو بہت سخت نابکار گرہ
دل اس کا پھوڑ کے نکلے، بہ شکلِ پھوڑے کی
خدا کرے کہ کرے اِس طرح اُبھار گرہ

نہ ہو، جب ہر گرہ کی گانٹھ میں تین چار گرہیں ہو گئی ہیں۔

۵-۶-:
جوتشی: جوتش کا علم جاننے والا، نجومی۔

شرح: سالگرہ کا رشتہ کسی نجومی کو دکھا کر پوچھا تھا کہ دیکھ کر بتاؤ، یہ تار کتنی گرہیں اٹھا لائے گا؟ اس نے جواب دیا کہ ہم نے آسمان پر تو گرہیں گنی ہیں۔ اگر زمین پر گنیں گے تو نو ہزار گرہیں پائیں گے۔

۷- شرح: خود آسمان مہاراؤ راجا پر قربان ہو رہا ہے۔ وہ اس تار پر سیکڑوں گرہیں نثار کر دے گا۔

۸- شرح: میری مراد اس مہاراؤ راجا سے ہے، جس کے حکم سے ڈھلکے ہر دانوں کی طرح فی الفور گرہیں چلنے لگیں۔

۹- شرح: وہی مہاراؤ راجا بہادر ہیں، جن کی سالگرہ کے لیے فصلِ بہار ہر سال غیب سے کلیوں کی گرہیں لاتی ہے۔

۱۰- شرح: وہی مہاراؤ راجا، جن کی سالگرہ کے لیے اولے برسانے والا بادل ہوا میں ہر بوند کو گرہ بنا رہا ہے۔

۱۱- شرح: وہی مہاراؤ راجا، جن کی سالگرہ کی خوشی میں اعلیٰ درجہ کے موتی گرہیں بن گئے ہیں۔

۱۲- شرح: اُن کی سالگرہ کی ایسی عزت ہے کہ شاخوں کے پھل گرہوں کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔

۱۳-۱۴- **لغات** : **ثوابت** : ثابت کی جمع۔ وہ ستارے جن کے متعلق خیال تھا کہ گردش نہیں کرتے اور اپنی جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کے مقابلے میں سیارے ہیں، جو گردش کر رہے ہیں۔

شرح : اے دوست! سن، تجھے بتاؤں کہ سالگرہ کے دھاگے نے گرہ کیوں اختیار کی؟ مقصد یہ تھا کہ اُس وجود کی زندگی کے لیے، جو فیض کا سرچشمہ ہے، دُعا مقصود ہے اور اس دھاگے میں دعا کے لیے گردش نہ کرنے والے تاروں کی پختہ گرہ لگ جائے گی۔

۱۵- **شرح** : وہ دھاگا اپنے لیے ہزار دانے کی تسبیح کا آرزو مند ہے اور مقصد یہ ہے کہ اس میں بلا مبالغہ ہزار گرہیں درکار ہیں۔

۱۶- **لغات** : جاذبہ : کشش کی قوت۔

شرح : خدا نے سالگرہ کے رشتے کو کشش کی وہ قوت عطا کی، ہے کہ وہ گرہ کو اپنی طرف کھینچے لیے آتا ہے اور چھوڑتا ہی نہیں۔

۱۷- **شرح** : ہمارے زمانے میں محبوب کے بندِ نقاب کے لیے بھی کوئی گرہ باقی نہیں رہی۔ پھر کیوں نہ وہ چہرہ کھلے پھرے!

۱۸- **شرح** : سالگرہ کا جو دھاگا ہے، اسے راستہ فرض کر لیں اور گرہوں کو اونٹوں کی قطار قرار دے لیں تو سمجھنا چاہیے کہ ایک قافلہ عیش و نشاط کا مال متاع لیے آتا ہے۔

۱۹، ۲۰- **شرح** : اللہ تعالٰی نے غالب کو شعر و سخن پر وہ قدرت عطا کی ہے کہ یہ خاکسار کروڑ گرہیں ڈھونڈ کر لاتا، مگر بات کہنے کی مجال ہی کہاں ہے؟ میں تو سانس بھی نہیں لے سکتا، کیونکہ میرے دل میں غم کی نہایت پیچدار گرہ پڑ گئی ہے۔

۲۱- **شرح** : میں نے گرہ کا نام لیا، لیکن کوئی بات نہ کر سکا۔ زبان تک آ کر گرہ اور پکی ہو گئی

۲۲- شرح : اگر یہ گرہ کھل جائے تو بلا شبہ دم نکل جائے۔ آہ! یہ گرہ بہت بری طرح گلے کا ہار ہو گئی ہے۔

۲۳- شرح : جب تک حضور کی توجہ اس طرف نہ ہو گی یہ گرہ کبھی کسی سے کھل نہ سکے گی۔

۲۴، ۲۵- شرح : دعا یہ ہے کہ مخالف کے دل میں بغض کی وجہ سے جو بہت ہی نابکار ملعون گرہ پڑ گئی ہے، خدا کرے، وہ گرہ ایسی ابھرے کہ اس کا دل پھوڑ کر پھوڑے کی طرح باہر نکل آئے۔

(۲)

نواب یوسف علی خاں

مرحبا! سالِ فرخی آئیں
عیدِ شوّال و ماہِ فروردیں

شب و روز افتخارِ لیل و نہار
مہ و سال اشرفِ شہور و سنیں

گرچہ ہے بعد عید کے نوروز
لیک بیش از سہ ہفتہ بعد نہیں

سو اس اکیس دن میں ہولی کی
جا بجا مجلسیں ہوئیں رنگیں

شہر میں کو بہ کو عبیر و گلال
باغ میں سو بہ سو گل و نسریں

شہر، گویا نمونۂ گلزار
باغ، گویا نگار خانۂ چیں

تین تہوار اور ایسے خوب
جمع ہر گز ہوئے نہ ہونگے کہیں

پھر ہوئی ہے اسی مہینے میں / منعقد محفلِ نشاط قریں

محفلِ غسلِ صحتِ نوّاب / رونق افزاے مسندِ تمکیں

بزمگہ میں، امیرِ شاہ نشاں / رزمگہ میں، حریفِ شیرِ کمیں

جن کی مسند کا آسماں گوشہ / جن کی خاتم کا آفتاب نگیں

جن کی دیوارِ قصر کے نیچے / آسماں ہے گداے سایہ نشیں

دہر میں اس طرح کی بزمِ سرور / نہ ہوئی ہو کبھی بروے زمیں

انجمیں چرخ، گوہر آگیں فرش / نور، مے، ماہ، ساغرِ سیمیں

راجا اندر کا جو اکھاڑا ہے / ہے وہ بالاے سطحِ چرخِ بریں

وہ نظر گاہِ اہلِ وہم و خیال / یہ ضیا بخش چشمِ اہلِ یقیں

واں کہاں یہ عطا و بذل و کرم / کہ جہاں گدیہ گر کا نام نہیں

یاں زمیں پر نظر جہاں تک جائے / ژالہ آسا، بچھے ہیں دُرِّ ثمیں

نغمۂ مطربانِ زہرہ نوا / جلوۂ لولیانِ ماہ جبیں

اس اکھاڑے میں جو کہ ہے مظنون / یاں وہ دیکھا بہ چشمِ صورت بیں

سرورِ مہر فر ہوا جو سوار / بہ کمالِ تجمّل و تزئیں

سب نے جانا کہ ہے پری توسن / اور بالِ پری ہے دامنِ زیں

نقشِ سمِ سمند سے، یکسر / بن گیا دشت، دامنِ گلچیں

فوج کی گردِ راہ، مشک فشاں
رہرووں کے مشام عطر آگیں

بسکہ بخشی ہے فوج کو عزّت
فوج کا ہر پیادہ ہے فرزیں

موکبِ خاص یوں زمین پر تھا
جس طرح ہے سپہر پر، پرویں

چھوڑ دیتا تھا گور کو، بہرام
ران پر داغ تازہ دے کے وہیں

اور داغ آپ کی غلامی کا
خاص بہرام کا ہے زیبِ سریں

بندہ پرور! ثنا طرازی سے
مدّعا، عرضِ فنِ شعر نہیں

آپ کی مدح اور میرا مُنہ
گر کہوں بھی تو آئے کس کو یقیں

اور پھر اب کہ ضعفِ پیری سے
ہو گیا ہوں نزار و زار و حزیں

پیری و نیستی، خدا کی پناہ
دستِ خالی و خاطرِ غمگیں

صرف اظہار ہے ارادت کا
ہے قلم کی، جو سجدہ ریز جبیں

مدح گستر نہیں، دعا گو ہے
غالبِ عاجزِ نیاز آگیں

ہے دعا بھی یہی کہ دنیا میں
تم رہو زندہ جاوداں! آمیں

تمہید:۔ نواب یوسف علی خاں والیِ رام پور بہت بیمار ہو گئے۔ بیماری دُور ہوئی تو غسلِ صحت کی تقریب پر رام پور کے "باغِ بے نظیر" میں جشن منایا گیا۔ یہ قصیدہ اسی موقع کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ غالباً یہ رمضان ۱۲۸۱ھ (جنوری، فروری ۱۸۶۵ء)

میں کہا گیا تھا، کیونکہ جشن شوّال میں منایا گیا اور عجیب بات یہ ہے کہ اس موقع پر چند روز کے تقدّم و تاخر سے خوشی کی چار تقریبیں جمع ہوگئیں، یعنی عید شوال، عیدِ نوروز، ہولی اور عیدِ جشن۔ قصیدے میں ان کا ذکر موجود ہے

افسوس کہ جشن صحت کے بعد تقریباً ایک مہینے کے اندر اندر نواب موصوف کا انتقال ہوگیا۔

۱۔ **لغات** : فرخی آئین : مبارک دستور کا، بابرکت۔

فروردین : پارسیوں کا پہلا مہینا، جو ایران میں بہار کا موسم ہوتا ہے۔

شرح : مرحبا، یہ سال کتنا بابرکت ہے! شوال کی عید آگئی، بہار کا مہینا ہے، جس میں نوروز کی عید ہوتی ہے۔

۲۔ **لغات** : شہور : شہر کی جمع، مہینے۔

سنین : سنہ کی جمع، سال۔

شرح : اس سال کے رات دن عام راتوں اور دنوں کے لیے باعث فخر ہیں۔ یہ مہینا اور یہ برس تمام مہینوں اور برسوں سے برتر ہیں۔

۳۔ **شرح** : اگرچہ نوروز عید کے بعد آئے گا، لیکن اس کی آمد میں تین ہفتے سے زیادہ مدت نہیں لگے گی۔

۴۔ **شرح** : تین ہفتے یا اکیس دن کی اسی مدت میں ہولی آئی اور اس کے لیے رنگین محفلیں جا بجا منعقد کی گئیں۔

۵۔ **شرح** : شہر کے کوچے کوچے میں عبیر و گلال چھڑکے گئے۔ باغ میں ہر طرف گلاب اور نسرین کے پھول نظر آرہے ہیں۔

۶۔ **شرح** : شہر باغ کا نمونہ بن گیا۔ باغ چین کا نگار خانہ معلوم ہونے لگا۔

۷۔ **شرح** : یوں تین تیوہار اور ایسے اچھے تیوہار جمع ہوگئے۔ یہ کبھی جمع نہ ہوئے اور نہ کہیں جمع ہوں گے۔

۸۔ **شرح** : پھر اسی مہینے میں اس محفل کا اہتمام ہوا، جو نشاط و شادمانی